سوانح
جو یاد رہا
مصنف
عابد سہیل

جو یاد رہا

(سوانح)

مصنف

عابد سہیل

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۱۸۲

JO YAAD RAHA

Autobiography

Abid Suhail

Published by

URDU ACADEMY, DELHI

Print

2012

Rs.600 .00

ضابطہ

سن اشاعت

۲۰۱۲ء

چھ سو روپے

اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی ۔ سی ۔ پی ۔ او ۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-186-0

لکھنؤ کی ان صبحوں اور شاموں

کے نام جو

مجازؔ، ڈاکٹر محمد حسن،

سداسرن مسرا،

سلام مچھلی شہری، م۔ نسیم

اور شیو پوری

کے دم قدم سے روشن اور گل و گلزار تھیں

فہرست

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہرِ بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پاکر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں اردو اکادمی، دہلی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج اردو اکادمی، دہلی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کررہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہوگئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے

ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور'' بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی نے مرحوم پروفیسر قمر رئیس کی وائس چیئرمین شپ کے زمانے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اکادمی تین مشاہیرِ ادب کو دو سال کے لیے فیلوشپ دے تاکہ اس فیلوشپ کے دوران وہ کسی ادبی پروجیکٹ پر کام کریں۔ ان تین فیلوشپ میں سے دو دہلی والوں کے لیے مخصوص تھیں اور ایک نیشنل فیلوشپ تھی جس کے لیے ممتاز و بزرگ ادیب، دانشور اور صحافی جناب عابد سہیل کو منتخب کیا گیا۔ صلاح و مشورے کے بعد جناب عابد سہیل نے اپنی زندگی اور طویل مدتی ادبی سفر کو اپنے پروجیکٹ کا موضوع بنایا اور بڑی محنت اور جانفشانی سے ''جو یاد رہا'' کے عنوان سے اپنی آپ بیتی تحریر کی۔ اس آپ بیتی میں آپ کو عابد سہیل کم ملیں گے لیکن ان کے متقدمین، معاصرین اور متاخرین کے ایسے ایسے واقعات ملیں گے جو یقیناً نہ صرف دلچسپی کا باعث ہوں گے بلکہ مفید بھی ہوں گے۔ ادبی تحریکات اور ادبی رجحانات کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ قدآور ادبی شخصیات کے ادبی معرکے اور بوقلمونیاں بھی ملیں گی۔

اکادمی جناب عابد سہیل کی شکر گزار ہے کہ انھوں نے ہمارے اشاعتی ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ہم اکادمی کے موجودہ وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے سابقہ دور کے تمام پروجیکٹس کو جاری رکھنے اور مکمل کرنے میں نہ صرف پورا تعاون دیا بلکہ انھیں اپنی ترجیحات میں شامل کیا۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ آپ بیتی ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی اور اس نوجوان نسل کے لیے جو زندگی میں کچھ کر گزرنے کی تمنا رکھتی ہے مشعلِ راہ ثابت ہوگی نیز ریسرچ اسکالرز کے لیے بھی معاون ثابت ہوگی۔

انیس اعظمی

سکریٹری

زندگی، خوشی، معنویت

زندگی میں خوشی کا عنصر بس اتنا ہی ہوتا ہے جتنا آٹے میں نمک کا اور شاید یہی بہترین صورت بھی ہے، جب کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ خوشیاں جتنی زیادہ ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ لیکن کیا خوشیوں کی نوعیت پر غور کیے بغیر اس سلسلے میں کوئی کلیہ قائم کیا جا سکتا ہے؟

یہ کوئی فلسفیانہ مسئلہ نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے کہ جو بھی بات ذرا سی گہرائی سے سوچیں اس کے ڈانڈے کسی نہ کسی طرح فلسفے سے جا ملتے ہیں۔ لفظ فلسفہ تجریدی معلوم ہو تو نظریہ کہہ لیجیے، گہرائی سے تفکر کا نام دے دیجیے لیکن نام کچھ بھی دیا جائے یہ بات دو جمع دو برابر چار اور چار ضرب تین برابر بارہ سے مختلف اور ایک طرح سے ارفع ضرور ہوگی۔

پنڈت نہرو نے ایک مرتبہ اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا تھا: "I do not know if happiness is a very happy state of mind." یعنی میں نہیں کہہ سکتا کہ خوشی کوئی بہت پسندیدہ ذہنی کیفیت ہے۔ قضیہ کا معنوی حسن اور happiness اور happy کا ایک ہی جملے میں اس قدر خوبصورت استعمال حیرت زدہ کر دیتا ہے اور فکر کو نئی بلندیاں چھونے پر آمادہ۔ یہ واقعہ ایک پریس کانفرنس کا ہے۔ معلوم نہیں وہاں پنڈت نہرو کو اس قدر گہری بات کہنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی۔

پنڈت نہرو کی یہ بات اخبار نویسوں کو اُٹ پٹی ضرور معلوم ہوئی ہوگی، خاص طور سے یوں کہ خوشی سے مروّجہ معنی ہی مراد لیے گئے ہوں گے۔ لیکن ذہن پر ذرا سا زور دیا جائے تو یقیناً اندازہ ہوگا کہ خوشی کو عام طور سے جس احساس کا نام دیا جاتا ہے وہ کسی ایسی بلند و بالا ذہنی کیفیت اور جذبے کے ترفع (حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا) سے متعلق نہیں ہوتی جو آج کی کلی کے چٹکنے سے کل پھول بن جانے اور اس تجربے میں گویا شامل ہونے، طلوع ہوتے ہوئے چاند اور اس کے ہالے کو ایک ٹک دیکھنے، اچھی غزل، نظم، افسانہ یا کچھ بھی ڈوب کر پڑھنے، کسی چہرے یا شخص کو

دیکھ کر اس کے حسن یا اس کے حسنِ بیان سے مبہوت ہو جانے یا کسی کے ساتھ، وہ مرد ہو یا عورت، لیکن جنس مخالف ہو تو کیا ہی خوب، ایسی گفتگو سے حاصل ہوتی ہے جس میں حسن کلام ہو، رفاقت کا احساس ہو، خلوص کی زیریں لہر ہو اور علم و ذہانت کی گوٹ ٹنکی ہو۔

اس موقع پر کیوں نہ آج کی خوشیوں کے وسیلوں کو، جنھیں منزل کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور ان کے حصول میں ناکامی کو بھی، ذرا الٹ پلٹ کے دیکھا جائے۔ وہ جن کی زندگی میں ایسی خوشیاں کم، بہت کم ہوتی ہیں، انھیں ذراسی خوشی، اس کی نوعیت چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو، شرابور کردیتی ہے اور انھیں جن کی زندگیوں میں ان کی بہتات ہو اس کیفیت کی ذراسی کمی غم واندوہ میں ڈبو دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ حساب برابر ہو گیا نا! لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مفلس و تنگ دست اور آسودہ حال زندگیوں کا حساب کتاب برابر ہوتا ہے، اگرچہ وسیع تر تناظر میں یہ دونوں صورتیں بالکل بے تعلق انتہائیں بھی نہیں کیوں کہ یہ بھی تو غور طلب ہے کہ آسودہ حالی اور تنگ دستی کے پیمانے کیا ہیں۔

کیا کسی نے ایسے شخص سے بڑا مفلس دیکھا ہے جو روپوں پیسوں سے مالا مال ہونے کے باوجود انھیں صَرف کرنے کی صلاحیت اور حوصلے سے محروم ہو اور جس نے دولت کے انبار ہی کو مقصدِ حیات سمجھ لیا ہو؟ میں نے تو اس سے زیادہ مفلس اور بدنصیب انسان نہیں دیکھا۔

دل اس وقت بھی دھڑکتا ہے، اگرچہ آہستہ آہستہ، جب کلی تبسم کرتی ہے اور اس وقت بھی جب بزاروف[1] کو اس زندگی کی لامعنویت جو وہ بسر کر رہا ہے خودکشی پر مجبور کر دیتی ہے... اور ان دونوں صورتوں کی عدم موجودگی میں بھی، لیکن ان سب کیفیتوں میں دل کے دھڑکنے کی ادا کیا ایک ہی ہوتی ہے؟ کیا وہ لمحے جن میں دل کی حرکت رقص کرنے یا بزاروف کے ساتھ ڈوبنے ابھرنے لگتی ہے اور وہ جسے اسٹےتھسکوپ کی مدد سے ناپ کر ڈاکٹر اطمینان کی سانس لیتا ہے، یا اس کے چہرے پر پریشانیاں ڈیرے ڈال دیتی ہیں، اپنی شدت اور معنویت کے اعتبار سے یکساں ہیں؟ سوچیے، ذرا ڈوب کر سوچیے، تو احساس ہوگا کہ صرف زندہ رہنے، زندگی کو ماہ و سال کے پیمانوں سے ناپنے اور شدت سے جینے میں کتنا فرق ہے اور یہ ''شدت'' معنویت کے بغیر ممکن نہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا خوب کہا ہے، ''آدمی جب شدت سے زندہ رہتا ہے زیادہ

۱۔ ترگنیف کے ناول Fathers and Sons کا ہیرو۔ یہ ناول تقریباً ساٹھ سال قبل پڑھا تھا۔

دن نہیں چلتا۔[1] طویل عرصے تک سانسوں کی بے ثمر آمد و شد اور معنویت سے پُر زندگی کے مختصر وقفے کے فرق کو اتنے تھوڑے لیکن مناسب ترین الفاظ میں شاید ہی کسی دوسری طرح بیان کیا گیا ہو۔ لمحۂ پیدائش سے دم واپسیں کی ایک طویل مدت تک جینے اور کم لیکن شدت سے جینے میں جو فرق ہے اسے کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے آخرالذکر کیفیت میں مختصر وقفے بھی گزارے ہوں اور کسی کو اس کیفیت میں زندگی کرنے کی طویل مدت نصیب ہو جائے تو اس کی قسمت پر رشک ہی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس نعمت سے قطعاً محروم رہا ہو۔ ہوتا بس یہ ہے کہ کسی کی زندگی اس نعمت سے مالا مال ہوتی ہے اور کسی کی بڑی حد تک محروم۔

زندگی کی فصل کے یہ خوشے اسے معنویت بھی بخشتے ہیں، اس کی جستجو کی لہلہاتی کھیتی بھی ہوتے ہیں اور ان کی زرخیزی اور فراوانی بظاہر بے سود کاوشوں کو فکر و احساس کی ایسی کامرانی سے مالا مال کر دیتی ہے کہ انسان خود اپنی نظروں میں سرخرو ہو جاتا ہے۔ زندگی کی یہ معنویت ہی آئے میں خوشیوں کے بے قدر رنگ ہونے کے باوجود نگ کو بلندی اور جان کو پرسوزی بخشتی ہے۔ رہی ایک مخصوص قسم کی دلنوازیٔ سخن، تو یہ اب آرٹ کے بجائے کرافٹ بنتی جارہی ہے اور شیریں سخنی کمینگیوں کو چھپانے کا ہنر۔

کم و بیش تیس سال قبل ایک صاحب انگریزی صحافت، ادارت، خبر کی پرکھ، اس کے حصول اور متعلقہ پہلوؤں پر ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک سوال نامہ تیار کیا تھا اور ان صحافیوں سے جنھوں نے اس میدان میں لمبی عمر گزاری تھی، اس کی روشنی میں بات چیت کرتے یا جوابات تحریری شکل میں حاصل کر لیتے۔ طویل عرصے تک صحافت سے وابستہ رہنے کے سبب میرا شمار بھی سینئر صحافیوں میں ہونے لگا تھا اس لیے انھوں نے یہ سوالنامہ مجھے بھی دیا اور اس کی روشنی میں بات چیت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایسوشی ایٹڈ جرنلس (قومی آواز، نیشنل ہیرالڈ، اور نوجیون کا اشاعتی ادارہ) کے دفاتر قیصر باغ چوراہے کے پاس اس عمارت میں تھے جسے مسمار کر کے اب ایک شاپنگ کامپلکس بنا دیا گیا ہے۔ یہ بات چیت ان اخباروں کی کین ٹین میں ہوئی تھی۔ یہ غالباً ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ بیشتر سوالات روایتی قسم کے تھے، جیسے، '' آپ نے صحافت کا پیشہ کیوں اختیار کیا؟ صحافت سے آپ کا تعلق کب قائم ہوا؟

۱۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کے نام ڈاکٹر ذاکر حسین کا ایک خط۔

آپ کو رپورٹنگ پسند ہے یا ڈیسک پر کام کرنا اور کیوں؟'' وغیرہ وغیرہ۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ واقعہ کا کون سا عنصر اسے خبر بنا دیتا ہے۔ یہ شاید سب سے عمدہ سوال تھا ورنہ انھوں نے گہرے پانیوں میں اترنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

ان دنوں انگریزی اخباروں اور خاص طور سے نیشنل ہیرالڈ میں زبان و بیان کی چستی اور درستی کے علاوہ خبر کی پیش کش میں سنجیدگی، اس کے ماخذ کے قابل اعتماد ہونے اور ایسی خبروں کی اشاعت سے احتراز برتنے پر زور دیا جاتا تھا جن کا مقصد ذاتی تشہیر ہو۔ کسی بے بنیاد خبر کی اشاعت کو تو اخبار کی بے توقیری سمجھا جاتا۔ خبر کو اخبار کی پالیسی کے مطابق توڑا مروڑا نہیں جاتا تھا اور صحافت کے اس بنیادی اصول پر کہ خبر مقدس ہے اور اس پر تبصرہ آزاد (News is sacred while comment is free) عمل ہوتا تھا اور بے بنیاد بات کو خبر کا مقدس لبادہ اڑھا کر مستند نہ بنایا جاتا۔ کچھ بات چیت ان مسائل پر ہوئی اور کچھ اخبار کے معیار، خبروں کی پیش کش کے انداز، صفحہ اوّل پر خبروں کی تعداد، مدیر کے نقطۂ نظر، اخبار کی پالیسی اور ان کی مناسبت سے خبر کی رنگ آمیزی سے متعلق۔

اس زمانے میں، کم سے کم نیشنل ہیرالڈ میں، صورت یہ تھی کہ اگر کسی ایسی خبر پر، جو اتفاق سے شائع ہونے سے رہ گئی ہو، اداریہ لکھا جانا مقصود ہوتا تو نیوز ایجنسی سے اس کی کاپی منگا کر اداریہ کی اشاعت سے قبل یا زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ وہ خبر ضرور چھاپی جاتی تاکہ پڑھنے والے اس زاویۂ نگاہ سے واقف ہو جائیں جس پر اخبار نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔

ابتدائی اور دُہرے کے سوالات پر بات چیت کے بعد بعض بنیادی سوال بھی زیرِ بحث آ گئے جن میں صحافت کے اقدار کا مسئلہ بھی شامل تھا۔ یہ سوال میں نے ہی اٹھایا تھا اور امرناتھ کھلر صاحب کو، جو میرے جوابات اور خیالات نوٹ کر رہے تھے، حیرت تھی کہ اخبار کے سلسلے میں، جس کی زندگی بس ایک دن کی ہوتی ہے، Value کا مسئلہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ میں نے مثال کے طور پر ان سے کہا کہ خبر کی تردید کی اشاعت کا تعلق صحافتی قدر سے بھی ہے اور اخبار کی معتبریت سے بھی۔ کسی خبر کی تردید کی جائے تو اس کی اشاعت ضروری ہے، اگرچہ رپورٹر یا اس شخص کو جس نے یہ خبر دی ہو، اپنی بات کہنے کا بھی حق ہوتا ہے۔ کھلر صاحب کے لیے یہ بات حیرت خیز تھی۔ (ان دنوں آج کی صورت نہ تھی کہ اخبار میں جو چاہا چھاپ دیا کہ تردید تو چھاپنی نہیں ہے۔ پچیس تیس سال قبل تک یہ ممکن نہ تھا)

صحافت اور خاص طور سے اخباری صحافت کا جن لوگوں کو تجربہ ہے ان کو احساس ہوگا کہ یہ پیشہ انسان کو سخت دل، بر خود غلط اور عیب جو بنا دیتا ہے۔ روزناموں کی صحافت کا سارا ڈھانچہ ہی ایک طرح سے حکومتِ وقت، اس سے متعلق افراد، اداروں اور سیاسی، سماجی اور معاشی نظام میں خرابیاں تلاش کرنے کی بنیاد پر قائم ہے۔

ہر شہر، قصبے یا گاؤں کی آبادی کی بڑی اکثریت کی زندگی عام طور سے معمول کے مطابق ہی گذرتی ہے اور حادثات، چوری ڈکیتی کے واقعات، آبادی کو پیش نظر رکھا جائے تو: مقابلتاً کم بلکہ بہت کم ہوتے ہیں لیکن اسے کیا کہیے کہ معمول کی یہ زندگی خبر نہیں بنتی۔ بیس ہزار کاریں اور موٹر سائکلیں سڑکوں پر یوں گذر جاتی ہیں جیسے پوری سڑک انھی کے لیے بنی ہو، کوئی اس جانب توجہ بھی نہیں کرتا لیکن جہاں کوئی کار یا موٹر سائکل کسی دوسری گاڑی سے ٹکرائی، کسی کو چوٹ آئی، خبر بن گئی اور خدانخواستہ کوئی راہیٔ ملکِ عدم ہو جائے تو عام طور سے مقامی اخبار کے صفحۂ اوّل کا ایک گوشہ اس کے لیے محفوظ ہو ہی جاتا ہے۔ دفتروں میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں لوگ ضرور ایمانداری سے کام کرتے ہیں، ایسے بھی ہیں، اگرچہ اب بہت کم، جو ملازمت کی ساری مدت میں ہمیشہ وقت سے دفتر آتے رہے اور کام کے اوقات ختم ہونے کے بعد ہی اپنی کرسی سے اٹھے، پھر بھی کسی رپورٹر کی ان پر نظر نہیں پڑتی لیکن رشوت اور غبن کا ہر واقعہ فوراً خبر بن جاتا ہے۔ گویا رپورٹر ہر وقت زندگی کی ناہمواریوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہ اسے کرنا ہی ہوتا ہے۔

کم و بیش یہی حال ان صحافیوں کا ہوتا ہے جو ڈیسک پر کام کرتے ہیں۔ ٹیلی پرنٹر کی خبروں یا رپورٹروں کی کاپی (صحافت کی اصطلاح میں کسی بھی ذریعے سے حاصل ہونے والی خبر کی اس تحریری صورت کو جو اشاعت کے لیے ڈیسک کے حوالے کی جاتی ہے کاپی کہا جاتا ہے) میں زبان و بیان کی غلطیاں درست کرتے کرتے، زندگی کے منفی رُخ کی تلاش اور عیب جوئی سب ایڈیٹر کے مزاج کا حاوی جزو بن جاتی ہے اور معاملہ یہاں بھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ رات گیارہ ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں اور کوئی ایسی خبر بھی نہیں آئی جسے صفحہ اوّل پر دو کالمہ سے بڑی سرخی کے ساتھ پیش کیا جا سکے... اسی پریشانی کے عالم میں ٹیلی پرنٹر[1] سے ایک مخصوص قسم کی آواز برآمد ہوتی ہے... رک رک کر... جس کے معنی ہوتے ہیں کہ کوئی بڑی (بُری) خبر آنے والی

۱۔ اب انگریزی اخباروں میں تو خبریں براہ راست کمپیوٹر پر آ جاتی ہیں اور ٹیلی پرنٹر صرف چند اردو اخباروں کے دفتروں میں نظر آتے ہیں۔

ہے۔ چیف ایڈیٹر یا شفٹ انچارج تیزی سے ٹیلی پرنٹر کا رخ کرتا ہے اور Attention, Attention, Attention, کی کسی قدر تیز کھٹ کھٹ کے بعد دو تین الفاظ کی خبر آتی ہے... ہوائی حادثہ، ہوائی حادثہ... شفٹ انچارج کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ایک بڑی پریشانی سے نجات حاصل ہوئی۔

تھوڑی دیر میں تفصیلی خبر آتی ہے۔

"... ہوائی جہاز، جس میں ۱۲۷ مسافر سوار تھے، پرواز شروع کرنے کے پندرہ منٹ بعد حادثہ کا شکار ہو گیا، تفصیلات کا انتظار ہے"۔

یا یہ کہ

"... ایکسپریس زبردست حادثہ کا شکار ہو گئی اور تین ڈبے پٹری سے اتر گئے... پاس کے اسٹیشنوں سے امدادی ٹیمیں روانہ کر دی گئی ہیں۔ حادثہ کے شکار مسافروں کی تعداد ابھی معلوم نہیں ہو سکی۔ تفصیلات کا انتظار ہے۔"

یہ یا ایسی ہی کوئی خبر ملتے ہی، برقی تاروں کے سہارے اور ان کے بغیر بھی، اخبار کے دفتروں اور خبر رساں ایجنسیوں سے جائے حادثہ تک، پہاڑ ہوں یا دریا یا گنجان آبادی کے علاقے، ایک مفروضہ سڑک کے ہر دو جانب پتھر دل گیدڑ زمین پر، درخت کے تنوں پر یا یوں ہی اپنی چونچیں مار مار کر اس انسانی المیہ کو مزید "آب دار" بنانے لگتے ہیں۔

اس طرح کی صورت، ہر روز نہ سہی، ہفتے عشرے میں ایک آدھ بار بھی پیش آتی رہے تو کیا یہ نرم دل سے نرم دل انسان کو سفاک اور موت کا سوداگر بنا دینے کے لیے کافی نہ ہوگی؟ تسلیم کہ گداختہ دلی اور انسان دوستی اس طرح کے حادثات اور صورت حال پر پژمردہ اور رنجور ضرور ہوگی لیکن تا کے، ایک نہ ایک دن انھیں بھی ہتھیار ڈال دینا پڑیں گے۔

اخبار میں کام کرنے والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔

کھلر صاحب کے سوالنامے میں اس طرح کا کوئی مسئلہ نہیں اٹھایا گیا تھا۔ یہ سوال میں نے ہی اٹھایا تھا اور جب میں نے کہا کہ صحافی اگر کسی گہرے عشق کے تجربے سے نہ گذرے، اس کی کوئی ہابی (Hobby) نہ ہو، فنونِ لطیفہ سے لطف اندوز نہ ہوتا ہو، چڑیوں کی چہچہاہٹ اس کے دل کی کلی نہ کھلا دیتی ہو، خاموشی سے بہتی ہوئی ہوا میں دھیرے دھیرے ڈولتے ہوئے پھول پر نظر پڑنے کے بعد وہ پلٹ پلٹ کر اسے دیکھنے پر خود کو مجبور نہ پاتا ہو تو بالکل ممکن ہے کہ وہ اپنے پیشے کی

بلندیوں کو چھو لے لیکن اسے اس کی قیمت بھی چکانی پڑے گی... اپنے دل کے سفاک اور بے رحم بن جانے کی شکل میں۔

اور جب میں نے کہا کہ لطیف احساسات سے محرومی اور ان احساسات کی مسلسل آبیاری سے گریز کسی بھی صحافی کو خراب انسان بنا دینے کے لیے کافی ہیں تو وہ حیرت زدہ رہ گئے... انھیں گمان بھی نہ رہا ہوگا کہ کوئی صحافی اپنے پیشے کے بارے میں اس قدر خطرناک رائے رکھ سکتا ہے۔

انھوں نے پوچھا: ''کیا یہ باتیں آپ کے حوالے سے لکھ سکتا ہوں؟''

میں نے انھیں نہ صرف اس کی اجازت دے دی بلکہ دو تین دن بعد اپنا نقطۂ نظر تحریری صورت میں ان کے حوالے کر دیا، باقاعدہ دستخط کر کے۔

کھلر صاحب نے پوری عبارت پڑھی، میرے دستخط اور تاریخ پر تھوڑی دیر تک نظریں گاڑے رہے، پھر میرے چہرے کی طرف دیکھا اور کاغذ تہہ کر کے احتیاط سے اپنی ڈائری میں رکھ لیا... ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ تو مکمل نہ ہو سکا لیکن وہ صحافیوں سے ملاقاتیں کرتے کرتے خود صحافی بن گئے۔

مجھ سے اپنا انٹرویو انھیں پندرہ سولہ سال قبل (۱۹۹۵ء) تک یاد تھا جب ایک اخبار کے دفتر میں ان سے بالکل غیر متوقع طور پر ملاقات ہوگئی۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ انھوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا ہے لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ وہ کس اخبار سے وابستہ ہیں کیوں کہ میں صحافی سے کتب فروش بن چکا تھا۔ وہ بالکل پہلے جیسے تھے، علاوہ اس کے کہ کچھ زیادہ ہی موٹے ہو گئے تھے اور چہرے پر وہ چمک پیدا ہو گئی تھی جو بینک بیلنس کا نتیجہ ہوتی ہے۔

جس شان اور ہنک سے وہ دفتر میں داخل ہوئے اور چپراسی کے سلام کا جواب دینے میں جو سرپرستانہ انداز انھوں نے اختیار کیا اسے دیکھ کر میں نے ان سے پوچھا۔

''چیف سب ایڈیٹر؟''

"No, Deputy News Editor"

ان کے لہجے میں خاصی رعونت تھی، خاصا غرور تھا۔

مجھے وہ سفاک، خودسر، مغرور اور اپنی اہمیت کے نشے میں چور نظر آئے۔

اب ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن گاہے گاہے ملاقات ہو جاتی ہے۔ جس قدر مطمئن، غیر

دلچسپ، معنویت سے عاری زندگی پر مسرور، صحافت اور ہیڈ کلرکی میں فرق سے ناواقف وہ دورانِ ملازمت تھے، اسی قدر آج بھی ہیں؛ کسی بھوکے کی آہ، کسی بیمار کی کراہ، کڑاکے کی سردیوں میں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر یا کسی چھجے کے نیچے ٹھٹھرتے ہوئے انسان کی تکلیف کا نہ انھیں پہلے کبھی احساس تھا نہ اب ہے۔ انھیں دیکھ کر یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ کوئی نازک خیال یا کوئی لطیف احساس غلطی سے بھی ان کے پاس سے کبھی گزرا ہوگا۔

ایک دن سرِ راہے نظر آ گئے۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو انھوں نے اپنی چمچماتی اسکوٹر روک لی۔ دو چار رسمی جملوں کے بعد بولے، ''چار لاکھ سے اوپر پراویڈینٹ فنڈ ملا تھا، پونے دو لاکھ گریچویٹی اور تین مہینے کی باقی چھٹی کی تنخواہ کے پچاس پچپن ہزار۔ پرانی اسکوٹر بیچ کر یہ خرید لی ہے''۔ انھوں نے اسکوٹر کی سیٹ کو تھپتھپایا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا، ''بیوی کے رٹائرمنٹ میں ابھی چار سال باقی ہیں۔ کٹ کٹا کر پینتیس چالیس ہزار آ ہی جاتے ہیں۔ اپنے روپے کم مدّتی سود پر چلاتا ہوں، پہلے سے زیادہ ہو جاتا ہے، رٹائر ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ مہینے میں دس بارہ دن کی رات کی ڈیوٹی سے الگ نجات ملی۔''

سطحی خوشیوں سے کیسی بھرپور، آسودہ، اور ہر قسم کے تفکّر سے عاری زندگی جی رہے ہیں ہمارے کھلر صاحب۔ تکیے پر سر رکھتے ہی نیند کی گود میں پہنچ جانے والی دو آنکھیں انھوں نے ناک کے اوپر دائیں بائیں جانب کی کٹوریوں میں جڑ لی ہیں۔

ایک صاحب کے اس دعوے پر کہ تکیے پر سر رکھتے ہی وہ نیند کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں، ایک دن سرور صاحب کا بیٹا صدیق، جو نیشنل ہیرالڈ میں سینئر رپورٹر تھا، خوب خوب ہنسا تھا۔ اس ہنسی کا طنز بھی ان صاحب کے سر پر سے گذر گیا تھا۔ لطف یہ ہے کہ وہ بھی صحافی تھے، کلرک صحافی۔

کیا اس طرح کی زندگی میں کسی قسم کی معنویت اور اس کی پروردہ اعلیٰ و ارفع خوشی کی تلاش کی جاسکتی ہے؟

عام معیاروں کے مطابق کھلر صاحب کی زندگی آسودگی سے چھلکتی ہوئی اور بے حد مطمئن ہے... خوشی کو بہت پسندیدہ ذہنی کیفیت قرار دینے سے احتراز کرتے ہوئے شاید معنی سے عاری ایسی ہی خوشی پنڈت نہرو کے پیشِ نظر رہی ہوگی اور غالباً انھی معنوں میں بس زندہ رہنے کے مقابلے میں ''شدت'' سے جینے کا نازک فرق ذاکر صاحب پر منکشف ہوا ہوگا۔

شادکامی بس یہ ہے کہ ایسی بے تعقل اور معنویت سے عاری زندگی اور بے محابا خوشی سے خدا نے مجھے محروم رکھا ہے۔

یہ ہے وہ ذہنی پس منظر جس میں شعور کی آنکھیں کھولنے کے بعد سے اب تک کی زندگی بسر کی ہے۔ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت، علم اور ذہانت سے پُر گفتگو کا ہمیشہ ہی دلدادہ رہا، دولت کے حسنِ استعمال نے تو متاثر کیا، لیکن دولت نے کبھی نہیں، جی ہاں کبھی نہیں۔ کسی کے سامنے دستِ طلب کبھی دراز نہیں کیا، قرض کی بات دوسری ہے۔

اب کچھ "جو یادرہا" کے بارے میں

زیرِ نظر خودنوشت کا خاصہ بڑا حصہ، غیر مرتب صورت ہی میں سہی، ۲۰۰۳ء اور اس سے کچھ پہلے کاغذ پر منتقل نہ ہو گیا ہوتا تو اب یعنی ۲۰۱۰ء میں اور اس کے بعد اسے مکمل کرنے کا خواب، خوابِ پریشاں ہی رہ جاتا۔

ہوا یہ کہ ۵ رمئی ۲۰۰۱ء کو نصرت پبلشرز سے نجات ملی تو اگلے ہی دن والدہ ماجدہ دنیا کو ٹھوکر مار کر عازمِ سوئے کہکشاں ہوئیں، اور اسی مہینے گودوں کھلائی ماموں زاد بہن وسیمہ اللہ کو پیاری ہوئی اور اس کے بعد بیماریوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اب کہیں جا کے تھما ہے، بس تھوڑا بہت۔ اس دوران کچھ دوسری مصروفیتیں بھی رہیں اور وہ بھی ایسی کہ انھیں کل پر نہیں ٹالا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد اس کام میں دوبارہ ہاتھ ڈالا اور بہ شکرِ خدا صحت نے اس حدِ ضرور تک ساتھ دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔

میں نہ کوئی دانا، نہ کسی ہنر میں یکتا، نہ میں نے آسمان سے تارے توڑے نہ زمین پر کامرانیوں کے لالہ و گل اُگائے، نہ بڑے عہدوں پر رہا، نہ صاحبانِ اقتدار کا مصاحب کہ ان کی فتوحات میں جو جو مذکور ہونے سے رہ گیا ہوتا اسی کا بیان اپنی جھولی میں ڈال لیتا اور خوب چٹخارے لے لے کر بیان کرتا... لیکن ایک بات ضرور ہے۔ عمر کے ان اَٹھتّر اَبہتّر برسوں میں زمانے نے اتنا کچھ دکھایا ہے کہ اب نہ بھوک سے پیٹ کُھرچتا ہے نہ خوانِ یغما پر رال ٹپکتی ہے، نہ طنز کے تیر جگر پاشی کرتے ہیں اور نہ کسی غیر متوقع کامیابی میں ہوش کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہے۔

اور یہ دعوا بھی نہیں کہ زندگی کے سارے پھول اور کانٹے ان چھے سات سو صفحات میں

سما گئے ہیں، کہ اس کے لیے بیان کی کہیں زیادہ وسعت درکار ہوگی، لیکن چراغ کی لَو پر ہاتھ رکھ کے یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں، نادانستہ طور پر یا یادوں کی بھول بھلیوں نے حامد کی ٹوپی محمود کے سر اور محمود کی ٹوپی حامد کے سر رکھ دی ہو یا ایک آدھ واقعہ آگے پیچھے ہوگیا ہو تو بات دوسری ہے۔ کہنا یہ بھی ہے کہ کبھی اور کہیں کچھ ایسا ہوا ہے جس سے اپنی شخصیت روشن ہوئی ہے تو اس کے ذکر سے محض اس لیے گریز نہیں کیا ہے کہ کوئی اسے ناقابلِ یقین قرار دے دے گا یا خودستائی، مزید یہ کہ جہاں جہاں سبک ہوا ہوں، خود اپنے یا دوسروں کے ہاتھوں، اور جہاں جہاں کمینگیوں کی لذت نے بے دست و پا کردیا ہے، ان مقامات سے بس اس حد تک سرسری گزرا ہوں کہ حتی الامکان دوسروں پر آنچ نہ آئے اور یہ بھی ہوا ہے کہ ایک آدھ مقام پر صبر وضبط کی طنابیں ٹوٹنے لگی ہیں تو شمشیر کو میان سے نکال کر اور پھر اسے آسودۂ غلاف کر کے صرف اشاروں اور کنایوں پر اکتفا کیا ہے۔

شعوری طور پر نہ زبان کو بیان پر قربان کیا ہے نہ بیان کو زبان پر، نہ خود کو دھلی دھلائی شخصیت بنا کر پیش کیا ہے نہ پورے طور پر کمینہ صفت کہ ان کے آمیزے کا نام ہی عابد سہیل ہے۔

زندگی کا بڑا حصہ ناگفتہ بہ حالات میں گزرا، مفلسی، سناٹے اور بے چارگی کے گھیرے میں، اگرچہ ایسی مختصر رفاقتیں بھی نصیب ہوئیں جن سے یادوں کا چمن کبھی کبھی لہلہا اٹھتا ہے لیکن یہ درد ہمیشہ رہا اور اب بھی ہے کہ وہ ان جانبوں سے نہیں تھیں جن سے توقع کی جاسکتی تھی... مفلسی اور ستم رسیدگی میں ایک بڑی خوبی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی ناکامیوں کا جواز فراہم کرتی ہیں اور بے چین اور افسردہ دل کو تھپکی دیتی ہیں کہ حالات بہتر ہوتے تو یہ تیر مارا ہوتا، وہ تیر مارا ہوتا، اگرچہ کبھی کبھی یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ کر سکا ہوں بصورتِ دیگر شاید وہ بھی ممکن نہ ہوتا۔

''فراغتے ، کتابے و گوشۂ چمنے'' تو کبھی نصیب نہیں ہوا ، اگرچہ تنہائی میں کتابوں کی رفاقت ضرور حاصل ہوئی، مجبوراً ہی سہی، تاہم اس تنہائی کے لیے بھی اظہار تشکر ضروری ہے۔

میں ہندوستان کے دورِ غلامی میں پیدا ہوا، اسی میں شعور نے آنکھیں کھولیں، پھر آزادی آئی اور اب تعصب، تشدد، دہشت گردی اور مجرموں، ملزموں اور بے گناہوں کے ساتھ یکساں سلوک کے دور میں جی رہا ہوں اور فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ملزم ہوں، مجرم ہوں یا بے گناہ۔

پچھلے ساٹھ پینسٹھ برسوں نے بہت کچھ دکھایا؛ عقیدے کی نارسائیاں، عقل کی بے

چارگیاں اور قولِ فیصل کے طور پر ان کی معذوریاں اور اب نہ پیچھے کعبہ ہے نہ آگے کلیسا، نہ ایمان روکتا ہے نہ کفر کھینچتا ہے۔ بس ایک خلا ہے جو کون ومکاں پر چھایا ہوا ہے۔

سانسوں کی آمد وشد کے ابتدائی دس بارہ سال تو ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں شمار کیا جائے یا نظر انداز کچھ خاص فرق نہیں پڑتا لیکن میرے لیے ان میں سے بیشتر ایسے تھے کہ جن میں چاند تارے ٹنکے تھے۔ پھر چودہ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد تو دنیا ہی بدل گئی۔ کم وبیش سات آٹھ سال نظریہ کی پرستش کی نذر ہو گئے لیکن یہ ضائع نہیں ہوئے کہ ان برسوں نے ہی وہ نظر دی جس کی لاٹھی کے سہارے زندگی کے کڑے کوس پار ہو سکے۔ باقی برسوں میں وہ اکیس سال بھی شامل ہیں جو نصرت پبلشرز کھا گیا۔ ان کی بربادی کا غم ہمیشہ رہے گا اور نیشنل ہیرالڈ کی زوال آمادگی کے دنوں کا اور بیماری کے ان برسوں کا بھی جنھوں نے لکھنے پڑھنے کے جو مواقع مل سکتے تھے ان سے بھی محروم کر دیا اور ان لمحوں، منٹوں، گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور طویل مدتوں کا بھی جن میں آنکھیں آبشار رہیں اور سینہ گنجینۂ غم واندوہ۔

حیرت، یا پروردگار حیرت۔ اس بے سروسامانی اور بے مائیگی میں بھی، یہ کہنے کا حوصلہ ہے۔

سفر ہے آخرت کا میرے ذمے کچھ نہ رہ جائے
بتا اے منزلِ ہستی ترا کتنا نکلتا ہے

لیکن ابھی ایک بات اور بھی کہنی ہے۔

تسلیم کہ ساری زندگی کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہ کیا لیکن اس سبزۂ بیگانہ کی بے ترتیبی میں جو تھوڑی سی ترتیب نظر آتی ہے وہ صرف میری کاوشوں کا نتیجہ نہیں۔ اس میں بہت سے جانے انجانے مہربانوں، چاہنے والوں اور کرم فرماؤں کی محبتیں اور دستِ تعاون بھی شامل ہے، جنھوں نے بہترین کتابوں کے نام بتائے، ٹیوشن دلائے، غلطیوں پر ٹوکا... وہ زبان وبیان کی ہوں یا قول وفعل کی... ان کو بھی یاد کرنا ہے۔

...اور یہ بھی کہ زندگی کی ایک طویل پالی کھیلی ہے اور کم وبیش ساٹھ پینسٹھ برسوں کے بہت سے سنگِ میل، تاریخ ساز واقعات اور کروٹوں کا عینی شاہد نہیں تو کسی نہ کسی حد تک ان سے واقف ضرور رہوں۔ ان میں سے بہت کچھ انسانی رشتوں سے بے نیاز تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور

محظوظ ہو گیا ہے لیکن انسان اور انسانیت اپنے دُکھوں کی اس بے توقیری سے اب بھی مضطرب ہے اور شاید ہمیشہ رہے گی۔ میرے جیب و داماں ان الیوں کے ایک بے حد قلیل اور مختصر حصے سے بوجھل اور مالا مال ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اس دولتِ بے پایاں کی جو بھی یادیں ذہن میں محفوظ ہیں ان میں آپ کو بھی شامل کروں۔

اس سب کے علاوہ ''جو یاد رہا'' کا نہ کوئی مقصد ہے، نہ کوئی جواز۔

شکر گزار ہوں محمد مسعود کا جنھوں نے اس مسودے کو توجہ سے دیکھا، زبان و بیان اور چند واقعات کی غلطیوں کی نشاندہی کی، مفید مشورے دیے۔

....

خود نوشت لکھنا خود کو آزمائش میں ڈالنا ہے کہ نفس کبھی کبھی ان عظمتوں اور رفعتوں کا مطالبہ کرتا ہے جن کا دور دور تک وجود نہیں ہوتا اور ضمیر راہِ راست سے ذرا سے انحراف پر سرزنش۔ دھڑکا یہ بھی لگا رہتا ہے کہ اس کشمکش میں نہ جانے کسے، کب، کہاں اور کس قدر بالادستی حاصل ہو جائے۔

ان امور سے قطع نظر، ساری زندگی کے زخموں کو پھر سے کریدنا اور سُکھوں سے ذرا کی ذرا میں محروم ہو جانا اشکبار کر دیتا ہے اور اس سب کو بیان کرنا ایک ایسا تکلیف دہ عمل بن جاتا ہے جس میں سُکھ بھی دکھ کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔

اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ساری زندگی کی دوستیاں، دشمنیاں، کمزوریاں، کوتاہیاں اور کمینگیاں دستک دیتی ہیں اور وقت کا عنصر ان کی صحیح ترجمانی کی راہ میں مشکلیں کھڑی کر دیتا ہے تو ترازو کا پلڑا اپنی طرف جھکنے لگتا ہے۔ یہ ایک بھیانک جنگ ہوتی ہے؛ اپنے آپ سے لڑنا کوئی آسان کام نہیں۔

بہر حال، میرا کام ختم ہوا۔ فیصلہ قارئین کریں گے، جن میں چند شاید ایسے بھی ہوں جو اس سب کے تھوڑے، بہت حصوں سے واقف ہوں اور زیادہ تر وہ ہوں گے جن کے لیے سب کچھ ایک ایسا بیانیہ ہوگا جس سے جذباتی طور پر ان کا کوئی تعلق نہ ہوگا اور وہ فیصلہ واقعات کی داخلی منطق کی بنیاد پر کریں گے کہ یہی سب سے قابلِ اعتماد پیمانہ ہوتا ہے۔

زندگی میں بہت کچھ ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے لیکن اسے لکھنے پر آئیے تو چیزیں آگے پیچھے ہونے لگتی ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ دور دور ہونے والی چیزیں گویا ایک ساتھ ہوتی ہوئی معلوم

ہوتی ہیں یہی ''جو یاد رہا'' میں بھی ہوا ہے۔

دہلی اردو اکادمی اور میرے پیارے دوست قمر رئیس نے یہ کام میرے سپرد کر کے مجھے تقریباً ساری زندگی ایک بار پھر سے جینے کا موقع دیا۔ اکادمی کا شکر گذار ہوں لیکن قمر رئیس کا شکریہ ادا کرنا بھی اب ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ اس کا افسوس ہمیشہ رہے گا۔ مسودہ میں بار بار تبدیلیاں کر کے اکادمی کے کار پردازان — انیس اعظمی صاحب اور راغب الدین صاحب کو بہت پریشان کیا۔ معذرت خواہ ہوں۔

عابد سہیل

اوّلین یادیں

اورئی میں چھوٹا سا ایک درخت ہوتا تھا جس کی شاخوں کو توڑنے یا کاٹنے سے سفید اور کسی قدر گاڑھا سا دودھ بہنے لگتا۔ اس دودھ کو بڑے سے ٹھیکرے پر کئی دن رکھا جاتا اور جب کافی دودھ، جو سوکھ کر سیاہ رنگ اختیار کر لیتا، جمع ہو جاتا تو اس سے گیند بنائی جاتی۔ یہ گیند جو کالے رنگ کی ہوتی اور بدصورت لگتی، زمین یا کسی سخت چیز پر زور سے ماری جاتی تو خوب اچھلتی۔

مہینوں کی محنت اور انتظار کے بعد میں نے بھی ایک گیند بنائی تھی۔

سڑک کے اس پار وہ مکان تھا جس میں ہم لوگ اورئی (ضلع جالون) میں بطور کرائے دار رہتے تھے۔ محلّے کا نام تو یاد نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ ان دنوں وہ محلّہ شہر کے اس آخری کنارے پر تھا جہاں سے کچہری بہت قریب تھی۔ ان دنوں ابا کچہری میں زیادہ سے زیادہ ہیڈ کلرک رہے ہوں گے کیوں کہ بالادین یا کوئی اور چپراسی ان کے ساتھ بستہ لے کر نہیں آتا تھا۔

ہمارے مکان کے سامنے، سڑک کی دوسری جانب، ایک لمبا چوڑا چبوترا تھا اور اس پر بہت بڑا مکان۔ یہ چبوترا اتنا اونچا تھا کہ پانچ چھے زینے طے کرنے کے بعد ہی اس پر پہنچا جا سکتا۔ ایک دن شام کے وقت میں اپنی گیند لے کر باہر نکلا، ہنستا مسکراتا۔ گیند کو دو چار ٹپے دیے، اسے لوکا اور پھر جو اسے زور سے زمین پر مارا تو وہ چبوترے کے چھوٹے سے کنویں کی مینڈ سے ٹکرائی اور دیکھتے دیکھتے جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اسے مینڈ سے ٹکرا کر کنویں سے دور ہوتے ہوئے میں نے دیکھا تھا اور سوچا بھی نہ تھا کہ غائب ہو سکتی ہے لیکن جانے کہاں چلی گئی۔ میں اسے اس وقت تک تلاش کرتا رہا جب تک اندھیرا اتر نہ آیا اور پھر روہانسی صورت بنائے گھر لوٹ آیا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اگلی صبح بھی اپنی گیند تلاش کی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اس کا ملنا مشکل ہے میری آنکھیں اسے ہفتوں بلکہ مہینوں ڈھونڈھتی رہیں۔ یہ بات غالباً ۱۹۳۸ء کی ہے۔ اس وقت میں مشکل سے پانچ ساڑھے پانچ برس کا رہا ہوں گا۔

چوہتر پچھتر سال ہونے کو ہیں لیکن میری آنکھیں اب بھی اس گیند کو تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اس کی یاد اب بھی آتی ہے۔

کوئی مجھے میری وہ گیند ڈھونڈھ کے لادے۔

اس مکان کے باہر کے کمرے میں دادے ابا رہتے تھے۔ وہ گھر میں کم آتے۔ یا شاید بالکل نہیں۔ میں نے انھیں گھر کے اندر کبھی نہیں دیکھا۔ یہ کمرا ایک چھوٹے سے کمرے کے ذریعے بھی باقی گھر سے ملا ہوا تھا لیکن مجھے نہیں یاد کہ میں نے اس کے دروازے کو آمد ورفت کے لیے استعمال کرتے ہوئے کبھی کسی کو دیکھا ہو۔

دادے ابا کے اس کمرے سے ان کی پان کی ڈبیا میں لگے ہوئے پان، سوکھے کتھے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، ڈلی، لونگ اور الائچی رکھوانے کے لیے میں ہی گھر میں لے جاتا اور واپس بھی لاتا۔ یہ پان دادی امّاں لگاتیں۔ وہ کشمیری تھیں، سرخ، سفید۔ وہ سر جھکائے جھکائے پان لگاتیں تو میں انھیں ایک ٹک دیکھا کرتا۔ اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ اس ڈبیا میں پان اور ڈلی کے ساتھ اپنی ساری محبت بھی رکھ دیتی تھیں۔

ایک دن پان کی ڈبیا لے کر دوڑتا ہوا واپس جا رہا تھا کہ میرا پیر پھسلا اور سر اس پتلی سی نالی میں گھس گیا جو بیس پچیس فٹ لمبے اور دس بارہ فٹ چوڑے راستے کو دو حصّوں میں بانٹ دیتی تھی۔ نالی کی دوسری جانب غسل خانہ اور آب خانہ تھا۔ میرے رونے کی آواز سنتے ہی دادے ابا اپنے کمرے سے اور دوسرے لوگ اندر سے آگئے۔ اس کے بعد کیا ہوا کچھ یاد نہیں، علاوہ اس کے کہ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر میں شاید بے ہوش ہو گیا اور ڈاکٹر کے یہاں لے جایا گیا۔ سر میں اب تک جو دو گومڑ ہیں وہ اسی واقعے کی یادگار ہیں۔ اب اُس وقت کی تکلیف بھی یاد نہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ پان کی اس چمکدار ڈبیا کا ڈھکنا الگ ہو گیا تھا اور یہ کہ دادے ابا مرتے مر گئے لیکن نہ انھوں نے اس ڈبیا کی مرمّت کرائی نہ دوسری خریدی۔

بعد میں، مَیں نے انھیں پان کھانے کے لیے اپنی ڈبیا کھولتے، ڈھکنا اُٹھا کے اپنے گھٹنوں کے پاس رکھتے، سرخ کپڑے میں سے لگا ہوا پان نکالتے اور میری جانب مسکرا کر ایک نظر ڈالتے ہوئے بارہا دیکھا۔ اس مسکراہٹ میں افسوس اور شرمندگی کی ایک لکیر بھی ہوتی تھی۔

یا اللہ! پہلے کے لوگ کیسے ہوتے تھے جو اپنے غموں کو مسکراہٹوں میں اس طرح لپیٹ

لیتے۔ وہ لوگ جانے کہاں چلے گئے۔

بسم اللہ

اسی مکان میں میری بسم اللہ ہوئی تھی لیکن اس تقریب کی تفصیلات یاد نہیں، علاوہ اس کے کہ مجھے نہلا دھلا کر خوب اچھے کپڑے پہنائے گئے تھے اور مولوی صاحب نے کئی بار مجھ سے ''بسم اللہ'' کہلایا تھا اور سب سے پہلے مجھے مٹھائی کھلائی گئی تھی۔

قرآن شریف پڑھانے کا کام تو خیر اماں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا لیکن اردو اور حساب یا گنتی پڑھانے اور رٹانے مولوی صاحب آنے لگے۔ مجھے جانے کیوں وہ اچھے نہ لگتے اور میں کتاب کاپی چھپا دیتا اور جب مولوی صاحب آجاتے تو روتا جاتا اور اس جگہ کے علاوہ جہاں انھیں چھپایا ہوتا باقی ساری جگہوں پر انھیں ڈھونڈھتا۔ کچھ دنوں میں سب کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ کتاب رکھ کے بھول نہیں جاتا بلکہ چھپا دیتا ہوں۔ ایک دن دادے ابا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو مولوی صاحب آرہے ہیں۔ جلدی سے کاپی کتاب چھپا دو''۔

یہ کہہ کر وہ مسکرائے تھے، کچھ ایسے جیسے مجھے چڑا رہے ہوں۔ لیکن اس میں بھی بس محبت ہی محبت تھی۔

ہم لوگ اس مکان سے کب اور کیوں بڑی مسجد نامی محلّے کے مکان میں منتقل ہوئے قطعاً یاد نہیں، البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ نئے مکان کے سامنے والے چھوٹے سے میدان کے تقریباً بیچوں بیچ ایک چبوترا تھا جسے چوک کہا جاتا اور نویں محرم کی رات میں مختلف رنگوں کے کپڑوں کی چوڑی پٹیوں کی بٹی ہوئی ڈوریوں سے سجا سجایا رنگ برنگا تعزیہ اس پر رکھ دیا جاتا اور اگلے دن محرم کے جلوس میں وہ سب سے آگے رہتا اور بڑا تعزیہ کہلاتا۔ یہ تعزیہ ان لوگوں کا ہوتا جنھیں لوگ خلیفہ کہتے۔

اورئی میں تعزیہ داری کی ساری دھوم دھام اور رونق انھی کے دم قدم سے ہوتی۔ وہی خوب اونچی اونچی چھڑیں نکالتے جو رنگ برنگے کپڑوں میں لپٹی ہوتیں اور جن کے اوپر، بالکل اوپر، سبز رنگ کے کپڑوں کی دھجیوں کا ایک جھومر سا ہوتا جس کی چمکدار پنیاں جھلملاتیں۔ یہ جھومر حضرت امام حسین کی سربلندی کی علامت ہوتا۔ یہ چھڑ بھی کمال کی چیز ہوتی۔ اسے پچیس تیس لوگ

مل کر زمین سے، جس پر دریاں بچھی ہوتیں، سیدھی کرتے اور پھر توازن قائم رکھنے کے لیے آنکھیں چھڑ کی اوپر کی پھننگلی پر جمائے جمائے قادر میاں نے ہاتھوں کے اس کٹورے میں جو وہ اپنے ہاتھ کی دسوں انگلیاں ایک دوسرے میں کس کر بنا لیتے، رکھ دیتے۔ اس کوشش کی کامیابی پر، اور وہ ہمیشہ ہی ہوتی، نعرۂ حیدری بلند ہوتا اور کبھی کبھی نعرۂ تکبیر بھی۔ قادر میاں کی نظریں چھڑ کے بالکل اوپر کے حصے پر جمی رہتیں اور وہ اپنے قدموں کو آگے پیچھے، دائیں بائیں کر کے اس کا توازن قائم رکھتے اور جلوس میں سب سے آگے، لیکن تعزیوں کے پیچھے رہتے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جلوس رُک جاتا اور وہ اپنے جسم کو سنبھالتے، دو قدم آگے بڑھتے، دو قدم پیچھے ہوتے، ایک آدھ قدم دائیں بائیں ہوتے اور بجلی کی تیزی سے جھک کر جانے کیسے چھڑ کو کندھے پر منتقل کر دیتے۔ جلوس دوبارہ روانہ ہوجاتا، تھوڑی دیر بعد پھر رُکتا اور چھڑ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل ہوجاتی۔

جلوس میں قدرے چھوٹی اور بہت چھوٹی چھڑیں بھی ہوتیں۔ انھیں وہ لوگ اٹھائے ہوتے جنھیں مستقبل میں بڑی چھڑ سنبھالنی ہوتی۔ یہ سارے لوگ قادر میاں کے خاندان ہی کے ہوتے۔

اس سارے دوران جوش اور تقدس میں ڈوبے ہوئے نعرے بلند ہوتے رہتے اور غفور میاں جو پیشے سے پان فروش تھے اپنی گردن میں لٹکے ہوئے بہت بڑے تاشے پر دونوں ہاتھوں سے کس کس کر چوب زنی کرتے اور ان سے پیدا ہونے والی آواز متبرک نعروں سے ہم آہنگ ہوجاتی۔ غفور میاں تاشہ بجاتے بجاتے پہلے جھکتے پھر دھیرے دھیرے زمین پر لیٹ جاتے لیکن اس طرح کہ تاشے سے نکلنے والی آواز ایک لمحہ کے لیے نہ رکتی۔ انھیں یہ کمال حاصل تھا کہ چاہتے تو تاشے کی آواز کو اس قدر بلندی عطا کر دیتے کہ لگتا کان پھٹ جائیں گے اور چاہتے تو اس قدر مدھم کہ وہ ہوا کی لہروں پر بہنے لگتی۔ آواز کے اس اتار چڑھاؤ میں ایک التزام ہوتا جو چھڑ کی نقل و حرکت اور نعروں سے ہم آہنگی کا پتہ دیتا۔

چھڑ کی اونچائی کے بارے میں کیا کہوں لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ چار منزلہ عمارت سے اونچی تو ہوتی ہی ہوگی۔

برقع پوش مسلم خواتین اور وہ جو برقع نہ پہنے ہوتیں اور ان سے زیادہ ہندو عورتیں، جو چادر سے اپنے سروں کو ڈھکے رہتیں، سڑک کے کنارے، مکانوں کے چبوتروں، کھڑکیوں،

دروازوں اور چھجوں سے یہ جلوس دیکھتیں اور آگے بڑھ کر نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ تعزیوں اور چھڑوں کو بے حد آہستگی سے چھوتیں اور ہاتھ اپنے چہروں پر پھیر لیتیں۔

عشرے کے دن شہر کے تقریباً سارے مسلمانوں اور سیکڑوں ہندوؤں کے گھروں میں تعزیے ٹھنڈے کیے جانے کے بعد ہی کھانا پکتا، اور بہت سے گھروں میں کھچڑا جو بے سروسامانی کی علامت ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دوست شیام سندر شرما کے والد جو برہمن تھے اور پیشے سے وید، سبز کرتا، سبز ٹوپی اور سفید پے جامہ پہنے جلوس کی اگلی صفوں میں ہوتے اور ایسا لگتا کہ ان کا ہاتھ سینے سے چپک کے رہ گیا ہو۔

اورئی میں شیعہ آبادی بہت کم تھی جن میں شرفائے گھر بمشکل دس پندرہ رہے ہوں گے۔ ان میں چند گھر اتھائی پر تھے جہاں ایک امام باڑا بھی تھا۔ یہاں زہرہ خالا کے گھر میں اماں مجلس پڑھتیں اور مجھے بھی اس میں شامل کر لیا جاتا اور جب اماں اور دوسری عورتیں

دربار میں کھڑی ہیں سر کو جھکائے زینب
ظالم دکھا رہا ہے بھائی کا سر بہن کو

پڑھتیں تو آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوتیں اور چہرے آنسوؤں سے تر ہو جاتے۔

درجنوں مجلسوں اور میلادوں میں اماں کے ساتھ شریک ہونے کے باوجود شیعہ۔ سنی اختلافات سے بالکل ناواقف تھا اور اختلافات کی شدت اور ان کی پروردہ لعنتوں کو لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد ہی جان سکا اور وہ بھی بس ایک حد تک۔

چوک کے ایک جانب مسجد تھی اور دوسری طرف ایک ٹوٹا پھوٹا امام باڑا جس میں بڑا تعزیہ تیار کیا جاتا... سال کے باقی دنوں میں وہ بڑی سی پالکی، جسے بڑے تعزیے کا ڈھانچہ کہا جا سکتا ہے، اسی امام باڑے میں رکھی رہتی۔

سامنے کے میدان اور آس پاس کے بیشتر گھروں سے پتنگیں اڑائی جاتیں۔ اورئی میں پتنگوں کا بہت رواج تھا اور برسات کے دنوں میں بھی بارش رکتی تو ذرا سی دیر میں رنگ برنگی پتنگیں آسمان میں لہرانے لگتیں۔ کبھی کوئی پتنگ میرے گھر میں گر جاتی اور کوئی لینے نہ آتا تو میں اسے اڑانے کی کوشش کرتا۔ کسی سے چھڑیاں دلواتا لیکن پتنگ ایک بار داہنے جاتی اور دوسری بار بائیں اور پھر جوڈ بکی لگاتی تو منڈیر سے ٹکرا کر اس کی کانپ ٹوٹ جاتی۔ پتنگ اڑانا سیکھنے کے لیے چار آنے مہینے کے حساب سے ایک پتنگ باز کی خدمات بھی حاصل کیں لیکن کبھی اسے چھت پر

اونچائی تک بھی نہ پہنچا سکا... آج بھی آسمان پر پتنگیں اڑتی ہوئی دیکھتا ہوں تو دل میں یہ حسرت کروٹیں لینے لگتی ہے کہ کم سے کم ایک پیچ تو لڑا ہی لیا ہوتا لیکن زندگی میں ایک بھی پیچ نہ لڑایا اور جب جب اس کی نوبت آئی میدان خالی چھوڑ دیا۔

دو ڈھائی سال بعد ہم لوگ اس مکان میں منتقل ہو گئے جو ہمارے مکان کی پشت پر تھا اور سڑک سے پچیس تیس فٹ اندر۔ بڑی مسجد اس کے داہنی جانب تھی جس کے سامنے مغرب کی نماز کے بعد پھونک ڈلوانے والوں کی دو رویہ قطار لگتی۔ ان قطاروں میں غریب مرد اور عورتیں ہوتیں جو بچوں کو گود میں لیے یا کندھے سے لگائے نماز ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتیں۔ نماز ختم ہوتی اور نمازی ان پر پھونک ڈالتے تو بچوں کی سمجھ میں کچھ نہ آتا اور وہ انھیں ٹکر ٹکر دیکھا کرتے۔ اب یہ منظر کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے، اگرچہ مسجدیں نمازیوں سے چھلکی پڑتی ہیں۔

پلیٹیئر صاحب

مسجد کے پاس ہی ایک مکان تھا جس کے باہر چھوٹی سی نیم پلیٹ پر لکھا ہوا تھا ''محمد اسحٰق پلیٹیئر'' لفظ ''پلیٹیئر'' میری سمجھ میں نہ آتا لیکن جب اس گھر کی خواتین اور والدہ کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ٹرین کی پٹریوں کی دیکھ بھال کا کام جو لوگ کرتے ہیں ان کے سربراہ کو ''پلیٹیئر'' کہا جاتا ہے۔

پھر ایک دن پلیٹیئر صاحب مجھے اپنی گاڑی میں سیر کرانے کے لیے اسٹیشن لے گئے۔ ٹرالی پر لوہے ہی کی ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جو غالباً اس سے پیوست تھی۔ میرے لیے ایک کرسی رکھی گئی اور اسے ایک مزدور نے اپنے اور اپنے دو تین ساتھیوں کے انگوچھوں سے پلیٹیئر صاحب کی کرسی سے اوپر اور نیچے کس کے باندھ دیا۔ ٹرالی پر ایک چھوٹا سا لال جھنڈا لگا ہوا تھا۔

پہلے کچھ مزدوروں نے جو خلاصی کہلاتے، اس گاڑی کو اس جگہ سے جہاں پلیٹ فارم ختم ہوتا تھا اٹھا کر پٹریوں پر رکھا، پھر اسحٰق صاحب جن کا رنگ آبنوسی تھا اور جو ناک پر نیچے کی طرف چشمہ جمائے ہوئے تھے، میری انگلی پکڑ کے آگے بڑھے، پہلے مجھے بٹھایا پھر اپنی کرسی پر بیٹھے۔ انھوں نے پیروں کے پاس رکھے ہوئے چند اوزاروں پر، جن میں ایک ہتھوڑا بھی تھا، نظر ڈالی اور خلاصیوں سے ٹرالی دوڑانے کے لیے کہا۔ دو تین خلاصیوں نے ٹرالی دوڑانا شروع کی اور

جب اس کی رفتار خاصی تیز ہوگئی تو وہ اُچک کر اُس پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت میری نظر اس سرخ کپڑے پر پڑی جو اسحٰق صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے جوں ہی وہ کپڑا زمین پر گرایا ایک خلاصی نے لوہے کا ہتھا جو ٹرالی پر لگا ہوا تھا کھینچا اور وہ ذرا دور جا کے رُک گئی۔ اب اسے دھکا دے کر اس جگہ کے قریب لایا گیا جہاں وہ کپڑا گرایا گیا تھا۔ پلیٹیئر صاحب نے ناک پر چشمہ درست کیا اور ایک مزدور سے جو ہتھوڑا لیے ہوئے کھڑا تھا ایک پٹری پر باہر سے ہلکی سی چوٹ لگانے کے لیے کہا۔ یہ عمل دونوں پٹریوں پر کیا گیا، دوسری پر اندر کی جانب سے۔ پھر اس جگہ ٹرالی کئی بار آگے پیچھے دوڑائی گئی۔ اس سارے دوران اسحٰق صاحب کرسی پر ذرا آگے کھسک کے اپنا سر جھکائے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح کا کام دو تین جگہ تو ضرور کیا گیا ہوگا۔ مجھے بہت مزا آیا۔

ان دنوں شرفا میں حدِ ادب کے سلسلے دراز ہوتے لیکن ہمارے گھر میں تو حالات انتہاؤں پر تھے۔ میں نے ابا کو دادے ابا سے بات کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ دادے ابا کو دیکھتے ہی سر جھکا لیتے اور ذرا ساہٹ کر نکل جاتے۔ ایک دن میں ابا کی انگلی پکڑے ہوئے بازار سے آ رہا تھا۔ معلوم نہیں دادے ابا وہاں کہاں سے پہنچ گئے کیوں کہ وہ جامع مسجد اور اپنے دوست احمد حسن صاحب کے گھر کے علاوہ، جو مسجد کے پاس تھا، اور کہیں نہیں جاتے تھے۔ میں بھول گیا، وہ کبھی کبھی پوسٹ آفس بھی جاتے۔ دادے ابا پر نظر پڑتے ہی ابا نے اپنی انگلی کو جلدی میرے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ ان کے ہاتھ کی سرسراہٹ یہ جملہ لکھتے وقت بھی محسوس کر رہا ہوں۔ باپ بیٹے کے درمیان نامہ و پیام کے مرحلے میرے یا دادی لمّاں کے ذریعے طے ہوتے۔

ہمارے دادیہال میں علم و ادب کی کوئی روایت نہ تھی۔ دادے ابا مڈل پاس تھے اور ہوتے ہوتے قانون گو اور رٹائرمنٹ سے چند ماہ قبل نائب تحصیل دار ہو گئے تھے لیکن کہلائے وہ ہمیشہ ''قانون گو صاحب'' ہی۔ ابا ہائی اسکول تھے لیکن ان کے بڑے بھائی، فتحیاب حسن، بی۔ اے ضرور رہے ہوں گے، ورنہ حکومت یو پی میں اعلیٰ افسر کیسے بنتے اور کلے اسکوائر میں، جو پہلے ریاست کے افسروں کی کالونی تھی، ان کا مکان کیسے ہوتا۔

ابا کی تعلیم کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ ہے لیکن اس کا ذکر بعد میں کروں گا ورنہ بات

کہاں کی کہاں نکل جائے گی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے دادیہال میں پڑھنے لکھنے کا کوئی خاص چرچا نہ تھا لیکن نانیہال میں مطالعے کی روایت میں، کم سے کم مذہبی کتب، خاص طور سے فقہ اور خانقاہی سلسلے سے متعلق کتابیں، ضرور شامل تھیں۔ جونپور میں ہمارا نانیہالی مکان خانقاہ رشیدیہ سے ملحق بلکہ ایک طرح سے اس کا ایک حصہ ہے۔ اس مکان کی کئی الماریوں اور طاقوں میں کتابوں کی موجودگی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ شاید اسی سبب لماں کو مطالعے کا شوق تھا، خاص طور سے ان کتابوں اور رسائل کا جو خواتین سے متعلق ہوں۔ چنانچہ عصمت، کامیاب، اور شاید خاتون مشرق ہمارے یہاں آتے تھے۔ کچھ کتابیں بھی ہمارے اور ئی کے گھر میں تھیں، میرا خیال ہے کہ شمیم اور انور قسم کی ناولیں رہی ہوں گی۔ ہاں یاد آیا، مولوی نذیر احمد کی دو تین کتابیں بھی ہمارے گھر میں تھیں اور ان میں سے کسی میں ایک مکالمہ پڑھ کر ہم لوگ..... میں، انوری آپا اور اختری آپا، خوب ہنستے تھے، لیکن لماں سے چھپ کر۔ وہ جملہ کچھ اس قسم کا تھا: "نکلتی ہے یا دھکے دے کر نکالوں۔" ہمارے یہاں اس قسم کی زبان معیوب سمجھی جاتی اور بزرگوں کے سامنے عورتوں کے زور سے بولنے اور ہنسنے کا تو تصور بھی ممکن نہ تھا۔

لبا سیاست کی باتیں کبھی نہ کرتے، شاید سرکاری ملازمت کے سبب، لیکن ان کا رجحان کانگریس کی طرف تھا اور شاید اسی لیے وہ "مدینہ[1]" منگاتے تھے جو بجنور سے ہفتے میں دوبار شائع ہوتا۔ بچوں کا رسالہ "غنچہ" بھی اسی ادارے سے نکلتا تھا اور وہ میرے لیے منگایا جاتا تھا۔

"مدینہ" کی پیشانی پر یہ شعر لکھا ہوتا:

معجزہ شق القمر کا ہے "مدینہ" سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

اس شعر کا پیچ تو نہ کھلتا لیکن اچھا لگتا۔ پھر جب نویں درجہ میں پہنچا اور بطور مضمون اردو کے علاوہ فارسی پڑھنا شروع کی تو ایک دن آپ ہی آپ "م" اور "ہ" کے درمیان "دین" ابھر آیا اور چاند چمکنے لگا۔

رسائل اور اخبار تو شاید ڈاک سے آتے لیکن ان دنوں کتابوں کی فروخت کا طریقہ کچھ

---

[1] "مدینہ" کے مالک و مدیر کا بیٹا زبیر گرسچین کالج میں میرا کلاس فیلو تھا، غالباً صرف انگریزی کے درجے میں۔ ہم دونوں میں گہری دوستی تھی۔

عجیب سا تھا۔ بڑے شہروں میں اُردو کی کتابوں کی دوکانیں ضرور رہی ہوں گی لیکن نوری میں اس طرح کی کوئی دوکان نہیں تھی۔ یہ بات شاید ۱۹۳۹ یا ۱۹۴۰ء کی ہے لیکن اس کے تقریباً آٹھ سال بعد بھی جب میں وہاں سے ہائی اسکول پاس کرکے لکھنؤ آیا صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور اب تو یہ تقریباً ناممکن ہے۔

ان دنوں کتابیں، کم سے کم اُردو کی کتابیں، گھر گھر جا کر فروخت کی جاتیں۔ لوگ، جو ممکن ہے ناشروں کے ملازم ہوتے ہوں، کتابیں لے کر شہروں شہروں گھومتے اور انھیں فروخت کرتے۔ کسی شہر میں پہنچنے کے بعد وہ ان لوگوں کے نام اور پتے معلوم کرتے جنھیں پڑھنے کا شوق ہوتا اور پھر ان کے گھروں پر جاتے۔ پہلے پسند معلوم کرتے اور اسی کے مطابق کتابیں گھروں میں بھیجتے۔ لیکن کتابیں بھیجنے سے پہلے انھیں گن لیتے اور اتنی اونچی آواز میں کہ اندر والے بھی سن لیں کتابوں کی تعداد کا اعلان بھی کردیتے۔ یہ شاید کسی تلخ تجربے کا نتیجہ ہوگا۔ خواتینِ خانہ کو کتابیں پسند نہ آتیں تو بھی مروتاً ایک آدھ تو خرید ہی لی جاتی۔ میری موجودگی میں امّاں نے دو تین مرتبہ میں چھے سات کتابیں خریدی تھیں۔

فیاض بھائی

میری امّاں، ابّا کی دوسری بیوی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی محی الدین پور ہی کی تھیں۔ ان سے تین اولادیں تھیں، اختری، انوری اور فیاض حسن جنھیں میں اختری آپا، انو آپا اور فیاض بھائی کہتا۔ دونوں بہنیں مجھے بہت چاہتی تھیں اور یہی رویہ ان کا امّاں کی طرف بھی تھا۔ امّاں بیمار پڑتیں تو دونوں ان کی بہت خدمت کرتیں اور طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو روتیں۔ لیکن فیاض بھائی کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ ہم لوگوں سے ناراض تو نہ رہتے مگر اپنے اوڑھے ہوئے پاگل پن کے نتیجے میں طرح طرح کی حرکتیں کیا کرتے۔

فیاض بھائی بالکل ابّا کی شکل پر گئے تھے۔ وہ دوسری جنگ عظیم سے ذرا پہلے فوج میں بھرتی ہونے کے سال ڈیڑھ سال بعد بھاگ آئے تو ان کی تلاش شروع ہوئی۔ دو ایک بار کچھ فوجی انھیں ڈھونڈتے ہوئے ہمارے گھر بھی آئے لیکن وہ ملے نہیں۔ پھر بھی ان کی تلاش جاری رہی۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ پاگل بن گئے اور پھر پاگلوں کی نقل کرتے کرتے ان پر پاگل پن کا

خاصا اثر نظر آنے لگا لیکن انھوں نے اپنی سدھ بدھ کبھی نہ کھوئی اور بکارِ خویش ہمیشہ ہشیار رہے۔

ابا اورئی کے کلکٹریٹ میں پیشکار (چیف ریڈر) ہو گئے تھے جو کوئی بڑا عہدہ نہ تھا لیکن ان دنوں، کم سے کم چھوٹی جگہوں پر، پیشکار بہر حال اہمیت کا مالک ہوتا۔ فیاض بھائی کبھی گرفتار نہیں کیے جا سکے۔ میرا خیال ہے فوج کے سپاہی یہ کام پولس کے حوالے کر کے چلے جاتے ہوں گے اور وہ دیکھی اَن دیکھی کر دیتی ہوگی۔ ان کے پکڑے نہ جانے میں ابا کی پیشکاری کا دخل ضرور رہا ہوگا ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ پولس انھیں پکڑ نہ پاتی۔ وہ دن بھر اورئی میں گھوما پھرا کرتے۔ ہر شخص انھیں یا تو ابا کے حوالے سے جانتا تھا یا ان کے جھوٹے پاگل پن کی معصومانہ حرکتوں کی وجہ سے، معصومانہ میں نے یوں کہا کہ وہ نہ کسی کو مارتے پیٹتے تھے نہ نقصان پہنچاتے لیکن چھوٹی موٹی شرارتیں ضرور کرتے جیسے کسی کا جوتا اٹھالے گئے اور دو دن بعد واپس کر دیا، کسی کے سر سے ٹوپی اُچک لی اور اپنے سر پر لگانے کے بعد یہ کہتے ہوئے واپس کر دی کہ چھوٹی ہے...

لیکن انھوں نے ایک بڑی شرارت بلکہ جرم بھی کیا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے کچھ دنوں بعد چیزوں کی قیمتیں بڑھنے لگیں اور پھر اجناس کی قلت کا دور شروع ہوا۔ حکومت نے راشننگ کا نظام نافذ کر دیا اور اپنی ایمانداری کی شہرت کی وجہ سے ابا کو سپلائی افسر بنا دیا گیا۔ پیشکاری ''دستِ غیب'' کہلاتی تھی اور سپلائی افسری ...اس میں تو ہن برس سکتا تھا۔ لیکن نہ برسا۔ وہ ایماندار تھے یا نہیں یہ بتانا میرے لیے مشکل ہے کیوں کہ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ان کے سپلائی افسر ہو جانے سے ہماری زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی ایمانداری کی وجہ سے کچھ لوگ ان کے مخالف بھی ہو گئے تھے، خاص طور سے وہ جو اُن کے ماتحت تھے، کیوں کہ ان کی وجہ سے وہ غلط قسم کے فائدے نہیں اٹھا پاتے لیکن ابا نے ایک غلط کام بھی کیا تھا، لاکھا سے ایک غریب چپراسی کی مدد کرنا کہا جائے۔

کچہری میں عبدالشکور نام کا ایک شخص جو روزے نماز کا سخت پابند تھا ابا کا چپراسی تھا، ابا کا کیا عدالت کا۔ وہ اور اس کی بیوی بچے کبھی کبھی ہمارے یہاں آتے تھے۔ ابا کو معلوم تھا کہ اس کے آٹھ بچے ہیں اور وہ زندگی بہت تنگی ترشی سے بسر کرتا ہے۔ ابا رحم کھا کر اس کی بدعنوانی کی اَن دیکھی کرنے لگے۔ وہ موکلوں سے چونی اٹھنی اکثر حاصل کیا کرتا۔

اس رشوت سے قطع نظر، عبدالشکور بے حد معصوم قسم کا مسلمان تھا۔ اسے چونی، اٹھنی،

غرض جو بھی ملتا خزانے میں جا کر فوراً بدل لیتا، یعنی اس کے بجائے دوسرا سکہ حاصل کر لیتا اور کہتا، ''میں حرام کا پیسہ اپنے پاس نہیں رکھتا۔'' اس کو یہ دعوا کرتے ہوئے خود میں نے سنا تھا۔ اس کی بیوی بھی جو کبھی کبھی اپنے دو چار بچوں کے ساتھ ہمارے یہاں آتی، یہی سمجھتی تھی کہ تبدیل کر لینے کے بعد پیسہ حرام کا نہیں رہ جاتا۔ اماں اس کے اس دعوے پر چپکے چپکے ہنستی تھیں۔

ایک بار ابا نے دو تین دن کی چھٹی لی۔ فیاض بھائی مفرور فوجی ہونے کے سبب گھر میں رہتے تو نہ تھے لیکن دن میں ایک آدھ چکر ضرور لگا لیتے۔ انھیں جیسے ہی ابا کی چھٹی کے بارے میں معلوم ہوا وہ دس سیر شکر کے پرمٹ کی درخواست لے کر دفتر گئے جہاں ماتحت افسر نے صرف اس خیال سے کہ وہ سپلائی افسر کے بیٹے ہیں انھیں پرمٹ دے دیا۔ ان دنوں شکر کی سخت قلت تھی اور بلیک میں بہت مہنگے داموں فروخت ہوتی۔ اس کے اصل خریدار حلوائی ہوتے۔ راشن کی دوکان کے ٹھیک سامنے ایک حلوائی کی دوکان تھی۔ یہ دونوں دکانیں مجھے یاد ہیں اور میں ذرا سا سوچ کر بتا سکتا ہوں کہ تالاب سے کتنے قدم دور تھیں۔ فیاض بھائی نے حلوائی سے معاملات طے کیے اور اسی سے روپے اور کپڑا لے کر راشن کی دوکان پر پہنچ گئے اور شکر خرید لی۔ اس دوران وہ سپاہی جو نگرانی کے لیے وہاں تعینات تھا خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا لیکن جیسے ہی انھوں نے پوٹلی حلوائی کے حوالے کر کے اس سے اپنے حصے کے پیسے لیے اس نے انھیں پکڑ لیا۔ فیاض بھائی بڑی مضبوط کاٹھی کے تھے۔ انھوں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور جب اس نے انھیں دوبارہ پکڑنا چاہا تو انھوں نے اسے گود میں بھر کے پاس والے تالاب میں، جو دوسری جانب سے ڈی۔اے۔وی۔کالج کے سامنے تھا، پھینک دیا۔

یہ خاصا سنگین معاملہ تھا اور سب کے سامنے ہوا تھا لیکن فیاض بھائی بہر حال پیشکار صاحب اور سپلائی افسر کے بیٹے تھے۔ شاید بے چارے سپاہی نے رپورٹ نہیں لکھائی اور کچھ بھی نہ ہوا۔

ابا کو معلوم ہوا تو انھیں بہت تکلیف پہنچی۔ وہ خاموش قسم کے انسان تھے۔ چیخے چلائے تو نہیں لیکن انھوں نے گھر میں فیاض بھائی کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ اماں نے بہت کہا لیکن ابا نہ مانے۔ اماں ڈرتی تھیں کہ لوگ کہیں گے سب کچھ سوتیلی ماں کے اشارے پر ہو رہا ہے۔

ان دنوں گھروں کے دروازے دن کے وقت بھیڑے چاہے جاتے رہے ہوں مگر انھیں اندر سے بند نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب ہمارے یہاں باہر کا دروازہ باقاعدہ بند کیا جانے لگا۔

اپنی ساری دیوانگی کے باوجود فیاض بھائی ابا سے بہت ڈرتے تھے اور ان کی موجودگی میں گھر میں نہ آتے لیکن کبھی موجود ہوتے اور ابا آ جاتے تو وہ سر جھکا کر ان کے سامنے سے ہٹ جانے کی کوشش کرتے۔ ابا بھی دوسری طرف دیکھنے لگتے۔ لیکن اب تو ان کے آنے پر پابندی لگ چکی تھی۔

ایک دن انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا جو ابا کے حکم کے مطابق کھولا نہ گیا۔ وہ دروازہ کھٹکھٹاتے رہے، پھر انھوں نے کہا، ''بھوک لگی ہے، کل سے کھانا نہیں کھایا۔'' یہ سن کر امّاں رونے لگیں اور انھوں نے انو آپا سے، جو، ان دنوں آئی ہوئی تھیں کہا، پیشکار صاحب (امّاں ابا کو پیشکار صاحب ہی کہتی تھیں) نے کھانے پر تو پابندی نہیں لگائی ہے، منیر کی امّاں سے کہو کھانا نکال دیں، اوپر کی کھڑکی سے چھینکے سے لٹکا دوں گی۔ غرض امّاں نے اس طرح انھیں کھانا پہنچا دیا اور یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہا، لیکن یہ بات ابا کو معلوم ہوگئی اور انھوں نے امّاں کو منع کر دیا کہ وہ انھیں اس طرح کھانا نہ پہنچائیں۔ کئی دنوں تک فیاض بھائی آتے رہے، انھیں کھانا نہیں دیا گیا۔ پھر امّاں نے ایک اور راہ نکالی۔ انھوں نے انو آپا سے کہا، ''تمھارے ابا نے مجھے روکا ہے، تمھیں تو نہیں، تم کھانا کھڑکی سے لٹکا دو۔'' یہی ہوا اور فیاض بھائی نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔

افسوس میری چہیتی بہنیں ابا کے انتقال کے چند برس بعد ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں اور میری سگی چھوٹی بہن نجمہ (میمونہ خاتون) علی گڑھ میں دودھ اُبالتے ہوئے ساری میں آگ لگ جانے سے جھلس گئی۔ زخم صرف پانچ فی صدی تھے لیکن موت بہانے ڈھونڈھتی ہے۔ وہ مجھ سے بارہ سال چھوٹی تھی، میں نے اسے گودوں کھلایا تھا۔

بات پھر آگے نکل گئی، کرایے کے اس مکان کی طرف لوٹتا ہوں جو پہلے والے سے بہت بڑا تھا، لیکن پندرہ بیس فٹ لمبی گلی میں۔ صدر دروازہ اس خاصے بڑے کمرے میں کھلتا تھا جس سے ملحق دوسرا کمرا تھا، اس کے بعد ایک بڑا سا کچا آنگن جس کے بیچ میں ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ بائیں جانب تقریباً پچیس تیس فٹ کے فاصلے پر تین کمرے تھے جن میں ہم لوگ رہتے تھے۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں وہ بوا رہتی تھیں جو ہمارے یہاں کام کرتیں، لیکن وہ منیر کی امّاں نہیں تھیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ ممکن ہے ان دنوں وہ اپنی چھوٹی بیٹی کے یہاں کالپی گئی ہوئی ہوں۔

یہ بوا بھی بہت اچھی تھیں۔ مجھے بہت چاہتی تھیں لیکن ان کی محبت خاموش سی تھی، الفاظ سے اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اس مکان میں قیام کے دوران جو مشکل سے سال ڈیڑھ سال کا تھا

ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔

ان دنوں مَیں ایک چھوٹے سے اسکول میں پڑھتا تھا جو شاید ساتویں درجے تک تھا۔ ممکن ہے مڈل اسکول رہا ہو لیکن میں نے وہاں مشکل سے آٹھ دس مہینے ہی پڑھا ہوگا۔ وہاں اُما ناتھ شرما نام کے ایک لڑکے سے جو گورا چٹا تھا اور مجھ سے ایک کلاس آگے، جانے کیسے میری دوستی ہوگئی۔ اس کے والد اورئی کے بڑے وکیلوں میں تھے اور تالاب سے ماموں بھانجے کی قبر کی طرف جانے والی سڑک پر ان کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ اس کوٹھی کے سامنے ایک کار بھی کھڑی رہتی جو اُن کاروں کی طرح کی تھی جن کی تصویریں اب ونٹیج کار ریلی کے موقع پر اخباروں میں چھپتی ہیں۔

شرما کچھ مغرور قسم کا تھا۔ اس عمر میں بھی اس کی کلائی پر گھڑی بندھی رہتی جسے وہ طرح طرح سے سب کو دکھاتا۔ ایک دن اس کی لڑائی ایک ایسے لڑکے سے ہوگئی جو تھا تو غریب لیکن اس سے تگڑا تھا۔ ہاتھا پائی کی نوبت آنے ہی والی تھی کہ شرما نے کہا میں کسی ایسے سے نہیں لڑوں گا جس کے پاس گھڑی بھی نہ ہو۔ اس کا جواب اس غریب کے پاس نہ تھا۔ وہ آبدیدہ ہوگیا۔ شرما کی یہ بات مجھے بری لگی اور جب معاملہ ٹھنڈا ہوگیا تو میں نے اس لڑکے سے کہا تم شرما سے کل لڑنا، میں تمھیں گھڑی لادوں گا۔

اگلے دن میں نے امّاں کی گھڑی بستے میں ڈالی اور اسکول جا کر اس لڑکے کو دے دی۔ گھڑی دیکھ کر اس کے چہرے پر جس طرح کی خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اس کا بیان میرے بس سے باہر ہے۔ اس وقت مجھے یہ بھی نہ معلوم تھا کہ مردوں اور عورتوں کے ہاتھ کی گھڑیاں الگ الگ طرح کی ہوتی ہیں۔ ممکن ہے ان دنوں ایک ہی طرح کی ہوتی رہی ہوں... مزے کی بات یہ ہے کہ لڑائی ہونے کے بجائے ان دونوں میں دوستی ہوگئی۔

گھڑی کے غائب ہونے کا علم امّاں کو دو تین دن بعد ہوا۔ ہر جگہ تلاش کی گئی لیکن ہوتی تو ملتی۔ گھر میں کسی سے اس کے بارے پوچھا بھی نہیں گیا اور پوچھا جاتا بھی تو کس سے۔ گھر میں لوگ ہی کتنے تھے۔ خود امّاں، ابا، میں، انو آپا اور اختری آپا جو اکثر آیا جایا کرتی تھیں اور بوا۔ ان کے علاوہ محلے کی دو چار عورتیں تھیں جن کا آنا جانا لگا رہتا۔ وہ کبھی کچھ سلائی کڑھائی کر جاتیں اور کبھی اپنے کپڑے سی لے جاتیں کیوں کہ ہمارے یہاں سنگر مشین تھی۔ اس گھر میں دادے ابّا کی موجودگی مجھے یاد نہیں آ رہی ہے۔

انھی عورتوں میں سے کسی نے لتاں سے ایک ملّانی جی کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ایسا عمل کرتی ہیں کہ چور کا پتہ چل جاتا ہے بشرطے کہ وہ گھر میں موجود ہو۔ ابّا اس طرح کی باتیں نہیں مانتے تھے۔ لتاں نے ذکر کیا تو مسکرائے اور تھوڑی دیر بعد بولے، رنجیت صاحب (پولیس کے اعلیٰ افسر) کو ان کا نام پتا بتادوں گا۔ ملّانی جی ان کے بہت کام کی ثابت ہوں گی۔ اماں کچھ نہ بولیں لیکن عورتوں کے اصرار پر انھوں نے ایک دن ملّانی جی کو بلا ہی لیا۔ ان کی شکل صورت اچھی طرح یاد ہے۔ وہ گوری چٹی تھیں اور سفید براق کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے تھیں۔ پیروں میں چپل تھی، لیکن پرانی سی۔ وہ برقع نہیں پہنے تھیں بلکہ انھوں نے ایک پرانی سی چادر ... خود کو جیسے لپیٹ رکھا تھا۔ بہت اچھی لگ رہی تھیں، بالکل فرشتوں جیسی۔ معلوم نہیں فرشتوں میں عورتیں ہوتی ہیں یا نہیں لیکن اگر ہوتی ہیں تو ان کے جیسی ہی ہوتی ہوں گی۔

لتاں کو جب اس عمل کے لیے ضروری چیزوں کے بارے میں بتایا گیا تو انھوں نے کہا کہ طشت تو خیر گھر میں ہے ہی اور بڑی سی کیل بازار سے آجائے گی لیکن پرانی چپل کہاں سے ملے گی اور اپنی استعمال کی چپل کو کون خراب کرے گا؟ پھر کسی نے بتایا کہ یہ دونوں چیزیں ملّانی جی اپنے ساتھ لائیں گی تو وہ مطمئن ہو گئیں۔ انھیں یہ سب کچھ شاید ڈرامے ایسا لگتا اور وہ اس کے بارے میں سوچ کر مسکرا دیتیں۔

ملّانی جی نے ان سارے لوگوں پر جنھیں اس عمل سے گزرنا تھا ایک نظر ڈالی اور پوچھا کہ کوئی رہ تو نہیں گیا ہے، یعنی کوئی ایسا جو گھر میں آتا جاتا ہو، تو لتاں نے کہا کوئی نہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ابّا کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا جب کہ اتوار ہونے کے سبب وہ باہر کے کمرے میں موجود تھے۔

ایک چھوٹے سے ''تخت'' پر جو مشکل سے فٹ سوا فٹ اونچا رہا ہوگا چادر بچھا کر طشت رکھا گیا اور تخت کی چوڑائی میں ایک پیڑھی رکھ دی گئی جس پر ملّانی جی بیٹھیں۔ طشت کو پانی سے لبالب بھر دیا گیا۔ ملّانی جی نے اپنے تھیلے سے چپل نکالی۔ کیل اس میں گڑی ہوئی تھی۔

''ایک شخص اِدھر بیٹھے گا،'' انھوں نے تخت کی لمبائی میں ایک طرف اشارہ کیا، ''اور دوسرا اُدھر،'' انھوں نے دوسری طرف اشارہ کیا اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ''اکڑوں بیٹھ کر کیل

کے ماتھے کو بالکل اس کے کونے سے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کھول کے شہادت کی انگلی کے ناخن سے تھامنا ہے۔" انھوں نے پھر ادھر ادھر دیکھا اور کہا، "انگلی کیل کو نہ چھونے پائے اور چپل گھومی اور ناخن اونچا کر کے اسے روکنے کی کوشش کسی نے کی تو سخت گناہ پڑے گا، اوپر سے اللہ دیکھ رہا ہے۔ اور نیچے میں... کیل چور کی طرف گھومے گی۔ (انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اگر دونوں نے مل کر چوری کی ہو تو کیل بے چاری کیا کرے گی)

اب ماحول سنجیدہ ہو گیا، ہر شخص خاموش، پتھر کی مورتی بنا انھیں دیکھتا رہا۔

ملانی جی نے آیتیں پڑھ پڑھ کر طشت کے پانی پر پھونکنا شروع کیا اور جب یہ کام ختم ہو گیا تو انھوں نے دو دو لوگوں کو بھیجنے کے لیے امّاں کی طرف اشارہ کیا۔

امّاں نے کہا کہ سب سے پہلے میں اور میری بیٹی انوری (انّو آپا) اس عمل سے گزریں گے۔ ملانی جی بولیں آپ ہی کی تو چیز کھوئی ہے آپ چور کیسے ہو سکتی ہیں؟ لیکن امّاں نہ مانیں۔ وہ پہلے بھی کہہ چکی تھیں کہ ہو سکتا ہے میں ہی کہیں رکھ کے بھول گئی ہوں یا چار روز اُدھر میلاد میں گئی تھی ممکن ہے کہیں گرا آئی ہوں۔ یہی بات انھوں نے دہرائی تو ملانی جی مان گئیں۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ چیزیں چوری میں نہیں آتیں کیوں کہ ان پر والدہ کی ہر خواہش کا احترام لازم تھا، ان مفتیانِ دین کی طرح جنھوں نے سرمد کے قتل کا فتویٰ دیا تھا۔

چنانچہ اس امتحان سے سب سے پہلے امّاں اور انّو آپا گزریں۔ آیتیں پڑھنے اور لمبی لمبی پھونکیں مارنے کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن چپل اپنی جگہ سے ذرا نہ ہلی۔ گھر میں جتنے لوگ تھے اور وہ بھی جو آتے جاتے تھے سب اس پل صراط سے گزر گئے لیکن کیل اپنی جگہ قائم رہی اور چپل بھی۔ اب باقی بچی تھیں بوا اور وہ دس گیارہ برس کا لڑکا جو باہر کے کام کرتا تھا۔ بوا کے سلسلے میں امّاں پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ ان کو اس آزمائش سے ہرگز ہرگز نہیں گزارا جائے گا لیکن اس کے باوجود بوا خود کو ساہوکار ثابت کرنے کے لیے بار بار آگے بڑھتیں اور امّاں ہر بار انھیں روک دیتیں۔ بوا کو تو خیر ملانی جی معاف بھی کر دیتیں لیکن وہ لڑکا تو انھیں صورت ہی سے چور معلوم ہوتا اور ظاہر ہے اس کے سامنے بیٹھنے والا بھی کوئی ہونا ہی چاہیے تھا۔ چنانچہ اب جو بوا نے اصرار کیا تو امّاں بھی کچھ نہ بولیں۔ دراصل وہ اب اس سارے عمل کو مذاق سمجھنے لگی تھیں اور مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھیں لیکن اسی وقت کیل نے دھیرے دھیرے بوا کی طرف جھکنا شروع کیا اور ملانی جی نے انھیں غصے سے دیکھا تو وہ رونے لگیں۔

ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرے دل کا چور باہر نکل آیا اور میں نے روتے ہوئے کہا۔

''گھڑی میں نے ایک لڑکے کو دے دی ہے۔''

میرے اس جملے سے ساری بساط ہی پلٹ گئی، خاص طور سے یوں کہ میں ضد کر کے، اگرچہ دھڑکتے دل کے ساتھ، کیل اور چپل کو پہلے ہی شکست دے چکا تھا۔ اس انکشاف سے ہوا کے اوسان درست ہوئے اور انھوں نے کھینچ کر مجھے لپٹا لیا۔

میں خود کو چور سمجھ رہا تھا اگرچہ میں نے گھڑی چرائی نہیں تھی، بس اماں کے تکیے کے نیچے سے اٹھا کر اپنے دوست کو دے دی تھی۔

نواب چچا

دادے ابا نواب چچا سے کچھ ایسے خوش نہ تھے لیکن انھوں نے زمینداری کا سارا کام انھیں سونپ رکھا تھا۔ فتحیاب بڑے ابا کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ ہوتے بھی تو کیا لکھنؤ میں اعلیٰ سرکاری نوکری چھوڑ کے زمین داری کی دیکھ بھال کرتے؟ ابا کو زمینداری سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اس کے باوجود دادے ابا نے آدھی زمینداری ان کے نام اور باقی وقف کردی تھی۔ وقف کے اندراجات میں نے ان دنوں دیکھے تھے جب یوپی وقف بورڈ کا دفتر مچھلی محال میں تھا۔ وصیت نامے کے مطابق ابا کے بعد باقی ساری جائیداد ان کے ایسے بڑے بیٹے کو منتقل ہونا تھی جس کے ہوش و حواس درست ہوں۔ ''ہوش و حواس'' کی یہ شرط انھوں نے فیاض بھائی کی وجہ سے رکھی تھی لیکن یہ راستہ کھلا رکھا تھا کہ وہ اگر اپنا اوڑھا ہوا پاگل پن اتار پھینکیں تو پہلا حق انھیں کا ہوگا۔

مجھے یہ بات ابا کے انتقال کے بعد معلوم ہوئی اور دادے ابا، جن کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا، کی انصاف پسندی بہت اچھی لگی۔ میں اور فیاض بھائی ان کی نظروں میں برابر تھے، دونوں ہی ان کے پوتے تھے۔ دادے ابا چچا سے کیوں ناراض تھے مجھے نہیں معلوم، شاید ان کی ترش مزاجی اور غصہ انھیں پسند نہ رہا ہو۔ دادے ابا کے انتقال سے پہلے ہم لوگ یعنی والدہ، میں اور میرا چھوٹا بھائی عمران، جو مجھ سے عمر میں دس سال چھوٹا ہے، ان کی زندگی میں آخری بار محی الدین پور گئے تو دادے ابا گھر سے پوری طرح ترک تعلق کر چکے تھے اور اپنی بنوائی ہوئی جامع مسجد کے حجرے میں رہتے۔ کھانا ضرور گھر سے جاتا۔ یہ غالباً ۱۹۴۵ء کی گرمیوں کی بات ہے۔

میں ان کے ساتھ مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں چچا گھر سے نکل کر مسجد کے سامنے سے گزرے۔ دادے ابا پر نظر پڑتے ہی انھوں نے سلام کیا اور کہا، "بیراؤں[1] جا رہا ہوں"۔

دادے ابا سلام کا جواب دینے کے بعد دھیرے سے بولے۔

"یہ خلاف معمول بات کیسی؟" (یعنی مجھے مطلع کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔ جملہ نقطہ بہ لفظ یہی تھا اور میری یادداشت میں ان کے آخری بول کے طور پر یہی الفاظ محفوظ ہیں۔)

گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم لوگ کبھی محی الدین پور چلے جاتے اور کبھی پھوپھی کے یہاں رتھیڑی (مظفر نگر)۔ پھوپا محمد فاضل بہت بڑے زمیندار تھے۔ دادے ابا ان کے سامنے کچھ بھی نہ تھے۔ معلوم نہیں صحیح یا غلط، کہا جاتا تھا کہ وہ مظفر نگر کے دوسرے سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ پھوپا دبلے پتلے اور گورے تھے۔ ان کی آنکھیں کرنجی تھیں۔ پھوپی بھی سرخ سپید تھیں، ماں پر گئی تھیں۔ ان کی بیٹی کا نام رضیہ اور بیٹوں کے نام مرغوب اور مطلوب تھے۔ مرغوب بھائی ... اپنی تعلیم انگلینڈ میں مکمل کی تھی لیکن ان کا انتقال جوانی ہی میں ہوگیا۔ تقسیم ہند کے سال ڈیڑھ سال بعد پھوپا کا بھی انتقال ہوگیا اور کچھ دنوں بعد پورا خاندان پاکستان چلا گیا۔ مطلوب بھائی کی شادی پاکستان میں لکھنؤ کے لامارٹینیر کالج کے ٹرسٹی کے خاندان میں ہوئی تھی۔ غالباً ۱۹۷۶ء میں وہ ہندوستان آئے تو بھابی کے ساتھ ہمارے کپور مارکیٹ کے مکان میں ملاقات کرنے آئے تھے۔

اس وقت مجھے رضیہ آپا کی بہت یاد آئی تھی۔

پاکستان بننے سے تقریباً سوا سال پہلے ہم لوگ آخری بار رتھیڑی گئے تھے۔ اس وقت کی بہت سی باتیں یاد ہیں لیکن بساط پلٹ چکی ہے، لکیر پیٹنے سے حاصل؟ پھر بھی ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنے سے خود کو نہیں روک پا رہا ہوں۔

رضیہ آپا، جو بہت خوبصورت بلکہ حسین وجمیل تھیں، مجھ سے بڑی تھیں لیکن ہم سب (چچا کی بیٹیاں بھی آئی ہوئی تھیں) تقریباً سارے دن ایک ساتھ رہتے۔ رضیہ آپا بچپن میں قرآن شریف نہیں پڑھ سکی تھیں اس لیے یہ کمی پوری کرنے کے لیے ایک مولوی صاحب انھیں قرآن پڑھانے آتے۔ پھوپی کبھی کبھی ان سے کچھ پڑھ کر سنانے کے لیے کہتیں تو وہ ... پڑھتیں، الٹا سیدھا اور کہتیں مولوی صاحب نے یہی سکھایا ہے۔ آخر پھوپی نے ایک دن پردے کے پیچھے سے مولوی صاحب کو پڑھاتے ہوئے سنا اور پھر وہاں سے ہنستے ہوئے لوٹیں۔

---

[1] نواب چچا کی سسرال۔ ضلع جونپور۔ یوپی

انھوں نے لمّاں کو مولوی صاحب کے قرآن شریف پڑھانے کے طریقے کی نقل سنائی۔ میں بھی وہاں موجود تھا، میں نے بھی یہ نقل سنی جو ایسی تھی کہ دماغ میں چپک کے رہ گئی۔ اب تک یاد ہے اور شاید کبھی نہ بھولوں۔

مولوی صاحب رضیہ آپا کو سکھا رہے تھے۔

"کاف لام پوش، لام یور جوجم...... کاف لام کو دھکا مارو کالو بولو کولیا"

یہ "قلیا" کی ہجے تھی۔ جوجم سے مراد شاید جزم تھا اور پوش سے پیش۔

اگلے روز پورے مہینے کی تنخواہ دے کر مولوی صاحب کی چھٹی کر دی گئی۔

ہم لوگ کبھی کبھی ماموں جان کے یہاں لکھنؤ اور خالا کے یہاں جونپور بھی جاتے اور یہ بھی ہوتا کہ محی الدین پور اور مظفر نگر سے چچی اور پھوپھی آ جاتیں، اپنے بچوں کے ساتھ۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب چچی، ان کے بچے اور رتھیڑی والی پھوپھی اور ان کے بچے آئے ہوئے تھے ایک نہایت دلچسپ واقعہ ہوا۔ میری چچا زاد بہن اقبال بہت شریر تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے ایک کتاب کے مصنف کا نام پڑھنے کے لیے کہا۔ کچھ تو چھپائی صاف نہ تھی اور کچھ یہ کہ تشدید "م" کے بجائے "ن" پر لگی ہوئی تھی۔ میں بڑی مشکل سے "میرامنا" پڑھ سکا جب کہ وہ تھا "میر امن"۔ اس دن سے اقبال، جو مجھ سے چھوٹی تھی، مجھے "میر امنا" کہنے لگی۔ رضیہ آپا نے بھی ایک آدھ بار مجھے "میر امنا" کہا لیکن وہ اپنے بڑے ہونے کا بہت اظہار کرتیں اس لیے ان کے ہاتھوں مجھے شرمندہ کم ہی ہونا پڑا۔ افسوس اقبال اب اس دنیا میں نہیں۔

ابا نہ زیادہ بات کرتے، نہ غصہ اور نہ رنج و خوشی کے اظہار میں زیادتی برتتے۔ ایک زمانے میں، انھوں نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ مجھے یاد نہیں لیکن ممکن ہے میں نے سوچا ہو کہ انھوں نے چھٹی لے رکھی ہے۔ پھر ایک دن، میں نے لمّاں اور ابا کی باتیں سن لیں۔ وہ لوگ شاید سمجھتے تھے کہ میں سو رہا ہوں۔ ان کی بات چیت سے معلوم ہوا کہ ابا کو ملازمت سے معطل کر دیا گیا ہے۔ "معطل" کے معنی مجھے نہیں معلوم تھے لیکن اس وقت کی بات چیت سے یہ اندازہ ہو گیا کہ کوئی خاص پریشانی کی بات ضرور ہے اور پھر دھیرے دھیرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساری بات معلوم ہوئی۔

شاید پہلے بتا چکا ہوں کہ ابا [illegible] بھی تھے۔ مال خانے میں مقدموں کے سارے

اہم کاغذات، فائلیں اور مِسلیں رہتی تھیں۔ وہیں خزانہ بھی تھا جو لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کا بنا ہوا تھا اور ان کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ دو بڑے مضبوط بکس اس میں رکھے ہوئے تھے اور میں نے خزانچی صاحب کو ان میں روپے رکھتے اور نکالتے ہوئے دیکھا تھا۔ بند کرتے وقت اس کے دروازے کے بڑے سے کنڈے میں تین بھاری بھاری تالے ڈالے جاتے جن کی چابیاں تین مختلف لوگوں کے پاس ہوتیں اور کہا جاتا تھا کہ ان تینوں تالوں کی ڈپلی کیٹ چابیاں محافظ مال کے پاس محفوظ رہتی ہیں (یہ بات صحیح تھی یا غلط مجھے نہیں معلوم)۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں نوٹ ہوتے تھے یا نہیں لیکن میں نے صرف ریزگاری دیکھی تھی یا وہ روپے جن پر کوئن وکٹوریا یا جارج پنجم کی تصویر بنی ہوتی اور گوالیار کے سکّے جو بھدّے ہوتے اور شاید روپے کے بارہ آنے بھر قیمت کے۔[1]

قتل کی مِسل

ہوا یہ تھا کہ مال خانے سے ایک بھیانک قتل کی مِسل غائب ہوگئی تھی اور ابا کی تکنیکی ذمّے داری کی وجہ سے کلکٹر نے، جو اُن سے ویسے بھی خوش نہ تھے، انھیں معطل کر دیا تھا۔

اب میں رات کو ذرا چوکنا رہتا کیوں کہ ابا اور اماں اس بارے میں اسی وقت باتیں کرتے۔ ایک رات میں نے ابا کے منہ سے ایک ایسا جملہ سنا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر اماں نے مجھے چمٹا لیا اور خود بھی رونے لگیں۔

ابا کا جملہ کچھ اس طرح تھا، "قتل کی فائل غائب کرنے کا الزام صحیح ثابت ہو جائے تو مجھے گولی مار دی جانا چاہیے۔"

اپنی معطلی کے خلاف ابا نے ریاستی حکومت سے اپیل کی تو اس نے معطلی ختم کر کے انھیں بحال کر دیا لیکن کلکٹر کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ چاہیں تو فائل دوبارہ کھول سکتے ہیں، تاہم ان سے دوبارہ معطّل کرنے کا حق لے لیا گیا۔

کلکٹر نے حکومت کے اس فیصلے کو اپنی توہین سمجھا اور ابا سے دوبارہ جواب طلب کر لیا۔

---

1. ان دنوں روپے میں سولہ آنے یا چونسٹھ پیسے ہوتے تھے۔ ایک آنہ چار پیسے کا ہوتا۔ دھیلا بھی چلتا تھا۔ مجھے گھر کے پاس والی مٹھائی کی دوکان سے ایک پیسہ کی برفی خریدنا یاد ہے۔ ان دنوں لوگ مہنگائی کا رونا روتے تو آخر دس سال پہلے کا ذکر کرتے جب کوڑیاں چلتی تھیں۔

ابا نے جواب میں لکھا کہ جب حکومت نے الزام سے مجھے بری کر دیا تو اس نوٹس کے کیا معنی؟ آپ کو جو حق دیا گیا ہے وہ صرف تکنیکی ہے اور اس کا مقصد کلکٹر کے عہدے کا وقار برقرار رکھنا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ میں اس نوٹس کے خلاف حکومت سے اپیل کروں گا۔

اسی دوران کلکٹر صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور انھیں ماموں بھانجے کی قبر کے سامنے والے افسروں کے کلب میں الوداعی پارٹی دی گئی۔ ابا اس پارٹی میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے لیکن بہی خواہوں کے اصرار پر انھوں نے شرکت کر لی۔

کہا جاتا تھا کہ پارٹی ختم ہونے کے بعد کلکٹر صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے انھوں نے کہا،

"May You go to hell"

میں نے یہ بات سب سے پہلے رفیق بھائی سے سنی جو ہمارے یہاں آتے جاتے تھے اور پھر دو ایک دوسرے لوگوں سے۔ رفیق بھائی کے والد کچہری میں منشی تھے۔ چھوٹے شہروں میں معمولی معمولی باتیں دور دور تک پھیل جاتی ہیں، اور اکثر بے بنیاد باتیں بھی، اس لیے میں اس واقعے کی صحت کے بارے میں کوئی دعوا نہیں کر سکتا۔

اب اسے اتفاق ہی کہیے کہ میرے رشتے کے خالو بشیر الدین جو لکھنؤ میں ضلع مجسٹریٹ رہ چکے تھے، اسی حیثیت سے اورئی آ گئے۔ ایک بار اماں اور میں لکھنؤ میں ان کے یہاں گئے تھے لیکن یہ بات کہ وہ لکھنؤ میں ضلع مجسٹریٹ تھے مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی۔ اورئی آنے کے کچھ ہی دنوں بعد خالہ نے اماں کو لانے کے لیے کار بھیجی تھی۔ اماں کے ساتھ میں بھی گیا تھا۔ خالہ کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام سعیدہ تھا، لیکن دوسری کا نام اب بھول گیا۔ دونوں خاصی خوبصورت تھیں۔ خالہ تھوڑی سی موٹی لیکن گوری تھیں اور اچھی لگتیں۔

بشیر خالو بھی بہت گورے لیکن دبلے پتلے تھے۔ ان کی مونچھیں بٹی ہوئی اور نوکدار تھیں۔ ان کو میں نے کوٹ پینٹ کے علاوہ اور کسی لباس میں نہیں دیکھا۔

اسی زمانے میں ابا ایک دن دفتر سے واپسی پر مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور انھوں نے اماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مبارک ہو، قتل کی وہ مسل جس نے ساری مصیبت کھڑی کی تھی، الماری کے پیچھے نیم جلی ہوئی حالت میں مل گئی۔ ایک کلرک کو معطل کر دیا گیا ہے۔ اب وہ مقدمہ جو مسل غائب

ہو جانے کی وجہ سے برسوں سے لٹکا ہوا تھا پھر سے شروع ہو جائے گا۔‘‘

اسی شام امّاں نے ملیدہ بنا کر پنجتن پاک کی نیاز دلوائی۔ مسئلے کی سنگینی اور والدہ اور والد کی پریشانی کا چوں کہ مجھے علم تھا اس لیے میں بھی بہت خوش تھا لیکن شاید سب سے زیادہ خوشی منیر کی امّاں کو تھی اور انھوں نے ابا کا سر جھکا کر ان کی پیشانی کو چوم لیا تھا اور گھنٹوں دعائیں دیتی رہی تھیں۔

بشیر خالو شام کے وقت بنگلے کے باہر کے لان میں ضرور بیٹھتے، سوٹ بوٹ پہنے اور ٹائی لگائے ہوئے۔ ان کی کرسی دوسری کرسیوں سے مختلف ہوتی، بڑی اور لمبی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اسے فراگ چیئر کہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کرسی ہمارے یہاں بھی تھی لیکن اس سے چھوٹی، اس کے ہتھے بھی کم چوڑے تھے۔ کرسی کے داہنی جانب، ان کے قدموں کے پاس ان کا السے شیئن بیٹھا رہتا۔ کتے کی نسل کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اس وقت تو مجھے اس سے بس ڈر لگتا تھا لیکن وہ سر اٹھائے بغیر کنکھیوں سے مجھے دیکھتا رہتا۔

سامنے والی کرسیوں پر جو ملاقاتی نظر آتے ان میں سے کچھ ایسے ہوتے کہ انھیں دیکھ کر لگتا جیسے وہ ادب سے جھکے جا رہے ہوں اور کچھ ویسے بیٹھے ہوتے جیسے بیٹھنا چاہیے۔ چپراس لگائے دو تین چپراسی بھی ہاتھ پیچھے باندھے ادھر ادھر کھڑے رہتے۔

امّاں کار سے اتر کر خالو کو سلام کرنے کے لیے مجھ سے ضرور کہتیں۔ میں ہاتھ اٹھائے بغیر سلام داغ دیتا، جیسے غلیل سے کنچا مار دیا ہو۔ وہ سر ہلا کر سلام کا جواب دیتے لیکن ایک دن ہنس دیے تھے، شاید سلام کرنے کے میرے انداز پر۔

ہم لوگوں کے ساتھ ابا کبھی بشیر خالو کے یہاں نہیں گئے۔ دفتر کے کاموں کے سلسلے میں ممکن ہے جاتے رہے ہوں لیکن مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔

ایک اور بات یاد ہے۔ خالہ نے ہمارے گھر آنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اماں بہت خوش ہوئیں لیکن ابا کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انھوں نے امّاں سے کہا کہ ابھی تو لوگ کہتے ہیں پیش کرائن کلکٹر صاحب کے یہاں بہت جاتی ہیں، اب وہ آئیں گی تو سرکاری گاڑی گھنٹے دو گھنٹے گھر کے سامنے کھڑی رہے گی اور لوگ سمجھیں گے کہ بہت قریبی رشتے داری ہے، طرح طرح کی سفارشیں آئیں گی۔ میں ان کا ماتحت ہوں، سفارش تو کر نہ سکوں گا اور لوگ خواہ مخواہ سمجھیں گے کہ میں نے ان کا کام نہیں کیا۔

ابّا نے یہ بات اس دن کہی تھی جب خالہ ہمارے گھر آئی تھیں یا اس سے پہلے اور ایک بار میں یا ٹکڑوں ٹکڑوں میں، جیسا کہ ان کا طریقہ تھا، ٹھیک سے یاد نہیں۔

شاید دو سال بعد بشیر خالو کا اوریٔ سے تبادلہ ہو گیا لیکن تقریباً دس یا اس سے بھی زیادہ برس بعد سعیدہ باجی سے لکھنؤ میں تین بار ملاقات ہوئی، ایک بار اس وقت جب وہ ماسٹر بدرالدین ماموں کے گھر میں امّاں سے ملنے آئی تھیں اور دو بار ان کے گھر پر۔ یہ کچھ عجیب کہانی ہے۔

ان کی کوٹھی وزیر حسن روڈ سے پہلے والی سڑک پر سی۔ آئی۔ ڈی آفس کے داہنی جانب تھی، سڑک سے کسی قدر فاصلے پر اور باہر سے شکستہ حال نظر آتی لیکن اندر سے نہایت عمدہ اور سجی سجائی تھی۔ امّاں نے معلوم نہیں کس کام سے مجھے دو بار ان کے یہاں بھیجا تھا۔ پہلی بار گیا تو سعیدہ باجی کے شوہر کو دیکھا، ان کا رنگ گندمی تھا، قد نکلتا ہوا اور جسم تھوڑا سا بھاری۔ وہ صاف شفاف کپڑوں پر ریشمی گاؤن پہنے ہوئے تھے اور صورت سے مغرور معلوم ہوتے۔

دوسری بار گیا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ سعیدہ باجی نے پہلی بار کی طرح اس بار بھی خوب خاطر مدارات کی۔ میرے پہنچتے ہی انھوں نے ملازمہ سے چائے بنوائی۔ ٹرے میں بسکٹوں کے علاوہ میوے تھے۔ میں چائے پی چکا تو انھوں نے کہا، "تم ذرا باہر جا کر اپنے بھائی صاحب کو دیکھتے رہو۔ میں اتنی دیر میں نماز پڑھے لیتی ہوں۔ وہ آتے دکھائی دیں تو مجھے بتا دینا"۔

انھوں نے مجھے کھانا کھائے بغیر واپس نہیں آنے دیا اور پانچ روپے کا نوٹ دیا، سر پر ہاتھ پھیرا اور گال تھپتھپائے۔ انھوں نے امّاں کے لیے ایک بند لفافہ بھی دیا جس میں کوئی سخت سی چیز تھی۔ میں نے لفافہ سورج کی طرف کر کے معلوم بھی کرنا چاہا کہ اس میں کیا ہے لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ کچھ دنوں بعد میں نے امّاں کے پاس خالا کی ایک تصویر دیکھی تھی۔

سعیدہ باجی کی اس طرح نماز پڑھنے کی بات کچھ اٹ پٹی لگی تھی۔ پھر کچھ دنوں بعد کسی نے بتایا کہ سعیدہ باجی کے شوہر ایک نیم مذہبی پندرہ روزہ کے، جو انگریزی میں شائع ہوتا تھا، بانی مدیر تھے لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ وہ مذہب سے اس قدر بیزار ہو گئے کہ سعیدہ باجی کو نماز بھی نہ پڑھنے دیتے اور وہ اکثر چھپ چھپا کر فرض رکعتیں ہی پڑھ پاتیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شوہر کو تکلیف نہ پہنچانے کے خیال سے نماز ان کے سامنے نہ پڑھتی رہی ہوں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ وہ سعیدہ باجی کا نماز پڑھنا پسند نہ کرتے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ کمیونسٹوں سے بھی نفرت کرتے تھے۔ کون جانے زندگی کی کسی منزل میں سب کچھ پھر الٹ پلٹ ہو گیا ہو۔

ایک دن اماں نے حکیم صاحب چا کی والے کے یہاں سے واپسی میں مجھے وہ مکان دکھایا تھا جہاں میری پیدائش ہوئی تھی۔ یہ مکان اس سڑک پر تھا جس کے ایک طرف بازار تھا اور دوسری طرف مکان ہی مکان، آبادی ہی آبادی۔

مجھے اس مکان کا باہری حصہ اب تک یاد ہے اور وہی اپنے ہوش وحواس میں دیکھا بھی تھا... دو دروازے تھے، ایک بڑا، ایک چھوٹا اور دو کھڑکیاں۔ میرا خیال ہے کہ دوسرا دروازہ اور کھڑکیاں بیٹھک میں کھلتی رہی ہوں گی، اوپر کے کمرے میں تین چار کھڑکیاں تھیں۔ اندر کیا صورت تھی، کتنی مکانیت اور اوپر جانے کا زینہ کس طرف مجھے نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ اس مکان میں جہاں میری گیند کھوئی تھی اور دادے ابا کی پان کی ڈبیا لے کر واپس آتے ہوئے میرا پیر پھسل گیا تھا اسی مکان سے منتقل ہوئے تھے لیکن اس نقل مکانی کی کوئی یاد میرے ذہن میں نہیں۔ اس وقت میں بہت چھوٹا رہا ہوں گا۔

بعد میں ادھر سے جب بھی گزرتا اس مکان کی جانب نظریں خود بخود اٹھ جاتیں لیکن اس کے اندر کی تفصیلات معلوم کرنے کی میں نے کوشش کبھی نہیں کی اور نہ کبھی جزوں کی تلاش اتنی رہی کہ قیاس کے گھوڑے دوڑاتا اور سارا نقشہ ذہن سے برآمد کر کے "وثوق" کے ساتھ پیش کر دیتا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہو جانے کی وجہ سے اجناس کی قیمتوں میں تو معمولی سا اضافہ ہوا تھا لیکن املاک کی قیمتیں تیزی سے گر رہی تھیں۔ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا اس وقت مجھے کوئی علم نہ تھا۔ یہ معلومات مجھے بزرگوں کی بات چیت سے بعد میں حاصل ہوئی تھیں، ہاں لڑائی کے بارے میں اسکول میں ضرور سنا تھا۔ اس وقت تو ابا اتوار کے دن بازار جاتے وقت مجھے اپنے ساتھ لے بھی نہیں جاتے تھے، ویسے وہ بازار صرف ضرورت پڑنے پر ہی جاتے، لیکن مہینے کے پہلے اتوار کو ضرور۔

ابا مذہبی آدمی نہیں تھے۔ عید بقرعید کے علاوہ میں نے انھیں نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا لیکن ان کا رہن سہن بالکل مسلمانوں کا تھا، سیدھے سچے مسلمانوں کا۔ وہ گھر سے باہر شیروانی پہنے بغیر نہیں نکلتے تھے لیکن ہاکی، کرکٹ کھیلتے وقت ان کھیلوں کے کپڑے پہنتے... میں نے ان کو نیکر یا جانگھیہ پہنے گھر میں بھی کبھی نہیں دیکھا۔

اس وقت اورئی میں اتھائی والے مدرسے کے علاوہ، جہاں مذہبی تعلیم کے ساتھ ابتدائی درجوں کی عام تعلیم بھی ہوتی تھی، ایک مدرسہ تھا جو ہمارے گھر اور جامع مسجد کے راستے میں پڑتا

تھا۔ اس مدرسے کے مہتمم سے، جن کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی، معلوم نہیں کیوں ابا بہت متاثر تھے اور اپنی بساط بھر مدرسے کی مدد کیا کرتے۔ دادے ابا بھی اورئی میں ہوتے اور عید بقرعید پڑتی تو روپے وہاں بھیجتے۔ ایک بار مدرسے میں دینے کے لیے ابا کو کچھ روپے دیتے ہوئے میں نے دادی امّاں کو بھی دیکھا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اپنے روپوں کے ساتھ یہ روپے بھی مولوی صاحب کو دے دینا۔ مولوی صاحب کو دو ایک بار میں نے مسجد والے اپنے گھر میں بھی دیکھا تھا۔ مولوی صاحب کا نام چند سال پہلے تک مجھے یاد تھا۔ وہ کبھی کبھی دادے ابا کے پاس بھی آتے تھے۔

نیا مکان

ایک دن ابا کچہری سے واپس آنے کے بعد مولوی صاحب کو ایک مکان دکھانے لے گئے۔ میں بھی نئے مکان کی خوشی میں ابا کے ساتھ لگ گیا۔ یہ مکان ہمارے اس وقت کے کرایے کے مکان سے مشکل سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ وہاں تین چار لوگ ابا کا انتظار کر رہے تھے۔

مکان کو قابلِ قبول بنانے کے لیے اس کی سفیدی کرائی گئی تھی۔ ممکن ہے تھوڑی بہت مرمت بھی کرائی گئی ہو۔ مکان میں سب سے پہلے مولوی صاحب داخل ہوئے، لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے اور باہر کے دونوں کمروں، دالان، دونوں جانب کے کمروں، آنگن، داہنی طرف کے دالان اور اندر کے کمرے سے ہوتے ہوئے بائیں طرف کے دالان اور کمرے کی طرف مڑے۔ اس سارے دوران وہ لمبی لمبی سانسیں لینے کے علاوہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھ بھی رہے تھے۔ آنگن کے ایک کونے میں چھوٹے سے چبوترے پر تلسی کا پیڑ لگا تھا۔ انھوں نے کہا کہ تلسی کے پیڑ کی پتیاں ہوا صاف کرتی ہیں، بہت مفید پودا ہے۔ بائیں جانب کا دالان سامنے والے دالان سے چھوٹا تھا، تاہم اس کے بھی تین محرابی در تھے۔ اندر کے کمرے کے دروازے پر زنجیر چڑھی تھی جب کہ دوسرے کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ دروازے کے دونوں طرف ایک ایک طاق تھا۔ مولوی صاحب نے مخروطی شکل کے طاق کے اوپری حصے کو ناخن سے کھرچا تو سیاہی نمودار ہوئی۔ انھوں نے دوسرے طاق کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور وہاں بھی یہی ہوا۔ ان کے اس عمل سے مالک مکان اور ان کے ساتھ کے لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن مولوی صاحب مسکرائے اور انھوں نے ابا سے کہا کہ اس کمرے میں دفینہ ہے۔ اس پر تالا ڈال

دیجیے گا۔ دفینہ از خود ظاہر ہو جائے تو کوئی بات نہیں لیکن اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو بہت بڑی قیمت چکانی پڑے گی۔ یہ کہہ کر انھوں نے میری طرف دیکھا تھا۔

آنگن میں نکل کے مولوی صاحب نے اوپر کے کمروں پر، جو بہت بڑے تھے، نظر ڈالی اور ابا سے کہا، مکان ماشاء اللہ بہت اچھا ہے، پسند ہو تو ضرور خرید لیجیے لیکن بس اُس بات کا خیال رکھیے گا، اور پھر چھوٹے دالان کی طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے ابا سے کہا، "دونوں طاقوں میں چراغ جلانا نہ بھولیں۔"

ابا کو دولت سے محبت نہ تھی۔ دفینہ خود سے ظاہر ہو جاتا تو بھی وہ اسے شاید ہاتھ نہ لگاتے۔

دو چار دن میں دادے ابا بھی مولوی صاحب کے ساتھ یہ مکان دیکھنے گئے تھے۔ پھر کئی برس بعد، شاید بھوپال سے واپس آنے پر، ایک دن ابا اور اماں کی بات چیت سے معلوم ہوا تھا کہ یہ اور سڑک والا مکان دادے ابا نے میرے نام سے خریدا تھا اور محی الدین پور کا ان سے بڑا مکان چچا کے نام کر دیا تھا۔

میں نے اس مکان میں اپنی زندگی کے تقریباً پانچ سال گزارے۔ یہ وہ عمر تھی جس میں ایک نظر دیکھنے سے چیزیں حافظے میں گھر بنا لیتی ہیں۔ اس مکان کا ایک ایک کمرہ، ایک ایک دالان، دو بڑی بڑی چھتیں، ان کے پیچھے کے لمبے کمرے، حد یہ ہے کہ اوپر کا غسل خانہ تک دل و دماغ میں اس طرح بسا ہوا ہے کہ آنکھ بند کر کے اس کا نقشہ بنا سکتا ہوں۔ یہ بتانا بھول گیا کہ مکان کے باہر تقریباً پچاس فٹ لمبا اور تقریباً اتنا ہی چوڑا میدان تھا۔ اس خالی زمین کے ایک کونے میں ایک ٹوٹا پھوٹا کمرہ تھا اور اس کے پاس پھلواری، پھلواری کیا گیندے اور گلاب کے کچھ پودے لگے تھے اور کچھ ٹماٹر اور مکو کے۔ مکو کے نیلے اور سرخ چھوٹے چھوٹے پھل، جو کھٹ مٹھے ہوتے، مجھے بہت مزے کے لگتے۔

میں جاڑوں اور برسات میں ابا اور اماں کے ساتھ اس بڑے کمرے میں سوتا تھا جو مکان کی چوڑائی میں تھا۔ میں نے دیگوں کے کھنکنے کی آواز اور سکوں کی کھنکھناہٹ کئی بار سنی تھی۔ اماں کہتیں دیگیں کھسک رہی ہیں تو ابا کہتے کہیں اور چلی جائیں تو بیچ کی دیوار توڑ کر اس کمرے کو خوب لمبا کر دیں اور دالان کی جگہ کو آنگن میں ملا لیں۔

دیگوں کے کھنکنے کی آواز اور سکوں کی کھنکھناہٹ حقیقت تھی یا واہمہ؟ کان کہتے ہیں کہ

جو آوازیں ہم نے سنیں انھیں کیسے جھٹلاؤ گے، لیکن دماغ کہتا ہے:

دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اب سوچتا ہوں کہ ابا تھوڑے سے لالچی ہوتے، زمین کھود کر دفینہ حاصل کر لیتے اور مولوی صاحب کی بتائی ہوئی قیمت چکا دیتے تو یہ سطریں لکھنے کی نوبت نہ آتی اور اب تک کے ستر اُتھتر برسوں میں سے کم سے کم ساٹھ باسٹھ برسوں کی المناک زندگی کو تفصیل سے بیان کرنے سے احتراز صرف اس لیے نہ کرنا پڑتا کہ یہ نثری مرثیہ کون پڑھے گا۔

انھی دنوں کا ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ گیا۔ دلچسپ ہے اس لیے کیوں نہ بیان کر دیا جائے۔ عید کا چاند دکھائی دیا تو میں اگلے دن ابا کے ساتھ صبح صبح عید گاہ گیا۔ وہاں ہزاروں کی بھیڑ میں نماز کے بعد اپنے جوتے تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا اس لیے لوگ سول سے سول ملا کر انھیں اپنے پیچھے رکھ لیتے۔ یہی ابا نے کیا، ریہی میں نے بھی... تھوڑی دیر بعد نماز شروع ہوئی تو میں نے بھی نیت باندھی، دوسری تکبیر ہوئی تو رکوع میں چلا گیا اور تیسری تکبیر پر سجدے میں۔ کنکھیوں سے دیکھا تو سارے لوگ ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ میں دوسروں سے بے نیاز سجدے ہی میں رہا اور جیسے ہی وہ سب سجدے میں گئے، میں نے جوتا اٹھایا اور نمازیوں کو الانگتا پھلانگتا یہ جا وہ جا... گھر واپس آ گیا۔

ابا نماز پڑھ کے واپس آئے تو ان کے چہرے پر کسی قسم کی تشویش نہ تھی۔ میں اس وقت پلنگ پر بیٹھا سوئیاں کھا رہا تھا۔ انھوں نے جھک کر مجھ سے عید ملی اور صرف یہ کہا۔

''باہر میرا انتظار کر لیتے۔''

کچھ دنوں بعد میں اماں کے ساتھ جونپور گیا۔ اس سے پہلے میں وہاں شاید ان دنوں گیا تھا جب بہت چھوٹا تھا اس لیے اس وقت کی کوئی بات یاد نہیں، در و دیوار کی دھندلی دھندلی تصویروں کے سوا۔

محلہ میر مست کا یہ مکان گلی میں ہے، باہر چبوترے پر ایک بڑا سا پیڑ لگا تھا، شاید نیم کا۔ درخت سے کچھ فاصلے پر کھیت تھے۔ مکان خاصا بڑا تھا لیکن دو تین کمروں کے علاوہ اس کی تفصیلات یاد نہیں۔ خانقاہ گھر سے ملحق تھی، دس پندرہ دن کے قیام کے دوران جو باتیں میں نے سنیں۔ ان میں سے ایک کچھ کچھ یاد ہے۔

وہاں مَیں نے سنا کہ میری پرنانی کے یہاں سانپ پیدا ہوئے تھے۔ دن میں وہ گھر میں ادھر ادھر پھرتے رہتے، ان کے لیے دودھ رکھا جاتا، رات میں وہ لکڑی کے ایک ڈبّے میں بند کر دیے جاتے۔ ان میں سے کوئی مر جاتا تو میری پرنانی پھوٹ پھوٹ کے روتیں اور ان کو دفن کر دیا جاتا۔ دھیرے دھیرے وہ سب یا تو مر گئے یا ادھر ادھر نکل گئے۔

اس واقعے کو اعتبار بخشنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ ہمارے ننیہال میں اس وقت سے اب تک کسی کو سانپ نے نہیں کاٹا۔ اس کے علاوہ میں نے خود گھر کے باہر کے درخت کے پاس ایک سانپ دیکھا تھا جسے کسی نے پکڑ کے پاس والے کھیت میں رکھ دیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے وہ قطعاً خوفزدہ نہ تھا۔ یہ بات ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہوگی۔ اس وقت مَیں چھے ساڑھے چھے برس کا رہا ہوں گا۔ سانپوں کے سلسلے میں میرے سگے خالہ زاد بھائی مولانا فصیح الدین نے، جنھیں میں فصو بھائی کہتا ہوں، صرف یہ کہا کہ ہمارے خاندان میں سانپ کے کاٹنے سے کسی کی موت نہیں ہوئی۔ انھوں نے پہلے والے حصّے کی تصدیق کی نہ تردید۔

کچھ پہلے کا لکھنؤ کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ تقریباً پورا کا پورا صرف شنیدہ ہے، علاوہ آخری ایک بات کے، اگرچہ عین ممکن ہے کہ وہ بھی سنتے سنتے ذہن میں کچھ اس طرح جاگزیں ہوگئی ہو کہ میں اسے اپنی یادداشت کا حصّہ سمجھنے لگا ہوں۔

میں امّاں کے ساتھ لکھنؤ آیا ہوا تھا اور ماموں جان کے یہاں قاضی باغ میں مقیم تھا۔ ایک دن میں تنہا گھر سے نکل کھڑا ہوا اور جانے کیسے اس جگہ پہنچ گیا جہاں عیش باغ کا واٹر ورکس ہے۔ تھوڑی دیر بعد میری تلاش شروع ہوئی اور لوگ ادھر ادھر دوڑائے گئے۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ایک اینٹ کے اوپر دوسری اینٹ رکھے زمین پر بیٹھا تھا اور ان دونوں اینٹوں کے درمیان مڑے ہوئے تار کا ایک ٹکڑا گھماتے ہوئے گا رہا تھا:

"میرے مولا بلا لے مدینے مجھے"

جب بھی اس واقعے یا کہانی کے بارے میں سوچتا ہوں مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اینٹ کے اوپر اینٹ میں نے ہی رکھی تھی، گا بھی میں ہی رہا تھا اور یہ تجربہ میرا اپنا ہے اور اس سڑک سے گزرتے وقت مختلف مقامات کے بارے میں اب بھی خیال ہوتا ہے کہ میں اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ ویسے یہ پوری کہانی امّاں نے مجھے درجنوں بار تو سنائی ہوگی۔

پیارے محمدؐ آئے نبی جی

ایک اور گھر جہاں لمّاں کا مجلس پڑھنا یاد ہے، جامع مسجد کے پیچھے والے دروازے کے پاس چوراہے سے ملحق ایک اونچے سے ٹیلے پر تھا۔ اس گھر کی ایک مجلس میں لمّاں کے ساتھ میں بھی گیا تھا۔ یوں بھی دو ایک بار جانا ہوا۔ مسیح الحسن رضوی (قومی آواز) کی ہونے والی بیوی اسی مکان میں رہتی تھیں۔ وہ مجھ سے بڑی تھیں اور بہت خوبصورت۔ مجھے نہیں یاد کہ وہاں میری ان سے کبھی بات چیت ہوئی ہو۔ لکھنؤ میں مسیح صاحب سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں ملاقات ہوئی اور انھیں معلوم ہوا کہ میں قاضی باغ میں رہتا ہوں تو انھوں نے مجھ سے اپنے یہاں آنے کے لیے کہا۔ ان کا گھر میرے مکان سے بمشکل دو ڈھائی سو قدم کے فاصلے پر رہا ہوگا، مصطفیٰ منزل کے سامنے۔ میں وہاں گیا تو مسیح صاحب کی اہلیہ نے مجھے فوراً پہچان لیا اور ہمیشہ مجھے بڑی بہن کا پیار دیا۔

مجھے اورئی میں مردانی میلادیں یاد نہیں۔ شاید وہاں ان کا رواج نہیں تھا۔ ابا اس طرح کے اجتماعات میں شرکت نہیں کرتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے اسی سبب میں ان سے ناواقف رہا ہوں۔ البتہ اورئی کی ایک بڑی میلاد یاد ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ انھی دنوں شروع ہوئی تھی یا پہلے سے ہوتی آئی تھی۔

سبزی منڈی میں جہاں تخت پر بانس کی بنی ہوئی درجنوں دکانیں تھیں بارہ وفات کے موقع پر عید میلادالنبی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سبزی فروشوں نے، جن میں ہندو مسلمان سب شامل تھے، اس دن دوکانیں نہیں لگائی تھیں اور تخت اٹھا کر دیواروں سے لگا دیے تھے۔ شام ہوتے ہوتے دوکانیں بند کر دی گئی تھیں۔ ترکاریوں کی دوکانیں اٹھا دی گئیں تو میدان دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ارے یہ اتنا بڑا ہے۔

میلاد شروع ہونے سے پہلے ہی میدان سامعین سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان میں ہندوؤں کی تعداد کافی رہی ہوگی۔ میدان کے آس پاس واحد رہائشی مکان حکیم صاحب چاکی والے کا تھا جس کی چھتیں خواتین سے بھری ہوئی تھیں۔ لمّاں بھی میلاد سننے وہاں گئی تھیں۔ یوں بھی اس گھرانے سے ہمارے تعلقات بہت قریبی تھے۔ مشہور ایڈوکیٹ عبدالمنان کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔

اس میدان میں چاکی والوں کے گھر سے متصل ایک چبوترہ تھا جو اس دن خوب سجایا گیا

تھا۔ شہر کے چند جانے مانے لوگ اور دو مولوی صاحبان اس پر تشریف فرما تھے اور ان مولانا کے منتظر جنھیں میلاد پڑھنے لیے مدعو کیا گیا تھا...۔ تھوڑی دیر میں ایک صاحب جو خاصے دراز قامت اور خوبصورت تھے، تشریف لائے۔ ان کی داڑھی بالکل سیاہ تھی اور خاصی دراز لیکن سر کے بالوں میں، جو شانوں تک لہرا رہے تھے، کہیں کہیں ستاروں کی چمک تھی۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ کھڑاؤں پہنے ہوئے تھے جسے ان دنوں اورئی میں کھٹ پٹی کہتے تھے۔

اسٹیج پر پہلے سے موجود افراد نے، جن میں کوآپریٹیو سوسائٹی کے صدر عبدالحئی صاحب بھی شامل تھے، کھڑے ہو کر نہایت ادب اور احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد کچھ اعلانات اور چھوٹی موٹی تقریریں ہوئیں۔ ایک مولوی صاحب نے بھی تقریر کی جس کی پذیرائی بھی ہوئی، لیکن کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ اس کے بعد عبدالحئی صاحب نے اعلان کیا کہ اب میں محترم المقام علامہ متّن شاہ وارثی صاحب سے بصد ادب واحترام درخواست کروں گا کہ وہ اپنی بصیرت افروز تقریر سے ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی راہ دکھا کر ہمارے ایمان کو تازہ فرمائیں (زبان اس سے بھی زیادہ ثقیل تھی کہ ان دنوں اورئی میں پرشکوہ الفاظ کا استعمال ہی اچھی اردو کا معیار تھا)۔

نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور مولانا وارثی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو مجمع میں ایک ایسی سراسراہٹ پیدا ہوئی جیسے کسی نے طویل وعریض حریری چادر، ایک کونے سے دوسرے کونے تک، بیک وقت ہزاروں سروں پر تیزی سے کھینچ دی ہو۔ اس سراسراہٹ میں عقیدت واحترام کی ایسی آوازیں بھی شامل تھیں جن کی تشکیل شاید بامعنی الفاظ سے نہیں ہوئی تھی۔

مولانا وارثی یکا یک اٹھ کھڑے ہوئے تو ایسا لگا جیسے تاڑ کا درخت اسٹیج پر اُگ آیا ہو۔ ان میں مولاناؤں کی کوئی بھی توادا نہ تھی، نہ عبا نہ قبا، نہ جُبہ نہ دستار، بس گیروے رنگ کی ایک چادر تھی جو اُن کے جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ انھوں نے میلاد شریف کا آغاز ایک نعت سے کیا جس کا ایک شعر یادوں میں محفوظ رہ گیا ہے

پیارے محمدؐ آئے نبی جی
بگڑی مُری بن جائے نبی جی

لیجیے ایک اور مصرع بھی یاد آ گیا

نورِ خدا کا تاج ہے سر پر

مولانا وارثی کی آواز ایسی تھی کہ ''شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو'' شاید اسی کے

لیے کہا گیا تھا اور ہزاروں کا مجمع پوری طرح ان کے قابو میں تھا۔ وہ کہتے کہ جاؤ اور پاس کے تالاب میں کود پڑو تو کوئی ایک منٹ کو نہ سوچتا۔ ان کی نعت اور اس سے زیادہ آواز نے سارے مجمع کو پاگل کر دیا تھا اور آس پاس کی فضا پر جیسے نور برس رہا تھا۔

انھوں نے سامعین کے شدید اصرار پر نعت دوبارہ پڑھی تو عمر اور دماغ کے اس پردے نے مل کر جس پر اس وقت تک یادوں کی بہت تھوڑی لکیریں بنی تھیں مجھے ایک ایک مصرع یاد کرا دیا اور میں یہ نعت امّاں کے ساتھ میلادوں میں پڑھنے لگا۔

اورئی ایسے چھوٹے سے شہر میں جہاں تقریباً سارے لوگ ایک دوسرے کے صورت آشنا ضرور تھے یہ بات پھیل گئی اور اگلے سال منتظمینِ جلسہ نے ابّا سے درخواست کی کہ شہر کا یہ نونہال مولانا وارثی کو انھی کی نعت انھی کے انداز میں سنائے۔ اتفاق سے میں اس وقت موجود تھا۔ ابّا نے ذرا سا سوچا اور کہا، ”ٹھیک ہے“۔

امّاں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ خوشی سے پاگل ہو گئیں اور انھوں نے مجھے چمٹا کر اتنے پیار کیے کہ میں گھبرا گیا۔

عید میلاد کا آغاز ہوا تو عبدالحیٔ صاحب نے مولانا وارثی کا استقبال کرتے ہوئے اپنی تقریر کے آخر میں ان سے درخواست کی کہ شہر کا ایک ہونہار بچّہ وہی نعت شریف پیش کرنا چاہتا ہے جو آپ نے پچھلے سال پڑھی تھی۔ اجازت مرحمت فرمائیے۔

”سبحان اللہ“۔ مولانا وارثی نے کہا تو عبدالحیٔ صاحب نے مجھے اشارہ کیا۔

میں سفید کرتا پاجامہ پہنے تھا۔ عبدالحیٔ صاحب نے پھولوں کا ایک ہار میرے گلے میں پہلے ہی ڈال دیا تھا۔ میں نے مولانا وارثی اور اسٹیج پر تشریف فرما دوسرے حضرات کو سلام کیا اور نعت شروع کی۔ آواز تو خیر جیسی تھی ویسی تھی ہی لیکن نعت اور اس کی معصوم ادائیگی نے ایسا جادو جگایا کہ سبحان اللہ کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں۔ میں نے نعت مکمل کی تو مولانا وارثی اپنی جگہ سے اٹھے اور انھوں نے جھک کر میری پیشانی کا بوسہ لیا۔ اپنے چہرے پر ان کی داڑھی کی سرسراہٹ یہ سطریں لکھتے وقت بھی محسوس کر رہا ہوں۔

بعد میں انھوں نے اپنی تقریر کے شروع ہی میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ اس بچّے نے وہ نعت شریف جو میں نے پچھلے سال پیش کی تھی اس قدر خوبصورت انداز میں سنائی ہے کہ میں اس کا اثر زائل نہیں کرنا چاہتا، چنانچہ میں دوسری نعت پیش کروں گا (ظاہر ہے اس میں میری

آواز کی تعریف سے زیادہ ہمت افزائی کو دخل رہا ہوگا)۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے بہت پیار سے میری طرف دیکھا اور نعت سرا ہوئے:

صدقہ لینے نور کا، آیا ہے توڑا نور کا

نورِ دن دونا ہوگا، دے ڈال صدقہ نور کا

اس وقت مجمع کا عالم یہ تھا کہ ساری آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور ان کے چہرے پر مرکوز اور وہ والہانہ انداز میں نعت پڑھ رہے تھے۔ بار بار سبحان اللہ کی آوازیں ابھرتیں اور دھیرے دھیرے ڈوب جاتیں، دوبارہ ابھرنے کے لیے۔

ان دنوں اور ئی ایک چھوٹا سا شہر تھا جہاں خاصے لوگ مجھے پہچانتے تھے، کچھ والد کے حوالے سے اور کچھ دادا کے حوالے سے لیکن اس میلاد کے بعد تو ایسا لگتا جیسے ہر شخص مجھے جانتا ہو۔

تقریباً سات آٹھ سال بعد اور ئی سے لکھنؤ منتقل ہوا اور امین آباد سے شناسائی اور پھر آشنائی ہوئی تو ایک دن مولوی گنج میں مولانا وارثی پر نظر پڑی۔ فوراً پہچان گیا۔ پوشاک وہی تھی جو میں نے اور ئی میں دیکھی تھی یعنی گیروے یا پیلے رنگ کی چادر، پیر میں کھڑاؤں ہی تھی۔ چہرے بشرے میں بس اتنا فرق ہوا تھا کہ ان کی زلفوں پر قدرت نے اتنی بھبھوت مل دی تھی کہ وہ انھیں رنگنے لگے تھے لیکن داڑھی کا حال مختلف تھا۔ اس میں سیاہی میں سفیدی اور سفیدی میں سیاہی چمک رہی تھی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہیں مسجد کے نیچے ان کی سرمے کی ایک دوکان ہے اور ان کا سرمہ "سرمۂ مدنی" کہلاتا ہے۔ جب بھی اس راستے سے گزر ہوتا ایک نظر دوکان پر بھی ڈال لیتا۔ دو ایک لوگ بیٹھے ہوئے نظر آتے۔ ان کے سرمے کی خوبیوں کا تو علم نہیں لیکن یہ خیال ضرور ہے کہ اس کی مقبولیت میں ان کی شخصیت اور لوگوں کی عقیدت مندی کا بھی دخل رہا ہوگا۔

تین چار برس بعد جب میرے لیے حضرت گنج بھی نیا پرانا ہوگیا تو ایک دن میں نے پرنس پکچر ہاؤس (موجودہ پرنس مارکیٹ) کا میٹنی شو ختم ہونے کے بعد والی بھیڑ میں انھیں دیکھا، اپنی روایتی پوشاک میں، کھٹ پٹ کرتے ہوئے۔ سخت حیرت ہوئی لیکن کچھ ہی دنوں میں معلوم ہوا کہ اپنی جوانی میں وہ پارسی تھیٹر کے بے حد مقبول ایکٹر تھے۔ پھر مذہب کا غلبہ ہوا تو داڑھی بڑھالی اور سر کے بال بھی آزاد چھوڑ دیے۔ ان دنوں یہ بھی مشہور تھا کہ برطانیہ کی ایک فلم کمپنی نے ان سے کسی فلم میں حضرت عیسیٰ کا کردار ادا کرنے کی درخواست کی تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ

یہ کام ان کے لیے شرعاً جائز نہیں۔

فلم میں حضرت عیسیٰ کا کردار ادا کرنے کی مذہبی حیثیت کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ اپنی پاکبازی کا ایسا ڈراما کھیلتے ہیں کہ نہ معمول کی زندگی جی پاتے ہیں نہ روح وقلب کی پاکی سے ان کی مشام جاں معطر ہو پاتی ہے۔ وہ یہ پیش کش قبول کر لیتے تو فلم کے پردے پر ہی سہی، حضرت عیسیٰ جی اُٹھتے کیوں کہ ان کی شکل وصورت، چال ڈھال، چہرے پر برستا ہوا نور اور قد وقامت جو ذہن میں جاگزیں ہے کچھ ایسا ہے جس پر مولانا وارثی پورے نہیں تو بڑی حد تک پورے ضرور اترتے اور جو کمی رہ جاتی وہ ڈائریکٹر، کیمرہ مین اور عقیدت کا عنصر پوری کر دیتے۔

وارثی صاحب نے اپنی مختصر سی خودنوشت بھی لکھی تھی، جو خاصی مقبول ہوئی، لیکن زیادہ تعداد میں چھاپی جانے کے سبب اس کی سو پچاس جلدیں فروخت ہونے سے رہ گئی تھیں جو اُن کے انتقال کے بعد نظیر آباد میں پرانی کتابوں کی ایک دوکان کوڑی سے کچھ زیادہ نرخ پر فروخت کر دی گئیں۔

ہمارے گھر میں وہ زبان نہیں بولی جاتی تھی جو اورئی میں لوگ عام طور سے بولتے تھے... ہم لوگوں کا ش۔ق۔ درست تھا اور کبھی کبھی فارسی کے دو چار الفاظ اور محاوروں کی آمیزش سے ہماری زبان دور دور تک پھیلے ہوئے سبزۂ بیگانہ میں ایسے چھوٹے سے قطعۂ زمین کی طرح معلوم ہوتی جس پر قدرت نے دو چار بیل بوٹے کاڑھ دیے ہوں۔ باہر کی زبان بڑی حد تک بندیل کھنڈی تھی اور ظاہر ہے میں اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ ایک دن میرے منہ سے تین چار ایسے الفاظ نکل گئے، اور وہ بھی مختصر سی گفتگو میں، جو ہمارے یہاں استعمال نہیں ہوتے تھے۔ والد کے کان کھڑے ہوئے، تشویش ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ رات میں ابا اور اماں میں اس مسئلے پر باتیں ہوتی رہیں لیکن اسی دوران مجھے نیند آ گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے بھوپال بھیجا جا رہا ہے۔

مجھے اورئی چھوڑنے کا بہت افسوس تھا۔ اماں اور ابا سے جدا ہونے کے خیال ہی سے غمگین ہو جاتا لیکن سب سے زیادہ غم تھا ابراہیم رضوی کی جدائی کا۔ وہ میرا عزیز ترین دوست تھا۔ دوسرا نمبر شیام کا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں ان کے بغیر کیسے رہ سکوں گا۔

بھوپال جانے کی تاریخ قریب آتی جارہی تھی ۔ میں ان دنوں ابراہیم سے ملنے روزانہ اس کے گھر جاتا، وہ بھی میرے گھر آجاتا۔ ہم جب بھی ایک دوسرے سے ملتے ہماری آنکھیں چھلک پڑتیں۔

ابراہیم مجھے رخصت کرنے اسٹیشن آیا تھا۔ اس وقت ہم دونوں کئی بار روئے تھے۔ ابّا اور امّاں ہر طرح سے میری دل جوئی کررہے تھے لیکن میرے آنسو رکنے کا نام نہ لیتے۔

آخر ریل گاڑی آگئی اور ہم تینوں ایک ڈبّے میں، جس میں مشکل سے دس بارہ لوگ تھے، بیٹھ گئے۔ ابراہیم ایک سرخ رومال لیے ہوئے تھا اور انجن نے جیسے ہی سیٹی دی اور تھوڑی دیر بعد گاڑی نے رینگنا شروع کیا تو روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی۔ ابراہیم رومال لہرا رہا تھا اور میں کھڑکی سے، جس میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں، ہاتھ باہر نکال کر اس وقت تک ہلاتا رہا جب تک وہ اور اس کا رومال آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگئے۔ پھر میں نے امّاں کی گود میں سر رکھ دیا اور نہ جانے کب نیند آگئی۔

یہ تیسرے درجہ کا ڈبّہ تھا۔ اس وقت تک ہم لوگوں نے انٹر کلاس میں سفر کرنا نہیں شروع کیا تھا۔ ان دنوں ریل گاڑی میں چار طرح کے ڈبّے ہوتے تھے... تیسرا، انٹر، دوسرا اور پہلا۔ آزادی کے چند سال بعد تیسرے درجے کے ڈبے کو دوسرا بنا دیا گیا اور دوسرے اور پہلے کے درمیان دو طرح کے ڈبّے شروع کردیے گئے لیکن اس تبدیلی کے باوجود رہے چار ہی طرح کے ڈبّے۔

ان دنوں مسافر بہت کم ہوتے تھے اور شاید رزرویشن کا طریقہ رائج نہیں ہوا تھا۔

◆◆◆

میری یادوں کا بھوپال

کم و بیش بہتر تہتر سال قبل (غالباً ۱۹۴۰ء) جب میں نے عروس البلاد بھوپال کو پہلا سلام کیا تو عمر کی اس منزل میں تھا جہاں مستقبل ہی مستقبل ہوتا ہے اور اب اس شہر اور اس میں قیام کے دو ڈھائی برسوں کی یادوں کو کھرچنے بیٹھا ہوں تو اس منزل میں ہوں جہاں مختصر سے مستقبل کا دھندھلائی ہوئی آنکھوں اور ماؤف ذہن سے دیکھا جانے والا کوئی خواب نما خیال ماضی کی ان یادوں کے بغیر تکمیل نہیں پاتا۔

اسٹیشن پر اماں کی انگلی پکڑے ہوئے میں ایک ایک چیز کو پھیلی ہوئی ان آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جن میں اورئی کی سڑکیں، گلیاں اور گلیارے بسے تھے اور جانے کن کن چیزوں اور دو تین دوستوں کی یادیں آباد تھیں۔ لیکن آنکھوں کے سامنے جو کچھ تھا وہ بھی دامنِ دل کھینچ رہا تھا۔

اس وقت کا بھوپال بھی کوئی معمولی شہر نہ تھا اور میرے لیے تو وہاں کی ہر چیز غیر معمولی تھی۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی تانگا جس سڑک پر دوڑا وہ دودھ میں نہائی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس پر چاندنی بچھا دی ہو۔ اورئی کے مقابلے، جہاں اس تک وقت بجلی نہیں آئی تھی اور لوگ گھروں میں اور اندھیری راتوں میں، سڑکوں اور گلیوں میں اپنے دل کے باہر کی روشنی کے لیے لالٹینوں سے کام چلاتے، یہ نئی جگہ کوئی خواب سی نظر آتی... سڑک پر یہ کیسی روشنی تھی جو آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی اور ساتھ ساتھ چلتی۔ دونوں طرف اونچے اونچے کھمبے تھے جو اوپر جا کر خیر مقدم کے لیے جھک جاتے اور روشنی میں جیسے آنکھیں بچھاتے۔ میں یہ سب کچھ ان حیران آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جن میں کوئی پریشانی نہ تھی، شاید اس لیے کہ ماں کا نرم اور مہربان ہاتھ کندھے پر تھا اور باپ کی نگاہِ شفقت مجھے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔ مہینوں بعد معلوم ہوا کہ گھوڑے کی ٹاپوں اور پہیوں کے نیچے تیزی لیکن نرمی سے سرکتی ہوئی یہ زمین ''ٹھنڈی سڑک'' کہلاتی ہے۔

تانگہ گھنی آبادیوں کے علاقے میں داخل ہوا تو ایک عجیب ہی دنیا نظر آئی اور اونچی اور

موئی فصیلیں ساتھ ساتھ چلنے گئی تھیں۔ جہاں سڑک مڑتی یہ فصیلیں برجیوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ ان فصیلوں میں کہیں کہیں پھاٹک تھے۔ ایسی ہی ایک سڑک پر جس کے ایک طرف فصیل تھی اور دوسری طرف پتھر کا بنا ہوا ایک بڑا سا مکان اور پھر ایک ٹیلا، تانگہ ذرا سا رُکا، پھر بائیں جانب مڑا اور ایک چھوٹے سے میدان میں داخل ہو گیا۔ سامنے میدان کی چوڑائی میں ایک مکان تھا اور اس کے سامنے دو درخت جو پھولوں کی سفید چادر اوڑھے کھڑے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ محلّہ کا نام بیسا ہزاری کھڑکی ہے۔

اسی وقت مکان کا دروازہ کھلا اور مجھ سے تین چار برس بڑے دو لڑکے، شاید تھوڑی سی چھوٹی ایک لڑکی اور بعد میں ایک کشیدہ قامت، دبلے پتلے بزرگ جن کا رنگ صاف تھا اور چہرے پر چھدری داڑھی تھی، برآمد ہوئے۔ خیال ہوا کہ انھیں کہیں دیکھا ہے اور فوراً ہی یاد آ گیا کہ کئی سال قبل جب وہ اورئی آئے تھے تو امّاں مجھ سے کہتی تھیں، ''کہو پھوپا'' اور میں شروع شروع میں صرف منہ پُھلا کر رہ جاتا۔

پھر بھی یہ گھر اور اس کے مکیں میرے لیے تقریباً اجنبی تھے لیکن اجنبیت کی دیوار میں پہلا شگاف ذرا سی دیر بعد اس وقت پیدا ہوا جب میں نے ان دو لڑکوں میں سے ایک کو مسکرا کے دیکھا اور پھر امّاں کی طرف دیکھنے لگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خالد بھائی ہیں اور دوسرے کا نام ہے یحییٰ۔ وہ لوگ یہ نام جس طرح سے لیتے اس طرح کی ادائیگی میرے لیے مشکل تھی لیکن پھر کئی دوسری مشکلوں کی طرح یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔

ابّا اور امّاں چھے سات دن رہے۔ وہ جب تک وہاں رہے میں کچھوے کی طرح گردن باہر نکالتا، اِدھر اُدھر دیکھتا اور پھر ماحول سے گویا بے نیاز ہو جاتا لیکن ان کی واپسی کے بعد نئے لوگوں اور نئے ماحول میں گھل مل جانے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اپنے بڑے بھائیوں اور چھوٹی بہن کے بعد آنکھوں میں بس جانے والی پہلی صورت پھوپی کی تھی، دبلی پتلی، سیدھی سادی، جیسی تھیں ویسی ہی نظر آنے والی۔ پھوپی سے جو پہلی بات میں نے پوچھی وہ کچھ عجیب سی تھی۔

میں کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ روزانہ کوئی چھوٹی سی چیز سل پر پسی یا گھسی جاتی اور اسے ایک کٹوری میں منتقل کرنے کے بعد اس کے دو دو چار چار قطرے گھڑونچی پر رکھے ہوئے تین چار گھڑوں اور ایک بڑے سے مٹکے میں ٹپکا دیے جاتے۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ یہ گیلا گیلا مسالہ گھڑوں میں کیوں ڈالا جاتا ہے۔ اورئی میں جہاں اس وقت تک گھر میں نل نہیں لگا تھا اور پانی بھشتی لاتا تھا،

ایسا کچھ نہ ہوتا۔ میرا سوال سن کر پھوپی ہنسی تھیں اور انھوں نے جو بتایا تھا وہ تو ٹھیک یاد نہیں لیکن اب دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے پانی میں پتھر کے ذرّات شامل ہو جاتے تھے اور اس مسالے کے چند قطروں سے پانی نتھر کر ذرا کی ذرا میں صاف ہو جاتا۔ اب سوچتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ گھڑے خالی ہو جاتے تو تازہ پانی بھرنے سے پہلے انھیں اندر سے صاف کیا جاتا، بلکہ دھویا جاتا۔ ان کی تہ میں کچھ نہ کچھ ضرور رہ جاتا ہوگا۔ یہ بھی یاد آتا ہے کہ وہاں پان کے ساتھ چونا زیادہ کھایا جاتا اور پان کی ڈبیا میں ایک چھوٹا سا خانہ اس کے لیے ہوتا اور ایک بہت چھوٹے اور نازک سے چمچے سے جسے شاید چنوٹی کہتے، چونا نکال کے دانتوں کے آس پاس رکھ لیا جاتا۔ ممکن ہے چونے کے زیادہ استعمال کا بھی پانی کی اس خصوصیت سے کوئی تعلق رہا ہو۔

اب میں گھر کے سارے لوگوں سے گھل مل گیا تھا۔ خالد بھائی اور یحیٰی بھائی سے دوستی ہو گئی تھی لیکن رشیدہ، جو چھوٹی تھی، کچھ دور دور رہتی۔ پھوپی کو دیکھتا تو ان کی صورت نہال کر جاتی۔ وہ محبت کا اظہار تو نہ کرتیں لیکن جانے کیا تھا کہ ان کی باتوں سے، جو وہ بہت کم کرتیں، ان کی آنکھوں سے جن سے وہ نظر بھر کر کم ہی دیکھتیں اور ان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آنے جانے اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے سے ایسا لگتا جیسے محبت پھوٹی پڑ رہی ہو۔ البتہ پھوپا سے تھوڑا سا ڈر لگتا۔ وہ کم بولتے، کم گھلتے ملتے، کم کھاتے اور دن کے وقت گھر میں کم ہی رہتے۔ ان کے پلنگ کے سرہانے، ایک چھوٹی سی میز پر دو چار کتابیں رکھی رہتیں جنھیں وہ رات میں پڑھتے۔ لیکن انھیں کچھ بھی لکھتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ شیروانی کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلتے۔ میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی، یہی ابا بھی کرتے تھے لیکن پھوپا کی شیروانی کے بٹن اوپر سے نیچے تک بند رہتے۔ ان کا رنگ بھی زیادہ صاف تھا اور قد بھی ذرا سا نکلتا ہوا۔ وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ میں نے دو ایک لوگوں کو انھیں مولوی صاحب کہتے ہوئے بھی سنا تھا لیکن جن مولویوں کو میں نے بعد میں دیکھا ان کی کوئی ادا پھوپا میں نہ تھی۔ ان کے دوستوں کا ایک حلقہ تھا، لوگ ان سے ملنے آتے، ان کا ادب و احترام کرتے اور اس کا اظہار بھی۔

میں عمر کی اس منزل میں تھا جب ہر شخص کا حوالہ باپ اور ماں ہوتے ہیں اور چیزوں کا حوالہ اپنے گھر کی چیزیں اور خود گھر۔

یہ مکان اورئی کے مکان سے چھوٹا تھا، آنگن بس اتنا تھا کہ دھوپ صرف دو تین گھنٹے بسر پاتی اور پھر دیواروں سے ہوتی ہوئی لوٹ جاتی کہ ان کمروں کے اوپر چھتیں تھیں جہاں وہ دیر تک

سستاتی۔ ہمارے اوری کے گھر میں کوئی تام جھام نہ تھا، خوش حالی کے کوئی خاص آثار نہ تھے لیکن کسی قسم کی کمی بھی نہ تھی۔ کھانے کو گوشت ملتا اور منیر کی اماں کے ہاتھوں بگھاری ہوئی دال، خاص طور سے ارہر کی۔ کرچھے میں گرم کیا ہوا گڑ گھی ملتا جو ٹھنڈا ہونے پر اس سے چپک جاتا۔ اس کے لیے کوئی فرمائش نہ کرنا پڑتی بس کہہ دینا کافی ہوتا۔ یاد نہیں کہ بھوپال میں کبھی اس طرح کا گڑ گھی کھایا ہو۔ یہ میری پھوپی کا گھر تھا، میرے ماں باپ کا نہیں اور یہاں منیر کی اماں بھی نہیں تھیں۔ یہ نہیں کہ میں کہتا تو یہ سوغات مجھے نہ ملتی لیکن شاید اس طرح کے چھوٹے موٹے شوق بھی اوری میں چھوڑ آیا تھا۔ یہاں کی زندگی مختلف تھی لیکن نہ صرف زندگی ہی مختلف تھی میں بھی ہر دن کم سے کم دو دن بھر ضرور تبدیل ہو رہا تھا۔

اب میں اپنی گردن جلدی سے اپنے اندر نہ کر لیتا، آنکھیں کھلی رکھتا، سڑک کے پاس جا کر ادھر ادھر دیکھتا۔ سڑک کی دوسری جانب فصیل تھی جس میں تھوڑی دور پر ایک بہت بڑا پھاٹک تھا اور دوسری طرف ایک برجی جس سے ملحق فصیل بڑے علاقوں کو اپنی گود میں لینے کے لیے آگے بڑھتی چلی جاتی۔

خالد بھائی اور یحییٰ بھائی سے اب دوستی ہونے لگی تھی، پھر ان کے دو چار دوستوں سے شناسائی ہوئی اور شام کے وقت گھر کے سامنے والے میدان میں زین کی گیند سے فٹ بال کے کھیل میں مجھے بھی شریک کیا جانے لگا۔ ہم سب گیند کو قبضے میں کرنے کے لیے ایک دوسرے پر جھپٹتے، گیند جدھر جاتی ادھر دوڑ پڑتے، یہ دیکھے بغیر کہ سامنے کوئی ہے یا نہیں، ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے، گر پڑتے اور گرد جھاڑ کر پھر گیند کی طرف لپکتے، جھپٹتے۔ میں نے ایسی ہی ایک چھین۔ جھپٹ میں، گول کرنے کے لیے گیند پر جو زوردار کِک لگانے کی کوشش کی تو داہنے پیر کا انگوٹھا پتھر سے ٹکرا کر جھول گیا اور خونم خون بھی ہو گیا۔

قدوس صہبائی اور متین سروش

میدان کے ایک کونے میں ٹیلہ سا تھا یا کسی مکان کا ملبہ اور دوسری طرف ایک کمرا، اچھا خاصا بڑا، جس میں دو لوگ رہتے تھے جنھیں میں نے قدوس بھائی اور متین بھائی کے نام سے جانا اور بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قدوس صہبائی اور متین سروش تھے۔ قدوس بھائی لمبے تھے اور گورے، ان کا بدن چھریرا تھا۔ کیا کرتے تھے، کہاں آتے جاتے تھے، نہ تب معلوم تھا نہ اب معلوم ہے لیکن وہ نیلا پینٹ اور نیلی ہی واسکٹ پہن کر کہیں جانے کے لیے کمرے سے نکلتے تو بہت اچھے لگتے۔ دھیرے دھیرے وہ میرے ہیرو بن گئے۔ پھر برسوں بعد جب میں اسٹوڈینٹس فیڈریشن سے ہوتا

ہوا کمیونسٹ پارٹی میں سرگرم ہوا تو ایک دن جانے کیسے یہ خیال ہوا کہ وہ کمیونسٹ رہے ہوں گے۔
دو تین برس بعد میں بھوپال سے اورئی لوٹ آیا، منماڑ اور اورنگ آباد کی سیر کرتا ہوا، اور پھر اورئی سے لکھنؤ لیکن آنکھیں انھیں تلاش کرتی رہیں۔ دو ایک بار ایسی صورتیں نظر آئیں جو اُن سے ملتی جلتی تھیں، میں ان کی طرف لپکا بھی لیکن افسوس ان میں سے کوئی قدوس صہبائی نہ تھا۔

برسوں بعد قومی آواز سے متعلق ہوا تو ایک دن مجیب سہالوی صاحب سے بات چیت کرتے ہوئے جانے کیسے ان کا ذکر نکل آیا۔ مجیب صاحب نے بتایا کہ قدوس صہبائی ندوہ میں ان کے کلاس فیلو تھے اور یہ معنی خیز جملہ بھی کہا، ''ایک بار منسٹر ہوتے ہوتے بچے''۔ ان کے اس جملے نے میرے اس قیاس کو کہ وہ کمیونسٹ رہے ہوں گے اعتبار بخش دیا اور حمید اختر کی کتاب ''روداد چمن'' نے میرے تصورات کی صداقت پر مہر لگادی لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔
افسوس، ۱۹۴۶ء، ۱۹۴۷ء میں اور شاید اگلے دو برسوں تک جب میری آنکھیں انھیں ڈھونڈھا کرتیں وہ بمبئی میں تھے اور مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ قدوس بھائی کے کمرے میں مگدر کی ایک جوڑی بھی رکھی تھی اور میں نے انھیں مگدر گھماتے بھی دیکھا تھا لیکن ان کا جسم کچھ ایسا گٹھا ہوا نہ تھا۔

اسی کمرے میں متین سروش بھی رہتے تھے اور اُن دنوں ''پھر آ گئے گلاب ساچہرا لیے ہوئے'' قسم کی شاعری کرتے۔ ہم تینوں بھائیوں کو سننے اور پڑھنے کی حد تک شعر و شاعری سے تھوڑی سی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور مجھے ایک دن یکا یک احساس ہوا تھا کہ غالبؔ کے دو شعر جانے کیسے خود بخود یاد ہو گئے ہیں۔ مجھے اس مکان کے کمرے کا وہ کونا اور پلنگ تک یاد ہے جس پر میں اس وقت بیٹھا تھا جب اس خیال نے احساس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ وہ شعر تھے:

منظر اک بلندی پر، اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

میں نے یحییٰ بھائی سے ''خوں چکاں'' کے معنی پوچھے تھے اور تو انھوں نے فوراً ہی بتا دیے تھے۔

ہم لوگوں نے متین بھائی کی ایک غزل کی الٹی سیدھی پیروڈی کہی تھی جو انھیں سنائی تو انھوں نے چھوٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر ہمیں دوڑایا اور ہم نے مکان کے سامنے کے دونوں

پیڑوں کے گرداگرد انھیں خوب خوب جھکائیاں دیں، اپنی تک بندی زور زور سے پڑھتے ہوئے، اس اضافے کے ساتھ

پھر آگئے متین بھائی ڈنڈا لیے ہوئے

بیس بائیس سال بعد "ماہنامہ کتاب" کے حوالے سے متین سروش سے رابطہ قائم ہوا اور میں نے ان دنوں کی یاد دلائی تو انھوں نے عمر کی کسی منزل میں " پھر آ گئے گلاب سا چہرا لیے ہوئے"، قسم کی شاعری کرنے سے انکار تو کر دیا لیکن یہ بتا کے نہ دیا کہ پھوپا کے یہاں اُن کے قیام کی صورت کیا تھی۔

کچھ دنوں بعد میرا داخلہ پاس کے ایک اسکول میں کرا دیا گیا جو شاید بیسا ہزاری کھڑکی سے موتی مسجد جانے والی سڑک پر تھا۔ اسکول کا نام تو یاد نہیں لیکن دو باتیں یاد ہیں، ایک مختصر اور ایک ذرا تفصیل طلب۔

پہلی بات یہ کہ میں کلاس میں ایک لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے لمبے لمبے بال کھول کر انھیں دوبارہ باندھ لیا تھا لیکن اس طرح نہیں جیسے لڑکیاں باندھتی ہیں۔ اس کے باوجود میں اسے لڑکی ہی سمجھتا رہا کیوں کہ اس کی صورت لڑکیوں ایسی ہی تھی۔ گھر آ کر میں نے پھوپی سے ذکر کیا تو وہ خوب ہنسیں اور انھوں نے کہا کہ کوئی گورا چٹا سکھ لڑکا رہا ہوگا۔

اس وقت تک میں نے کوئی سکھ لڑکا نہیں دیکھا تھا، اور ئی میں بھی نہیں۔

خالد بھائی اور یحییٰ بھائی شریر ضرور تھے لیکن میں تو شیطان تھا، آفت کا پرکالا۔ بھوپال پہنچنے کے مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر ہی میں ان دونوں کے ساتھ سیر گشتی کر کے بھوپال سے، جو اُن دنوں کچھ ایسا بڑا نہ تھا، خاصا واقف ہو چکا تھا۔ بدھوارہ، منگل وارہ اور جمعراتی بازار ہی نہیں، بھوپال تال اور شاہجہانی ماڈل اسکول تک سے، جس کا نام اب صرف ماڈل ہائی اسکول ہے۔ اسکول کی چڑھائی کے بعد کے ایک بڑے سے پھاٹک سے تھوڑے سے فاصلے پر حدِ نظر تک پھیلے ہوئے امرود اور شریفے کے باغوں سے بھی شناسائی ہو چکی تھی۔ شریفے کا اصل نام تو اس وقت کے بھوپال میں، جو اَب مدھیہ پردیش کا دارالسلطنت ہے، سیتا پھل تھا لیکن اُن دنوں کی ریاست بھوپال میں اسے سیتا جی کے احترام میں چھیتا پھل کہا جاتا۔ اب دوسرے مذاہب کی مقدس ہستیوں کی طرف لوگوں کا رویہ بالکل بدل چکا ہے۔

ہم تینوں ان باغوں میں دو ایک بار جا چکے تھے، گھر میں بتائے بغیر، امرود اور چھیتا

پھل کی لالچ میں۔ خالد بھائی اور یحییٰ بھائی ساتھ دینے سے اکثر گریز کرتے کیوں کہ انھیں پھوپا کے ہاتھوں پٹائی کا خاصا تجربہ تھا لیکن میں نو آموز تھا اور میرے ساتھ کچھ مروّت بھی برتی جاتی اس لیے مجھے سیر سپاٹے کی للک زیادہ ہی رہتی اور ان دونوں کو اپنی چرب زبانی سے راضی کر لیا کرتا۔ میں باتیں خوب کرتا اور زبان کو سکون ذرا نہ دیتا۔ اس وقت یہ سوچا بھی نہ تھا کہ آگے چل کر قسمت میں خاموشی ہی خاموشی لکھی ہے۔ قدرت بھی کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔

ناٹی بوائے

عید کی چھٹیاں کئی دن کی ہوتیں۔ دوستوں کے یہاں جانے کا بہانہ کر کے ایک دن ہم تینوں چھیتا پھل کی لالچ میں کم اور سیر سپاٹے کے لیے زیادہ، ان باغوں کی طرف نکل پڑے۔ کچھ پھل بھی کھائے، کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ایک چھیتا پھل پر نظر پڑی تو جی مچل اٹھا، جوانی اور بچپن گلے مل رہے تھے، سرخی نمودار ہونے لگی تھی لیکن ایک آنچ کی کسر تھی۔ میرے سر پر ترکی ٹوپی تھی جو دوسروں کی نظر سے بچانے کے لیے میں نے اسے اڑھا دی۔

رات کو ٹوپی کے بارے میں پوچھا گیا تو میں اسے جگہ جگہ تلاش کرتا رہا۔ ہوتی تو ملتی۔ آخر مار پڑی تو اقبالِ جرم کر لیا۔ اگلے دن ہمیں اس کی تلاش میں بھیجا گیا تو وہاں نہ ٹوپی تھی نہ چھیتا پھل۔ ٹوپی کا تو مجھے کوئی خاص غم نہ تھا لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ پٹائی کا راستہ کھل گیا ہے۔ اس پھل کا متوقع ذائقہ تو بھول چکا ہوں لیکن ہتھیلی پر بید کی مار اب تک یاد ہے۔ حشمت پھوپا، خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، پٹائی لگاتے وقت بے حد بے رحم ہو جاتے تھے لیکن میں بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ آتا چنانچہ ان کو اور ان کے بید کو اکثر زحمت اٹھانی پڑتی۔

بھوپال پتھریلی زمین پر آباد ہے۔ پکّی سڑکوں کے دونوں جانب بھی پتھر پڑے رہتے، چھوٹے اور کسی قدر بڑے۔ ایک دن گھر کے باہر کے میدان میں، ٹیلے کے پاس پڑا ہوا ایک گول مٹول پتھر مجھے بھا گیا اور میں اسے ٹھوکر مارتا ہوا اسکول تک لے گیا۔ وہاں میں نے اسے ایک کونے میں چھپا دیا اور واپسی میں بھی ٹھوکر مارتا ہوا اسے گھر لے آیا۔ پھر تو یہ روز کا معمول ہو گیا۔ چند ہی دنوں میں جوتے نے کھیسیں نکال دیں۔ دوسرا خریدا گیا لیکن مہینے ڈیڑھ مہینے میں اس کا بھی منہ کھل گیا۔ اب تو گھر کے سب لوگ پریشان ہو گئے اور شاید کسی کے مشورہ پر باٹا کا ''ناٹی بوائے'' (Naughty Boy) خرید دیا گیا۔ اس نے میری ''سنگساری'' کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن تا

کے۔ آخر اس نے بھی سپر ڈال دی۔ ہر شخص پریشان تھا کہ اس قدر مضبوط جوتے سے میں نے کیا سلوک کیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے بھی ہار مان لی اور گھگھیانے لگا۔

آخر ایک دن پھوپا نے خاموشی سے میرا تعاقب کیا تو راز کھلا۔ ان کے اس تعاقب کی بات مجھے اگلی صبح معلوم ہوئی۔ اس دن اتوار تھا، پھوپا تو کسی کام سے چلے گئے لیکن میں دن بھر چور بنا اور دوسروں سے آنکھیں ملانے سے بچتا ہوا گھر میں لیٹا بیٹھا یا یوں ہی ادھر ادھر گھومتا رہا۔ ایسا لگتا کہ ہر ایک کو کوئی ایسی بات معلوم ہے جو وہ مجھ سے چھپا رہا ہے۔

شام ہوتے ہوتے پھوپا آئے اور شیروانی کھونٹی پر ٹانگنے کے بعد ہی انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ میں ایک اندھیری کوٹھری میں چھپ گیا۔ آخر کسی طرح مجھے کھینچ کھانچ کے ان کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ میں تھر تھر کانپ رہا تھا، خاص طور سے اس بید کو دیکھ کر جو ان کے پاس پلنگ پر رکھا ہوا تھا۔ لیکن ان کے چہرے پر، جو ذرا سے غصّے میں سرخی مائل ہو جاتا، غصّے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ انھوں نے گھر کے لوگوں کو، جن میں پھوپی بھی شامل تھیں اور جو ہم لوگوں کی معمولی پٹائی پر بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھیں، باہر جانے کا اشارہ کیا، کمرے کے دونوں دروازے بند کر لیے اور مجھ سے اپنے پاس پلنگ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

انھوں نے اپنی شیروانی کی جیب سے وہ پتھر جو خاصا گول اور چکنا ہو چکا تھا، نکالا اور مجھے دکھاتے ہوئے پوچھا:

''یہی ہے نا؟''

اوپر کی سانس اوپر تھی اور نیچے کی نیچے اور یہ بھی سمجھ میں نہ آتا کہ انھیں یہ ملا کہاں سے کیوں کہ میں تو اسے ٹیلے کے پاس کونے میں چھپا دیا کرتا تھا۔ لیکن زیادہ سوچنے کا وقت نہ تھا اس لیے میں نے تصدیق میں گردن ہلا دی۔

''تمھیں یہ بہت اچھا لگتا ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

میں نے پھر اسی طرح گردن ہلائی۔

''اس میں تمھیں کیا اچھا لگتا ہے؟''

میں خاموش رہا لیکن اپنی خاموشی پر ان کے تیور بگڑتے ہوئے دیکھ کر میں نے جلدی سے کہا ''اچھا لگتا ہے۔''

وہ مسکرائے، پھر انھوں نے پوچھا ''اسے کتنا چاہتے ہو؟''

ان کی مسکراہٹ سے میری ہمت بڑھی اور میں نے کہا، ''بہت۔''

''بہت!،'' انھوں نے ایک ایک حرف کو کھینچ کے کہا، میری طرف دیکھا اور حیرت سے پوچھا، ''پھر بھی تم اسے ٹھوکر لگاتے ہو!''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ انھوں نے میری مشکل بھانپ لی اور بولے، ''میں تو کسی پتھر کو اتنا چاہتا تو اسے زمین سے اٹھا کر کسی طاق میں سجا دیتا اور اس کے سامنے ایک پھول رکھ دیتا اور کوئی دوسرا پتھر سڑک پر دیکھتا تو اسے کونے میں کر دیتا تاکہ اسے بھی کسی کی ٹھوکر نہ لگے''۔

یہ کہہ کر انھوں نے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولے، ''کیوں ٹھیک ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جسے چاہو، جس سے پیار کرو، اسے ٹھوکریں لگاؤ، کتنی بری بات ہے!'' انھوں نے میری طرف دیکھا تو میں مسکرا دیا۔

وہ بھی ہنس دیے اور میرا پتھر مجھے دیتے ہوئے بولے، ''اسے اپنے بستے میں رکھ لو، جب بھی کاپی کتاب نکالو گے اس پر نظر پڑ جائے گی۔'' پھر ذرا سا رک کے انھوں نے کہا، ''سڑک پر کوئی پتھر پڑا ہوا دیکھو تو اسے اٹھا کر کنارے کر دیا کرو۔''

وہ اپنے جملے کا، جس میں ایک بات انھوں نے دوسری بار کہی تھی، میرے چہرے پر تاثر دیکھنے لگے۔ پھر انھوں نے بہت پیار سے بید میری بانہہ پر مارا اور کہا، ''اچھا اب جاؤ۔''

پھوپا جان کی اس دن کی باتوں میں جانے کیا جادو تھا کہ سڑک پر پڑے ہوئے پتھروں کو کنارے کر دینے کی ایسی عادت پڑ گئی کہ اب تک اس نے ساتھ نہیں چھوڑا ہے اور یہ انھی کا فیض ہے کہ اب تک، اپنے ہوش و حواس میں، کسی کی راہ کھوٹی نہیں کی۔

پھوپا جان کے اس دن کے رویّے سے ایک بات تو میں نے گرہ میں باندھ لی لیکن شرارتیں نہ چھوڑیں اور بعد میں بھی ہتھیلی پر اتنے بید پڑے کہ انگلیاں سوج سوج گئیں اور جب تک میں وہاں رہا یہ سلسلہ جاری رہا کیوں کہ نہ میں اپنی شیطانیوں سے باز آتا نہ وہ پٹائی کرنے سے۔

یہ سطریں لکھتے لکھتے پھوپا کے اس دن کے برتاؤ کے بارے میں ایک عجیب خیال ذہن میں آیا۔ شاید اس دن انھوں نے یہ رُخ ایک تجربہ کے طور پر اپنایا تھا۔ مجھ پر اس کا اثر بھی ہوا تھا لیکن ہماری شرارتوں اور شیطانیوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تو انھیں گھی نکالنے کے لیے اپنی

انگلی دوبارہ ٹیڑھی کرنی پڑی۔

خاکسار تحریک

پھوپی کی سخت مخالفت کے باوجود میرے اخراجات کے سلسلے میں اورئی سے ہر مہینے روپے آتے تھے جن میں دو روپے میرے جیب خرچ کے لیے ہوتے۔ اس زمانے میں دو روپے بہت ہوتے تھے۔ میں انھیں پھوپی کے پاس رہنے دیتا اور ان سے ایک آنے دو آنے کر کے لیا کرتا۔ پھوپی بہت سیدھی تھیں۔ کبھی کبھی ان سے زیادہ پیسے بھی لے لیتا اور ان کو پتہ بھی نہ چلتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھیں اندازہ ہو جاتا ہو لیکن انجان بنی رہتی ہوں۔ وہ سچ مچ ایسی ہی تھیں۔ میں اپنے روپوں کا بڑا حصہ خالد بھائی اور تکّی بھائی پر صرف کرتا جس کی حیثیت اپنی شرارتوں، شیطانیوں اور سیر سپاٹوں میں انھیں شامل کرنے کے لیے ایک طرح کی رشوت کی سی ہوتی اور وہ اس کا تاوان پٹائی کی صورت میں پھوپا کو ادا کرتے۔

ان دنوں علاّمہ عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک کا بہت چرچا تھا لیکن مجھے اس کے رہنما اور تحریک کے نام کے سوا اس وقت کچھ بھی نہ معلوم تھا اور اب بھی کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ یہ معلومات بھی مجھے قاضی باغ کے اکرام صاحب سے برسوں بعد حاصل ہوئیں۔ اکرام صاحب مجھ سے عمر میں پندرہ بیس برس بڑے ضرور رہے ہوں گے۔ وہ میرے دوست، بزرگ اور شاگرد بھی تھے۔ میں انھیں انگریزی پڑھاتا تھا۔ ان کے سارے بچّے اور ایک لڑکی بھی جس کا نام عزّت جمال تھا اور جو انھیں کے یہاں رہتی تھی میرے شاگرد تھے۔ خاکسار تحریک کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات فاطمی صاحب سے بھی حاصل ہوئیں۔ فاطمی صاحب مرتے مر گئے لیکن انھوں نے خاکساروں کی وردی پہننا ترک نہ کی۔ ۱۹۹۰ء کے آس پاس تک مولوی گنج (لکھنؤ) کی سڑک کے ایک مکان کے اوپری حصّے میں خاکسار پارٹی کا دفتر تھا لیکن بعد میں وہاں انقلابی سوشلسٹ پارٹی کا دفتر قائم ہو گیا۔ اب انقلاب زمانہ نے اس مکان کو شاید کسی اور کے حوالے کر دیا ہے۔

لیجیے بھوپال سے لکھنؤ آ گیا۔ واپس لوٹتا ہوں۔

میں جمعہ کی نماز پڑھنے موتی مسجد گیا تھا۔ اس دن وہاں کچھ زیادہ ہی بھیڑ تھی۔ مسجد کے زینے پر کسی نے مجھے ایک پمفلٹ دیا جو تہہ بہ تہہ کھلتا تھا۔ اس طرح کا پمفلٹ میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور اس میں خاکسار تحریک کے اغراض و مقاصد بیان کیے گئے تھے۔ میں نے اسے پڑھا

ضرور تھا لیکن اب کچھ بھی یاد نہیں۔

موتی مسجد کے بائیں جانب، تھوڑے سے فاصلے پر، بھوپال تال ہے اور سامنے ایک بڑا سا پھاٹک۔ اس پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد سڑک کے بائیں طرف "روز نامہ ندیم" کا دفتر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اخبار کے دفتر کے باہر ڈیڑھ دو انچ چوڑی لکڑی کی جالی ایک کونے سے دوسرے کونے تک جڑی تھی۔ سڑک کے دوسری طرف شاہی شفاخانہ تھا۔

مسجد کے زینے اور سامنے والے پھاٹک کے درمیان سناٹا چھایا ہوا تھا اور نماز ادا کرنے کے لیے آنے والوں کے سوا سڑک پر ایک شخص نہ تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی، مجھے کچھ عجیب سی لگی بھی تھی لیکن تجسس اتنا نہ تھا کہ اس کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

نماز پڑھ کر زینے پر آیا تو سارا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ پھاٹک کے پاس اور اندر تک پولس بندوقیں تانے کھڑی تھی اور سامنے خاکی وردی پہنے ہوئے سیکڑوں خاکسار، قطار اندر قطار۔ ان کے ہاتھوں میں بیلچے تھے جو وہ کندھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ تصادم کی نوبت نہیں آئی لیکن ہر نمازی کے چہرے پر تشویش نمایاں تھی اور سب لوگ خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

ان دنوں خاکسار تحریک کے ساتھ بیلچے کا ذکر بھی ہر ایک کی زبان پر تھا۔ کہا جاتا کہ فائرنگ کی صورت میں اس کو سامنے کر کے گولی روکی جاسکتی ہے اور سپاہیانہ زندگی میں ضرورت پڑ جائے تو اس سے تکیہ کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اس سے حملہ کیا جاسکتا ہے اور اس کی مار دشمن کے ہوش اڑا دینے کے کافی ہے۔

تھوڑے دنوں تک خاکسار تحریک کا خاصا چرچا رہا، پھر اس محاذ پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دنوں بعد خاکسار تحریک کے ایک انتہا پسند کارکن کے ہاتھوں محمد علی جناح پر قاتلانہ حملہ نے اس کی مقبولیت پر برا اثر ڈالا تھا۔ یہ بات بہت بعد میں معلوم ہوئی۔

ان دنوں مجھ پر مذہب کا غلبہ بہت تھا، پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا اور صبح تلاوتِ کلام پاک کرتا۔ پہلا روزہ میں نے بھوپال ہی میں رکھا تھا۔ روزہ کشائی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ اماں اور ابا اورئی سے آئے ہوئے تھے۔ شاید گرمیوں کے دن تھے۔ پیاس نہایت زوروں سے لگی۔ میں نے برداشت کرنے کی کوشش بھی بہت کی لیکن ظہر کی نماز کے بعد تاب نہ رہی اور خاصی نگرانی کے باوجود میں نے چپکے سے ایک چلو پانی پی لیا۔ یہ پانی گھڑے کا نہ تھا اور گرم تھا، لیکن کیا کرتا، بالکل مجبور ہو گیا

تھا۔ یہ مذہبی احکام کی خلاف ورزی نہیں، پیاس کے سامنے سپر اندازی تھی۔ مذہب سے مجھے لگاؤ اتنا تھا کہ لوگوں کو حیرت زدہ کردینے کے لیے میں نے چھپ کر قرآن شریف حفظ کرنا شروع کردیا تھا اور کئی پارے کافی اچھی طرح یاد کرلیے تھے۔ آج بھی شروع کے پارے کسی کو بہ آواز بلند پڑھتے ہوئے سنتا ہوں تو بعد کی عبارت کے بارے میں میرا اندازہ اکثر و بیشتر صحیح ثابت ہوتا ہے۔

بعد میں شاہجہانی ماڈل اسکول میں میرا داخلہ کرادیا گیا، شاید چوتھے درجے میں۔ مذہب سے رغبت کے سبب میں نے بطور مضمون عربی لے لی تھی۔ عربی پڑھانے کا اہتمام وہاں پہلے سے نہ تھا اور نہ اس کے لیے کوئی ٹیچر، اس لیے محمد اسحٰق صاحب جو جغرافیہ پڑھاتے تھے عربی بھی پڑھانے لگے۔ وہ مدرسوں کے طرز پر عربی نہیں پڑھاتے تھے بلکہ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسا پبلک اسکولوں میں اختیار کیا جاتا ہے اور ابتدا میں قواعد پر زور دینے کے بجائے چھوٹے چھوٹے جملے سکھائے جاتے ہیں۔

مجھے پہلے دو دنوں کے عربی کے سبق اب تک یاد ہیں۔ پہلے دن کا سبق تھا۔

سرت من البصره الی الکوفه۔

(سفر کیا میں نے بصرے سے کوفے تک)

اور دوسرے دن کا سبق تھا۔

لسان العربی لسان القراٰن ۔ ولسان الاسلام، فتعلموھا۔

(زبانِ عربی قرآن کی زبان ہے، اسلام کی زبان ہے اس لیے آؤ اسے سیکھیں)

لیکن عربی کی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا کیونکہ یا تو کورس کے مضامین میں عربی شامل نہ ہونے کی وجہ سے مستقل استاذ کا انتظام نہ ہوسکا یا مضامین کی تعداد محدود کردی گئی۔

بہت بعد کی ایک بات یاد آ گئی۔ وہ بھی کیوں نہ بیان کردی جائے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر، ڈاکٹر رضوان علوی مرحوم، یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران جنرل انگلش کے کلاس میں، جو لازمی تھی، میرے ساتھ تھے۔ وہ نہایت نیک، شریف اور ایماندار انسان تھے اور حتی الامکان ہر شخص کا بہت خیال رکھتے، اپنے دوستوں کا تو بہت ہی زیادہ۔

نیشنل ہیرالڈ کے حالات سے شہر کا ہر شخص واقف تھا۔ شاید اسی پس منظر میں انھوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں عربی کا ایک مخصوص امتحان پاس کرلوں جس کے بعد اس میں

ایم۔اے۔ کیا جاسکتا تھا۔ انھوں نے ادارۂ فروغ اُردو کی ایک کتاب کا نام بھی بتایا۔ چنانچہ میں نے یہ کتاب حاصل کرلی اور کسی استاد کی مدد کے بغیر عربی سیکھنی شروع کردی۔ یہ بالکل ابتدائی قسم کی کتاب تھی اور اس میں عربی الفاظ کے معنی اردو میں لکھے ہوئے تھے۔ اس کتاب کی مدد سے مجھے عربی کی شد بد ہوگئی۔

ایک دن میں نے رضوان صاحب کے پاس جاکر عربی میں اپنی چھوٹی موٹی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ امتحان تو آسانی سے پاس کرلو گے لیکن ابھی دو مہینے باقی ہیں، تھوڑی سی محنت اور کرلو تو فرسٹ ڈویزن آجائے گی جس سے آگے بہت مدد ملے گی۔ ان کے منصوبوں کا اندازہ مجھے اسی بات سے ہوا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد انھوں نے ایک صاحب کے ذریعے کلاس میں داخلے اور امتحان کا فارم مجھے بھیجا۔ مجھے اس فارم پر اپنی تصویر بھی چسپاں کرنی تھی۔ اتفاق سے اہلیہ (انیس نصرت) ان دنوں اپنی بہن کے یہاں دہلی گئی تھیں۔ اس طرح کی چیزیں انھی کی الماری میں رہتی تھیں چنانچہ گھر میں کہیں ایسی تصویر نہ مل سکی جسے فارم پر چسپاں کرتا۔ فارم تیسرے دن داخل کیا جانا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس وقت تک شہر میں ایسے کیمرے نہیں آئے تھے جن سے تصویر فوراً ہی تیار ہوجاتی ہے۔ چنانچہ یہ فارم داخل نہ کیا جاسکا۔

یہ فارم داخل کردیا جاتا تو شاید دو تین سال بعد حالات کی بہتری کی صورت نکل آتی اور ممکن ہے کچھ دنوں میں ڈاکٹر اور بعد میں پروفیسر کا پھندنا بھی نام میں جڑ جاتا۔ سربراہ شعبہ مہربان ہوتو کیا نہیں ہوسکتا لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا اور ایک بہت عمدہ موقع ہاتھ سے نکل گیا جس کا مہینوں بہت افسوس رہا۔ تاہم اب، جب ''ہوچکیں غالبؔ بلائیں سب تمام'' والی صورت ہے خیال ہوتا ہے کہ یہ بات Blessing in diguise تھی کیوں کہ تصویر مل جاتی تو ممکن ہے دو تین سال بعد زندگی آسان ہوجاتی لیکن یہ بھی ہوتا کہ میں آج یہ خودنوشت نہ لکھ رہا ہوتا۔

آیئے پھر بھوپال چلیں۔

فصیل کے بعد والی سڑک پر ایک مسجد تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا اور خالد بھائی، یحییٰ بھائی اور میں تراویح پڑھنے وہیں جاتے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی اس لیے بجلی کے پنکھوں کا سوال نہ تھا۔ یہی حال مسجد کا تھا جہاں پیش امام کی جگہ اور اس کے بعد کی دو چار صفوں تک تو چھت تھی لیکن اس کے بعد سر پہ بس آسمان جس کے سبب وہاں موسم بہت خوشگوار رہتا۔ گھر

کی گرمی سے بچنے کے لیے ہم لوگ ایک تھیلے میں چھوٹے موٹے تکیے بھی ساتھ لے جاتے اور اس وقت تک نفلیں پڑھتے رہتے جب تک ایک ایک نمازی رخصت نہ ہو جاتا۔ اس کے بعد ہم یہ تکیے سروں کے نیچے رکھ کر چٹائی پر دراز ہو جاتے اور پچیس تیس منٹ خوشگوار موسم کا لطف اٹھانے کے بعد گھر، جو بمشکل ساٹھ ستر قدم رہا ہوگا، لوٹ جاتے۔

ایک دن اتفاق سے، اتفاق نہیں بلکہ نہایت خوشگوار موسم کے سبب، ہم تینوں کی آنکھ لگ گئی اور کھلی پھوپا کی غصہ سے بھری ہوئی آواز سے۔ ہم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے اور لگے طرح طرح کے بہانے بنانے لیکن تکیوں نے ہر جھوٹ کا پول کھول دیا۔ گھر جا کر جو ہوا اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔

اب وہ دن یاد کرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں شرارتوں اور پٹائی کے الگ الگ خانے تھے جو ایک دوسرے کو مسترد نہ کرتے۔ چنانچہ دونوں ساتھ ساتھ جاری رہتے۔

پھوپا کو ہاتھ پیر اور سر دبوانے کی عادت تھی اور بستر پر لیٹتے ہی ان کا بدن ٹوٹنے لگتا۔ یہ خدمت ہمارے سپرد تھی، کوئی ہاتھ دباتا کوئی سر اور کوئی پیر۔ لیکن پیر دبانے میں وہ کسی کو ہاتھ کا استعمال نہ کرنے دیتے اور یہ کام دیوار کے سہارے پیروں پر کھڑے ہو کر کیا جاتا۔ میں چوں کہ سب سے کم عمر تھا اور وزن بھی ظاہر ہے کم تھا اس لیے ان کے پتلے پتلے پیروں کو میرا وزن مناسب لگتا اور یہ خدمت اکثر میرے ہی سپرد ہوتی۔

ہاتھ پیر دبوانے کی میری عادت شاید انھی کا فیضان ہے لیکن ان کا فیضان یہ بھی ہے کہ میں نے آج تک کسی کو اپنے پیروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔

مفلسی کا تاشہ

انھی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا جس نے میری زندگی پر دور دور تک اثر ڈالا۔

ہمارے ''بیسا ہزاری کھڑکی'' کے مکان سے ملحق بائیں جانب کے گھر میں ایک خاندان رہتا تھا جس کی مالی حالت سقیم تھی۔ مکان البتہ ان کا اپنا تھا۔ معلوم نہیں ان پر کیسا وقت آن پڑا کہ مکان گروی رکھنے کی نوبت آ گئی لیکن دوسری عالمی جنگ جاری تھی اور کوئی شخص اپنے روپے پھنسانے کے لیے تیار نہ تھا۔ خاتونِ خانہ ہمارے یہاں آتی تھیں اور ہم لوگوں کا بھی ان کے یہاں آنا جانا لگا رہتا۔

رمضان کا مہینہ تھا اور عید چڑھی آ رہی تھی۔ ایک دن میں ان کے یہاں گیا تو ان کا ایک جملہ سنا۔ سیاق وسباق سے ناواقف تھا لیکن مفلسی اپنے ساتھ ایک تاشہ بھی رکھتی ہے جو ہر وہ بات جو آپ چھپانا چاہیں ضرور الم نشرح کر دیتا ہے اور یہاں تو ایک پورا جملہ تھا، اگرچہ نامکمل...'' لٹھے کا ایک تھان آ جاتا، اُن کا کرتا پے جامہ بن جاتا، بچّوں کے کپڑے...''

وہ مجھے دیکھتے ہی خاموش ہوگئی تھیں لیکن اس نامکمل جملے میں بھی مفلسی کی جو لپکیں، حسرتِ تعمیر کی جو آنچ اور دل گرفتگی تھی اس کے احساس سے میں بھی جس کی عمر اس وقت بمشکل آٹھ نو سال رہی ہوگی، نہ بچ سکا۔ لیکن دو ایک دن میں سب کچھ بھول گیا اور یہ جملہ شاید کیا ہرگز یاد نہ رہ جاتا اگر بعد کے واقعات اسے یادداشت کا حصہ نہ بنا دیتے۔

چند دن بعد کا دوسرا واقعہ اس سے زیادہ دل کو پاش پاش کر دینے والا تھا۔ ہمارے گھر میں پھوپی سے انھوں نے ایک دن کہا۔

''ایک دن پاؤ بھر گوشت آ جاتا ہے...سالن کھا لیتے ہیں، بوٹیوں کو ہاتھ نہیں لگاتے، دوسرے دن انھی بوٹیوں کو ڈال کر ترکاری بن جاتی ہے، اس بار بھی ترکاری ہی کھالی جاتی ہے، بوٹیاں نہیں چھوئی جاتیں اور تیسرے دن بوٹیوں کے کباب بن جاتے ہیں''۔

اس وقت میں اس کمرے میں تو نہ تھا جہاں وہ بیٹھی تھیں لیکن دروازے کے پاس ضرور تھا اور انھوں نے مجھے نہ دیکھا ہوگا یا ممکن ہے حالات نے اس اوٹ کی پھٹی پھٹائی چلمن بھی گرا دی ہو۔

ان کے ان جملوں میں نہ تو خود ترحمی کا کوئی عنصر تھا نہ ایسا لگتا کہ وہ کسی راز پر سے پردہ اٹھا رہی ہیں۔ انھوں نے پھوپی کو یہ بات کچھ اس طرح بتائی تھی جیسے اس میں کچھ بھی خاص نہ ہو۔

مکان گروی رکھنے کی ان کی مجبوری کا علم مجھے کیسے ہوا یہ تو نہیں یاد لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ ایک دن امّاں نے یہ بات ابّا کو بتائی تھی۔ سال میں دو بار ابّا اور امّاں کبھی الگ الگ بھوپال آتے اور کبھی ساتھ ساتھ۔ اس بار وہ ساتھ ساتھ ہی آئے ہوئے تھے۔

ابّا نے امّاں سے پوچھا ذرا پتہ لگاؤ ان کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے۔ امّاں نے پھوپی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ معاملہ چند سو روپوں کا ہے لیکن وہ لوگ قرض نہیں لینا چاہتے، مکان گروی رکھنا چاہتے ہیں۔ ابّا نہیں چاہتے تھے کہ وہ لوگ مکان گروی رکھیں لیکن ان لوگوں کے اصرار پر انھوں نے یہ بات مان لی، تین شرطوں کے ساتھ۔ یہ شرطیں تھیں: روپے قسطوں میں

واپس کیے جائیں گے، کوئی سود نہیں قبول کیا جائے گا اور آخری شرط تھی، ''اگر رقم ادا نہ کی جا سکی تو بھی مکان آپ لوگوں کا ہی رہے گا۔'' تیسری شرط سن کر مالک مکان رو دیے تھے۔

اب مالک مکان نے یہ شرط رکھی کہ وہ خود کو کرائے دار سمجھیں گے اور ہر مہینے پانچ روپے دیا کریں گے۔ ابا نے یہ شرط مان لی اور اورئی جا کر روپے بھیج دیے۔

مکان صرف ساڑھے پانچ سو روپوں پر گروی رکھا گیا تھا، کوئی لکھا پڑھی نہیں ہوئی تھی لیکن مالک مکان نے خود ہی ایک تحریر ابا کو دے دی تھی۔

وہ صاحب ہر مہینے کرایا پھوپا کو دینے کے بعد ایک پوسٹ کارڈ ابا کو لکھ دیا کرتے۔

حشمت پھوپا عالمِ دین تھے، بے حد ایمان دار اور بااصول، لیکن اخراجات زیادہ تھے اور یافت کم۔ یہ روپے دوسری عالمی جنگ کے دوران قیمتوں میں اضافے کے سبب خرچ ہو جاتے رہے ہوں گے۔ کئی مہینے بلکہ ڈیڑھ سال گزر گئے۔ ابا نے پھوپا سے ایک لفظ نہ کہا لیکن ایک گرہ ضرور پڑ گئی جو آخرکار شیشے کا بال ثابت ہوئی۔

آخر ابا نے مالک مکان کو خط لکھ دیا کہ اب کرایے کی ادائیگی بند کر دیں۔ مکان آپ کا ہے اور آپ ہی کا رہے گا اور میرا کوئی قرض آپ پر نہیں۔ انھوں نے وہ تحریر بھی واپس کر دی جو انھیں کسی مطالبے کے بغیر دی گئی تھی۔

یہاں ابا سے ایک غلطی ضرور ہوئی۔ انھیں یہ کام پھوپا کو مطلع کیے بغیر بالا بالا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پھوپا نے اس بات کا برا مانا اور اس میں وہ بالکل حق بجانب تھے لیکن ابا نے پھوپا سے روپوں کا مطالبہ بھی کبھی نہیں کیا اور میرے اخراجات کے لیے روپے برابر بھیجتے رہے۔ پھوپا نے بھی کوئی خط نہیں لکھا۔ ان کی عزتِ نفس ضرور مجروح ہوئی ہوگی۔ میرا خیال ہے وہ سوچتے ہوں گے کرایے کی رقم کا انتظام ہو جائے تو اسے بھیجتے وقت تاخیر کے لیے معذرت کر لیں لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ قسمت جب خاندانوں کو بانٹنا چاہتی ہے تو عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ میرے پیارے پھوپا حالات کی ستم رسیدگی کے شکار ہو گئے۔ اس طرح کے کھیل جب بگڑتے ہیں تو نیک ارادے اپنا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

بارہ تیرہ برس بعد جب ہم لوگ لکھنؤ میں تھے تو پھوپا، جو ندوہ کی کسی کانفرنس یا اجتماع میں شرکت کے لیے آئے تھے، جانے کیسے قاضی باغ میں ہمارے مکان کا پتہ لگا کر ابا سے ملنے آئے۔ ان کا سرخ سفید رنگ ماند پڑ چکا تھا، سر اور داڑھی کے تقریباً سارے بال سفید ہو گئے

تھے۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے امّاں کو ایک لفافہ دیا تھا جس میں کچھ روپے تھے، کتنے، معلوم نہیں۔ لفافے میں روپے دیکھ کر امّاں رونے لگی تھیں اور انھوں نے کہا تھا، ''بھیّا یہ روپے جس کے تھے وہ تو چلا گیا، میں یہ روپے لینے والی کون ہوتی ہوں۔'' ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ حشمت میاں پر میرا کوئی قرض نہیں۔ وہ خط جانے کیوں نہیں لکھتے۔

امّاں کی آنکھوں سے آنسو برابر ٹپکتے رہے۔ وہ خاموشی سے روتی تھیں، دہاڑیں مارنا یا چیخنا چلاّنا انھیں نہیں آتا تھا۔ پھوپا کے آنسوؤں نے ان کی داڑھی تر کردی تھی۔ دونوں کو روتا دیکھ کر میں بھی رونے لگا تھا۔ پھوپا نے بہت کہا لیکن امّاں روپے لینے پر تیار نہیں ہوئیں۔ اگلے دن بھی پھوپا آئے، روئے، بہت بہت کہا لیکن امّاں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

ان دنوں ہم لوگ ایک ایک پیسے کے محتاج تھے۔

جوشؔ کی نظم؟

پہلے شاید ذکر نہیں آیا کہ باہر کا کمرہ کبھی کبھی پھوپا کی بیٹھک کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا، اگرچہ شاذ و نادر ہی۔

ایک دن جگرؔ صاحب تشریف لائے۔ اس سے پہلے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن جانے کیسے انھیں پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ پھوپا نے انھیں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موقع بھی خاص تھا۔ وہ اپنی وہ غزل سنانے والے تھے جس کا تعلق ایک خاص واقعے سے تھا۔ پھوپا نے اپنے چند دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا، کام زیادہ تھا اس لیے یحییٰ بھائی کو اور مجھے اس کمرے میں جانے کے مواقع زیادہ مل رہے تھے۔

جگرؔ صاحب نے اپنی غزل:

مدّت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم
خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم

اپنے مخصوص انداز میں سنائی تھی۔

احباب کی ایسی ہی ایک دوسری یک جائی میں ایک منصوبہ بنایا گیا۔ ہم تینوں بھائیوں نے ان معلومات کو جو ٹکڑوں میں حاصل ہوئی تھیں، جوڑا تو اندازہ ہوا کہ کوئی بہت سنگین معاملہ ہے۔

اس نشست میں جگر صاحب موجود نہیں تھے لیکن ان کا نام بار بار سننے کو ملتا۔ معاملہ کچھ اس طرح تھا۔

شاہجہانی ماڈل اسکول کے محمد فاروق صاحب کے ایک دوست کے پاس کوئی ایسی چیز تھی جس کی پولیس کو سخت تلاش تھی اور اس سے زیادہ پھوپا اور ان کے دوستوں کو جو اسے حاصل کرنے کے طریقے ڈھونڈھ رہے تھے۔ فیصلہ آخر میں یہ ہوا کہ فاروق صاحب اپنے دوست کے گھر جا کر ان سے، یہ کہیں کہ داروغۂ شہر جانے کیسے یہ سمجھتا ہے کہ جگر صاحب کے آپ سے گہرے مراسم ہیں اور اسی لیے آپ کے گھر پر چھاپا نہیں مارا جا رہا ہے۔ جگر صاحب نے کہا ہے کہ وہ نظم جس کی پولس کو تلاش ہے میرے حوالے کر دیجیے ورنہ میں اس سے کہہ دوں گا کہ وہ میری بات نہیں مان رہے ہیں، اب آپ جو کارروائی چاہیں کریں۔

اس ترکیب کی کامیابی کا اندازہ ہم لوگوں کو فاروق صاحب کے چہرے پر بکھری ہوئی مسکراہٹ سے، جو چھپائے نہیں چھپتی تھی، ہو گیا۔ لیکن فاروق صاحب جیسے ہی پہنچے کمرہ اندر سے بند کر لیا گیا اور ہم تینوں کو پان اور چائے وغیرہ لانے کی ذمہ داریوں سے سبکدوش۔ اب ہم لوگ اندر کے حالات سے بالکل بے خبر ہو گئے، الاّ اس کے کہ در و دیوار سے چھن کر کبھی کبھی ''واہ واہ'' اور ''خوب کہا ہے'' کی آوازیں باہر آ جاتیں۔

اس کمرہ کی ایک چھوٹی سی الماری میں پھوپا کی کتابیں، جن میں سے زیادہ تر مذہبیات سے متعلق تھیں، رکھی رہتی تھیں۔ اب یہ تو قطعاً یاد نہیں کہ الماری کتنی بڑی تھی لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ اس کے نیچے کے خانے میں ایک چھوٹا سا ٹین کا بکس رکھا ہوا تھا۔ اس پر تالا نہیں پڑا تھا لیکن ہم نے اسے کھول کے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک دروازہ ذرا سا کھلا تو میں لپکا کہ شاید کوئی کام سپرد کیا جائے اور اس طرح اس چیز کے بارے میں جسے راز میں رکھنے کے لیے دونوں دروازے اندر سے بند کر لیے گئے ہیں، کچھ معلوم ہو جائے لیکن پھوپا نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کوئی کام نہیں ہے اور خود گھر میں چلے گئے۔ بمشکل پانچ چھے منٹ بعد وہ واپس ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک تالا تھا۔ اس تالے نے معاملے کو کچھ اور پر اسرار بنا دیا۔

محفل برخاست ہونے کے بعد قدوس بھائی اور یحیٰی بھائی نے اس مسئلے پر غور کیا کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس کے بارے میں اس قدر راز داری برتی جا رہی ہے۔ اس وقت میں بھی

موجود تھا لیکن چوں کہ میں بہت چھوٹا تھا اس لیے میری حیثیت کچی لوئی کی تھی۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ جو کچھ بھی ہے وہ اسی الماری میں ہوگا اور اسے کھولتے ہی اس کی تصدیق بھی ہوگئی کیونکہ صندوقچے پر تالا لگا ہوا تھا۔

ان دونوں نے معلوم نہیں کہاں سے چابیوں کا ایک گچھا حاصل کیا اور آخر کار تالا کھول ہی لیا۔ صندوقچے میں ایک بڑا سا کاغذ رکھا تھا جس کے دونوں طرف ایک نظم لکھی ہوئی تھی۔

یہ نظم پڑھتے ہوئے قدوس بھائی اور یحییٰ بھائی کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور میرا تو سارا جسم۔ لیکن ہم نے نظم پڑھ ہی ڈالی۔ ان دونوں کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے ایک ہی بار پڑھنے میں وہ نظم تقریباً پوری کی پوری یاد ہوگئی تھی۔ نظم پر جوش ملیح آبادی لکھا ہوا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نظم کسی اور کی تھی۔ اس نظم کے بارے میں مجھے دو تین باتیں اور بھی کہنی ہیں لیکن پہلے وہ چند شعر سن لیجیے جو اب تک حافظے میں محفوظ ہیں:

سلام اے تاجدار جرمنی اے نیّر اعظم
(دوسرا مصرع اب ذہن میں نہیں ہے)

خبر لینے بکنگھم کی جو اب کی بار تم جانا
ہمارے نام سے بھی ایک گولا پھینکتے آنا
کہا جاتا ہے کہ ہٹلر دشمنِ ہندوستاں بھی ہے
ہمارے خشک خرمن کے لیے برقِ تپاں بھی ہے
یقیں ہم کو مگر یہ سچ کبھی بھی ہو نہیں سکتا
ہمارے خون سے تو تیغ اپنی دھو نہیں سکتا

خزانہ لوٹ لے لندن کا قتل عام ہو جائے

پہلا مصرع اب یاد نہیں لیکن خیال ہوتا ہے کہ اس کے آخر میں ''خوں آشام ہو جائے'' تھا۔ یہ نظم جوش کے کلیات میں شامل نہیں ہے۔ پاکستان میں ایک انٹرویو کے دوران انھوں نے اس سے قطعاً لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے مطالعے کا اشتیاق بھی ظاہر کیا تھا۔

اِن دنوں ''جوش شناسی'' کا کام زوروں پر ہے، ممکن ہے چھان پھٹک کے دوران اس نظم کے مصنف کے نام پر سے پردا اُٹھ جائے۔ لیکن اس کے اشعار پر جوش کے ڈکشن کی چھاپ

ضرور ہے اور مندرجہ بالا اشعار اور مصرعوں میں سے صرف ایک مصرع ''یقیں ہم کو مگر یہ سچ کبھی بھی ہو نہیں سکتا'' میں زبان کی وہ صفائی نہیں جو جوش کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

ایک خیال اور بھی ہوتا ہے۔ جوش کی شاعری بائیں بازو کے خیالات کی ترجمان چاہے نہ رہی ہو لیکن وہ ان خیالات کے حامل لوگوں کے اس قدر قریب تھے کہ انھوں نے اپنے رسالہ ''کلیم'' کو سردار جعفری، مجاز اور سبطِ حسن کے ماہنامے ''نیا ادب'' میں ضم کر دیا تھا۔ اس سے پہلے ان کی ایک نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اس وقت کمیونسٹ ہٹلر اور مغربی طاقتوں کی جنگ کو ''امپیریلسٹ جنگ'' کہتے تھے لیکن روس پر ہٹلر کے حملے اور ایک نئے اتحاد کے قیام کے بعد جس میں روس اور مغربی طاقتیں شامل تھیں، کمیونسٹ پارٹی نے اتحادی طاقتوں کی حمایت شروع کر دی تھی اور یہ دوسری نظم اسی وقت لوگوں کے ہاتھ میں پہنچی تھی۔ اس پس منظر میں کیا یہ ممکن نہیں کہ صورتِ حال میں اس تبدیلی کے بعد انھوں نے اپنے کمیونسٹ دوستوں کے اصرار پر اس نظم سے اظہارِ بے تعلقی کر دیا ہو؟

اب اس نظم کے بارے میں ایک واقعہ سنیے۔

چودہ پندرہ سال قبل ایک دن نصرت پبلشرز میں ایک صاحب تشریف لائے، سرخ سفید، فرنچ کٹ داڑھی، نکلتا ہوا قد، کپڑوں سے ہی ان کی مالی حالت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ انھوں نے خود کو متعارف کرایا۔ وہ آنکھوں کے ڈاکٹر تھے اور لندن میں ان کا کلینک تھا۔ ان کے مطابق وطن تو ان کا گورکھپور تھا لیکن اب انھوں نے برطانیہ کی شہریت حاصل کر لی تھی۔

دورانِ گفتگو معلوم نہیں کیسے اس نظم کا ذکر نکل آیا اور میں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ ہو نہ ہو یہ نظم جوش ہی کی ہے کیوں کہ ایسی نظم کوئی اور نہیں کہہ سکتا تو انھوں نے کہا، ''یہ بات آپ کو تو نہیں کہنی چاہیے،'' اور پھر گورکھپور کے کسی صاحب کا نام لیا جو بقول ان کے ''ہمارے'' رشتہ داروں میں تھے۔ انھوں نے اس نظم کا سہرا ان کے سر باندھ دیا۔

انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ لندن جا کر مذکورہ نظم اور اس کے ''خالق'' کے بارے میں ساری تفصیلات مجھے بھیج دیں گے لیکن ان کا کوئی خط نہیں ملا۔

دسمبر ۲۰۰۹ء میں رشتے کے ایک خالو اور مولانا آزاد سبحانی کے بیٹے، ڈاکٹر حسن سبحانی، سے جن کا تعلق گورکھپور سے تھا اور جو وہیں مقیم تھے، میں نے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے لندن کے ڈاکٹر صاحب اور گورکھپور کے ''ہم لوگوں'' کے کسی ایسے عزیز سے جس نے یہ

نظم کہی ہو، مکمل عدمِ واقفیت کا اظہار کیا۔

اب بھوپال چلتے ہیں۔

انھی دنوں نواب بھوپال کی سلور جبلی کے سلسلے میں وہاں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ معلوم نہیں کیسے یحییٰ بھائی، خالد بھائی اور میں مشاعرہ گاہ پہنچ گئے۔[1] جگرؔ صاحب ضرور رہے ہوں گے لیکن مجھے بس فانیؔ بدایونی یاد ہیں جنھوں نے سامعین کے اصرار کے باوجود صرف دو غزلیں پڑھی تھیں۔ ان میں سے مجھے بس تین شعر یاد ہیں، دونوں غزلوں کے مقطعے اور ایک شعر۔

سفید شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس فانیؔ بدایونی جن کا رنگ آبنوسی تھا اپنے اشعار کے حسن کی بدولت خوبصورت نظر آ رہے تھے، مخدوم محی الدین کی طرح۔ افسوس دونوں کو صرف ایک بار دیکھنا نصیب ہوا۔

اب فانیؔ کے اشعار سنیے:

فانیؔ اب ان سے عرضِ حال کیجیے بار بار کیا
ہم نئے سرے سے کیا کہیں، وہ نئے سرے سے کیا سنیں

دوسری غزل کے دو شعر تھے:

شاید میں در خورِ نگہٗ گرم بھی نہیں
بجلی چمک رہی ہے مرے آشیاں سے دور
فانیؔ دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

آخرالذکر شعر کی ایک نئی معنویت اس وقت آشکارا ہوئی جب میں نے سال سوا سال بعد مہینہ ڈیڑھ مہینہ اورنگ آباد میں گزارا اور دوسری اس وقت جب آزادیٔ ہند کے بعد اس دوری کو بذریعہ طاقت ختم کر دیا گیا۔

اس مشاعرے کے موقع پر ''روزنامہ ندیم'' نے بڑے سائز کا ایک مشاعرہ نمبر چھاپا تھا۔ ندیمؔ کے مدیر کا نام قمرالحسن تھا۔ ان کی شکل وصورت بھی دھندلی دھندلی یاد ہے۔ گورا رنگ، نکلتا ہوا قد، دبلے پتلے۔ کرتے اور تنگ مہری کے پاجامے پر شیروانی پہنتے تھے۔ ایک یاد کہتی ہے کہ کہیں آتے جاتے تو چھڑی ہاتھ میں ہوتی تھی، دوسری کہتی ہے کہ نہیں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔

ا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عمر میں ہم وہاں کیسے پہنچ گئے۔ ممکن ہے کوئی دوسرا مشاعرہ رہا ہو۔

میں نے ان کو اپنے پھوپا مولوی حشمت علی کے ساتھ دیکھا تھا۔

یہ مشاعرہ نمبر ۱۹۶۶ء میں اس وقت تک میرے پاس تھا جب ''ماہنامہ کتاب'' کے ایک کارکن نے یہ نمبر اور ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کا پورے سال کا فائل اور چند دوسرے اہم ادبی رسائل رڈی میں فروخت کردیے تھے۔ ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کا دو سال کا زر سالانہ میری اہلیہ انیس نصرت کے بڑے بھائی محمد ابراہیم نے جمع کیا تھا۔ انھوں نے فلسفہ کی دو تین کتابیں بھی بھیجی تھیں۔ یہ کتابیں سادی ڈاک سے آئی تھیں۔ اگلی ملاقات میں میرے دریافت کرنے پر انھوں نے کہا تھا کہ کتب فروش سے پیکٹ بذریعہ رجسٹری بھیجنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے سوچا ہوگا کہ رجسٹری کے لیے کہنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ہندوستان کا ڈاک کا نظام اس قدر خراب ہے کہ سادی ڈاک سے بھیجی جانے والی چیز کے بارے میں یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں پہنچ ہی جائے گی۔

کیا اس طرح کے احساس کو وطن سے گہری محبت پر محمول نہیں کیا جاسکتا؟ سوال یہ بھی ہے کہ وطن سے یہ محبت اس وطن پرستی سے بڑی ہے یا چھوٹی جس کے ڈھنڈھورے اسٹیج سے پیٹے جاتے ہیں۔

اس وقت ایک واقعہ یاد آ گیا جو میں نے کے۔ ایم۔ پانیکر کی کسی کتاب یا اس کتاب پر کسی مضمون میں پڑھا تھا۔

پانیکر جرمنی میں بذریعہ ٹرین سفر کررہے تھے۔ ایک اسٹیشن آیا تو ان کا جی چاہا کہ کچھ پھل خرید لیے جائیں۔ اسٹیشن پر انھیں پھلوں کی دوکان یا کوئی پھل فروش نظر نہ آیا تو وہ جرمن زبان میں بدبداتے ہوئے کہ عجیب اسٹیشن ہے جہاں پھل بھی نہیں ملتے اپنے ڈبے میں لوٹ آئے۔

اتفاق سے ریل گاڑی وہاں کچھ زیادہ دیر رک گئی اور بس چلنے ہی والی تھی کہ انھیں ایک شخص نظر آیا جو ایک ٹوکری لیے بھاگا چلا آرہا تھا۔ اس نے ڈبے میں داخل ہوکر یہ ٹوکری پانیکر کو پیش کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ اگر آپ کبھی اس سفر کا حال لکھیں تو مہربانی کرکے یہ نہ لکھیے گا کہ جرمنی میں ایک ایسا ریلوے اسٹیشن بھی ہے جہاں پھل دستیاب نہیں ہوتے۔

یہ کتاب یا مضمون ان دنوں پڑھا تھا جب میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس واقعے کے بارے میں پڑھ کر میری آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ وطن سے کس قدر گہری محبت تھی

اس بزمن کو! ممکن ہے وہ جرمن نازی پارٹی کا کارکن رہ چکا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اس پارٹی سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا ہو لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنے وطن سے اس کی محبت بے مثال تھی اور اس میں کسی دوسرے ملک سے نفرت یا دشمنی کا شائبہ تک نہ تھا۔

ممکن ہے تازہ خداؤں میں وطن ہی سب سے بڑا ہو اور اس سے دامنِ تہذیب بھی تار تار ہو جاتا ہو لیکن اس جرمن کی وطن پرستی تو ایسی ہے کہ اس سے بے لباسی بھی زرق برق کپڑوں میں ملبوس ہو جاتی ہے۔ کاش ہندوستان کے تازہ اور باسی وطن پرستوں کو کسی نے بتایا ہوتا کہ کسی دوسرے ملک، کسی دوسری قوم اور کسی دوسرے نقطۂ نظر سے نفرت کیے بغیر بھی اپنے وطن سے محبت کی جا سکتی ہے اور یہ محبت زیادہ ہی ثمر آور ہوتی ہے۔

اس وقت کا شاہجہانی ماڈل ہائی اسکول میرے گھر سے خاصا دور تھا۔ میں نے چند ہی دنوں میں بہت سے دوست بنا لیے تھے وہ عمر ہی دوست بنانے کی تھی اگر چہ اس عمر کی دوستیاں بہت دنوں ساتھ نہیں دیتیں لیکن بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی یادیں ساری زندگی کا سرمایہ بن جاتی ہیں۔ ان دوستوں میں سب ہی پیارے تھے لیکن دو تین ... چھوٹے میاں، شمبھو اور احمد سہیل ... تو جان سے پیارے۔

اسکول ہم چاروں ساتھ ساتھ جاتے۔ سہیل جمعراتی بازار کے پاس رہتا تھا، چھوٹے میاں ہمارے گھر کے سامنے کی فصیل کی دوسری جانب کی سڑک پر مسجد سے پہلے اور شمبھو اسی سڑک پر آگے چل کر۔ سہیل پہلے مجھے لیتا اور پھر ہم دونوں چھوٹے میاں (اس کا نام معلوم نہیں کیا تھا اور ہم سب اسے چھوٹے میاں ہی کہتے) اور شمبھو کو لے کر اسکول جاتے۔ یہ سڑک آگے چل کر اس بڑی سڑک سے مل جاتی جس کے ایک طرف نور محل تھا اور دوسری طرف بدھوارہ یا جمعراتی بازار۔ نور محل کے لیے سڑک جس جگہ مڑتی تھی اسی جگہ دوسری طرف کی چھوٹی موٹی جھاڑیوں کے درمیان ایک شارٹ کٹ تھا جو نامکمل تاج المساجد کے پاس نکلتا۔

ایک دن اس شارٹ کٹ سے اسکول جاتے ہوئے ایک جھاڑی میں مکو سے کچھ بڑے پھل نظر آئے۔ جانے کیوں میرا جی چاہا کہ انھیں چکھ کر دیکھوں۔ چکھا تو بہت مزے دار لگا، سوندھا بھی تھا، نمی اس میں بس برائے نام تھی۔

میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ اسے کھا کے دیکھو مونگ پھلی کا مزا بھول جاؤ گے تو انھوں نے بھی چکھا اور پھر ہم چاروں نے ان کا خوب خوب مزا لیا۔ میں نے اس کا مزا دوبالا کرنے

کے لیے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور چاروں نے سگرٹیں جلالیں۔ اس وقت ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک بزرگ سامنے سے آ رہے تھے جنھوں نے ہمیں سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''اتنے سے ہواور ابھی سے سگریٹ پینے لگے''۔

میرے دوست تو خاموش رہے، شاید وہ کچھ شرمندہ تھے لیکن میں پٹ سے بول اٹھا۔

''اتنے بڑے ہوگئے اب بھی سگریٹ نہ پئیں؟''

یہ محض ہیکڑی تھی کیوں کہ اس دن، بلکہ تھوڑی دیر قبل ہی، ہم چاروں نے پہلی بار چار سگرٹیں اور دیا سلائی خریدی تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ اس کے بعد میں نے بھوپال میں اپنے قیام کے دوران کبھی سگریٹ پی ہو۔ اس شوق نے لَت کی شکل برسوں بعد لکھنؤ میں اختیار کی۔

اسکول پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی میرے پیٹ میں درد اور سخت مروڑ ہوئی اور میں چھٹی لے کر گھر چلا آیا۔ سات آٹھ دن بعد میں اسکول جانے کے قابل ہوا اور تھوڑی دیر سہیل کا انتظار کر کے چھوٹے میاں کو لینے اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا حال بھی میرے ہی ایسا ہوا تھا۔ شمبھو پہلے ہی اسکول جا چکا تھا۔

ہم دونوں اسکول پہنچے تو معلوم ہوا کہ سہیل کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس زمانے میں شاید تعزیتی جلسوں کا رواج نہیں تھا اور ہوتا بھی تو کیا فرق پڑتا کیوں کہ میرے لیے یہ غم ایسا نہیں تھا جس کا زخم ایسے کسی جلسے یا دومنٹ کی خاموشی سے بھر جاتا۔

سہیل میرا بے حد چہیتا اور پیارا دوست تھا۔ کبھی کبھی اس کی صورت اب بھی آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔

اس غم کا نشتر اس قدر گہرا تھا کہ اسی دن، اسی وقت، سید محمد عابد، سید عابد سہیل ہوگیا۔

اب کہاں جاؤ گے سہیل، اب تو ساری زندگی کا ساتھ نبھانا پڑے گا، میں تمھیں اپنے آپ سے ایک لمحہ کے لیے جدا نہ ہونے دوں گا۔

معلوم نہیں سہیل کی روح، اگر اس کا کوئی وجود ہے، میری اس محبت سے واقف ہے یا نہیں۔ برسہا برس گزر گئے لیکن کبھی کبھی سہیل کی یاد تڑپا دیتی ہے۔

سہیل! میں تمھیں الوداع کبھی نہ کہوں گا، کبھی نہیں۔

میں نہیں جانتا کہ جمال گوٹا کیسا ہوتا ہے لیکن بعد میں کئی بار خیال آیا کہ ممکن ہے وہ چھوٹا سا پھل جمال گوٹا ہی رہا ہو۔

چھوٹے میاں بھی کبھی کبھی یاد آتے ہیں۔ لیکن کچھ اوپر ساٹھ سال قبل جب اورئی سے ہائی اسکول پاس کر کے لکھنؤ آیا وہ کہیں زیادہ یاد آتے تھے۔ قاضی باغ کے پاس ہی ندان محل روڈ پر، پبلک لانڈری کے سامنے ڈاکٹر عظیم کا مطب تھا۔ ان کے کمپاؤنڈر بھی چھوٹے میاں کہلاتے تھے اور مجھے اس کے ہم شکل بھی لگتے۔ میں نے ان سے دو تین بار بھوپال کے بارے میں پوچھا لیکن وہ بھوپال والے چھوٹے میاں نہیں تھے۔

چڑیل

تاج المساجد اس وقت نامکمل تھی اور اس کے سامنے کے میدان میں بڑے بڑے چوکور پتھر سیکڑوں کی تعداد میں رکھے ہوئے تھے جن پر ''ش ج'' (شاہ جہاں) کھدا ہوا تھا۔ اس میدان میں بہت سے درخت تھے جنھیں معلوم نہیں کیوں ''چڑیل'' کہا جاتا۔ برسوں بعد بھوپال میں یہ نام لیا تو لوگوں کو حیرت ہوئی لیکن مجھے یہی نام یاد ہے۔ ممکن ہے اصل نام اس سے ملتا جلتا رہا ہو۔ ان درختوں سے جو چھوٹی چھوٹی پتیاں گرتیں اُن کے بیچ میں ایک بہت چھوٹا سا خشک میوہ ہوتا۔ ہم لوگ اسکول جاتے ہوئے بیس پچیس پتیوں سے یہ پھل نکال کر ضرور کھاتے جو سوندھے ہوتے، لیکن مٹھاس اور نمک سے عاری۔ اس دن بھی ہم چاروں وہاں گئے تھے لیکن زبان کو شارٹ کٹ کی جھاڑیوں کے پھل کا مزا لگ چکا تھا اس لیے شاید ایک آدھ ہی پتی سے پھل نکال کر کھایا اور اسکول چلے گئے، اس سڑک سے جس کے دونوں طرف جھیل تھی۔

۸ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو جس دن میں نے اوپر کے چار پانچ صفحات لکھے تھے، ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا اور میں اس کی کوئی توضیح نہیں کر سکتا۔

اپنے اوپر کے کمرے سے، جہاں میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں، نیچے آتے ہوئے زینے پر مجھے ویسی ہی پتی نظر آئی لیکن میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی، تاہم اسے دیکھتا ضرور رہا، دو زینے بھی اتر گیا، پھر پلٹا اور وہ پتی اٹھالی۔ ارے یہ تو وہی تھی، بالکل وہی۔ میں نے اس میں سے پھل نکالا اور دانتوں کے درمیان دبالیا۔ پھل بھی وہی تھا، وہی، بالکل وہی۔

لکھنؤ میں رہتے ہوئے ساٹھ سال ہو چکے ہیں، بھوپال سے واپسی کے بعد کا اورئی کا قیام بھی شامل کر لیا جائے تو یہ مدت اور بھی طویل ہو جاتی ہے۔ ان طویل برسوں میں یہ پتی میں نے کبھی نہ دیکھی تھی، پھر اس دن وہ میرے کمرے کے زینے پر کہاں سے آ گئی؟ کیا اس نے

بھوپال سے لکھنؤ تک کے سیکڑوں میل کا سفر صرف اس لیے کیا تھا کہ میں یہاں اس کا ذکر کر رہا تھا یا اسے وہ بظاہر بھولا بھالا لیکن شیطان صفت لڑکا یاد آ گیا تھا جو اس میں سے گودا نکال کر کھایا کرتا۔ کون جانے، ویسے خود کو مرکزِ کشش تصوّر کرنا کسے اچھا نہیں لگتا۔!

ایک دن ہم لوگ اسکول کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں کسی قدر سناٹے کا احساس ہوا اور پولیس کی موجودگی نے اس احساس میں کچھ اضافہ کر دیا۔ دوکانیں کھلی تھیں اور لوگ آ جا بھی رہے تھے لیکن ذرا کم کم۔

ہمارا اسکول ایک ڈھال پر تھا جس کے ایک جانب وہ عمارت تھی جس میں تعلیم ہوتی تھی اور دوسری جانب پرنسپل صاحب (معلوم نہیں کیوں انھیں ہیڈ ماسٹر کے بجائے پرنسپل کہا جاتا تھا) کا مکان، اسکول کے دفاتر، والی بال اور ٹینس یا بیڈ منٹن کورٹ تھے۔

اس ڈھال کے اوپر کے بائیں پھاٹک سے فوجی ٹرک آتے ہوئے اکثر نظر آتے لیکن اس دن ان کا تانتا نہیں ٹوٹ رہا تھا اور ان میں انگریز فوجیوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ اسکول کھلا تھا لیکن لڑکے روزانہ سے بہت کم تھے، چار چھے سپاہی بھی ادھر ادھر نظر آ رہے تھے۔

ان فوجیوں کو دیکھ کر مجھے وہ نظم یاد آ گئی جو ہم نے پھوپا کی الماری سے نکال کر پڑھی تھی اور میں نے اسے زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا۔ چھوٹے میاں اور شمبھو، جنھیں میں یہ نظم کئی بار سنا چکا تھا، جہاں جہاں ان کی یادداشت ساتھ دیتی میری آواز سے آواز ملا دیتے۔ اتنے میں ایک سپاہی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے حسنِ اتفاق ہی کہیے کہ ٹینس کورٹ کے پاس سے پرنسپل ابراہیم صاحب گزر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پتلا سا بید تھا۔ وہ تیزی سے سڑک کے کنارے کی اس جگہ کی طرف لپکے جہاں سپاہی میرا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا اور انھوں نے ساری بات معلوم کرنے کے بعد اس سے کہا کہ یہ میرے اسکول کا طالب علم ہے اور اسے سزا میں دوں گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور تقریباً کھینچتے ہوئے مجھے ٹینس کورٹ تک لے گئے۔ پھر انھوں نے مجھ سے دونوں ہتھیلیاں پھیلانے کے لیے کہا اور انھیں باری باری اپنے بید کا نشانہ بنانے لگے۔ وہ بید سر

۱۔ ان گرمیوں میں (۲۰۱۱ء) یہ چھوٹا سا پھل جگہ جگہ نظر آیا۔ کسی نے بتایا کہ اسے چلبل کہتے ہیں۔ اس کی بگڑی ہوئی صورت مجھے بطور چڑیل یاد تھی۔ سچ بات یہ ہے کہ پہلے کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا تھا، شاید اسی لیے نظر نہ آیا۔

کے اوپر تک لے جاتے، بہت تیزی سے نیچے کی جانب لاتے لیکن ہتھیلی تک پہنچتے پہنچتے اس کی ساری تیزی ختم ہو جاتی۔

اس وقت میں نے اسے اپنے طالب علم سے ان کی محبت سے تعبیر کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اس میں وطن کی آزادی کے لیے ان کی تڑپ کو بھی دخل تھا بلکہ شاید اس کا حصہ زیادہ ہی تھا۔

یہ بات غالباً ۱۹۴۲ء کی ہے لیکن تقریباً پینتیس برس بعد ۱۹۷۵ء میں جب اردو، ہندی، اسمیا اور شاید بنگلا کے تیرہ چودہ ادیبوں کے ساتھ مجھے بھی حکومتِ ہند کے محکمہ فیلڈ پبلسٹی نے شمالی ہند کی چند ریاستوں کا دورہ کرایا تو ایک واقعے نے مجھے بھوپال کی اس دن کی ''مار'' کی یاد دلادی۔ ہوا یہ کہ چندی گڑھ یونیورسٹی میں وفد کے استقبالیہ کے دوران، شاید سر کے کھچڑی بالوں کے سبب میری عمر کا غلط اندازہ لگاتے ہوئے مجھے مجاہد آزادی کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ بعد میں اپنی تقریر کے دوران جب میں نے کہا، ''کاش میں مجاہد آزادی ہوتا،'' تو سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اس وقت یہ بات ذہن میں نہیں آئی لیکن اب سوچتا ہوں کہ اگر اس دن کی ''پھولوں کی چھڑی'' سے پٹائی کا ذکر کر دیتا تو ابراہیم صاحب کی آزادیٔ وطن کی للک کے اعتراف کے علاوہ شاید مجھے بھی سب لوگ مجاہد آزادی تسلیم کر لیتے، اگرچہ یہ بھی ہوتا کہ میری تقریر کے دوران لوگ قہقہہ لگانے کے موقعے سے محروم رہ جاتے۔

وفد کی قیادت من متھ ناتھ گپت نے کی تھی اور وشنو پربھاکر کے علاوہ دیوندر ناتھ اِسّر بھی اس میں شامل تھے۔ اس دورے کا کچھ اور ذکر آگے آئے گا۔

غالب شناسی

اسی اسکول کے ایک استاد ابراہیم خلیل صاحب کا نام ایک دلچسپ حوالے سے غالب ''شناسوں'' میں درج ہو گیا۔

میری یادداشت کے مطابق ابراہیم صاحب نے، ان دنوں جب میں بھوپال میں مقیم تھا، ''اپریل فول'' کے موقع پر روزنامہ ندیم میں اس وضاحت کے ساتھ ایک غزل شائع کرائی تھی کہ غالب کی یہ غزل انھیں بھوپال کے ایک جاگیردار کے ذخیرۂ کتب سے حاصل ہوئی ہے۔

مجھے نہ وہ غزل یاد تھی نہ میرے پاس اس کی کوئی نقل موجود تھی۔ لیکن میرے کرم فرما

کوثر چاند پوری مرحوم کے صاحبزادے نعیم کوثر نے میری درخواست پر دسنوی صاحب کی کتاب ''غالبیات کے چند مباحث'' سے متعلقہ صفحات کی فوٹو کاپی عنایت کردی۔ ان صفحات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

''مسٹر ضمیر الحسن صدیقی جب اس موقع پر اپنی شوخیوں کی داد دے چکے تو ہم نے بھی اسی سلسلہ میں یارانِ قوم ادب کو دعوت نامے بھیج دیے۔ چنانچہ جوہر شناسان عیاد زبان نقادان کلام شعرائے ہندوستان یعنی ہمارے ارکان بزم ادب رونق افروز ہوئے۔ بذلہ سنجیاں ہوتی رہیں۔

آج کے پروگرام میں ایک نمبر یہ بھی تھا کہ خدائے سخن نواب میرزا اسعد اللہ خاں غالبؔ مرحوم مغفور کی ایسی متبرک غزل پیش کی جائے گی جو اَب تک ان کے دیوان یا اس کے کسی ضمیمہ میں شائع نہیں ہوئی ہے۔ یہ غزل ایک فرسودہ بوسیدہ کاغذ پر لکھی ہوئی تھی۔ حرفوں کی (صفحہ ۲۸ ختم ہوا) کشش بارہویں صدی ہجری کے نقش ونگار میں تھی اور ورق کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا۔

نقل مسودہ از قدیم کتب خانہ امیر الامرا میاں نواب یار محمد خاں صاحب بہادر مرحوم و مغفور جاگیردار ریاست بھوپال اور غزل کے اشعار ذیل تھے۔

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو — کیا لطف ہو جو ابلقِ دوراں بھی رام ہو
تا گردشِ فلک سے یوں ہی صبح شام ہو — ساقی کی چشم مست ہو اور دورِ جام ہو
بیتاب ہوں بلا سے کن انکھیوں سے دیکھ لیں — اے خوش نصیب کاش قضا کا پیام ہو
کیا شرم ہے حریم ہے محرم ہے راز دار — میں سر بکف ہوں تیغ ادا بے نیام ہو
میں چھیڑنے کو کاش اسے گھور لوں کہیں — پھر شوخ دیدہ برسرِ صد انتقام ہو
وہ دن کہاں کہ حرفِ تمنا ہو لب شناس — ناکام بد نصیب کبھی شاد کام ہو
گھس پل کے چشم شوق قدم بوس ہی سہی — وہ بزم غیر ہی میں ہوں پر اژدہام ہو
اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اٹھوں — مجھ پر جو چشم ساقیٔ بیت الحرام ہو

پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

(صفحہ ۲۹ ختم ہوا)

اس غزل کی نسبت میری رائے یہ تھی کہ غالب مرحوم جن دنوں بھوپال تشریف لائے تھے یہ غزل غالباً اس وقت کی کہی ہوئی ہے اگر چہ جناب خلیل کی بیاض میں اس کو دیکھا گیا ہے۔
اس نمائش میں یہ تبرّک بڑی قدر و عزت سے دیکھا گیا۔ دیکھیں ہمارے معاصر خصوصاً گہوارۂ ادب اس کی کیا قدر فرماتے ہیں۔

سلیمان۔ مدیر
(صفحہ ۳۰) (۱۹۷۱ء)"

اس تراشے کے مطابق یہ غزل الگزنڈرا جہانگیریا اسکول کے رسالہ گہوارۂ ادب، میں شائع ہوئی تھی لیکن میرا اب بھی خیال یہی ہے کہ اس کی اشاعت روزنامہ ندیم کے یکم اپریل ۱۹۴۲ء یا ایک آدھ سال قبل کے شمارے میں عمل میں آئی تھی۔

کتاب کے صفحہ ۳۰ کی تحریر کہ'' اس نمائش میں یہ تبرک بڑی قدر و عزت سے دیکھا گیا، دیکھیں ہمارے معاصر خصوصاً 'گہوارۂ ادب' اس کی کیا قدر فرماتے ہیں''۔ اس کے علاوہ یہ وضاحت کہ رسالہ الگزینڈرا جہانگیر یا ہائی اسکول بھوپال کا تھا، اور بریکٹ میں (۱۹۷۱ء) کا اندراج اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ یہ تحریر کسی دوسری جگہ سے نقل کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ شروع کی عبارت میں کچھ حصے ضرور چھوٹ گئے ہیں جس سے تشنگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ان دنوں بھوپال میں شاید ایک ہی سینما گھر تھا اور وہاں کوئی ایسی فلم لگی تھی جس میں ہماری عمر کے لڑکوں کے لیے خاص کشش تھی۔ اسکول میں اس کا خوب چرچا تھا۔ میں نے چھوٹے میاں اور شمبھو سے فلم دکھانے کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن وہ دو روپے جو مجھے ہر مہینے ملتے تھے تقریباً سارے کے سارے ختم ہو چکے تھے اور جو پیسے بچے تھے وہ اتنے نہیں تھے کہ ان سے اپنے دوستوں کو فلم دکھا سکتا۔ مجھے سخت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی اور اس سے نجات پانے کے لیے میں نے پھوپا کی گھڑی، جو اُن کے بستر پر رکھی ہوئی تھی، جیب میں ڈالی اور جمعراتی بازار میں ایک شخص کو جو ایک چھوٹی سی میز یا اسٹول پر گھڑیاں فروخت کرتا تھا، بیچ دی، کتنے میں یاد نہیں۔

شک کی سوئی میری جانب تھی کیوں کہ میں تین چار گھنٹے گھر سے غائب رہا تھا۔ چنانچہ مجھ سے ذرا سختی سے باز پرس کی گئی اور سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلا تو پھوپا کو اپنے بید سے کام لینا پڑا۔ پٹائی تو ہم تینوں کی ہوئی لیکن شاید پہلی بار خصوصی توجہ میری جانب تھی۔ مار سے بھوت بھی بھاگتا ہے، میری کیا حیثیت تھی، چنانچہ آخر کار میں نے چوری تسلیم کر لی اور سب کچھ اُگل دیا۔

اگلے دن بازار کھلنے کا وقت ہوتے ہی پھوپا مجھے لے کر جمعراتی بازار گئے اور میں نے اس چلتی پھرتی دوکان کی نشاندہی کر دی۔ پہلے تو دوکان کا مالک انکار کرتا رہا لیکن جب پھوپا نے پولیس میں رپورٹ کرنے کی دھمکی دی تو اس نے کلائی کی گھڑی کھول کر ان کے حوالے کر دی۔ اس نے فریم بدل دیا تھا۔ پھوپا نے کہا یہ گھڑی میری نہیں تو اس نے اصل فریم بھی ان کے حوالے کر دیا۔

پٹائی کے اس واقعے سے میں پھوپا سے بہت ناراض تھا اور اپنی حرکت پر شرمندہ بھی۔ وہ عمر اپنی غلطی ماننے کی نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں اپنی حرکت کے لیے طرح طرح کی تاویلیں تلاش کرتا، اگرچہ پھوپا کی محبتیں بھی یاد آتیں۔ وہ مجھے بالکل اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ کھانے پینے کی کوئی چیز باہر سے لاتے تو اس میں میرا حصہ بھی اتنا ہی ہوتا جتنا ان کے بیٹے بیٹیوں کا۔ میرے کپڑے ذرا سے میلے ہوجاتے تو ٹوکتے اور کپڑے تبدیل کرنے کے لیے کہتے اور پھوپی... وہ تو جان چھڑکتی تھیں۔ جس دن پٹائی لگتی، اپنے بیٹوں کی طرح میری چوٹ پر بھی ہلدی چونا لگاتیں اور روتی جاتیں۔

یہ سب مجھے اس وقت بھی یاد تھا لیکن میں پٹائی سے زیادہ شرمندگی کا مارا ہوا تھا اور کسی سے آنکھ ملا کر بات بھی نہ کر پاتا۔ چنانچہ میں نے اورئی بھاگ جانے کا فیصلہ کیا اور ہر ماہ آنے والے روپے جمع کرنے شروع کر دیے۔ بیچ میں عید پڑی۔ اس میں جو عیدی ملی وہ بھی خرچ نہ کی اور جیسے ہی آٹھ یا نو روپے ہوئے کسی کو بتائے بغیر اسٹیشن کا رُخ کیا۔

لیکن ابھی کچھ اور باتیں یاد آ رہی ہیں۔

چار چور

☆ شاہجہانی ماڈل ہائی اسکول کے سامنے کی چڑھائی پر داہنی طرف ایک بڑا پھاٹک تھا جس کے تھوڑا آگے پھلوں کے پیڑوں کا وہ سلسلہ تھا جہاں میں نے ایک چھیتا پھل کو اپنی ٹوپی اڑھا دی تھی۔ اس کے آگے جنگل تھا اور اس کا ایک حصہ ''چار املی'' کہلاتا کیوں کہ وہاں املی کے چار بڑے درخت پاس پاس تھے اور مشہور تھا کہ وہاں شاطر چوروں کا کوئی گروہ ایک بڑے سے درخت کے نیچے بیٹھ کر چوری کا مال آپس میں تقسیم کرتا ہے۔ ممکن ہے ان چوروں کی تعداد چار رہی ہو۔ اسی مناسبت سے یہ علاقہ ''چار چور'' بھی کہا جانے لگا تھا۔

برسوں بعد ان دنوں جب اقبال مجید بھوپال کے ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ تھے میں اپنی اہلیہ انیس نصرت کے ساتھ جنھیں آل انڈیا ریڈیو کی ایک مزاحیہ نشست میں شرکت کرنی تھی وہاں گیا اور اپنے ایک عزیز کے یہاں جو پولیس کے بہت بڑے افسر تھے مقیم ہوا۔ ان کا گھر افسروں کی ایک بڑی کالونی میں تھا۔ دوسرے ہی دن آس پاس کے علاقے میں گھومتے ٹہلتے مجھے احساس ہوا کہ یہ علاقہ دیکھا ہوا ہے اور تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ یہ شاید وہی علاقہ ہے جو اُن دنوں ''چار چور'' بھی کہلاتا تھا۔ میں نے اپنے عزیز سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا، ''پہلے یہاں چار چور رہتے تھے اب چار ہزار رہتے ہیں۔'' قطع نظر اس کے کہ یہ علاقہ وہی تھا یا نہیں ان کے جواب سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ''چار چور'' کے نام سے لوگ چالیس پینتالیس سال بعد بھی واقف تھے۔ مزید یہ کہ ان کا یہ جملہ ہمارے ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی اور افسر شاہی پر ایسا تبصرہ تھا جسے میں شاید ہی کبھی بھول سکوں۔

☆ بھوپال کی خوبصورت یادوں میں وہ مقدمہ بھی ہے جس میں ایک فریق کے وکیل سر وزیر حسن تھے اور دوسرے کے محمد علی جناح۔ مقدمہ کیا تھا اور اس کا انجام کیا ہوا یہ مجھے نہ اس وقت معلوم تھا نہ اب معلوم ہے لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ اسکولوں میں چھٹی نہ ہونے کے باوجود درجے خالی پڑے تھے اور عدالت کے باہر جم غفیر اکٹھا تھا کیونکہ مشہور یہ تھا کہ مقدمہ میں پنڈت نہرو بھی آرہے ہیں۔ میں وہاں نہیں تھا اور خاصے فاصلے پر سڑک کے کنارے ہونے کی وجہ سے کسی کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ میرے دوست لطیف صدیقی کا کہنا ہے کہ پنڈت نہرو نے کالا کوٹ کبھی نہیں پہنا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ لندن سے بار ایٹ لا کی ڈگری لینے کے بعد انھوں نے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں تھوڑے دنوں وکالت ضرور کی تھی اور ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد نے اپنی خودنوشت ''میرے جیون کی کچھ یادیں'' میں بھی یہی لکھا ہے۔ یہاں میں نے بھی وہی بات لکھی تھی جو عام طور سے مشہور تھی لیکن بالکل آخر وقت میں اتفاق سے سید محمد مہدی کا ایک غیر مطبوعہ خط مل گیا جس سے معلوم ہوا کہ سر وزیر حسن کو مہدی صاحب کے والد لائے تھے اور نواب بھوپال کے بھانجوں کے وکیل وہی تھے۔ (بھوپال کے آخری حکمران نواب حمید اللہ خاں کی بیٹی عابدہ سلطان کی خودنوشت میں اس مقدمہ کا کوئی ذکر نہیں ہے)

☆ ہمارے اسکول میں فاروق صاحب تاریخ پڑھاتے تھے۔ ان کا داہنا ہاتھ نہ جانے کیسا تھا

کہ کہنی سے مڑے بغیر سیدھا ہو جاتا۔ کلاس میں پڑھائی کے دوران وہ کسی طالب علم کی طرف ہاتھ اُٹھاتے اور کہتے۔ ''تم بتاؤ''

ہاتھ کہنی سے ذرا نہ مڑتا۔

ہم لوگ ان کی طرح ہاتھ اٹھانے کی بہت کوشش کرتے لیکن کامیاب نہ ہوتے۔

☆ ٹھنڈی سڑک پر سبزیوں کا ایک بہت بڑا باغ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ریاست میں ترکاریوں کی ساری فراہمی اسی پارک سے ہوتی ہے۔ اسی باغ سے ملحق سڑک شاید سیہور جاتی تھی۔ میں نے سائکل چلانا اسی سڑک پر سیکھا تھا، کسی کی مدد کے بغیر۔ کئی بار گرا بھی تھا۔ لیکن تین چار دن میں اس قدر مشاق ہو گیا تھا کہ ہینڈل چھوڑ کر سائکل چلانے لگا تھا اور اپنی اس مہارت کا ذکر دوستوں میں بہت فخر کے ساتھ کرتا۔

☆ ایک دن گھر کے سب لوگ پکنک کے لیے بھد بھدا گئے ہوئے تھے۔ پھوپا کے دو شاگرد بھی ساتھ تھے۔ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جایا گیا تھا۔ سیر سپاٹے کے بعد جب کھانا کھانے کا اہتمام ہونے لگا تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی چیز جس کے بغیر پکنک نامکمل رہ جاتی گھر پر ہی چھوٹ گئی ہے۔ ایک طالب علم نے جو سائکل بہت تیز چلاتا تھا کہا کہ میں ابھی لے کے آتا ہوں۔ اسے گھر کی چابی دے دی گئی۔ بھد بھدے سے موتی مسجد تک تو خیر ڈھلان ہی ڈھلان تھی اور اس کے بعد گھر کچھ ایسا دور نہ تھا۔ وہ ذرا کی ذرا میں پہنچ گیا ہو گا لیکن واپسی میں چڑھائی ہی چڑھائی تھی۔ اس نے جلد سے جلد پہنچنے کے لیے سائکل بہت تیز چلانے کی کوشش کی اور بہت تھوڑے وقفے میں بھد بھدا پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن اس کا داہنا پیر سوج گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ گھٹنے تک کی نسیں پھٹ گئی ہیں اور وہ اسپتال میں کئی مہینے علاج کے بعد صحت یاب ہو سکا۔

☆ زندگی میں پہلی فلم میں نے بھوپال ہی میں دیکھی تھی۔ فلم کا نام تو شاید ''نجمہ'' تھا لیکن فلم جو بھی رہی ہو یہ گانا یقیناً اس میں تھا:

کہیں عشق اے دل نہ ہو جائے رسوا
محبت کی باتیں ذرا چپکے چپکے
جو پانوں میں ہم کو کھلاتے ہیں مرچیں
دعا دے رہا ہوں انھیں چپکے چپکے

☆ بھوپال میں شعری بھوپالی کو بھی دیکھا اور سنا۔ ان دنوں ان کو ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ ان کے دو شعر اب بھی یاد ہیں۔

نہ ہے یہ اضطراب اپنا نہ ہے یہ بے خودی اپنی
تری محفل میں شاید بھول آیا زندگی اپنی
تقاضا ہے یہی دل کا وہیں چلیے وہیں چلیے
وہ محفل ہائے جس محفل میں دُنیا لٹ گئی اپنی

☆ ریاست بھوپال کے عوام نواب حمید اللہ خاں کی تقریباً پرستش کرتے تھے۔ وہاں پرجا منڈل ضرور قائم رہا ہوگا اور اس کے کارکن اور حامی بھی رہے ہوں گے لیکن نواب صاحب کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے عوام سے ان کی محبت، حسنِ سلوک، نہایت عمدہ نظم ونسق، مسلمانوں اور ہندوؤں سے یکساں سلوک، علم وادب کی قدردانی، عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اقدام اور برطانوی حکومت کی بے جا حمایت سے ان کا گریز اس محبت کی بنیاد تھے۔ اس محبت نے ان کے اور ریاست کے بارے میں طرح طرح کے افسانوں کو ضرور جنم دیا لیکن ان میں حقیقت کا بھی خاصا عنصر موجود تھا، مثلاً

☆ بہت سے لوگ بھوپال تال کو تقریباً سمندر سمجھتے تھے۔

☆ شملہ کی پہاڑیوں اور بھد بھدا کو ملک کا سب سے خوبصورت مقام تصوّر کیا جاتا۔

☆ نواب بھوپال کی بڑی بیٹی عابدہ سلطان عورتوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لیتی تھیں اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ کار موڑتے وقت اس کی رفتار سے سڑک کی گڈیاں اکھڑ جاتی ہیں۔

☆ عابدہ سلطان کا نکاح ۱۹۲۶ء میں نواب کوروائی سرور علی خاں سے ہوا، رخصتی ۱۹۳۳ء میں ہوئی اور ایک بیٹے کی پیدائش کے بعد دونوں کے درمیان تلخی کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نمودار ہوا، شاید ۱۹۳۵ء میں۔

☆ اور یہ تو میں نے خود دیکھا تھا کہ نواب بھوپال کی کار شہر سے گزرنے والی ہوتی اور خبر پھیل جاتی تو ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ سڑک کے دونوں طرف قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے۔

آزادیٔ ہند کے بعد ہندوستان کی بہت سی چھوٹی بڑی ریاستوں نے آزاد رہنے

کا فیصلہ کیا تھا۔ اُن میں سے بیشتر کو ہندوستان سے الحاق پر آمادہ کرنے میں نواب بھوپال کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کی کوششیں صرف جونا گڑھ اور حیدر آباد کے سلسلے میں کامیاب نہ ہوسکی تھیں اور ان کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ وزیر داخلہ سردار پٹیل نے بھی اس عظیم الشان کام کے لیے نواب بھوپال کی تعریف واضح الفاظ میں کی تھی۔ نواب بھوپال نے اپنی ریاست کے الحاق کے سلسلے میں صرف یہ شرط رکھی تھی کہ بھوپال کو نئی ریاست کا دار السلطنت بنایا جائے۔

◆◆◆

بھوپال سے فرار

اورئی کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر بیٹھ کر جو مقابلتاً سنسان جگہ پر تھی ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ اس احتیاط کے باوجود دھڑ کا لگا تھا کہ کہیں پھوپا کا کوئی شناسا دیکھ نہ لے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی آ گئی اور میں ایک ایسی سیٹ پر جو کھڑکی کے پاس تھی پیچھے کھسک کے بیٹھ گیا۔ گاڑی نے سیٹی دی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ڈبے میں بھیڑ بالکل نہ تھی، بہت سی بلکہ زیادہ تر بینچیں خالی پڑی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو لیٹ رہتا۔ کوئی سامان ساتھ نہ تھا، علاوہ ایک جھولے کے، جس میں دو تین جوڑ کپڑے میں نے رکھ لیے تھے۔ شاید پانچ ساڑھے پانچ روپے جیب میں تھے، بھوک لگی تو کچھ خرید کے کھالیا۔ بھوپال سے کافی دور نکل آنے کے سبب اب کسی قسم کا خوف یا پریشانی نہیں رہ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ رات میں نو دس بجے اورئی پہنچ جاؤں گا لیکن اب تک جھانسی بھی نہیں آیا تھا جب کہ سورج ڈوبے خاصی دیر ہو چکی تھی لیکن میں پریشان بالکل نہ تھا۔

اتنے میں ٹکٹ چیکر آ گیا۔ وہ میرے سامنے آیا تو میں نے ٹکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مسکرایا اور بولا، ''برخوردار آپ غلط ٹرین میں بیٹھ گئے ہیں۔ یہ ٹرین تو بمبئی جا رہی ہے۔ اگلا اسٹیشن آ رہا ہے، وہاں اتر جانا۔ دو تین گھنٹے کے بعد اسی اسٹیشن پر گاڑی آئے گی، اس پر بیٹھ جانا۔''

اس نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ اس ٹکٹ سے میں اورئی نہ جا سکوں گا اس لیے میں سمجھا کہ چوں کہ میں دھوکے سے غلط ٹرین پر بیٹھ گیا تھا اس لیے اسی ٹکٹ سے اورئی چلا جاؤں گا۔ تھوڑی دیر میں ایک بڑا سا اسٹیشن آ گیا اور میں گاڑی سے اتر کر ایک بینچ پر جو بالکل خالی تھی بیٹھ گیا اور اسٹیشن کی چہل پہل اور رونق میں کھو گیا۔

ان دنوں اسٹیشنوں کے نام اردو اور انگریزی میں لکھے ہوتے تھے اس لیے مجھے معلوم ہو گیا کہ اسٹیشن کا نام منماڑ ہے۔ اس وقت مجھے کسی قسم کی پریشانی کا احساس تک نہ تھا اور میں سمجھتا

تھا کہ گاڑی بس ذرا سی دیر میں آ جائے گی اور میں اس میں بیٹھ کر اورئی چلا جاؤں گا۔

تھوڑی دیر میں اسی بینچ پر ایک بزرگ جن کی لمبی سی داڑھی تھی آ کر بیٹھ گئے۔ ان کے کندھے سے ایک پوٹلی لٹک رہی تھی اور ایک ہاتھ میں ٹین کا چھوٹا سا بکس تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ ایک لڑکے کی انگلی پکڑے ہوئے تھے جس کی عمر چھے سات سال رہی ہوگی۔ پلیٹ فارم سے گاڑی چلی گئی تو انھوں نے تھیلے میں سے ایک ڈبّہ نکالا۔ اس میں کھانے کا کچھ سامان تھا۔ انھوں نے چپکے سے میری طرف دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کھانے کا ڈبّہ دیکھ کر میں نے نظریں دوسری طرف کر لیں لیکن انھوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

''بھیّا! تم کچھ کھاؤ گے؟''

میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا تو وہ لوگ کھانا کھانے لگے لیکن وہ بزرگ کبھی کبھی میری طرف دیکھ ضرور لیتے اور میں بھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کھانا بے دلی سے کھا رہے ہیں اور کبھی کبھی نوالہ اٹھاتے تو ہیں لیکن منہ تک لے جاتے لے جاتے اسے واپس ڈبّے میں رکھ دیتے ہیں۔ اتنے میں اسٹیشن پر ایک گاڑی آئی اور روشنی ان کے چہرے پر پڑی تو میں نے دیکھا وہ رو رہے تھے۔ میں نے ان کی جانب تھوڑا کھسک کے پوچھا:

''آپ رو کیوں رہے ہیں؟''

میرا سوال سن کر وہ زار و قطار رونے لگے اور ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں نے اور اس لڑکے نے جو اُن کے ساتھ تھا انھیں چپ کرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ خود بھی رونے لگا۔ ان دونوں کو روتا دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

وہ لڑکا ان سے بار بار کہتا، ''بابا اب مت رو، بھیّا تو چلے گئے... وہ لوٹ کے تو آئیں گے نہیں۔'' اس لڑکے کا نام عمر تھا لیکن مجھے یہ نہیں یاد کہ اس کا نام مجھے کب معلوم ہوا۔

بڑی مشکل سے وہ خاموش ہوئے۔ گاڑی کھڑی تھی، پلیٹ فارم پر چہل پہل تھی اور خوانچے والے کھانے پینے کا سامان بیچ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا وہ بار بار میری طرف دیکھتے ہیں اور جب میری نظر ان سے ملتی ہے تو وہ مُنہ دوسری طرف کر کے چپکے سے آنسو پونچھ لیتے ہیں۔ ان کا بار بار رونا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، میں نے اپنا سوال دہرا دیا، ''آپ رو کیوں رہے ہیں؟''

اس بار میرا سوال سن کر وہ ذرا دیر میری طرف دیکھتے رہے، پھر انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بتایا کہ ان کا بڑا بیٹا جو اپنی دادی کے ساتھ جونپور میں رہتا تھا پچھلے مہینے گومتی میں ڈوب کر مر گیا۔ یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے اور بولے، ''دریا میں باڑھ آئی ہوئی تھی''۔

بیٹے کے بارے میں باتیں کرتے کرتے انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس کی صورت مجھ سے بہت ملتی تھی۔

اتنے میں گاڑی چلی گئی اور پلیٹ فارم پر سناٹا ہو گیا۔ اب انھوں نے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے بھوپال سے اپنے فرار ہونے اور اس اسٹیشن پر گاڑی سے اتار دیے جانے کی ساری کہانی بیان کر دی اور رونے لگا۔ ظاہر ہے میں نے اپنی شرارتوں اور گھڑی چرانے کا ذکر نہیں کیا ہو گا... میں نے انھیں اپنا ٹکٹ دکھایا تو انھوں نے کہا کہ اس ٹکٹ سے تو تم اورئی نہیں جا سکتے کیوں کہ ایک تو تمھارے پاس یہاں سے بھوپال تک کا ٹکٹ نہیں ہے اور دوسرے بھوپال سے اورئی تک کا جو ہے وہ ایک دن پرانا ہو گیا ہے۔ یہ بات سن کر میں پریشان ہو گیا کیوں کہ میں تو سمجھتا تھا کہ گاڑی آئے گی تو میں اس میں بیٹھ کر سیدھا اورئی چلا جاؤں گا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اورنگ آباد جا رہے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ تم چاہو تو میرے ساتھ اورنگ آباد چلو، میں دس پندرہ دن میں تمھیں اورئی پہنچا دوں گا اور اگر ابھی جانا چاہو تو ٹکٹ خریدے دیتا ہوں۔

چاہتا تو میں یہی تھا کہ جلدی سے جلدی اورئی چلا جاؤں لیکن ان کی حالت اور بار بار کا رونا دیکھ کر میرا دل پسیج گیا اور میں نے کہا، ''آپ ہی پہنچا دیجیے گا۔''

میرے اس جواب میں پھوپا کا ڈر بھی ضرور سمایا رہا ہو گا۔ میں نے سوچا ہو گا کہ بھوپال کے اسٹیشن پر میری تلاش کی جا رہی ہو گی اور اگر کسی کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو غضب ہو جائے گا، خوب پٹائی لگے گی۔

اورنگ آباد

اورنگ آباد کے لیے گاڑی تھوڑے فاصلے سے جاتی تھی۔ ہم دونوں کو وہاں بٹھا کر وہ صاحب میرا ٹکٹ خرید لائے اور رات ہی میں ہم لوگ اورنگ آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس گاڑی کے ڈبے بھوپال سے منماڑ تک آنے والی گاڑی کے ڈبوں سے چھوٹے

تھے اور وہ چلتی بھی دھیمی رفتار سے تھی۔[1] میں نے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ گاڑی ریاست حیدرآباد کی ہے، دلّی والے بادشاہ کی نہیں۔ ''دلّی والے بادشاہ'' پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اورنگ آباد میں ان کا ایک بڑے اور ایک چھوٹے کمرے کا مکان ایک خاصے بڑے میدان کے کونے پر تھا۔ میدان کی دوسری جانب ایک بڑی سی درگاہ تھی۔ کئی دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ حضرت نظام الدین نام کے کسی بزرگ کی درگاہ ہے۔

ہم لوگ اورنگ آباد پہنچ گئے تو ہمارے وہاں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک ایک دو دو کر کے دس بارہ لوگ ان سے ملنے آئے اور ان کو طرح طرح سے دلاسا دیتے رہے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اللہ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ آپ کی ایک اولاد لے لی تو دوسری پلی پلائی دے دی۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں ان کے یہاں رہنے کے لیے تھوڑی آیا تھا۔ لیکن پھر یہ بات بھول بھال گیا۔ وہ عمر چھوٹی چھوٹی باتیں یاد رکھنے کی تھی بھی نہیں۔

میں نے وہاں ہر شخص کو انھیں ''مولوی صاحب، مولوی صاحب'' کہتے ہوئے سنا تو خود بھی یہی کہنے لگا۔ وہ پاس کی مسجد میں نماز پڑھاتے تھے۔ بہت صبح سو کر اٹھتے، نہا دھو کر مسجد جاتے اور واپس آ کر ناشتہ کا انتظام کرتے۔ وہ کھانا بھی خود ہی پکاتے جس میں ان کا بیٹا ہاتھ بٹاتا۔ اس گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ میں اس طرح کے مکان میں پہلے کبھی نہیں رہا تھا پھر بھی مجھے یہ مکان بھوپال کے مکان سے اچھا لگتا کیونکہ یہاں ڈانٹ ڈپٹ کرنے والا کوئی نہ تھا اور نہ میں کوئی ایسی بات ہی کرتا کہ ڈانٹا جاؤں اور کرتا بھی تو مولوی صاحب کچھ نہ کہتے، پیار سے سمجھا بجھا دیتے اور بس۔

دو تین دن بعد مولوی صاحب مجھے سیر کرانے لے گئے۔ عمر بھی ساتھ میں تھا لیکن یہ بات صرف پہلے دن کی ہے۔ بعد میں وہ صرف مجھے لے جاتے۔ وہ دس بجے کے قریب مجھے لے کر گھر سے نکلتے اور ظہر کی نماز سے پہلے ہی لوٹ آتے۔ کبھی کبھی کوئی کھانے پینے کی چیز بھی مجھے خرید دیتے لیکن اس میں سے خود کچھ نہ کھاتے۔ میں نے ان کے پاس دو طرح کے سکے دیکھے تھے، ایک تو وہی جو بھوپال میں چلتے تھے اور دوسرے کچھ ان سے مختلف۔ میرے پوچھنے پر

۱۔ لیکن میرے دوست مصحف اقبال توصیفی کا کہنا ہے کہ ریاست حیدرآباد کی ریل گاڑی کے ڈبے چھوٹے نہیں ہوتے تھے۔

انھوں نے بتایا تھا کہ یہ سکہ حیدرآباد کا ہے، اسے ''حالی'' کہتے ہیں اور دوسرا دلّی کے بادشاہ کا جو ''کلدار'' کہلاتا ہے۔ حیدرآباد کے سکّے کے بارے میں انھوں نے اور بھی کئی باتیں بتائی تھیں لیکن اب کچھ بھی یاد نہیں، علاوہ اس کے کہ دلّی کے بادشاہ کے سکّے کے مقابلے میں اس کی قیمت کم ہوتی تھی۔ مجھے یہ بات سن کر حیرت نہیں ہوئی تھی کیوں کہ اورئی میں بھی دو سکّے چلتے تھے جن میں سے ایک گوالیار کا کہلاتا تھا۔ دوسری طرح کے سکّے سے اس کی قیمت بھی کم ہوتی اور وہ تھوڑا بھدّا ہوتا تھا۔

اورنگ آباد میں ان تین چار دنوں کے سیر سپاٹے کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں علاوہ اس کے وہاں کی سڑکیں پکّی تھیں، شہر خوبصورت تھا، مکان بڑے بڑے تھے اور مولوی صاحب کے گھر سے خاصے فاصلے پر ایک بہت بڑا پارک تھا جس میں بیٹھنے کے لیے سفید پتھر کی بنچیں تھیں، پارک میں چھوٹی چھوٹی گھاس اُگی ہوئی تھی جو بہت اچھی لگتی۔ ذرا آگے ایک چبوترے پر گائے کا منہ بنا تھا جس سے ہر وقت پانی بہتا رہتا۔ تھوڑے فاصلے پر جہاں ایک پارک کے پاس کی بڑی سی عمارت میں دو پھاٹک تھے، خوب بڑے، دوسری طرف ایک سادہ سی قبر تھی جس کے چاروں طرف بہت خوبصورت جالی لگی ہوئی تھی اور ایک درخت اس پر سایہ کیے رہتا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ اورنگ زیب کی قبر ہے۔ یہاں میں کچھ کچھ بھول رہا ہوں۔ یہ جگہ خلدآباد کہلاتی تھی۔ وہاں ہم ایک دن کسی سواری سے گئے تھے لیکن کس سواری سے یہ یاد نہیں۔

ایک دن میں نے ایک لڑکا دیکھا جو کانوں میں چاندی کے دُر پہنے ہوئے تھا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا اور بال بڑے بڑے تھے اور اچھا لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کسی لڑکے یا آدمی کو دُر پہنے نہیں دیکھا تھا اس لیے اسے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے مولوی صاحب سے پوچھا تو وہ مسکرا کے رہ گئے اور انھوں نے کچھ کہا نہیں۔ دو تین دن بعد میں نے ایسا لڑکا دوبارہ دیکھا تو مولوی صاحب سے پھر پوچھا۔ اس بار بھی وہ خاموش رہے لیکن میرے بار بار کے پوچھنے پر انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر مسکرا کر کہا۔

''کسی نواب کا لونڈا ہوگا''۔

لفظ ''لونڈا'' میں نے پہلی بار اورنگ آباد ہی میں سنا تھا۔

اب یہاں آئے آٹھ دس دن ہو چکے تھے اور میں مولوی صاحب سے اورئی چلنے کے لیے کہنے ہی والا تھا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ ان کا بخار اترنے کا نام ہی نہ لیتا۔ بارے کسی طرح انھیں

اس سے نجات ملی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ دو چار قدم چلنا مشکل تھا۔ اس طرح تقریباً ایک مہینہ گزر گیا۔ بھوپال سے نجات مل جانے پر میں اس قدر مسرور تھا کہ اماں ابا کی یاد بھی کم کم ہی آتی اور جانے کیسے دل میں کچھ اس طرح کا خیال بیٹھ گیا تھا کہ اورنگ آباد میں خیریت سے میری موجودگی کے بارے میں انھیں معلوم ہوگا۔

خیر، ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو وہ اپنے بیٹے عمر کو ساتھ لے کر منماڑ کے لیے روانہ ہوئے جہاں ہم نے لکھنؤ جانے والی گاڑی پکڑی۔ مولوی صاحب کے ساتھ ایک بستر تھا اور ٹین کے ایک بکس میں تھوڑا سا سامان۔ وضو کرنے کے لیے لوٹا بھی اس بکس میں تھا۔ ان کا بستر ایک موٹی سی رسّی سے بندھا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اورئی پہنچا کر وہ جونپور چلے جائیں گے۔ یہ خیال معلوم نہیں کیسے میرے دل میں بیٹھ گیا تھا اگرچہ انھوں نے اس بارے میں مجھ سے کچھ کہا نہیں تھا۔

خیر سے بدھو...

مجھے بھوپال چھوڑے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا پھر بھی اس شہر کی ایسی ہیبت طاری تھی کہ اسٹیشن آنے کو ہوا تو میں سیٹ پر مولوی صاحب اور عمر کے پیچھے چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے عمر کا لال چوخانے دار رومال جسے سر پر باندھ کر وہ نماز پڑھتا تھا چادر کے نیچے اپنے منہ پر پہلے ہی ڈال لیا تھا۔ بارے گاڑی چلی تو جان میں جان آئی۔

رات میں شاید دس ساڑھے دس بجے ریل گاڑی اورئی پہنچی اور ہم اسٹیشن سے باہر نکلے تو میری نظر سندر اور اس کے تانگے پر پڑی لیکن وہ کچھ سواریاں بٹھا چکا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے آواز دی تو مجھے دیکھتے ہی وہ پہچان گیا اور وہیں سے چلا کر بولا۔

''بھیا آ گئے، کہاں چلے گئے تھے؟''

ان دنوں اورئی ایسے چھوٹے سے شہر میں زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس تانگے رہے ہوں گے۔ سندر جامع مسجد کے بازار والے دروازے کے پاس سڑک کے اس پار رہتا تھا۔ اماں کو جب بھی کہیں جانا ہوتا تو ایک دن پہلے کہلوا دیتیں اور وہ آ جاتا۔ اماں برقع اوڑھ کر تانگے پر بیٹھتی تھیں جس پر چاروں طرف چادر تنی ہوتی۔ ان دنوں پردے کا بہت زیادہ رواج تھا۔ بھوپال میں

عورتیں ایک جگہ سے دوسری جگہ زیادہ تر ڈولی میں جاتی تھیں۔ وہاں ہم لوگوں کے کچھ اعزا نور محل (ایک محلّہ) میں رہتے تھے، نور محل کا مکان ایسا تھا کہ ڈولی مکان کے دروازے پر نہیں لگ سکتی تھی اس لیے لوگ دونوں طرف چادر تان کے کھڑے ہوجاتے اور لماں یا پھوپی برقع پہنے پہنے ڈولی میں آ کر بیٹھ جاتیں۔ ڈولی میں ایک پتھر بھی رکھ دیا جاتا کہ کہاروں کو سواری کے وزن کا اندازہ نہ ہو سکے۔ اس ساری کارروائی کے بعد کہاروں کو جو ڈولی رکھ کر ہٹ جاتے تھے آواز دی جاتی۔

لیجیے اورئی سے بھوپال، جہاں سے جان بچا کر بھاگا تھا، پھر پہنچ گیا۔

مجھے دیکھ کر سندر نے پہلے والی سواریاں اتار دیں اور ہم لوگوں کو بٹھا کر تیزی سے تانگا دوڑانے لگا۔ سڑک اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور فرلانگ سوا فرلانگ کے فاصلے پر ٹاون ہال تک سڑک کے دونوں طرف پیچھے کے گھروں سے روشنی چمک اٹھتی تو ایسا لگتا کہ کوئی ہاتھ میں لالٹین لیے تیزی سے دوڑ رہا ہو، یہ روشنی درخت کے تنوں اور پتیوں میں کبھی چھپ جاتی اور کبھی نظر آنے لگتی۔

اس وقت تک اورئی میں بجلی نہیں آئی تھی یا ممکن ہے بڑے افسروں کے گھروں میں رہی ہو، بہر حال ہمارے گھر میں نہیں تھی اور لالٹین کی روشنی ہی سے کام چلتا تھا۔ تانگا خزانچی بازار[1] میں لڑکیوں کے اسکول کے پاس پہنچا تو سندر نے زور زور سے آواز لگانا شروع کر دی۔

''بھیا آ گئے، بھیا آ گئے''۔

میں گھر پہنچا تو دادے ابا نے مجھے چمٹایا، ابا نے سر پر ہاتھ پھیرا اور لماں چمٹا کر خوب خوب روئیں۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ میرے سر، ہاتھ اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتی جاتیں جیسے ٹٹول ٹٹول کر خود کو یقین دلا رہی ہوں کہ میں واقعی لوٹ آیا ہوں اور وہ خواب نہیں دیکھ رہی ہیں۔

سندر کی آواز سن کر محلّے کی کچھ عورتیں ہمارے یہاں آ گئی تھیں اور دو چار مرد باہر کھڑے تھے۔ ان دنوں مکان ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے تھے، لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے اور آج کل کی طرح ''کسے را با کسے کارے نہ باشد'' والی صورت نہ ہوتی۔

مولوی صاحب کو دادے ابا نے اپنے کمرے میں سلایا اور عمر گھر میں سویا۔ دو تین دن

۱۔ اب معلوم ہوا ہے کہ اورئی میں خزانچی بازار نام کا کوئی محلّہ نہیں ہے۔ البتہ یہ نہیں معلوم کہ لال رنگ کی اس عمارت میں جو ہمارے گھر سے بمشکل پچاس قدم کے فاصلے پر تھی لڑکیوں کا کوئی اسکول ہے یا نہیں۔

کے بعد مولوی صاحب نے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو دادے ابا نے کہا۔

''اب آپ ہمارے گھر کے فرد ہو گئے ہیں اور ہم آپ کو اورنگ آباد میں نہیں رہنے دیں گے۔ آپ وہاں سے اپنا سامان لے آیئے''۔

یہ سن کر مولوی صاحب حیران رہ گئے۔ انھوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ حالات یہ رخ اختیار کریں گے۔ ان کا زیادہ سے زیادہ یہ خیال رہا ہوگا کہ سفر خرچ اور انعام و اکرام دے کر انھیں رخصت کر دیا جائے گا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اورنگ آباد میں ان کا قیام ضروری ہے کیوں کہ وہاں وہ ایک مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں لیکن دادے ابا ان کی بات ماننے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے اور انھوں نے کہا کہ وہاں کسی دوسرے پیش امام کا انتظام کر لیا جائے گا اور آپ چاہیں تو یہی کام اور ئی میں کر سکتے ہیں۔ دادے ابا نے ان سے کہا کہ عمر کو یہیں چھوڑ جایئے لیکن مولوی صاحب کی اس بات کے بعد کہ وہ گھر گرہستی سمیٹنے میں ان کی مدد کرے گا دادے ابا نے اپنی بات پر زور نہیں دیا اور دو ایک دن میں مولوی صاحب عمر کے ساتھ لوٹ گئے۔ مجھے یہ معلوم کر کے کہ مولوی صاحب اور عمر اب یہیں رہیں گے بہت خوشی ہوئی کیونکہ مہینے سوا مہینے کے ساتھ میں دونوں سے انسیت ہو گئی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ دادے ابا نے مولوی صاحب کو کتنے روپے دیے۔ دادے ابا کی موجودگی میں ابا اس طرح کا کوئی کام کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ہمارے گھر کے سامنے کی پھلواری سے ملحق ایک کمرہ شکستہ حالت میں تھا۔ وہ ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ ان دنوں جب میں بھوپال گیا تھا ہمارے یہاں دو بکریاں تھیں اور لیگ ہارن مرغ اور مرغیاں۔ یہ کمرہ انھیں کے کام آتا تھا۔ مرغیوں کے دو ڈربے تھے، ایک میں تو مرغ ہی رہتا تھا۔ لیگ ہارن ابا کا چہیتا تھا۔ ہم لوگ پلنگ پر بیٹھ کر رات کا کھانا کھاتے تو ابا روٹی توڑ کے اپنے ہاتھ سے اسے کھلاتے۔ یہ مرغ اس قدر دبنگ تھا کہ بلّیاں اس سے ڈرتی تھیں اور اسے دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگتیں۔ گھر میں بھی ایک بلّی پلی تھی لیکن وہ اس سے کچھ نہ بولتا۔

اب ہمارے یہاں نہ بکریاں تھیں نہ مرغیاں اور وہ کمرہ خالی پڑا تھا۔ مولوی صاحب کی واپسی سے پہلے کمرے کی مرمت کرا کے اس میں دروازہ لگا دیا گیا۔ وہ یہ کمرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ آرام سے زیادہ اپنی قدر و منزلت سے خوش تھے۔ دادے ابا ان سے ''آپ جناب'' سے بات کرتے، ابا ''مولوی صاحب'' کہتے اور میں تو ان کا وہ بیٹا تھا جو انھیں پلا پلایا مل گیا تھا۔

وہ مجھے بہت چاہتے تھے اور کبھی کبھی کہیں سے آتے تو مٹھائی کی ایک پڑیا چپکے سے مجھے تھما دیتے۔

یہ بات غالباً ۱۹۴۳ء کے آخر یا ۱۹۴۴ء کے شروع کی ہے۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں ابا کے انتقال تک مولوی صاحب اور ان کا بیٹا ہمارے ساتھ ہی رہے۔ عمر کا داخلہ ایک مدرسہ میں کرا دیا گیا اور مولوی صاحب کسی مسجد میں پیش امام ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے کہا کہ دو آدمیوں کا کھانا ہوتا ہی کتنا ہے وہ خود پکا لیا کریں گے لیکن ابا اس پر راضی نہیں ہوئے۔ ابا کے انتقال کے بعد مولوی صاحب اور عمر لکھنؤ چلے گئے۔ معلوم نہیں کیسے انھوں نے قاضی باغ کے ہمارے مکان کا پتہ لگا لیا تھا اور کبھی کبھی وہاں آتے تھے۔ یہ بات اماں نے مجھے خط میں لکھی تھی اور ہائی اسکول کر کے اورئی سے واپس آ جانے کے بعد میں نے عمر کو چوک کی ایک دوکان میں چاندی کا ورق کوٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ دوکان غلام نبی کی فالودہ کی مشہور دوکان کے تقریباً سامنے تھی۔ مولوی صاحب سے بھی دو ایک بار ملاقات ہوئی تھی لیکن پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ممکن ہے دونوں جونپور چلے گئے ہوں۔

پھوپا کا خیال تھا کہ میں بھوپال سے بھاگ کر اورئی ہی گیا ہوں گا اس لیے انھوں نے میرے فرار ہونے کی خبر بالکل رسمی طور پر دی تھی اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ ابا اور اماں نے خبر ملنے کے بعد اور بھوپال کے لیے روانہ ہونے سے قبل محی الدین پور، الہ آباد، جونپور، رتھیڑی اور لکھنؤ، جہاں جہاں اعزا تھے یا میں جا چکا تھا، اطلاع دے دی تھی۔

بھوپال میں ابا نے میرے دوستوں سے مل کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں کوئی بھی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جس سے میرے بارے میں کچھ پتا چلتا کیوں کہ میں نے جان بوجھ کر اپنے ارادے کی کسی کو بھنک بھی نہ لگنے دی تھی۔ بھوپال میں یحیٰی بھائی اور خالد بھائی نے میری تلاش کے اس کام میں ابا کی ہر طرح مدد کی تھی۔ دس پندرہ دن تک میرا کوئی پتہ نہ چلا تو ابا مایوس ہو گئے لیکن ماں کا دل ہار مشکل سے مانتا ہے اور خوف بھی زیادہ کھاتا ہے۔ وہ ہر وقت روتی رہتیں، دعائیں مانگا کرتیں، ان کی نظریں ہر جگہ مجھے تلاش کرتیں اور حد یہ ہے کہ زمین پر نظریں گڑائے رہتیں اور جگہ جگہ اپنی چپل رگڑتیں کہ کہیں پھوپا نے مار کر مجھے گھر ہی میں نہ گاڑ دیا ہو۔ یہ ساری باتیں اماں نے مجھے بعد میں بتائی تھیں۔

اس بدقسمت واقعہ نے جس کا اصل قصوروار میں ہی تھا، ایک خاندان کے دو گھروں میں افتراق کی ایک گہری لکیر ڈال دی تھی جو پھوپی کی چھوٹی بیٹی اسماء نے چالیس پینتالیس برس

بعد لکھنؤ میں مجھ سے مل کر مٹادی۔ اس سے قبل اس نے ماہنامہ ''آجکل'' میں میرا پتہ دیکھ کر مجھے خط لکھا جس سے خط و کتابت اور بعد میں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اب ہمارے تعلقات بالکل ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے۔

◆◆◆

اورئی کے رات دن

بھوپال میں پڑھائی اورئی کے اسکولوں سے خاصی مختلف تھی۔ وہاں انگریزی کے علاوہ اردو، فارسی اور چھوٹے درجوں میں عربی کی تعلیم پر زور تھا جب کہ یوپی میں انگریزی کے علاوہ حساب، تاریخ اور جغرافیہ کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ میرے پاس ٹرانسفر سرٹیفکٹ ہوتا بھی تو یہاں داخلے کے کلاس کا تعین ٹیسٹ کے بغیر نہ ہو پاتا اور یہی اس کی عدم موجودگی میں بھی ہوا۔ ٹیسٹ کے بعد مجھے ڈی۔اے۔وی۔ کالج میں چھٹے درجے میں داخلہ دیا گیا جب کہ مَیں بھوپال میں بھی چھٹے درجے میں تھا۔ درمیان کے چند ماہ بھی ضائع ہو گئے تھے اس طرح کل ملا کر ایک سال کا نقصان ہوا۔

میں حساب میں بھوپال میں بھی کمزور تھا اس لیے یہاں آ کر زیادہ مشکل کا سامنا کرنا پڑا جب کہ اردو کا کورس میرے لیے بہت آسان ثابت ہوا۔ انگریزی تھوڑی بہت ابّا پڑھا دیتے اور بھوپال کی کمی اس سے پوری ہو جاتی۔ حساب کے لیے مولوی خدا بخش کے گھر جاتا۔ وہ کالج میں تو اردو اور فارسی پڑھاتے لیکن ان کا حساب بھی بہت اچھا تھا۔ وہ گھر آ کر بھی پڑھانے کے لیے تیار تھے لیکن ابا کا کہنا تھا کہ پیاسے کو کنویں کے پاس جانا چاہیے۔ کوئی پڑھانے کے لیے گھر نہیں آئے گا۔ چنانچہ میں حساب پڑھنے ان کے یہاں جاتا۔ ان کا حق المحنت ابّا خود جا کر انھیں دیتے۔ انھوں نے یہ رقم میرے ہاتھوں کبھی نہیں بھجوائی اور نہ مجھے معلوم ہوا کہ انھیں کتنے روپے دیے جاتے تھے۔

میں پڑھنے لکھنے میں کچھ زیادہ دلچسپی لیتا نہ کوئی ایسا ذہین ہی تھا جس کی وجہ سے میرا شمار اوسط درجے کے طالب علموں میں ہوتا لیکن فیل بھی کبھی نہیں ہوا۔

مولوی خدا بخش رام پور کے تھے اور مزاج کے بے حد سیدھے سادے۔ کرتا اور پتلی موہری کا پاجامہ پہن کر کالج آتے۔ دبلے پتلے تھے، چگی سی داڑھی تھی اور بائیں پیر میں ہلکا سا

لنگ، چنانچہ چھڑی لے کر چلتے لیکن اچھے لگتے اور اساتذہ اور طلبہ ان کی عزت کرتے۔

پونڈرک صاحب جو جغرافیہ پڑھاتے ہومیو پیتھی کی گولیاں کھاتے تھے اور کبھی کبھی ان کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلتی اور ہم لوگ پیٹھ پیچھے ان کی نقل کرتے۔ انھیں اردو بالکل نہیں آتی تھی اور وہ ششماہی امتحان کی اردو کی کاپیاں پڑھنے کے لیے مجھے اپنے گھر بلاتے۔ وہ ابا سے خوب اچھی طرح واقف ہونے کے سبب ہی یہ کام مجھ سے لیتے تھے۔ میں جواب پڑھ کر سناتا تو جتنے نمبر بتاتے میں سوال کے آخر میں لکھ دیتا۔ کبھی کبھی وہ جواب پر تبصرہ کرتے یا غلطیوں کی نشاندہی۔ ایک دن ششماہی امتحان کی میری ہی کاپی کے کسی جواب پر انھوں نے کوئی تبصرہ کیا یا غلطی کی نشاندہی کی تو میں اسے کاپی پر نوٹ کرنے لگا۔ انھوں نے کاپی پر کچھ لکھنے سے منع کیا لیکن میرے یہ بتانے پر کہ یہ میری ہی کاپی ہے وہ خاموش ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد کے جوابوں پر نمبر دینے میں انھوں نے کچھ نہ کچھ فیاضی ضرور برتی تھی۔ یہ بات شاید آٹھویں درجے کی ہے۔ اس زمانے میں ششماہی امتحان کی کاپیاں طلبہ کو دے دی جاتی تھیں۔ اب معلوم نہیں کیا حال ہے۔

ایک بات اور یاد آ گئی۔ ہسٹری اور جیوگرافی صرف مجھے ہی نہیں دوسرے لڑکوں کو بھی پریشان کرتیں اور ہم لوگ اکثر ان دونوں مضامین کے کلاسوں سے نکلتے ہوئے دھیرے دھیرے گنگناتے۔

ہسٹری جاگرافی بڑی بے وفا
رات کو رٹی ، صبح کو صفا
درجے میں گئے تو ماسٹر خفا
امتحان میں بیٹھے تو نمبر صفا

ان دنوں نویں درجے کے امتحان میں اردو کے طلبہ کو دس نمبر کا ہندی کا امتحان پاس کرنا ہوتا تھا اور ہندی کے طلبہ کو اتنے ہی نمبروں کا اردو کا امتحان۔ یہ امتحان یوں تو ایک مذاق ہوتا لیکن اس کے باوجود ہر طالب علم کو دوسری زبان کی شدبد تو ہو ہی جاتی، کم سے کم حروف شناسی اور زیادہ سے زیادہ اٹک اٹک کے دو چار جملے پڑھنے کی حد تک۔ دوسری زبان کی کتاب پتلی سی ہوتی اور پنڈت جی یا مولوی صاحب اس میں سے دو ایک پیراگراف پڑھواتے اور دو تین الفاظ کے معنی پوچھتے۔ میں ہندی کی کتاب لے کر پنڈت جی کے سامنے گیا تو انھوں نے کہا کوئی صفحہ کھول کر آٹھ دس سطریں پڑھو۔ میں نے کتاب کھولی تو آمنے سامنے کے وہی صفحات کھلے جہاں سے بار بار

موڑنے کی وجہ سے کتاب ایک طرح سے دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ یہ دونوں صفحے میں نے ہندی کے طلبہ سے پوچھ پاچھ کے خوب اچھی طرح یاد کر لیے تھے، یاد کیا رٹ لیے تھے۔ پنڈت جی سمجھ گئے اور انھوں نے میرے ہاتھ سے کتاب لے کر ایک دوسرا صفحہ سامنے کر دیا اور کہا اسے پڑھو۔ میں بمشکل دو چار الفاظ ہی پڑھ سکا تو پنڈت جی نے کہا کہ ''درجہ ملنے کے لیے یہ امتحان پاس کرنا لازمی نہ ہوتا تو میں تمھیں ایک بڑا سا شونیہ دے دیتا۔ جاؤ پاس کر دیا۔''

اسی طرح ہندی کے ایک طالب علم سے مولوی صاحب نے ''پرستش'' کے معنی پوچھے تو اس نے کہا ''پتھر''۔ اس کا جواب سن کر مولوی صاحب ہنسے اور بولے: ''پوجا پتھر ہی کی ہوتی ہے، اس لیے جواب پچاس فیصدی صحیح ہے۔ جاؤ دوسرے لڑکے کو بھیجو۔''

اس صورت حال کے باوجود آج تک اٹک اٹک کے ہی سہی جو تھوڑی بہت ہندی پڑھ لیتا ہوں وہ اسی امتحان کی دین ہے۔ ہندی کے طلبہ کو دس نمبروں کے اس امتحان سے یقیناً زیادہ فائدہ پہنچتا ہوگا کیوں کہ ان دنوں اردو ہی کا چلن تھا لیکن تین چار سال بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور ہندی کو لازمی مضمون قرار دے دیا گیا۔

آٹھویں درجے تک تو سارے ہی مضمون آسان ہوتے تھے اور شاید بھوپال کی تعلیم کے سبب میری اردو دوسرے ہم چشموں سے بہتر تھی۔ لیکن نویں کلاس میں سارے مضمونوں کی طرح اردو فارسی بھی مشکل ہوگئی۔ مولوی خدا بخش یہ دونوں ہی مضمون پڑھاتے تھے۔ وہ بہت اچھے استاد تھے اور گھنٹہ بجتے ہی کلاس میں آجاتے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی کہ اپنا سارا علم گھول کر طلبہ کو پلا دیں۔ نویں دسویں درجے کی کورس کی کتاب سروؔر صاحب کی مرتب کی ہوئی تھی اور مولوی صاحب بہت فخر سے کہتے کہ سروؔر صاحب میرے استاد ہیں۔ ان کی اس شاگردی پر ہم لوگ بھی کچھ کم فخر نہ کرتے۔

فارسی کے درجے میں وہ گردانوں پر بہت زور دیتے تھے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ماضی استمراری تمنائی تک کی گردان مجھے اب بھی یاد ہے (یہ بات دوسری ہے کہ فارسی میں اب اس کا استعمال متروک ہو چکا ہے)۔ میرے دوست شیام نے بھی، جس کا ذکر آ چکا ہے، اردو اور فارسی لے رکھی تھی۔ ''یعنی'' اس کا تکیۂ کلام تھا اور اس سے اردو یا فارسی کے کسی شعر یا عبارت کے معنی بتانے کے لیے کہا جاتا تو وہ جواب ''یعنی'' سے شروع کرتا۔ مولوی صاحب اسے سمجھاتے کہ پہلے اپنی بات کہو اور پھر تمھارے خیال میں کوئی بات پوری طرح نہ بتا پائے ہو یا اسے کسی دوسری طرح

بتانا چاہتے ہو تب ''یعنی'' کا استعمال کرو۔ بات اس کی سمجھ میں آ جاتی لیکن وہ دوسری کوشش میں بھی ابتدا ''یعنی'' ہی سے کرتا۔ ایک دن جانے کیسے مولوی صاحب کو غصہ آ گیا۔ جانے کیسے یوں کہ میں نے ان کو کبھی غصہ میں نہیں دیکھا تھا، نہ اس واقعے سے پہلے نہ اس کے بعد۔ اس دن بار بار ٹوکنے کے باوجود جب اس نے جواب کا آغاز ''یعنی'' سے کرنا نہ چھوڑا تو انھوں نے اس کی ہتھیلی پر دو چار بید جڑ دیے، وہ رونے لگا۔ لیکن اس پٹائی کے باوجود اس نے رونا دھونا ختم کرنے اور آنسو پونچھنے کے بعد جواب ''یعنی'' ہی سے شروع کیا تو مولوی صاحب کو ہنسی آ گئی۔ اس دن کے بعد انھوں نے اس غلطی پر اسے کبھی نہیں ٹوکا۔ فارسی دس گیارہ لڑکوں نے لے رکھی تھی جن میں شیام کے علاوہ کم سے کم تین دوسرے طلبہ غیر مسلم تھے۔ اردو میں طلبہ کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں فوجداری کے مشہور وکیل عبدالرزاق مرحوم کا بیٹا عبدالسلام، شیتل کمار سریواستوا، آنند سروپ نگم اور کاظم علی قریشی کے نام یاد آ رہے ہیں۔

آنند سروپ یادو، چندرما پرشاد کھرے اور بنواری لعل وکیل کا بیٹا رمیش چندر سریواستو میرے کلاس فیلو تھے۔ چند روز قبل کی ایک ملاقات میں عبدالسلام صاحب نے بتایا کہ رمیش چندر ترقی کرتے کرتے ہائی کورٹ کا جج ہو گیا تھا۔

غازی محمود دھرم پال

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ مضبوط ہو رہی تھی تاہم اورئی میں اس کا کوئی خاص اثر نہ تھا۔ عبداللطیف نامی ایک مشہور وکیل اس کے صدر تھے، لیکن اس کی کوئی مضبوط تنظیم تھی نہ پُر جوش کارکن البتہ فضلو نام کا ایک نوجوان، جو کچھ سنکی سا تھا، مسلم لیگ اور پاکستان کے لیے دیوانہ ہو رہا تھا۔ کپڑوں لتوں سے بے نیاز اور پھٹی پرانی چپل پہنے ہوئے فضلو کو بزریا میں میں تیز تیز چلتے اور خود سے باتیں کرتے ہوئے میں نے کئی بار دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر دوکاندار، جو زیادہ تر مسلمان ہوتے، اس سے پوچھتے: ''فضلو میاں کتنا پاکستان بن گیا'' تو شروع شروع میں وہ اسے کوئی اہمیت نہ دیتا لیکن جب ہر دوکاندار یہی سوال اس کی جانب اچھالتا تو وہ مسکرا دیتا۔ پھر دھیرے دھیرے یہ سوال اس کی چڑ بن گیا اور وہ ایسی بری بری گالیاں دیتا کہ ماں بہن تک کی ان کے سامنے حقیر لگتیں۔

ان دنوں پاکستان کے مطالبے کی حیثیت بس زیادہ سے زیادہ یہ تھی کہ اس کے ذریعے

مسلمانوں کے لیے کچھ اور مراعات حاصل کر لی جائیں، خاص طور سے ان صوبوں میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ پاکستان کے مطالبے سے ہندوؤں کو نہ کوئی خوف محسوس ہوتا نہ مسلمانوں نے اس سلسلے میں کوئی ایسا خواب آنکھوں میں بسایا تھا جس سے کوئی خوف زدہ ہو جائے۔ مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں میں انھیں کچھ زیادہ حقوق دینے میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ تھی الا اس کے کہ یہ ایک رہنما اصول بن جاتا اور ہندو بھی ان صوبوں میں جہاں وہ اقلیت میں تھے اپنے لیے اسی طرح کے حقوق کا مطالبہ کرتے۔ مولانا آزاد نے کہا تھا کہ اس میں مول تول کی کوئی بات نہیں۔ جو ایک ہاتھ سے لوگے وہی دوسرے ہاتھ سے دینا پڑے گا۔ مسلمانوں نے یہ سوچا بھی نہ تھا، چنانچہ معاملہ ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا۔ صوبۂ سندھ، پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، بنگال اور آسام میں اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی ہندوؤں کو دینا مسلمانوں کو کسی طرح قبول نہ تھا۔ ایک پر لطف بات یہ ہے کہ ان دنوں اقلیتوں کو زیادہ نمائندگی دینے کے اصول کو Weightage کہا جاتا تھا اور یہ لفظ کچھ اس طرح چلن میں آ گیا تھا کہ انگریزی کے اخباروں میں بھی ٹھاٹھ سے استعمال ہوتا جب کہ انگریزی کی کسی ڈکشنری میں اس طرح کا کوئی لفظ موجود ہی نہیں، Bio-data کی طرح۔ میرا خیال ہے یہ بات ۱۹۴۵ء کی ہے۔ (لیکن ان دونوں الفاظ کے غلط ہونے کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا) پھر نہ جانے کیا ہوا کہ مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھنے لگی اور سبز رنگ کے جھنڈے جن پر چاند تارا بنا ہوتا چند مکانوں پر لہرانے لگے تاہم یہ سارے مکان کھاتے پیتے مسلمانوں کے تھے۔ عام مسلمانوں کے لیے پاکستان کے نعرے میں کوئی کشش نہ تھی۔

انھی دنوں اورئی میں پراسرار طور پر جگہ جگہ ایک پوسٹر نمودار ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ فلاں تاریخ کو ایک مشہور نومسلم جن کا نام غازی محمود دھرم پال ہے شہر کے ایک میدان میں (جو تین طرف سے مسلم آبادی سے گھرا ہوا تھا) تقریر کریں گے۔ اردو کے اس پوسٹر میں دعوا کیا گیا تھا کہ غازی محمود دھرم پال پیدائش سے ہندو تھے۔ جوانی کے دنوں میں ان کے دل میں اپنے مذہب کے بارے میں کچھ شکوک پیدا ہوئے تو انھوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا لیکن یہاں بھی انھیں سکونِ قلب نصیب نہ ہوا کیوں کہ حضرت عیسیٰ کے خدا کے بیٹے ہونے کا تصور ان کی سمجھ میں نہ آتا، تو وہ مسلمان ہو گئے اور اب اسی کو سچا مذہب مانتے ہیں اور شہروں شہروں گھوم کر ہندوؤں اور عیسائیوں کو مناظرہ کی دعوت دیتے ہیں۔ پوسٹر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ دو چار جگہ پادریوں اور ہندو دھرم شاستریوں نے ان کی مقابلے کی دعوت ضرور قبول کی لیکن انھیں ایسی شکست فاش نصیب

ہوئی کہ پھر کوئی ان کے مقابلے پر نہ آیا۔ یہ پوسٹر خاص طور سے مسلم محلوں میں لگائے گئے تھے۔

شہر میں غازی محمود دھرم پال کا بہت چرچا تھا تاہم یہ صورت بازاروں تک محدود تھی اور میں نے ان گھروں میں جہاں میرا آنا جانا تھا اس اشتہار کا کوئی ذکر نہیں سنا، لیکن پھر جب ان کی آمد کو دو تین دن رہ گئے تو سڑکوں سڑکوں، گلیوں گلیوں ڈگی پٹی گئی اور چار چار یا پانچ پانچ لوگوں کے گروہوں نے بھونپو سے غازی محمود دھرم پال کے پروگرام کا کچھ اس طرح اعلان کیا کہ یہ نام در و دیوار توڑ کر گھروں میں داخل ہو گیا۔ ہوتے ہوتے مقررہ تاریخ آ گئی۔ اس میدان کو جس کے ایک طرف ایک چھوٹا سا اسکول تھا اور جو ایک سمت سڑک سے مل جاتا، خوب اچھی طرح سجایا گیا، چاروں طرف سبز جھنڈیاں لگائی گئیں اور ایک مکان پر کسی نے بڑا سا سبز جھنڈا لہرا دیا۔ شام ہوتے ہوتے وہاں دریاں بچھا کر دو تخت ڈال دیے گئے اور شاید جناب صدر کو زیادہ ذی وقار بنانے کے لیے سفید چادر پر قالین بچھانے کے بعد اس پر ایک گاؤتکیہ بھی رکھ دیا گیا۔

شام ہی سے لوگ میدان میں جمع ہونے لگے اور عشاء کے بعد جب تقریر شروع ہوئی تو نہ صرف میدان بھر گیا بلکہ سامنے کی سڑک اور اتھائی کی طرف جانے والے راستے پر تھوڑی دور تک سر ہی سر نظر آنے لگے۔ اماں نے تقریر پاس کے ایک مکان سے سنی اور میں نے اسی مکان کے چبوترے سے۔

غازی محمود دھرم پال آئے تو اسٹیج تک راستہ بنانے کے لیے مجمع کائی کی طرح چھنٹ گیا۔ اسٹیج پر وکیل عبداللطیف اور چند مولوی حضرات پہلے سے موجود تھے جنھوں نے اللہ اکبر کے نعروں کے درمیان کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ دھرم پال صاحب گیروے رنگ کے کپڑے پہنے تھے، کرتا اور لنگی۔ دراز قامت اور دہرے بدن کے غازی محمود کلین شیو تھے اور شکل وصورت اور گیروے رنگ ہی کی پگڑی سے، جو صافہ سے بالکل مختلف تھی، کسی طرح مسلمان معلوم نہ ہوتے، تاثر شاید وہ یہ ڈالنا چاہتے تھے کہ ایک ہندو بچہ اسلام کا کیسا شیدائی ہو گیا ہے۔

سب سے پہلے عبداللطیف صاحب نے استقبالیہ تقریر کی، پھر دو تین مولوی حضرات نے غازی محمود کی حق گوئی پر تحسین کے پھول نچھاور کیے۔ اس سب کے بعد جب دھرم پال صاحب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو کئی منٹ تک نعرۂ تکبیر بلند ہوتا رہا۔ اس وقت تک اورئی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات بہت خوشگوار تھے بلکہ سچ پوچھیے تو ان میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق ہی نہ تھی لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ ان نعروں کو ہندوؤں نے

خطرے کی گھنٹی ضرور سمجھا ہوگا۔

غازی محمود دھرم پال نے ہندو مذہب کی سخت نکتہ چینی کی، دیوی دیوتاؤں کا مذاق اڑایا، ہندوؤں کے مذہب کی خوب خوب برائیاں کیں اور اسے مہمل اور ڈھکوسلہ قرار دیا لیکن بس تھوڑی دیر، اگرچہ کسی قدر جارحانہ انداز میں۔ انھوں نے عیسائیت کی بھی نکتہ چینی کی لیکن بس برائے بیت اور پھر اسلام کی تعریف شروع کردی اور اپنے حساب دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کے علاوہ کوئی مذہب سچا نہیں ہے۔ وہ بہت عمدہ مقرر تھے۔ جوش دلانا بھی جانتے تھے اور پھر اس جوش کو ٹھنڈا کرنا بھی۔ وہ اسلام کی تعریف کرتے تو مسلمان پر جوش نعرے لگاتے اور دوسرے مذہبوں کا مذاق اڑاتے تو مجمع قہقہہ زار بن جاتا اور جب وہ دین اسلام کی تلقین کرتے اور مسلمانوں کو غیرت دلاتے، ان کی بے دینی کا ذکر کرتے تو مجمع گویا دیوار گریہ میں تبدیل ہو جاتا اور ایسا لگتا کہ آنسو اور آہیں انھیں پورا مسلمان بنا کر ہی دم لیں گی۔

دیر رات تک کی اس تقریر سے کتنے سامعین کے دل کدورتوں سے پاک ہوئے، خشوع و خضوع سے نمازیں پڑھنے والوں کی تعداد میں کتنا اضافہ ہوا اور کتنوں کے دل و دماغ ایمان کی روشنی سے منور ہو گئے یہ نہ مجھے معلوم ہوا نہ اس کا پتہ لگانے کی میری عمر ہی تھی لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ اگلے دن شام ہوتے ہوتے مسلمانوں کے بہت سے گھروں پر چاند تاروں سے مزین سبز پرچم لہلہا رہا تھا۔ ہندوؤں کے گھروں پر بھگوا جھنڈے تو نہیں نظر آئے لیکن میں نے ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج میں اپنے ایک غیر مسلم دوست اور کلاس فیلو کو بہ آواز بلند غازی محمود دھرم پال کو برا بھلا کہتے دیکھا اور سنا۔

کہا جاتا تھا کہ ان کے سگے بھائی بالکل اسی طرح ہندو مذہب کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ میں نے انھیں نہ دیکھا نہ سنا اس لیے اس سلسلے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن اورئی میں مشہور یہی تھا۔

غازی محمود دھرم پال کی تقریر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تو نہیں کیا لیکن مسلمانوں میں اپنے وکیلوں، ڈاکٹروں اور افسروں کی غیر معمولی اہمیت کا احساس اور ان کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا جذبہ ضرور پیدا کر دیا اور زندگی کو ہندو۔ مسلمان کے پیمانوں سے آنکنے کی للک بھی۔ عبداللطیف صاحب اچھے وکیل تھے، میں نے ان کے گھر کے باہر موکلوں کی بھیڑ بھی کئی بار دیکھی تھی لیکن راتوں رات وہ شہر کیا پورے صوبے کے

سب سے بڑے وکیل بن گئے۔ کچھ یہی حال ڈاکٹر خان کا ہوا جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ پہلے کسی مشہور ڈاکٹر کے کمپاؤنڈر تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی دوکانوں پر ان کے ہم مذہب خریداروں اور ہندوؤں کی دوکانوں پر ہندو خریداروں کی تعداد میں اضافہ نظر آنے لگا۔ مذہب کی بنا پر ترجیح کی اس جنگ میں اقتصادی طور سے مسلمانوں کا یقیناً نقصان ہوا ہوگا کیوں کہ آبادی کے تناسب سے ان کی دوکانیں زیادہ تھیں۔

اماں کی ایک اور دوست تھیں جنھیں میں تنویر خالہ کہتا تھا ان کا مکان جامع مسجد کے صدر دروازے کے پاس نالے کی متوازی سڑک پر تھا اور وہ مسلم لیگ کی زبردست حامی تھیں۔ انھیں کے زیر اثر اماں مسلم لیگی ہوگئی تھیں۔ انھیں دنوں انتخابات بھی ہوئے۔ مسلم لیگ کے امیدوار عبداللطیف تھے اور کانگریس کے الٰہ آباد کے کوئی ڈاکٹر فاروقی۔ فاروقی صاحب کے بارے میں کانگریسی کہتے کہ وہ جغرافیے کے ڈاکٹر ہیں تو مسلم لیگی ان کا خوب مذاق اڑاتے کہ ڈاکٹر تو مریضوں کا علاج کرتا ہے جغرافیے سے اس کا کیا تعلق اور اپنے امیدوار کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ یہ انتخاب جداگانہ حق رائے دہی کی بنیاد پر ہوا تھا۔ امیدوار اور ووٹر دونوں ہی مسلمان تھے ظاہر ہے مسلم لیگ کے امیدوار کو کامیاب ہونا تھا اور یہی ہوا بھی۔

ووٹ ٹاون ہال میں ڈالے گئے تھے اور اماں کے ساتھ میں بھی وہاں موجود تھا۔

سرکاری ملازم ہونے کے باوجود ابا کا رجحان کانگریس کی طرف تھا۔ ایک دن کچہری سے لوٹے تو انھوں نے دیکھا کہ گھر پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ انھوں نے اس وقت تو کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا لیکن دو تین دن کے بعد کانگریس کا جھنڈا لہرانے کے لیے مجھ سے کہا اور جھنڈے اور بانس کے لیے شاید ایک روپیہ دیا۔ میں انھیں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اماں کے کہنے پر مسلم لیگ کا جھنڈا اپنے دوستوں کی مدد سے میں نے ہی لگایا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ کانگریس کا جھنڈا ابھی بزریا کی اسی دوکان میں ملتا ہے۔ کاپی کتابوں کی یہ دوکان چاکی والوں کے گھر کے پاس تھی۔ لیکن یہ بالکل نہیں یاد کہ بانس کہاں سے آئے تھے۔ میں نے وہاں سے کانگریس کا جھنڈا حاصل کیا اور اپنے انھی دوستوں کی مدد سے جنھوں نے مسلم لیگ کا جھنڈا لگانے میں میرا ہاتھ بٹایا تھا کانگریس کا جھنڈا بھی لہرا دیا۔

اورئی میں ہمارا واحد مکان تھا جس پر کانگریس اور مسلم لیگ کے جھنڈے بیک وقت لہرا رہے تھے لیکن یہ ''افتخار'' چند روزہ تھا اور چند روزہ بھی کیا بس دو تین روزہ! دوسرا جھنڈا لگنے کے

بعد اماں پر مسلم لیگ کا بھوت بس دو دن سوار رہا۔ تیسرے دن انھوں نے اپنا جھنڈا اتروا دیا۔ ابا نے ایک ہی جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھا تو خوش ہوئے اور اگلے دن کانگریس کا جھنڈا بھی منظر نامہ سے غائب ہو گیا۔

ان دنوں کے لوگ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کس قدر خاموشی سے کرتے تھے، ایک دوسرے پر جتائے بغیر۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے جھگڑے سے میں کچھ ایسا واقف نہ تھا لیکن مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ اورئی کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایک طرح کا منٹاؤ پیدا ہو گیا ہے اور اب وہ پہلے والی بات نہیں رہ گئی ہے۔

ڈی۔اے۔وی۔کالج میں چڑھائی کے بعد اس جگہ سے ذرا پہلے جہاں سے کالج کی عمارت شروع ہوتی تھی ایک چھوٹی سی بغیہ تھی جس میں ایک کنواں بھی تھا۔ ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں مطلوب بھائی اور دوسرے بھائی بہن رتھیڑی سے آئے ہوئے تھے۔ میں مطلوب بھائی کو صبح صبح اپنا اسکول دکھانے لے گیا تو وہاں کچھ لوگوں کو جو ہاتھ میں لاٹھیاں لیے تھے بغیہ سے نکلتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان میں میرے کالج کے بھی کچھ لڑکے تھے۔ وہ ہاف پینٹ پہنے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس بغیہ میں اتنے لوگ لاٹھیوں کا کیا کر رہے تھے لیکن برسوں بعد لکھنؤ میں راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کی پریڈ دیکھ کر سمجھ میں آ گیا کہ ہمارے اسکول کی بغیہ میں بھی یہی ہو رہا تھا۔

اماں کے ساتھ خواتین کے ان اجتماعات میں جو مسلم لیگ کے سلسلے میں ہوتے تھے، جانے کے سبب مجھ پر مسلم لیگ کا رنگ چڑھنے لگا تھا۔ لیکن میرے ذہن میں ہندو۔ مسلم کا کوئی خانہ نہ تھا۔ میرے دوستوں میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے بلکہ شاید ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان دوستوں میں مسرا، رمیش چندر شریواستوا، نصیر، پربھوشنکر، شیام اور عزیز شامل تھے۔ ابراہیم کے والد کا کہیں تبادلہ ہو گیا تھا اور وہ اب اورئی میں نہیں تھا۔

ابراہیم سے، جس کے بغیر کبھی ایک دن گذارنا مشکل تھا، پچیس تیس سال بعد بصد اشتیاق لکھنؤ میں ملاقات کی نوبت آئی تو ہم دونوں کے درمیان کچھ بھی مشترک نہ رہ گیا تھا۔ وہ کسی بینک یا تجارتی ادارہ سے وابستہ تھا اور میری دلچسپیاں ادب، صحافت اور سیاست سے تھیں۔ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ چائے پی اور آدھ گھنٹے تک ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے

رہے۔

وقت بھی اپنے ساتھ سب کچھ بہالے جاتا ہے اور جیتے جی اجنبیت کی دیواریں ان چہیتوں کے درمیان بھی قائم کر دیتا ہے جو اَب بھی ایک دوسرے کی دسترس میں ہوتے ہیں۔

شیام کے گھر مَیں اکثر جاتا۔ اس کے والد وید تھے اور اس کا مکان اتھائی سے جامع مسجد جانے والی سڑک کی ڈھال پر تھا۔ وہ مجھے مزیدار چورن کھلاتا اور وید جی نے بھی جو دیکھنے میں بہت خرانٹ تھے کئی بار چورن دیا تھا۔ شیام کی بڑی بہن شیاما بہت خوبصورت تھی اور اس کی شادی ہو چکی تھی۔ لیکن یہ شادی کامیاب نہیں رہی اور اس کی سسرال والوں نے اتنے دکھ دیے کہ عاجز آ کر وید جی اسے صبح صبح سائکل پر بٹھا کر کالپی سے گھر لے آئے اور پھر اسے سسرال نہیں بھیجا۔

وید جی کے مکان کی کرسی اتنی اونچی تھی کہ تین چار زینے چڑھنے کے بعد ہی اس میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ گھر میں آنگن کے بعد ایک بڑا سا دالان تھا جس کی چھت میں ایک کڑے سے دو موٹی موٹی رسیاں لٹکی رہتیں۔ شیاما دیدی اس پر بیٹھ کر جھولا جھولتیں اور جب میں اور شیام باری باری بیٹھتے تو وہ خوب جھکولے دیتیں۔ وہ ہر وقت ہنستی اور مسکراتی رہتیں۔ اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اب ان کی صورت اور ہنسی یاد آتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ ان کی ہنسی جھوٹی تھی اور وہ اس کے پیچھے اپنا دکھ درد چھپاتی تھیں۔

اب میں بڑا ہو گیا تھا اور اماں کے ساتھ عورتوں کے جلسوں اور مجلس میلادوں میں نہیں جاتا تھا۔ اس ''بڑے ہونے'' کا احساس بہت دلچسپ طریقے سے ہوا۔ ان دنوں ریل گاڑی میں عورتوں کے ڈبے الگ ہوتے تھے۔ اماں لکھنؤ آ رہی تھیں اور میں کسی اسٹیشن پر دروازے میں کھڑا تھا۔ اسی وقت ٹکٹ چیکر کی نظر مجھ پر پڑی اور اس نے یہ کہتے ہوئے کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو مجھے دوسرے ڈبے میں بٹھا دیا۔ میں نے اس کے ساتھ دوسرے ڈبے میں جانے سے پہلے اماں کو ساری بات بتائی تو وہ پریشان ہو گئیں لیکن مجھے ایسی کوئی خاص پریشانی نہ تھی۔

خواجہ مجذوب غوری

انھی دنوں معلوم نہیں کیسے میرے دل میں ''بچہ مسلم لیگ'' قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ میرا خیال ہے یہ بات جھنڈے والے واقعے سے پہلے کی ہے۔ ممکن ہے یہ خیال اماں نے ہی میرے دل میں ڈالا ہو لیکن اس بارے میں مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔

ان دنوں اورئی میں دو ہی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ ان میں سے ایک ڈی۔ اے۔ وی کالج کے پاس مشہور وکیل اور شاعر بابو ہر گووند دیال کی تھی اور دوسری وسط شہر میں خواجہ صاحب کی جو ''خواجہ منزل'' کہلاتی۔ موٹر کار دونوں کوٹھیوں میں تھی۔ ''خواجہ منزل'' کا ایک لڑکا ڈی۔ اے۔ وی کالج میں پڑھتا تھا اور مجھ سے ایک کلاس آگے تھا۔ میری اس سے نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ اس نے ایک دن مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور میں وہاں گیا تو باہر کے کمرے کی آرائش اور فرنیچر وغیرہ دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہاں میں نے ایک صاحب کو سگار پیتے ہوئے دیکھا۔ اس سے پہلے نہ میں نے سگار دیکھا تھا نہ کسی کو اسے پیتے ہوئے۔ برسوں بعد وہی صاحب لکھنؤ میں اسلم رضوی کی کوٹھی ''احمد منزل'' میں نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے اماں اور چھوٹے بھائی بہن کی خیریت دریافت کی۔ اس وقت تو میری سمجھ میں اس تعلق خاطر کا سبب نہ آیا لیکن بعد میں جب میں ان کے یہاں بھی دو بچیوں کو پڑھانے لگا تو مجھے ''خواجہ منزل'' اور وہاں ان کی موجودگی یاد آ گئی۔

''خواجہ منزل'' میں ایک نہایت وجیہہ، دراز قامت، سرخ سفید اور بہت مزے کی باتیں کرنے والے صاحب کو بھی دیکھا۔ ان کی داڑھی لمبی اور گھنی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شاعر ہیں اور مجذوب تخلص کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ انسپکٹر آف اسکولس تھے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ بچہ مسلم لیگ کے خیال نے زور پکڑا تو میں نے جلسے کی صدارت کرنے کی درخواست خواجہ صاحب سے کی جو انھوں نے قبول کر لی۔ اتفاق سے نسیم قریشی صاحب بھی جو مسلم لیگ کے شعلہ بار مقرر تھے ان دنوں اورئی آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے بھی شرکت کی درخواست کی اور انھوں نے میری بات مان لی۔ یہ جلسہ جامع مسجد کے پیچھے کے راستے کے سامنے کی دو منزلہ عمارت کے اوپر کے حصے کے اس بڑے کمرے بلکہ ہال میں ہوا تھا جہاں بعد میں کپڑوں کی سلائی کا ایک بڑا سا کارخانہ قائم ہوا تھا۔ یہ کارخانہ ہائی اسکول کرنے کے بعد میرے لکھنؤ آنے سے قبل ہی جانے کیوں بند ہو گیا تھا۔

جلسے میں خواجہ صاحب اور نسیم قریشی صاحب نے تقریریں کیں۔ ان دونوں نے اپنی تقریروں میں کیا کہا یہ تو یاد نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ نسیم قریشی پان بہت کھاتے تھے اور ان کے ہونٹ لال ہو رہے تھے اور وہ تھوڑی دیر بعد ڈبیہ سے پان نکال کر کھا لیتے۔

''بچہ مسلم لیگ'' کا یہ پہلا اور آخری جلسہ تھا۔ ٹیپ کا بند یہ ہے کہ میں اس کا صدر اور

شیام سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔ کوئی باقاعدہ انتخاب نہیں ہوا تھا، بس یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ میں اس کا صدر ہوں اور شیام سکریٹری۔

ابا کو ''بچّہ مسلم لیگ'' بنانے کے لیے میری بھاگ دوڑ پسند نہ آئی تھی تاہم اس وقت انھوں نے کچھ بھی نہ کہا لیکن جب میں نے ان کے سامنے نہایت جوش و خروش کے ساتھ امّاں کو بتایا کہ میں صدر چنا گیا ہوں تو انھوں نے صرف یہ کہا کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو ''بچّہ مسلم لیگ'' کیوں بنائی۔ ناپسندیدگی ظاہر کرنے کا ان کا یہی انداز تھا۔ وہ غصّہ کبھی نہیں کرتے تھے۔

لکھنؤ آنا جانا تو لگا ہی رہتا تھا۔ ایک دن عارف بھائی کے ساتھ امین آباد جانا ہوا وہاں مجذوبؔ صاحب کو دیکھا، اس جگہ کے آس پاس جہاں اب برما بسکٹ فیکٹری کی دوکان ہے لیکن قطعاً یاد نہیں کہ یہ دوکان ان دنوں تھی یا نہیں۔ انھیں دیکھتے ہی میں لپک کر ان کے پاس پہنچا، نہایت ادب سے سلام کیا اور یاد دلایا کہ آپ نے اورئی میں ''بچّہ مسلم لیگ'' کے جلسے کی صدارت کی تھی۔ میری بات سن کر وہ مسکرائے ضرور لیکن ان کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے کوئی خاص بات نہیں سمجھتے تھے۔

برسوں بعد لکھنؤ میں معلوم ہوا کہ خواجہ مجذوبؔ کا تعلق فرنگی محل سے بھی تھا اور وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ اس وقت میری نظروں میں فرنگی محل کی اہمیت کمیونسٹوں کی نئی پود کی نرسری سے زیادہ نہ تھی کہ نہ اس کے ماضی سے واقف تھا نہ درسِ نظامی سے اور نہ رضا انصاری، فرحت اللہ انصاری اور ہاشم میاں سے۔ وہیں غوث انصاری رہتے تھے لیکن ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شاید بعد میں شروع ہوا۔ انھوں نے بچّوں کے لیے ''عام معلومات'' نام کی ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ مجھ سے سینیر تھے۔ میں پاس ہی قاضی باغ میں رہتا تھا اور وکٹوریہ اسٹریٹ میرے لیے گھر آنگن کی حیثیت رکھتی تھی۔ انھی دنوں اپنے دوست برجموہن ناتھ کاچر سے مجذوبؔ کے بہت سے شعر سنے، وہ ان کی شاعری کے عاشق تھے۔ بعد میں مجذوبؔ کے کلام کے انتخاب سے جو رضا انصاری نے اردو اکادمی سے چھپوایا تھا اور متین میاں فرنگی محلی سے ان کا بہت سا کلام سننے اور ان کی شخصیت اور شعری کمالات سے کسی قدر واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

جن دنوں میں یہ سطریں لکھ رہا تھا، نشورؔ واحدی مرحوم کے صاحبزادے نیاز واحدی (افسوس مئی ۲۰۱۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا) نے جو اورئی میں بسلسلۂ ملازمت بیس پچیس سال گذار چکے تھے بتایا کہ مجذوبؔ دراصل ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن بدعنوانیوں اور رشوت ستانیوں سے عاجز آ کر

انھوں نے ڈپٹی کلکٹری ترک کر کے انسپکٹر آف اسکولس کا عہدہ قبول کرلیا تھا۔ ان دنوں یہ دونوں سرکاری ملازمتیں ہم رتبہ تھیں کیوں کہ پوری ریاست کے اسکولوں کا صرف ایک انسپکٹر ہوتا تھا۔

نیاز واحدی صاحب نے مجذوبؔ کی زود گوئی کے متعلق ایک واقعہ سنایا تھا۔ اورئی میں ایک دن ایک حسین و جمیل لڑکی اپنی کار سے آ رہی تھی اور یہ دوسری طرف سے اپنی کار سے کہیں جا رہے تھے۔ کچھ ایسا ہوا کہ وہ اس کی کار کو راستہ نہ دے سکے اور وہ ہارن بجاتی رہی۔ پھر جب انھیں اپنی کار کو بائیں طرف کرنے کا موقع ملا تو اس نے انھیں اور ان کی وضع قطع کو گھور کر دیکھا۔ اس کی خشمگیں آنکھیں دیکھ کر مجذوبؔ نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا:

اس شان سے، اس ناز سے، اس تیز روی سے
گزرو گے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم

مجذوبؔ کی زود گوئی کا یہی عالم تھا۔ لیکن فی الوقت ان کی ایک غزل اور چند نہایت عمدہ شعر سنیے، بلکہ پڑھیے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجاؤ کہ خلوت ہوگئی
خاک میں کس نے ملایا یہ تو دیکھ
شکر کر مٹی سوارت ہوگئی
پڑ گئی تھی ان پہ بھولے سے نظر
بات اتنی سی قیامت ہوگئی
سوگ میں یہ کس کی شرکت ہوگئی
بزم ماتم بزم عشرت ہوگئی
میں بھی نازک طبع وہ بھی تند خو
خیریت گذری محبت ہوگئی

زبردستی لگا دی منہ سے بوتل آج ساقی نے
میں کہتا ہی رہا، ہاں ہاں، نہیں ساقی، نہیں ساقی

سارے عالم کی نگاہوں سے گرا ہے مجذوبؔ
تب کہیں جا کے ترے دل میں جگہ پائی ہے
اب بھی مجذوبؔ جو محرومِ پذیرائی ہے
کیا جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے

مجذوبؔ طول طویل غزلیں کہتے لیکن ان میں بھرتی کے شعر مشکل ہی سے ہوتے۔ کئی برس بعد جب میں قومی آواز سے متعلق ہوا تو رضا انصاری نے خواجہ مجذوبؔ کا ایک واقعہ سنایا، بے حد دلچسپ اور ان کی مقبولیت کا گواہ۔ بعد کی ملاقاتوں میں متین میاں (فرنگی محل کے جلال عبدالمتین) اور کئی دوسرے حضرات نے بھی اس کی تصدیق کی۔

گنگا پرشاد ہال میں ایک مشاعرہ تھا۔ منتظمین نے مجذوب کو بھی جو مشاعروں میں شرکت نہ کرتے تھے، جانے کیسے راضی کر لیا۔ مجذوبؔ کا شمار چوں کہ مسلمہ شعرا میں نہیں ہوتا تھا اس لیے انھیں دو چار لوگوں کے بعد ہی دعوت سخن دی گئی۔ انھوں نے انکار تو نہیں کیا لیکن یہ ضرور کہا کہ کچھ اور لوگوں کو پڑھ لینے دیجیے۔ چنانچہ دو تین شعرا کے بعد ان سے پھر درخواست کی گئی تو وہ کلام سنانے کے لیے اپنی جگہ سے فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت ان کی وضع قطع کچھ یہ تھی۔ لمبی بے ہنگم داڑھی، سر پر گول ٹوپی، گھٹنوں کے نیچے تک جھولتا کرتا اور اُٹنگا پے جامہ۔ سامعین نے قہقہہ بلند کیا اور کسی نے جملہ کسا، ''یہ مشاعرہ ہے، مسجد کے حجرے سے کس کو پکڑ لائے، شاعر لاؤ۔'' مجذوبؔ نے جو اس شور وغل سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتے تھے اپنی غزل چھیڑی اور پہلے ہی شعر نے سارا منظر نامہ تبدیل کر دیا۔ وہ شعر تھا:

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلفِ عنبریں ساقی
ترے ہوتے، فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

شعر بار بار پڑھوایا گیا اور پھر ہر شعر کے ساتھ یہی ہوا اور:

زبردستی لگا دی منہ سے بوتل آج ساقی نے
میں کہتا ہی رہا، ہاں، ہاں، نہیں ساقی، نہیں ساقی

نے تو جیسے زمین و آسمان پلٹ کے رکھ دیے۔ ایسا لگتا تھا کہ مشاعرہ گاہ کی چھتیں اڑ جائیں گی۔ انھیں غزل پوری کرنے میں بہت وقت لگا لیکن جیسے ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑے ''ایک غزل اور'' ''ایک غزل اور'' کا ایسا شور برپا ہوا کہ انھیں ''ایک غزل اور'' سنانی پڑی اور یہ سلسلہ

گھنٹوں جاری رہا۔ انھوں نے لاکھ کہا کہ ابھی بہت اچھے شعرا کو کلام سنانا ہے لیکن سامعین نے ان کی ایک نہ سنی۔ اس دوران استاد شعرا ایک ایک کر کے جلسہ گاہ سے چلے گئے اور رات گئے تک مجذوبؔ اپنا کلام سناتے اور داد کے ڈونگرے بٹورتے رہے۔

اپنا کلام شروع ہی میں سنانے سے ان کے احتراز کی کوشش کا اصل سبب شاید یہی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سامعین انھیں چھوڑیں گے نہیں اور دوسرے شعرا کی دل شکنی ہوگی... بے نیاز قسم کے انسان تھے، ان میں شاعرانہ ادائیں نہ تھیں، نہ آواز بلند کرتے نہ سامعین سے توجہ کی درخواست کرتے۔

سہل ممتنع کا ان کا سا شاعر اردو میں مشکل ہی سے ملے گا لیکن افسوس کہ سو سوا سو صفحات کی رضا انصاری کی کتاب کے علاوہ ان کا کوئی انتخاب تک شائع نہ ہوا اور پاکستان سے کلیات کی اشاعت کے علاوہ میرے خیال میں نہ ان پر کوئی کتاب لکھی گئی نہ کسی نے ایم۔اے کا مقالہ لکھا اور نہ کسی نے ڈاکٹریٹ ہی کیا۔ نام و نمود سے بے نیاز لوگوں کے ساتھ اکثر یہی ہوتا ہے۔

نسیم قریشی[1] نے ایم۔اے شاید آزادیٔ ہند کے بعد کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے متعلق ہو گئے۔ بہت عمدہ نثر لکھتے تھے، معلوم نہیں استاد کیسے تھے لیکن اس قوتِ اظہار کے پیشِ نظر جس کے وہ مالک تھے خیال یہی ہوتا ہے کہ وہ استاد بھی بہت عمدہ رہے ہوں گے۔ ان دنوں جب میں لکھنؤ میں نیا نیا آیا تھا وہ نظیر آباد میں کپڑوں کی ایک دوکان میں اکثر نظر آتے۔ اسی دوکان پر ایک بار ملاقات کر کے میں نے اورئی کی ''بچہ مسلم لیگ'' کا ذکر کیا تو بات انھیں یاد تھی۔ وہ کچھ سوچ کر مسکرائے اور بولے، ''وہ بھی ایک زمانہ تھا''۔

لیجیے پھر آگے نکل گیا۔ اورئی لوٹتا ہوں۔

دادے ابا

دادے ابا زیادہ تر ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہتے لیکن سال میں ایک بار محی الدین پور، بھوپال اور رتھیڑی ضرور جاتے۔ یہ بھی ہوتا کہ وہ دادی امّاں کو بھوپال یا رتھیڑی پہنچا کر دو چار دن بعد اورئی آ جاتے۔ کبھی انھیں واپس لینے بھی چلے جاتے یا وہاں سے کوئی پہنچا جاتا۔ محی الدین پور

۱۔ ''علی گڑھ تحریک، آغاز تا امروز۔ ۱۹۶۰ء'' جو ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے، نسیم قریشی ہی کی مرتب کردہ ہے۔

وہ عام طور سے مئی جون ہی میں جاتے اور پھر گرمیوں کے دنوں کی صبحیں آم کے اپنے لگوائے ہوئے باغوں اور باقی وقت اپنی بنوائی ہوئی جامع مسجد کے حجرے میں گزار کر آموں کے موسم کے بعد ہی اورئی واپس آتے۔

ہمارے باغوں کا لنگڑا بہت لذیذ ہوتا۔ آم کے باغ عید گاہ کے دونوں جانب پھیلے ہوئے تھے۔ ان دنوں یہ تصور عام تھا کہ آم کے تھالے میں ہر ہفتہ کم سے کم دو بار پانی کے بجائے دودھ ڈالے جانے سے پھل لذیذ، بڑا اور ذائقہ دار ہو جاتا ہے۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن کہا یہی جاتا تھا کہ ہمارے ان باغوں میں دودھ سے سنچائی ہوتی ہے۔ ہم لوگ اسے باعثِ افتخار سمجھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمی ان ساری جگہوں پر عام تھی جہاں آم ہوتے اور لوگ حسبِ توفیق انھیں دودھ سے سینچتے بھی، جب کہ لطف کی بات یہ ہے دودھ سے نہ پھل بڑا ہوتا ہے نہ خوش ذائقہ۔ میرا خیال ہے کہ یہ غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد اب دودھ ضائع نہ کیا جاتا ہوگا۔

ایک سال چھوڑ کے ہم لوگ بھی گرمیوں کی چھٹیوں میں محی الدین پور جاتے اور پوری چھٹیاں وہیں گزارتے لیکن ملازمت کے سبب ابا جلد ہی لوٹ آتے۔

اب کا حال نہیں معلوم لیکن ان دنوں اورئی میں گرمی بہت پڑتی تھی، لُو تو اور بھی غضب کی چلتی اور ہر دوسرے تیسرے دن لُو سے کسی کے چٹ پٹ ہو جانے کی خبر ملتی۔ گرمی اور خاص طور سے لُو کی شدّت کے پیشِ نظر مئی جون میں دفتر کھلنے کے اوقات دس بجے دن کے بجائے صبح ۸ بجے کر دیے جاتے۔ دفتر دو بجے بند ہو جاتے اور لوگ ڈھائی بجے تک اپنے اپنے گھر لوٹ آتے کیوں کہ لُو میں شدّت اسی وقت پیدا ہوتی تھی اور اکثر شام میں ۷ بجے سے قبل گھروں سے نکلنا خطرے سے خالی نہ ہوتا۔

میں بھوپال سے آیا تو ہمارے دوسرے مکان میں ایک قانون گو صاحب رہتے تھے۔ ان کی انگریزی اچھی تھی۔ ان دنوں جب میں آٹھویں درجے میں تھا کلاس میں حضرت محمدؐ پر مضمون لکھنے کے لیے کہا گیا۔ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مضمون لکھ کر انھیں دکھایا تو انھوں نے نہ صرف زبان کی غلطیاں درست کیں بلکہ میرا پہلا جملہ کاٹ کر خود ایک جملہ لکھ دیا جو مجھے اب تک یاد ہے۔ یہ جملہ تھا، "Blessed was the day when Prophet Mohammad was born"۔ لفظ Blessed مجھے اس قدر پسند تھا کہ موقع بے موقع اسے اکثر استعمال کرتا، کچھ تو پسندیدگی کے سبب اور کچھ اپنی لیاقت دکھانے کے لیے۔ پھر جب تھوڑی

سی انگریزی آ گئی اور ملازمت بھی ایسی ملی کہ ہر روز اسی میں کام کرنا پڑتا تو کہیں پڑھا کہ اپنا پسندیدہ لفظ کم سے کم استعمال کرنا صاف ستھری انگریزی لکھنے کے لیے ضروری ہے۔ تب کہیں جا کر میں نے Blessed کا پیچھا چھوڑا۔

برسوں بعد لکھنؤ میں ان دنوں جب میں اپنے عزیز دوست عبدالحلیم حلیم خاں (مرحوم) کے یہاں محلہ پل کمہاراں میں رہتا تھا ایک دن جنرل انگلش میں اپنے کلاس فیلو اور بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے سربراہ رضوان علوی کے مکان کے سامنے سڑک پر قانون گو صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ وہ حلیم خاں کے مکان کی پشت سے ملحق اس مکان میں رہتے تھے جس کے سامنے بڑا سا میدان اور سڑک پر ایک بڑا پھاٹک تھا۔ وہ ان دنوں لکھنؤ میں نائب تحصیلدار تھے۔ ان کا نام رام پرشاد یا کچھ ایسا ہی تھا۔

عالمی جنگ کے دوران جہاں اجناسِ صَرف کی قیمتوں میں اضافہ ہوا تھا وہاں املاک کی قیمتیں گر گئی تھیں کیوں کہ لوگ نقد رقم اپنے پاس یا ڈاک خانے میں رکھنا پسند کرتے تھے۔ اس وقت میں لفظ ''بینک'' سے واقف تک نہ تھا اور میرے خیال میں اورئی میں کوئی بینک تھا بھی نہیں۔

ہمارے گھر سے ملحق ایک چھوٹی سی زمین، جس کے ایک حصے میں چھوٹا سا کچا کمرہ تھا، خالی پڑی تھی اور زمین کا مالک، شاید اس خیال سے کہ لڑائی کبھی ختم نہ ہوگی، اور گرتے گرتے اس کی قیمت کوڑیوں میں رہ جائے گی، اسے اونے پونے فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ابا سے ذکر کیا اور بیٹی کی شادی کے لیے روپوں کی ضرورت بتائی تو انھوں نے یہ چھوٹی سی زمین جس کا رقبہ مشکل سے ہزار سوا ہزار مربع فٹ رہا ہوگا خرید لی۔

پھر لڑائی ختم ہوئی اور سب کہنے لگے کہ اب چیزوں کے دام گر جائیں گے، اور کچھ چیزوں کے دام گرے بھی تو ابا نے اس زمین کے ایک حصے میں اوپر نیچے دو کمرے اور دالان بنانے کا فیصلہ کیا اور اینٹیں وغیرہ منگوا لیں۔ انھی دنوں دادے ابا محی الدین پور سے واپس آئے اور انھوں نے نیو کھدتی دیکھی تو دادی اماں کے ذریعے ابا سے کہلوایا کہ چیزوں کی قیمتیں کم ہونے میں ابھی وقت لگے گا لیکن اس وقت تک کافی سامان آ چکا تھا جس کی واپسی ممکن نہ تھی، اس لیے کھدائی کا کام جاری رہا اور تھوڑے ہی دنوں میں ابا کو اندازہ ہو گیا کہ قیمتوں کے سلسلے میں ان کا خیال غلط تھا۔ چند چھوٹی موٹی چیزوں کی قیمتوں میں کمی ضرور آئی لیکن عام طور پر گرانی اپنی جگہ قائم رہی۔ تعمیر

میں کام آنے والی چیزوں کے ساتھ بھی یہی ہوا بلکہ کچھ دنوں میں یہ بھی ہوا کہ لوگوں نے یہ سوچ کر کہ اب قیمتیں کم ہو جائیں گی مکانوں کی تعمیر شروع کردی اور مانگ میں اضافے نے الٹا ہی اثر دکھایا۔

اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیچے کا کمرہ، دالان اور زینہ ہی بن پایا تھا کہ ابا کے روپے ختم ہو گئے اور اب ان کے سامنے دادے ابا سے قرض لینے کے علاوہ کوئی چارا نہ رہا۔ چنانچہ انھوں نے دادے ابا کو ایک خط میرے ذریعے بھجوایا۔ باپ بیٹے میں بات چیت کم ہی ہوتی تھی اور یہ کام زیادہ تر دادی امّاں کے ذریعے انجام پاتا لیکن اس بار چوں کہ تعمیر کے کام میں جلد بازی نہ دکھانے کے لیے دادے ابّا نے دادی امّاں کے توسط سے ہی کہلایا تھا شاید اس لیے ابّا کو میری مدد لینی پڑی۔

دادے ابّا نے خط پڑھا، مسکرائے لیکن کہا کچھ نہیں۔ اس وقت مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ اگلے دن وہ ظہر کی نماز پڑھنے ذرا جلدی چلے گئے اور واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک پتلی سی کاپی تھی۔ عصر اور مغرب کی نمازیں انھوں نے گھر پر ہی پڑھیں، پھر مجھ سے کھیلتے اور چھیڑتے رہے، کبھی گدگداتے، کبھی گدگدانے کے لیے انگلیاں دکھاتے اور میں اسی میں لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ وہ مجھے بہت چاہتے تھے اور میں ان کی چھیڑ چھاڑ اور گدگدانے کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ وہ کہیں چلے جاتے تو میں انھیں برابر اسی حوالے سے یاد کرتا۔ اسی چھیڑ چھاڑ کے دوران جیسے انھیں یکا یک کچھ یاد آ گیا۔ اٹھے، الماری کھولی، اس میں سے سرخ رنگ کی ایک تھیلی نکالی اور وہ کاپی بھی جو وہ دن میں لائے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے کاپی میں کچھ لکھا اور تھیلی مجھے دیتے ہوئے کہا، ”اپنے ابّا کو دے دو“۔

اس وقت مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ دوڑتے دوڑتے ابّا کے پاس گیا۔ ابّا نے روپے گنے اور ایک کاپی میں کچھ نوٹ کیا۔ پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ ابّا کا پرچہ میں ہی لے کر جاتا اور دادے ابّا روپے ہمیشہ اگلے دن دیتے۔

کچھ دنوں میں مکان کے اس حصّے کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ اس پر پلاسٹر نہیں کرایا گیا تھا۔ مجھے اپنے مکان سے لگی ہوئی اوپر نیچے کے کمروں کی اینٹوں کی یہ دیوار بہت اچھی لگتی۔ ہمارے مکان کی پتائی انھی دنوں ہوئی تھی اور اس سے لگی ہوئی سرخ اینٹوں کی دیوار سے دونوں مکانوں کی سفیدی اور سرخی چمک اٹھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ نئی دیوار کے اچھے لگنے کا یہی سبب رہا ہوگا۔ ابا نے

اس چھوٹے سے مکان کا جس کے مختصر سے آنگن کے بعد کا کچا کمرہ اس وقت تک برقرار تھا، آب خانہ پورے کا پورا پتھر کا بنوایا تھا۔ ایک دن میں نے انھیں اماں سے کہتے سنا، ''ایسا آب خانہ پورے اورئی میں نہ ہوگا''۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات کتنی صحیح تھی لیکن ان کی یہ بات مجھے اچھی نہ لگی تھی، خاص طور سے یوں کہ وہ بڑھ چڑھ کے باتیں نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ بات انھوں نے اماں کو خوش کرنے کے لیے یا اپنے آپ پر بطور طنز کہی ہو کہ مکان کی تعمیر تو مکمل کرا نہ سکا ہاں آب خانہ ضرور بہت اچھا بنوا دیا۔

حساب جو جو، بخشش سو سو

چار پانچ مہینے بعد روپوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہوا، انھی سرخ تھیلیوں میں، لیکن ابا ہر بار روپے مہینے سوا مہینے بعد بھیجتے۔ دادے ابا تھیلی سے روپے نکالتے، انھیں دوبار گنتے، واپس تھیلی میں رکھ دیتے، پھر الماری سے کاپی نکالتے، اس میں کچھ لکھتے اور پھر دونوں چیزیں الماری میں رکھ کر اس میں ایک چھوٹا سا تالا ڈال دیتے۔ یہ سلسلہ کئی مہینے چلا، ہر بار وہی ہوتا جو پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ میرا خیال ہے تھیلی میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس روپے ہوتے ہوں گے۔

بہت دنوں بعد ابا نے روپوں کی تھیلی کے ساتھ ایک پرچہ بھیجا۔ دادے ابا نے اسے پڑھا، کاپی میں کچھ لکھا پھر کچھ جوڑتے گھٹاتے رہے۔ اس دن وہ کچھ کچھ الجھ رہے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے روپے تو الماری میں رکھ دیے لیکن کاپی باہر ہی رہنے دی اور وضو کر کے عشاء کی نماز پڑھنے لگے۔

دادے ابا مغرب کی نماز کبھی کبھی اور عشاء اکثر گھر ہی میں پڑھتے۔ مکان کے باہر سات آٹھ فٹ کی چوڑائی میں اینٹیں چنی ہوئی تھیں اور اس جگہ جو اندر کے لمبے کمرے کی پشت پر تھی اینٹوں پر پتھر کی ایک لمبی سی سل رکھی تھی۔ دادے ابا نماز اسی پتھر کی سل پر پڑھتے تھے، انھوں نے نماز مکمل کی تو میں اسکول کا کام پورا کر کے لالٹین رکھنے جا رہا تھا۔ انھوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

''آج چمنی صاف نہیں کی تھی؟''

میں نے ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس دن میں نے چمنی واقعی صاف نہیں

کی تھی۔

ہمارے یہاں ہر کام منیر کی امّاں پر نہیں لادا جاتا تھا۔ ایک دن ابّا نے انھیں لالٹین کی چمنی صاف کرتے ہوئے دیکھا تو مجھے بلا کر کہا، ''کل سے یہ کام تم خود کرنا۔ منیر کی امّاں تمھیں اتنا چاہتی ہیں اور تم اپنے اتنے سے کام کا بوجھ بھی ان پر ڈال دیتے ہو۔''

اس دن کے بعد سے اپنی لالٹین کی چمنی مَیں خود صاف کرنے لگا تھا۔ شروع میں تو یہ کام اچھا نہ لگتا اور چمنی بھی زیادہ صاف نہ ہوتی لیکن پھر جیسے ماہر ہو گیا۔ کام کرنے ہی سے آتا ہے۔ اب میں لائف بائے صابن کا چھوٹا سا ٹکڑا چمنی میں ڈال کر گیلے کپڑے کو اندر گھماتا اور پھر پانی سے دو تین بار دھوتا تو سیاہی کا ایک نشان باقی نہ رہتا۔ یہی حال جوتوں پر پالش کرنے کا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی کسی سے اپنے جوتوں پر پالش کرنے کے لیے کہا ہو۔ لیکن ایک بار جب زرّین چھوٹی سی تھی اور لا مارٹینیر میں دوسرے یا تیسرے درجے میں پڑھتی تھی اس کی ضد کے سامنے بے بس ہو گیا تھا اور ساجد میاں تو اب بھی، جی ہاں اب بھی، جب میں العین میں ہوں یا وہ لکھنؤ میں، مجھ سے چھپا کر یہ کام کر ڈالتے ہیں لیکن مجھے پتہ لگ جاتا ہے۔ ایک راز کی بات بھی بتاتا چلوں۔ میں جوتے پر پالش بہت اچھی کرتا ہوں، جوتا چمک جاتا ہے اور وہ طریقہ بھی مجھے آتا ہے جس کے ذریعے یہ چمک پانچ چھے دن برقرار رکھی جا سکتی ہے۔

اگلے دن دادے ابا فجر کی نماز پڑھ کر آئے اور کاپی لے کر حساب کتاب کرنے بیٹھ گئے۔ صبح کا میرا سارا وقت اسکول جانے کی تیاریوں میں نکل جاتا اس لیے اتوار کے علاوہ دادے ابا کی چھیڑ چھاڑ اور گدگدی سے اس وقت لطف اندوز ہوتا نہ ان کے پاس جا ہی پاتا لیکن مولوی خدا بخش کے یہاں سے حساب پڑھ کے واپس آنے کے بعد اور رات کی پڑھائی شروع کرنے سے پہلے تھوڑی بہت دیر ان کے ساتھ ضرور رہتا۔ اسی شام انھوں نے مجھے ایک پرچہ دیتے ہوئے کہا، ''اپنے ابا کو دے آؤ''۔

میں نے پرچہ ابّا کو دیا اور اسے انھوں نے پڑھا تو ان کے چہرے سے لگا جیسے انھیں کسی بات پر سخت حیرت ہوئی ہو لیکن انھوں نے کچھ کہا نہیں۔

دو تین ہفتوں کے بعد ابّا نے دادے ابا کو دینے کے لیے کچھ روپے دیے لیکن یہ تھیلی میں نہ تھے۔ میرا خیال ہے دس بیس سے زاید سکّے نہ رہے ہوں گے۔ میں نے یہ روپے دادے ابا کو دیے تو انھوں نے کاپی الماری سے نکالی، اس میں کچھ اندراج کیا، روپے تھیلی میں رکھے اور اس

کانسٹہ دوسری تھیلیوں کی طرح ڈوری سے کس کے بند کردیا۔ یہ ڈوری تھیلی ہی میں سلی ہوئی تھی۔

اس کے بعد انھوں نے کاپی کے آمنے سامنے کے ورق پھاڑے، انھیں ٹکڑے ٹکڑے کیا اور مجھ سے کہا کہ کاغذ کے ٹکڑے بغیہ کے پاس کونے میں، جہاں سے سڑک پر جھاڑو لگانے والا کوڑا اٹھا لے جاتا تھا، پھینک آؤں۔ دراصل یہ بات انھوں نے مجھ سے کہی نہیں تھی بلکہ آنکھوں سے صرف اشارہ کیا تھا۔

میں کاغذ کے ٹکڑے پھینک کر آیا تو وہ ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ تحریر مکمل کرنے کے بعد انھوں نے کاغذ موڑا، مجھے دیا، بیٹھے بیٹھے الماری کا پٹ کھولا اور روپوں کی تھیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''اپنے ابّا کو دے آؤ۔'' لیکن مَیں ساری تھیلیاں ایک ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا اس لیے ان میں سے بس دو تین تھیلیاں اور خط لے کر دوڑا دوڑا ابّا کو دے آیا۔ وہ دفتر کی کسی فائل پر انگریزی میں نوٹ لکھ رہے تھے۔

دوسری بار چار تھیلیاں لے کر میں ابّا کے پاس گیا تو وہ رو رہے تھے۔

ابّا کو روتے ہوئے میں نے اس دن پہلی بار دیکھا تھا۔

اس وقت تو ابّا کے رونے کا سبب میری سمجھ میں نہ آیا تھا لیکن جب کچھ بڑا ہوا اور دونوں کی شفقت سے محروم ہو گیا تو ایک دن یکایک احساس ہوا کہ سارے روپے ابّا کو دے دینے سے پہلے دادے ابّا نے قرض کا ایک ایک پیسہ وصول کر کے انھیں بچپن کا کوئی سبق پھر سے یاد دلایا تھا۔ ان کی اصول پسندی اور محبت کی آمیزش کے سبب ہی شاید ابّا اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پاسکے تھے۔ ''حساب جَو جَو، بخشش سَو سَو'' کی معنویت بھی اسی وقت پوری طرح سمجھ میں آئی۔ ویسے یہ فقرہ میں نے سب سے پہلے دادی امّاں سے سنا تھا۔

چاندی کا پہیہ

اسی زمانے کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے، جو شاید کچھ بعد کا ہے۔

معلوم نہیں کیسے مجھے پہیہ چلانے کا شوق ہو گیا تھا۔ گھر سے کسی بھی کام کے لیے نکلتا تو نئے مکان کے سامنے جو بچی ہوئی اینٹیں رکھی ہوئی تھیں ان کے پیچھے سے پہیہ اور اسے چلانے کے لیے لوہے کا موٹا سا تار جو ایک طرف سے پیالی کے کنڈے کی طرح مڑا ہوا تھا نکالتا اور ہوا ہو جاتا۔ ایک دن جب میں جامع مسجد کے پاس کی چڑھائی سے گھر آ رہا تھا یکایک دادے ابّا پر

نظر پڑی۔ وہ تسبیح ہاتھ میں لیے، سر جھکائے گھر جا رہے تھے۔ اسی جگہ سے ایک راستہ پھوٹتا تھا جو آگے چل کر ہمارے گھر کی طرف جانے والی سڑک سے مل جاتا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اپنا راستہ بدل دوں لیکن پھر خیال ہوا کہ دادے ابّا تو سر جھکائے ہوئے ہیں اور انھیں پتہ بھی نہیں چلے گا اور میں ان کے پاس سے پہیہ دوڑاتے ہوئے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد دادے ابّا گھر آ گئے اور انھوں نے اپنی شیروانی کی جیب سے نکال کر ایک پڑیا میری طرف بڑھا دی۔ اس میں برفی تھی۔ دادے ابّا اکثر، بلکہ تقریباً ہمیشہ، جب بھی باہر سے آتے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز میرے لیے ضرور لاتے۔ پھر وہ مجھے گدگداتے، طرح طرح سے ہنساتے۔ اس دن بھی یہی سب کچھ انھوں نے کیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میری ترکیب کارگر ہوئی اور وہ مجھے نہیں دیکھ پائے۔

رات کا کھانا سب سے پہلے دادے ابّا کو بھیجا جاتا۔ یہ کام منیر کی امّاں کے سپرد تھا۔ ہم لوگ بعد میں کھانا کھانے بیٹھتے، موسم کے اعتبار سے دالان میں تخت یا آنگن میں پلنگ پر۔ دادی امّاں رتھیڑی یا بھوپال گئی ہوئی تھیں اور صرف ہم تینوں، یعنی ابّا، امّاں اور میں پلنگ پر کھانا کھا رہے تھے کہ منیر کی امّاں نے ایک چھوٹا سا پرچہ لا کر ابّا کو دیا۔ لالٹین ذرا دور تھی اس لیے انھوں نے اس کی طرف جھک کر پرچہ پڑھا اور امّاں کی طرف بڑھا دیا۔ امّاں نے پرچہ پڑھنے کے بعد مجھے دے دیا۔ اس پرچہ میں لکھا تھا۔

برخوردار ظفریاب سلمہٗ، دعائیں

عزیزی عابد میاں کو پہیہ چلانے کا شوق ہے۔ انھیں چاندی کا پہیہ بنوا دیجیے۔ لوہے کے پہیے سے میری بے عزّتی ہوتی ہے۔

دعاگو

سید وزیر حسن

نہ ابّا نے ڈانٹا، نہ امّاں نے کچھ کہا لیکن اس دن کے بعد سے میں نے پہیے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

گرمیوں میں دادے ابّا اپنے کمرے کے باہر کھلے آسمان کے نیچے سوتے تھے۔ میں بھی اپنا پلنگ وہیں ڈلوا لیتا۔ بچپن کی نیندیں یوں ہی گہری ہوتی ہے لیکن میں تو ہاتھی گھوڑے بیچ کے

سوتا۔ اس کے باوجود کبھی کبھی میری آنکھ کھل جاتی۔ ایسے کئی موقعوں پر میں نے انھیں ٹہلتے اور وہ ہی شعر آہستہ آہستہ پڑھتے سنا اور دیکھا۔ ان کی آواز میں ہلکا سا ترنم ہوتا۔ ان میں سے ایک شعر فارسی کا ہوتا جس کے معنی پوری طرح میری سمجھ میں نہ آتے۔ پھر ایک دن میں نے کلاس میں مولوی صاحب سے اس کے معنی پوچھے تھے۔

یہ اشعار تھے:

گندم از گندم بروید، جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

اور

مدت سے امیرؔ اس سے ملنے کی تمنا تھی
آج اس نے بلایا ہے لینے کو قضا آئی

میں نے دادے ابا کی زبان سے ان کے علاوہ کوئی شعر کبھی نہیں سنا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھیں کوئی اور شعر یاد تھا یا نہیں۔ لیکن ان کے پاس گلستان و بوستاں تھیں اور وہ انھیں کبھی کبھی پڑھتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجھے ایک حکایت سنائی تھی جو کچھ اس طرح تھی۔

ایک شخص سے کسی نے قرض لیا جو وہ کسی طرح واپس نہ کرتا۔ آخر تنگ آ کر قرض خواہ قبرستان کے پھاٹک پر جا کے بیٹھ گیا۔ کسی نے پوچھا کہ یہاں کیوں بیٹھے ہو تو اس نے کہا کہ مجھے اپنا قرض وصول کرنا ہے۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ قرض وصول کرنا ہے تو اس کے گھر جاؤ، یہاں کیا کر رہے ہو، تو اس نے جواب میں کہا کہ آخر میں وہ آئے گا تو یہیں۔ میں نے ہائی اسکول میں جب یہ حکایت پڑھی تو دادے ابا کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ بہت یاد آئے اور میں کلاس ہی میں رونے لگا تھا۔

۱۹۴۵ء کے آخر میں دادے ابا کی پیٹھ پر پھوڑا نکلا۔ یوں تو اس وقت اورئی میں سول سرجن ڈاکٹر رفیق حسن کے بھائی جن کا نام غالباً شفیق حسن تھا تعینات تھے اور ان سے ابا کے تعلقات بھی تھے لیکن پھوڑے کے آپریشن کے لیے ڈاکٹر جان بہت مشہور تھے۔ انھوں نے پھوڑا دیکھتے ہی بتا دیا تھا کہ آپریشن خطرناک ہو سکتا ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ آپریشن کامیاب رہا اور مہینے ڈیڑھ مہینے میں زخم مندمل ہو گیا مگر دو تین ماہ بعد پھوڑا پھر عود کر آیا۔ ظاہر ہے پھر ڈاکٹر جان سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ کاربنکل ہے اور تقریباً لاعلاج۔ پھر بھی

آپریشن ہوا اور نہ صرف یہ کہ زخم بہت جلد بھر گیا بلکہ دادے ابا اس حد تک صحت مند ہو گئے کہ ہر روز کم سے کم ایک وقت کی نماز پڑھنے مسجد جانے لگے اور پھر جلد ہی محی الدین پور چلے گئے۔

محی الدین پور میں قیام کے دوران دادے ابا ایک عرصے سے اپنی جامع مسجد کے حجرے میں ہی رہنے لگے تھے، گھر میں قدم نہ رکھتے اور مسجد میں بھی ان سے ملاقات صرف فجر کے بعد یا عصر اور مغرب کے درمیان ممکن تھی۔ کسی ضروری کاغذ پر دستخط کرانا ہوتا تو نواب چچا شام ہی میں ان سے ملنے جاتے اور وہ بھی پہلے سے کہلانے کے بعد۔

دادے ابا نے دنیا سے ایک طرح سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ مسجد سے وہ شاذ ہی باہر نکلتے لیکن کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی مسجد سے بیس پچیس قدم چل کر عید گاہ اور اپنے آم کے ان باغوں پر نظر ضرور ڈالتے جو انھوں نے بڑے شوق سے لگوائے تھے۔ عید گاہ تو سارے خاندان کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ تھی مگر جامع مسجد صرف ان کی بنوائی ہوئی تھی۔ وہ محی الدین پور کے بڑے زمیندار تھے۔ مکان یوں تو سارے ہی زمینداروں کے اچھے تھے لیکن صرف دادے ابا کا مکان ایسا تھا جس کی چھتیں گرڈروں پر مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔ اونچی چھت اور موٹی دیواروں کے سبب یہ کمرے شدید لو دھوپ کے دنوں میں بھی ٹھنڈے رہتے اور اورئی کے ہمارے گھر کے کمروں کی طرح جن کی چھتیں مقابلتاً بہت نیچی تھیں، گرم نہ ہوتے۔ اسی وجہ سے یہاں کی چھتوں پر وہ جھالر دار پنکھے نہ ٹانگے جاتے جنھیں دروازے کے باہر بیٹھا اور تھک جانے پر رسی انگوٹھے اور انگلیوں کے درمیان داب کر کھینچنے والا لڑکا اونگھ جانے پر ڈانٹ کھاتا۔ یہاں دروازوں پر خس کی ٹٹیاں اور اندر ہاتھ کے پنکھے ہی کافی ہوتے۔

اورئی میں کچہری کے اوقات کی تبدیلی اور اسکول میں گرمیوں کی چھٹی کے سبب ابا، امّاں، میں اور چھوٹا بھائی عمران جو بہت چھوٹا تھا، جب تک دھوپ زینے چڑھ کے اوپر کے کمروں کے سامنے کی چھت کے کونے میں چھپ نہ جاتی، کمرے ہی میں رہتے۔ البتہ میں کبھی کبھی چپکے سے کمرے سے باہر نکل کر اونگھتے ہوئے لڑکے سے رسّی چھین کر کھینچنے لگتا۔ میرے اس عمل میں شرارت اور ایک نئے قسم کے تجربے سے لطف لینے کی خواہش کے علاوہ غالباً کچھ نہ ہوتا اور اس میں اس غریب لڑکے سے ہمدردی کے قسم کا کوئی عنصر تلاش کرنا سراسر جھوٹ ہوگا۔

دادے ابا کا انتقال

محی الدین پور میں دادے ابا کی صحت اچھی تھی لیکن یکا یک پھوڑا پشت پر اسی جگہ پھر نمودار ہوا اور قبل اس کے کہ الہ آباد سے طبی مدد حاصل کی جاسکتی ان کا انتقال ہو گیا۔

تار ملتے ہی ہم سب وہاں کے لیے روانہ ہو گئے لیکن سوئم تک میں شرکت ممکن نہ ہو سکی۔ ملازمت کے سبب ابا اگلے ہفتے اورئی لوٹ آئے لیکن ہم وہیں رہ گئے۔ پھر بھی مجھے دادے ابا کا چالیسواں قطعاً یاد نہیں۔

دادے ابا کے انتقال میں گیا تھا تو بہت رویا تھا اور حالت یہ تھی کہ مسجد میں، جو گھر سے لگی ہوئی تھی، نماز پڑھنے نہ جاتا کہ کہ حجرہ دیکھ کر دادے ابا یاد آتے اور آنسو بہنے لگتے اور مسجد کے پاس سے گذرتا تو دوسری طرف دیکھنے لگتا کہ اسے دیکھ کر رونا آتا۔

دادے ابا کا انتقال ہوا تو میں خاصا چھوٹا تھا۔ یہ عمر غم پالنے کی نہیں ہوتی اور غم ہی کیا خوشیاں بھی گزشتنی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہوں لیکن دادے ابا کے بغیر محی الدین پور سونا سونا لگتا۔ نصیر چچا ہوں یا ماجد دادا، لطیف تائے ابا ہوں یا شکر قند والے دادا سب طرح طرح سے دلجوئی کرتے اور کوشش کرتے کہ میں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہوں، کچھ نہ ہو تو آموں کے باغ ہی گھوم آؤں یا وہ چکی دیکھنے دوسرے بچوں کے ساتھ چلا جاؤں جو ماجد دادا کے گھر کے پیچھے لیکن جوہڑ سے ذرا سا آگے، ہر وقت ''پھک پھک'' کرتی رہتی۔ پھر بھی دادے ابا یاد آتے ہی رہتے، مگر اتنے نہیں جتنے بعد میں آئے اور ان یادوں میں اس وقت محرومی کا عنصر بھی اتنا نہ تھا۔ ان کے نہ ہونے کے معنی پوری طرح تو ابا کے انتقال کے بعد سمجھ میں آئے۔ ابا کے چٹ پٹ ہو جانے کے فوراً بعد نہیں، تھوڑا وقت گزر گیا تو ایک طرح سے اس خیال نے گھیرا ڈال دیا کہ دادے ابا ہوتے تو سب کچھ یوں بکھر نہ جاتا، اور ایسا نہ لگتا جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔

میاں کی آن

محی الدین پور میں ہمارے گھر سے ملحق میدان میں جو مسجد کے پشت کی پوکھر کے بائیں جانب تھا ہفتے میں دو دن، غالباً منگل اور سنیچر کو، ہاٹ لگتا اور تہہ بازاری ہمارے گھر آتی۔

ترکاریوں کے ٹوکرے اور جھابے تو میں نے ضرور دیکھے لیکن گیہوں، چاول، چنا وغیرہ بھی ہیں۔ ویسے اس کی ضرورت بھی نہ تھی کیوں کہ گھر کے سامنے کا کوٹھار اجناس سے بھرا رہتا۔ پھر بھی میں اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ زمیندار اور صاحبانِ حیثیت صرف اپنی آن بان دکھانے کے لیے غریب غربا پر اپنے اقتدار کے اظہار میں بھی ایک طرح کی راحت محسوس کرتے ہیں اور اسی لیے بالکل ممکن ہے کہ اجناس کی تہہ بازاری نقد کی صورت میں وصول کی جاتی رہی ہو۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ترکاری کا بڑا حصّہ گھر میں کام کرنے والی عورتوں اور دھوبنوں وغیرہ میں تقسیم کردیا جاتا۔

تہہ بازاری وصول کرنے اور ہاٹ کے دوسرے انتظامات کے لیے ایک صاحب مقرر تھے۔ وہ دبلے پتلے اور چھوٹے سے قد کے تھے اور نہ صرف ان کی چگّی داڑھی بلکہ پورے چہرے پر مظلومیت برستی تھی۔ میدان کے کونے میں ان کا چھوٹا سا مکان تھا جس میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے۔ انھیں رہنے کے لیے یہ کچّا مکان شاید چچا نے دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انھیں تہہ بازاری میں سے تھوڑی بہت ترکاریوں کے علاوہ دس پندرہ روپے مہینہ تنخواہ بھی ملتی رہی ہوگی۔ ان کا نام قدیر تھا۔

ان کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ تاریخ طے ہونے کے بعد وہ نواب چچا کو اس تقریب میں مدعو کرنے کے لیے آئے۔ چچا خاموش رہے لیکن جب وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگے تو چچا نے آمادگی ظاہر کردی۔ میں اس وقت وہاں موجود تھا۔ چچا نے شادی میں شرکت کے لیے رضامندی ظاہر کی تو قدیر میاں کے چہرے پر کچھ ایسی خوشی چھا گئی کہ اسے بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔ خوش تو وہ ضرور تھے اور اس قدر کہ باچھیں کھلی جارہی تھیں لیکن اس میں غربت بھی تھی اور اس کا احساس بھی، جنم جنم کی مفلوک الحالی کا نقش بھی اور بیٹی کے بہتر مستقبل کی امیدیں بھی۔ وہ جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے لوٹے اور چبوترے کے زینے اتر کر انھوں نے پوکھر کا رخ کیا تو معلوم ہوتا کہ خوشی کے مارے ان کے پیر زمین پر نہ پڑ رہے ہوں۔

اس وقت خیال نہیں آیا لیکن اب سوچتا ہوں کہ نواب چچا شادی میں شرکت چاہے نہ کرتے لیکن اس غریب کو سو پچاس روپے دے دیتے تو اس کے دس کام نکلتے۔ دادے ابّا ہوتے تو یہی کرتے، مجھے یقین ہے۔

معلوم نہیں کیوں شادی میں شرکت کرنے کے لیے نواب چچا صرف مجھے اپنے ساتھ

لے گئے تھے، اپنے کسی بیٹے کو بھی نہیں۔ قدیر میاں پہلے ہی سے منتظر رہے ہوں گے۔ ابھی ہم پوکھر کے پاس ہی تھے کہ ہم پر ان کی نظر پڑگئی اور انھوں نے دوڑ کر ہمارا استقبال کیا۔ وہ مارے خوشی کے بچھے جارہے تھے، کبھی دو قدم بڑھ کر اپنا سر جھکاتے اور دونوں ہاتھ جو کمر سے نیچے جھولتے رہتے آگے بڑھاتے اور کبھی پہلے سے موجود مہمانوں کی طرف جو ہم پر نظر پڑتے ہی کھڑے ہوگئے تھے، فخر سے دیکھتے، جیسے کہہ رہے ہوں کہ تم سمجھتے کیا ہو میری بیٹی کی شادی میں نواب میاں آئے ہیں۔

قدیر میاں نے نواب چچا کے لیے خاص انتظام کیا تھا۔ پلنگ پر سفید چادر بچھی تھی اور سرہانے گاؤ تکیہ تھا۔ ہم لوگ بیٹھے ہی تھے کہ وہ شاید فرطِ مسرّت میں پیتیانے اور سرہانے کا فرق بھول کر تکیہ کے پاس بیٹھ گئے، یہ جانے بغیر کہ وہ ان کی ''توہین'' کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان کی اس جرأت پر چچا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ انھوں نے گھور کے قدیر میاں کی طرف دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس غریب نے لاکھ لاکھ منّت سماجت کی، ہاتھ جوڑے، معافی مانگی لیکن چچا کا دل نہ پسیجا اور وہ مجھے لے کر چلے آئے۔ نواب چچا کا رویہ مجھے ذرا اچھا نہ لگا، میرا بس چلتا تو وہیں رک جاتا۔

سارے زمینداروں کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ہمارے گھر کے بعد نصیر چچا، بڑی اماں، لطیف تائے ابّا پھر ماجد دادا کا گھر تھا پھر گلیارہ اور پوکھر، جس کے ایک کونے پر بانس کے درختوں کا جُھنڈ تھا اور گلیارہ کی دوسری جانب داروغہ جی کا گھر۔

شام ہوتی تو ان پانچوں گھروں کے سامنے کے چبوتروں پر پہلے چھڑکاؤ ہوتا، دھیرے دھیرے جھاڑو دی جاتی، تخت پر دوہر اور سفید چادر بچھا کر اسٹول یا چبوترے کی مینڈ پر لالٹینیں روشن کردی جاتیں۔ ایسے میں کارندے جو ''سپاہی'' کہلاتے، تیل پلائی لاٹھیاں ہاتھوں میں لیے ایک دوسرے سے باتیں کرتے یا ادھر ادھر ٹہلتے رہتے لیکن ''مالک'' کے آتے ہی چُپ سادھ کے کھڑے ہوجاتے اور سورج ڈوبنے کے بعد کے دھندلکے میں ہیولے سے نظر آنے لگتے۔ دور سے ان کے مضبوط جسم اور لاٹھیاں تو نظر آجاتیں لیکن ایسا لگتا کہ ایک ہی کاٹھی اور شکل وصورت کے لوگ ادھر ادھر کھڑے ہوئے ہیں۔

گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار جو بھی رہا ہو لیکن دبدبہ سب سے زیادہ ماجد دادا کا تھا اور اس کے بعد نواب چچا کا۔ دونوں ہی درشت مزاج تھے لیکن ماجد دادا زیادہ۔ باقی سب

زمینداری سبھاؤ سے کرتے۔ ماجد دادا کی بیٹی کا نام شمیم تھا اور سب لوگ اسے شمّو کہتے اور میں جانے کس رشتے سے شمو خالا۔ لیکن وہ مجھ سے پردہ کرتی تھیں۔

ڈاکٹر جعفر رضا سے ان کی کیا رشتہ داری ہے یہ نہیں معلوم لیکن ان دنوں جب ''کتاب'' شائع ہوتا تھا میں الہ آباد گیا تو ان کے یہاں بھی جانا ہوا۔ میں جلدی میں تھا اور دس بارہ منٹ کے قیام کے بعد رخصت ہونے لگا تو انھوں نے کہا شمو سے نہیں ملیے گا لیکن میں نے کوئی بہانہ بنا دیا۔

ہمارے گاؤں میں تعزیے داری بہت زور شور سے ہوتی تھی اور اس سلسلے کے جلسے جلوسوں کا آغاز زمینداروں کے مکانوں کے سامنے والے میدان ہی سے ہوتا۔

محی الدین پور پھول پور کے حلقۂ انتخاب میں آتا تھا جہاں سے پنڈت نہرو پارلیمنٹ کا الیکشن لڑتے۔ ان کا انتخابی دفتر ہمارے گھر میں قائم ہوتا۔ بعد میں رام منوہر لوہیا اور لال بہادر شاستری بھی یہیں سے لوک سبھا کے لیے منتخب ہوئے۔ پنڈت نہرو اور شاستری جی تو ماجد دادا کے یہاں آئے بھی تھے۔

ان دنوں پھول پور اور سرائے ممریز کے درمیان چلنے والی بس، جو محی الدین پور سے گذرتی، ہفتے میں دو بار چلتی تھی۔ مردوں کو سرائے ممریز جانا ہوتا یا پھول پور تو وہ بس سے سفر کرتے لیکن ہمارے خاندان کی خواتین محی الدین پور سے سرائے ممریز تک کا سفر پالکی سے طے کرتیں۔ یادداشت کے مطابق میں نے یہ سفر اماں کے ساتھ دو بار کیا تھا۔ دو مسیارے پالکی کا ڈنڈا کندھے پر رکھے ہوئے اس قدر تیز چلتے کہ تیل پلائی ہوئی لاٹھیوں سے دونوں مسلح سپاہیوں کو جو حفاظت کے خیال سے ساتھ بھیجے جاتے تقریباً دوڑنا پڑتا۔ یہ مسیارے اپنی زبان میں مسلسل ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے جو ہماری سمجھ میں خاک نہ آتیں۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ پالکی زمین پر رکھے بغیر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کندھا کیسے بدل لیتے ہیں لیکن ہلکے سے جھٹکے سے ہمیں اس کا احساس ہو جاتا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ پالکی زمین پر رکھ دیتے، گڑ اور چبینا کھاتے، پانی پیتے اور ستاتے۔ میرا خیال ہے انھیں چبینا کے علاوہ مزدوری کے طور پر کوئی رقم نہ دی جاتی ہوگی کیوں کہ گاؤں میں جھونپڑی ڈال کر رہنے کی اجازت کیا کچھ کم اجرت تھی!

برسوں بعد معلوم ہوا کہ یہ سیاہ فام لوگ چوہے کھاتے تھے اور اسی لیے مسیارے کہلاتے۔

دادے ابا کے بارے میں اتنا کچھ یاد ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کیا

چھوڑ ں۔ وہ اپنی مثال آپ تھے۔ اس وقت تو اندازہ نہ تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ میرے ہیرو رہے ہوں گے۔ لیکن میں نے ان کی تصویر میں ایک رنگ بھی نہیں بڑھایا ہے۔ مجھے انھیں بھی تو جواب دینا ہے۔

میں نے انھیں قیمتی کپڑے پہنے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی بات چیت، لوگوں سے ملنے جلنے کے انداز یا چال ڈھال میں ذرا بھی تصنع نہ تھا۔

ان کا قیام زیادہ تر ہم لوگوں کے ساتھ رہتا اور اورئی کے ڈاک خانے میں ان کا اکاونٹ تھا۔ یہی صورت بھوپال اور رتھیڑی کی تھی۔ محی الدین پور میں اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔

ان دنوں کتابوں کی طرح چشموں کی دکانیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ کم سے کم اورئی میں کوئی ایسی دوکان نہیں تھی جہاں آنکھیں ٹیسٹ کرا کے چشمہ بنوایا جا سکے۔

چشمے فروخت کرنے والے لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے بکس لیے ہوئے آتے۔ ایک میں مختلف نمبروں یا طاقت کے شیشے ہوتے اور دوسرے میں فریم اور تیار چشمے۔ ان کا کام خاصا مشکل ہوتا۔ عام طور پر پیاسا کنواں تلاش کرتا ہے لیکن ان دنوں کم سے کم چشموں اور کتابوں کے سلسلے میں کنویں کو پیاسوں کی تلاش کرنا پڑتی تھی۔ دادے ابا کے پاس جب بھی کوئی چشمہ فروخت کرنے آتا وہ ایک چشمہ ضرور خرید لیتے۔ دادی اماں کہتیں کہ اتنے تو رکھے ہوئے ہیں کیا ضرورت تھی تو وہ کہتے معلوم نہیں وہ بے چارہ کیا کیا امیدیں لے کر آیا ہوگا، اس سے انکار کیسے کرتا۔

میرا خیال ہے اس زمانے میں چشمہ ایک ڈیڑھ روپے میں مل جاتا ہوگا یا ممکن ہے اس سے بھی کم میں۔ اس زمانے میں دوا ڈال کر بینائی ٹیسٹ کرنے کا طریقہ جو اَب متروک ہو چکا ہے، شاید شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ بس جس نمبر پر کہہ دیا جاتا کہ پہلے کے مقابلے میں صاف دکھائی دیتا ہے وہی چشمہ کا نمبر قرار پاتا۔

پھنڈر پھو

ابا صبح ٹہلنے جاتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی ساتھ ہو جاتا۔ وہ اتھائی کی ڈھال اور نالا پار کرنے کے بعد جو برسات میں بہت بڑی ندی کی شکل اختیار کر لیتا، جوتے اتار کر تھیلے میں رکھ لیتے، شاید گھاس کی نمی سے لطف اندوز ہونے کے لیے۔ لیکن کچھ لوگ اسے کنجوسی پر محمول کرتے۔

میرا خیال ہے کہ ابا کنجوس نہیں تھے، ہاں فضول خرچی ضرور انھیں ناپسند تھی۔

ایک دن سیر کے لیے نکلتے وقت وہ گھڑی دیکھنا شاید بھول گئے یا آسمان کی روشنی سے غلط اندازہ لگانے کے سبب انھوں نے اس کی ضرورت نہ محسوس کی۔ اس دن کنڈ کے داہنی جانب جب ہم دونوں خاصے آگے نکل گئے تو یکا یک دور سے ایک زوردار آواز گونجی۔

''ہوکم سَدے اَر، پھنڈ ر پھو''۔

ابا نے اس آواز کو کوئی اہمیت نہ دی اور چہل قدمی جاری رکھی۔ مشکل سے دو منٹ کے بعد وہی آواز پھر گونجی۔

''ہوکم سَدے اَر، پھنڈ ر پھو''۔

معلوم نہیں ابا کس خیال میں گم تھے کہ انھوں نے اس بار بھی آواز پر کوئی توجہ نہ دی اور میری تو سمجھ میں یہ بھی نہ آ رہا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ اتنے میں دو سپاہی جو بندوق سے لیس تھے تیزی سے چلتے ہوئے ہم دونوں کے سامنے دھپ سے اس طرح بیٹھ گئے کہ ان کی بندوق کی نال کا رخ ہماری طرف تھا۔ اب ابا کو صورتِ حال کی سنجیدگی کا احساس ہوا اور انھوں نے فوراً کہا۔

''فرینڈ... ظفریاب حسن۔''

یہ سنتے ہی دونوں سپاہیوں نے بندوقیں نیچی کرلیں اور آگے بڑھ کر کہا۔

''آج آپ اتنی جلدی ٹہلنے کے لیے نکل آئے، ابھی تو سویرا ہونے میں دیر ہے۔''

ابا کے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ تین ساڑھے تین بجے ہیں۔

گرمیوں کے دن تھے۔ وقت کا اندازہ کرنے میں اتنی بڑی غلطی پر ابا کو سخت حیرت تھی۔ ہم دونوں نے باقی وقت جیل کے گیٹ پر تعینات سپاہیوں کے ایک کمرے میں پلنگ پر گذارا۔ اس دوران سپاہی ابا سے بہت ادب سے بات چیت کرتے رہے۔

واپسی میں میرے پوچھنے پر ابا نے بتایا کہ جیل کے ان سپاہیوں کو Who comes there, friend or foe? کا تیسری بار بھی جواب نہ ملنے کی صورت میں گولی مار دینے کا حکم ہے۔ اس وقت مجھے Foe کے معنی بھی نہیں معلوم تھے۔

ہمارے یہاں گراموفون نہیں تھا لیکن رفیق بھائی کے یہاں، جن کے والد کچہری میں کسی معمولی سی جگہ پر تھے، بہت پہلے سے تھا۔ رفیق بھائی کے مکان کی چھت ہمارے مکان سے ملی ہوئی تھی اور ان کے درمیان بس اتنی اونچی دیوار تھی کہ ان کی والدہ اسٹول رکھ کر اماں سے بات

چیت کرلیا کرتیں۔ رفیق بھائی کے دو بڑے بھائی بھی کسی دفتر میں ملازم تھے اس لیے ان کی مالی حالت اچھی تھی۔ دھیرے دھیرے اس گھر کے لوگوں سے ہمارے تعلقات اتنے اچھے ہو گئے کہ ابا نے انھیں اپنے مکان کے باہر کی زمین میں ایک کھڑکی کھولنے اور زینہ بنانے کی اجازت دے دی لیکن ابا کے انتقال کے بعد جب ہمارے مکانوں کے فروخت ہونے کی نوبت آئی اور خریدار نے کھڑکی اور زینے پر اعتراض کیا تو رفیق بھائی نے کسی حیل وحجت کے بغیر زینہ توڑ کر کھڑکی بند کر لی اور پہلے کی طرح دیوار چن دی۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس دوران سورج نہ جانے کتنی بار ڈوبا اور ابھرا ہوگا۔

میں رفیق بھائی کے یہاں سے کبھی کبھی گراموفون منگا لیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اماں سے کہا کہ رفیق بھائی کے یہاں سے باجا منگوا دیجیے۔ انھوں نے کسی سے کہلوایا لیکن اس وقت ان کے یہاں کچھ مہمان آئے تھے اور گانا سن رہے تھے اس لیے گراموفون نہیں آیا۔ ان دنوں مَیں عمر کی اس منزل میں تھا جہاں دوسروں کی مجبوری مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے، چنانچہ میں نے مُنہ پھلا لیا۔

تو نے کیا کِیا بتا تو سہی

اتنے میں ابا کچہری سے آ گئے اور انھوں نے میرا مُنہ پھولا ہوا دیکھ کر اماں سے اشارے سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے ساری بات بتائی۔ یہ سنتے ہی ابا نے، جو شیروانی اتا رہے تھے، آستین میں ہاتھ دوبارہ ڈالا، شیروانی کے بٹن لگائے، میری انگلی پکڑی اور بالا دین چپراسی کو ساتھ لے کر بزریا کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان دنوں اورئی میں گراموفون کی ایک ہی دکان تھی اور وہ دکان اب بھی موجود ہو تو میں بغیر کسی کوشش کے سیدھے اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو سکتا ہوں۔ لیکن اب وہاں گراموفون تو فروخت ہوتے نہ ہوں گے کیوں کہ ان کا چلن نہیں رہ گیا ہے ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ تیسری نسل ٹی۔ وی۔ وغیرہ فروخت کر رہی ہو۔ اس وقت ہز ماسٹر وائس کا گراموفون، ٹین کے ڈبے میں پندرہ سولہ رکارڈوں اور سوئیوں کی دو ڈبیوں کے ساتھ، صرف سترہ یا اٹھارہ روپے میں ملتا تھا۔ اس گراموفون میں رفیق بھائی کے باجے کی طرح بھونپو بھی نہیں تھا۔ دوکان دار نے کئی رکارڈ بجا کر سنائے تھے اور مجھے سب سے زیادہ وہ رکارڈ پسند آیا تھا جس کے ایک طرف دلیپ کمار رائے کا مشہور گانا

کوئی ہمدم نہ رہا، کوئی سہارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے، کوئی ہمارا نہ رہا

تھا اور دوسری طرف ان کی شاگردہ کا

تو نے کیا کِیا بتا تو سہی
مرا چین گیا ، مری نیند گئی

یہ دونوں گانے مجھے اب تک بہت پسند ہیں۔

کئی برس بعد حالات کے تھپیڑوں نے اس گراموفون اور رکارڈ کے دونوں ڈبّوں کو اتوار کے نخاس بازار پہنچا دیا جہاں وہ ساڑھے سینتیس روپے میں فروخت کردیے گئے۔ ماموں جان نے روپے لا کر اماں کو دیے تو وہ بہت روئیں اور مرتے مر گئیں لیکن اس کے بعد انھوں نے سینما کبھی نہ دیکھا۔

خوش قسمتی سے مجھے تیس اکتیس برس بعد چنڈی گڑھ میں دلیپ کمار رائے اور ان کی شاگردہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگیا۔ اسے حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ اس وقت دیویندر اسّر جو خود بھی دلیپ کمار رائے کی آواز کے عاشق ہیں میرے ساتھ تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میں ان کے ساتھ تھا۔ ان دونوں عظیم موسیقاروں کا ذکر آگے آئے گا۔ لیکن کم و بیش اسی زمانے کے ایک واقعے کو ابھی کیوں نہ بیان کردوں کہ مصیبت کے اُن دنوں میں نغمہ و موسیقی کا ذکر کچھ اچھا نہ لگے گا۔

ایک دن کسی اخبار میں امین آباد کی گراموفون رکارڈوں کی ایک دکان کا اشتہار نکلا جس میں دو رکارڈوں کی خریداری پر اپنی پسند کا ایک رکارڈ مفت دینے کی پیش کش کی گئی تھی۔ میری جیب میں کچھ روپے تھے چنانچہ میں نے اس پیش کش سے فائدہ اٹھایا۔ رکارڈ لے کر گھر پہنچا تو پہلی بات جو پوچھی گئی یہ تھی کہ گراموفون تو ہے نہیں، ان کا ہوگا کیا؟ میں نے کہا جس نے رکارڈ دیے ہیں وہی گراموفون بھی دے گا اور کچھ دنوں بعد اس نے گراموفون دے ہی دیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے تینوں اخبار عارضی طور پر بند کردیے گئے تھے، کئی مہینوں کی تنخواہ کی عدم ادائیگی اور ہڑتال کے بعد۔ ایک دن مَیں، انیس اور چھوٹی بیٹی زرّیں اسکوٹر پر لال باغ سے آرہے تھے۔ ہیرالڈ کے سامنے کی عمارت کی دکانوں میں گراموفون کی ایک دوکان پر نظر پڑی تو بس یونہی، آپ چاہیں تو بیکار مباش کچھ کیا کر، کے

مصداق بھی کہہ سکتے ہیں کہ ظاہر ہے ان دنوں اس طرح کی کوئی چیز خریدنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، گراموفون دیکھنے چلے گئے۔ دکان میں داخل ہوتے ہی میں نے کہہ دیا کہ اس وقت خریداری کا کوئی ارادہ نہیں ہے صرف دیکھنے آئے ہیں تاکہ بعد میں دکاندار کو یہ خیال نہ ہو کہ ہم لوگوں نے خواہ مخواہ اس کا وقت برباد کیا۔ پھر ہم طرح طرح کے ماڈل دیکھنے لگے۔ ایک ماڈل پسند آیا تو آپس میں اس پسندیدگی کا اظہار اور ہیرالڈ کھلنے کے بعد اسے خریدنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے ہم دکان سے اٹھنے لگے تو اس نے کہا، "لیتے جایئے، روپے تو آتے ہی رہیں گے۔" اس دوران اسے میں نے یہ تو بتا دیا تھا کہ نیشنل ہیرالڈ میں کام کرتا ہوں لیکن وہ تو بند تھا اور اس کا بھی کیا ٹھکانا تھا کہ میں سچ ہی بول رہا تھا۔ لیکن وہ بضد ہو گیا اور ہمارے لاکھ انکار کے باوجود اس نے گراموفون پیک کر کے ساتھ کر ہی دیا۔ لطف یہ ہے کہ اس وقت اس نے نہ بل دیا نہ کسی کاغذ پر ہم سے دستخط ہی کرائے۔ چند روز بعد میں نے خاص طور سے جا کر بل مانگا تو اس نے کہا جلدی کیا ہے اخبار کھل جانے دیجیے اس کے بعد بل بھی دے دیا جائے گا اور اس نے یہی کیا بھی۔ حالات بہتر ہوئے یعنی تنخواہ ملنے لگی تو میں نے یہ رقم قسطوں میں ادا کر دی۔

اس طرح کے تین چار واقعات میرے ساتھ پیش آئے ہیں۔ موقع ملا تو انھیں بیان کر دوں گا۔

شعر و شاعری

رفیق بھائی کے گھر سے ملحق ایک چھوٹے سے مکان میں جو شاید انھی کا تھا ایک صاحب بطور کرایہ دار رہتے تھے۔ وہ کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے، انھیں شعر و شاعری کا شوق تھا، نعیم تخلص تھا اور شاید نام بھی۔ اورئی کی شعری نشستوں میں شرکت کرتے تھے، ظاہر ہے اپنی غزلیں بھی سناتے رہے ہوں گے۔ انھوں نے اپنی دو ایک غزلیں مجھے بھی سنائی تھیں جب کہ میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا۔ وہ ان شعری نشستوں کا ذکر کرتے تو جی چاہتا کہ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں لیکن اماں اجازت نہ دیتیں۔ بڑی مشکل سے دو شعری نشستوں میں شرکت کا موقع ملا اور دونوں کی ایک ایک دلچسپ بات یاد ہے۔ ان میں سے پہلی نشست اس وقت ہوئی تھی جب جنگ ختم ہونے کے قریب تھی اور دوسری نشست بعد میں۔

بابو ہر گووند دیال اورئی کیا پورے صوبے کے مشہور وکیلوں میں تھے۔ ڈی۔ اے۔ وی

کالج کے پاس ان کی بہت بڑی کوٹھی تھی اور اب بھی ہوگی۔ وہ خاصے خوش گو شاعر تھے لیکن میں نے ان کا کوئی شعری مجموعہ نہیں دیکھا۔ ان کے یہاں ہر مہینے ایک مشاعرہ ہوتا تھا جس میں نہ صرف اورئی بلکہ پورے ضلع کے شعرا شرکت کرتے۔ ان کے یہاں کا وہ مشاعرہ جس میں مَیں موجود تھا، عالمی جنگ میں اتحادی طاقتوں کی حمایت میں ہوا تھا۔ ظاہر ہے اشعار کے پسِ پشت کوئی جذبہ نہ تھا، اس لیے بیشتر اشعار قافیہ پیمائی تک محدود تھے اور ان کا مقصد بابو ہر گووند دیال کی خوشنودی حاصل کرنا تھا، انگریزوں سے بھلا انھیں کیا حاصل ہوتا۔

بابو جی کہنہ مشق شاعر تھے اور ممکن ہے انگریزوں کی حکومت کو ایک بڑی نعمت سمجھتے ہوں اس لیے ان کی غزل میں سراسر آورد نہ تھی۔ شاید اسی لیے ان کا ایک شعر یاد رہ گیا۔ مصرعۂ طرح تھا ''مقاماتِ فتح وظفر اور بھی ہیں'' اور انھوں نے اس پر خوبصورت گرہ لگائی تھی:

ارے جنگ پر مرنے والوں سے کہہ دو
مقاماتِ فتح و ظفر اور بھی ہیں

دوسری نشست میں چوبیس پچیس برس کے ایک صاحب نے جن کی داڑھی خشخشی تھی اور جو مولوی صاحب صرف اس لیے کہلاتے تھے کہ ایک مدرسے میں پڑھاتے تھے، ایک غزل سنائی۔ وہ ہر شعر کچھ اس انداز سے پڑھتے جیسے اس سے اچھا شعر ممکن نہیں اگرچہ ان کی غزل نہ صرف یوں ہی سی تھی بلکہ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی غلطی بھی تھی اور مقطع میں تو انھوں نے کمال ہی کر دیا تھا۔ انھوں نے ''مقطع عرض ہے'' کہتے ہوئے شعر پڑھا:

یہ مسائل تصویف، یہ ترا بیان واحدؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ وعدہ خوار ہوتا

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایسی نشستوں میں شرکائے محفل سے تعریف کرنے کا پٹا لکھا لیا جاتا ہے۔ میں ان اشعار کی پسندیدگی پر حیران تھا اور جب مقطع کی بھی تعریف کی گئی تو مجھ کندۂ ناتراش سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے بہ آواز بلند کہا کہ یہ شعر تو غالبؔ کا ہے اور صحیح شعر پڑھ دیا۔

اس کے بعد جب بھی ان کی نظر مجھ پر پڑتی وہ مُنہ دوسری طرف کر لیتے۔

میں نے مولوی صاحب کو ٹوک تو دیا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ مجھے اپنے دوستوں سے زیادہ اردو آتی تھی لیکن کلاس کے لڑکوں کے ساتھ ہوتا تو اس طرح کے اشعار نہ صرف پسند کرتا بلکہ خود بھی سناتا:

خط کبوتر کس طرح لے جائے بام یار پر
خط کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

اور اس کا جواب

خط کبوتر اس طرح لے جائے بامِ یار پر
خط کا مضموں ہو پروں پر، پر کٹیں دیوار پر

یا

بلبلو غل نہ کرو میرا صنم سوتا ہے
تم تو اُڑ جاتی ہو وہ مجھ پہ خفا ہوتا ہے

دھیرے دھیرے مولوی صاحب والی بات اورئی میں پھیل گئی۔ کچھ لوگ میری تعریف کرتے تو دوسرے کہتے اتنے سے لڑکے نے مولوی صاحب کو سب کے سامنے ٹوک دیا، انھیں ذلیل کیا، یہ اچھی بات نہیں کی اس نے۔ اس کے گھر والوں نے اسے ڈانٹا کیوں نہیں تاکہ اس طرح کی حرکت وہ آگے نہ کرے۔ یہ بات مجھے ان صاحب سے معلوم ہوئی جو نعیم تخلص کرتے تھے۔ معلوم نہیں کتنی صحیح تھی، کتنی غلط۔ تین چار دن بعد یہ بات ابا کو بھی معلوم ہوئی اور جب میں نے انھیں تفصیل بتائی تو انھوں نے کہا تو کچھ نہیں مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ خوش ہیں اور انھیں تھوڑا سا فخر ہے کہ ان کے بیٹے کو اتنی اردو آتی ہے۔

ان دنوں ڈی۔اے۔وی۔ کالج جو صرف انٹرمیڈیٹ تک تھا، شہر کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ تھا اور میں نے اس میں چار پانچ سال گذارے تھے۔ ظاہر ہے اس کی بہت سی یادیں ہیں لیکن ذہن میں ترتیب سے محفوظ نہیں چنانچہ انھیں اسی طرح پیش کرنے کے سوا چارہ نہیں، جیسے وہ یاد آتی جائیں۔

اب کالج دو حصّوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ انٹر سیکشن ڈی۔اے۔وی۔ کالج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پرانے کالج کی زمین بھی دو حصّوں میں تقسیم کر دی گئی ہے اور بغیہ سے لے کر وہ سارا حصّہ جہاں میرے کلاس ہوتے تھے اب پی۔جی۔ کالج کے قبضہ میں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس جگہ کی صحیح صحیح نشاندہی میں اب بھی کر سکتا ہوں جہاں پرارتھنا ہوتی تھی۔ پرارتھنا میں جو" وہ شکتی ہمیں دو گیان دیو کرتو مارگ پر ڈٹ جائیں" سے شروع ہوتی، پانچویں سے انٹر تک کے طالب علموں کی آٹھ قطاریں لگتیں اور سامنے ٹیچر سر جھکائے کھڑے ہو جاتے۔ یہ پرارتھنا بہت

عقیدت اور احترام سے کی جاتی لیکن ایک بار آٹھویں درجے کے طلبہ نے ایک شرارت شروع کردی۔ اس میں ہوتا یہ کہ سب سے پیچھے والا لڑکا اپنے آگے والے لڑکے کے سر پر دھیرے سے ٹیپ لگاتا اور پھر یہ سلسلہ سب سے آگے والے لڑکے تک جاری رہتا۔ چنانچہ ایک دن جوں ہی پرارتھنا شروع ہوئی اور ٹیچرس نے بھی سر جھکا لیے تو آٹھویں درجے کے طلبہ کی قطار کے آخری لڑکے نے اپنے آگے والے لڑکے کے سر پر ٹیپ ماری۔ اس کا ٹیپ مارنا ہی تھا کہ کسی نے اس کے سر پر پیچھے سے زوردار چانٹا رسید کیا۔ اس لڑکے نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اس دوران کوئی لڑکا آکے قطار میں شامل ہو گیا ہے اور یہ حرکت اسی کی ہے پلٹ کر چانٹا جڑ دیا۔ اسی وقت اسے احساس ہوا کہ پیچھے انگریزی کے ٹیچر مسراجی کھڑے ہیں، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کا تو خون خشک ہو گیا کیوں کہ مسراجی بہت سخت ٹیچر تھے۔ مشہور تھا کہ وہ امتحان کے دنوں میں طلبہ پر نظر رکھنے کے لیے کرپچ کے جوتے خریدتے ہیں۔ لیکن اس دن وہ پرارتھنا ختم ہونے سے پہلے ہی خاموشی سے ادھر ادھر ہو گئے اور انھوں نے پرنسپل صاحب سے کوئی شکایت بھی نہیں کی۔ اس واقعہ کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیپ مارنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

نیت ڈگمگا گئی

شروع کے کچھ دنوں میں ابا کا چپراسی بالادین مجھے اسکول چھوڑنے جاتا لیکن واپسی پاس پڑوس کے لڑکوں کے ساتھ ہوتی۔ ایک دن ابا نے اسے میرا بستہ اٹھائے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ بات انھیں اچھی نہ لگی اور انھوں نے بالادین سے تو صرف یہ کہا کہ تم عابد میاں کا بستہ مت لے جایا کرو لیکن مجھ سے کسی قدر سخت لہجے میں پوچھا، "پڑھنے تم جاتے ہو یا وہ؟۔ آئندہ سے میں اس کے ہاتھ میں بستہ نہ دیکھوں ورنہ تمھیں اسکول اکیلے جانا پڑے گا۔" اور کچھ دنوں بعد ہوا بھی یہی۔ ویسے بالادین کو ساتھ جانے کی ضرورت بھی کیا تھی، وہ تو بس اماں کی ضد پر مجھے کالج تک پہنچانے جانے لگا تھا۔

ان دنوں دستور یہ تھا کہ مہمان آتے تو رخصت ہوتے وقت گھر کے بچّوں کو کچھ نہ کچھ پیسے ضرور دیتے۔ یوں بھی مجھے جیب خرچ کے لیے کچھ پیسے ہر پانچویں چھٹے ملتے تھے۔ پلٹ کے دیکھتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ کلاس میں میری مقبولیت کا ایک سبب شاید یہی تھا۔ ان دنوں اکنّی میں چار پیسے ہوتے اور ایک یا دو پیسے میں بھورے مہاراج سے، جو انٹرول سے تھوڑا پہلے آتے

تھے، سیو، چھوٹے چھوٹے تین سموسے اور مٹھائی مل جاتی جو میں خود کھاتا اور اپنے دوستوں کو کھلاتا۔ بھورے مہاراج کے کھوئے کے پیڑے جو کتھئی رنگ کے ہوتے مجھے بہت پسند تھے۔ یہ پیڑے تھوڑے سے مہنگے ضرور ہوتے۔

ایک دن میرے یہاں کچھ مہمان اس وقت آئے جب میں اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا۔ انھوں نے شاید اس خیال سے کہ ان کے رخصت ہوتے وقت میں موجود نہ ہوں گا، مجھے چونی دے دی۔ پیسے لیتے وقت میرے دل میں کوئی کھوٹ نہ تھا لیکن ناتھورام فوٹو گرافر کی دوکان کے پاس کے چوراہے پر ایک دکان میں کنٹروں میں بھری ہوئی انگریزی مٹھائیاں دیکھ کر، جنھیں ان دنوں کمپٹ کہا جاتا تھا، میری نیت ڈگمگا گئی اور میں نے دو پیسے کی رنگ برنگی کمپٹیں خریدی لیں۔ کالج پاس ہی تھا اور وہاں پہنچتے پہنچتے ان میں سے بہت تھوڑی سی ہی کھا سکا۔ ظاہر ہے باقی ساری دوستوں کو کھلا دیں۔

اوپر کی سطروں میں ناتھورام فوٹو گرافر کا نام محض حوالے کے طور پر آیا ہے، لیکن اس کا ذکر بصورت دیگر بھی آتا۔ اول تو یہ کہ اس وقت تک وہ اورئی میں واحد فوٹو گرافر تھا اور دوسرے یہ کہ اس کی دکان کے باہر اردو میں ایک مزے کا شعر لکھا ہوا تھا اور چالیس بیالیس سال قبل جب میں آخری بار اورئی گیا تھا وہ شعر اسی طرح اردو میں موجود تھا۔ یہ شعر جس کی حیثیت تک بندی سے زیادہ نہیں ان دنوں اس دکان کی پہچان بن گیا تھا۔

پکّے فوٹو سستے دام
فوٹو گرافر ناتھو رام

اس کے علاوہ ناتھورام کے ذکر کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان دنوں جب میں ہائی اسکول میں تھا، سائکل کے پیڈل پر پیر رکھ کر میں نے اس کے یہاں ایک تصویر کھنچائی تھی۔ وہ تصویر یوں بھی عزیز تھی کہ اس میں اس متاع گم گشتہ کے نشان تھے جس کی یاد عمر میں اضافے کے ساتھ فزوں تر ہوتی جاتی ہے۔ افسوس وہ تصویر میرے پاس سے کھو گئی اور بعد میں ناتھورام کی دکان میں نگیٹو (Negative) تلاش کرنے میں اس کی مدد کرنے کے باوجود کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ یہ پہلی تصویر تھی جو میں نے کھنچوائی تھی۔

آیئے ڈی۔اے۔وی۔ کالج ہی چلیں کہ وہاں سید محمد عابد کی جیب میں پیسے کھنکھنا رہے ہیں۔

میں نے انٹرول میں اپنے دوستوں کو مٹھائی اور چھوٹے چھوٹے لیکن بہت مزیدار سموسے خوب خوب کھلائے لیکن ان پیسوں میں شاید گولر کے پھول پڑے تھے کہ ختم ہونے کو ہی نہ آتے اور اسی سے نیت کا کھوٹ کھل گیا۔ اسکول سے آکر کپڑے بدلنے میں جیب سے نکل کر پیسے بکھر گئے جو پانچویں چھٹے دن ملنے والے پیسوں سے زیادہ تھے۔ اماں خفا تو بہت ہوئیں لیکن انھوں نے ابا سے شکایت نہیں کی۔

ابّا نے چانٹا مارا

لیکن ایک بار اماں نے شکایت بھی کر دی۔ میں لڑکوں کے ساتھ آفیسرس کلب کے سامنے والی سڑک پر شاید میل بھر آگے تک جامن کھانے چلا گیا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد واپس آیا تو چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، کچھ تو اتنی دیر تک دھوپ میں گھومنے پھرنے کی وجہ سے اور کچھ ڈر کے سبب۔ اماں نے پوچھا تو میں لگا بہانے بنانے لیکن کپڑوں پر جامن کے نشانوں نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ یہ جامنیں ہم سب نے پتھر مار مار کے گرائی تھیں اور ظاہر ہے ان میں سے کچھ کپڑوں پر بھی گری تھیں۔

کپڑے تو اسی وقت تبدیل کرا دیے گئے لیکن شام کو اماں نے وہ کپڑے ابا کو دکھائے تو جانے کیسے انھیں غصہ آ گیا۔ اور انھوں نے ایک چانٹا میرے مُنہ پر جڑ دیا۔ منیر کی اماں دال بگھارنے کے لیے کرچھے میں گھی گرم کر رہی تھیں۔ انھوں نے جھٹ پٹ گھی چولہے میں ہی الٹ دیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر ابا کے سامنے کر چھا تان کر کھڑی ہوگئیں اور بولیں، ''بس ظفریاب بس، اب ہاتھ نہ اٹھے''۔

ابا سر جھکائے کمرے میں چلے گئے۔

منیر کی اماں ابا کو ظفریاب اور اماں کو بہو کہتیں۔

مجھے نہیں یاد کہ ابا نے کبھی اور مجھے مارا ہو۔ اب اس محرومی پر رونا آتا ہے۔

انھی دنوں کالج میں بنگال سے والی بال کی ایک ٹیم آئی جس نے ہمارے کالج کے کھلاڑیوں کو روند کے رکھ دیا۔ بنگال کی ٹیم میں سوم ناتھ نام کا ایک لمبا چوڑا اور گٹھے جسم کا کھلاڑی تھا۔ وہ اچک کر نیٹ سے شاٹ مارتا تو کوئی اٹھا نہ پاتا لیکن معلوم نہیں کیوں کالج کے لڑکے اس کا

نام لے کرایک دوسرے کو چڑاتے اور سب ہنستے بھی رہتے۔ نہ اب تک اس ہنسی کا سبب سمجھ میں آیا نہ اس کے چڑ بن جانے کا۔ بعد میں کالج کے ایک طالب علم نے جس کا نام احمد بیگ تھا وائی بال میں بڑا نام کمایا۔ وہ اس وقت کالج کا طالب علم یقیناً نہیں تھا اور یہ بات بہت بعد کی ہے۔ اسی لیے میرے ذہن میں اس کی کوئی تصویر نہیں۔

کالج میں ایک لڑکے کا نام شیام جی گپتا تھا، گورا چٹا رنگ اور نکلتا ہوا قد تھا اس کا۔ وہ زیادہ شریر تو نہیں تھا لیکن، ہیکڑی بہت تھی اس میں اور اپنی بات کو اوپر رکھنے کی عادت تھی اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا کام کر لیتا تھا جو کالج میں کوئی اور نہیں کر پاتا۔

ڈی۔اے۔وی۔ کالج تالاب کے کنارے تھا اور کبھی کبھی سانپ تالاب سے نکل کر اس جگہ تک آ جاتے جہاں ایک درخت پر اسکول کا گھنٹہ ٹنگا ہوا تھا۔ سانپ نکلنے کی خبر پھیلتی تو لڑکے وہاں جمع ہو جاتے لیکن دور دور رہتے۔ اسی وقت گپتا لڑکوں کی بھیڑ چیرتا ہوا آگے بڑھتا اور اس کی دم پکڑنے کی کوشش کرتا اور ہمیشہ اس میں کامیاب ہو جاتا۔ میں نے اسے ناکام ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ سانپ کو ایک جھٹکا دیتا اور اپنی گردن میں ڈال کر اسکول میں گھومتا پھرتا اور دوسرے لڑکے ذرا سے فاصلے پر، آگے پیچھے رہتے ہوئے تالیاں بجاتے۔

وہ کہتا کہ دم پکڑ کر جھٹکا دینے سے سانپ کے جسم کی چھوٹی چھوٹی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور وہ ڈسنے کے قابل نہیں رہ جاتا۔ معلوم نہیں یہ بات کتنی صحیح ہے اور کتنی غلط لیکن میں نے یہ ضرور کئی بار دیکھا کہ گپتا جب اسے دوبارہ تالاب کے پاس ڈال دیتا تو وہ اسی جگہ پڑا رہتا، ہلے ڈلے بغیر۔ اس کا کیا ہوتا، چیل کوے اٹھا لے جاتے یا کچھ اور، یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے دوسرے دن کوئی سانپ وہاں پڑا ہوا نہیں دیکھا۔ شیام جی گپتا کے اس بہادری کے کارنامے کی عام طور پر بڑی دھونس پڑتی لیکن کچھ لڑکے ایسے بھی تھے جو اسے کوئی بڑی بات نہ سمجھتے۔ ان کا کہنا تھا کہ تالاب کے سانپوں میں زہر نہیں ہوتا۔ پھر بھی، ان میں سے کسی کو میں نے اس طرح سانپ پکڑتے نہیں دیکھا۔

اوپر کی سطروں میں اسکول کے گھنٹے کا ذکر آ گیا تھا۔ اس سلسلے کی ایک بہت دلچسپ یاد ہے۔ گھنٹہ بجانے کا کام ایک سن رسیدہ بزرگ کرتے تھے۔ وہ ایسے بوڑھے تو نہیں تھے لیکن لمبی داڑھی اور بے ترتیب سر کے بالوں سے انھوں نے صورت ایسی بنالی تھی کہ بہت بڈھے معلوم ہوتے۔ پیتل کا بڑا سا گھنٹہ درخت سے ٹنگا رہتا اور وہ اس کے بڑے سے تنے سے پیٹھ لگائے سویا

کرتے۔ وہ سچ مچ سو جاتے تھے یا ہم کو بس ایسا لگتا کہ وہ سو رہے ہیں، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ ضرور ہوتا کہ وہ ایک دم اٹھ بیٹھتے اور لکڑی کی بڑی سی موگری اٹھا کر گھڑی دیکھے بغیر گھنٹہ بجا دیتے۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی کسی کو شکایت ہوئی ہو کہ انھوں نے پانچ منٹ پہلے یا پانچ منٹ دیر سے گھنٹہ بجا دیا۔ ان کا ایک لڑکا میرے کلاس میں تھا لیکن اب نہ ان کا نام یاد رہ گیا ہے نہ اس لڑکے کا۔

یہ دن کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کے عروج کے تھے۔ شاید ۱۹۴۶ء کے شروع کی بات ہے۔ ایک دن دونوں پارٹیوں کے حامیوں میں معمولی سی جھڑپ ہوگئی۔ مجھے یہ خبر اسکول سے آتے ہوئے اپنے ایک دوست سے ملی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ اس وقت تک میں نے یہ لفظ نہیں سنا تھا لیکن میں نے اس سے اس کے معنی نہیں پوچھے اور ''لاٹھی چارج'' سے یہ سمجھ لیا کہ کچھ لوگوں کو چوٹ بھی لگی ہوگی۔

ابّا کچہری سے آئے تو میں نے یہ خبر انھیں سنائی اور لاٹھی چارج میں ''زبردست'' کا اضافہ بھی کر دیا۔ ابّا مسکرا کر رہ گئے لیکن رات میں انھوں نے مجھے لاٹھی چارج کے معنی بتانے کے بعد کہا کہ پولیس نے دونوں پارٹیوں کے حامیوں کے درمیان تصادم کو روکنے کے لیے زمین پر لاٹھیاں مار مار کر انھیں صرف ڈرایا دھمکایا تھا۔

اورئی میں ان دونوں پارٹیوں کے درمیان تناتنی تو تھی مگر اس اونگھتے سوتے چھوٹے سے شہر میں جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے تھے اس طرح کا تصادم شاید ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن یہ سب بعد کی سوچی ہوئی باتیں ہیں۔ بچپن اور اس کے بعد کے دو چار سال استعجابات کی اس دنیا کا حصہ ہوتے ہیں جو ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے۔

اسی زمانے میں ہمارے گھر میں ایک اضافہ ہوا اور میری چھوٹی بہن نجمہ (میمونہ خاتون) پیدا ہوئی وہ عمران سے دو ڈھائی سال اور مجھ سے تقریباً بارہ سال چھوٹی تھی۔ مجھے بہت اچھی لگتی اور میں اسے گود میں لینے کے لیے کہتا تو امّاں کہتیں تم اسے گرا دو گے، اتنی چھوٹی سی ہے۔ لیکن جب میں نے بہت ضد کی تو امّاں راضی ہوگئیں اور انھوں نے اسے میرے ہاتھوں میں اس طرح دیا کہ نیچے پلنگ تھا۔ اس کے باجود ہوا وہی جس کا امّاں کو ڈر تھا۔ میرے ہاتھ نجمہ کو سنبھال نہ سکے اور وہ گر گئی، لیکن پلنگ پر جہاں امّاں ہاتھ پسارے بیٹھی تھیں۔

عید قربان

دادے ابا کے انتقال کے بعد پہلی عید قربان آئی تو ابا نے گائے خرید کر حسبِ معمول قصائی کے حوالے کر دی۔ ان دنوں گئو کشی پر پابندی نہیں تھی لیکن اس خیال سے کہ برادرانِ وطن کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے ہمارے یہاں قربانی کا جانور چاندرات میں بارہ ایک بجے قصائی لے کر آتا اور راستہ بھی ایسا چنا جاتا جس میں اہلِ ہنود کی آبادی کم سے کم ہو۔ قصائی باڑہ تو خیر پورا کا پورا اسلم محلہ تھا لیکن وہاں سے ہمارے یہاں تک کے دو راستوں میں سے ایک کا فاصلہ خاصا لمبا تھا اور دوسرے کا بہت کم۔ اس چھوٹے راستے میں اتھائی کے بعد تقریباً ایک فرلانگ کا علاقہ ایسا تھا جس میں مسلمانوں کے بس دو چار ہی مکان تھے۔ ہمارے اس مکان میں بھی جو کرایے پر اٹھا ہوا تھا ایک غیر مسلم نائب قانون گو رہتے تھے۔ اورئی میں سڑکیں اس زمانے میں بھی تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبے اور اسی قدر چوڑے پتھروں کی بنائی جاتی تھیں۔ اتھائی سے ہمارے گھر بلکہ ساٹھیے کنویں کے آگے تک کی سڑک پکّی تھی اور اس پر دوسری طرف کھرے بابو کے دو تین گھر تھے۔ کھرے بابو بھی کچہری میں کام کرتے تھے اور ہم لوگوں سے ان کے خاصے گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی قربانی کے جانور کو اتھائی پر روک کے اس کے کھروں کے نیچے روئی اور پھر ٹاٹ کے ٹکڑے رکھ کر انھیں سُتلی سے کس کے باندھ دیا گیا تاکہ پکّی سڑک پر اس کے پیروں سے کم سے کم آواز ہو... بھوپال سے واپسی کے بعد اورئی میں یہ میری تیسری یا چوتھی بقرعید تھی۔ میں نے پہلے بھی یہی طریقہ اپنایا جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس سال ایک بہت بڑا فرق ہو گیا تھا اور وہ یہ کہ پہلے قربانی دادے ابّا کرتے تھے اور اس سال یہ کام ابّا کو انجام دینا تھا۔

عید گاہ سے ہمارے آنے کے تھوڑی دیر بعد قصائی آیا تو میں نے ابا کو رکتے، جھجکتے اور الجھتے ہوئے سامنے والی بغیہ میں جاتے دیکھا جہاں انھیں قربانی کا فرض انجام دینا تھا۔

قربانی کے بعد ہاتھ میں چھری لیے ہوئے، جس سے خون ٹپک رہا تھا، گھر میں ابّا کا داخل ہونا مجھے اس طرح یاد ہے جیسے یہ واقعہ آج میرے سامنے ہو رہا ہو۔ ان کی آستین بھی خون آلود ہو گئی تھی اور کرتے کے دامن پر خون کے چھینٹے پڑے تھے۔

لقاں پر جیسے ہی ان کی نظر پڑی انھوں نے کہا۔

''میرے گھر میں یہ آخری قربانی ہے۔''

اب اسے پیش گوئی کہیے یا اتفاق کہ اگلی بقرعید سے قبل ابا کا انتقال ہوگیا اور میرے لیے تو چڑیا کے گلے پر بھی چھری پھیرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ اس دن کے بعد سے اب تک ہمارے گھر میں قربانی نہیں ہوئی اور ہمارے لیے یہ کام دوسروں کو کرنا پڑتا ہے۔

ان دنوں سورج نکلنے اور ڈوبنے کے درمیان جیسے وقت بہت ہوتا تھا لیکن جانے کیا ہوا کہ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا وقت بھی کم ہوتا گیا۔ یہ حال صرف میرا نہیں سب کا تھا۔ ان دنوں ابّا کے ساتھ ٹہلنے نہ جانا ہوتا تب بھی طلوع آفتاب سے بہت پہلے سو کر اٹھ جاتا۔ سب سے پہلے منجن سے دانت مانجتا، پھر Prefect[1] صابن سے منہ ہاتھ دھوتا اور اکثر نہا کر تیار ہوجاتا تو سورج کی کرنیں اوپر کے کمرے کی چھت کے بیچ والے اونچے حصے کو نرمی سے چوم رہی ہوتیں۔ یہ چھتیں کھپریل کی تھیں، بیچ میں اونچی اور دونوں طرف ڈھلواں، تا کہ پانی چاہے چھاجوں برسے، چاہے جھڑی لگ جائے ذرا نہ چوئے۔ منیر کی امّاں کا گھر پاس ہی میں تھا جہاں وہ بس چھٹے ساتویں دن ہی جاتیں اور صبح جانے کب اٹھ کر جھاڑو و بہارو کے بعد برتن مانجھ کے باورچی خانے کی الماری میں لگا دیتیں اور ہم لوگ سو کر اٹھتے تو گھر صاف ستھرا ملتا۔ ذرا کی ذرا میں ناشتہ مل جاتا اور ناشتہ بھی کیا... مجھے سنکی ہوئی رات کی باسی روٹی جس پر ہلکا سا دانے دار گھی لگا ہو پسند تھی اور ساتھ میں برفی کا ٹکڑا ہوتا تو مزا آجاتا۔ اس کے ساتھ ایک گلاس دودھ پی کر مگن ہوجاتا۔

امّاں کتابیں، رسالے پڑھتیں، بینجو بجاتیں، کروشیا بنتیں، غلافوں پر پھول کاڑھتیں، غریب عورتیں آتیں تو پیسے چاہے آنے دو آنے ہی دیں لیکن گھنٹہ گھنٹہ بھر ان کی رام کتھا سنتیں پھر بھی وقت تھا کہ ختم ہی نہ ہو کے دیتا۔ کمروں میں، آنگن میں، دالانوں میں اور ہر جگہ بس جگہ ہی جگہ ہوتی۔ کوئی نئی چیز آتی، پھر اور کچھ آتا لیکن خالی جگہ اتنی کی اتنی ہی رہتی۔ قصہ اصل میں یہ تھا کہ چیزیں کم ہوتی تھیں اور کام تو چیزوں سے بڑھتے ہیں اور جانے کیسا چکّر ہے کہ چیزیں وقت کو کھا جاتی ہیں اور وقت چیزوں کو اور کام کھڑا انتظار کرتا رہ جاتا ہے۔ اُن دنوں ہنسنے کے لیے بھی بہت وقت ہوتا تھا اور رونے کے لیے بھی بہت۔

انھی دنوں اسکول میں جو نئے ٹیچر آئے تھے وہ شروع کے درجوں میں ڈرائنگ سکھاتے،

۱۔ اس زمانے کے صرف تین صابن یاد ہیں لکس، پریفکیٹ اور لائف بائے، ہاں یاد آیا حمام نام کا بھی ایک صابن ہوتا تھا۔ حمام اور لائف بائے نہانے کے کام آتے، لکس خواتین استعمال کرتیں اور مرد پریفکیٹ سے منہ ہاتھ دھوتے۔

اور ہاکی، فٹ بال اور والی بال کھیلنا بھی اور جب کالج کے اینوئل ڈے (Annual Day) میں ایک مہینہ رہ گیا تو انھوں نے پورے ایک ہفتے کا پروگرام بنا ڈالا۔ اس ایک ہفتے میں ایک دن کالج کے لڑکوں کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش ہونی تھی، اردو، ہندی اور انگریزی میں ڈبیٹ کا الگ مقابلہ تھا، کھیلوں کے مقابلے تھے، پانی پینے کا مقابلہ تھا اور اس طرح کی بہت سی دوسری چیزیں۔

میں تین چیزوں میں تھا، ہاکی، ڈبیٹ اور نمائش کے لیے بنائی جانے والی چیزوں میں۔ ہاکی تو خیر میں کھیلتا ہی تھا اور کرکٹ بھی لیکن کالج میں شاید کرکٹ کی ٹیم نہیں تھی اس لیے کہ اس کھیل میں وقت بہت لگتا ہے۔

یہ نئے ماسٹر صاحب بھی عجیب تھے، جس میں ذرا سا ہنر دیکھتے اسے چمکا دیتے۔ مجھ سے ایک دن پوچھا، ''تمھیں کون سا پھول پسند ہے؟'' میں سوچنے لگا۔ میرے گھر کی بغیہ میں گلاب اور بیلے کے پودے تھے اور مجھے دونوں ہی پسند تھے، یاد آیا ٹماٹر اور کدو کے پودے بھی تھے۔ مجھے سوچتے دیکھ کر بولے، ''ترکاری منڈی تو نہیں پہنچ گئے۔'' اشارہ تھا گوبھی کے پھول کی طرف۔ پھر خود ہی بولے، ''ہاں ہاں، چلو گلاب ہی پسند ہے، تو پھر بنا لاؤ۔''

''بنا لاؤں؟'' میری سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے کہا۔

''تو اور کیا، ڈال سے توڑ کے لاؤ گے تو ذرا سی دیر میں سوکھ جائے گا۔ اور وہ تو ہر جگہ مل جاتا ہے۔ میں تو گلاب کا ایسا پھول چاہتا ہوں جو اصلی نہ ہو لیکن بالکل اصلی لگے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا۔

''مجھے تو گلاب کا ایسا پھول بنانا آتا ہی نہیں۔''

''یہ تم کیسے کہتے ہو'' وہ بولے، ''کیا تم نے بنانے کی کوشش کی تھی؟''

میں نے کہا مجھے معلوم ہی نہیں کہ پھول بنایا بھی جا سکتا ہے، اور یہ بھی جوڑ دیا، ''گلاب کا پھول بنانا مجھے سکھا دیجیے''

''کیا خاک سکھادوں، کریپ پیپر تو ہے ہی نہیں۔''

میں نے کریپ پیپر کا نام سنا بھی نہ تھا، اس لیے ہونقوں کی طرح ان کی صورت دیکھنے لگا۔ اپنی طرف مجھے اس طرح دیکھتے پا کر وہ بولے، ''ایک خاص طرح کا کاغذ ہوتا ہے، کھرے بابو کی دوکان پر مل جائے گا۔ ہرا اور لال یا گلابی لینا۔''

میں شام کو ابا کے ساتھ سبزی منڈی میں کھرے بابو کی دوکان پر گیا تو انھوں نے بھی

میری طرح اس کا نام تک نہیں سنا تھا۔ بزریا کی دوسری اسٹیشنری کی دوکان پر بھی نہیں ملا۔ اگلے دن میں نے یہ بات انھیں بتائی تو بولے، ''لکھنؤ میں مل جائے گا''۔ میں نے لماں سے کہا تو وہ بولیں وہاں کون ڈھونڈے گا، بھائی جان کو اپنے کاموں سے فرصت نہیں ملتی اور کوئی ہے نہیں لیکن انھوں نے پھوپی کو رتھیٹری لکھ دیا اور انھوں نے شاید مظفر نگر سے منگا کر سرخ، گلابی اور ہرے کریپ پیپر کے دو دو دستے، انگور بنانے کے سانچے، ایک خاص طرح کا بہت سا موم اور کیک بنانے کے سانچے بھیج دیے۔

میں بہت خوش ہوگیا، بہت بہت خوش۔ وہ عمر چھوٹی سی چھوٹی بات پر ہی بہت زیادہ خوش ہونے کی ہوتی ہے اور ذرا سی بات میں غم میں ڈوب جانے کی بھی، لیکن بس تھوڑی دیر کے لیے جب کہ جوانی اور اس کے بعد کے دکھ اور بے عزّتیاں بھلائے نہیں بھولتیں، لاکھ کوشش کے باوجود۔

میں نے تینوں رنگ کے کاغذ کی ایک ایک شیٹ موڑ کے اپنے بستے میں رکھی اور اسکول جا کر ماسٹر صاحب کو دکھائی تو وہ خوش ہو گئے، کہنے لگے یہ تو بہت عمدہ ہیں، دلّی سے منگائے ہیں کیا؟ میں نے ہاں تو نہیں کہا لیکن اس طرح انھیں دیکھتا رہا جیسے ان کا خیال صحیح ہو۔ اتنی لمبی چوڑی بات کون بتاتا۔

پنکھڑی اک گلاب کی سی...

اسی وقت انھوں نے جیسے کچھ چونکتے ہوئے کہا کہ تار کے لیے بتانا تو بھول ہی گیا تھا لیکن پھر بولے کہ میرے پاس رکھا ہوا ہے، لیتا آؤں گا۔ ان کی اس بات سے میری خوشیوں پر اوس پڑ گئی کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ اسکول سے واپسی پر اپنے ہاتھ کا بنا ہوا پھول ابا اور اماں کو دکھاؤں گا۔ لیکن اسی وقت ماسٹر صاحب نے اتنا کچھ سکھا دیا کہ میں گھر جا کر یہ کہنے کے قابل ہو گیا کہ گلاب کا پھول دو چار دن میں بنانے لگوں گا۔

کریپ پیپر عام کاغذ کی طرح چکنا نہیں تھا۔ اس کی چوڑائی میں بہت پتلی پتلی سکڑنیں سی پڑی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان سے پھول کیسے بنے گا لیکن جیسے ہی انھوں نے پہلا سبق دیا اور ایک انچ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ٹکڑا قینچی سے کاٹا اور اسے دونوں انگوٹھوں کے بیچ میں رکھ کر اس طرح سے دبایا کہ بیچ کا حصہ ذرا سا گول ہو گیا اور کچھ کچھ پنکھڑی ایسا لگنے لگا تو میری حیرت اور

خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پھر انھوں نے چھوٹی سی قینچی سے اسے ایک جانب سے تراشا تو سچ مچ کی پنکھڑی لگنے لگی۔ انھوں نے دھیرے دھیرے کئی پنکھڑیاں بنائیں، تاکہ میں اچھی طرح سمجھ جاؤں اور کہا کہ گھر پر مشق کرنا لیکن کاغذ برباد نہ کرنا، بہت مہنگا آتا ہے۔

یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ پنکھڑی کیسے بنتی ہے لیکن پھول کیسے بنے گا اور شاخ کیسے بنے گی اور اس میں پتے کیسے لگیں گے یہ اس وقت ذرا بھی سمجھ میں نہ آیا مگر دھیرے دھیرے ماسٹر صاحب نے سب سکھا دیا۔ نمائش میں میری طرف سے گلاب کی شاخیں ہی رکھی جانی تھیں لیکن میں نے ماسٹر صاحب کو اور دوسروں کو حیران کر دیا، عین نمائش کے دن ایک ایسی چیز بھی لے جا کر جس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہوا تھا۔

کریپ پیپر کے ساتھ پھوپی نے انگور بنانے کے سانچے اور موم بھی بھیجا تھا۔ یہ چیزیں اصل میں رضیہ باجی نے بھیجی تھیں اور انگور بنانے کی ترکیب بھی لکھ دی تھی جو بہت آسان تھی۔ انگور بنانے کا سانچا دو حصوں کو ملانے کے بعد مکمل ہوتا، بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ سانچے کے اندر چاروں طرف گھی یا کھانے کا کوئی تیل لگانے کے بعد ان کے درمیان کی پتلی سی نلکی کے ذریعے پگھلا ہوا موم ڈال کر ذرا دیر کے بعد اسے الٹ دیا جاتا تو فالتو موم گر جاتا، پھر یہ سانچہ پانی میں ڈال دیا جاتا تو تھوڑی دیر میں سانچہ خود بخود الگ ہو جاتا اور موم کا انگور الگ۔ یہ انگور بالکل اصل انگور کی طرح کا ہوتا لیکن اندر سے کھوکھلا اور اس میں چھوٹی، بالکل چھوٹی سی ڈنڈی ہوتی۔ یہ انگور ایسے ہوتے کہ پلیٹ میں اچھی طرح سجا کر انگور کے دانوں کے ساتھ رکھ دیے جائیں تو ان میں فرق کرنا مشکل ہو جائے۔

نمائش کے دن میں گلاب کے پھول کی دو ٹہنیوں کے ساتھ انگور کی پلیٹ بھی اسکول لے گیا۔ لیکن اس کام کے لیے بالا دین کو بلانا پڑا۔ راستے میں لوگ میرے دونوں ہاتھوں میں گلاب کی ایک ایک ٹہنی اور بالا دین کے ہاتھوں میں انگور کی پلیٹ حیرت اور اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ نمائش دیکھنے کے لیے شہر کے معززین کو بھی بلایا گیا تھا اور شام کو انعامات تقسیم کرنے کے لیے جلسہ ہوا تھا۔ مجھے دو انعام ملے تھے۔ ایک انگور اور گلاب بنانے اور دوسرا ہا کی میں اچھا مظاہرہ کرنے کے لیے۔ لیکن دوسرے انعام کے بارے میں کچھ شبہ ہے، ہو سکتا ہے وہ سرٹیفکیٹ رہا ہو۔ ایک انعام اور ابھی میرا منتظر ہے لیکن اسے لینے کیک کھانے کے بعد چلیں گے۔

کیک بنانا بہت آسان تھا۔ اسے بنانے میں خوب لطف آیا اور کھانے میں مزا کیوں

کہ اس میں اپنی محنت بھی شامل تھی۔ زندگی میں بہت اچھے اچھے کیک کھائے لیکن اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے پہلے کیک کی بات ہی اور تھی۔ اس سے زیادہ مزے دار کیک تو ساری زندگی میں نہیں کھایا۔ چھ انڈوں اور پاؤ بھر میدے میں پون پاؤ شکر (یا شاید اس کی آدھی؟) اور اسی قدر گھی اور پستے بادام کاٹ کر ملا دینے کے بعد وہ محلول تیار ہو جاتا جو سانچوں میں رکھنے کے بعد بیس پچیس منٹ میں اوپر اور نیچے کی آگ میں تپ کر کیک کی شکل اختیار کر لیتا۔

سانچے طرح طرح کے تھے اور اندر کی طرف تیل لگانے کے بعد انھیں محلول سے پُر کر کے ایک ایسے طشت میں رکھ دیا جاتا جس کے نیچے تسلے میں کوئلے بھبک رہے ہوتے۔ پھر اسے ایک سینی سے ڈھکنے کے بعد اس پر بھی انگارے رکھ دیے جاتے۔ ہدایت کے مطابق پندرہ بیس منٹ بعد سینی کو ہٹا کر دیکھنا ضروری تھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ کیک لگ جائیں لیکن میں اپنے پہلے تجربے میں اس قدر اتاولا ہو رہا تھا کہ میں نے امّاں کے ٹوکنے کے باوجود یہ کام پانچ منٹ بعد ہی شروع کر دیا۔ بار بار کے اس کھولنے ڈھکنے سے ہی، امّاں کے مطابق، کیک کہیں کہیں کچے رہ گئے تھے۔ ممکن کیا یقیناً اس میں میرا ہی قصور تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کے باوجود ان کا ذائقہ لاجواب تھا۔

تقریباً پندرہ بیس سال قبل یعنی بیسویں صدی کے نویں دہے میں ''ذہن جدید'' نے سال بھر کے بہترین مضامین نظم و نثر پر انعامات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ میرا مضمون ''فکشن کی تنقید۔ چند مباحث'' اس سہ ماہی جریدے میں اسی سال شائع ہوا تھا۔ رسالہ کے قارئین نے اس مضمون کو پسند کیا۔ یہی اس کی شادکامی تھی۔ اس انعام کی حیثیت صرف مضمون کی پسندیدگی کے اعتراف کی تھی اور اس میں مالی منفعت کا کوئی عنصر شامل نہ تھا۔ میرے لیے یہ انعام بعد کے بڑے مالی انعاموں پر بھی بھاری تھا۔

لیکن بیت بازی کے اس انعام کی حیثیت جو میری ٹیم کو اور مجھے اس وقت ملا جب میں غالباً آٹھویں درجے میں تھا، کچھ اور ہی تھی۔ بیت بازی کا مقابلہ کالپی کے کسی کالج میں ہوا تھا اور ٹیم کے چاروں ارکان نے اورئی سے یہ سفر سائکل سے کیا تھا۔ والدہ کسی طرح تیار نہ تھیں کہ میں وسط دسمبر میں کالپی تک کا سفر سائکل سے کروں لیکن بالآخر میں نے ان کی رضامندی حاصل کر ہی لی تھی۔

ہم چاروں صبح صبح کالپی کے لیے روانہ ہوئے۔ سردی خاصی تھی اس لیے خوب اوڑھے

لپیٹے تھے۔ کالپی آیا تو دل بلّیوں اچھل رہا تھا لیکن منزلِ مقصود تک پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے لیے سائکل سے اترنا ممکن نہیں کیوں کہ بریک کے استعمال کی ضرورت نہ پڑنے سے انگلیاں جم گئی تھیں جب کہ مسلسل پیڈل چلانے سے پیر سردی سے باکل غیر متاثر تھے۔ چنانچہ ہم لوگ تقریباً آدھ گھنٹے بلاضرورت سائکل چلانے کے دوران انگلیوں کو مسلسل جنبش دینے کے بعد ہی اپنی اپنی سائکلوں سے اترنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔

ٹیمیں چار تھیں اور آدھے آدھے گھنٹے کے دو مقابلوں کے بعد کامیاب ٹیموں کے درمیان فائنل ہونا تھا، پورے ایک گھنٹے کا۔

ابتدائی مقابلہ تو ہم نے بہ آسانی جیت لیا لیکن فائنل میں کالپی کی ٹیم نے دانتوں چنے چبوا دیے اور ص، ط، ظ، اور غ، پر ختم ہونے والے اشعار نے ہمیں مصیبت میں ڈال دیا۔ بہر حال ہم شکست کھانے سے بچ گئے کیوں کہ ہمارا ذخیرہ ختم ہونے ہی والا تھا کہ گھنٹہ پورا ہو گیا۔

ہمارا خیال تھا کہ جج حضرات چوں کہ مقامی ہیں اس لیے ہماری کامیابی مشکل ہے۔ چاروں جج اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے اپنے نمبر دوسرے ججوں کے نمبروں سے ملاتے رہے اور ہم آٹھوں سانسیں روکے نتیجے کا انتظار۔ لیکن نتیجے کا اعلان کیے بغیر وہ چاروں یکا یک اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ دونوں ٹیموں کے نمبر برابر ہیں اس لیے فیصلہ کرنے میں دقت ہو رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت بھی یہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چاروں اپنی اپنی کرسیوں پر دوبارہ براجمان ہوئے اور فیصلے کا اعلان ہوا۔ ہماری ٹیم پہلے انعام کی مستحق قرار پائی۔ فیصلہ اشعار کے معیار کی بنیاد پر ہوا تھا۔

ظاہر ہے طلبہ سارے کالپی ہی کے تھے اس لیے نتیجے کا خیر مقدم رسمی تالیوں سے ہوا؛ گڑگڑاہٹ ان میں ذرا نہ تھی۔

اشعار کی بہتر ادائگی کا خصوصی انعام مجھے ملا۔

امّاں کی علالت

امّاں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ اورئی کے حکیم عبدالرب صاحب نے تبدیلیِ آب و ہوا کا مشورہ دیا تو وہ جونپور چلی گئیں اور گھر میں میرے اور ابّا کے علاوہ صرف منیر کی امّاں رہ گئیں۔

برسات کا موسم تھا اور میں اور ابّا اوپر کے کمرے میں سو رہے تھے۔ رات میں جانے

کیسے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ ابا میرے سرہانے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں اور ان کے سامنے میز پر لالٹین اور وہ چھوٹا سا تھیلا رکھا ہے جس میں اہم خطوط رکھ دیے جاتے تھے۔ وہ تھیلے میں سے خطوط نکالتے، ان میں سے کوئی خط الگ کرتے، اسے پڑھتے اور روتے جاتے۔ اس سے پہلے روتے ہوئے میں نے انھیں صرف ایک بار دیکھا تھا۔ وہ دادے ابّا کے خط پڑھ رہے تھے۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ابا دادے ابا کو اس قدر چاہتے ہیں۔ میں انھیں ایک ٹک دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

اماں جونپور میں پندرہ بیس دن قیام کرنے کے بعد لوٹ تو آئیں لیکن ان کی طبیعت اب بھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ دس بارہ دن بعد ابا علاج کے لیے انھیں ماموں جان کے یہاں لکھنؤ پہنچا آئے۔ ابّا ہر سنیچر کی شام کو لکھنؤ چلے جاتے اور اتوار کی رات میں یا دوشنبہ کی صبح واپس آ جاتے۔ دو بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ میں دونوں بار اگلے دن انھی کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔ ابّا کو قبض کی شکایت رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب ہم ماموں جان کے تانگے میں اسٹیشن جا رہے تھے، انھوں نے رکاب گنج (اس وقت مجھے اس کا نام نہیں معلوم تھا) کے پل کے پاس تانگہ رکوا کر بائیں جانب کی ایک دوکان سے منقّے خریدے اور ایک ایک کر کے کھاتے رہے۔ میرا دل للچا رہا تھا اور میں بار بار کنکھیوں سے انھیں منقّے کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ مجھے بہت چاہتے تھے، جو بھی کھاتے مجھے پہلے کھلاتے لیکن اس وقت وہ شاید اماں کی بیماری سے بہت پریشان تھے اور کھوئے ہوئے۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی سی بات ان کی یاد کا ایک حوالہ بن جائے گی۔

ہائی اسکول پاس کر کے لکھنؤ آیا اور پھر یہیں کا ہو رہا تو سیکڑوں نہیں ہزاروں بار اس پل پر سے ضرور گزرا ہوں گا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہر بار اس جگہ سے گزرتے ہوئے مجھے ابا کی یاد آئی لیکن یہ یقیناً کہوں گا کہ درجنوں درجنوں بار میں نے اس جگہ پر نظر ڈالی ہے جہاں ابا نے تانگہ رکوایا تھا، جہاں سے انھوں نے منقّے خریدے تھے.... اور یہ سب سوچتے اور اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھ کر اکثر آنکھیں نم ہو گئی ہیں اور کبھی کبھی تو رو بھی دیا ہوں۔

بے کسی ہائے تماشہ...

اسی دوران یا شاید اس سے کچھ پہلے کا ایک واقعہ ذہن میں اب تک نقش ہے۔

میں اسکول سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ آٹھ دس لوگوں کو مجتمع دیکھا، تجسس ہوا کہ دیکھوں کیا معاملہ ہے۔ دو لوگوں کے درمیان بحث ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک شکل وصورت سے مسلمان معلوم ہوتا، اس کا کہنا تھا کہ وہ ساری رقم واپس کر چکا ہے۔ وہ کہتا دو روپے فلاں دن دیے، ایک روپیہ اس دن باقی بچے دو تو وہ تمھارے گھر جا کے دیے تھے۔ فریق مخالف کو ایک بار کی واپسی یاد نہ تھی، اور وہ بضد تھا کہ ابھی ایک روپیہ باقی ہے۔ اس دوران کچھ اور لوگ بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ بحث بڑھی تو اس میں گرمی بھی آ گئی، اسی وقت ایک صاحب نے جن کی بڑی سی چوٹی تھی اور جو ماتھے پر تلک لگائے ہوئے تھے اس شخص سے جو دھوتی پہنے ہوا تھا، کہا، ''تم بھول گئے ہو یا جھوٹ بول رہے ہو، یہ ''میاں'' ہیں، یہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔''

یہ سن کر ''میاں'' کے چہرے پر فخر اور خوشی سے ایک ہلکی سی چمک عود کر آئی۔ فریقِ مخالف ظاہر ہے مطمئن نہ تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں اور دھیرے دھیرے بھیڑ چھنٹ گئی۔ میں اور میرے ساتھی بھی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ بات آئی گئی ہوئی۔

وقت گزرتا گیا۔ میں اورئی سے لکھنؤ آ کر بس گیا اور اسے بھی مدتیں گزر گئیں لیکن ایک بار بھی یہ واقعہ یاد نہ آیا تا آنکہ ایک دن کسی غیر ملکی رسالے میں ایک واقعہ پڑھا۔

لندن کے ایک تاجر نے ایک بڑی رقم کی ادائیگی کے لیے بینک سے روپے نکلوائے۔ تھوڑی دیر بعد اسے اطلاع ملی کہ پیرس میں اس کی ماں شدید بیمار ہے۔ اس وقت تک بینک بند ہو چکے تھے۔ اس لیے اس نے ساری رقم اپنے ایک بے حد عزیز دوست کے پاس رکھا دی اور کہا کہ میں دو چار دن میں واپس آ کر لے لوں گا۔ دو چار دن میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور وہ چھے سات دن کے بعد ہی واپس آ سکا۔ اگلے دن اس نے اپنے دوست سے روپے مانگے تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا تم بھول رہے ہو، تم نے روپے مجھے نہیں دیے۔ شروع شروع میں تو وہ سمجھا کہ اس کا دوست مذاق کر رہا ہے لیکن جب اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ تم اس وقت کی گھبراہٹ کے سبب بھول گئے ہو، کسی اور دوست کو دیے ہوں گے تو وہ پریشان ہو گیا۔

دو ایک دن بعد اس نے اپنے دوست کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جو کسی ثبوت یا گواہ کی عدم موجودگی میں پہلی ہی پیشی میں خارج ہو گیا۔

ایک دن وہ بے حد پریشان اور الجھا ہوا فٹ پاتھ پہ چلا جا رہا تھا کہ ملحق گرجا گھر سے کسی نے اس سے رکنے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر میں پادری اس کے پاس آیا اور بولا "What is

"wrong with you, my son?" ۔ ہمدردی کے دو بول سن کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور اس نے ساری بات اسے بتادی۔ پادری اسے چرچ میں لے گیا اور بائبل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ ''اسے ہاتھ میں لے کر کہو کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ صحیح ہے۔'' ظاہر ہے اس نے ایسا ہی کیا۔ پادری اسے بینچ پر بٹھا کر یہ کہتے ہوئے کہ میں ابھی آیا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لوٹا تو ایک بند لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے کہا کہ کامیابی کی کوئی خاص امید تو نہیں ہے پھر بھی ایک اور کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ تم یہ لفافہ اپنے دوست کو دے دو، لیکن اسے کھول کے پڑھنا نہیں۔

حسب ہدایت وہ اپنے دوست سے ملنے گیا تو وہ بہت خندہ پیشانی سے پیش آیا اور اس نے ان روپوں کے بارے میں بھی پوچھا اور یہ معلوم ہونے پر کہ اسے یہ یاد نہیں آیا کہ روپے کس کو دیے تھے، اظہارِ ہمدردی کیا اور طرح طرح سے اس کی دلجوئی کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد تاجر نے وہ لفافہ اپنے دوست کو دیا تو اس نے صوفے پر پیچھے کی طرف ذرا سا جھک کر خط پڑھا، اسے جیب میں رکھا، خاموش بیٹھا رہا، پھر یکا یک اٹھا اور اندر سے ساری رقم لا کر اپنے دوست کے سامنے رکھ دی اور اس سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

''جان، مجھے معاف کر دو میرے دل میں بے ایمانی آ گئی تھی۔''

وہ شرمندہ تھا، معافی مانگ رہا تھا لیکن خط دکھانے پر تیار نہ تھا۔ جان نے بھی ہار نہ مانی اور اصرار کرتا ہی رہا۔ آخر تنگ آ کر اس نے خط دے ہی دیا۔ اس میں لکھا تھا، ''مائی سن، اس کے روپے واپس کیوں نہیں کر دیتے، کیا تم بھی مسلمان ہو گئے ہو؟''

◆◆◆

شجرِ سایہ دار سے محرومی

ابا ہاکی کے بہت اچھے اور کرکٹ کے اوسط درجے کے کھلاڑی تھے اور ہرڈل ریس (Hurdle Race) میں تو کہا جاتا تھا کہ ان کا جواب ہی نہ تھا۔ وہ کلکٹریٹ کے اسپورٹس کلب کے صدر اور ہاکی ٹیم کے کیپٹن تھے۔ میں نے انھیں ہاکی کھیلتے ہوئے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ سینٹر فارورڈ کی پوزیشن میں کھیلتے۔ ان دنوں ہاکی میں ہار جیت کا فیصلہ طاقت کے بجائے مہارت کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پاس دیے جاتے، جسے گیند ملتی وہ مخالف ٹیم کے ایک دو کھلاڑیوں کو جھکائی دے کر گیند کسی اور کے حوالے کر دیتا۔ لیکن یہ بھی ہوتا کہ گیند قبضے میں آنے کے بعد ماہر کھلاڑی جھکائیاں دیتا ہوا ''ڈی'' میں جا کر خود ہی گول کر دیتا۔ ابا کا کھیل دیکھ کر مجھے بھوپال وانڈرس (Bhopal Wanders) کے مشہور کھلاڑی منیر کی یاد آ جاتی۔ میں نے بھوپال میں اپنے قیام کے دوران ان کا جادوئی کھیل دیکھا تھا۔ ایسا لگتا کہ گیند ان کی اسٹک سے چپک کے رہ گئی ہے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ابا کی تعلیم کے دنوں کا ایک واقعہ سن لیجیے جو مجھے دادی اماں نے سنایا تھا۔ ابا نے ہائی اسکول اٹاوہ اسلامیہ کالج سے کیا تھا۔ وہ پڑھائی میں نمایاں نہ تھے مگر ہر سال پاس ہو جاتے۔ نویں درجے میں وہ فیل ہو گئے۔ ان دنوں تعلیم پر بہت زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا اس لیے ان کے فیل ہونے پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی لیکن جب اسی کلاس میں وہ دوسرے سال بھی فیل ہوئے تو دادے ابا کو تشویش ہوئی اور وہ اس کا سبب معلوم کرنے اٹاوہ گئے۔ وہاں جا کر انھیں معلوم ہوا کہ ابا کو نواں درجہ اس لیے نہیں پاس کرنے دیا جا رہا ہے کہ وہ دسویں درجے میں پہنچ گئے تو ایک سال بعد ہائی اسکول کر کے چلے جائیں گے اور اسکول کی ہاکی ٹیم کمزور ہو جائے گی۔ دادے ابا نے پرنسپل صاحب سے ملاقات کر کے ابا کا نتیجہ تبدیل کرایا اور اگلے سال انھوں نے ہائی اسکول پاس کر لیا۔

ان دنوں ہاکی میں نیشنل ٹیم کے علاوہ بھوپال وانڈرس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اٹاوہ

اسلامیہ کالج کی ٹیموں کا دبدبہ تھا۔

میرے خیال میں ابا نے ہائی اسکول ۱۹۱۳ء کے آس پاس کیا ہوگا۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ ابا ہائی اسکول پاس کر کے آئے تو لوگ دیکھنے آتے تھے کہ ہائی اسکول پاس لڑکا کیسا ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں اس بیان کی حیثیت زیبِ داستاں سے زیادہ نہیں کیوں کہ اس وقت تک ہائی اسکول پاس کرنے والوں کی کئی نسلیں اس مرحلہ سے گذر چکی ہوں گی۔

ابا کو ادب اور شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ ہر سال ہاکی کے کل ہند ٹورنامنٹ کے علاوہ ٹاؤن ہال میں ایک مشاعرے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ میں نے انھیں کرکٹ کھیلتے ہوئے تو دیکھا تھا لیکن یہ نہیں یاد کہ اورئی میں کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتا تھا یا نہیں۔

کلکٹریٹ کی ہاکی اور کرکٹ ٹیموں کا خاصا سامان ہمارے گھر میں ہی رہتا لیکن مجھے اسے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ انھوں نے مجھے دو اسٹکیں، کرکٹ اور ہاکی کی ایک ایک بال اور ایک بیٹ خرید دیا تھا اور انھیں سے وہ مجھے دونوں کھیلوں کے گُر سکھاتے تھے۔ ہاکی تو وہ بہت اچھی کھیلتے ہی تھے، لیکن کرکٹ میں وہ معمولی بیٹس مین، معمولی اسپن بالر لیکن قابلِ اعتماد فیلڈر تھے۔ کیچ ان سے مشکل سے چھوٹتا۔

وہ مجھے بال کیچ کرانے کی مشق اس طرح کراتے کہ پہلے دور کھڑے ہو کر بال پھینکتے اور ہر بار سمت اور رفتار بدلتے رہتے، کبھی یکایک اور کبھی دھیرے دھیرے فاصلہ کم کرتے۔ وہ بال کی حرکت، اس کی سمت اور رفتار اور اس ہاتھ کے درمیان جو دائیں بائیں یا اوپر نیچے اسے لوکنے کے لیے بڑھایا جائے مطابقت پیدا کرنے پر زور دیتے اور سامنے سے آنے والی گیند کے بارے میں کہتے کہ سینے سے نیچے کی بال کو دونوں ہاتھ سے ہی کیچ کرنا چاہیے۔ بیٹنگ کے سلسلے میں ان کا ایک جملہ اب تک یاد ہے۔ وہ کہتے، ''ڈیڑھ گز پہلے تک آنکھ اور اس کے بعد سب کچھ تجربے اور اندازے پر منحصر ہوتا ہے''۔ اسپن بالنگ کرنے کے لیے وہ بال پر انگلیوں کی پوزیشن سمجھاتے، نہ صرف سمجھاتے بلکہ گیند پر انھیں ادھر ادھر کھسکاتے۔ شہادت کی انگلی انگوٹھے کے پاس ہوگی تو ٹپا کھا کے گیند داہنی طرف مڑے گی۔ ایسی بال وکٹ سے فٹ سوا فٹ پہلے ٹپا کھائے تو وکٹ اڑ سکتا ہے اور تین فٹ پہلے تو بیٹس مین کے ایل۔ بی۔ ڈبلو ہو جانے یا کیچ اچھال دینے کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے کہ، ''اگر بیٹس مین کو اگلی بال کے بارے میں شک و شبہ میں نہ مبتلا کیا جائے تو اسے آؤٹ کرنا مشکل ہے۔'' گول کرنے کی مشق وہ نہایت دلچسپ طریقے سے

کراتے۔ وہ دو اینٹیں رکھ کر بال ان کے درمیان سے نکالنے کی مشق کراتے اور اس دوران اینٹوں کا فاصلہ کم کرنے کے ساتھ میرے اور گول کے درمیان کی دوری بڑھاتے رہتے۔ پینالٹی کارنر میں اور یوں بھی وہ گیند کی رفتار اور اس کی ممکنہ سمت کے بارے میں گول کیپر کو شک وشبہ میں ڈالنے پر زور دیتے۔ ان کی تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ میں آٹھویں درجے میں ہی ڈی۔ اے وی۔ کالج کی ہاکی ٹیم میں لے لیا گیا تھا، اگرچہ اس کی مدت بہت مختصر رہی۔ ویسے کالج میں کرکٹ کھیلنا بھی یاد ہے۔

میں ہاکی اور کرکٹ کا بہت اچھا کھلاڑی چاہے نہ رہا ہوں لیکن کچھ ایسا خراب بھی نہ تھا۔ محکمۂ اطلاعات (یو پی) کے ماتحت منعقد ہونے والے شہر کے اخبارات کی ٹیموں کے درمیان میچوں میں فیلڈنگ کے دوران مجھے ایسی جگہ کھڑا کیا جاتا جہاں گیند کے آنے کا امکان زیادہ ہوتا اور مجھے یقین ہے کیپٹن کو اپنے اس فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑتا تھا۔ میں اسپن بالنگ کرتا، اور وہ بھی وکٹ پر کھڑے کھڑے، دو چار قدم بھی دوڑے بغیر۔ ایسے ہی ایک میچ میں جو وزیر اعلیٰ کی قیام گاہ کے سامنے لامارٹینیر گراؤنڈ میں پائنیر اور ہیرالڈ کے درمیان ہوا تھا میں نے تین بالوں میں تین وکٹ لیے تھے اور میری اس ہیٹ ٹرک کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی اور انعامات ریاستی گورنر چنا ریڈی نے تقسیم کیے تھے۔ انھوں نے اپنی مختصری تقریر کے دوران ایک جملہ یہ بھی کہا تھا، ''جلد ہی مجھے بھی ایک میچ کھیلنا ہے۔'' میں نے یہ جملہ سن کر نیشنل ہیرالڈ کے چیف رپورٹر پی۔ این۔ بہل سے کہا تھا، ''بہو گنا گئے،'' اور چند ماہ بعد اسمبلی میں واضح اکثریت کے باوجود انھیں مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا تو بہل صاحب نے میری سیاسی فہم کی تعریف کی تھی۔ سیاسی فہم خاک، بس اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی تھی۔

تقسیم انعامات کے موقع کا ایک گروپ فوٹو میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ اس میں میرا بیٹا ساجد سہیل بھی ہے جسے میں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس وقت نیشنل ہیرالڈ کی ٹیم کا کپتان سرور صاحب کا بیٹا صدیق تھا۔ صدیق بہت اچھا کھلاڑی اور اتنا ہی اچھا صحافی تھا۔ تفتیشی رپورٹنگ (Investigative reporting) میں تو اس کا جواب ہی نہ تھا۔ جن دنوں صدیق اور نجم الحسن نیشنل ہیرالڈ کے رپورٹر کی حیثیت سے کانپور میں تھے انھوں نے اپنے Scoops[1] سے نیشنل ہیرالڈ کی تعداد فروخت میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ ایک بدقسمت واقعہ کے بعد دونوں نے ہیرالڈ سے ایک

۱۔ ایسی خبر جو کسی اور اخبار کے ہاتھ نہ لگنے پائی ہو۔

ساتھ قطع تعلق کر لیا تھا۔

نیشنل ہیرالڈ اور محکمۂ اطلاعات کی ٹیموں کے درمیان ایک میچ بابو اسٹیڈیم میں ہوا تھا۔ اس میچ کے دیکھنے والوں میں دوسرے صحافیوں کے علاوہ ایم۔ سی۔ اور ان کے دوست ایس۔ کے۔ نرائن بھی شامل تھے۔ میں بڑی شان سے بیٹنگ کرنے گیا لیکن پہلی اور دوسری گیندوں پر چوے لگانے کے بعد تیسری گیند پر آؤٹ ہوگیا۔ واپس آتے ہوئے جیسے ہی میں اسٹیڈیم کی سیڑھیوں کے پاس سے گذرا، ایم۔ سی۔ نے کہا، "What happened to you Abeed?"

وہ لکھتے تو Abid تھے لیکن بولتے ہمیشہ Abeed ہی۔

میں نے جواباً کہا۔

Sir,what could have I done? They were eleven and I was all alone.

میرے اس جواب پر ایم۔ سی۔ مسکرا دیے تھے لیکن "Yours is really a pitiable case" کہنے سے چوکے بھی نہ تھے۔ برخلاف اس کے ایس۔ کے۔ نرائن نے جو مجھے یونیورسٹی میں انگریزی پڑھا چکے تھے، مجھ سے پوچھا تھا، "Suhail, had you been in the game?" اور میں نے صرف "Yes Sir" کہا تھا۔

نیشنل ہیرالڈ میں اس میچ کی رپورٹ خود ایم۔ سی نے لکھی تھی۔ میں دو سال ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کی کرکٹ ٹیم کا کپتان رہا تھا۔

لیجیے بات پھر کہاں سے کہاں نکل گئی۔

علاج کے لیے اماں ابھی لکھنؤ ہی میں تھیں کہ اورئی کلکٹریٹ کے سالانہ کھیل شروع ہوگئے۔

ابا کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی لیکن تشویش کی کوئی بات نہ تھی۔ اس سال میں نے ان کو آخری بار ہاکی کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ کپتان ہونے کے باوجود وہ خرابیٔ صحت کے سبب ٹیم میں شامل ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے بہت کہا کہ اب سانس پھولنے لگی ہے لیکن ٹیم کے دوسرے کھلاڑی

بضد رہے اور وہ ان کے اصرار پر بطور گول کیپر کھڑے ہو گئے۔ اس پوزیشن میں وہ کبھی کھیلے نہ تھے۔ مخالف ٹیم کا کھلاڑی گیند لے کر آیا اور آسانی سے گول کر کے چلا گیا، ابا دیکھتے ہی رہ گئے۔ انھیں مخالف ٹیم کو تھالی میں سجا کر گول پیش کر دینا اچھا نہ لگا اور انھوں نے گول کیپر کو اس کی جگہ بھیجا، خود اپنی سینٹر فارورڈ کی پوزیشن سنبھالی، بال اپنے قبضے میں لی اور مخالف ٹیم کے ہر کھلاڑی کو جس نے گیند چھیننے کی کوشش کی جھکائیاں دیتے ہوئے ڈی میں پہنچ کر شاٹ مارا جو گول میں تبدیل ہو گیا۔ ''قرض اتار دیا، اب تم لوگ جانو،'' کہتے ہوئے ابا میدان سے باہر نکل آئے۔

اس وقت وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔

امّاں کی طبیعت یکا یک زیادہ خراب ہوئی تو انھیں میڈیکل کالج میں داخل کر دیا گیا۔ ابا کو تار ملا تو وہ لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے، مجھے منیر کی امّاں پر چھوڑ کے۔

دو تین دن بعد ابا کی شدید علالت کا تار آیا تو منیر کی امّاں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ اس طرح کے تار کا مطلب کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ رویا میں بھی تھا لیکن غم کی دبیز چادر نے مجھے اس طرح نہیں لپیٹا تھا جیسے وہ بعد کی تقریباً ساری زندگی لپیٹے رہی۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک طرح کے سکون، بلکہ معمولی سی مسرّت کا احساس بھی ہوا تھا کہ اب کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔

بعد کی ساری زندگی جس طرح گزاری اور دنیا نے جیسا کچھ سلوک کیا اس کے لیے میں نے خود کو ہمیشہ اس وقت کی معمولی سی مسرّت کی اپنی کمینگی سے جوڑ کے ہی دیکھا ہے۔

لکھنؤ پہنچا تو سیوم ہو رہا تھا۔ امّاں مجھے چمٹا کر جس طرح روئیں اور دوسروں نے جس طرح دلجوئی کی اس سے یکا یک احساس ہوا کہ تحفظ کے اس ہالے سے جو اس وقت تک مجھے اپنے سایے میں لیے تھا یکا یک محروم ہو گیا ہوں اور میں حیران حیران نظروں سے ایک ایک کو دیکھ رہا تھا اور سمجھ میں نہ آتا کہ صرف ایک شخص کے رخصت ہو جانے سے ساری دنیا کیسے بدل سکتی ہے۔

نانا تیسرے چوتھے دن آئے تھے، اپنے ذاتی خدمت گار چھیتن (چھی تن) کے ساتھ۔ ان کا چہرہ کچھ ایسا تھا کہ بڑی سے بڑی خوشی، بڑے سے بڑا غم، اس کی ایک لکیر کم کر سکتا تھا نہ اس میں اضافہ۔ وہ سیدھے امّاں کے پاس گئے۔ انھوں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور صرف ایک جملہ کہا، ''اچھن اب تک تو صرف ایک ماں تھی، اب تو ماں بھی ہے اور باپ بھی۔ بہادری سے جینا، خوب ہمّت کر کر کے۔''

''وہ ہمیشہ ''کر'' کے بجائے ''کر کر'' بولتے تھے۔

چچا بھی محی الدین پور سے آ گئے تھے۔ انھوں نے لمّاں سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ عدّت کے بعد میرے علاوہ سب لوگ محی الدین پور منتقل ہو جائیں گے۔ میں اس وقت نویں درجے میں تھا، عمران کی عمر بمشکل پانچ سال اور نجمہ کی ڈھائی سال رہی ہوگی۔

امانتوں کی واپسی

لمّاں ابھی لکھنؤ میں ہی عدّت کے دن گذار رہی تھیں کہ چچا نے اورئی آ کر سارا سامان محی الدین پور منتقل کر دیا۔ بڑے بڑے پلنگ، مسہریاں، پانی کی ٹنکی، لکڑی کے دو بڑے بڑے بکس جس میں چینی کے بھاری لیکن خوبصورت برتن تھے اور سارا دوسرا سامان تین چار بڑی بڑی گاڑیوں میں لاد کر محی الدین پور بھیج دیا گیا۔

لمّاں نے دو بکسوں کی چابیاں مجھے دے دی تھیں۔ ان دونوں بکسوں میں پچیس تیس چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں تھیں جن میں روپے اور چھوٹے موٹے زیورات تھے۔ ہر پوٹلی میں کاغذ کے ایک چھوٹے سے پرچے پر نام لکھا ہوا تھا۔ یہ لوگوں کی امانتیں تھیں جو اُن کے سپرد کر دی گئیں۔ ابّا کے کپڑوں کے بکس میں ایک بڑے سے رومال میں بہت سے روپے اور سونے کا ایک بھاری زیور تھا اور ایک کاغذ پر ''تواری جی'' لکھا ہوا تھا۔ وہ انھیں دے دیا گیا۔

اس وقت تو مجھے خیال نہ ہوا لیکن اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ بہت سے دوسروں کے ساتھ تقریباً وہ سارے ہی لوگ جن کی امانتیں تھیں مجھ سے ملنے آئے تھے لیکن کسی نے ان امانتوں کے سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ تواری جی کا مکان ہمارے گھر سے بمشکل بیس پچیس قدم کے فاصلے پر لڑکیوں کے اسکول کے سامنے تھا۔ وہ تاجر تھے لیکن ان کی دوکان کہاں تھی اور وہ کس چیز کی تجارت کرتے تھے یہ نہ اس وقت جانتا تھا نہ اب معلوم ہے۔ وہ اپنے لق و دق مکان میں تنہا رہتے تھے اور کہیں باہر جاتے تو اپنے گھر کی چابیاں ہمارے یہاں دے جاتے۔

سامان کی منتقلی کے دوران تواری جی تقریباً ہمہ وقت موجود رہے۔ ان کی خاصی بڑی رقم ابّا کے بکس میں تھی لیکن انھوں نے اشارۃً اور کنایۃً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ دونوں بکس، گراموفون اور رکارڈ کے ڈبّے جن کی تعداد اب دو ہو گئی تھی، لمّاں کی ہدایت کے مطابق حکیم صاحب چاکی والے کے یہاں منتقل کر دیے گئے۔

برسوں کی جمی جمائی گرہستی گھر سے تو لکڑی کی بڑی گاڑیوں پر منتقل ہوئی تھی لیکن محی

الدین پور کس طرح پہنچی اس کا مجھے علم نہیں۔ امّاں نے کہا تھا کہ وہ سارا سامان جو مولوی صاحب کے زیرِ استعمال ہے انھیں دے دیا جائے۔ وہ اس کے لیے راضی تو ہو گئے لیکن بڑی مشکل سے۔ برخلاف اس کے منیر کی امّاں بے حد اصرار کے بعد یادگار کے طور پر صرف ایک چمٹا اپنے پاس رکھنے پر تیار ہوئیں۔ امّاں نے منیر کی امّاں سے کہلوایا تھا کہ باورچی خانے کا سارا سامان پہلے بھی تمھارا تھا، اب بھی تمھارا ہے اور یہ سچ بھی تھا۔ امّاں بمشکل ہی کبھی باورچی خانے جاتیں۔ چنانچہ ہر چیز محی الدین پور چلی گئی۔

میں نے دونوں بکسوں میں سے ایک میں اپنے کپڑے اور کتابیں وغیرہ رکھیں اور گراموفون اور رکارڈ وغیرہ کے ساتھ حکیم صاحب چاکی والے کے مکان میں منتقل ہو گیا۔

کچہری سے بھی تعزیت کے لیے لوگ آتے رہے لیکن کسی نے بھی ہاکی اور کرکٹ کے سامان کا ذکر تک نہ کیا۔ بالا دین چپراسی صرف ایک بار آیا۔ اس کے بعد اس نے صورت نہیں دکھائی۔ کھیل کا سارا سامان سندر کے یکّے پر رکھ کر میں نے خود کچہری پہنچایا اور سندر میرے لاکھ اصرار کے باوجود کرایے کی اٹھنی قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔ اتفاق سے انھی دنوں جب سامان محی الدین پور منتقل کیا جا رہا تھا ایک صاحب جو بطور کرایے دار مکان کی تلاش میں تھے، آ گئے اور مکان انھیں بارہ روپے مہینے کے کرایے پر دے دیا گیا۔ دوسرا بڑا مکان دس روپے مہینے پر پہلے ہی سے کرایے پر تھا جب کہ اس مکان میں جو صرف اوپر نیچے کے دو لمبے کمروں، چھت، دالان، چھوٹے سے کچے آنگن اور آب خانے پر مشتمل تھا، چتنی لال نامی ایک سندھی پہلے ہی سے رہتا تھا۔

حکیم صاحب چاکی والے کے یہاں مجھے اوپر کا ایک کمرہ دے دیا گیا تھا۔ یہ اصل میں دو کمرے تھے لیکن ایک معلوم ہوتے۔ سامنے چھوٹی سی کھلی چھت تھی، زینے سے لگی ہوئی۔

سال ڈیڑھ سال سے مہینے کے پہلے اتوار کو جب ابّا گھر کا سامان لینے بازار جاتے میں بھی ان کے ساتھ لگ جاتا۔ اس کام کے لیے ابّا بالا دین کو نہیں بلاتے تھے۔ ایک دن امّاں نے اشارتاً اس کا ذکر کیا تو ابّا نے کہا کہ اسے بھی تو ہفتے میں ایک ہی دن کی چھٹی ملتی ہے۔ گھر کے کام اسے نہیں کرنے ہوتے؟

مجھے ہوش سنبھالے پچھتّر سال ہونے کو ہیں لیکن ان سارے برسوں میں مجھے ایک سال بھی ایسا یاد نہیں جب لوگوں کو گرانی کا رونا روتے نہ دیکھا ہو۔ یہی صورت اس وقت بھی تھی۔ ہر شخص گرانی کا شاکی تھا اور پر امّید کہ اب تو عالمی جنگ ختم ہو گئی، چیزیں کب تک سستی نہ ہوں

گی۔

۱۹۴۷ء میں ابا کی تنخواہ سوا سو روپے کے قریب تھی اور تقریباً چالیس سال بعد ان کی پینشن کے سلسلے میں عمران بھاگ دوڑ کر رہے تھے تو لوگوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی تھی کہ پیشکار صاحب کو اتنی زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔

ان دنوں گیہوں دو طرح کا ہوتا تھا، کٹھیا اور پسیا، کٹھیا مٹ میلے رنگ کا ہوتا اور روپے کا اٹھارہ سیر ملتا جب کہ پسیا جو سفید ہوتا روپے کا سترہ سیر لیکن ہمارے یہاں کٹھیا ہی کھایا جاتا۔ حکیم صاحب نے پسیا کھانے سے منع کیا تھا کیوں کہ وہ چکنا اور لیس دار ہوتا۔ لائف بائے صابن شاید دو آنے کا ملتا اور نہانے کا سب سے اچھا صابن جو پریفیکیٹ کہلاتا اور بیچ سے کچھ دھنسا ہوا ہوتا دو آنے سے کچھ زیادہ کا۔ کریموں میں صرف پونڈ یاد ہے لیکن اب قیمت بالکل یاد نہیں۔ یہ دونوں صابن آج کل کے صابنوں سے تقریباً ڈیوڑھے ہوتے۔ یاد آیا، لکس صابن بھی ہمارے یہاں آتا لیکن اس کی قیمت یاد نہیں۔ اچھا دانے دار گھی ان دنوں تین ساڑھے تین روپے سیر کے حساب سے ملتا تھا۔ ڈالڈا نیا نیا چلا تھا اور شرفا اسے کھلے عام نہیں خریدتے تھے۔ اسے گھاسلیٹ بھی کہتے تھے کیوں کہ مشہور تھا کہ گھاس سے بنایا جاتا ہے۔ یہ گھی ہمارے یہاں بھی ایک بار آیا تھا، دادے ابا اور دادی امّاں سے چھپا کے۔

سوختنی لکڑی کی گاڑی ڈیڑھ پونے دو روپے میں ملتی تھی اور اس میں لکڑی گھر تک پہنچانے اور اسے گھر کے اندر رکھنے کی اجرت شامل ہوتی۔ ہمارے یہاں برسات سے پہلے تین چار چھکڑے لکڑی باورچی خانے سے ملحق کمرے میں جو بہت بڑا تھا محفوظ کر لی جاتی۔ برسات سے پہلے کھپریل کی چھتوں کو بھی درست کیا جاتا۔ پرانے کھپریل ہی دوبارہ چھائے جائیں تو اسے کھپریل کا پلٹنا کہا جاتا۔ کھپریل کے نیچے گھاس پھوس اور سوکھی ٹہنیاں رکھ کر انھیں جمایا جاتا۔ کام شروع کرنے سے پہلے مزدور زور زور سے آوازیں لگاتے، "پردے والے پردا کر لیں، مجدور کھپریل پر چڑھت ہیں۔" کھپریلوں کے نیچے سانپ کی کینچلی کئی بار ملی، کبھی کبھی تو سوکھا بے جان سانپ بھی۔

عدّت کے دن گذارنے کے بعد امّاں اور ئی آئیں تو قیام حکیم صاحب چاکی والے کے مکان ہی میں کیا۔ تعزیت کے لیے آنے والی خواتین کا تانتا بندھ گیا۔ جب بھی کوئی پہلی بار آتا آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوتیں اور پھر دھیرے دھیرے ڈوب جاتیں۔

لکھنؤ میں مجھے اتنی سدھ بدھ نہ تھی کہ پوچھتا آخر ابّا کو کیا ہوا تھا۔ یہاں لمّاں نے بتایا تو معلوم ہوا۔ میڈیکل کالج ہی میں ابّا کی طبیعت خراب ہوئی۔ فوراً ہی انھیں داخل کر دیا گیا تو جانچ پڑتال سے پتہ چلا کہ پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، دھیرے دھیرے پانی نکال دیا جائے گا لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ سارا پانی ایک دم نکال لیا گیا اور وہ چٹ پٹ ہو گئے۔

معلوم نہیں کس ڈاکٹر نے کس سے کیا کہا اور اس نے لمّاں تک کیا پہنچایا اور وہ کیا سمجھیں لیکن میں ذرا کی ذرا میں یتیم اور وہ بیوہ ہو گئیں۔ لمّاں بیوگی کے پچپن برس گذار کر ۲۰۰۱ء میں سدھار گئیں۔

اورئی میں اپنے آٹھ دس دن کے قیام کے دوران لمّاں ایک بار بھی گھر سے نہیں نکلیں، اپنا مکان دیکھنے بھی نہیں گئیں۔ کس دل سے جاتیں۔ جب بھی لکھنؤ، محی الدین پور یا جونپور جاتیں تو ایک بکس ہی ساتھ ہوتا۔ اس بار دو بکس، گراموفون اور رکارڈوں کے دو ڈبے ساتھ تھے لیکن بے سروسامانی کا عالم ایسا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔

حکیم صاحب چاکی والے کا یہ مکان وسط شہر میں، خاص بازار جسے بزریا کہا جاتا، کے قلب میں تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے آٹھ نو کمرے تھے۔ اس گھر میں ایک نہایت گورے چٹے صاحب تھے جنھیں میں شبّو خالو کہتا اور ان کی بیوی کو خالا۔ ان کی بیٹی عتیق اشرف تھی جسے سب لوگ اتّو کہتے۔ وہ مشن اسکول میں پڑھتی تھی۔ مجھ سے بڑی، دبلی پتلی اور خاموش سی شمیم باجی تھیں جن کی شادی کاکوری میں ہوئی تھی۔ میں دعوت ولیمہ میں شرکت کے لیے پہلی اور آخری بار کاکوری گیا تھا۔ ان کے شوہر حنیف بھائی ریلوے میں شاید ٹکٹ کلکٹر تھے۔ وہ چار چھے بار نصرت پبلشرز بھی آئے تھے۔ جب بھی آتے، کاکوری آنے کی دعوت دیتے، خاص طور سے آم کی فصل کے دنوں میں لیکن افسوس میں وقت نہ نکال سکا اور اب دعوت دینے کے لیے وہ اس دنیا میں نہیں۔

اتّو گوری چٹی اور بھولی بھالی تھی، مجھے اچھی لگتی، اور شاید میری دلچسپی کے پیش نظر ہی لمّاں نے اسے بہو بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن پھر دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ لوگ عشق کرنا بھی بھول گئے۔

شبّو خالو اور خالا چاکی نامی گاؤں آتے جاتے رہتے۔ وہاں ان کا مکان اور کھیت کھلیان تھے۔ ایک بار میں بھی گیا تھا لیکن اب رساول کے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں۔ اورئی والے گھر

میں ایک خاتون اور تھیں، دبلی پتلی، چھوٹی سی، شاید بیوہ تھیں اور ہر شخص انھیں ''بوبو'' کہتا۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کیا کرتیں۔ میں نے انھیں دن کے وقت آرام کرتے کبھی نہیں دیکھا۔

میرے اورئی میں قیام کے دوران نواب چچا ہر ماہ پندرہ روپے بھیجتے تھے۔ کرایے کے اٹھائیس روپے ملتے تھے جس میں سے پندرہ روپے میں اماں کو لکھنؤ بھیج دیتا۔ اورئی میں اسکول کی فیس، کاپیوں کتابوں کی خریداری اور اوپر کے اخراجات کے علاوہ میرا کوئی خرچ نہ تھا کیوں کہ کھانے کے لیے بوبو ایک پیسہ لینے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ کالج کے پرنسپل کھرے بابو ابا کے دوست تھے، وہ فیس معاف کرنا چاہتے تھے لیکن اماں نے مجھے منع کر دیا تھا۔

بلا ٹکٹ سفر

اماں کی واپسی کے ڈیڑھ دو مہینے بعد جب میں پہلی بار لکھنؤ جانے کے لیے اسٹیشن پہنچا تو ایک عجیب قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ابا کی زندگی کے آخری دنوں میں ہم لوگ انٹر کلاس میں سفر کرنے لگے تھے۔ اس میں سیٹوں پر پتلے پتلے گدّے ہوتے اور کرایا تیسرے درجے سے تھوڑا سا زیادہ ہونے کی وجہ سے عام طور سے مسافر مہذب اور پڑھے لکھے ہوتے۔ پھر بھی تبدیل شدہ حالات میں انٹر کے بجائے تیسرے درجے کے ڈبے میں سفر کرنا مناسب معلوم ہوا لیکن سب سے بڑا مسئلہ ٹکٹ خریدنے کا تھا۔ اورئی میں ہر شخص ایک دوسرے کو جانتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ تیسرے درجے کی کھڑکی پر مجھے کوئی نہ دیکھے۔ جب بھی کوشش کرتا کوئی نہ کوئی شناسا چہرہ نظر آ جاتا۔ آخر گاڑی آ گئی اور میں بغیر ٹکٹ خریدے اس میں سوار ہو گیا۔ اب اسے اتفاق ہی کہیے کہ لکھنؤ تک کوئی ٹکٹ چیکر نہیں آیا۔

میں نے بلا ٹکٹ سفر ضرور کیا تھا لیکن میری نیت میں کھوٹ نہ تھا۔ ڈبے سے باہر نکلا تو سامنے ایک زینہ تھا۔ مسافروں کو اس جانب بڑھتے دیکھ کر میں نے بھی وہی رخ اختیار کیا۔ اوپر کے لوہے کے گیٹ پر ٹکٹ کلکٹر ایک ایک مسافر سے ٹکٹ لے کر اسے اس پل پر جانے دیتا جو ریلوے کے اختیار اور حدود سے باہر تھا۔ گیٹ پر زیادہ بھیڑ نہ تھی۔ میری باری آئی تو میں نے کہا اورئی سے آ رہا ہوں، میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ مہربانی کر کے ٹکٹ بنا دیجیے۔ میری بات سن کر اس نے ایک ہاتھ نیچا کر کے کچھ اس طرح اشارہ کیا جس کے معنی شاید یہ تھے کہ اسے چند روپے دے دوں لیکن میں نے ٹکٹ بنانے پر اصرار کیا تو اس نے کسی قدر خفگی سے کہا کہ بھیڑ چھنٹ جانے

دو، ابھی کھڑے رہو۔ اتنے میں ایک مسافر نے ٹکٹ کے بجائے ایک لمبا سا کاغذ اسے دیا تو وہ ایک ایک مسافر کو گن گن کر باہر کرنے لگا۔ یہ شاید کسی بارات کے مسافر تھے۔ ایسے موقعوں پر بارات کے لوگ قانون اور ضابطے کی زیادہ پروانہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ ہر کام ہنستے ہنساتے اور جلدی جلدی ہو جائے۔ چنانچہ کسی نے جھک کر گیٹ کی چٹخنی کھول دی اور دھکا مکّی میں بہت سے ایسے لوگ جو بارات کا حصّہ نہ تھے گیٹ سے باہر ہو گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ باقی سب نے تو اپنی اپنی راہ پکڑی لیکن میں وہیں کھڑا رہا۔ ٹکٹ کلکٹر نے چٹخنی دوبارہ لگائی اور جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی میں نے اس سے ٹکٹ بنانے کے لیے کہا۔ وہ سمجھا کہ اسے چڑا رہا ہوں۔ اس نے غصّے میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے، ''بھاگ جا، اب یہاں کیا کر رہا ہے'' کہتے ہوئے دھیرے سے مجھے دھکا دیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے ٹکٹ بنانے کے لیے نہیں کہا۔

ان دنوں جب میں حصولِ تعلیم کے لیے اورئی میں رہتا تھا ایک نہایت دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ اس مکان کے کرایے دار جس میں پہلے ہم لوگ رہتے تھے حیران پریشان چلے آرہے ہیں۔ وہ کرایہ دوسری یا تیسری تاریخ کو خود ہی دے جاتے تھے چنانچہ انھیں دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی۔ انھوں نے بتایا وہ گھر کے سب لوگوں کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے باہر گئے تھے۔ تھوری دیر قبل واپس آئے تو دروازہ اندر سے بند ملا۔ زنجیر کھٹکھٹائی تو اوپر کے کمرے کی کھڑکی سے آپ کے بھائی صاحب نے کہا، ''میں تمھیں نہیں جانتا، جاؤ عابد کو بلا لاؤ۔''

خیر میں ان کے ساتھ ہولیا اور مکان کے باہر سے فیاض بھائی کو آواز دی تو انھوں نے دروازہ فوراً کھول دیا، جیسے میری آواز کا انتظار ہی کر رہے ہوں۔

میں نے کہا، ''فیاض بھائی، یہ آپ نے کیا کیا؟'' تو انھوں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا، ''یہ صاحب بھی عجیب ہیں۔ گھر خالی چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ وہ تو میں نے انھیں بیوی بچوں کے ساتھ لدے پھندے اسٹیشن جاتے دیکھ لیا اور ان کے سامان کی حفاظت کرنے گھر میں آ گیا، ورنہ کوئی چور اچکا ان کا سامان لے جاتا تو تمھاری کتنی بدنامی ہوتی۔''

مجھے ہنسی آ گئی لیکن فیاض بھائی نے اپنی بات جاری رکھی۔

''ان کا کوئی نقصان میں نے نہیں ہونے دیا۔ تالہ رکھا ہے۔ میں نے تو کیل سے کھول لیا تھا۔ چابی انھیں کے پاس ہوگی۔ دن رات جاگ کے ایک ایک چیز کی حفاظت کی ہے۔ بس

دو روٹی صبح، دو روٹی شام کھالیتا تھا۔''

ان کی اس بات پر کرایے دار صاحب اور ان کے بچے ہنسنے لگے۔

فیاض بھائی ان سب کو ہنستے دیکھ کر اور بھی سنجیدہ ہو گئے اور بولے، ''آپ اندر جا کر ایک ایک چیز دیکھ لیجیے۔ کوئی چیز ادھر کی ادھر ہوئی ہو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔''

میں نے فیاض بھائی سے کہا کہ اچھا اب آپ جایئے اور آئندہ کسی کرایے دار کے سامان کی حفاظت کی ضرورت پڑے تو مجھے بھی ساتھ لے لیجیے گا مگر وہ وہاں سے رخصت ہونے پر اس وقت تک تیار نہ ہوئے جب تک کرایہ دار نے گھر کے اندر سے آ کر یہ نہ کہہ دیا کہ ہر چیز اپنی جگہ موجود ہے۔

حکیم صاحب چاکی والے کے مکان کے صدر دروازے سے ملحقہ کمرے اور ڈیوڑھی کے اوپر ایک بڑا سا کمرا اور آنگن تھا۔ مکان کے اس حصے میں ایک بہت خوبصورت نوجوان رہتے تھے۔ ان کو میں شمو بھائی کہتا لیکن اس وقت بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہیں۔ میرا خیال ہے شبو خالو کے چھوٹے بھائی رہے ہوں گے۔ وہ بھی شبو خالو کی طرح سرخ سفید تھے، شام میں سفید قمیض اور سفید نیکر پہنے ٹینس کا ریکٹ ہاتھ میں لیے زینے سے اترتے تو بہت اچھے لگتے۔ وہ ماموں بھانجے کی قبر کے پاس کے آفیسرس کلب جاتے تھے، اگرچہ سرکاری ملازم نہ تھے۔ ان کی شادی لکھنؤ کے محلّہ گولا گنج میں ہوئی تھی۔ بارات میں مَیں بھی گیا تھا۔ ان کی سسرال کے مکان پر ''قزلباش ہاؤس'' لکھا تھا۔ بعد میں شفیق نقوی صاحب کے یہاں جاتے ہوئے، جن کا قیام دو چار گھر آگے یا پیچھے تھا، جب بھی اس مکان پر نظر پڑتی شمو بھائی یاد آ جاتے۔ ان کی بیوی بہت خوبصورت تھیں لیکن میں نے انھیں صرف دو یا تین بار دیکھا تھا کیوں کہ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے۔

شبو بھائی کے یہاں انگریزی کا ایک اخبار آتا تھا۔ اخبار کا نام تو یاد نہیں لیکن بعد میں ان کے پاکستان چلے جانے سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ اخبار ''ڈان'' رہا ہو۔ مسلم لیگ کا اردو اخبار ''منشور'' دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ ''سیاست'' کانپور، بھی مسلم لیگ کا پرجوش حامی تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا محمد اسماعیل ذبیح تھے اور اخبار کی پیشانی پر ''مسلمانو اللہ کی رسّی مضبوطی سے تھامو اور منتشر نہ ہو جاؤ'' لکھا رہتا تھا۔ ''ڈان'' کے ایڈیٹر پوتھن جوزف تھے۔

ان دنوں اورئی میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی جہاں ''منشور''، ''تنویر'' اور

''سیاست'' آتے تھے۔ ''تنویر'' بھی مسلم لیگ کا حامی تھا۔

تقسیم ہند

ہندو۔ مسلم اختلافات نے پورے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ فسادات بھی جگہ جگہ بھڑک اٹھے تھے لیکن مجھے نہیں یاد کہ اورئی میں اس کا کوئی اثر نظر آیا ہو۔ میں نویں درجے میں تھا اور ان دنوں کی سیاسی یادیں خاصی دھندھلا گئی ہیں پھر بھی بہت کچھ یاد ہے، اگرچہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان میں تاریخی تسلسل مجروح ہو گیا ہو۔

دہلی میں ایک عارضی بلکہ عبوری (Interim) حکومت بن کے ناکام ہو چکی تھی اس میں سردار پٹیل وزیر داخلہ، لیاقت علی خاں وزیر مالیات اور سردار بلدیو سنگھ وزیر دفاع تھے۔ سالانہ بجٹ میں لیاقت علی خاں نے ایک لاکھ روپئے سے زیادہ منافع پر زبردست انکم ٹیکس لگا دیا تھا جس سے ہندوؤں کے اوپری طبقے میں سخت بے چینی پھیل گئی تھی۔ سردار پٹیل کو شکایت تھی کہ وہ پن کا ڈبہ تک نہیں خرید سکتے کیوں کہ وزارت مالیات سے اس کی منظوری حاصل نہ ہوتی۔ پاکستان کے سابق گورنر جنرل غلام محمد ان دنوں غالباً وزارت مالیات کے سکریٹری تھے۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ وہ لکھنؤ میں بھی رہ چکے تھے۔ یہ بجٹ سراسر سیاسی تھا اور مقصد اس کا صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر کوئی حکومت نہیں چلا سکتے۔

اس کے بعد فیڈریشن کا فارمولا سامنے آیا۔ اس کے تحت مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے صوبوں کو الگ الگ اکائیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ مغرب میں یہ صوبے پنجاب، سندھ، بلوچستان اور این۔ ڈبلو۔ ایف۔ پی۔ (صوبہ سرحد) اور مشرق میں بنگال اور آسام (یعنی موجودہ مغربی بنگال، آسام، چھوٹی چھوٹی کئی ریاستیں اور پورا بنگلا دیش) ہوتے۔ یہ دونوں اکائیاں مسلم اکثریت کی ہوتیں جب کہ وسیع وعریض باقی ہندوستان ہندو اکثریت کا ہوتا۔ ان تینوں یونٹوں کی خارجہ پالیسی، دفاع اور نقل وحمل مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوتے جبکہ دیگر سارے امور میں تینوں اکائیاں مالک ومختار ہوتیں۔ اس منصوبے کو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے تسلیم کر لیا تھا لیکن بعض بدقسمت حالات نے عمل در آمد کا آغاز ہونے سے پہلے ہی اسے دفن کر دیا۔

بنگال میں مسلم لیگ کے لیڈر سہروردی تھے اور محمد علی جناح ان کی آرزوؤں اور حوصلہ

منڈیوں سے پریشان تھے۔ وہ مجوزہ پاکستان سے الگ رہتے ہوئے بنگال اور آسام پر حکمرانی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران جناح کو پنڈت نہرو کے ایک بیان کی صورت میں ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ بمبئی میں پنڈت نہرو سے ایک پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں نے پوچھا کہ کیا یہ فارمولا مسئلہ کا مستقل حل ہے تو انھوں نے کہا کہ اسے آزما کے دیکھتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اس منصوبے کو مسترد کردینے کے مترادف تھا۔ جناح نے نہرو کے اس بیان کے بعد فیڈریشن کی تجویز جو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں قبول کرچکی تھیں، مسترد کردی۔ کانگریس نے بھی یہی کیا۔ فیڈریشن کی تجویز کو قبول کر کے جناح ایک طرح سے مطالبہٗ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے لیکن اس بدبختانہ بیان نے ان کو اپنے مطالبے پر شدومد سے اصرار کرنے کا موقعہ فراہم کردیا اور ایک بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

اب لارڈ ماونٹ بیٹن کو مارچ ۱۹۴۸ء تک کسی بھی طرح ہندوستان سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی ہدایت دے کر بھیجا گیا لیکن ماونٹ بیٹن، لیڈی ماونٹ بیٹن اور پنڈت نہرو کے پرخلوص تعلقات اور جناح کی جلد بازی نے یہ منزل آسان اور قریب تر کردی۔

ملک کی تقسیم روکنے کے لیے گاندھی جی نے آخری کوشش کے طور پر جناح کو یہ پیش کش کی کہ وہ مطالبہٗ پاکستان سے دستبردار ہو جائیں تو کانگریس انھیں ملک کا پہلا وزیر اعظم بنانے کے لیے تیار ہے لیکن پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے گاندھی جی کو یہ پیش کش واپس لینے پر مجبور کردیا۔ اگرچہ مسلم لیگ نے اس پیش کش پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تھا اور وہ مذبذب بھی تھی لیکن اس کے واپس لیے جانے کے بعد عام تاثر یہ پیدا ہو گیا کہ تقسیم ہندوستان کی قسمت بن گئی ہے۔

تقسیم ہند کے فیصلے سے مسلم لیگ اور ان صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی کیوں کہ ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں کا تعین صوبائی اکثریت کے بجائے علاقائی اکثریت کی بنا پر کیا جانا تھا۔

دونوں ملکوں کے پہلے گورنر جنرل کے طور پر لارڈ ماونٹ بیٹن کا نام آیا تو جناح نے کہا، ''پاکستان کے لوگ میرے احکام پر عمل کریں گے۔'' اپنے اس فیصلے سے جناح نے ایک طرح سے ماؤنٹ بیٹن کو خفیف کرنے کی کوشش کی تھی لیکن خود گورنر جنرل بن کر انھوں نے پاکستان کا نقصان کیا کیوں کہ علاقوں کی تقسیم کو حتمی شکل دینے والے ریڈکلف ماؤنٹ بیٹن کے زیر اثر تو ہو سکتے تھے، جناح کے ہرگز نہیں۔

تقسیم ہند کے سلسلے میں مندرجہ بالا بیانیہ میری یادداشت کے مطابق ہے اگر چہ ممکن ہے کہ بعد میں حاصل ہونے والی معلومات بھی اس میں شامل ہوگئی ہوں۔

محمد علی جناح

محمد علی جناح کے مسلم لیگ میں شامل ہونے اور اس کی قیادت سنبھالنے کے وقت مطالبۂ پاکستان پیش منظر میں نہیں تھا بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال رہا ہو تو بات دوسری ہے۔ اس سے پہلے لندن سے ایک صاحب جن کا نام شاید چودھری رحمت علی تھا چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بھیج کر مجوزہ پاکستان کے خدوخال روشن کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ان کا دعوا تھا کہ نظریۂ پاکستان کے خالق وہ ہیں۔ میں نے ان دنوں ان کا ایک پمفلٹ دیکھا تھا، شاید شبّو بھائی کے یہاں۔ اسے پڑھا بھی تھا لیکن میری انگریزی کی استعداد اتنی نہ تھی کہ اسے اچھی طرح سمجھ پاتا۔ جناح ان سے ملاقات کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوئے تھے۔ وہ اقبال کے منصوبے کو بھی فکر کی اڑان کہتے تھے۔

جناح فرقہ پرست تھے نہ سیاستداں۔ وہ ایک نہایت اعلیٰ درجے کے ضدّی اور خود پسند وکیل تھے۔ انھیں ایک بار کانگریسیوں نے بہت ذلیل کیا تھا جس کا وہ بدلہ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ میں پاکستان کا مقدمہ قائم کیا اور پھر خود ہی یہ مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے جیت کر بھی دکھا دیا۔ انھیں اس سے قطعاً دلچسپی نہ تھی کہ مقدمے کی کامیابی کی صورت میں اس وقت کے دس کروڑ مسلمانوں کو کن مسائل اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ تقسیم ہند کے نظام کے تحت انھوں نے جو علاقہ پاکستان کے لیے حاصل کیا ہے اس سے زیادہ علاقہ ویسے بھی مسلمانوں کا تھا۔ انھوں نے ان صوبوں کے مسلمانوں کو جہاں وہ اقلیت میں تھے یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ پاکستان ان کا اصل وطن (Homeland) ہوگا جب کہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ لیکن وہ بنیادی طور پر سیکولر تھے۔

بعد میں انھوں نے خلیق الزماں سے ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں کہا تھا۔

"I have written them off."

اقتدار کی منتقلی کے لیے ۱۴/ اور ۱۵/ اگست کی تاریخیں مقرر ہوئیں: ۱۴/ اگست پاکستان اور ۱۵/ اگست ہندوستان کے لیے۔ غالباً ۵/ اگست کو جناح پاکستان کے لیے بذریعہ

ہوائی جہاز روانہ ہوئے تو اخبار نویسوں کی ایک پوری ٹیم ان کے ساتھ تھی۔ اخبار نویسوں اور ان کے درمیان بات چیت اور سوالات اور جوابات کی رپورٹ کسی انگریزی اخبار (غالباً ڈان) کے صفحہ اوّل پر ساتویں اور آٹھویں کالم میں شائع ہوئی تھی۔ میں اس وقت نویں درجے میں تھا۔ اس رپورٹ کے دو تین سوال اور ان کے جوابات مجھے اب بھی یاد ہیں اور مکمل اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں چند الفاظ کا الٹ پھیر تو ممکن ہے لیکن نفسِ مضمون میں کسی قسم کی غلطی ناممکن۔ دو سوال اور ان کے جواب کچھ اس طرح تھے۔

Q : What sort of Country will Pakistan be?

A : Pakistan will he a democratic, secular Republic.

اور اس سوال کے جواب میں کہ

What will happen to the Hindus in Pakistan?

جناح نے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا:

The Hindus have nothing to fear in Pakistan, I am there to protect them. I am not the leader of the Muslims; I am the leader of the minorities.

کارل مارکس نے کیا خوب کہا ہے۔

"جہنم کا راستہ نیک ارادوں سے پٹا پڑا ہے۔"

مغربی پاکستان کے حصے میں جو صوبے آئے تھے ان میں سے بیشتر میں مسلم لیگ کا دبدبہ تھا لیکن شمالی مغربی صوبہ سرحد (N.W.F.P.) میں خان عبدالغفار خاں کی پارٹی چھائی ہوئی تھی اور اس کے ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ رائے شماری سے ہونا تھا۔ یہ صوبہ سیکڑوں میل دور ہونے کے سبب ہندوستان میں کسی طرح شامل نہ ہوسکتا تھا اور پاکستان میں شمولیت کی خان عبدالغفار خاں حمایت نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے رائے شماری کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ اس کے باوجود پاکستان میں شامل ہونے کی تجویز کے حق میں فیصلہ صرف چند ہزار ووٹوں سے ہوا تھا۔

تقسیم ہند کے لیے کانگریس کی رضامندی کے اعلان کے بعد خان عبدالغفار خاں نے ایک نہایت سخت بیان میں کہا تھا...:

"کانگریس نے ہمیں کتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔"

تقسیم ہند سے چند ماہ قبل جناح نے خان عبدالغفار خاں کو ہم خیال بنانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہی صورت جناح کو کشمیر میں بھی پیش آئی جہاں شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس نے ان کی سخت مخالفت کی۔ ویسے جناح کشمیر کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے، پاکستان کے ایک حصے کے طور پر نہیں۔

خان عبدالغفار خاں کو منانے میں جناح کی ناکامی پر کسی اردو اخبار نے ایک دلچسپ کارٹون چھاپا تھا۔ کارٹون میں خان عبدالغفار خاں ایک مکان کی چھت پر کھڑے تھے اور جناح مکان کے سامنے سے انھیں اپنے پاس بلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کارٹون کے نیچے فارسی کا یہ شعر لکھا تھا:

سرخ پوشے بہ لب بام نظر می آید
نہ بہ زوری، نہ بہ زاری، نہ بہ زری آید

(ایک سرخ پوش یعنی محبوب مکان کی چھت پر کھڑا ہے اور زور زبردستی، آنسو بہانے اور دولت کی لالچ دینے سے بھی نیچے نہیں آتا... لطف کی بات یہ ہے کہ خان صاحب کی پارٹی کے کارکنوں کی وردی سرخ تھی اور وہ سرخ پوش کہلاتے تھے۔)

ممکن ہے جناح ایک جمہوری اور سیکولر پاکستان چاہتے رہے ہوں لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ملک کی تقسیم جس مذہبی منافرت کی بنیاد پر ہوئی ہے اس میں نہ صرف یہ کہ پاکستان میں ان کے خوابوں کو خریدنے والا کوئی نہیں بلکہ اس نے ہندوستان کی حکومت کے سربراہوں کے، جن کی بڑی اکثریت نے ہر طرح کی فرقہ پرستی کے خلاف خاصی بے جگری سے جنگ کی تھی اور جو اس جنگ کو جاری رکھنا چاہتے تھے، ہاتھ باندھ دیے تھے۔ ان حالات میں مذہبی منافرت نے جنون کی شکل اختیار کر لی اور پاکستان دشمنی نے اس حد تک شدت کہ پاکستان کے پچاس کروڑ روپے اس کے حوالے کرنے کی وکالت کی قیمت گاندھی جی کو اپنی جان دے کر ادا کرنی پڑی۔ جناح کا تعزیتی پیغام ان کی شکست کا عکاس تھا۔ وہ جھنجھلائے ہوئے تھے کیوں کہ گاندھی جی کی شہادت جناح کے سارے مقدمات اور دلائل کا مسکت جواب تھی۔

جناح نے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کی افتتاحی تقریر میں یقیناً جمہوری اور سیکولر حکومت کا خاکہ پیش کیا تھا لیکن اگلی صبح کے اخباروں میں شائع ہوتے ہوتے اس میں سے بہت کچھ فضا میں تحلیل ہو چکا تھا اور ان کے دوسرے خطبہ پر جس میں پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دیا

گیا تھا، ان کے نام کی صرف مہر لگی تھی۔ ان کے تیار کردہ دستور کا حال تو اس سے بھی خراب ہوا۔ اس پر غور بھی نہیں کیا گیا۔

پاکستان کے حکمرانوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ جناح کی زندگی چراغ سحری سے زیادہ نہیں، اگرچہ پاکستان بننے سے پہلے انھیں اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ کانگریس کے رہنما بھی جناح کی بیماری کی شدت سے واقف نہ تھے ورنہ وہ شاید ڈیڑھ دو سال انتظار کر لیتے۔ ایک پاکستانی مورخ کے مطابق مسٹر جناح کے آخری دنوں میں ان کی جانب خاصی بے توجہی برتی گئی یہاں تک کہ انھیں اسپتال پہنچانے کے لیے جو ایمبولینس فراہم کی گئی وہ ایسی تھی کہ راستے میں ہی خراب ہو گئی۔

مسٹر جناح کی دق کی بیماری اور اس کی بگڑتی ہوئی حالت کا علم صرف انھیں، ان کے ڈاکٹر اور ان کی بہن مس فاطمہ جناح کو تھا اور اگر انھیں موت کے سایے تیزی سے اپنی طرف بڑھتے ہوئے نظر نہ آرہے ہوتے تو ممکن ہے کہ وہ مولانا حسرت موہانی کے الفاظ میں '' کٹا پھٹا پاکستان'' قبول نہ کرتے۔

جناح مسلم لیگ کے قائدین سے جو کبھی ان کے دست و بازو تھے اس قدر دل برداشتہ تھے کہ کہا جاتا ہے انھوں نے بسترِ مرگ پر نیم بے ہوشی کے عالم کہا تھا۔

I will go to Delhi and apologise Nehru.

ممکن ہے یہ بات قصہ کہانی ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جناح کی موت سے پاکستان کے ایک سیکولر اور جمہوری ملک بننے کے سارے امکانات معدوم ہو گئے۔

لیکن جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس کے ذمّے دار جناح بھی کچھ کم نہ تھے۔ انھوں نے ہوا میں بوئی تھیں اور نتیجتاً آندھیوں کی فصل کاٹی اور یہ سب بڑی حد تک ان کی ضدی طبیعت کا نتیجہ تھا۔ تاہم اس زبردست انسانی المیے کے وہ واحد ولین (Villain) نہ تھے، بلکہ اس ذہنیت کے دوسرے لوگ بھی برابر کے ذمّے دار تھے جنھوں نے سیکولرازم کا چولہ پہن کر ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو '' ایک ہزار سال کی غلامی'' کے بعد حاصل ہونے والی آزادی قرار دیا تھا۔

جناح ایک ماڈرن انسان تھے، نام کے مسلمان۔ ان کا تعلق بھی گاندھی جی کی طرح کاٹھیاواڑ سے تھا۔ دونوں کے خاندان تجارت سے وابستہ تھے۔ (نسلی واڈیا جناح کا نواسہ ہے، ان کی بیٹی ڈینا جناح کا بیٹا) انھوں نے اپنی بیٹی کو ممبئی کے مالابار ہلس کے اپنے وسیع وعریض

مکان سے محروم رکھا۔ وہ ان سے ناراض تھے۔

جناح کا نماز روزہ سے کچھ علاقہ نہ تھا لیکن انھوں نے اپنی سیاست کو مضبوطی بخشنے کے لیے عید، بقر عید کی نماز پڑھنا اور جمعہ کی نماز کے لیے کبھی کبھی مسجد جانا شروع کر دیا تھا، اگر چہ یہ نمازیں خدا کی نہیں سیاست کی تھیں۔ عید کی نماز کے سلسلے میں ان سے ایک لطیفہ منسوب ہے جو اُن کے مزاج اور رہن سہن سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ غلط ہونے کی صورت میں بھی صحیح مان لیا جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ لیاقت علی خاں کے ساتھ ممبئی میں عید کی نماز پڑھنے گئے۔ خطبہ میں کہا گیا تھا کہ اپنے اللہ کا حکم مانو، رسول کا حکم مانو اور پھر قائد کا حکم مانو۔ جناح نے لیاقت علی خاں سے آہستہ سے پوچھا:

Well Liaqat, Allah that is God, Qaid that is I, who is this third gentleman?

(لیاقت God تو ہوا اللہ اور قائد جو میں ہوں، یہ تیسرے صاحب کون ہیں؟)

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ یا لطیفہ اورئی میں ایک صاحب نے جو ریش دراز تھے مجھے جناح کی تعریف وتوصیف کے طور پر سنایا تھا۔

جناح ایک متنازعہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی مداحی اور نکتہ چینی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ماضی قریب میں لال کرشن ایڈوانی نے انھیں سیکولر قرار دیا اور ان کی بے حد تعریف کی اور انجام کار آر۔ ایس۔ ایس کے عتاب کے شکار ہوئے اور اپریل ۲۰۰۹ء کی انتخابی مہم کے دوران ان کے مخالفین نے اس سلسلے میں ان پر خوب خوب حملے کیے۔ پھر اگست ۲۰۰۹ء میں جسونت سنگھ نے جو اٹل بہاری واجپئی حکومت میں وزیر خارجہ تھے جناح پر ایک کتاب لکھ کر انھیں عظیم انسان (Great Person) قرار دیا تو ان کی پارٹی، یعنی بھارتیہ جنتا پارٹی، نے انھیں اپنے خیمے ہی سے باہر کر دیا۔ لطف یہ ہے کہ وہ کانگریس کی نکتہ چینی کا نشانہ بھی بنے کیوں کہ نہرو اور پٹیل کانگریس کے لیڈر تھے لیکن اسے کیا کہیے کہ پٹیل پر بھارتیہ جنتا پارٹی اپنا حق زیادہ سمجھتی ہے اور ان کی وراثت پر اپنا دعوا مستحکم کرنے کے لیے حکومت گجرات نے جسونت سنگھ کی کتاب پر پابندی لگا دی۔ یہ بات دوسری ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے جسونت سنگھ کو پارٹی میں دوبارہ لے لیا۔

ہندوستانیوں کے ذہن میں جناح تقسیم ہند کی علامت بن گئے ہیں لیکن کسی برصغیر کی

تباہی یا کامرانی کسی فرد واحد کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ تقسیم ہند کے المیہ کی ذمے دار کانگریس بھی تھی جس کے بعض فیصلوں نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی جھولی میں ڈال دیا۔ آزادی سے قبل صوبۂ بمبئی میں کانگریس کے صدر نریمان تھے اور وہی ریاست کے سب سے بڑے کانگریسی لیڈر بھی لیکن جب ۱۹۴۶ء کے شروع میں کسی کانگریسی کے وزیر اعلیٰ بننے کی نوبت آئی تو کسی کھنڈیلکر یا ایسے ہی نام کے کسی دوسرے کانگریسی کو وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ یہی بہار میں ہوا۔ ریاست میں کانگریس کے سب سے بڑے قائد ڈاکٹر سید محمود تھے لیکن راجندر پرساد نے وزیر اعلیٰ بنایا شری کرشن سنہا کو۔ ان دو فیصلوں سے اقلیتوں تک پیغام یہ گیا کہ اقتدار ان کا مقدر نہیں، وہ بس پارٹی کے بڑے لیڈر ہو سکتے ہیں۔

ایسا ہی کچھ ۱۹۳۷ء میں یوپی میں بھی ہوا۔ یوپی کانگریس کا قلعہ تھا اور مسلم لیگ کا بھی۔ انتخابات کے بعد خلیق الزماں اور نواب اسماعیل کو مسلمانوں کے نمائندوں کے طور پر حکومت میں شامل نہ کر کے کانگریس نے ایک بڑی غلطی کی تھی۔ خلیق الزماں برسوں ہندو اکثریت کی لکھنؤ میونسپل کمیٹی کے چیرمین رہے تھے۔ وہ پنڈت خلیق الزماں کہلاتے تھے۔ امین آباد کے ہنومان مندر کا سنگ بنیاد انھی نے رکھا تھا اور خود کھڑے ہو کر اس کی تعمیر کرائی تھی۔ بیس پچیس سال قبل تک یہ سنگ بنیاد مَیں نے خود دیکھا تھا۔ اب شاید نو تعمیر عمارت کی دیوار میں چھپ گیا ہے یا چھپا دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسلمان اس مندر کی تعمیر کے خلاف تھے۔ اس سب کے باوجود خلیق الزماں شہری مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ تھے اور نواب اسماعیل دیہی مسلم آبادی کے۔ یہ دونوں مل کر کانگریس سے مفاہمت کی راہیں استوار کر سکتے تھے لیکن ان میں کوئی بھی اکیلے چنے کی طرح بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا تھا۔ افسوس یہ نادر موقع کھو دیا گیا۔

اس سے قبل وہ بدقسمت واقعہ ہوا جس نے جناح کو، جنھیں خود گاندھی جی نے ''سب سے بڑا قوم پرست'' گردانا تھا، اپنے زخم چاٹنے اور مناسب وقت کا انتظار کرنے کے لیے لندن منتقل ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

مسٹر گاندھی

مسٹر جناح ''مہاتما'' اور ''مولانا'' قسم کے الفاظ استعمال نہ کرتے۔ ان کے لیے ''مسٹر'' کافی تھا۔ اسی ''مسٹر'' نے ایک بار غضب ڈھایا۔ کانگریس کے ایک اجلاس میں انھوں

نے گاندھی جی کو "مسٹر" کہہ کر خطاب کیا تو مندوبین نے آسمان سر پر اٹھالیا اور جناح تقریر نہ کرسکے۔ جناح کو زیادہ تکلیف اس بات سے ہوئی کہ مندوبین کو خاموش کرانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ اس واقعہ سے جناح، جنھیں قائداعظم کا خطاب خود گاندھی جی نے دیا تھا ہندوستان کی سیاست سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی ناکامی کے بعد ایک طرح سے لندن ہی میں آباد ہوگئے۔ ہندو مسلم مفاہمت کے منظرنامے میں ان کی عدم موجودگی نے دونوں فرقوں کے درمیان نفرت اور عداوت کے بیج بونے والوں اور برطانوی حکمرانوں کو "لڑاؤ اور حکومت کرو" پر عمل کرنے کے لیے خالی میدان فراہم کردیا۔

حالات سازگار ہونے پر جناح لندن سے واپس آئے، مسلم لیگ میں شرکت کی اور اس کے قائد بن گئے۔ انھیں پڑھے لکھے، اونچے طبقے کے مسلمانوں اور خاص طور سے نوجوانوں میں مقبولیت حاصل کرنے میں دیر نہ لگی۔

اس مقبولیت کے متعدد اسباب رہے ہوں گے۔ لیکن اب تک جن اسباب سے بحث کی گئی ہے وہ عام طور سے خارجی ہیں اور ردِّعمل کا نتیجہ؛ کچھ مثبت عناصر اور اسباب (Factors) بھی رہے ہوں گے۔ فی الوقت ان میں سے ایک سبب پر غور کرنا شاید مناسب ہو۔

جنگ عظیم کے بعد دنیا میں تبدیلی کا عمل جو روس میں کمیونسٹ انقلاب، چھے سو سالہ مملکت عثمانیہ (۱۹۲۲-۱۲۹۹) کے زوال اور اس کے باقیات پر مصطفیٰ کمال اتاترک کے ہاتھوں جمہوریہ ترکی کے قیام کے ساتھ شروع ہوا، تیز تر ہوگیا تھا۔ ہندوستان کی سیاست اور زندگی میں قدامت اور جدیدیت کے درمیان جنگ جاری تھی۔ آزادیٔ ہند سے پندرہ بیس سال پہلے اپنی فکر اور عمل سے نوجوانوں کے لیے صرف دو افراد... پنڈت نہرو اور جناح... مرکز کشش تھے... دونوں وکیل تھے، دونوں پر مغرب کے جدید افکار کا زبردست اثر تھا، دونوں کو انگریزی پر زبردست قدرت حاصل تھی، مذہب کی جانب دونوں کا رویہ متشکک کا تھا۔ اس وقت یہ وہ باتیں تھیں جو نوجوانوں کے خواب و خیال پر چھائی ہوئی تھیں۔ چنانچہ کانگریس اور مسلم لیگ میں نوجوانوں کے قائداعظم یہی دو تھے۔

مسلمان مولویوں کے زیر اثر تو اکثر و بیشتر رہا اور اب بھی ہے لیکن ادب میں، شاعری میں ہیرو وہ تھے جو مولویوں کے لیے ولین (Villain) یا وسیع تر مفہوم میں اینٹی ہیرو (Anti-hero) تھے۔ حافظ کی شاعری سے لے کر فیض احمد فیض تک کے کلام پر نظر ڈالیے، شیخ، واعظ، مولوی،

محتسب کہیں بھی ہیرو نظر نہ آئیں گے۔ ایک ایسے دور میں جب مسلم نوجوان مغرب کی طرف دیکھ رہا تھا، کانگریس نے مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے مولویوں کا سہارا لیا اور علامہ شبیر احمد عثانی کے علاوہ سارے بڑے مولوی کانگریس کے ساتھ ہو گئے۔ برخلاف اس کے مسلم لیگ قیادت... جناح، لیاقت علی، عبدالرحیم نشتر، سہروردی، خلیق الزماں اور نواب اسماعیل وغیرہ پر مشتمل تھی جو کم سے کم اپنی شکل وصورت سے مسلمان نوجوانوں کو اپنی طرف ملتفت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جب کہ کانگریس میں پنڈت نہرو اور ان کے کمیونسٹ وسوشلسٹ حامیوں کے علاوہ، پارٹی کی مجموعی قیادت مذہبی اصطلاحات، مثلاً ''گئورکشا''، ''شواجی مسلک'' اور ''رام راج'' کے گرداگرد گھوم رہی تھی۔

مولانا آزاد عربی، فارسی اور اردو کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کا کوئی جواب مسلم لیگ کے پاس نہ تھا لیکن ان کا مولویانہ اور محتسبانہ انداز مسلم نوجوانوں کے لیے کوئی کشش نہ رکھتا تھا۔

مسلمانوں اور خاص طور سے مسلمان نوجوانوں میں جناح کی مقبولیت کا میرے خیال میں اصل سبب یہ تھا۔

پاکستان اور اس وقت کی سیاست پر درجنوں کتابیں لکھی گئیں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ مسلمانوں اور مسلم نوجوانوں میں جناح اور مسلم لیگ کی مقبولیت کے اسباب کا کوئی مطالعہ ہوا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں نہیں ہوا۔ سیاسی واقعات کی کڑیاں جوڑنے کے مقابلے میں اس طرح کے گہرے مطالعوں کی اب بھی ضرورت ہے کیوں کہ دنیا ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور نہ بدقسمتی سے ہندو۔ مسلم تفریق۔

مابعد تقسیم

ہندوستان کی تقسیم سے قبل ہی زبردست فسادات پھوٹ پڑے تھے اور ہندوستان کے دوسروں میں مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق جانے والے لٹے پٹے قافلے جب ایک دوسرے کے پاس سے گذرے تو وہ اس قابل بھی نہیں رہ گئے تھے کہ ہاتھ پھینک پھینک کر ایک دوسرے کو برا بھلا ہی کہہ سکیں۔ چنانچہ اپنا خوں بہا وصول کرنے کا کام انھوں نے اپنی ہم مذہب اکثریت کے لیے چھوڑ دیا جس میں اپنے اپنے علاقوں کی اقلیتوں کے خون سے اپنی آستینیں تر کرنے کی سکت اور حوصلہ باقی تھا۔

اورئی میں تالاب کے کنارے اور ہر اس جگہ جہاں ایسی بیس پچیس مربع فٹ زمین خالی پڑی تھی جس کا پرسانِ حال کوئی نہ تھا سیکڑوں جھگیاں اُگ آئی تھیں۔ اس وقت تک بہت سے بچوں اور کم سن لوگوں نے "سکھ" لفظ بھی نہ سنا تھا لیکن اب انھیں دیکھ بھی لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ غریب الوطنی، ستم رسیدگی اور اپنی جڑوں سے اکھڑے ہوئے شاداب اور تناور درختوں کے لیے نئی جڑیں تلاش کرنا اور سانسوں کی آمد وشد قائم رکھنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

مقامی آبادی کے لیے لفظ رفیوجی (Refugee) اس وقت اجنبی تھا لیکن یہ لفظ چند ہی دنوں میں سکۂ رائج الوقت بن گیا۔ تاہم مرحبا صد مرحبا، حوصلہ در حوصلہ، بمشکل پندرہ برس میں نہ صرف یہ لفظ چلن سے غائب ہو گیا بلکہ خود وہ جو اس نام سے پکارے جاتے تھے، اسے بھولنے لگے... اس کے برخلاف ایک دوسرے خطۂ ارض پر، جو کچھ ایسا دور بھی نہیں، ان کے ہمزاد آج تک خود کو پناہ گزیں نہیں، مہاجر کہہ کے اس لفظ کو بے حرمت کرتے ہوئے لندن، نیویارک اور مغرب کے دوسرے شہروں میں دونوں ہاتھوں سے دولت بٹور رہے ہیں۔

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا، ہماری ہجرت کیا (افتخار عارف)

ایک بار مَیں لکھنؤ میں چند ہفتے گزار کر اورئی پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس مکان کے کرایے دار جس میں کبھی ہم لوگ رہتے تھے، تبادلہ کے سبب مکان چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور انھوں نے چابی اور کرایہ شہر کے کوتوال (یا جو بھی رہے ہوں) کو دے دیا ہے۔ مجھے اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ کرایہ دار محکمۂ پولیس سے متعلق ہیں۔ کوتوال صاحب سکھ تھے (ممکن ہے یہ صاحب وہی رہے ہوں جن کا ذکر ایک بار ابا نے رنجیت کے نام سے کیا تھا)۔ حالات نے اس عنصر کو خطرے کی گھنٹی بنا دیا تھا۔ مجھے شہر کے مسلمانوں نے بتایا کہ کوتوال صاحب مکان اپنے کسی رشتے دار کے لیے جو پاکستان سے جان بچا کر آئے ہیں، چاہتے ہیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو سمجھو مکان ہمیشہ کے لیے تمھارے ہاتھ سے گیا۔ میرا خیال ہے کہ کم سے کم میرے بیس پچیس "خیر خواہوں" نے یہ بات طرح طرح سے مجھے سمجھائی ہوگی۔ ان لوگوں نے بہانے بھی بتائے تھے جن میں سب سے زیادہ قابل قبول یہ تھا کہ میری والدہ اورئی ہی میں رہنا چاہتی ہیں اور وہ جلد ہی آ جائیں گی۔ مجھے یہ بہانہ اچھا لگا۔ چنانچہ میں نے یہی بات کوتوال صاحب کے سامنے دہرا دی۔ انھوں نے میری

بات توجہ سے سنی، اندر گئے اور چابی اور کرایے کی رقم لاکر میرے حوالے کر دی لیکن ساتھ یہ ضرور کہا کہ مکان جب بھی کرایے پر اٹھانے کا ارادہ ہو پہلے مجھے بتانا۔

تالاب کا وہ سرا جہاں پناہ گزینوں نے جھگیاں جھونپڑیاں ڈال رکھی تھیں، میری قیام گاہ سے بمشکل دو ڈھائی سو قدم رہا ہوگا۔ چنانچہ کالج جانے کے علاوہ بھی ادھر سے گذر ہوتا۔ جب بھی ان ستم رسیدہ لوگوں اور ان کی جھگی جھونپڑیوں کو دیکھتا دل دکھتا۔ اس کا ایک سبب ممکن ہے یہ رہا ہو کہ خود میں تھوڑے عرصے قبل ہی گھنے پیڑ کے سایے سے محروم ہوا تھا۔

ایک سردار جی برابر آتے اور اپنی پریشانی بتاتے لیکن میں وہی بہانہ کر دیتا جو کوتوال صاحب سے کیا تھا، اگر چہ وہ سردار جی مجھے اچھے لگتے۔ ان کی پپتا سن کر میرا دل بھر آتا۔ ایک آدھ بار تو میرا دل چاہا کہ ان سے ''ہاں'' کہہ دوں لیکن ایک مشکل یہ بھی تھی کہ پہلا حق کوتوال صاحب کا تھا جنھوں نے بے انتہا شرافت کا مظاہرہ کیا تھا۔

لیکن اپنے دل کا چور بھی بتانا ضروری ہے۔ میں بھی چاہتا تھا کہ کوئی شریف مسلمان کرایہ دار مل جائے۔ میں سمجھتا تھا یا مجھے سمجھا دیا گیا تھا کہ ان حالات میں کرایے دار مسلمان ہو تو مکان محفوظ رہے گا لیکن مسلمان کرایے دار کہاں سے ملتا، وہ تو خود اپنے گھر اَونے پَونے بیچ کر پاکستان بھاگ رہے تھے۔

جاڑوں کے دن تھے اور دو تین دن کی بوندا باندی کے بعد گھنے سیاہ بادل گھر آئے اور رُک رُک کر بارش ہونے لگی۔ اسی وقت کسی نے زنجیر کھٹکھٹائی اور میں جب تک زینہ، صحن اور ڈیوڑھی پار کر کے دروازے تک پہنچوں زنجیر ایک بار اور کھٹکھٹائی گئی... میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک سردار جی کھڑے تھے۔ میں نے لالٹین اوپر کی تو فوراً پہچان لیا، وہی سردار جی تھے جو اکثر آیا کرتے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا، چادر اور پھر ٹاٹ کچھ اس طرح اوڑھے ہوئے کہ اسے پہچاننا مشکل تھا۔ میں نے اسے دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ سردار جی نے بے حد ملتجیانہ انداز میں مکان کے لیے کہا تو میں نے وہی پرانا جھوٹ دہرا دیا... والدہ اور بھائی بہن مستقل قیام کے لیے آنے والے ہیں۔

میرا جواب سننے کے بعد سردار جی نے اس ''شخص'' کے چہرے پر سے ٹاٹ اُلٹ دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے اس کی پیشانی پر رکھ دیا... وہ ایک چودہ پندرہ سال کی نہایت خوبصورت لڑکی تھی جو بخار سے تپ رہی تھی۔

سردار جی نے کہا، ''جھونپڑی چو رہی ہے، زمین بھی گیلی ہوگئی ہے۔ پُتر تم اسے اپنے ساتھ رکھ لو، وہاں رہی تو مرجائے گی۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور انھیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے اندر چلا گیا اور مکان کی چابی لا کر سردار جی کے حوالے کردی۔

''پتر، کرایہ؟''

''بعد میں دیکھا جائے گا'' میں نے کہا اور انھیں مشورہ دیا کہ جو بھی کپڑے بھیگنے سے رہ گئے ہوں انھیں لے کر اسی وقت مکان میں منتقل ہوجایئے۔''

آج بھی وہ مکان انھی لوگوں کے پاس ہے۔ پہلے وہ اس میں کرایے دار تھے، اب اس کے مالک ہیں، اب ان سردار جی کے ورثا لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ ایک بار مجھ سے سردار جی نے خود کہا تھا کہ ان کی ساری ترقی اسی مکان کی وجہ سے ہوئی ہے۔ بہتوں کا یہ خیال تھا کہ اس مکان کا دفینہ ان کے ہاتھوں لگ گیا۔ جب تک وہ اس مکان میں کرایے دار رہے اور پھر جب انھوں نے یہ مکان خرید لیا میرا جب بھی جانا ہوتا وہ مجھے ''مالک مکان'' ہی کہتے۔

حساب گڑبڑ ہے

ہائی اسکول کے ششماہی امتحان کے حساب کے پرچے میں مجھے پچاس میں دو نمبر ملے تو پرنسپل صاحب نے جن کا نام چندر ما پرشاد کھرے تھا، بلا کر کہا کہ ہم تمھارا نام امتحان کے لیے نہیں بھیجیں گے۔ ان کی دھمکی سن کر میں گھبرا گیا اور میں نے کہا کہ میرے پاس تو حساب کی کتاب بھی نہیں۔ پچھلے سال تھی لیکن جانے کیا ہوئی۔ اب خرید لوں گا۔ آپ امتحان سے مہینہ بھر پہلے میرا ٹیسٹ لے لیں، پاس نہ کرسکوں تو نام نہ بھیجیں۔

کھرے بابو نے جو ابا سے خوب اچھی طرح واقف تھے میری بات مان لی اور میں نے اگلے دن رستوگی صاحب کی تیار کی ہوئی کتاب جو پیپر بیک میں نارنجی رنگ کی تھی خرید لی۔ اس کی قیمت پانچ روپے تھی۔ میں نے بالکل شروع سے سوال حل کرنے شروع کیے تو دو سوا دو مہینے میں ایک ایک سوال دو دو بار حل کر ڈالا۔ مشکل سوال حل کرنے میں اپنے کلاس فیلو مرلی سے مدد لی۔

اسی دوران کلاس میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ گرو جی نے جو ہوم ورک دیا تھا اس میں سے ایک سوال کوئی لڑکا حل نہ کرسکا تھا۔ میں نے کوشش بھی نہ کی تھی کیونکہ میں رستوگی کی کتاب

میں لگا ہوا تھا۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ پہلے حساب کا ہوم ورک اس لیے نہ کرتا کہ آتا نہیں تھا اور اب اس لیے نہ کرتا کہ سب تو آتا ہے۔

سوال ذرا مشکل تھا اور گرو جی نے بلیک بورڈ پر حل کرنے کے بعد اسے مٹایا نہ تھا بلکہ بلیک بورڈ پلٹ دیا تھا تا کہ ایک آدھ سطر نقل کرنے سے رہ گئی ہو تو طالب علم اسے بعد میں نقل کر لیں۔ اتنے میں ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں چوتھی صف میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ وہ غصے سے میری طرف بڑھے اور بولے۔ ''نہ تم گھر سے کام کر کے لاتے ہو نہ کلاس میں پڑھنے میں دل لگاتے ہو۔ یہ سوال کوئی حل نہ کر پایا۔ تم اسے بھی نقل نہیں کر رہے ہو۔''

سوال کا حل کرنے کا طریقہ مجھے معلوم تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں اسے آسانی سے حل کر سکتا ہوں لیکن میں نے جو جواب دیا اس میں تھوڑی سی شوخی اور بہت سی بدتمیزی شامل تھی۔

میں نے کہا، ''آپ نے سوال بورڈ کے ایک طرف حل کیا اور اب اسے دوسری طرف مکمل کر رہے ہیں۔ میں اسے ایک ہی طرف میں حل کر دوں گا۔''

اب سوچتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے ایسی بے وقوفی کی بات کیسے کہی۔

میرا جواب سن کر گرو جی، جن کا نام شاید بنکم داس تھا، غصہ سے کانپنے لگے۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچتے ہوئے بلیک بورڈ تک لے گئے اور ایک اسٹیپ جو انھوں نے کیا تھا ڈسٹر سے مٹا دیا، چاک میرے ہاتھ میں تھمائی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بلیک بورڈ کی طرف مجھے دھیرے سے ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

''میں بھی دیکھوں تم کیا کرتے ہو۔''

غصے کے مارے ان کا گہرا گندمی رنگ سیاہ ہو گیا تھا اور میرا یہ عالم تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔

میں نے بورڈ پر ایک نظر ڈالی اور پھر میز کی طرف دیکھنے لگا جہاں کتاب رکھی تھی۔ گرو جی نے کتاب مجھے دے دی۔ میں نے سوال دوبارہ پڑھا اور بلیک بورڈ پر پہلا اسٹیپ لکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلا اسٹیپ لکھتے وقت مجھے پنجوں کے بل کھڑا ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد میں نے کلاس کی طرف پلٹ کے دیکھا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گرو جی بھی میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن ان کی صورت سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ میرا یہ اسٹیپ مجھے جواب تک پہنچائے گا یا نہیں۔

میں نے سوال پھر پڑھا، دوسرا اسٹیپ لکھا اور پھر رکے بغیر تیسرا۔

میں نے پھر ایک بار کلاس کی طرف دیکھا جو اَب بھی سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ گرو جی پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ وہ حیرت سے بورڈ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھ رہا ہے۔ میں نے سوال پھر پڑھا، ایک اسٹیپ لکھا، کتاب دوبارہ دیکھی اور اگلے دو تین اسٹیپ میں جواب نکال دیا۔ گرو جی آگے بڑھے اور انھوں نے مجھے سینے سے چمٹا لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے سینے سے چمٹائے چمٹائے انھوں نے آنسو پونچھے اور لڑکوں سے کہا کہ میں سوال جس طرح حل کر رہا تھا اسے کاٹ دو اور یہ حل نوٹ کر لو۔ سوال کو حل کرنے کا پہلا طریقہ لمبا ہے۔

جیسے ہی گرو جی کی گرفت ڈھیلی ہوئی میں نے جھک کر ان کے پیر چھوئے، انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور مجھے حساب آ گیا۔

اس واقعے سے پورے کالج میں میری شہرت ہو گئی اور میرا نام مرلی کے ساتھ لیا جانے لگا۔ اسے حساب میں سَو میں سَو نمبر ملتے تھے۔ اسی دن گرو جی نے مجھ سے کہا کہ کوئی سوال سمجھ میں نہ آئے تو میرے گھر آ جایا کرو۔ میں اپنی مشکل حل کرنے کبھی کبھی ان کے یہاں چلا جایا کرتا۔ ان کی بیوی دبلی پتلی تھیں لیکن ان کے بال بہت لمبے تھے۔ وہ سر پر ہمیشہ آنچل ڈالے رہتیں۔ ان کا چھ سات سال کا بیٹا گول مٹول تھا۔ جب بھی گرو جی کے یہاں جاتا وہ چھینکے پر سے ہانڈی اتار کے اس میں سے ایک رس گلا مجھے ضرور کھلاتے۔

معلوم نہیں اب ایسے گرو جی ہوتے ہیں یا نہیں۔

حساب کے درجے کے اس واقعے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ پرنسپل صاحب نے ہائی اسکول کے امتحان کے لیے فارم بھیجتے وقت میرا امتحان نہیں لیا۔

گرو جی کو میں نے ہمیشہ کرتے پاجامے اور چپل میں دیکھا۔ بعد میں، بلکہ برسوں بعد، جب میں نیشنل ہیرالڈ میں تھا گوڑ صاحب کو دیکھ کر کبھی کبھی گرو جی یاد آ جاتے، بس اس فرق کے ساتھ کہ گوڑ صاحب کا قد ذرا سا کم تھا اور گرو جی سگریٹ نہیں پیتے تھے۔

ٹپک!

دسویں درجے کے معیار سے میری انگریزی کچھ خاص اچھی تھی، نہ بہت زیادہ خراب،

لیکن گرامر بالکل نہ آتی تھی۔ اب بھی نہیں آتی۔ ایک دن انگریزی کے استاد مسرا جی نے کہا کہ آج گرامر پڑھاؤں گا اور لینے لگے وہ پڑھائے ہوئے کا امتحان۔ میں تیسری یا چوتھی قطار میں تھا۔ جیسے ہی مسرا جی نے سوال پوچھنا شروع کیے میں نے گردن جھکا لی کیوں کہ اکثر یہ ہوتا کہ ان کی نظر جس لڑکے پر پڑ جاتی اس سے سوال پوچھنا شروع کر دیتے۔ اپنی ترکیب کے سبب تھوڑی دیر تو بچا رہا لیکن پھر ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور انھوں نے ایک جملے کی پارزنگ کے لیے مجھ سے کہا۔ مجھے پارزنگ بالکل نہیں آتی تھی لیکن پاس میں بیٹھے ہوئے ایک لڑکے نے میری مدد کی اور ابتدائی مراحل آسانی سے طے ہو گئے۔ مگر کیس (Case) میں وہ بھی الجھ گیا۔ اس نے دھیرے سے کہا کہہ دے Hopeless Case۔ میں نے یہی کہہ دیا۔ مسرا جی مسکرائے اور بولے "Governed by Singer machine"۔

سب لڑکے ہنس دیے۔ مجھے بہت شرم آئی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ سنگر مشین سے اس کا کیا تعلق تھا۔ اب خیال ہوتا ہے کہ یہ مذاق اڑانے کا ایک طریقہ تھا۔

کسی اور دن ایک اور دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر انگلی اٹھائی اور کہا۔

"Can I go?"

مسرا جی نے کہا، "You may, if you can"

وہ لڑکا تو خیر چلا گیا لیکن انھوں نے Can اور May کا فرق اس طرح سمجھا دیا کہ اب تک اس میں گڑبڑ نہیں ہوتی۔

مسرا جی کی ایک عادت بہت دلچسپ تھی۔ وہ کسی سے کچھ پوچھتے اور وہ جواب دینے کے بجائے منہ اٹھا کر چھت دیکھنے لگتا تو وہ پانچوں انگلیوں سے ایک پیالہ سا بنا کر ہاتھ اوپر کرتے اور کہتے، ''ٹپک''۔

ہم لوگ انٹرول میں اس ''ٹپک'' کی نقل کرنے کے ساتھ ساتھ آواز بھی ان کی ایسی ہی بنانے کی کوشش کرتے۔ اب بھی بنا سکتا ہوں۔

امتحان قریب آئے تو معلوم ہوا کہ اورئی میں طاعون نے وبائی شکل اختیار کر لی ہے اس لیے امتحانات کالپی میں ہوں گے۔ میں بیت بازی کے سلسلے میں کالپی جا چکا تھا لیکن صرف چند گھنٹوں کے لیے۔ اس بار وہاں دس بارہ دن کے قیام کا انتظام کرنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کمرہ تلاش کرنے میں خاصی دقت ہو گی اس لیے تین چار دن قبل وہاں پہنچ گیا لیکن لیکن کام پہلی کوشش

میں بن گیا اور کمرہ اس اسکول کے بالکل سامنے مل گیا جو امتحان کا مرکز قرار دیا گیا تھا۔ کالج کے سامنے ایک بڑا سا میدان تھا جس میں لڑکے فٹ بال کھیلتے اور دس بارہ گز کے فاصلے پر کمرہ جس کی ایک کھڑکی کالج کی طرف کھلتی تھی۔

میں امتحان کی رات میں کورس دہرانے کا قائل نہ تھا اور جلد سو جاتا۔ یہی اس دن بھی کیا، لیکن جانے کیسے رات میں آنکھ کھل گئی اور بہت دیر تک نیند نہیں آئی، اگرچہ وہ عمر ہاتھی گھوڑے بیچ کے سونے کی تھی۔ اگلے دن حساب کا پرچہ تھا۔ شاید آنکھ اسی گھبراہٹ میں کھل گئی ہو۔ پھر نہ جانے کب نیند آ گئی اور آنکھ کھلی تو سورج کی کرنیں کھڑکی سے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا تو کالج کے سامنے کے کمرے میں لڑکے امتحان دے رہے تھے۔ جھٹ پٹ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، قلم پنسل اور ربر لیا، یاد نہیں کہ کپڑے تبدیل کیے یا نہیں اور کالج کی طرف بھاگا۔ ان دنوں قاعدہ یہ تھا کہ امتحان شروع ہونے کے آدھ گھنٹے بعد کسی طالب علم کو امتحان کے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ ایک ٹیچر نے میری طرف حیرت سے دیکھا، گھڑی پر نظر ڈالی اور مجھ سے اپنی سیٹ پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میری سانسیں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اگر آٹھ دس منٹ کی اور تاخیر ہو جاتی تو ایک سال کا نقصان ہو جاتا۔ اتنے میں ٹیچر نے کاپی اور امتحان کا پرچہ سامنے رکھ دیا لیکن مَیں آنکھیں بند کیے خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔ حواس قابو میں آئے تو میں نے پرچے پر نظر ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ پورے پچاس نمبروں کے سوال حل کر سکتا ہوں لیکن اب اتنے سوال حل کرنے کا وقت نہیں رہ گیا تھا چنانچہ میں نے اسی فی صدی نمبر کے سوالوں پر نشان لگا لیے اور سوچا کہ امتیازی نمبر تو مل ہی جائیں گے۔

جوابات سارے ہی طلبہ اپنے اپنے پرچوں پر لکھ لیتے تھے تاکہ بعد میں دوسروں کے جوابوں سے انھیں ملا سکیں۔ میرے پاس دس منٹ اب بھی باقی تھے اور اس سوال کا، جو چھوٹے چھوٹے حصّوں پر مشتمل تھا، ایک اور حصّہ حل کر سکتا تھا لیکن میں نے ان سوالات پر جو حل کر چکا تھا نظر ثانی کرنا زیادہ بہتر سمجھا۔ میرے خیال میں سارے ہی جواب درست تھے۔

کاپیاں دے کر ہم لوگ باہر نکلے تو سارے ہی طلبہ اپنے جواب مرلی کے اور میرے جوابوں سے ملانے ٹوٹ پڑے۔ یہاں ایک نہیں دو کھلیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک اور طالب علم حساب میں بہت اچھا تھا لیکن اس کا نام نہیں یاد آ رہا ہے اگرچہ خیال ہوتا ہے کہ وہ کالج کے ان ملازم کا بیٹا تھا جو گھنٹہ بجاتے تھے۔ اس لڑکے کا نام میرٹ لسٹ میں بھی تھا۔ اب اس کا نام بالکل بھول چکا

ہوں اور دوسرا یہ کہ جیومیٹری اور الجبرا کے پرچے کے بارے میں کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ جیومیٹری کی وہ تھورم تو یاد آ رہی ہے جس میں ثابت یہ کرنا ہوتا تھا کہ All angles of a triangle are equal to two right angles اور الجبرا کے بارے میں وہ مذاق بھی کہ گانٹھ میں پیسہ ایک نہ ہو پھر بھی رقم ادا کی جاسکتی ہے لیکن امتحان میں ان کا ہوا کیا اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔

میں نے اور مرلی نے جو پانچ سوال کیے تھے ان میں سے تین مشترک تھے۔ دو سوالوں کے جواب تو دونوں کے ایک تھے لیکن تیسرے میں خاصا فرق تھا۔ ہم اپنے اپنے جواب سے مطمئن تھے چنانچہ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کس کا جواب ٹھیک ہے ہم دونوں سوال حل کرنے لگے، وہیں زمین پر بیٹھ کے۔

شروع کے پانچ چھے اسٹیپس ہم دونوں کے بالکل ایک تھے۔ ایک جگہ اسے روک کے میں نے کہا کہ یہی تو میرا جواب ہے۔ مرلی مسکرایا اور اس نے کہا، ''پورا سوال تو پڑھو''۔

سوال کچھ اس طرح کا تھا: محمود فلاں جگہ سے فلاں جگہ جاتا ہے، راستے میں دو چڑھائیاں ہیں جن کی لمبائی اتنی اتنی ہے اور دو ڈھلان جن کی لمبائی اتنی ہے۔ چڑھائی پر محمود کی رفتار اتنی ہوتی اور ڈھلان پر اتنی اور سپاٹ زمین پر اس قدر۔ بتاؤ محمود یہ فاصلہ کتنی دیر میں طے کرے گا۔ سوال انگریزی میں تھا اور بالکل آخر میں لکھا تھا and came back جو تاخیر سے پہنچنے کی گھبراہٹ میں پڑھنے سے رہ گیا تھا۔ پھر بھی میرا خیال تھا کہ سات نمبر کے اس سوال میں ساڑھے تین نمبر مل جائیں گے اور آدھا نمبر چونکہ پورا کر دیا جاتا ہے اس لیے امتیازی نمبر ہو جائیں گے۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ حساب میں بشمول الجبرا اور جیومیٹری نمبر کتنے ملے معلوم نہیں کیونکہ مارک شیٹ ہے نہیں اور سرٹیفیکٹ میں صرف اردو کے سامنے Distinction لکھا ہوا ہے۔ حساب میں پچھتر فی صدی سے کم نمبر ملنے پر افسوس ہوا لیکن فارسی میں امتیازی نمبر نہ ملنے پر سخت حیرت ہوئی۔ ایک ایک شعر اور پیراگراف کے معنی بالکل ٹھیک لکھے تھے۔ بعض اشعار کے متوازی یا ملتے جلتے معنی کے اردو شعر بھی لکھے تھے اور سفر پر مضمون لکھا تھا جو ''سفر وسیلۂ ظفر'' سے شروع ہوتا تھا۔ تاریخ اور جغرافیے میں نمبر کم تھے جس کی وجہ سے سیکنڈ ڈویژن آئی۔ میرا رول نمبر 15290 تھا اور اس وقت کے بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ کے سکریٹری پرمانند تھے۔

امتحان کا نتیجہ نکلا تو میں محی الدین پور میں تھا۔ اعجاز بھائی (فتحیاب بڑے ابا کے بڑے

بیٹے) کامبارکباد کا تار وہیں ملا تھا۔ اس دن میں بہت رویا تھا۔ ابا بے تحاشہ یاد آئے تھے۔ اماں کئی بار بتا چکی تھیں اور مجھے بھی یاد تھا کہ ابا کہتے تھے عابد میاں نے ہائی اسکول کرلیا تو انھیں انگلینڈ بھیج دوں گا۔ اب میں نے یہ "کارنامہ" کر دکھایا ہے تو اسے دیکھنے کے لیے وہ نہیں ہیں۔ انگلینڈ جانے کی کوئی للک نہ تھی۔ میں اس دن ان کی فرنچ کٹ داڑھی اور کھلتے ہوئے گندمی رنگ کے چہرے پر ان کی مخصوص مسکراہٹ کے لیے ترس رہا تھا۔ سچ پوچھیے تو ابا کے انتقال کے بعد میں کبھی کھل کر نہیں ہنس سکا، شاید کبھی نہیں... اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی ہے۔

چند تصویرِ بتاں...

اورئی میں کلاس اور کالج کے دوستوں کے علاوہ میرے دو خاص دوست تھے۔ ان سے ادبی دوستی تھی، یعنی ہم لوگ اپنے حساب میں ادب کے متعلق باتیں کیا کرتے۔ ہفتے میں دو تین شاموں کی یہ ملاقاتیں ریاض رضوی کے ہاں ہوتیں۔ اس کا مکان سرکاری اسپتال کے سامنے سڑک کی دوسری جانب تھا۔ اس کے والد محکمۂ نہر میں اتنے بڑے افسر تھے کہ ان کو سرکاری بنگلہ ملا ہوا تھا۔ دوسرے دوست کا نام ابرار احمد تھا۔ دوستی اصل میں ریاض ہی سے تھی۔ ابرار سے ملاقات اسی کے ذریعے ہوئی تھی اور پھر ہم تینوں گہرے دوست بن گئے تھے۔

اس زمانے میں جب میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کر رہا تھا ریاض بی۔ ایس۔ سی میں تھا۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن سرِ راہے مل گیا تو میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ بی۔ ایس۔ سی۔ کے دوسرے سال میں مستقل ہوگیا ہوں۔ میرے چہرے پر حیرت واستعجاب دیکھ کر اس نے کہا کہ دوسری بار بھی فیل ہوگیا تھا۔ (ہم دونوں ایک دوسرے سے بے خبر ایک ہی سمت رواں تھے) اس کے بعد اس نے بجلی کمپنی میں ملازمت کرلی تھی۔

گذشتہ صدی کے آخری برسوں میں اس سے اتفاق سے ملاقات ہوگئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے فون نمبر لیے تھے لیکن معلوم نہیں کیوں رابطہ نہ قائم کر سکے۔ ان دنوں وہ اندرا نگر روڈ پر نہرو کراسنگ کے آس پاس کہیں رہتا تھا۔

ایک دن مجھے اس کی بہت یاد آئی تو میں نے روزنامہ "صحافت" میں ایک خط چھپوا کر اس کا اتا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر ایک ادبی نشست میں جو عارف نقوی کے اعزاز میں ہوئی تھی ایک شناسا سے معلوم ہوا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں نے

اس کے گھر کا پتہ بھی نوٹ کر لیا تھا کہ کسی روز جا کے پہلے خود کو متعارف کراؤں گا اور پھر تعزیت... لیکن تین چار سال گذرنے کے باوجود اس کی نوبت اب تک نہ آ سکی۔

دنیا نے کس بری طرح جکڑ رکھا ہے، لعنت ہے اس پر اور مجھ پر بھی۔

اورئی میں قیام کے آخری دنوں میں ایک شام کو کچھ شعر و شاعری ہو رہی تھی اور کچھ اس کی باتیں کہ ابرار نے غالبؔ سے منسوب یہ شعر سنایا:

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

میں نے کہا یہ شعر غالبؔ کا نہیں ہو سکتا۔ میرے اس دعوے پر دونوں کو سخت حیرت تھی۔ میری دلیل یہ تھی کہ چند تصویرِ بتاں کی ترکیب غلط ہے۔ یہاں تصاویرِ بتاں ہونا چاہیے اور غالبؔ اس قدر قادرالکلام شاعر تھے کہ یہ عیب دور کرنا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ دونوں نے میری دلیل مان لی تھی لیکن تیس پینتیس سال بعد حنیف نقوی صاحب سے ذکر آیا تو انھیں یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ یہ شعر غالبؔ کا نہیں ہے میری دلیل قبول نہ تھی۔

اس شعر سے متعلق ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک دن نصرت پبلشرز میں ایک صاحب تشریف لائے۔ جانے کہاں سے غالبؔ اور پھر اس شعر کا ذکر نکل آیا اور میں نے اورئی کے واقعے کا ذکر کیا تو انھوں نے حیرت سے دریافت کیا۔

''یہ شعر غالبؔ کا نہیں ہے؟''

''میرے خیال میں نہیں،'' میں نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے دیوانِ غالبؔ سامنے والی الماری سے اٹھایا، الٹ پلٹ کے دیکھتے رہے، پھر خاموشی سے الماری میں لگا کر چلے گئے۔

◆◆◆

محی الدین پور، جونپور، غازی پور

گرمیوں کی چھٹیوں میں یتیمی کی ردا اوڑھ کر میں، اماں اور چھوٹے بھائی بہن کے ساتھ پہلی بار محی الدین پور گیا تو نواب چچا کا رویہ بہت اچھا تھا۔ پہلے وہ مجھے عابد کہتے تھے لیکن اب ''عابد میاں'' کہہ کر پکارتے، چھوٹے بھائی عمران اور چھوٹی بہن نجمہ کو بھی بہت پیار کرتے۔ ان کا اصرار تھا کہ اماں اور ہم لوگ اب وہیں رہیں لیکن بچوں کی تعلیم کے پیش نظر اماں گاؤں میں نہیں رہنا چاہتی تھیں۔

نواب چچا ''عابد میاں'' کہتے تو مجھے بہت اچھا لگتا۔ ابا کی خاموش محبت اور دادے ابا کے لاڈ پیار، جس کا اظہار پیڑے اور برفی، ان کے گدگدانے اور گدگدانے کی دھمکیوں سے ہوتا، سے محرومی نے نام کے ساتھ ''میاں'' کے اضافہ کو بڑی قیمتی چیز بنا دیا تھا۔ اگلے دن ایک ایسی بات ہوئی جو میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ نواب چچا نے اماں سے کہا، ''بڑی بھابی، عابد میاں کو تیار کر دیجیے۔ وہ اپنا علاقہ دیکھنے جائیں گے۔'' مجھے زمینداری کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا؛ بس دھندلا دھندلا سا خیال تھا کہ ہم لوگ زمیندار ہیں۔ زمیندار کے معنی میں بس یہ سمجھتا تھا کہ آموں کا ایک آدھ باغ ہے اور تھوڑی بہت کھیتی۔ اس سے زیادہ کا کچھ احساس نہ تھا، لیکن وہ واقعہ یاد تھا جس میں نواب چچا قدیر میاں کی بیٹی کی شادی سے ذرا سی بات پر اٹھ کے چلے آئے تھے۔ میں نہانے دھونے کے بعد کپڑے تبدیل کر کے اور مخملی ٹوپی لگا کر باہر نکلا تو چبوترے کے سامنے ایک شخص گھوڑی کی راس پکڑے موجود تھا۔ پاس ہی ایک سپاہی بندوق لیے کھڑا ہوا تھا۔ چچا نے مجھے دیکھا تو چہرہ اس طرح بنایا جیسے کہہ رہے ہوں ''بہت اچھے لگ رہے ہو'' اور پھر سائیس سے کہا، ''گھوڑی دوڑانا نہیں اور میاں تھک جائیں تو لوٹ آنا۔''

مجھے سہارا دے کر گھوڑی پر بٹھایا گیا، جس پر زین کسی ہوئی تھی یا نرم گدہ بچھا تھا۔ سائیس راس تھامے آگے آگے چل رہا تھا اور سپاہی گھوڑی کے ساتھ ساتھ۔ وہ بندوق کبھی کندھے

پر رکھتا، کبھی ہاتھ میں لے لیتا۔ میرا خیال تھا کہ آم کے دو باغوں اور عید گاہ کے بعد کا چھوٹا سا تالاب پار کرنے کے بعد گھوڑی بائیں طرف مڑ جائے گی اور ہم گھر لوٹ جائیں گے۔ معلوم نہیں کیوں میں سمجھتا تھا کہ تالاب کے بعد گاؤں ختم ہو جاتا ہے، ممکن ہے یہ خیال اورئی کے گنڈ کے سبب رہا ہو جس کے بعد ان دنوں بس جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ لیکن جب تالاب کے بعد بھی گھوڑی سیدھی ہی چلتی گئی تو میں نے پوچھا، ''ابھی کتنی دور چلنا ہے؟''

سائیس نے جو راس تھامے تھا، کہا، ''میاں تھوڑی دور اور، پھر لوٹ چلیے۔ کل اودھر سے آئی،'' اس نے بائیں طرف خاصے پیچھے چھوٹ جانے والے باغوں کی طرف اشارہ کیا۔ عید گاہ کے آگے بڑھنے کے تھوڑی دیر بعد چار پانچ کچے مکانوں کے آثار دکھائی دیے تو سپاہی نے کہا، ''میاں!، آپ کے والد صاب کی پیدائس ہییں ہوئی رہی... ان دنوں گاؤں میں پلیگ پھیلا تھا۔ چوہے پٹا پٹ مر رہے تھے۔ سب لوگ جلدی جلدی بنائے گئے ان مکانوں میں آ گئے تھے۔''

ابا کا ذکر آیا تو وہ چھوٹی موٹی سی خوشی جو علاقہ دیکھنے کی ہوئی تھی، جاتی رہی۔ ابا، اورئی کا مکان، دادے ابا، منیر کی اماں، حافظ جی جو ہم لوگوں کے ساتھ رہتے تھے، ان کا بیٹا عمر اور اس وقت کی اورئی کی زندگی، دوست احباب، سب بری طرح یاد آئے اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں لیکن میں مُنہ اوپر کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، ایسے کہ آنکھیں سورج سے نہ ٹکرائیں اور کسی کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ میں رو رہا ہوں۔

تھوڑی دیر آگے چلنے کے بعد سائیس نے داہنے ہاتھ کے کھیت کی منڈیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اودھر کے کھیت ماجد میاں کے ہیں اور گھوڑی موڑ دی۔

آسمان پر سورج چمک رہا تھا لیکن گرمی بہت زیادہ نہیں تھی۔ تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ ایک بڈھے نے جس کی بھنویں بھی سفید تھیں اپنی زبان میں سائیس سے کچھ کہا۔ میں اس کی زبان تو پوری طرح نہیں سمجھ سکا لیکن یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ تیزی سے گھر لوٹ جانے کو کہہ رہا ہے کیونکہ پانی آنے والا ہے۔ میں نے سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا تو دھوپ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ بادل کا تو نام و نشان نہ تھا۔ گاؤں کے بڈھے کی بے سر پیر کی بات پر میں شاید ہنس دیتا لیکن ابھی ابا اور اورئی کی یادیں دل پر چھائی ہوئی تھیں۔

سپاہی اور سائیس نے کچھ کہا تو نہیں لیکن اب ہم سب ذرا تیزی سے لوٹ رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں آسمان پر ایک طرف سے کالی گھنگھور گھٹائیں امڈتی دیکھ کر مجھے اس بڈھے کی

بات یاد آئی اور دادے ابا کی جامع مسجد کے سامنے پہنچتے پہنچتے اتنی تیز بارش شروع ہوگئی کہ بیس پچیس قدم کے فاصلے پر اپنے گھر پہنچا تو پوری طرح بھیگ چکا تھا۔

مجھے نہیں یاد کہ یہ بات کس نے بتائی لیکن کسی نے کہا تھا کہ گاؤں والے بھینس کے گوبر کے زمین پر گرتے وقت اس کے چھدرنے کے انداز سے پتہ لگا لیتے ہیں کہ بارش ہونے والی ہے۔

مجھے اپنا ''علاقہ'' دیکھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور ویسے بھی معلوم نہیں کیوں مجھے زمینداری اچھی نہ لگتی تھی اور زمیندار تو میں بالکل ہی نہیں بننا چاہتا تھا۔

جگ مگ جگ مگ موتی برسیں...

سائیس نے مجھ سے کہا تو تھا کہ باقی ''علاقہ'' دیکھنے کل چلیے گا لیکن شاید چچا نے یہ سمجھا کہ مجھے سب کچھ دکھا دیا گیا اور سپاہی اور سائیس نے سوچا کہ جب نواب میاں نے نہیں کہا تو بیکار دھوپ میں مارے مارے پھرنے سے فائدہ اور مجھے اپریل کے آخر یا مئی میں سوکھی ساکھی بنجری زمین دیکھنے کا کوئی چاؤ نہیں پیدا ہوا۔ کچھ بھی ہو، میں نے باقی علاقہ نہیں دیکھا اور جو دیکھا تھا اس میں ان ٹوٹے پھوٹے کچے مکانوں کے علاوہ جن کا رشتہ ابا کی پیدائش سے جوڑا گیا تھا، میری دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ میں نے ان ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے بارے میں نواب چچا سے پوچھنے کے بارے میں سوچا تھا لیکن پھر اس کا خیال نہ آیا۔

اگلے دن ایک بات اور ہوئی۔ میری بڑی امّاں (ابا کی پہلی اہلیہ) کا مکان ہمارے مکان سے بالکل لگا ہوا تھا۔ میں کچھ غلط کہہ گیا۔ بیچ میں ایک اور مکان کا راستہ تھا لیکن وہ مکان ذرا اندر تھا۔ خیر، کہنا یہ ہے کہ بڑی امّاں کے گھر سے کوئی مجھے بلانے آیا۔ میں چچا کے گھر کے باہری حصّے میں ہوتا تو فوراً ہی بلانے والے کے ساتھ ہو لیتا لیکن اس وقت میں اندر تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ محی الدین پور کی رہنے والی تھیں اور سچ پوچھیے تو سگے سوتیلے کی بات کچھ زیادہ جانتا بھی نہ تھا۔ اورئی میں ہمارے گھر میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ انو آپا اور اختری آپا مجھے اور امّاں کو بہت چاہتی تھیں اور فیاض بھائی کی طرف ان کے پاگل پن کی وجہ سے سب کا رویہ ایک سا تھا اگرچہ وہ بھی مجھے بہت چاہتے تھے اور امّاں تو طرح طرح سے ان کی مدد کیا کرتیں۔

امّاں نے اس لڑکے سے جو مجھے بلانے آیا تھا کہا کہ تھوڑی دیر میں آئیں گے اور مجھے غسل خانے بھیج دیا۔ نہانے دھونے کے بعد کپڑے بدل کر میں تیار ہو گیا تو امّاں نے میری

مانگ نکالی اور پیشانی پر بالکل اس جگہ جہاں سے بال شروع ہوتے ہیں نذر کا ٹیکا لگا دیا۔ لیکن یہ سب کرتے ہوئے وہ کچھ کچھ الجھ رہی تھیں۔ اتنے میں وہ لڑکا بلانے کے لیے دوبارہ آ گیا تو انھوں نے مجھ سے دھیرے سے کہا، "وہاں کچھ کھانا پینا نہیں۔" مجھے خیال ہوتا ہے کہ ان کی اس بات سے میرے اندر کچھ کھٹ سے ہوا تھا لیکن میں بڑے شوق سے اس لڑکے کے ساتھ ہو گیا۔

بڑی اماں کے گھر کی صورتیں تو سب جانی پہچانی تھیں، خاص طور سے بڑوں کی، لڑکے لڑکیاں البتہ نئے نئے سے لگ رہے تھے۔ مجھے جانے کیسے یہ معلوم تھا کہ وہاں جو دو عورتیں تھیں وہ میری خالائیں تھیں۔ انھوں نے بڑے پیار سے مجھے چمٹایا، پیاری پیاری باتیں کیں، ایسی کہ میں ذرا سی دیر میں اماں کی ہدایت بھول گیا اور جو کچھ بھی کھانے پینے کو دیا گیا میں نے بغیر ایک بار بھی انکار کیے کھا لیا۔ وہ سب بڑے اچھے لوگ تھے، بہت پیارے، بہت چاہنے والے، اور پھر ایسا لگنے لگا جیسے ہم سب ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے اور چاہتے ہوں۔

وہاں میری عمر کے یا کچھ بڑے چھوٹے پانچ چھے لڑکے تھے۔ ایک لڑکی بھی تھی، مجھ سے چھوٹی، جسے سب لوگ شمّی کہتے۔ وہ سب سے الگ تھی، گورا رنگ، گھنگھریالے بال، ہر وقت مسکراتی رہتی، ہر بات کا جواب اس کے پاس موجود تھا۔ اس کی باتیں ایسی ہوتیں کہ سبھی ہنس دیتے۔ یہ باتیں سب کو اچھی لگتیں۔ وہ مجھے بھی اچھی لگی، اس کی باتیں بھی۔ لیکن گھنٹے دو گھنٹے بعد، خوب ٹُچن ہو کر، اماں کے بلانے پر جب وہاں سے آیا تو کوئی یاد، کوئی چہرہ اپنے ساتھ نہیں لایا۔ مجھے نہیں یاد کہ اگلے تین ساڑھے تین سال بعد جب میں الٰہ آباد گیا تو خالا کے گھر کیسے پہنچ گیا۔ مجھے یہ بھی نہیں یاد کہ ان کا مکان کس محلّے میں تھا، بس اتنا خیال ہے کہ ان کے مکان کے زینے کے دونوں طرف دور دور تک بانس کی دوکانیں تھیں اور دیوار سے ٹکا کر بھی بانس کھڑے کر دیے گئے تھے، بانس ہی بانس، ہر جگہ بانس۔

بڑوں میں تو ایک ہی شناسا صورت تھی، بڑی اماں کی۔ بچے بڑے ہو گئے تھے، ان کی صورتیں بدل گئی تھیں لیکن کوئی اجنبیت نہ تھی علاوہ اس کے کہ شمّی نہیں تھی۔ مجھے اس کا خیال بھی فوراً نہیں، تھوڑی دیر بعد آیا اور میں نے پوچھا، "شمّی دکھائی نہیں دے رہی ہے؟"

"اس کی تو شادی ہو گئی بھیا،" خالہ نے کہا۔

"آپ نے شادی کر دی، مجھے بتایا بھی نہیں؟" میں نے کہا۔

"بھیا تم چاہتے تھے تو کہا ہوتا"، خالہ نے کہا، "اپنی بیٹی کو دور دیس بھیجتے کسے اچھا لگتا ہے۔"

خالہ کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا۔

میری آنکھ سے بھی ٹپکنے کے لیے ایک قطرہ پر تولنے لگا۔ لیکن باہر آنے کے بجائے دل کے آس پاس کہیں جم گیا۔

یہ بات ۱۹۴۹ء کی گرمیوں کی ہے، ساٹھ باسٹھ سال پرانی۔ ان سارے برسوں میں ایک بار بھی شمّی کا خیال نہیں آیا، ایک بار بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا، لیکن دو سال پہلے ایک صاحب سے، جو محی الدین پور میں بھی موجود تھے اور الٰہ آباد میں بھی، ملاقات ہوئی تو میں نے ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد شمّی کے بارے میں پوچھا اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں، آنسو کا وہ قطرہ جو بہت پہلے آنکھوں سے ٹپک جانے کے بجائے دل کے پاس جم گیا تھا، دوبارہ آنکھوں میں آیا اور پھر اپنی جگہ لوٹ گیا۔ یہ معصوم سی محبت تھی۔ لوگ سچ ہی کہتے ہیں، پہلی محبت بھلائے نہیں بھولتی۔

میں ایک جملہ جوڑ دوں...اور یاد کرے یاد نہیں آتی۔

جگ مگ جگ مگ موتی برسیں

برسیں ہیرا پنا

نواب یوسف

کچھ دن بعد ہم لوگ مسیاروں کی ڈولی پر، جس کا اب نام ونشان بھی باقی نہ رہ گیا ہوگا، جون پور جانے کے لیے سرائے میر یز کے لیے روانہ ہوگئے۔ ابّا کے انتقال کے بعد جونپور کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ دس بارہ دن کے قیام کے بعد ہم لوگ وہاں سے پہتیا (غازی پور) جانے والے تھے۔

جونپور کے قیام کے دوران ایک دن نانے ابّا کے ساتھ نواب یوسف کے یہاں گیا۔ وہ میرے رشتے کے ماموں تھے۔ ان کی آنکھیں جاتی رہی تھیں اور ملازمین کے رحم وکرم پر تھے، جو انھیں لوٹ رہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ کچھ لانے کے لیے نیفے سے نکال کر دس روپے کا نوٹ دیتے ہیں تو سامان لا کر نوکر پانچ روپے کے حساب سے پیسے واپس کرتا ہے؟ وہ کہتے ہیں دس روپے کا نوٹ دیا تھا تو ملازم جواب دیتا ہے۔ ''کہاں نواب صاحب پانچ کا نوٹ دیا تھا آپ نے''۔

وسط شہر میں، بہت بڑی کوٹھی تھی اور اس سے زیادہ زمین پر نہایت خوبصورت لان۔ سبز

رنگ کی کوٹھی کے مینار پر اتنی بڑی گھڑی لگی تھی کہ سارے شہر سے نظر آتی۔ اب کا حال نہیں معلوم۔
اور یہ تو شاید ہی کسی کو یاد ہو کہ وہ یوپی کے پہلے ہندوستانی وزیر صحت تھے اور حضرت گنج میں میونسپل
کمیٹی کی شاندار عمارت کا سنگِ بنیاد انھی نے رکھا تھا۔ پتھر اب تک لگا ہوا ہے۔

ملازمین کا برتاؤ برداشت کرنا تو خیر اُن کی مجبوری تھی لیکن سنا تھا کہ وہ نانے ابا سے
بہت ڈرتے تھے، اس وقت بھی جب وہ اپنی بینائی سے محروم نہیں ہوئے تھے۔

نانے ابا نے کہا کہ کوٹھی کے پیچھے کے لان میں دو کانیں بنا کر انھیں کرایے پر اٹھا دے،
نہیں تو سب ہاتھ سے نکل جائے گا۔ گاؤں کے گاؤں جو بٹائی پر دے رکھے ہیں انھیں کم سے کم کاغذ
پر تو خود کاشت کر لے، اب زمانہ بدل رہا ہے۔ نانے ابا اپنے ہاتھ کا ڈنڈا بار بار زمین پر مارتے،
جیسے انھیں دھمکا رہے ہوں اور یوسف ماموں ان کے سامنے کھڑے ہوئے ''جی ہاں، جی ہاں''
کہتے رہتے۔ معلوم نہیں کیوں نواب یوسف ان سے ڈرتے تھے۔ رشتہ کیا تھا، یہ میں نہ جانتا تھا لیکن
چند ماہ قبل جونپور کے بارے میں باتیں معلوم کرنے گیا تو میرے سگے خالہ زاد بھائی مولانا فصیح
الدین نے بتایا کہ نانے ابا کی سگی بہن نواب یوسف کے والد نواب عبدالمجید سے منسوب تھیں۔

نانے ابا کے ''کر'' کے بجائے ''کرکر'' پر۔ پہلے مجھے ہنسی آتی، اب اچھا لگنے لگا تھا۔

''اچھن آئی ہوئی ہیں، معلوم ہے؟'' نانے ابا نے ان سے کہا۔

''جی ہاں، سنا ہے... لیکن میں...''

''ہاں ہاں، ملنے آئیں گی۔ اس کا بیٹا عابد ساتھ ہے، تیرے پاس کھڑا ہے۔''

انھوں نے ہاتھ بڑھایا۔ نانے ابا نے مجھے ان کے پاس کر دیا۔ انھوں نے سر اور مُنہ
ٹٹولا اور کہا۔

''میں نے کہا تھا... کہلوایا تھا... اچھن سے کہیے...''

''کہا تھا۔''

''کیا ہوا، اچھن نے کیا کہا؟'' انھوں نے پوچھا اور کہا، ''عابد میاں جہاں تک پڑھنا
چاہیں...''

''وہ نہیں مانتا۔''

''کون؟ اچھن؟'' وہ ساری بات سن نہ پائے۔

''نہیں یہ، تیرا بھانجا، عابد''

''کیوں؟''

انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، اور کہا، ''ماموں کا کوئی حق نہیں؟''

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ مجھے سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ انھوں نے ایک بار پھر پوچھا لیکن میں چپ سادھے رہا۔ ایسی کوئی بات جب بھی ہوتی مجھے ابا کی یاد بہت آتی، دادے ابا بھی یاد آتے۔ میں سوچتا کہ ابا سارا خرچ اٹھاتے تھے، ایک بار بھی محسوس نہیں ہوا، خیال بھی نہیں آیا۔ کوئی اور روپے دے گا تو ہر وقت ایسا لگے گا کہ اپنی جیب میں جو پیسے ہیں ان کے بوجھ سے جیب پھٹی جا رہی ہے۔ اب سوچتا ہوں تو اس میں خودداری وغیرہ کی کوئی بات نظر نہیں آتی، بس اس کی عادت نہیں تھی، کسی سے روپے لینا کچھ اچھا نہ لگتا۔

یوسف ماموں کی بینائی سے محرومی دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ یہ بھی شاید خیال آیا کہ جو شخص ہر وقت لوٹا جا رہا ہو اس سے کچھ لینا بھی ایک طرح سے اسے لوٹنا ہی ہوا... ایک بات اور بھی تھی۔ میں کسی معاملے میں دوسروں سے اچھا نہ تھا۔ نہ شکل میں، نہ صورت میں (اور شاید اسی لیے ایک خاتون کا یہ جملہ کہ رنگ صاف ہوتا تو خوبصورتوں میں شمار ہوتا بہت اچھا لگا تھا)، اور تین تین مکانوں اور زمینداری کو کبھی بڑی چیز نہ سمجھتا تھا۔ لیکن اب غیر محسوس طور پر محرومی کے احساس نے گھیر رکھا تھا اور اس کو چھپانے کے لیے ایک طرح کی اکڑفوں پیدا ہو گئی تھی اور پیسے والے لوگوں سے ایک طرح کی چڑ۔ مجھے معلوم تھا کہ نواب یوسف نے کیمبرج میں تعلیم حاصل کی تھی، وہاں سے بیاہ کر ایک میم لائے تھے اور اسے گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیے الٰہ آباد میں جمنا کے کنارے ایک کوٹھی بنوائی تھی لیکن چند ہی برسوں میں وہ چٹ پٹ ہو گئی۔ ان کی دولت اور امارت کے قصے سنے تھے اور اب ان کی حالت دیکھ کر افسوس ہوتا لیکن میں ان کو دولت و ثروت سے الگ کر کے کبھی نہ دیکھ سکا۔

لماں انھیں دیکھنے گئی تھیں اور واپس آ کر انھوں نے یوسف ماموں کی پیش کش کا ایک بار پھر ذکر کیا تھا لیکن میں خاموش رہا تھا۔ لماں سے اسی طرح کی بات ڈاکٹر سید محمود نے بھی کہی تھی۔

نانے ابا وہاں سے مجھے ایک بہت بڑے باغ لے گئے۔ یہ باغ نواب یوسف ہی کا تھا اور نہ جانے کیوں شیو پار کہلاتا۔ باون بیگھے کے اس باغ کے ایک حصے میں صرف آم کے پیڑ لگے تھے۔ وہیں ایک بڑا سا کمرہ بنا تھا جو نانے ابا کے قبضے میں تھا۔ اس کا تالا انھوں نے میرے سامنے کھولا تھا۔ اندر پلنگ پر بستر بچھا تھا، ایک کونے میں چٹائی پر موٹی سی دری بچھی تھی۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتا۔ باورچی خانہ دیکھ کر مجھے خیال آیا تھا کہ

کھانا کون پکائے گا لیکن تھوڑی دیر میں چھیتن آ گیا، مگر اس کے آنے سے پہلے ہی ایک نوکر گلاس میں آم کا پنا بنا کر لے آیا۔ اس میں برف تو نہیں ڈالی گئی تھی لیکن پنا ٹھنڈا تھا۔ آم کا پنا مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔ معلوم نہیں نانے ابا نے، جنھیں یہ بات معلوم تھی، خاص طور سے یہ شربت بنوایا تھا یا یہ محض اتفاق تھا۔

آم کے ایک درخت کے نیچے، جو بالکل شروع ہی میں تھا، پلنگ ڈال کر چادر بچھا دی گئی تھی۔ نانے ابا اور میں وہاں بیٹھے ہی تھے کہ کسی چیز کے ٹپ سے گرنے کی آواز آئی اور پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں جانتا تھا کہ یہ آواز آم کے شاخ سے ٹوٹ کر گرنے کی ہے۔ آم کھانے کو میرا دل تو چاہ رہا تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ ذرا دیر بعد چھیتن ایک پلیٹ میں دو تین آم کاٹ کر لے آیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ آم خوب ٹھنڈے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا نانے ابا نے اپنے آنے کی خبر بھیج دی تھی اور بڑے سے مٹکے میں تھوڑے سے آم گیلی ریت میں دبا دیے گئے تھے۔ کئی گھنٹوں تک گیلی ریت میں دبے رہنے کی وجہ سے ٹھنڈک آموں کے ایک ایک ریشے میں اتر گئی تھی۔

میں وہاں دو تین دن رہا۔ نانے ابا کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کتنے اچھے، ٹھنڈے، بخ آم مجھے کھلا دیں۔ ہر کھانے پر جب چھیتن ٹھنڈے کیے ہوئے آموں کی قاشیں کاٹ کے لاتا تو وہ یہ ضرور اس سے پوچھتے کہ ریت میں نئے آم دبانا بھول تو نہیں گیا۔

چھیتن چچا

نانے ابا کا ذکر میں نے جس طرح کیا ہے اس سے ان کی مزاجی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ بہت غصور تھے۔ سیدھے مُنہ بات نہ کرتے لیکن میں نے انھیں چھیتن کو ڈانٹتے کبھی نہیں دیکھا۔ چھیتن کی جانب ان کا نرم رویہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔

اپنے ہوش میں میرا جونپور جانا دو بار ہوا اور اکتوبر ۲۰۰۹ء میں تیسری بار۔ میں نے چھیتن کو گھر کے اندر کبھی نہیں دیکھا۔ مکان کے سامنے ایک بنگلیہ تھی جس پر کھپریل چھایا ہوا تھا اور اس میں ایک چھوٹے سے دالان کے علاوہ تین چار کمرے تھے۔ نانے ابا کا کمرہ خاصا بڑا تھا اور چھیتن اسی کمرے میں چٹائی پر سوتا تھا۔ اپنے کسی کام کی نانے ابا کو فکر نہ کرنا پڑتی۔ سارے کام اسی کے سپرد تھے۔ وہی کھانا پکاتا، ان کے کپڑے دھوتا، صفائی کرتا اور سائے کی طرح ہمیشہ ان

کے ساتھ رہتا۔ نانے ابا دنیا سے پہلے رخصت ہوئے اور چھمیتن بہت دنوں بعد۔ وہ خاموش رہتے لیکن اندر اندر رویا کرتے۔ اب کے جونپور گیا تو معلوم ہوا گھر کے سارے چھوٹے بڑے انھیں ''چھمیتن چچا'' کہتے تھے۔ اب میں بھی انھیں چھمیتن چچا ہی کہوں گا۔

شیو پار میں دوسری یا تیسری شام کو نانے ابا نے کسی ملازم سے کہا، ''بھیا کے لیے اچھے اچھے آم چن کر لے آ۔'' وہ پچیس تیس آم لے آیا اور یہ ہمارے ساتھ کر دیے گئے۔

یہ آم گھر میں نہیں بھیجے گئے۔ چھمیتن دن میں دو تین بار مجھے نانے ابا کی بنگلیہ میں بلا کر ایک دو آم ضرور کھلا دیتا۔ لیکن یہ آم بہت ٹھنڈے نہیں ہوتے تھے۔ شاید انھیں گیلی ریت میں نہیں دبایا جاتا تھا۔

جونپور میں اپنے قیام کے دوران ایک دلچسپ بات سنی اور وہ بالکل قرین قیاس معلوم ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں شمالی ہندوستان پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد جب انگریزوں کو جنگ و جدال اور بغاوتوں سے فرصت ملی تو انھیں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ممکن ہے کہ اس کے سیاسی محرکات بھی رہے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے کچھ انگریز ایسے بھی تھے جو مشاعروں میں شرکت کرتے، مشاعرے کراتے اور ٹوٹے پھوٹے شعر بھی کہتے۔ مثلاً

مجھ کو اس کافر سے الفت ہوگیا   پارسائی پر قیامت ہوگیا

ارے محبوب تمھارا لال کرتی ہے   ہم ڈھونڈتا پھرتا ہے تم اُڑتا پھرتی ہے

ہندوستان میں جو انگریز اعلیٰ عہدوں پر تعینات کیے جاتے وہ تو اپنی شان دکھاتے لیکن اوسط اور معاشی طور پر نچلے طبقے سے متعلق انگریز جو چھوٹے موٹے عہدے سنبھالنے کے لیے یہاں بھیجے جاتے، اپنی زندگی کی محرومیوں کا حساب دو طرح سے چکاتے۔ ہندوستانیوں پر ظلم و ستم کر کے یا اُن میدانوں میں جو اہل ہند اور خاص طور سے مسلمانوں کی متاع عزیز تھے، ان سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کر کے۔ ایسے انگریز دل لگا کر اردو سیکھنے کی کوشش کرتے اور یہ بھی ہوتا کہ وہ ڈکشنریوں کی مدد سے خود کو اہل زبان سے زیادہ اردو داں سمجھنے لگتے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک ایسے انگریز کو میرؔ کا شعر

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے   سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

بہت پسند آیا۔ لیکن ''زلف اور'' اسیر'' اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ زلف کے معنی کسی نے محبوبہ کے سر کے بال بتایا اور معنی بتاتے ہوئے بائیں جانب کے اپنے سر پر ہاتھ بھی رکھا۔ اسیر

کے معنی اس نے گرفتار کرنا یا جیل بھیجنا بتایا۔ چنانچہ اس انگریز نے اپنے کسی دوست کو یہ شعر اس طرح سنایا۔

ہم ہوا تم ہوا کہ میرؔ ہوا سب کو (اس طرف کے) بالوں نے جیل بھیجا

(بائیں طرف کے بالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی انگریز نے اردو قواعد اور لغات پر مہارت حاصل کر لی اور چیلنج دیا کہ وہ اردو کے بڑے سے بڑے صاحبِ زبان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ مقابلہ تو خیر کیا ہوا ہوگا لیکن ایک شعری نشست میں جب اس نے اپنا چیلنج دہرایا تو ایک صاحب نے جواباً کہا، ''یہ اردو دانی میں ہم سے مقابلہ کرے گا۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ''

اس غریب کو پدّی کا شوربہ کسی لغت میں نہیں ملا۔ لیکن یہ واقعہ لکھنؤ کا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جونپور میں انگریزوں نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا اور اس کے لیے مصرعۂ طرح ایسا دیا کہ یا تو لوگ غزل ہی نہ کہیں اور کہیں تو سبک ہوں۔ مصرعۂ طرح تھا...

''دینِ احمدؐ کا گھٹے دینِ مسیحا بڑھ جائے''

مجھے نہیں معلوم کہ مشاعرے میں کتنے شعرا نے شرکت کی اور انھوں نے مصرعۂ طرح پر کیا کیا گرہیں لگائیں لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ ایک گرہ غضب کی لگائی گئی اور اس کے بعد شعر نے یہ صورت اختیار کر لی۔

گر براقِ نبوی سے خرِ عیسیٰ بڑھ جائے
دینِ احمد کا گھٹے دینِ مسیحی بڑھ جائے

اب بہتیا چلنا ہے۔ لیکن ایک بات رہی جاتی ہے، ویسے باتیں تو بہت سی رہ گئی ہوں گی لیکن ایک اور یاد آ گئی ہے تو کیوں نہ اس کا بھی ذکر ہو جائے۔ نانے ابا کی بنگلیہ کے پیچھے ایک چھوٹا سا اکھاڑہ تھا، اکھاڑہ کیا بارہ تیرہ فٹ لمبی اور اسی قدر چوڑی زمین کو پولا کر کے اس کے کنکر پتھر نکال دیے گئے تھے اور گھر کے لڑکے شام کے وقت اس میں کشتی لڑتے، گھر میں پہننے والے کپڑے پہنے ہوئے۔

مجھے کسرت اور کشتی وغیرہ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی اور نہ جسم ہی ایسا تھا لیکن عمر کی جس منزل میں تھا اس میں یہ احساس ذرا کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی کام مشکل ہے۔ خالازاد بھائیوں کو کشتی لڑتے دیکھا تو میں سمنانی بھائی سے مقابلہ آرائی کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ لمبے چوڑے تھے، گٹھا ہوا

جسم تھا اور میرے سامنے ہی کئی بھائیوں کو پچھاڑ چکے تھے۔ کسی نے مجھے سمنانی بھائی سے کشتی لڑنے سے منع بھی کیا لیکن میں انھیں دعوت دے چکا تھا، چنانچہ سنی ان سنی کردی اور اکھاڑے میں اتر گیا۔ ناآزمودہ کار کی جرأت تو تھی لیکن آتا جاتا خاک نہ تھا۔ ہاتھ ملایا اور بھڑ گیا اور ایسا بھڑا کہ مشکل سے دو تین منٹ میں انھیں چت کردیا۔ سب نے تالیاں بجادیں۔ سمنانی بھائی شرمندہ لگ رہے تھے اور میں بظاہر تو خوش تھا لیکن اندر سے یہ ضرور جانتا تھا کہ اس جیت کی حیثیت ''اتفاق'' سے زیادہ نہیں۔ زندگی میں جو تھوڑی بہت کامیابیاں ملیں، ان کی حیثیت بھی ایسی ہی ہے اور جہاں جہاں آنکھیں کھلی رہیں وہاں وہاں چت اور پٹ دونوں دوسروں ہی کی رہیں۔

گلی ڈنڈے کا میچ

چلیے اب پہتیا چلیں۔ کہیں سمنانی بھائی ایسی پٹخنی نہ دیں کہ ساری ہیکڑی بھول جاؤں۔

جونپور سے غازی پور تک کا ریل کا سفر یاد ہے نہ وہاں سے پہتیا کا۔ البتہ پہتیا سے بذریعہ لڑھیا غازی پور واپسی، وہاں کے شجاول پور کے مکان میں مختصر سا قیام اور پھر ریل گاڑی سے لکھنؤ تک کا سفر خوب یاد ہے۔ یہ سفر ہم لوگوں نے انٹر کلاس میں کیا تھا۔

لیکن پہلے پہتیا میں آٹھ دس دن کے قیام کی وہ باتیں تو ہو جائیں جو یاد رہ گئی ہیں۔ چالیس پینتالیس سال قبل قاضی عبدالستار کا ''پیتل کا گھنٹہ'' پڑھا تھا تو احساس ہوا تھا کہ افسانہ لکھتے وقت یہی مکان ان کے ذہن میں رہا ہوگا، علاوہ اس کے کہ افسانہ کے مکان کی دیواریں بہت بوسیدہ ہیں اور غسل خانے کا پردہ بہت پرانا ہے۔ معاملہ دو مکانوں کا نہیں، وقت کا ہے۔ یہ بات ۱۹۴۸ء کی گرمیوں کی ہے اور اُن کے سامنے دس بارہ سال بعد کا اپنا گاؤں تھا۔

پہتیا کی دو تین باتیں کسی قدر تفصیل سے یاد ہیں۔ ایک تو باہر کا وہ کمرہ جدھر سے آموں کی بو کی وجہ سے ہم لوگ گزرتے نہ تھے، دوسرے بزرگوں اور خوردوں کا گلی ڈنڈے کا میچ، تیسرے ماموں صاحب (ڈاکٹر علیم) کے ساتھ چند دن اور ایک مزے دار واقعہ۔

پہتیا میں ماموں صاحب کو میں نے پہلی بار قریب سے دیکھا۔ یوں تو انھیں ابا کے انتقال کے بعد قاضی باغ میں عقیل ماموں کے مکان اور ان کی قیام گاہ، نرہی کے یونیورسٹی ڈیلی گیسی سینٹر، میں کئی بار دیکھ چکا تھا لیکن یہ سارے بس دور کے جلوے تھے کہ وہ خود سے بات چیت کا

آغاز مشکل سے کرتے اور دوسروں کی ہمت کم ہی پڑتی اور ایسی ہی مجبوری آن پڑتی تو" ہوں، ہاں" میں ساری منزلیں طے ہو جاتیں۔ یہاں ایک انکشاف ہوا؛ وہ نہ صرف مسکرا لیتے ہیں بلکہ ان کو کبھی کبھی ہنس لینا بھی آتا ہے۔

وہاں بزرگوں اور نوجوانوں کی ٹیموں کے درمیان گلّی ڈنڈے کا میچ ہوا تھا۔ دونوں طرف کی ٹیموں کے چند ہی کھلاڑیوں کے نام یاد ہیں، ماجد صدیقی جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ بایو کیمسٹری میں پروفیسر اور پھر سائنس فیکلٹی کے ڈین ہوئے، لکھنؤ کے آرٹس کالج کے پرنسپل اور مشہور آرٹسٹ بشٹ کے کلاس فیلو عارف صدیقی، طفیل بھائی، مدنی بھائی، محسن الملک کے سکریٹری اور مدرسۃ العلوم کے سابق پروفیسر ابوالحسن، حمید اللہ صاحب، علیم صاحب اور مَیں۔

مکان کے پچھلی طرف کے دالان سے ملحق کمرے میں فراگ چیئر پر نیم دراز ہو کر علیم صاحب ہر روز انگریزی کا اخبار پڑھتے۔ یہ اخبار بارہ ایک بجے دن میں کوئی غازی پور سے لاتا تھا۔

عارف بھائی لکھنؤ آرٹس کالج میں کامرشیل آرٹ کے طالب علم تھے۔ انھوں نے ایک عورت کی تصویر کی جو انگریزی کے کسی اخبار میں چھپی تھی نقل بنائی تھی۔ یہ تصویر انھوں نے ماموں صاحب کو دکھائی۔ انھوں نے کہا، "اچھی ہے، اصل تصویر سے بہت ملتی ہے"۔ ان کے اس جملے پر عارف بھائی نے کہا، "اور ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے"۔

جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا، "مکمل ہو جانے پر اصل سے مختلف ہو جائے گی"۔

میرے اس جملے پر ماموں صاحب ہنس دیے تھے، کسی قدر زور سے۔ اس طرح سے ہنستے ہوئے میں نے ان کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ سچ پوچھیے تو ان کے دانت اس دن میں نے پہلی بار دیکھے تھے۔

علیم صاحب سے میری کیا رشتہ داری تھی مجھے معلوم نہ تھا۔ میری عمر کے نوجوان انھیں "ماموں صاحب" کہتے تھے، میں بھی کہنے لگا، یہ بھی ممکن ہے امّاں نے بتایا ہو... وہ مجھے اچھے لگتے تھے، اور میرا بھی وہ خیال کرتے۔ یعنی مجھے دیکھتے تو لگتا ان کی آنکھوں میں محبت ہے۔

واپسی پہتیا سے غازی پور تک بیل گاڑی سے ہوئی۔ ماموں صاحب کیسے آئے نہیں معلوم۔ ہم نے غازی پور میں شجاول پور کے ان کے لق و دق مکان میں شاید ایک دن قیام کیا۔ پھر ہم لکھنؤ آ گئے۔

◆◆◆

مولانا آزاد سبحانی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اورئی میں ہائی اسکول کر رہا تھا۔ ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج میں دو چار دن کی بھی چھٹی ہوتی تو میں لکھنؤ آ جاتا۔ یہاں امّاں تھیں، چھوٹا بھائی تھا، چھوٹی بہن تھی۔ یہاں پاس پاس دو گھر تھے، ایک تو ماموں جان کا، جہاں مَیں رہتا، اور دوسرا بالکل پاس ہی ماسٹر بدرالدین کا۔ یہ گھر مجھے قاضی باغ والے گھر کے مقابلے میں اچھا لگتا۔ یہاں ہنسنے بولنے کی ذرا زیادہ آزادی تھی اور پھر شہزادی باجی تھیں جو واقعی شہزادی تھیں اور ان کی شادی ہونے والی تھی، ان کی بڑی بہن زبین باجی تھیں جو انگریزی میں فرسٹ ڈویزن ایم۔ اے اور رائے بریلی کے کسی کالج میں لکچرر ہونے کے باوجود ''اس میں کچھ ریزنو (Reasanaoo) ہے'' بولتی تھیں، پڑھا کو خورشید تھی اور مہ جبین تھی، سب سے چھوٹی لیکن بلا کی شیطان اور دبلی پتلی، ہر وقت پھرکی کی طرح گھر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومتی رہنے والی ممانی تھیں جو ہر وقت مسکرایا کرتیں۔ اسی گھر میں ایک دن ایک لحیم شحیم بزرگ کو پہلی بار دیکھا۔ چہرے پر اس قدر رعب تھا کہ آنکھ ملا کے بات کرنا مشکل لگتا۔ معلوم ہوا مولانا آزاد سبحانی ہیں، وہی مولانا آزاد سبحانی جنھوں نے ان دنوں جب کلکتہ کے مسلمانوں نے مولانا آزاد کے پیچھے عید کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تھا، دو سال تک عید اور بقر عید کی نماز پڑھائی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ سے متعلق رہ چکے ہیں۔ بہت بعد میں ''اقبال جامعہ کے مصنّفین کی نظر میں'' پڑھنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک مضمون ان کا بھی تھا۔

یہ ساری باتیں تو بعد میں دھیرے دھیرے معلوم ہوئیں لیکن مولانا کو پہلی بار دیکھ کر ہی ان کی شخصیت اور علمیت کا رعب قائم ہو گیا۔ میانہ قد اور دہرے بدن کے مولانا کے سر کے بال تو چھوٹے چھوٹے تھے لیکن داڑھی انھوں نے بے تحاشہ چھوڑ رکھی تھی۔ گھر میں وہ گیروے رنگ کی تہمد باندھتے اور ڈھیلا ڈھالا سفید کرتا پہنتے لیکن کہیں جاتے تو کبھی کبھی پتلی مہری کا پاجامہ پہن لیتے۔

وہ آتے تو ماسٹر ماموں کے مکان کے زینے سے لگا ہوا اوپری کمرہ ان کے لیے وقف

ہو جاتا۔ میں نے اوپر نیچے جانے آنے کے دوران اُن کو ٹین کے ایک بکس میں سے جو کتابوں سے بھرا تھا کوئی کتاب تلاش کرتے، کچھ پڑھتے اور کچھ لکھتے بار ہا دیکھا۔

بچپن میں میری عادت بڑوں میں گھسنے کی تھی جو اس وقت بھی تھوڑی بہت باقی تھی۔ لیکن ان کے سلسلے میں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتے۔ میں نے اس کمرے میں جانے کی بھی کوشش نہیں کی، بات کرنا تو دور کی بات۔ ان کی شخصیت کا رعب ایسا تھا کہ اس سب کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن جب بھی ادھر سے گذرتا ایک نظر ان پر ضرور ڈال لیتا۔ میرا جی چاہتا ہر وقت انھیں دیکھتا رہوں، اور وہ بھی ایسے کہ انھیں معلوم نہ ہو۔

وہ چھوٹا سا باغ جس کے نام پر محلّہ قاضی باغ کہلاتا ماموں جان کے مکان سے لگا ہوا تھا اور مولانا آزاد سبحانی وہاں ہر شام ٹہلنے جاتے۔ میں بھی ان کے پیچھے لگ جاتا۔ وہ بہت تیز تیز ٹہلتے، میں پیچھے رہ جاتا اور یہ بھی ہوتا کہ کوشش کر کے ان کے ساتھ ہو جاتا۔

ان دنوں مجھ پر مذہب یعنی روزے نماز کا بہت غلبہ تھا اور مولانا کا حال یہ تھا کہ پانچوں وقت کی نماز بھی نہ پڑھتے، کبھی تو کئی کئی دن کسی وقت کی نماز پڑھتے نظر نہ آتے اور پھر پڑھنے پر آتے تو سارے سارے دن پڑھا کرتے۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کیسے مولانا ہیں، اور وہ بھی نامی گرامی، کہ پابندی سے نماز تک نہیں پڑھتے۔ حیرت یوں اور بڑھ جاتی کہ ان سے ملاقات کرنے جو طرح طرح کے لوگ آتے ان میں مولانا قسم کے لوگوں کی کثرت ہوتی۔ ملاقات کے لیے آنے والوں کی موجودگی میں بلائے بغیر کوئی کمرے میں پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہ ان سے چپکے چپکے جانے کیا باتیں کیا کرتے۔

میرا جی چاہتا کہ ان سے بات کروں لیکن کیا بات کروں یہ سمجھ میں نہ آتا۔ آخر ایک دن میں نے ایک سوال داغ ہی دیا۔ اس وقت وہ قاضی باغ میں ٹہل رہے تھے۔

میں نے پوچھا، ''آپ نماز نہیں پڑھتے؟''

''ہوں''، انھوں نے جواب دیا، تیز تیز ٹہلتے ہوئے، میری طرف دیکھے بغیر۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر پوچھا۔

''آپ نماز نہیں پڑھتے؟''

پھر وہی جواب ملا، ''ہوں''

کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس ''ہوں'' سے کیا سمجھوں۔ آخر ہمت کر کے وہی سوال

تیسری بار پوچھ لیا۔

اس بار انھوں نے میری طرف دیکھا اور جو جواب دیا وہ ''ہوں'' سے زیادہ سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ انھوں نے کہا تھا، ''مسلمان بہت لالچی ہوتا ہے۔''

عقل اب بھی کم ہے، اس وقت اور بھی کم تھی۔ یہ گتھی کسی طرح حل نہ کر سکا تو میں نے ایک بار پھر ہمت کی اور کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

اب پھر ''ہوں'' کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تیسری یا چوتھی بار میں انھوں نے کہا

''مسلمان بہت لالچی ہو گیا ہے، جنت میں بھی محل بنانا چاہتا ہے۔''

جانے کیسے یہ بات تو میری سمجھ میں آ گئی کہ انھوں نے پہلے جواب کے ''ہوتا ہے'' کو ''ہو گیا ہے'' میں بدل دیا ہے لیکن اس جواب کے معنی سمجھ میں نہیں آئے، خاص طور سے یہ کہ نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے اس کا کیا تعلق ہے لیکن برسوں بعد بہت سوں کی عبادتوں اور عملی زندگی میں ان کے پرتو کی بھی عدم موجودگی نے اس کے معنی کسی حد تک ظاہر کر دیے۔ اس معنی کی تشریح تو میرے لیے ممکن نہیں لیکن خیال ہوتا ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق مذہب کی روح کی ان دیکھی اور عبادت پر اصرار کے درمیان کی غیر ہم آہنگی سے ضرور ہے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو عبادت گذار مسلمانوں سے زیادہ مسلمان پایا ہے۔

سات آٹھ سال بعد جب میں فلسفہ میں ایم۔اے کر رہا تھا، امانوئیل کانٹ (Emanuel Kant) کورس میں تھا اور میں نے اس کی دو مشہور ترین کتابیں "A Critique of Pure Reason" اور "A Critique of Practical Reason" پڑھ ڈالی تھیں لیکن بس موٹی موٹی باتیں سمجھ میں آ سکی تھیں۔ کانٹ کے بارے میں ہیگل نے کہا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے دانت اکھاڑنا آسان ہے اور کانٹ کو سمجھنا مشکل۔ میرے دانت اس وقت بھی ہلتے تھے، زیادہ سمجھنے کی کوشش کرتا تو ممکن ہے خود بخود اکھڑ جاتے۔ اس کی Categories کو سمجھنا تو اس قدر مشکل ہے کہ خوب خوب پڑھنے اور اپنے حسابوں سمجھ لینے کے باوجود امتحان میں اس کے فلسفے سے متعلق سوال کو جواب کے لیے منتخب کرنے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔

کانٹ کا فلسفۂ اخلاقیات مقابلتاً آسان ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس کارِ نیک کو کرنے کے لیے خود سے لڑنا نہ پڑے اسے نیکی (Virtue) نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہر وہ

نیک کام جو خود سے لڑ کر کیا جائے اس کام سے بڑی نیکی ہے جو عادتاً کیا گیا ہو۔ میرا خیال ہے کہ مولانا آزاد سبحانی یہی کہنا چاہتے تھے اور شاید یہ بھی کہ جنت کی امید میں کی جانے والی عبادت سے وہ عبادت بہتر ہے جو کسی امید اور غرض کے بغیر کی جائے۔

مولانا آزاد سبحانی نے اپنے فلسفۂ ربانی پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ ان میں سے دو میری نظروں سے گذری تھیں، لیکن ان دنوں جب میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ ظاہر ہے ان کی فکر کی گہرائیوں تک پہنچنا تو دور کی بات ان کے حاشیوں سے بھی متعارف ہونا میرے لیے ممکن نہ تھا، تاہم ان کی کسی تحریر کی ایک بات یاد ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ خدا نے دنیا کے سارے انسانوں کے لیے رزق اتارا ہے۔ اس لیے اگر کوئی بھوکا سوتا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ کسی نے اس کے رزق پر ڈاکہ ڈال دیا ہے۔[1]

مولانا کے بارے میں ان دنوں ایک ''واقعہ'' مشہور تھا جو میں نے کئی لوگوں سے سنا۔ کہا جاتا تھا کہ انھیں جامعۂ ازہر میں اسلام پر پانچ خطبے دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا اور پہلے تین دن انھوں نے اپنے خطبوں میں، جو عربی میں تھے، اسلام پر مدلل انداز میں اعتراضات وارد کیے تھے۔ سامعین ششدر تھے لیکن انھیں ٹوکنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ تیسرے دن کے خطبے کے آخر میں انھوں نے کہا کہ اب تک میں نے جو باتیں کہی ہیں ان کے علاوہ اسلام کے خلاف کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا اور اگلے دونوں دن کے خطبوں میں انھوں نے ایک ایک الزام کو عقل، فکر اور فلسفہ کی روشنی میں غلط ثابت کر دیا تھا۔

یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اعتراضات کو تین دن اور ان کے جواب کو دو دن دینے میں یہ سبق پوشیدہ تھا کہ خدا نے دوسروں کا نقطۂ نظر سننے کے لیے دو کان اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے صرف ایک زبان دی ہے۔

ان دنوں تو میں نے اس واقعہ کو من وعن تسلیم کر لیا تھا لیکن بعد میں سوالات ذہن میں کلبلانے لگے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جامعۂ ازہر میں جہاں اسلامیات کے ایک سے ایک اسکالر سامعین میں موجود رہے ہوں گے کسی نے انھیں ٹوکا کیوں نہیں۔ چنانچہ اس کا ذکر میں نے

۱۔ مولانا کے چھے رسالے۔ (۱) مسلمانوں کا زوال اور اس کا علاج۔ (۲) تذکرۂ محمدیؐ (پہلا حصہ) (۳) کلمۂ طیبہ کی تشریح (۴) خدا کیا ہے؟ (۵) ربانیت کیا ہے؟ (۶) خطبات ربانی میرے پاس موجود ہیں۔

ان کے بیٹے ڈاکٹر حسن سبحانی سے، جنھیں میں حسن سبحانی خالو کہتا ہوں، کیا اور ایک سوالنامہ کی روشنی میں تصدیق چاہی۔ حسن سبحانی خالو نے اس ''واقعے'' کو بالکل بے بنیاد قرار دیا۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے مولانا کے افکار اور حیات پر ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے اور اب اسی موضوع پر ڈی لٹ کررہے ہیں۔ حسن سبحانی خالو کی عمر پچاسی سے زیادہ ہی ہوگی اور انھوں نے اپنا مقالہ تقریباً مکمل کرلیا ہے۔ ان دنوں وہ گورکھپور میں مقیم ہیں۔ فلسفۂ ربانیت کے ایک دوسرے مرکز سے بھی اس ''واقعے'' کی تردید ہوئی۔ اس کے باوجود خودنوشت میں اسے شامل کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ تحریری طور پر اس کی تردید ہوجائے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ حسنِ عقیدت کی تراشی ہوئی ایسی خوش فہمیاں وقت گذرنے کے بعد ''حقیقت'' کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ ویسے انھوں نے یورپ اور امریکا کا دورہ ضرور کیا تھا۔ ممکن ہے اس طرح کی کوئی بات وہاں پیش آئی ہو۔

(چند روز قبل ایک شادی میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی خودنوشت میں رشید کوثر فاروقی کے حوالے سے مولانا کے کئی واقعات لکھے ہیں، ان میں رشید کوثر فاروقی کی مولانا سے پہلی ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں کوثر فاروقی سے بھول ہوئی۔ وہ مولانا سے پہلی بار میرے ساتھ ملے تھے، اس وقت وہ قاضی باغ میں رہتے تھے اور کرسچین کالج میں میرے کلاس فیلو تھے۔)

مولانا آزاد سبحانی کو میں نے ۱۹۴۸ء میں اور ایک آدھ سال بعد بھی دیکھا تھا۔ ان کی شخصیت کے اطراف عظمت کا ایک ہالا تھا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ممکن نہ تھا، لیکن وہ پُراسرار بھی معلوم ہوتے تھے۔

مولانا ایک بیدار مغز مفکر اور روشن ضمیر شخص تھے۔ ان کے فلسفۂ ربانیت کے بنیادی نکات یہ ہیں۔ خدا رب ہے۔ یعنی پالن ہار۔ خدا کی پہلی صفت ہے تخلیق اور خلاقی۔ وہ ساری دنیاؤں کا خالق ہے، وہ ان کی زندگی کے وسائل و ذرائع پیدا کرتا ہے۔ وہ خالق کے ساتھ رزاق بھی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ کوئی بھوکا سوئے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ جو کچھ پیدا کرتا ہے معاشرے میں مساویانہ تقسیم کردیا جائے اور کوئی بھوکا نہ رہ جائے۔

اسلامک بینکنگ کا تصور شاید سب سے پہلے مولانا ہی نے پیش کیا تھا۔ وہ ۱۹۲۱ء میں یو پی کانگریس کے صدر تھے۔

دو ڈھائی سال قبل میں نے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں دعوا کیا گیا تھا کہ انھوں نے نیپال کے دورے کیے تھے اور برطانوی حکومت کے خلاف مسلح جدو جہد کے لیے اسلحہ حاصل کرنے کے واسطے کسی کو نیپال بھیجا بھی تھا اور یہ تو عام طور سے مشہور تھا کہ ان کا ایسے لوگوں سے رابطہ تھا جو پر تشدد طریقے سے حکومت برطانیہ سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر حسن سجانی نے اس ساری باتوں کو بھی بے بنیاد قرار دیا ہے۔ انھیں بیان کرنے کا مقصد بھی وہی ہے جس کا ذکر پہلے واقعے کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔

مولانا کو ایک بار اور دیکھا تھا لیکن اس کا کوئی نقش ذہن میں نہیں علاوہ اس کے کہ ان کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا جس کے ہلکے سے سہارے کی ان کو ضرورت ہوتی تھی۔ عمر کی الٹی گنتی تو پیدائش کے وقت ہی شروع ہو جاتی ہے لیکن اس وقت وہ زیادہ تر گنتیاں گن چکے تھے اور آخر کار ۲۳ رجون ۱۹۵۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ تاریخ بھی ڈاکٹر حسن سجانی کی فراہم کردہ ہے۔

قومی آواز سے میرے باقاعدہ طور پر متعلق ہونے کے بعد ایک دن جانے کیسے حسن سجانی خالو کا ذکر نکل آیا۔ وہ قومی آواز میں سب ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ان کا نام سنتے ہی محمد حسن قدوائی مرحوم نے کہا تھا کہ دفتر سے ترکِ تعلق کرنے کے بعد انھوں نے ایک بار بھی اپنی صورت نہیں دکھائی۔

علی گڑھ کے مکتبہ جامعہ میں وہ تقریباً ہر روز آیا جایا کرتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان سے ملاقات کرنے کی میری ہر کوشش نا کام ہوگئی۔ ۲۰۰۸ء میں معلوم ہوا کہ وہ گورکھپور چلے گئے ہیں لیکن ان کا موبائل نمبر مل گیا۔ ان سے آخری رابطہ ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ نمبر کام نہ آیا۔[1]

مجھے ان کا ایک راز معلوم ہے۔ اس راز کے دوسرے سرے پر جو خاتون تھیں ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایک بار تو جی چاہا کہ گردشِ زمانہ نے جس راز کو طاقِ نسیاں بنا دیا ہے اس کا ایک ورق ان کے سامنے کھول دوں تا کہ وہ اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس پر ایک نظر ڈالنے کی کم سے کم کوشش تو کر سکیں لیکن پھر ان کے زخموں کو کریدنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

اقبال کو تو سینۂ کائنات میں صرف ایک ہی راز کی موجودگی اور اس کے بھی فاش ہو جانے کا گریہ تھا لیکن میرا سینہ تو امانتوں اور رازوں کا خزانہ ہے جن کی نگہبانی میں نے اب تک کی ہے اور کرتا رہوں گا۔ ◆◆◆

۱۔ کل یعنی ۱۱ر فروری ۲۰۱۰ء کو معلوم ہوا کہ دسمبر میں حسن سجانی خالو کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کرسچین کالج میں داخلہ

اب لکھنؤ میں آگے کی تعلیم کا مرحلہ درپیش تھا۔ گرمی کی چھٹیوں کا ایک حصہ محی الدین پور میں گزار کر لکھنؤ واپس آنے کے بعد ایک دن ماموں زاد بھائی عارف صدیقی کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک بہت خوبصورت عمارت نظر آئی۔ عارف بھائی سے یہ معلوم ہونے پر کہ کالج ہے، عمارت کے حسن سے مسحور ہو کر وہیں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

زندگی کے اس مرحلے سے جس میں ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ ہر قول و فعل پر نظر رکھی جا رہی ہے تو ابا کے انتقال کے بعد ہی نکل چکا تھا، اب اورئی ایسے چھوٹے سے شہر سے وسیع و عریض لکھنؤ میں آمد اور قیام نے ذہنی آزادی اور سرشاری کو دوسری طرح کی تقویت بخشی اور اپنے فیصلے خود کرنے لگا۔ ویسے تھا بھی کون جس سے مشورہ کرتا۔ ماموں جان کو میونسپلٹی کی ملازمت، ریس اور اس کے کتابچے پڑھنے اور شام اودھ کا قرض چکانے سے فرصت نہ تھی، لمّاں ایک تو کوئی مشورہ دے ہی نہ سکتی تھیں، دوسرے اپنی آزادانہ زندگی کے تیاگ کے جبر اور دوسروں کی مرضی اور خواہش کو ذہن میں رکھ کر منہ کھولنے کی مجبوری نے انھیں کچھ کا کچھ بنا دیا تھا اور ماسٹر ماموں یعنی ماسٹر بدرالدین بدر کو کالج کی ملازمت، شعری نشستوں، ان کے لیے تیار ہونے میں ایڑی پر کاغذ رکھ کر چوڑی دار پاجامہ پہننے، سجنے سنورنے اور تیل پھلیل میں دو ڈھائی گھنٹے لگانے کے بعد اتنی فرصت کہاں ملتی کہ میری بات سنتے اور کوئی مشورہ دیتے۔ رہ گئے ماموں صاحب، تو ان سے میں مشورہ کرتا؟ گھر میں بزرگوں کا منہ تو ان کی خاموشی کے سامنے کھلتا نہ تھا۔

چنانچہ قلم جیب میں لگا کر سیدھا کرسچین کالج پہنچا کہ یہ فیصلہ تو پہلے ہی کر چکا تھا۔ کہیں سنا یا پڑھا تھا کہ اب کامرس کا زمانہ ہے اور بی۔ کام کرتے ہی ملازمت مل جاتی ہے، سو اسی میں داخلہ لے لیا۔

کم و بیش ڈیڑھ دو سال تک مہینے میں کم سے کم دو چار دنوں اور کبھی کبھی ایک ایک ہفتے کے قیام کے سبب ان دنوں اور ان سے ذرا پہلے کے لکھنؤ کے شعرا اور ان کے کلام سے تھوڑا بہت

واقف ہو چکا تھا۔ حسنِ اتفاق سے رشید کوثر فاروقی میرے کلاس فیلو تھے، اگر چہ وہ آرٹس میں تھے۔ ان سے دوستی ہوگئی۔ دوستی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ پاس ہی اکرام صاحب، جو بعد میں میرے شاگرد ہوئے، کے گھر کے قریب رہتے تھے۔ رشید کوثر شاعر تھے، سچ مچ کے شاعر، محض نام کے نہیں۔ ان سے خوب خوب ملاقاتیں ہونے لگیں۔ مجھے بھی شاعری کا چسکا لگ گیا اور پہلی چیز جو میں نے کہی وہ ایک نظم تھی، صرف ایک بند یاد ہے اور وہ بھی نامکمل:

وہ التفات کے اگلے چراغ کیوں ہیں بجھے
نیاز و ناز کے پہلے سے دور کیوں نہ رہے
(بھول گیا)
کہ جیسے چاند جھمکتا ہو بادلوں کے پرے
سنا دے پھر کوئی رنگین سا فسانہ دوست
مچل مچل کے ہے کشمیر عشق فریادی
بہار ہی ہے سبیلِ اشک دل کی آزادی
سنا دے پھر کوئی رنگین سا فسانہ دوست

کئی غزلیں بھی کہیں، دو چار نظمیں، غزلیں چھپیں بھی۔ ابا کے انتقال کو بہت دن نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت بھی جب یاد نہ آرہے ہوتے وہ دل کے آس پاس ہی رہتے اس لیے اپنا نام عابد ظفر ریاب لکھنے لگا۔ پہلا افسانہ ''دور آسمان کی خلاؤں میں'' دیوان سنگھ مفتوںؔ کے مشہور و بدنام ہفت روزہ ''ریاست'' کے ۱۵/اگست ۱۹۴۹ء کے خاص نمبر میں شائع ہوا۔ مجید پرویز اور برج موہن ناتھ کاچڑ سے دوستی ہو ہی چکی تھی۔ کاچڑ شاعری کرتے تھے اور مجید پرویز افسانے لکھتے۔ مجید پرویز کے افسانے ان دنوں ''ادب لطیف'' میں شائع ہوتے اور دو بار تو سرورق پر ان کا نام بھی دیکھا تھا۔ اس کے افسانوں کی ایک خوبی جو اس وقت سمجھ میں نہ آتی تھی اب خیال ہوتا ہے ان کا گٹھاؤ تھی۔ اس کے افسانوں میں کردار اور واقعات اس قدر پاس پاس ہوتے کہ منظر نامہ بھرا بھرا لگتا۔ ہر وقت کوئی کچھ کہہ رہا ہوتا یا کر رہا ہوتا۔ پچاس سال پہلے کے تاثر کو الفاظ دینا بڑا مشکل کام ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ اس کے افسانوں کی یہ ایک بڑی خوبی تھی اور شاید اسی وجہ سے اچھے لگتے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ اس کے کسی افسانے میں کہیں ڈیش (...) کا استعمال کیا گیا ہو۔

ناآزمودہ کار کی جرأت جعفر علی خاں اثر تک لے گئی اور ان سے اصلاح لینی شروع کر دی۔ اثر صاحب نے شاید یہ سوچ کر کہ شاعری میرے بس کی بات نہیں ایک دن کہا، ''میاں اب آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں۔'' اب سوچتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا ورنہ برسوں مشاعروں کا چارہ بننے کے بعد آج استاد شعرا میں شمار ہوتا، کہ یہ تمغہ شاعری کو نہیں عمر کو ملتا ہے۔

کامرس کے صدر شعبہ اگروال صاحب تھے۔ ان کے کمرے میں ایک طغریٰ لگا تھا "Service Before Self" اگرچہ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ یہ مشورہ صرف دوسروں کے لیے ہے۔

پہلا کلاس انھی کا تھا اور جب انھوں نے کہا، ''پہلے لکھ اور پیچھو دے، بھول پڑے کاغذ سے لے،'' تو یقین مانیے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کیوں کہ دینے کے لیے اپنے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ کامرس کے مضامین سے جوں جوں واقفیت ہوئی یہ احساس مضبوط ہوتا گیا کہ غلط جگہ پھنس گیا ہوں۔ لیکن اب کیا ہی کیا جا سکتا تھا۔

اماں نے کالج میں داخلہ لینے کے لیے کچھ روپے دیے تھے، معلوم نہیں کہاں سے۔ اس کے بعد اپنی پوری تعلیمی زندگی میں، علاوہ ان پچاس روپوں کے چیک کے جو ماموں صاحب کے ذریعے انھوں نے بھیجے تھے، کسی نے نہ کچھ دیا، نہ میں نے مانگا۔ لیکن یہاں ایک انکشاف بھی ضروری ہے۔

ماموں صاحب کوئی کتاب یا کتابیں چھاپنا چاہتے تھے۔ یہ بات ۱۹۵۰ء کی ہے۔ اماں کو اورئی کی کچہری یا کسی اور جگہ سے ابا کے روپے ملے تھے۔ ماموں صاحب نے شاید پانچ سو روپے ان سے لیے تھے۔ کتابوں کی اشاعت کا کام نہیں ہوا تو ماموں صاحب نے جب اماں کو ضرورت پڑی اور جب انھوں نے جتنے روپے مانگے یہ روپے دے کر ایک ایک پیسہ ادا کر دیا۔

یہ چیک اسی سلسلے کا تھا۔ انھوں نے خط میں لکھا تھا کہ کسی کے حساب میں اسے جمع کر کے یہ روپے حاصل کر لینا۔ کوئی دقت ہو تو مجھے مطلع کرنا۔ مختصر سے خط کا آخری جملہ تھا، ''امید ہے تم عائشہ (میری والدہ) کو اس سلسلے میں مطلع کر دو گے۔''

میں نے یہ چیک کتابی دنیا کے مالک اظہر نگرامی صاحب کو دے دیا تھا اور جب بھی ضرورت پڑتی دو دو چار چار کر کے روپے ان سے لے لیتا۔

اب سوچتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ممکن کیسے ہوا۔ میرے نام کا چیک اظہر صاحب

یا کتابی دنیا کے اکاونٹ میں کیسے جمع ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ہوا ایسے کہ آج کل کے بینک کے قاعدے قانون اس وقت نہیں تھے۔ بیئرر چیک تو کسی جانور کی گردن میں باندھ دیا جائے تو بھی بینک اس کی ادائیگی کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ لیکن وہ چیک علی گڑھ کے کسی بینک کا رہا ہوگا۔ پھر وہ یہاں کیش کیسے ہوا؟ اب بس ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ لکھنؤ کے کسی بینک کا ہو، ماموں صاحب کے اس اکاونٹ کا جو انھوں نے اس وقت تک بند نہ کیا ہو۔

سچی بات

اب ایک بات اور: میری رائے میں سچی بات یہی ہے۔ علیم صاحب کو نہ کتابیں چھاپنی تھیں، نہ روپوں کی ضرورت۔ انھوں نے اماں سے یہ روپے اس لیے "بطور قرض" لے لیے تھے کہ ان کے ہاتھوں کے چھیدوں سے ان رومالوں میں گرنے سے محفوظ رہیں جو نیچے پھیلے ہوئے تھے اور ضرورت کے وقت ان کے کام آئیں، جیسا کہ ہوا۔

میرے پاس چند کاپیاں تو تھیں لیکن کتاب ایک نہ تھی۔ کلاس میں، کم سے کم تھیوری کی حد تک، جو کچھ پڑھایا جاتا وہ لکھ لیتا، اگر چہ اس میں سے بھی بہت سا سر پر سے گزر جاتا، لیکن کامرس کا عملی حصہ جسے بک کیپنگ کہتے ہیں، بالکل سمجھ میں نہ آتا۔ پٹی کیش بک اور لیجر کی باتیں سر پر سے گذر جاتیں۔ اگروال صاحب کا We debit all losses and credit all gains اور We credit what comes in and debit what goes out یوں تو سمجھ میں آجاتے لیکن جب سوال حل کرنے بیٹھتا کہ کیا آ رہا ہے، کیا جا رہا ہے تو مجھے ہر چیز جاتی ہوئی لگتی یہاں گئے، اورئی کی زندگی گئی، وہاں کا مکان جس کی چھت پر سے میں چاند کو صورتیں بدلتے دیکھا کرتا، چھوڑنا پڑا۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آتا کہ کسی کا قرض ادا کیا ہے تو یہ Debit کیسے ہوگیا۔ جب کلاس میں اور گھر میں بھی کچھ سمجھ میں نہ آئے تو باہر کی دلچسپیوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ کامرس کے کلاسوں میں حاضری کم ہونے لگی لیکن انگریزی کے درجے کی یہ صورت نہ تھی۔ انگریزی چوبے صاحب پڑھاتے تو لطف آتا، اگرچہ تیسری یا چوتھی صف میں بیٹھا ہوا شاعری پڑھا کرتا۔

ایک دن چوبے صاحب نے مارٹن لوتھر کنگ کے بارے میں، جن پر ایک سبق تھا، سوال پوچھا تو انگریزی میں کوئی بتا نہ سکا، دو چار لڑکوں نے انگریزی میں جواب دینے کی کوشش کی،

لیکن ٹوٹے پھوٹے ایک آدھ جملے کے بعد بات آگے نہ بڑھی۔ میں اس دن بھی پیچھے کی کسی صف میں بیٹھا تھا۔ وہاں تک ان کی نظر کہاں جاتی لیکن جانے کیسے انھوں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے کھڑے ہوکر جواب دیا، انگریزی میں اور وہ بھی صحیح، تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے کہا تم چوتھی رو (Row) میں کیوں بیٹھتے ہو، اگلی صف میں آؤ۔ میں اٹھ کر اگلی صف میں بیٹھ گیا، اس افسوس کے ساتھ کہ یہیں تو شعر و شاعری پڑھنے کا موقع ملتا تھا وہ بھی جاتا رہا۔

میرے جواب سے چوبے صاحب خاص طور سے خوش یوں ہوئے تھے کہ مجھ سے پہلے ایک لڑکے نے کہا تھا Martin Luther is a kind of ether جس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا تھا۔

لڑکے طرح طرح کی باتیں کرتے۔ ایک لڑکے نے جو انٹر کے دوسرے سال میں تھا کہا کہ اس سال ہڑتالوں کا موسم ہمارے کالج میں جلدی شروع ہوگیا ہے۔ ابھی سے ہڑتال کی شروعات ہوگئی، ابھی تو ایڈمیشن پورے ہوئے مشکل سے مہینہ سوا مہینہ ہی ہوا ہے۔ میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔ کامرس کے کلاسوں میں دل نہ لگتا اس لیے وہاں کم ہی جاتا اور جیب میں پیسے نہ ہوں تو وقت کیسے کٹے۔ کچھ بھی کیا جائے، وقت کاٹنے کے لیے یا سچ مچ کچھ کرنے کے لیے پیسے ضروری ہوتے ہیں اور جیبیں خالی ہوں تو وقت ہی وقت ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ جب وقت بہت ہو اور کچھ کرنے کو نہ ہو تو وہ کاٹے کھاتا ہے۔ سو میں اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے لڑکوں کے ساتھ ہڑتالیں کرانے لگا۔

ہڑتال کرانے والوں میں لڑکیاں بھی تھیں، لڑکے تو تھے ہی۔ میں ان لڑکوں کو سگریٹ پیتے، ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے دیکھتا اور ان کے کپڑے جوتے بھی تو مجھے یہ نہ لگتا کہ ان کی جیبیں خالی ہوں گی۔ تب وہ اپنا وقت ہڑتالیں کرانے میں کیوں برباد کرتے ہیں؟ ہوٹل میں کیوں نہیں بیٹھتے، حضرت گنج میں شامیں کیوں نہیں گذارتے، ٹہلتے، گھومتے کیوں نہیں، میں سوچتا۔

مولوی جعفر حسن

کالج میں زیادہ تر ٹیچر کوٹ پینٹ اور ٹائی لگا کر اور کچھ صرف قمیض پینٹ پہن کر آتے لیکن تین ان سے بالکل الگ تھے۔ ان میں ایک تو تھے اگروال صاحب جو قمیض پینٹ کبھی کبھی ہی پہنتے ورنہ ہمیشہ دھوتی کرتے میں آتے۔ دو اور تھے، باقی سب سے مختلف۔ ان میں ایک ہمیشہ دھوتی کرتا پہنتے، ان کی پیشانی پر لمبا سا قشقہ کھنچا ہوتا، ان کی بڑی سی چوٹی تھی۔ دوسرے کے

چہرے پر داڑھی تھی، چھدری چھدری، چھوٹی سی۔ وہ کرتا پاجامہ اور شیروانی پہنتے۔ ان کی شیروانی کے بٹن کھلے رہتے۔ وہ دونوں جب ساتھ ساتھ چلتے تو ایسا لگتا کہ ساتھ ساتھ چلنے کے بہانے ایک دوسرے سے الگ الگ چل رہے ہوں، اس طرح کہ ایک کا کپڑا دوسرے کے کپڑے کو چھونے نہ پائے۔ یہ تو دیکھا، لیکن سنا یہ کہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے وقت ہاتھ ملانے کے بعد فیئر فیلڈ ہال کے پیچھے والے نل سے ایک دوسرے کی موجودگی میں ہاتھ دھوتے ہیں۔ ان کو ہاتھ دھوتے تو نہیں دیکھا لیکن ساتھ ساتھ فیئر فیلڈ کے ہال کے پیچھے جاتے اور الگ الگ وہاں سے آتے ضرور دیکھا۔ جب تک یہ بات معلوم نہ ہوئی تھی، ان دونوں کو ادھر جاتے اور پھر کھیل کے میدان کی طرف کے دالان سے الگ الگ واپس آتے دیکھ کر تھوڑی سی حیرت ہوتی۔

قاضی باغ سے کالج جانے کے لیے راجہ بازار کے چوراہے سے گلی گلی ہو کر وہاں نکلتا جہاں سے رکاب گنج سے میڈیکل کالج جانے والی سڑک بیچ سے جبلی کالج کی طرف مڑ جاتی ہے۔ پھر اسی راستے پر چل کر ریل کے چھتے کے نیچے سے کبھی وزیر گنج ہوتے ہوئے اور کبھی رفاہ عام کلب کے سامنے سے کالج چلا جاتا۔ ایک دن جانے کیوں راجہ بازار کے اس راستے سے جس کی چھوٹی سی چڑھائی کے دونوں طرف بتاشوں کی دوکانیں تھیں، میڈیکل کالج والی سڑک پر جا نکلا۔ سڑک کی دوسری جانب چھوٹی سی پولیس چوکی تھی، جس کے باہر کے چبوترے پر پیپل کے درخت کے نیچے ایک بڑھیا کیتھے، امرود، املی، کمرخ اور جاڑوں میں مونگ پھلی بیچتی تھی۔ ایک بار دو پیسے کی مونگ پھلی میں نے بھی خریدی تھی۔ درخت کی جڑوں کے پاس دو چار گول گول پتھر رکھے ہوئے تھے۔ اب تو وہاں کم سے کم چھوٹا سا مندر ضرور ہی بن گیا ہوگا۔ اس سڑک پر آگے بڑھا تو چھتے سے پہلے جبلی کالج کی پشت کی موٹی سی دیوار کے پاس سڑک کے کنارے کنارے مولوی صاحب کو سر جھکائے جاتے ہوئے دیکھا۔ خیال ہوا کہ ممکن ہے یہیں کہیں رہتے ہوں گے، چنانچہ واپسی میں پیچھا کیا تو اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ وہ اخگر صاحب کے مکان کے دوسری جانب ایک گلی میں جو ذرا اونچائی پر تھی، مڑ گئے۔ (اس وقت مَیں اخگر صاحب کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ بعد میں یونیورسٹی میں ان کے بیٹے افضال سے دوستی ہوئی اور ان کے یہاں آنا جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کے والد وکالت کرتے ہیں اور شاعر بھی ہیں)۔

دھیرے دھیرے مولوی صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں، جو دلچسپ اور بعض تو حیرت انگیز تھیں۔ مولوی صاحب کے بارے میں کہا جاتا کہ اپنی ساری ملازمت میں انھوں نے اتفاقیہ رخصت نہیں لی اور علالت کے سبب چھٹی لینے پر مجبور ہو جاتے تو ان دنوں کی

تنخواہ قبول نہ کرتے۔ یہی حال گرمیوں کی چھٹی کا ہوتا، موسم سرما کی چھٹیوں کا بھی۔ دیکھا تو نہیں لیکن سنا ضرور تھا کہ پرنسپل صاحب کے آفس کے باہر دائیں جانب کے کمرے کے لوہے کے جنگلے میں، جہاں اساتذہ کو تنخواہ ملتی اور لڑکوں کی فیس بھی جمع کی جاتی، وہ اپنا رومال بچھا دیتے اور خزانچی اس میں روپے رکھنے کے بعد اس کے چاروں کونے باندھ کر ان کی طرف بڑھا دیتا۔

مولوی جعفر حسن اثنا عشری فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور بے حد مذہبی تھے۔ تنخواہ میں سے کچھ روپئے ہر مہینے کربلائے معلیٰ کی زیارت کے لیے الگ کر دیتے، بہت تھوڑے سے اپنے اخراجات کے لیے رکھ لیتے اور باقی روپوں سے غریب طلبہ کی مدد کیا کرتے۔ کہا جاتا تھا کہ مستحق طلبہ کا انتخاب وہ خود کرتے اور اس میں یہ نہ دیکھتے کہ کون سنّی ہے اور کون شیعہ۔ انھوں نے ایک بکری پال رکھی تھی جس کے لیے پتے توڑنے کے لیے لگھالے کر شام کو جاتے، اپنا کھانا خود پکاتے، جھاڑو بہارو بھی خود ہی کرتے رہے ہوں گے کیوں کہ ان کے یہاں کوئی ملازم نہ تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ وہ گھر میں تالا نہیں لگاتے ہیں اور صرف زنجیر چڑھا کر کالج چلے جاتے ہیں۔

ان کے بارے میں ایک واقعہ مشہور تھا جو تفصیلات میں کسی قدر فرق کے ساتھ کئی دوستوں سے سنا۔ لوگ کہتے کہ وہ تنخواہ کا رومال بائیں ہاتھ میں لٹکائے وزیر گنج کی ڈھال پر سر جھکائے چلے جا رہے تھے کہ کہ چیل نے یہ سمجھ کر کہ اس میں کھانے پینے کا کچھ سامان ہوگا جھپٹا مارا اور رومال لے کر غائب ہوگئی۔ انھوں نے آنکھ اٹھا کے دیکھا بھی نہیں۔ گھر جا کر شیروانی کھونٹی پر ٹانگی، کچھ کھایا پی کر تھوری دیر آرام کیا اور ایک ہاتھ میں بکری کی رسّی تھامے اور دوسرے ہاتھ میں لگھالے کر شاہ مینا روڈ کی جانب روانہ ہوگئے۔ ان دنوں یہ سڑک ویران پڑی رہتی اور بائیں جانب ڈاکٹروں کے چند بنگلوں کے علاوہ کوئی مکان بھی نہ تھا۔ انھوں نے لگھے سے جس کے اوپر ہنسیا لگی تھی ایک شاخ کو جھٹکا دیا تو شاخ کے ساتھ رومال بھی زمین پر آن گرا۔ اس کے چاروں کونے بندھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے رومال یا روپے چیل کے کس کام کے تھے! اس روایت کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں کچھ کہنا میرے لیے ممکن نہیں۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے کہ اس واقعے پر پائنیر میں ایک توصیفی کارٹون بھی چھپا تھا۔

ملٹری ٹریننگ

پاکستان سے پہلی لڑائی آزادی کے چند مہینے بعد ہی کشمیر پر قبائلیوں کے حملے کی

صورت میں شروع ہوگئی۔ لڑائی تو اقوام متحدہ نے لائن آف کنٹرول پر ختم کرادی لیکن یہ طے ہوگیا کہ ملک کی تقسیم ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑنے کے لیے ہوئی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے سارے کالجوں میں ملٹری ٹریننگ لازمی کردی گئی۔ کرسچین کالج میں یہ ٹریننگ فیئر فیلڈ ہال کی پشت کے کھیل کے میدان میں ہوتی اور نقلی بندوقیں اس وقت کے چیپل یعنی فیئر فیلڈ ہال کے سامنے کے زینوں کے نیچے کی کوٹھریوں میں رکھی جاتیں۔ اس ملٹری ٹریننگ کی حیثیت مذاق سے زیادہ نہ تھی۔ یہ ٹریننگ راٹھور صاحب کراتے اور کوٹھری سے بندوقیں وغیرہ نکالنے کے لیے ایک چپراسی ان کا معاون ہوتا۔ لیکن انٹرمیڈیٹ کے سال اوّل اور سال دوم کے طلبہ کی نگرانی اور انھیں ٹریننگ دینا ایک شخص کے بس کی بات نہ تھی، چنانچہ حاضری لینے کے دوران ہی لڑکے کھسکنا شروع کردیتے۔ ایک دن میں اور رشید کوثر فاروقی زینے سے ہوتے ہوئے کھسک تو لیے لیکن اوپر کے اس وقت کے بند کلاسوں کے سامنے سے کھڑے کھڑے دوسرے زینے تک نہیں جاسکتے تھے کیوں کہ کسی کی بھی نظر پڑسکتی تھی۔ ہم دونوں گھٹنوں کے بل راستہ طے کرنے لگے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پرنسپل ہینس سامنے سے چلے آرہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی ہم دونوں کھڑے ہوگئے اور وہ جیسے ہی ہمارے پاس سے گزرے میں نے ان کے پوچھے بغیر کہا "Sir, I am suffering from fever and cannot do military training" تو وہ مسکرائے اور "Good treatment" کہتے ہوئے چلے گئے۔

مسٹر ہینس کالج کے آخری انگریز پرنسپل تھے۔ ان کے بعد ٹھیکور صاحب پرنسپل ہوئے اور کالج سے سبکدوش ہوئے تو امریکی لائبریری کے ڈائرکٹر ہوگئے۔ یہ لائبریری اس عمارت میں تھی جس میں اب فیملی کورٹ (Family Court) ہے، ویسے اس کا بہتر حوالہ تو پنڈت آنند نرائن ملاّ کا مکان ہوتا جو اس عمارت کی دوسری جانب سڑک کے اس پار تھا لیکن لکھنؤ اور اس کی زندگی کا منظر نامہ کچھ اس طرح بدل رہا ہے کہ ممکن ہے زیادہ تر لوگ پوچھیں یہ ملاّ صاحب کون تھے۔ اب ان کا مکان، جس کے سامنے خوبصورت لان تھا، ڈھاکر وہاں ایک کئی منزلہ تجارتی کامپلکس بنا دیا گیا ہے اور یہ تو شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ ان کے والد پنڈت جگت نرائن بلرام پور اسپتال کے پاس گوئن روڈ چوراہے پر ریڈ گیٹ نام کی عمارت میں رہتے تھے۔ پنڈت آنند نرائن ملاّ کی بیٹی چترا ملاّ اپنے زمانے میں لکھنؤ کی سب سے حسین لڑکی تھی۔

ملاّ صاحب کا ذکر نکل آیا ہے تو ان کے بارے میں دو چار باتیں اور کیوں نہ بتا دی

جائیں کہ ممکن ہے بیس پچیس سال بعد یا شاید اس سے بھی پہلے وہ اور ان کی باتیں لوگوں کے حافظے سے بالکل ہی غائب ہو جائیں۔ یہ ملاّ صاحب وہی ہیں جنھوں نے اردو متحدہ محاذ کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا، ''میں اپنا مذہب بدل سکتا ہوں لیکن اپنی زبان نہیں بدل سکتا۔'' ان کی دوسری پہچان وہ فیصلہ تھا جس میں انھوں نے ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے یو پی پولیس کو مجرموں کا سب سے بڑا منظم گروہ قرار دیا تھا۔ ان کی ایک پہچان یہ بھی تھی کہ انھوں نے شہر کے سب سے بڑے صنعت کار اور کانگریس کے امیدوار وی۔ آر۔ موہن کو بطور آزاد امیدوار لوک سبھا کے انتخابات میں شکست دی تھی۔ یہ بات بھی گرہ میں باندھ لینے کی ہے کہ نیشنل ہیرالڈ نے، جو تقریباً کانگریس کا اخبار تھا، کھل کر آنند نرائن ملاّ کی حمایت کی تھی اور کانگریس کا پورے صفحے کا اشتہار جس میں وی۔ آر۔ موہن کو ووٹ دینے کی اپیل کی گئی تھی شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ زمانہ اقدار کے لیے جان جوکھم میں ڈالنے کا تھا، آج کی عافیت کوشی کا نہیں۔ ان دنوں دستار عزیز تھی، اب سر عزیز ہیں۔

امریکی لائبریری میں اپٹن سینکلیئر (Upton Sinclair) کے کئی ناول تھے۔ ان دنوں، (یہ شاید ۱۹۵۳ یا ۱۹۵۴ء) کی بات ہے امریکا میں میکارتھی ازم کا بول بالا تھا اور اس ملک میں کسی کو قابلِ گردن زدنی قرار دینے کے لیے اسے کمیونسٹ یا کمیونسٹوں کا حامی کہہ دینا کافی تھا۔ کمیونسٹ دشمنی امریکا میں اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ کسی کتاب پر بھی جس میں انسانی حقوق کی جانب صرف معمولی سا اشارہ ہو پابندی لگائی جاسکتی تھی۔ سیکڑوں کتابوں کی لاکھوں لاکھ جلدیں امریکا میں نذر آتش کر دی گئی تھیں۔ میں امریکی لائبریری کبھی کبھی جاتا، اگرچہ اسی سبب سرخا سرخ کامریڈوں کی نظر میں مشکوک بھی ہو گیا تھا۔ ایک دن میں گیا تو وہاں کتابیں جلائی جا رہی تھیں اور نذر آتش کی جانے کی منتظر کتابوں میں اپٹن سنکلیئر کا ایک ناول بھی تھا۔ میں نے ٹھیکور صاحب سے درخواست کی کہ یہ ناول مجھے دے دیجیے تو انھوں نے شاید کرسچین کالج کے رشتے کے سبب کتاب تو مجھے دے دی لیکن اس پر سے امریکی لائبریری کی چھپی پھاڑ لی۔ کرسچین کالج سے میرے تعلق کے علاوہ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں کمیونسٹ ہوں لیکن شاید مطالعے کے شوق کے پیش نظر ہی فیصلہ میرے حق میں ہوا تھا۔

آزادی کے فوراً بعد ہندی کا بہت زور ہو گیا تھا، ہندی کا نہیں ایک مصنوعی زبان کا جو کسی کی سمجھ میں نہ آتی۔ حد یہ ہے کہ لوگوں نے ریڈیو سے ہندی خبروں کا بلیٹن سننا چھوڑ دیا تھا۔ ملٹری

ٹریننگ کے دوران احکامات بھی ہندی ہی میں دیے جاتے، علاوہ ان احکامات کے جن کی ہندی اس وقت تک نہیں بن سکی تھی۔ فوجی احکامات کی ہندی اصطلاحات سمجھ میں نہ آتیں۔ اس کے علاوہ دوسرے بیشتر طلبہ کی طرح مجھے بھی ملٹری ٹریننگ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں بندوق پکڑے کھڑا رہتا۔ ایک دن راٹھور صاحب کی نظر پڑ گئی۔ انھوں نے ڈانٹا تو میں اٹین شن (Attention) پوزیشن میں ہوگیا لیکن تھوڑی دیر بعد پھر وہی پرانی صورت ہوگئی۔ انھوں نے پھر ڈانٹا اور میں پھر اٹین شن ہوگیا۔ لیکن تیسری بار معاملے نے سنگین رخ اختیار کرلیا اور مسٹر راٹھور نے مجھے ڈھیلے ڈھالے انداز میں دیکھا تو ڈانٹ کر کہا:

"Abid, can't you do military training properly? If you do not want to do military training, why don't you go to your bloody Pakistan"

اسٹوڈینٹس فیڈریشن سے میری قربت شروع ہوچکی تھی، اس کے علاوہ پاکستان سے مجھے کبھی دلچسپی نہ تھی۔ سر سے پیر تک آگ ہی تو لگ گئی اور میں نے اسی قدر زوردار آواز میں کہا، "Why don't you go to your bloody England?" یہ سنتے ہی راٹھور صاحب غصّے سے کانپنے لگے اور انھوں نے نہایت سخت لہجے میں کہا، "Fatigue, four rounds of the field, full four rounds"

میں اسی طرح کھڑا رہا۔ انھوں نے غصہ سے میری طرف دیکھ کے کہا۔

"Ten rounds of the field"

میں نے نہ صرف یہ کہ ان کا حکم نہیں مانا بلکہ اسی طرح ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑے کھڑے جواب دیا "One thousand rounds of the field, but I am not going to take even one."

مسٹر راٹھور نے پھر ڈانٹ لگائی تو میں نے بندوق ہاتھ سے چھوڑ دی اور وہ دھپ سے زمین پر گر گئی۔ بندوق کی بے حرمتی فوج میں بہت بڑا جرم مانی جاتی ہے اور ظاہر ہے اس کی سزا بھی سخت ہوتی لیکن مسٹر راٹھور کو میرا جملہ "Why don't you go to your bloody England?" زیادہ برا لگا تھا اور انھوں نے پرنسپل صاحب سے شکایت کی بنیاد اسی جملے کو بنایا۔ اسی دن مجھے مسٹر ہینس نے دفتر میں طلب کر کے مسٹر راٹھور سے معافی مانگنے کے لیے کہا۔ میں نے کہا کہ بلڈی پاکستان جانے کا مشورہ پہلے مسٹر راٹھور نے دیا تھا، اس لیے معافی میں پہل انھیں کرنی چاہیے۔

ملٹری ٹریننگ میں ڈھیل ڈھال اور حکم عدولی کا معاملہ پس پشت چلا گیا۔

مسٹر احمد سے، جو صرف لائبریرین ہونے کے باوجود کالج کے معاملات میں بہت دخیل تھے، میں پہلے سے واقف تھا۔ میں نے ان کو اور دو تین دوسرے اساتذہ کو ساری بات بتا دی، کسی قسم کی ڈنڈی مارے بغیر، ایک ایک بات بالکل سچ سچ۔ ٹریننگ میں ڈھیل برتنے اور بندوق پھینک دینے کے لیے مسٹر احمد نے مجھے ڈانٹا بھی لیکن why don't you go to your bloody Pakistan انھیں بھی بہت برا لگا۔ دو چار ٹیچرس میرے حامی تھے، ان میں مسٹر چافن بھی تھے۔ وہ مجھے جانتے تھے کیوں کہ ان کی بیوی جو کشمیری محلہ گرلس اسکول میں پرنسپل یا وائس پرنسپل تھیں میری رشتے کی ایک بہن کی آئی۔ ٹی۔ کالج میں کلاس فیلو رہ چکی تھیں اور دونوں، یعنی میاں بیوی، ہمارے گھر آتے تھے۔ لیکن اپا سوامی اور مسٹر پرمار کے علاوہ جنھیں ہم لوگ پین مار کہتے کہ وہ قلم لے کر مانگے بغیر واپس نہ کرتے، سارے ٹیچرس مسٹر راٹھور کے ساتھ تھے اور معاملہ کسی طرح سلجھ نہیں پا رہا تھا۔ اسی دوران اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے پچیس تیس طلبہ نے پرنسپل صاحب کے دفتر کے سامنے جو باہر کے پھاٹک کے بالکل پاس تھا میری حمایت میں مظاہرہ بھی کیا۔ اب معاملہ سنگین ہو گیا۔ انھی دنوں مسٹر ہینس کو پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری ملنے والی تھی اور وہ یہ سوچ کر خاصے پریشان تھے کہ اسٹوڈینٹس فیڈریشن والے یونیورسٹی کے کنووکیشن میں کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کر دیں۔

وزیر گنج کی ڈھال جس جگہ شروع ہوتی وہیں بائیں ہاتھ پر چائے کا ایک ہوٹل تھا جو مولانا کا ہوٹل کہلاتا۔ یہ ہوٹل خاصا کشادہ تھا۔ دو کمروں میں دو دو لمبی میزیں اور ان کے دونوں طرف بنچیں پڑی تھیں۔ ایک مقابلتاً چھوٹے کمرے میں دو چار کرسیاں اور ایک قاعدے کی میز رکھی تھی۔ یہ کمرہ کالج کے ٹیچرس کے لیے تھا کیوں کہ اکثر یہ ہوتا کہ مولانا کے یہاں کام کرنے والے لڑکوں میں کوئی گول ہو جاتا تو چائے پینے کے لیے اساتذہ کو یہاں آنا پڑتا۔ اساتذہ نہ ہوتے تو دبنگ لڑکے اس کمرے پر قبضہ کر لیتے لیکن جیسے ہی کوئی ٹیچر آ جاتا اسے خالی بھی کر دیتے۔

ایک دن اس حصے میں صرف میں ہی بیٹھا تھا، باقی دونوں کمروں میں کوئی جگہ نہ تھی۔ اتنے میں مسٹر راٹھور آ گئے۔ میں اٹھنے لگا تو انھوں نے بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا "Abid, why don't you understand that both of us belong to the minority community?" مجھے ان کی یہ بات بہت بری لگی اور میں نے فوراً اس قدر سخت بات کہہ دی جو

مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ میں نے کہا، "Sir, you are again talking nonsense."
انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں باہر چلا آیا۔

دو چار دن بعد پرنسپل صاحب نے مجھے بلایا اور کہا،" مسٹر راٹھور تمھارے استاد ہیں، انھیں ڈانٹنے کا حق ہے، تم ان سے معافی کیوں نہیں مانگ لیتے؟" یہ بات انھوں نے انگریزی میں کہی تھی۔

اس دن میں مصالحتی موڈ میں تھا اور تین دن قبل کے اپنے برتاؤ پر شرمندہ بھی۔ لیکن وہاں راٹھور صاحب بھی موجود تھے اور انھیں دیکھتے ہی میرے غصّے کا پارہ پھر چڑھ گیا۔ چنانچہ میں اپنے مطالبے پر اڑا رہا۔ اس کے بعد ہینس صاحب نے راٹھور صاحب سے کہا کہ آپ اپنے شاگرد کی غلطی معاف کر کے" ساری" (Sorry) کہہ دیجیے۔ یہ سنتے ہی مسٹر راٹھور کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور انھوں نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا تو مسٹر ہینس نے کہا، "This is the apology letter you want."

میں نے لفافہ پھاڑ کے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور یہ کہا،" غلطی آپ کے شاگرد کی تھی، آپ نے Fatigue کی سزا دینے کے بجائے مجھے مارا کیوں نہیں"؟

راٹھور صاحب نے مجھے چمٹا لیا۔ اس وقت ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس واقعہ کی خبر ذرا کی ذرا میں کالج میں پھیل گئی اور ایک ہی دن میں کالج کے سارے ٹیچر اور اسٹوڈینٹس مجھ سے واقف ہو گئے اور میں چند دنوں کے لیے ہی سہی کالج کا ہیرو بن گیا۔

یہ رویہ ساری زندگی رہا، کبھی کسی کو سبک نہیں کیا اور کبھی غلطی سے کوئی ایسی بات ہو گئی تو فوراً معافی مانگ لی۔ معلوم نہیں وہ لوگ کتنے احمق ہیں جو اپنی غلطیوں اور عیاریوں پر صرف ایک بار اشارۃً اور کنایۃً ہی اظہارِ افسوس کر کے ساری زندگی کی سرخ روئی نہیں حاصل کر لیتے۔

ان دنوں اسٹوڈینٹس فیڈریشن ہی طلبہ کی واحد سرگرم اور فعال انجمن تھی اور ہڑتال کرنے اور کرانے کے بہانے ڈھونڈا کرتی۔ چنانچہ ہر تیسرے چوتھے دن کالج کے گیٹ پر دھرنے دیے جاتے اور خوب خوب نعرے بازی ہوتی۔ اس وقت کھدرا کے شیعہ کالج کے علاوہ سارے کالجوں میں اسٹوڈینٹس فیڈریشن کا دبدبہ تھا۔ مطالبات کسی کالج کے طلبہ کے ہوں ان کی گونج ہر کالج میں سنائی دیتی۔ میں نے خود کو طلبہ کی احتجاجی سرگرمیوں میں غرق کر دیا تھا۔ کامرس میں دل نہ لگنے کی وجہ سے کلاس میں تو کم ہی جاتا پھر بھی معلوم نہیں کیسے پہلے سال کا امتحان پاس

کرلیا۔ فیس کئی مہینوں کی نہ دینے اور حاضری کم ہونے کا نوٹس کئی بار بورڈ پر لگایا گیا لیکن امتحان دینے کی اجازت مل گئی اور پاس میں یوں ہوگیا کہ پہلے سال کے امتحان میں شاید تھیوری کا حصہ زیادہ تھا اور تھیوری تو میں خوب بگھار لیتا ہوں۔

ایک اور ٹیوشن

دوسرے سال مجھے ایک اور ٹیوشن مل گیا۔ رکاب گنج سے میڈیکل کالج جانے والی سڑک پر مولوی انوار کے باغ والی گلی سے قبل ایک گلی کے دوسرے یا شاید پہلے ہی مکان میں ایک وکیل صاحب رہتے تھے۔ ان کا بیٹا انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا اور پہلے ہی سال میں انگریزی میں فیل ہوگیا تھا۔ مجھے اسے انگریزی پڑھانی تھی۔ چھماہی امتحان میں وہ انگریزی میں نہ صرف پاس ہوا تھا بلکہ اس کے نمبر بہت اچھے آئے تھے اور اس کے والد مجھ سے بہت خوش تھے۔

اس سال ہڑتالوں کا موسم شاید پورے سال رہا۔ ایک بار ماحول بہت گرمایا اور طے یہ ہوا کہ امین آباد، لال باغ اور لاٹوش روڈ کے کالجوں کے طلبہ پہلے کرسچین کالج میں اکٹھا ہوں اور پھر یہاں سے بڑے امام باڑے کے پاس حسین آباد کالج چلیں، جہاں ایک بڑا معرکہ سر کرنا تھا۔

اتفاق سے وہ لڑکا بھی جسے میں انگریزی پڑھاتا تھا کسی کالج کے جلوس میں آیا اور اس نے مجھے اور چند دوسرے طلبہ کے ساتھ دوسروں کو کالج میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے گیٹ پر دھرنا دیتے یا لمبے لمبے لیٹے ہوئے دیکھا اور گھر جا کر اپنے والد سے کہا کہ ماسٹر صاحب خود انٹرمیڈیٹ میں پڑھتے ہیں۔

اگلے دن اس کے والد نے مجھ سے پوچھا کہ ماسٹر صاحب آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے۔ میں نے کہا انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا ہوں۔ انھوں نے کہا آپ نے یہ بات بتائی کیوں نہیں، میں نے کہا آپ نے پوچھی ہی نہیں۔

یہ ٹیوشن دس روپے کا تھا اور اس وقت یہ دس روپے ایک باریک ڈوری سے لٹک رہے تھے۔ ایک خیال ہوتا کہ پڑھا کے جانے لگوں گا تو حساب کردیا جائے گا۔ دوسرا کہتا کہ ششماہی امتحان میں انگریزی میں اس کے اچھے نمبر یہ ڈور ٹوٹنے نہ دیں گے اور ہوا بھی یہی۔

بعد میں میرے اس طالب علم نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ میں نے پچیس تیس سال قبل اسے کالے کوٹ میں کئی بار دیکھا لیکن یہ صفحات لکھنے کے دوران ایک بار اس کی تلاش میں گیا

توجس جگہ چھوٹا سا مکان تھا وہاں اب دو منزلہ مکان بنا ہوا ملا۔ اور آس پاس کوئی ایسا نظر نہ آیا جس سے دریافت کرتا، پھر اس کا نام بھی تو یاد نہیں تھا۔ چنانچہ چلا آیا۔

اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے جلسے جلوسوں میں شرکت اور کچھ کامرس سے عدم دلچسپی کے سبب کلاس سے رشتہ بس برائے نام ہی تھا۔ لیکن چونکہ لیڈر قسم کا ہوگیا تھا اس لیے کبھی کبھی کوئی پراکسی (Proxy) بول دیتا۔ ایک دن کسی نے بتایا کہ نوٹس بورڈ پر ایک فہرست میں تمھارا نام بھی ہے۔ میں نے جا کے فہرست دیکھی تو معلوم ہوا کہ کلاس میں حاضری کم ہونے کی وجہ سے جن لڑکوں کے نام امتحان کے لیے یوپی بورڈ نہیں بھیجے جا رہے ہیں ان میں میرا نام بھی ہے۔ پاس ہی ایک اور نوٹس لگا تھا۔ یہ نوٹس فیس کی عدم ادائیگی کے بارے میں تھا اور اس میں بھی میرا نام موجود تھا۔ پہلی فہرست دیکھ کر ایک طرح کی خوشی بھی ہوئی کہ اب حاضری کم ہونے کی وجہ سے فیس کے لیے پریشان ہونے سے نجات ملی۔

اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ کے سبب طلبہ کی سیاست (Student politics) سے متعلق میری سرگرمیوں نے باقاعدہ سیاسی رنگ اختیار کرلیا۔

کرسچین کالج کے سامنے پان کی دوکان کے پاس ایک لمبا گورا لڑکا تقریباً ہر وقت نظر آتا۔ اس کی خاص ادا یہ تھی کہ ایک ٹانگ سے ٹیک لگا کر گھنٹوں سائکل پر بیٹھا رہتا۔ ایسا لگتا کہ پاس پڑوس میں وہ کافی مقبول ہے کیوں کہ کوئی نہ کوئی طالب علم تقریباً ہر وقت اس کے آس پاس موجود ہوتا۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ وہ کالج میں پڑھتا تھا یا نہیں لیکن جانے کیسے میری اس سے دوستی ہوگئی۔ اس کا نام شنکر سریواستوا تھا اور ہر شخص اسے شنکر، شنکر کہتا۔ اس کی ایک آنکھ خراب تھی اور وہ ہر وقت کالا چشمہ لگائے رہتا۔ لیکن صاف کرنے کے لیے جب بھی چشمہ اتارتا تو ایک آنکھ کی پتلی میں بڑی سی سفیدی نظر آجاتی۔ ان لوگوں کو جن کی آنکھوں میں یہ عیب ہوتا ہے میں نے ہمیشہ شرمندہ شرمندہ دیکھا ہے لیکن پربھو شنکر کے چہرے پر اس طرح کا کوئی اثر نظر نہ آتا اور نہ میں نے کبھی کسی کو اسے چڑاتے ہوئے دیکھا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا، "تم اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے کاموں میں دن بھر لگے رہتے ہو، کبھی اس کے دفتر بھی گئے؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا تو اس نے کہا، "ذرا جا کے دیکھو، بہت خوبصورت لڑکیاں وہاں ملیں گی"۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت وہ پان کی دوکان کے تقریباً سامنے ایک پیڑ سے ٹیک لگائے سائکل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد میری طرف دیکھا اور پھر سائکل کے کیری ار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''چلنا ہو تو بیٹھ جاؤ''۔

اور میں کیری ار پر بیٹھ گیا۔

مہدی بلڈنگ

قیصر باغ کی مہدی بلڈنگ کے زینے چڑھنے کی یہ تھی اصل وجہ۔ اس وقت اس عمارت کی اوپری منزل پر شاید ضلع کمیونسٹ پارٹی کا دفتر تھا لیکن دروازے پر بورڈ نہیں لگا تھا۔ وہاں لڑکیاں تو تھیں اور ان میں دو تین خاصی خوبصورت بھی لیکن ان میں سے کسی کو جنس مخالف کے لیے مرکز کشش ہونے کا احساس تک نہ تھا۔ خدیجہ، رشیدہ، جگت بجیا، ریکھا اور مس سکینہ کے نام یاد آرہے ہیں۔ ایک تو بہت ہی خوبصورت تھی لیکن اس کی اس طرح کی تصویر ذہن میں نہ اس وقت ابھری نہ اب موجود ہے جو لڑکا بنام لڑکی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ پہلے دن کی میٹنگ کے دوران جب تقریریں ہو رہی تھیں یا باتیں، کنکھیوں سے کسی کو دیکھا ہو لیکن سردار جعفری کی نظم ''پتھروں کی دیواریں'' کے چند بند اور کمیونسٹ انٹرنیشنل:

تعمیریں ہیں، خیراتیں ہیں

اور تیرتھ حج بھی ہوتے ہیں

یوں خون کے دھبّے دَھن والے

دامن سے اپنے دھوتے ہیں

کیوں دان کے ٹکڑے کھائیں ہم

سارا سنسار ہمارا ہے

سارا سنسار ہمارا ہے

سارا سنسار ہمارا ہے

کے بعد وہاں نہ کوئی مرد تھا نہ عورت، نہ کوئی لڑکی رہ گئی تھی نہ لڑکا... سب ایک عظیم جدو جہد کا حصہ بن گئے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک مقصد پایا اور پھر ایک ایسے راستے پر چل نکلا

جو ساری زندگی ساتھ رہا ہے۔ دنیاوی فوائد کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بہت کچھ کھویا لیکن اس نے جو دیا وہ انمول ہے۔ یہاں آ کر ہی فکر کا وہ پہلو دل ودماغ پر روشن ہوا جس نے دوسروں کے دکھ درد اور محرومیوں کو سمجھنا، اپنے بس بھر ان کے لیے کچھ کرنا، ان کے غموں میں شامل ہونا اور ان سے ہمدردی اور جان سوزی سکھائی؛ غیر ضروری دولت کی جانب حقارت کا رویہ بھی جس سے زندگی کے کڑے کوس آسان ہو گئے، اسی نظریے کی دین ہے۔

اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے کاموں میں میرے جوش وخروش اور بے تکان کام کو دیکھ کر مجھے ریل روڈ ورکرس یونین سے وابستہ کر دیا گیا۔ یہ زمانہ کمیونسٹ پارٹی میں انتہاپسندی کا تھا۔ پارٹی کے جنرل سکریٹری بی۔ ٹی۔ رندیوے تھے اور ان کا اور ان کی قیادت میں ساری پارٹی کا خیال تھا کہ ملک کے عوام اس ''جھوٹی آزادی'' اور کامن ویلتھ میں ہندوستان کی شرکت سے اس قدر ناراض ہیں کہ انقلاب کے لیے لال جھنڈے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے میرا بھی یہی خیال تھا۔

شاید ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ ۱۵ راگست کی شام میں بشیشر ناتھ روڈ پر پی پلس بک ہاؤس پر کھڑا رکشوں اور تانگوں پر اور لوگوں، خاص طور سے بچوں کے ہاتھوں میں، ترنگا جھنڈا دیکھ کر ان کی بے وقوفی اور جہالت پر دل ہی دل میں کھول رہا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے اعلان کے باوجود کہ ملک کو سچی آزادی نہیں ملی ہے یہ لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ میں نے احمد مسعود سے جو پی پلس بک ہاؤس کے منیجر تھے، کہا، ''آج سڑکوں پر خاصی بھیڑ بھاڑ لگتی ہے'' تو انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ ''اتنی بھیڑ تو کامریڈ روز ہی ہوتی ہے، رہے جھنڈے تو بچوں کو کھلونے نہ دلائے، جھنڈے دلا دیے۔ یہ سستے بھی ہوتے ہیں۔''

کبھی کبھی ہم وہ نہیں دیکھتے جو ہے بلکہ وہ دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔

مسعود کی بات میں نے مان لی۔

آج اپنی آنکھوں کو جھٹلانے پر ہنسی آتی ہے۔ ذرا سوچیے تو، کبھی کبھی نظریہ اور اس کی غلط تاویل بھی بصارت اور معروضی حقیقت تک کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔

ریلوے مینس فیڈریشن میں جس کی قیادت جے پرکاش نرائن کے ہاتھوں میں تھی، ہڑتال کے سوال پر پھوٹ پڑ گئی تو کمیونسٹوں اور ان کے حامیوں نے ریل روڈ ورکرس یونین کے نام سے ایک علاحدہ تنظیم بنائی جس نے ریلوے ملازمین کی غیر معینہ مدت کی ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ فیڈریشن کی نارتھ ایسٹرن یونین کے صدر پاٹھک جی ریل روڈ ورکرس یونین میں شامل،

ہو گئے تھے۔ ان کی یونین کا مرکزی دفتر گورکھپور تھا۔ ہڑتال کی تیاریاں شروع ہوتے ہی گورکھپور میں بڑی بڑی ریلیاں ہوئیں۔ لکھنؤ میں یونین کا دفتر لوکو ورکشاپ کے پاس تھا۔ وہاں روزانہ جلسے ہوتے جن میں ریل مزدور بڑی تعداد میں شرکت کرتے، گرما گرم تقریریں ہوتیں، فلک شگاف نعرے لگائے جاتے۔ معلوم ہوتا کہ انقلاب دستک دے رہا ہے۔

ایک دن مویا سے ایک جلوس نکالا گیا جس میں مزدوروں کے علاوہ فضل عباس کاظمی، ڈاکٹر دھر، ڈاکٹر علیم[1]، آنند، جواہر، خدیجہ، رشیدہ وغیرہ شامل تھے۔ ڈاکٹر علیم اپنی سائکل پر چھوٹا سا جھنڈا لگائے ہوئے تھے۔

ہم نوجوانوں نے شہر کی دیواروں کو، جہاں بھی جگہ ملی، نعروں سے پوت دیا تھا۔ نعرے تھے: یہ آزادی جھوٹی ہے، دیش کی جنتا بھوکی ہے، روٹی روزی دے نہ سکے جو وہ سرکار نکمّی ہے، ۹ مارچ[2] کو کیا کریں گے، ریل کا پہیہ جام کریں گے۔

آخر غیر معینہ مدت کی ریلوے ہڑتال کا دن آ ہی گیا۔ یونین کے بہت سے مقامی لیڈر پہلے ہی گرفتار کیے جا چکے تھے اور جو گرفتاری سے بچ گئے وہ روپوش ہو کر کام کرنے لگے۔ ہڑتال شروع ہونے سے ایک دن قبل اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے دس بارہ نوجوان جن میں رشیدہ، خدیجہ، کرشنانند، جواہر، چندر چارو شاستری (سیارام سرن ترپاٹھی) اور میں شامل تھے، لوکو ورکشاپ کے خفیہ آفس سے عالم باغ کی طرف نعرے لگاتے ہوئے جا رہے تھے کہ عالم باغ پولس چوکی کے باہر کے درخت کے پاس پولیس نے ہمیں روکا۔ یہ چوکی ٹی۔ این۔ باجپئی چوک کے سامنے ہے۔

گرفتاری

گرفتاری سے پہلے سپاہیوں سے گرما گرم باتیں ہوئیں پھر جھگڑے کی نوبت آ گئی۔ چندر چارو بے حد مضبوط جسم کا مالک تھا۔ ایک سپاہی نے بدتمیزی کی تو چندر چارو نے اسے ڈانٹا۔ اس نے گریبان پکڑ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ چندر چارو نے اسے زمین پر پٹخ دیا۔ ایک سپاہی اپنے ساتھی کی مدد کے لیے بڑھا تو اسے بھی اس نے دھر دبوچا۔ اسی وقت ایک دوسرے سپاہی نے پیچھے

۱۔ سرور صاحب کے اس مضمون میں جو "علیم صاحب" نامی کتاب میں شامل ہے، ٹریڈ یونین سے ان کے تعلق کا ذکر ہے۔

۲۔ ـــــ ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔

سے اس کے ٹخنے پر لاٹھی کا وار کیا تو وہ چکرا کر گر گیا اور ہماری ساری مزاحمت ختم ہوگئی۔ ہم میں سے دو تین لوگوں کے پاس سائکلیں تھیں جو تھانے میں جمع کر لی گئیں اور ہمیں جیل بھیج دیا گیا... لڑکیوں کو خواتین کی جیل اور ہمیں ضلع جیل۔

جیل پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ ہم لوگ شاید بیرک نمبر سات میں ہانک دیے گئے۔ اس رات کھانا بھی نہ ملا کیوں کہ کارروائی مکمل ہوتے ہوتے دیر ہو چکی تھی۔

دوسرے دن صبح صبح چائے ملی۔ بسکٹ کے بجائے پاپے تھے۔ یہاں ہماری جان پہچان کے بس وہی تھے جو ساتھ میں گرفتار ہوئے تھے۔ کچھ اور لکھا پڑھی ہوئی، پھر ہمیں بیرک نمبر آٹھ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں رابن مترا، درگا مسرا، ورما جی، اور شاید مشیر علوی اور چندر جیت یادو بھی تھے۔

اس بیرک میں بیڈمنٹن کورٹ تھا اور کھیل کا سامان۔ ہم لوگ شام کے وقت بیڈمنٹن کھیلتے۔ کھانا پکانے کے لیے ایک قیدی ملا تھا۔ ہر روز مکھن کی ایک ٹکیا ملتی جسے چاہیے تو صبح کی چائے پیتے وقت بسکٹ میں لگا کے کھا لیجیے اور چاہیے تو کھانے میں ڈلوا دیجیے۔ لائف بوائے صابن ہر دوسرے یا تیسرے دن ملتا۔ اس کے بدلے میں جیل کے ملازمین کی مدد سے بیڑی، سگریٹ اور دوسری چیزیں مل جاتی تھیں۔ صابن کی حیثیت سکہ رائج الوقت کی تھی۔ گرفتاری کے وقت میری جیب میں چار مینار کی ڈبیا تھی جس میں مشکل سے چار پانچ سگریٹیں رہی ہوں گی۔ خود پر روک لگا کے انھیں دو دن چلایا اور پھر جیل سے نکل کر پہلی جو چیز خریدی وہ سگریٹ کی ڈبیا ہی تھی، ان پیسوں سے جو جیل میں داخل ہونے کے بعد رکھا لیے گئے تھے۔ میرے ایک دوست بھی چین اسموکر تھے، لائف بائے کا استعمال وہ سگریٹ خریدنے کے لیے ہی کرتے لیکن اس سے ان کا کام نہ چلتا۔ وہ قیدیوں کی پی ہوئی بیڑیوں کے ٹرے ایک دوسرے میں جوڑ کے پیتے۔ یہ طریقہ اور بھی کئی لوگ اختیار کرتے۔

جیل اسٹیشن کے پاس ہی تھا، ہر وقت ریل گاڑیوں کے چلنے اور سیٹی کی آوازیں سنائی دیتیں تو غصہ آتا کہ جن کے لیے ہم جیل میں سڑ رہے ہیں وہ مزے سے ڈیوٹی کر رہے ہیں۔ بیڈمنٹن کھیلنے میں بھی کوئی لطف نہ آتا۔

تیسرے دن کچھ اور کامریڈ آ گئے۔ ہم لوگوں نے ہوا میں گھونسے لہرائے اور ''انقلاب زندہ باد'' کے نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ ان کامریڈوں نے بتایا کہ ہڑتال بہت کامیاب ہے اور حکومت خالی ڈبوں کی شنٹنگ کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ ہڑتال کا کوئی اثر نہیں

ہے۔ اس خبر سے دل کو قرار آیا اور اس شام خوب بیڈ منٹن کھیلا گیا۔
اب ہمیں اخبار بھی ملنے لگا تھا جس میں ہر دن چند خبروں پر سیاہی پتی ہوتی۔ ہم ہڑتال کی ناکامی کی بڑی بڑی خبروں کو نظر انداز کر کے ان خبروں کو ہی جو ہم پڑھ بھی نہ پاتے، ہڑتال کی کامیابی کی اصل خبر سمجھتے۔ اخبار میں ہر روز تواری جی کی صحت کا بلیٹن شائع ہوتا۔ وہ کانگریس کے بڑے لیڈروں کے ساتھ جیل کاٹ چکے تھے۔ اس بلیٹن کی اشاعت کو ہم حکومت کی کمزوری تصور کرتے۔ کچھ یہی صورت ان سہولتوں کے بارے میں بھی ہمارے ذہن میں تھی جو ہمیں فراہم کی گئی تھیں۔

ہم ضمانت ملنے سے قبل دو بار چاندی والی کچہری لے جائے گئے تھے، جیل روڈ سے اسٹیشن روڈ میں داخل ہونے کے بعد سامان اور سواریوں سے لدے ہوئے اکّے اور تانگے دیکھ کر ہمارا دل بیٹھ جاتا۔ ہم سوچتے کہ ریل گاڑیاں نہیں چل رہی ہیں تو یہ مسافر چار باغ اسٹیشن کیوں آ جا رہے ہیں۔ لیکن ہم نعرے لگا کے دل کو بہلاتے۔ پولیس کی جالی دار گاڑیوں سے قیصر باغ کے چوراہے پر وہ جگہ دیکھ کر جہاں ہم گرفتاری سے قبل نکّڑ میٹنگیں کیا کرتے اور زور زور سے نعرے لگانے لگتے۔ لوگ نعرے سنتے اور ہمیں مڑ مڑ کے دیکھتے، ہم سمجھتے کہ یہ سب ہمارے ہمدرد ہیں۔ ایک دن ہم لوگ عدالت ہی میں تھے کہ فضل عباس کاظمی جو نظر بند تھے رہا ہو کر آئے تو وکیلوں نے ان کو خوب خوب گلے لگایا۔ ویسے اس میں کوئی خاص بات نہ تھی کہ کاظمی صاحب خود بھی وکیل تھے لیکن ان کے اس استقبال کو ہم نے وکیلوں میں پارٹی کی مقبولیت کی دلیل سمجھا۔
ہماری بیرک کی پشت پر جیل کا کھیت اور باغ تھا۔ اس کی دیکھ ریکھ قیدی ہی کرتے۔ ہر قیدی دوسرے قیدی سے کچھ نہ کچھ ہمدردی رکھتا ہے۔ یہی رویہ ان کا ہماری طرف تھا۔ وہ ہماری عزت بھی کرتے، شاید اس لیے کہ ہم سفید پوش تھے اور جیلر ہم سے انگریزی میں باتیں کرتا۔ شام ہونے کو ہوتی تو کھیت میں کام کرنے والے قیدی ''ہو ہو'' کی آواز لگاتے تا کہ ہم ہوشیار ہو جائیں اور پھر اونچی سی لال دیوار کی طرف سے ٹماٹر اور امرود آنے لگتے جو زیادہ تر صورتوں میں ہم لوگ لیتے اور مزے لے لے کے کھاتے۔

جیل میں ایک تکلیف دہ احساس تو یہ تھا کہ بیرک کے باہر قدم نہیں رکھا جا سکتا لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ تھے اینٹ اور گارے کے وہ بستر جنھیں ہم قبریں کہتے اور سوچتے کہ اصل قبریں ان سے بہتر ہوں گی کہ وہاں جوئیں اور کھٹمل بھرے کمبل نہ ہوں گے۔ نیند تو پھانسی کے

پھندے پر بھی آ جاتی ہے، ہم ان قبروں پر سو جاتے۔ دن بھر ہم انھیں بھولے رہتے مگر شام ہوتے ہی بیرکیں بند کرنے اور ان پر تالے چڑھانے کی آوازیں آنا شروع ہوتیں تو ہمیں خیال آتا کہ تھوڑی دیر بعد ہم ان قبروں میں دفن ہو جائیں گے اور باہر کا آنگن اور بیڈمنٹن کورٹ نظر تو آئے گا لیکن دروازے پر تالا لگنے اور ''جنگلا، تالا، بتی سب ٹھیک'' کی پکار کے بعد بس ہم ہوں گے، مچھر ہوں گے اور جوئیں ہوں گی اور کھٹمل، حقِ رفاقت ادا کرنے کے لیے۔

یہ سب تو تھا لیکن یہ احساس بھی تھا کہ آنے والی نسلیں ہمارے نام چاہے نہ جانیں لیکن انھیں یہ ضرور خیال ہوگا کہ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے ان کے مستقبل کی خاطر رات رات بھر جاگ کر، دیواروں پر چاکنگ کر کے انقلاب کی آہٹوں کو قریب کیا تھا، جیل کاٹی تھی اور یہ جو شفق پھولی ہے اس میں ان کے خون کی سرخی بھی شامل ہے۔

ضمانت پر رہائی

بارہ تیرہ دن بعد ضمانت مل گئی تو ایسا لگا جیسے یہ وقفہ آرام کے لیے تھا اور پہلے سے زیادہ کام تکمیل کے منتظر ہیں۔ ریلوے ہڑتال بری طرح ناکام رہی لیکن ابھی تلنگانہ باقی تھا۔ ہم ''کراس روڈس'' امین آباد کے چوراہے پر فروخت کرتے اور یہ سوچتے کہ جلد ہی تلنگانہ کا دائرہ پھیل کر پورے ہندوستان کو اپنی آغوش میں لے لے گا۔ ''کراس روڈس'' میں قحط کے شکار لوگوں کے پنجروں کی تصویریں شائع ہوتیں اور ہم چلا چلا کر اعلان کرتے کہ ہندوستان بھوکوں مر رہا ہے اور یہ جو ہر دوسرے روز ریل کے حادثے ہو رہے ہیں اس کے ذمے دار ہم نہیں بلکہ سو سال پرانی ریل کی پٹریاں اور ان پر دوڑتے ہوئے کینیڈا کے بھاری انجن ہیں۔

یہ ساری باتیں ہم سب نہ صرف دوسروں سے کہتے اور انھیں سمجھاتے بلکہ ان میں یقین بھی کرتے اگرچہ دل و دماغ میں کبھی کبھی کوئی چیز کھٹ سے بھی ہو جاتی۔

ان دنوں سے زیادہ مصروف زندگی کبھی گزاری اور نہ کبھی ایسے مقاصد سے سامنا پڑا جن میں سے ہر ایک گویا عظیم اور مقدس تھا۔ آج کالجوں میں فیس کے اضافے کے خلاف لڑائی ہے، کل حسین آباد کالج سے حیدر عباس کے اخراج کے خلاف مظاہرہ کرنا ہے اور پرسوں؟ کاموں کی کیا کمی، ایک نہیں دس سامنے آ جائیں گے۔ کہنے کو تو میں کرسچین کالج میں انٹرمیڈیٹ کے دوسرے (عملاً تیسرے) سال میں تھا لیکن کیا کیا جائے حکومت نے لکھنؤ میں بسیں چلانا شروع

کردیں تو تانگے اور اِکّے والوں نے کامریڈ شکیل کی قیادت میں ہڑتال کر دی اور اپنے ہمدردوں کے ساتھ جلوس نکالا جس کا ایک سرا وکٹوریہ اسٹریٹ پر تھا تو دوسرا لال باغ میں اور سرِ جلوس ایک تانگے میں کھڑے تھے کامریڈ شکیل... گورا رنگ، سیاہ واسکٹ، پان سے لال ہونٹ۔

جو ہم سے ٹکرائے گا

چور چور ہو جائے گا

شہر کے لوگوں کو ظاہر ہے پریشانی ہوئی تو انھیں سمجھانا بھی تو تھا کہ بسوں کا نہ چلنا تمھارے مفاد میں ہے۔ بسیں چلیں گی تو ان کی رفتار اور موٹے موٹے پہیوں کے سبب دھول بھری سڑکوں سے جو گرد اڑے گی اس سے جراثیم پھیلیں گے اور گھروں کے اندر کا کھانا بھی زہر آلود ہو جائے گا۔ مگر بسیں چلیں اور خوب چلیں لیکن کچھ نہ ہوا علاوہ اس کے کہ اِکّوں اور تانگوں کی دنیا محدود ہو گئی اور اب یہ حالت ہے کہ بچّوں ہی نہیں بڑوں تک کو کوئی اِکّہ پرانے لکھنؤ میں نظر آ جاتا ہے تو وہ اسے حیرت اور اشتیاق سے دیکھتے ہیں۔

ان دنوں پرانے شہر میں پالکیاں بھی تھیں اور صرف خواتین کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے استعمال ہوتیں۔ میں نے آخری بار پالکی کٹرہ ابوتراب میں مصطفیٰ منزل کی طرف سے آنے والی گلی میں ایک چھجے کے نیچے کھڑی دیکھی تھی۔ یہ بات غالباً ۱۹۵۳ء یا اس کے بعد کے سال کی ہے۔

لکھنؤ میں ایک کاٹن مل بھی تھا اور مل تھا اس لیے وہاں ہڑتال بھی ہوتی اور اس کی یونین بھی تھی جس پر قبضہ تھا آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس یعنی کمیونسٹ پارٹی کا۔ اس یونین کے صدر تھے بابو خاں۔

کاٹن مل میں ہڑتال ہو تو کیا غریب مزدوروں کو مالک، پولیس اور حکومت کے رحم و کرم پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے؟ سو ہم اسٹوڈینٹس فیڈریشن والے بھیجے گئے کہ مزدور اکیلے نہ پڑ جائیں۔ چوہا بھاگ بلّی آئی کا یہ کھیل اتنی بار کھیلا گیا کہ کاٹن مل بند ہو گئی۔

لیکن اس سب میں دل کا کوئی کھوٹ نہ تھا۔ کاٹن مل کے مزدوروں نے ایک ایک دو دو روپیہ چندہ کر کے بابو خاں کو ایک سائکل خرید دی تو پارٹی نے ان سے باقاعدہ جواب طلب کر لیا کہ پارٹی کی تیس روپے تنخواہ سے یہ سائکل کیسے خریدی۔

انھی دنوں اجناس کی قلت کے سبب راشن کی دوکانوں سے غلّہ کی فراہمی بند ہو گئی تو فیصلہ کیا گیا کہ ان دوکانوں پر قبضہ کر کے غلّہ ''بھوکے ننگے عوام'' میں تقسیم کر دیا جائے۔ فیصلہ کی

خبر اخباروں میں چھپی تو پرانے لکھنؤ میں راشن کی دوکانوں پر دو دو سپاہی تعینات کر دیے گئے۔ ان دنوں پولیس کو اطلاع دینے کے بعد احتجاج کرنے کا طریقہ نہیں رائج ہوا تھا چنانچہ مولوی گنج میں راشن کی دوکان پر تعینات سپاہیوں نے جواہر، تا تا، خدیجہ انصاری اور دوسرے کامریڈوں کو جھنڈے لیے آتے دیکھا تو ایک سپاہی دوڑا کہ تھانے سے اور سپاہیوں کو بلا لایا لیکن جب تک وہ آئیں دوکان پر قبضہ ہو چکا تھا، مگر وائے ناکامی...وہاں غلّہ کا ایک دانہ نہ تھا۔ یہ ساری مشقت کارِ عبث نہ ثابت ہو اس لیے ہم نوجوانوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا اور پولیس نے ہماری پیش کش قبول کر لی لیکن جانے کیا ہوا کہ ہمیں تھانہ لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں مَیں بھی تھا۔ کاموں کی کوئی کمی نہ تھی۔ پہلی گرفتاری کا مقدمہ بھی چاندی والی بارہ دری کی کچہری میں چل رہا تھا۔ وہاں جانے کا ایک راستہ نشاط سینما کی ملحق گلی سے تھا۔ دوسرے راستے بھی تھے لیکن ہم جاتے اسی راستے سے۔ پیشی میں اور تو کچھ ہوتا نہ تھا، بس تاریخ لگ جاتی لیکن پورا دن برباد ہو جاتا۔ ان پیشیوں کے دوران ایک مزے کا واقعہ ہوا۔

دو لوگ نقب زنی کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ درجنوں پیشیوں کے بعد پولیس نے آلاتِ جرم پیش کیے تو اس میں ایک چھینی تھی اور ایک ہتھوڑی۔ مجسٹریٹ نے چھینی اٹھائی، گھما پھرا کر اسے دیکھا اور میز پر رکھ دی، مسکرائے اور پولیس اور سرکاری وکیل سے کہا، ''اماں یہی چھینی تو تم نے پچھلے ہفتے پیش کی تھی'' اور انگلیوں سے دھیرے سے دھکا دے کر اسے میز سے نیچے گرا دیا۔ پھر کہا، ''کھولو ہتھکڑی۔ میں فیصلہ لکھتا ہوں گا۔''

دونوں ملزموں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں تو عدالت نے کہا۔

''بھاگ جا، بھاگ، یہاں سے۔ آس پاس دکھائی نہ دینا نہیں تو یہ پھر پکڑ لائیں گے۔''

عدالت میں موجود سب لوگ ہنس دیے۔ دونوں ملزمین بگٹٹ بھاگے۔

ہمارے مقدمے میں باقاعدہ فیصلہ کیا ہوا یہ تو نہیں یاد لیکن جیل پھر نہیں جانا پڑا۔ خیال ہے کہ چونکہ یہ ہمارا پہلا جرم تھا اس لیے چھوڑ دیے گئے ہوں گے۔

ہمارا خیال تھا کہ عدالت سے بری ہونے کے بعد بھی خفیہ پولیس کے لوگ ہمارا تعاقب کرتے رہتے ہیں، اس لیے ہم سڑکوں پر چلتے چلتے یکایک کسی گلی میں مڑ جاتے اور دو چار چھوٹی موٹی گلیاں پار کر کے کسی اور سڑک پر نمودار ہوتے اور سوچتے کہ در گایا سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے کسی اور کارندے کو

خوب دھوکا دیا۔ ہمیں ہر وقت محسوس ہوتا کہ دو آنکھیں ہمارا تعاقب کر رہی ہیں۔ اب سوچتا ہوں کہ یہ دو آنکھیں شاید ہی کبھی ہمارے تعاقب میں رہی ہوں۔ بیشتر صورتوں میں ہم نے انھیں فرض کر رکھا تھا۔

ان دنوں جب ہمارے خیال میں انقلاب کسی وقت بھی آ سکتا تھا، رام منوہر لوہیا نے کسانوں اور مزدوروں کی ایک بڑی ریلی کا اہتمام کیا۔ یہ جلوس ایک لاکھ سے کم کا نہ رہا ہوگا۔ یو پی میں آزادی کے بعد کا یہ پہلا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔

اس جلوس کے سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی نے تعاون کی پیش کش کی جو لوہیا نے نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دی لیکن ہم لوگ کسی نہ کسی طرح اپنی شرکت درج کرانا چاہتے تھے۔ یہی اوپر سے حکم بھی تھا۔ فیصلہ ہوا کہ لاٹوش روڈ پر ہنسیے ہتھوڑے والے بڑے بڑے لال جھنڈے لے کر ہم جلوس میں شامل ہو جائیں۔

جلوس چار باغ کی جانب سے آ رہا تھا اور ہم پچیس تیس لوگ جن میں درگا مسرا، کرشنا نند، رابن مترا، منان، جواہر، خدیجہ، رشیدہ، بجیا، میں، اور حیدر عباس اور کئی دوسرے نوجوانوں کے ساتھ کاٹن مل کے دس بارہ مزدور شامل تھے، بودھ مندر کے تراہے پر ڈنڈوں پر جھنڈے لپیٹے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں جلوس آ پہنچا اور جب اس کا آگے کا حصہ، جس میں لیڈران تھے، نکل گیا تو ہم نے اس میں گھسنے کی کوشش کی۔

لوہیا کو ہمارے منصوبوں کا اندازہ تھا اور انھوں نے ان کے تدارک کی تیاری کر رکھی تھی۔ سوسوا سو لوگوں کا لاٹھیوں سے لیس ایک جتھا ہماری مداخلت کا منتظر تھا۔ اس نے ہمیں گھیرے میں لے لیا لیکن جب ہم نے اپنی کوششیں کسی طرح ترک نہ کیں تو نوبت تصادم کی آ گئی جس میں خدیجہ، جواہر اور دو تین دوسرے نوجوانوں کو چوٹیں آئیں۔ ان کی مرہم پٹی ڈاکٹر رشید جہاں نے کی۔ میں دھان پان ویسے ہی تھا، شاید اسی لیے بخش دیا گیا اور حسین گنج ہوتے ہوئے پیدل کافی ہاؤس آ گیا۔

امتحان کے دن قریب آنے لگتے ہیں تو طلبہ کی احتجاجی تحریکوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ ذرا سی فرصت ملی تو سوچا کہ تیسرا سال ہے، انٹر کر ہی لیا جائے۔ چنانچہ امتحان کی تیاریاں سنجیدگی سے شروع کر دیں۔ ٹیوشن تین تھے، دو چار کتابیں بھی خرید لیں۔ تھیوری تو یوں بھی رٹ رٹا لی تھی لیکن اصل مسئلہ بک کیپنگ کا تھا۔ ایک لڑکا جس سے تھوڑی سی دوستی تھی بیلینس شیٹ بنانے میں ماہر تھا۔ اس نے کہا بہت آسان ہے میرے یہاں آ جایا کرو میں سکھا دیا کروں گا۔ چنانچہ میں

روزانہ اس کے یہاں جانے لگا اور اتوار کا دن تو تقریباً سارا کا سارا اسی کے یہاں گذار دیتا کہ اس دن ٹیوشنوں کے لیے جانا نہ ہوتا۔ دس پندرہ دن میں اس نے بہت کچھ سکھا دیا، پھر بھی کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہو ہی جاتی۔

آخر امتحان آ ہی گئے۔ تھیوری کے پرچے تو کسی طرح ٹھیک ٹھاک ہو گئے لیکن اصل مسئلہ پچاس نمبروں کے اس پرچے کا تھا جس میں چودہ نمبر کا سوال بیلینس شیٹ بنانے کا ہوتا۔

میں نے بیلینس شیٹ بنا تو لی لیکن Debit اور Credit کی رقوم میں تقریباً بیس ہزار روپوں کے فرق سے پریشان تھا۔

پیشاب کرنے باہر گیا تو واپسی میں اتفاق سے ایک لڑکے کی کاپی پر نظر پڑ گئی۔ وہ لڑکا کامرس میں بہت تیز تھا اور بیلینس شیٹ کا آخری صفحہ دوبارہ چیک کر رہا تھا۔ اس کے دونوں جانب کی رقم وہی تھی جو میری بیلینس شیٹ میں ایک طرف تھی۔

بیلینس شیٹ بناتے وقت دونوں جانب کی رقوم کا فرق دور نہ ہو رہا ہو تو Suspense Account کھول کر حساب برابر کر دیا جاتا ہے اور پتہ چل جانے پر غلطی دور کر دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ بتاتے وقت سمجھایا گیا تھا کہ اس سے کام اسی وقت لیا جاتا ہے جب بالکل ہی مجبوری ہو۔ امتحان سے بڑی مجبوری کیا ہو سکتی تھی۔ سو میں نے بھی یہی کیا۔ ممتحن نے شاید دونوں جانب کی رقوم دیکھ کر پورے نمبر دے دیے اور میں پاس ہو گیا۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ سوال ہی ایسا رہا ہو کہ Suspense Account کے بغیر کام نہ چلتا ہو لیکن یہ خیال اپنی پیٹھ خواہ مخواہ تھپتھپانے سے زیادہ نہیں لگتا۔ تاہم، میں کسی نہ کسی طرح یونیورسٹی پہنچ گیا۔

◆◆◆

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء کے شروع میں بین الاقوامی کمیونسٹ تنظیم کے جہازی سائز کے اخبار For a Lasting Peace, For a Peoples Democracy کے صفحہ اوّل پر ایک مضمون شائع ہوا جس میں پرولتاری انقلاب کے بجائے عوامی جمہوریتوں کے قیام کو عالمی کمیونسٹ تحریک کا مقصد قرار دیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل تک تلنگانہ میں مسلح کمیونسٹ تحریک اس قدر طاقتور تھی کہ ضلع مجسٹریٹ تک سرخ جھنڈے کو سلامی دینے کے بعد ہی سرکاری کام کاج شروع کرتے۔ تلنگانہ کے مسلح کمیونسٹ فوجی دستے ''دلم'' کہلاتے اور عملی طور سے اس سارے علاقے پر کمیونسٹ پارٹی کی حکمرانی تھی۔ یہ ایک طرح سے متبادل حکومت تھی۔ مخدوم محی الدین کو ملک کا وزیر اعظم[۱] منتخب کیا گیا تھا۔ ان دنوں میں انٹرمیڈیٹ ہی میں رہا ہوں گا۔

اس مضمون کی اشاعت کے آس پاس ہندوستان کی جانب روس کا رویہ بالکل تبدیل ہو گیا ورنہ اس سے قبل یہ تک ہوا تھا کہ پنڈت نہرو کے دورۂ امریکا کے دوران سوویت یونین کی حکومت نے سردار پٹیل کا ایک خط اس وضاحت طلبی کے لیے لوٹا دیا تھا کہ پنڈت نہرو کے سرکاری دورۂ امریکہ کے دوران کوئی دوسرا شخص کارگزار وزیر اعظم کیسے ہو سکتا ہے۔ اب روس کی کمیونسٹ پارٹی نے ہندوستان کی آزادی کو بھی تسلیم کر لیا تھا۔

پہلے والے مضمون کے آگے پیچھے اسی اخبار میں اسٹالن کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ کمیونزم سارے تضادات کا خاتمہ نہیں ہے اور تضادات کمیونسٹ سماج میں بھی رہیں گے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے نزدیک انقلاب ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہا

۱۔ اس وقت بھی میں مقامی کمیونسٹ تحریک میں ایک نہایت معمولی کارکن تھا۔ مخدوم محی الدین کا بطور وزیر اعظم انتخاب مجھے نہیں یاد لیکن سینئر جرنلسٹ اختر یونس قدوائی کا اس واقعہ کی صداقت پر اصرار ہے۔

تھا اور ڈانگے نے بمبئی کے ایک عظیم الشان جلسے میں کہا تھا کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ہم کسی دن سو کر اُٹھیں تو معلوم ہو کہ ملک میں انقلاب آچکا ہے۔

اسی سال بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے اخبار ''کومن ٹرن'' نے اپنے ایک شمارے میں اعلان کیا کہ ''ہندوستان کو آزادی مل گئی ہے، وہاں کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس آزادی کو مضبوط کریں، ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کی معیشت کو بھی مضبوط کر کے ملک کی عوامی بہبود کی حکمت عملیوں کے ساتھ جوڑنے میں مدد کریں۔'' (میری جیون کی کچھ یادیں، از ڈاکٹر زیڈ۔اے۔احمد صفحہ ۳۰۸) ان دنوں لکھنؤ میں پارٹی کے کارکن کامریڈ نعیم خاں کو ڈاکٹر رشید جہاں، ڈاکٹر احمد اور حاجرہ بیگم سے قربت کے سبب بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ وہ جس کو چاہتے سی۔آئی۔ڈی۔کا ایجنٹ قرار دے دیتے۔ انھوں نے مجھ پر بھی یہ الزام لگایا تھا اور یہ بات صلاح الدین عثمان سے کہی تھی۔ اس بات سے مجھے سخت تکلیف ہوئی تھی اور میں نے دو تین دن کھانا نہیں کھایا تھا۔

عبرت انگیز ہے اے شمع لحد تیری حیات
جل بجھی جس کے لیے اس کو خبر تک نہ ہوئی

ہندوستان کی جانب سوویت یونین کے رویہ میں تبدیلی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت اور پارٹی کی پالیسی میں تبدیلی کی محرک بنی۔ کچھ تو پالیسی کی تبدیلی اور کچھ حیدرآباد کے خلاف ''پولیس ایکشن'' کے بعد ہندوستانی فوج کے قبضے نے صورت حال بالکل تبدیل کردی۔ ''دلم'' کے دستے نظام کی پولیس یا فوج کا مقابلہ تو کر سکتے تھے لیکن ہندوستان کی فوج کا مقابلہ ان کے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ تلنگانہ تحریک کچل دی گئی۔ ابتدا میں کمیونسٹ پارٹی بہت زور وشور سے کہتی تھی کہ حیدرآباد میں ہندوستان کا پولیس ایکشن دراصل نظام کو کمیونسٹ تحریک سے بچانے کی کوشش ہے لیکن پالیسی کی تبدیلی کے بعد اس الزام کی لے کمزور ہوتی گئی۔

کمیونزم میں تضادات کی موجودگی کا امکان ہم لوگوں پر بجلی بن کے گرا کیوں کہ ہمارے خیال میں تو اشتراکیت ایک ایسی جنتِ ارضی کا وسیلہ تھی جس میں تمام تضادات، تمام مسائل آن کی آن میں حل ہو جاتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کی تبدیلی سے ہم نوجوان جو ذرا ذرا سی بات پر اسکولوں اور کالجوں میں ہڑتال کرانے کے بہانے ڈھونڈھتے، شام میں نکڑ میٹنگوں (Street-corner meetings) میں تقریریں کرتے اور نعرے لگاتے، امین آباد کے چوراہے اور حضرت گنج میں پارٹی کا ہفت روزہ کراس روڈس (Crossroads) اور اردو ہندی کے اخبار اور

کتابیں فروخت کرتے اور رات میں دیواروں پر حکومت مخالف نعرے گیرو سے لکھتے، نہ صرف یکا یک ''بے روزگاری'' کے حالات کے شکار ہو گئے، بلکہ ہمیں زندگی ہی بے معنی نظر آنے لگی۔

سوویت حکومت اور اتحادی طاقتیں دوسری عالمی جنگ میں تو ایک دوسرے کی حلیف تھیں لیکن اب تال ٹھونک کر ایک دوسرے کے سامنے، اگرچہ ایک دوسرے سے خوف زدہ بھی۔ اسی زمانے میں امن تحریک شروع ہوئی اور ایک طرح سے تلنگانہ تحریک کا خوں ریز تجربہ سارے ہندوستان میں تیسری جنگ کے امکان کے خلاف ایک پرامن جدوجہد میں تبدیل ہو گیا۔

اس وقت امریکہ سوویت یونین کو ختم کرنے کے لیے اس پر حملہ کرنے کے بہانے ڈھونڈھ رہا تھا اور اس تحریک کا مقصد دنیا کو تیسری عالمی جنگ کے خطرے، یعنی روس کو امریکی حملے سے بچانا تھا۔ دنیا بھر کے سوشل ڈیما کریٹس (Social Democrats)، مثلاً ہندوستان میں جے پرکاش نرائن اور رام منوہر لوہیا، کا کہنا تھا کہ امن تحریک کا مقصد سوویت یونین کو ایٹم بم بنانے کا وقفہ فراہم کرنے کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ شاید کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

ہم نوجوان جو پارٹی میں سرگرم تھے ان لوگوں میں نہ تھے جن کے لیے اس سب کی حیثیت ''ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے'' کی رہی ہو۔ انقلاب ہماری منزل تھی، ہمارا دین تھا، ہمارا ایمان تھا۔ پارٹی کی سطح پر تو بی۔ ٹی۔ رندیوے کی جگہ اجے گھوش نے لے لی لیکن مجھ ایسے ہزاروں نوجوان مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوب گئے۔ یہ انکشاف کہ جس مقصد کے لیے ہم نے اپنی زندگی کے سارے خواب داؤ پر لگا دیے تھے، وہی غلط تھا، ''ایں ماتم سخت است'' کی حیثیت رکھتا تھا۔

کرشنانند، ایک چھوٹا سا گول ڈنڈا بغل میں دبائے ہوئے، ہر وقت انقلاب کی آمد قریب تر کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ ایک دن وہ لڑکی جس کا نام نندنا باچپئی تھا تنہائی میں اس سے ایک آدھ جملہ کہنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے چند منٹ، محض چند منٹ، آنند سے مانگے تو وہ بولا۔

''کامریڈ نندنا، تم اپنا دردِ دل بیان کرنا چاہتی ہو لیکن میرے پاس اسے سننے کے لیے وقت کہاں؟ انقلاب وقت کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور تم محبت میں دیوانی ہو رہی ہو۔ کامریڈ، محبت کرنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے لیکن اگر انقلاب آ گیا اور ہم اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ملے تو مستقبل کی نسلیں ہمیں معاف نہ کریں گی۔''

وہ آنند سے بس تھوڑی دیر بات کرنے کے لیے وقت کی بھیک مانگتی رہی لیکن آنند کے پاس احکامات جاری کرنے، کمیونزم کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے، ہر ہفتے مرکزی پارٹی کے دفتر سے ملنے والے مسودات کا مطالعہ کرنے، بارود خانے میں شفیق نقوی کے نظریاتی لیکچروں میں شرکت کرنے اور خود اسٹیڈی سرکلس میں سرگرمی سے حصہ لینے سے وقت ہی کہاں بچتا تھا کہ اس غریب کو دیتا... آخر ایک دن ''دردِ دل چپ بھی رہ'' کے سناٹے میں اس غریب نے خودکشی کر لی، ایک ایسے وقت جب چند ہی ماہ بعد منزلیں بے سمتی کا شکار ہو کر فضاؤں میں تحلیل ہو جانے والی تھیں۔

اور... اور برسوں بعد آنند نے زندگی کے خلا اور بے مقصدیت کے جھکولے کھانے کے بعد موت کو گلے لگا لیا۔

یہ دونوں اور ان جیسے درجنوں اور سیکڑوں خوش قسمت تھے کہ انھیں منزلوں کی گمشدگی کا کرب طویل عرصہ تک نہیں جھیلنا پڑا اور سانسوں کی آمد و شد کے جواز اور خود کو مطمئن کرنے کے لیے بہانے نہیں تراشنے پڑے۔

سرخ سائے مری دیوار تک آ پہنچے تھے

کتب فروشی کا باقاعدہ آغاز

پارٹی کی پالیسی کی تبدیلی نے ''بے روزگاری'' کے علاوہ کئی اور مسئلے کھڑے کر دیے تھے۔ پہلے صرف ایک مقصد تھا اور اس کے حصول کا جنون، جس میں اور سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ لیکن اب بہت سے دوسروں کی طرح میں اندر سے بھی ٹوٹ گیا۔ اب بھوک زیادہ لگتی اور پیاس بھی۔ زندگی کے دوسرے مسائل کا بھی خیال آتا۔

اخبار، کتابیں اور کتابچے فروخت کر کے ان کی ساری رقم پیپلس بک ہاؤس میں جمع کر دینے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ایک دن مسعود نے جو پیپلس بک ہاؤس کے انچارج تھے مجھ سے کہا کہ روسی کتابیں فروخت کرنے پر پچیس فی صدی کمیشن ملے گا۔ میرا دل کھل اٹھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

میں نے روسی کتابیں اور رسالے فروخت کرنے شروع کر دیے۔

ابتدا میں یہ کام کچھ اَٹ پٹا سا لگا۔ ابا کے انتقال سے قبل کی زندگی عیش و عشرت کی نہ تھی

لیکن موجودہ حالات میں وہ دن شہنشاہی کے معلوم ہوتے۔ اونچے اونچے خواب تو کبھی نہ دیکھے تھے، لیکن ذہن میں مستقبل کا جو دھندھلا سا تصوّر تھا، ان کے بکھر جانے کے باوجود یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ سڑک کے کنارے چھینٹ کے کپڑے پر کتابیں اور رسالے پھیلا کر انھیں فروخت بھی کرنا پڑے گا... اب صورت شکستِ خواب کے علاوہ حقائق سے نبرد آزما ہونے کی تھی۔

خواب اور حقائق میں جب بھی چھیڑ ہوتی ہے، خواب ٹوٹ جاتے ہیں
اور یہ بھی ہوتا ہے تلخیِ حقائق میں خواب یاد آتے ہیں

چالیس پچاس روپے سے کم میں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل تھا اور آمدنی کے ذرائع صرف دو ٹیوشن تھے۔ حاجی اکرام احمد اور کالون کالج کے شاہد صاحب کے یہاں کا۔ یہ ٹیوشن ڈاکٹر محمد حسن نے دلایا تھا۔

یہ خوف بھی تھا کہ کتابوں کی فروخت سے اتنے روپے نہ ملے کہ کام چل سکے تو کیا ہوگا۔ لیکن کالون کالج کا ٹیوشن اور حضرت گنج میں کتابیں فروخت کرنے کے اوقات اوپر نیچے کرنے کے بعد ایک دن جی کڑا کر کے فیصلہ کر ہی لیا۔ اس فیصلے میں سرگرم کمیونسٹ کارکن کی جیل کی دیواروں کے پیچھے کی باقی دنیا سے بے تعلقی کے احساس کے علاوہ مئی جون کی چلچلاتی دھوپ اور نومبر دسمبر کی راتوں میں پھٹیچر سا سوئٹر پہن کے کام کرنے کی عادت کام آئی۔ لیکن ابا کے ''لندن بھیجنے کے ارمان'' اور دادے ابا کی ''لوہے کے پیسے سے بکی'' نے بہت دنوں تک پیچھا کیا۔

اب جس جگہ ساہو ہے وہاں تقریباً اوپر نیچے دو سینما گھر تھے۔ شاید پلازا اوپر، پرنس نیچے۔ بائیں جانب لکڑی کے فرش کا کرشنا ریسٹورانٹ تھا جس کی چائے بہت اچھی ہوتی۔ ریسٹورانٹ کے اندر ہی سے ایک راستہ بڑے سے بلیئرڈ روم میں کھلتا۔ میں تو وہاں جانے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن میرے شناسا میلکم جن سے تعارف قیصر تمکین نے کرایا تھا دو چار بار اپنے ساتھ وہاں لے گئے۔ وہاں لوگوں کو بلیئرڈس کھیلتے ہوئے دیکھ کر کھیل کی نزاکتوں کے بجائے دلچسپی مشہور کارخانۂ عطریات اصغر علی محمد علی کے مالک اصطفیٰ خاں کی شائستہ اچھل کود سے پیدا ہوگئی۔ ان کا شمار شہر کے رؤسا میں ہوتا۔ وہ بلیئرڈس کھیلتے کم اور دوسروں کے کھیلنے کے لیے وسائل زیادہ فراہم کرتے۔ کہا جاتا کہ بلیئرڈس روم کے زیادہ تر اخراجات وہی برداشت کرتے ہیں۔

اس ہوٹل سے حضرت گنج کی سڑک کی جانب جانے والے چوڑے راستے پر ایک طرف پلازا کا قبضہ تھا اور دوسری طرف کافی ہاؤس (اولڈ انڈیا کافی ہاؤس نہیں) کا۔ اس کی شکلیں

بدلتی رہتیں، کبھی انپورنا ہوجاتا، کبھی عام ہوٹل، معلوم نہیں فی الوقت کیا صورت ہے۔ باہر نکل کر ایک طرف یونیورسل بک ڈپو تھا اور دوسری جانب کی وہ جگہ جہاں اب موٹر سائیکل اسٹینڈ ہے خالی پڑی رہتی۔ سوویت یونین کی انگریزی، اردو اور ہندی کتابوں اور رسائل کی فروخت کے کام کا آغاز میں نے اسی جگہ سے کیا۔ ''بےعزتی'' سے بچنے کا ایک آسان راستہ بھی ڈھونڈ نکالا کہ کوئی پوچھے یا کسی کی آنکھیں سوال کریں تو کہہ دیا جائے یہ کام پارٹی کا ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد، خاص طور سے وہ جن کا تعلق آرٹس فیکلٹی سے تھا، پارٹی سے میرے اس تعلق سے واقف تھی اور میں نے ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز'' کے معنی اپنی ضرورت کے مطابق تھوڑے، بہت وسیع کر لیے تھے۔

پہلا دن بخیر وخوبی گزر گیا۔ سائکل کھڑی کرنے کے لیے ایک آنے اور چائے سگریٹ کے اخراجات کے بعد بھی کوئی پونے تین روپے بچ رہے۔ میں نے باقی کتابیں قیصر باغ میں اپنے ایک دوست کے یہاں رکھ دیں اور اگلے دن فروخت شدہ کتابوں کی قیمت ادا کر کے دوسری کتابیں لے لیں۔ دوسرے دن کتابوں اور جرائد کی فروخت کی رفتار اور بھی بہتر تھی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک سپاہی نے اس ''کاروبارِ شوق'' کی دوکان اٹھادی۔ اٹھائی تو نہیں ہاں دھمکی ضرور دی، اگرچہ نرم لفظوں میں، کیونکہ اوّل تو میں کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے پہنتا اور اس وقت تک اس پرانے مقولے کی کہ ''تم کپڑوں کی عزّت کرو، کپڑے تمھاری عزّت کریں گے'' حکمرانی ختم نہیں ہوئی تھی، دوسرے یہ کہ صورت ہی سے اسٹوڈینٹ معلوم ہوتا اور پولیس والے عام طور سے ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چونی اٹھنی سے کام چل جاتا لیکن میں ڈرپوک قسم کا آدمی ہوں اور اپنے خیال میں ایماندار بھی۔ یہ خیال بھی تھا کہ سپاہی ایماندار ہوا تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ چنانچہ فوراً ہی اپنا بوریا سمیٹا۔ اس وقت سوچا بھی نہ تھا کہ وہ بوریا جس پر کتابیں سجا کر کام شروع کیا تھا کسی نہ کسی طرح جنم جنم کا ساتھی بن جائے گا۔

اب کیا کیا جائے؟ میں نے اسی وقت سے سوچنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب رات میں پپوٹوں نے کھلے رہنے سے انکار کر دیا۔ کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا لیکن صبح آنکھ کھلی تو مسئلہ حل ہو چکا تھا اور حل یہ تھا کہ کیوں نہ یہ کام گھر گھر جا کر کیا جائے۔ یعنی وہی طریقہ جو اپنے بچپن میں دیکھا تھا کہ کتب فروش ان لوگوں کے یہاں جا کر جو پڑھنے کے شوقین تھے کتابوں کے بستے کھولتے۔ لیکن ابھی یہ سوال باقی تھا کہ کام کا آغاز کہاں سے کروں۔ بہت

سوچ بچار کے بعد میں نے ممبران اسمبلی اور کونسل کی قیام گاہ دارالشفا سے کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں اسمبلی میں کمیونسٹ ممبروں کی تعداد غالباً دس گیارہ تھی۔

سائکل کے دونوں ہینڈلوں پر کتابوں سے بھرے تھیلے اور کیریئر پر رسائل کا تھیلا مضبوطی سے جما کر میں دارالشفا کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس وقت تک مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دارالشفا میں دو بلاک ہیں اور میں لب سڑک کے مکانوں کی پشت والی عمارت ہی کو ممبران اسمبلی کی قیام گاہ سمجھتا تھا۔ لیکن وہاں جا کر پیچھے والے بلاک کا علم ہوا۔ وہ بڑا بھی معلوم ہوا اور وہاں لفٹ بھی تھی جب کہ سڑک سے ملحق عمارت میں اس وقت یہ سہولت نہ تھی۔ اب کا حال نہیں معلوم۔ چنانچہ، یہ سوچ کر کہ لفٹ سے سائکل سمیت سارا بوجھ اوپر کی منزلوں تک پہنچانے میں کوئی دقت نہ ہوگی وہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ سائکل اوپر لے جانے کے لیے لفٹ کا استعمال ممکن نہیں۔ پریشانی کا احساس ضرور ہوا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور لدی پھندی سائکل اٹھا کر زینے چڑھتے ہوئے اوپر کی منزل پر پہنچ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ اسمبلی اور کونسل کے ممبران حضرت گنج کی سیر اور بعد میں ہنومان مندر کے پاس والے بھوجنالے میں کھانا کھانے کے لیے جا چکے تھے لیکن چند کمرے غیر مقفل تھے۔

میں نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک صاحب نے جو بنیائن اور تہمد میں تھے، دروازہ کھولا، میں نے انھیں بتایا کہ آپ کے لیے کچھ کتابیں لایا ہوں تو انھوں نے اندر بلا لیا اور کتابیں اور رسالے دیکھے۔ انھیں کمیونسٹ پارٹی یا کمیونزم سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن ان دنوں کمیونسٹوں کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا تھا اس لیے یا شاید خود کو پڑھا لکھا ثابت کرنے کے لیے یا میرے صاف ستھرے کپڑوں اور بات چیت کے شائستہ انداز سے متاثر ہو کر انھوں نے چائے پلائی اور چند کتابیں اور رسالے خرید لیے۔ دو چار دوسرے کمروں میں بھی کامیابی حاصل ہوئی اور زندگی آسان ہوتی نظر آئی۔

...اور یہ سلسلہ چل نکلا۔

جھار کھنڈے رائے

پاکستان کے قیام کا زخم ابھی بھرا نہ تھا۔ بعض ممبران کمیونسٹ پارٹی پر پاکستان کے مطالبے کی حمایت کا الزام لگاتے، میں گول مول سا جواب دیتا کہ زیادہ کچھ معلوم نہ تھا لیکن

بحیثیت مجموعی کمیونسٹوں کے خلوص اور ان کی ایمانداری کی قدر کی جاتی جس سے مجھے اپنے کام میں مدد ملی اور یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اتفاق سے ایک دن جھارکھنڈے رائے سے ملاقات ہوگئی۔ وہ انقلابی سوشلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ ان کی پارٹی کے کمیونسٹ پارٹی میں ضم ہونے کی بات چیت چل رہی ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ اس سلسلے میں مولانا اسحاق سنبھلی خاصے سرگرم ہیں لیکن دونوں سیاسی جماعتوں کے درمیان کن سیاسی مسائل پر یا تنظیمی امور پر بات چیت ہو رہی ہے اس بارے میں ظاہر ہے میں کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ اس وقت تک رائے صاحب سے میرے تعلقات خاصے ہوگئے تھے۔ ایک دن میں گیا تو انھوں نے مجھ سے کہا:

''سہیل تمھیں کچھ پتا ہے؟''

میں سمجھ گیا، چنانچہ میں نے کہا، ''کچھ کچھ''۔

وہ مسکرائے اور بولے، ''سچ سچ بتاؤ، کمیونسٹ کی طرح نہیں، میرے دوست کی طرح، کوئی گڑ بڑ تو نہیں''۔

''نہیں کوئی گڑ بڑ نہیں'' میں نے کہا اور انھیں یہ بھی بتا دیا کہ ''میں باقاعدہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہوں لیکن خود کو کمیونسٹ سمجھتا ہوں اور شاید پارٹی بھی بہت بھروسہ کرتی ہے۔''

کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں، پھر چلا آیا۔ جو بات میں نے کہی تھی میرے علم و یقین کے مطابق بالکل سچ تھی۔ بعد میں بہت سی باتیں سنیں۔ خدا جانے سچ تھیں یا جھوٹ۔

برسوں بعد کا ایک واقعہ یاد آ گیا، وہ بھی سن لیجیے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب یو پی میں بھان متی کے پٹارے نے سنیکت ودھایک دل کے نام سے حکومت بنالی تھی۔ اس کے وزیر اعلیٰ ہندوستانی سیاست میں دل بدلی کے بادا آدم چودھری چرن سنگھ تھے اور کمیونسٹ پارٹی کانگریس دشمنی میں اس حد تک آگے بڑھ گئی تھی کہ اس نے جن سنگھ (آج کی بھارتیہ جنتا پارٹی) سے ہاتھ ملا کر حکومت کی تشکیل میں مدد دی تھی اور اس کے انعام کے طور پر جھارکھنڈے رائے کو وزیر غذا اور بنارس کے کمیونسٹ ممبر اسمبلی رستم سیٹن کو نائب وزیر داخلہ بنا دیا گیا تھا۔ انھوں نے بطور نائب وزیر داخلہ پارٹی میں حکومت کے مخبروں کی فائل حاصل کرنے کی لاکھ لاکھ کوشش کی لیکن چرن سنگھ نے جو وزیر اعلیٰ تھے اور وزیر امور داخلہ بھی، رستم سیٹن کی کوششیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ خیر۔

انھی دنوں میں دفتر جانے کے لیے میوہ والی سرائے (وکٹوریہ اسٹریٹ) کے اپنے

کرائے کے مکان سے میڈیکل کالج ہوتا ہوا سائکل سے سٹی اسٹیشن سے قبل کے چھتے کی ڈھال پر پہنچا تو ایک مال گاڑی شاید سگنل نہ ملنے کے سبب رکنے کے قریب تھی، اسی وقت میں نے ایک شخص کو گارڈ کے ڈبے سے اترتے ہوئے دیکھا۔ میانہ قد، گٹھا ہوا جسم، کرتا پاجامہ پہنے ہوئے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں اسے جانتا ہوں چنانچہ میں نے صرف تجسس کے سبب سائکل کی رفتار دھیمی کردی۔ اس دوران وہ شخص، جو ہاتھ میں ایک تھیلا لیے ہوئے تھا، گمٹیاں پار کر چکا تھا۔ اب جو میں نے غور کیا تو وہ جھارکھنڈے رائے تھے۔ حکومت اتر پردیش کے کابینی وزیر۔ میں سائکل سے اتر پڑا اور وہ پٹری کے پاس کی دیوار سے کود کر سڑک پر آگئے۔ میں نے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ کسی غمی میں گئے تھے، واپسی میں گاڑی چھوٹ گئی تو منت سماجت کر کے مال گاڑی کے گارڈ کے ڈبے میں جگہ مل گئی۔ لکھنؤ پہنچنا یوں ضروری تھا کہ اسمبلی میں سوالوں کے جواب دینے تھے۔

ان کے دریافت کرنے پر میں نے بتایا کہ ہیر اللہ جا رہا ہوں۔ کہنے لگے قیصر باغ تک چھوڑ دو گے، میں نے کہا ہاں اور سائکل چلائی تو ذرا اچک کر کیری ار پر بیٹھ گئے۔ ان کا قد چھوٹا لیکن جسم گٹھا ہوا تھا، رفاہ عام کی چڑھائی پر بہت زور لگانا پڑا۔ میں قیصر باغ میں، اپنے دفتر چلا گیا اور وہ رکشہ پر کونسل ہاؤس۔

آیئے کتابیں بیچنا پھر شروع کریں۔

تین چار مہینے بعد جانے کیسے میری ملاقات چودھری گردھاری لال سے ہوگئی۔ موجودہ اینکسی سے ملحق تراہے کے بعد پہلی کوٹھی میں گووند سہائے رہتے تھے یہ تو خوب یاد ہے لیکن دوسری کوٹھی میں گردھاری لال رہتے تھے یا چرن سنگھ یہ بھول رہا ہوں۔

گووند سہائے کانگریس کے ان چند رہنماؤں میں تھے جن کے سیکولرزم کی قسم کھائی جاسکتی تھی۔ ان کا تھوڑا سا رجحان بائیں بازو کی طرف تھا۔ کچھ دنوں کے لیے انھوں نے کانگریس سے علاحدگی اختیار کر لی تھی لیکن پھر جلد ہی لوٹ آئے تھے۔ ایم۔ سی۔ کے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا تھا، ''صرف ایم۔ ایل۔ اے۔ بننے کے لیے کانگریس میں نہیں لوٹا ہوں'' لیکن ایماندار آدمی تھے، سیاست میں ترقی نہ کر سکے اور زیادہ جیے بھی نہیں۔

مسلمانوں سے منصفانہ سلوک ان دنوں بھی نہیں ہوتا تھا۔ مرکزی وزیر داخلہ نے ایک خفیہ سرکلر کے ذریعے پولیس میں مسلمانوں کی بھرتی پر پابندی لگادی تھی۔ یوں تو اس طرح کی پابندی لگانے کا حق صرف ریاستی حکومت کو تھا لیکن مرکز اور تقریباً ساری ریاستوں میں کانگریس ہی کی حکمرانی

تھی اس لیے اس طرح کے فیصلے حکومت کے بجائے پارٹی کی سطح پر ہوتے۔ مسلمانوں سے ملازمتوں اور زندگی کے ہر شعبے میں تفریق برتی جاتی پھر بھی صورتِ حال آج سے بہتر تھی۔

دوسرا یا تیسرا بنگلا چودھری گردھاری لال کا تھا۔ دروازے پر بندوق لیے ایک سپاہی کھڑا تھا۔ مَیں ان سے ملنے مقررہ وقت پر گیا تو سپاہی نے پوچھا کہ کیوں ملنا چاہتے ہو میں نے کہا انھوں نے بلایا ہے۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کسی کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ اس نے میرا نام پوچھا اور اندر چلا گیا۔ بمشکل ایک منٹ بعد باہر آ کر اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

چودھری صاحب نے کھڑے ہوکر، جی ہاں کھڑے ہوکر، میرا استقبال کیا۔ کتابوں کے تھیلے سائکل پر ہی تھے۔ میں نے انھیں لانے کے لیے اجازت مانگی تو انھوں نے چپراسی سے کہا کہ باہر سائکل پر جو کچھ رکھا ہے لے آؤ۔ پھر چائے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر میں چائے آ گئی، بسکٹ بھی تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں بہت مودبانہ انداز میں جو بھی بن پڑا جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد انھوں نے کتابیں اور رسالے دیکھے اور آٹھ دس روپے میری جیب میں منتقل ہو گئے۔

میں رخصت ہونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ پولیس کے ایک افسر آ گئے اور دونوں کے درمیان باتیں ہونے لگیں۔ میں ان کی بات چیت میں مداخلت بھلا کیا کرتا، چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آج ان دونوں کی گفتگو کے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ ذات پات کی سیاست کا بیج اس وقت تک بویا نہیں گیا تھا لیکن کھیتوں کی گڑائی کے بارے میں ضرور سوچا جا رہا تھا۔ یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

پولیس افسر نے بھی تین رسالے خریدے اور ایک صاحب کا نام و پتہ بتایا اور کہا کہ انھیں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔ کل اتوار ہے صبح صبح چلے جایئے۔

یہ صاحب جن کا نام مہروترا یا ایسا ہی کچھ تھا لاٹوش روڈ پر شاید گولڈن بیکری[1] سے کچھ پہلے سڑک کی دوسری طرف جو پتلا سا راستہ پھوٹتا ہے اس میں دوسرے یا تیسرے مکان میں رہتے تھے۔ مکان کی کرسی اونچی تھی اور دو یا تین چھوٹے سے زینے چڑھنا پڑتے تھے۔

۱۔ یہاں بیکری کی حیثیت صرف حوالے کی ہے۔ معلوم نہیں اس وقت وہاں بیکری تھی یا نہیں اور اگر تھی تو اس کا نام یہی تھا یا کچھ اور، بہر حال، اب وہاں کوئی بیکری نہیں ہے۔ بیکری سے ذرا آگے کرونا شنکر سکسینہ رہتے تھے۔

میں نے پہلے چودھری گردھاری لال اور پولیس افسر کا حوالہ دیا، پھر اپنا تعارف کرایا۔ گورے چٹے اور دہرے بدن کے تھے اور ایک آنکھ پتھر کی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا انھیں اس کا احساس بھی نہیں۔ وہ نہایت اخلاق سے پیش آئے، دو تین کتابیں اور رسالے خریدے اور دو تین دوسرے لوگوں کے نام و پتے بتائے۔

کام چل نکلا تھا اور میں نے کئی بار سوچا کہ ٹیوشن چھوڑ کر یہی کام کیوں نہ کیا جائے۔

چودھری چرن سنگھ

یہ جاننے کے باوجود کہ چودھری چرن سنگھ کمیونسٹوں کے سخت مخالف بلکہ دشمن ہیں، میں کسی اتوار کو ان کے یہاں پہنچ گیا۔ میں نے ادبی کتابوں اور رسائل کے علاوہ چند ایسی کتابیں بھی رکھ لی تھیں جن کا تعلق ان کے محکمے کے کاموں سے تھا۔ وہ غالباً تعمیرات یا کسی ایسے محکمے کے وزیر تھے جس میں تعمیرات کا کام شامل تھا۔

پھاٹک پر کھڑے ہوئے سپاہی سے میں نے کہا کہ چودھری صاحب سے ملنا ہے۔ اس نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا کام ہے اور کہا سامنے کے کمرے میں بیٹھے ہیں، مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ ''کیا ان کے کمرے میں چلا جاؤں'' اس نے کہا، ''لیمپ جل رہا ہو اور وہ سر جھکائے بیٹھے ہوں تو اس کرسی پر بیٹھ جانا۔'' اس نے سامنے والے دالان میں کمرے سے تھوڑے فاصلے پر رکھی ہوئی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور بتایا، ''اگر لیمپ بجھا ہو تو چک اٹھا کر اندر چلے جانا۔''

میں نے دیکھا تو وہ لیمپ کی روشنی میں سر جھکائے ہوئے شاید کوئی فائل دیکھ رہے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں سر کب اٹھاتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں انھوں نے لیمپ بجھایا اور کرسی سے ٹیک لگالی۔

میں نے چک اٹھا کر سلام کیا اور اندر آنے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے لیمپ روشن کر دیا اور سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آنے کا مقصد دریافت کیا۔

چرن سنگھ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ درشت مزاج ہیں لیکن اس وقت ان کا رویہ قطعاً مختلف تھا... ان کے سوال کے جواب میں جو میرے آنے کے مقصد کے بارے میں تھا میں نے کہا،

''آپ کو دکھانے کے لیے سوویت یونین کی کچھ کتابیں لایا ہوں''

انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا جس میں کسی قسم کی ناراضگی کا شائبہ تک نہ تھا، اور بولے۔

''مجھے نہ کمیونزم سے دلچسپی ہے نہ سوویت روس سے۔''

میں نے کہا، ''دو چار ایسی کتابیں بھی لایا ہوں جو آپ کے محکمے کے کاموں سے تعلق رکھتی ہیں۔''

''دیکھیے مجھے ان کتابوں کی ضرورت ہوگی تو سرکاری طور پر منگا لوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کتابیں آپ لوگوں کے پاس کس طرح آتی ہیں اور ان کی فروخت سے حاصل ہونے والے روپے کس کام میں استعمال ہوتے ہیں۔'' ان کے اس جملے میں طنز کا عنصر تھا اور وہ شاید کہنا چاہتے تھے کہ یہ کتابیں روس سے مفت آتی ہیں اور ان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کمیونسٹ پارٹی کے کام آتی ہے۔ حقیقت جو بھی رہی ہو، مجھے اس بارے میں نہ اس وقت کچھ معلوم تھا نہ اب جانتا ہوں۔

اب کہنے کو رہ ہی کیا گیا تھا پھر بھی میں نے دو چار باتیں کیں جن کا انھوں نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے ان سے رخصت چاہی۔ انھوں نے پانی تک کے لیے نہ پوچھا، کھڑے ہو کر رخصت کرنے کی بات تو بہت دور کی ہے۔ کتاب تو ایک فروخت نہ ہوئی اور ان کی کمیونسٹ دشمنی بھی آشکارا ہوگئی، لیکن ان کی صاف گوئی نے ایک خوشگوار تاثر ضرور قائم کیا، اور یہ بڑی بات تھی کیونکہ ہم نوجوان ان دنوں ہر کمیونسٹ دشمن کو بے ایمان یا کوڑھ مغز سمجھتے تھے۔

تقریباً پندرہ سال بعد دو تین واقعات ایسے ہوئے جن سے ان کی اصول پرستی کے ساتھ ساتھ موقع پرستی بھی آشکارا ہوئی۔ ان میں سے ایک واقعے کا مجھ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن یہاں ذکر دونوں ہی کا کروں گا۔

برسوں بعد ان کی قیادت میں غیر کانگریسی حکومت قائم ہوئی۔ اس سے قبل انھوں نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اپنی اور اپنے گروپ کی کانگریس سے علاحدگی کا اعلان کیا۔ بلاشبہ اس وقت ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ان کی ہچکی بندھ گئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستانی سیاست میں ''آیا رام گیا رام'' کی داغ بیل ڈالنے والے چرن سنگھ ہی تھے۔

ساجھے کی ہانڈی چوراہے پر پھوٹتی ہے اور یہی اس حکومت کے ساتھ بھی ہوا۔

نیشنل ہیرالڈ کے چیف رپورٹر بہل صاحب چرن سنگھ کے بہت قریب تھے۔ وہ انھیں

یوگا کرانے ہر صبح جاتے۔ وہ محکمۂ اطلاعات سے متعلق رہ چکنے کے سبب تقریباً سارے وزرا کے قریب تھے لیکن چرن سنگھ کی بات ہی دوسری تھی۔

یہ بات ۱۹۶۷ء۔ ۶۸ء کی ہے۔ ایک رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے دفتر میں فون کی گھنٹی بجی۔ دوسرے سرے پر مسٹر بہل تھے۔ انھوں نے فون کر کے اطلاع دی کہ کابینہ کے غیر رسمی جلسے میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ حکومت مستعفی ہو جائے۔ کابینہ کے رسمی اور غیر رسمی جلسے میں فرق یہ ہوتا ہے کہ رسمی جلسے میں کابینی سکریٹری موجود ہوتا ہے اور جلسے کے فیصلوں کی حیثیت قانونی ہوتی ہے جب کہ کابینہ کے اراکین کے ایسے جلسے کی جس میں کابینی سکریٹری موجود نہ ہو کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی، لیکن اخلاقی اہمیت ضرور ہوتی ہے اور اس زمانے میں سیاست اور اخلاقیات میں مکمل بیگانگی نہیں قائم ہوئی تھی۔

اس رات شفٹ انچارج مسٹر رائے تھے اور میں چند ماہ قبل ہی سینیر سب ایڈیٹر بنایا گیا تھا۔ وہ صفحۂ اوّل بنانے پریس جا چکے تھے۔ میں نے انھیں یہ خبر بتائی تو انھوں نے کہا کہ ریاستی کابینہ میں اختلافات سے متعلق خبر کے آخر میں چند سطریں جوڑ دو۔

ان دنوں اخبار تیار کرنے کے کام کی نوعیت آج کل سے بالکل مختلف ہوتی تھی۔ اب تو صفحہ اوّل، بلکہ ہر صفحہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے کمپیوٹر پر تیار ہو جاتا ہے جب کہ اس زمانے میں کم سے کم پہلا صفحہ بنانے کے لیے چیف سب ایڈیٹر یا شفٹ انچارج کو پریس ضرور جانا پڑتا۔ ان دنوں کمپوزنگ میں ایک ایک حرف کا دھات کا بنا ہوا سانچہ جوڑ کر اسے چاروں طرف سے سُتلی سے باندھنے کے بعد پروف نکالا جاتا۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ کمپوز شدہ میٹر سے چھیڑ چھاڑ خاصی پریشانی کھڑی کرنے کے مترادف تھی، لیکن اغلاط تو درست کی ہی جاتیں۔ مسٹر رائے پہلا صفحہ بنانے میں مصروف تھے اور شاید اس ذہنی کیفیت میں انھوں نے اس اہم خبر کو پہلے والی خبر کے آخر میں جوڑ دینے کے لیے کہہ دیا تھا۔ مجھے اس قدر اہم خبر کے ساتھ اس سلوک پر خاصی حیرانی ہوئی۔

ان کی بات کے جواب میں مَیں نے کہا کہ خبر انھی چند سطروں سے شروع کر کے سرخی بھی اسی پر قائم کی جانا چاہیے، اصل خبر تو اب یہی ہے۔ مسٹر رائے نے بمشکل آدھے منٹ میں اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا اور گیلی پروف میری طرف بڑھاتے کہا، ''سرخی چار کالمہ ہو گی''۔

اگلے دن کابینہ کے غیر رسمی جلسہ کی خبر اور اس کا فیصلہ نیشنل ہیرالڈ میں صفحۂ اوّل پر نمایاں طور پر شائع ہوا۔ اس وقت لکھنؤ میں انگریزی کے صرف دو ہی اخبار تھے۔ نیشنل ہیرالڈ اور

پائنیر اور پائنیر میں یہ خبر نہیں تھی۔

چرن سنگھ، جنھوں نے کابینہ کے اس غیر رسمی جلسہ کا فیصلہ مسٹر بہل کو غیر رسمی طور پر بتا دیا تھا اس خبر کی اشاعت کے سبب ان سے کچھ ایسے خوش نہ تھے۔ خبر کی اشاعت نے اور وہ بھی نمایاں طور پر، ایک طرح سے حکومت کے ہاتھ باندھ دیے اور اب اس کے لیے فیصلے پر نظر ثانی کرنا ناممکن ہو گیا۔ بہل نے رائے صاحب سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے ساری بات تفصیل سے بتا دی۔ انھوں نے مسٹر بہل سے کہا کہ میں تو اسے کابینہ میں اختلافات کی خبر کے آخر میں جوڑنا چاہتا تھا لیکن سہیل کا اصرار تھا کہ اسی پر سرخی قائم کی جانا چاہیے۔ مسٹر بہل نے عذرِ گناہ کے طور پر یہ تفصیلات وزیر اعلیٰ کو بتائیں تو انھوں نے اس صحافی سے جس نے اس خبر کو اتنی اہمیت دی ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ بہل صاحب نے مجھ سے کہا تو میں نے معذرت کر لی۔ میرا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا کیوں کہ چیف سب ایڈیٹر تو مسٹر رائے تھے، میں تو ان کی ماتحتی میں کام کر رہا تھا۔

کابینہ کے غیر رسمی جلسے کے فیصلے کی تشہیر کے دو دن بعد اس پر تصدیق کی مہر کابینہ نے لگا دی اور چرن سنگھ نے گورنر کو حکومت کا استعفیٰ پیش کر دیا۔

دستور کے مطابق گورنر نے چرن سنگھ سے کہا کہ متبادل انتظام ہونے تک آپ ذمہ داریاں سنبھالے رہیں۔ نئی حکومت بننے میں خاصی دیر لگی۔ شاید دو چار دن بعد وہ سرکاری گاڑی سے میرٹھ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ فیض آباد میں کسی دوست سے ملاقات کے بعد اپنا سفر جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن وہیں ڈرائیور نے انھیں بتایا کہ آپ کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا ہے۔ یہ خبر اس نے ایک ڈھابے میں چائے پینے کے دوران ریڈیو سے سنی تھی۔ چرن سنگھ نے سرکاری کار واپس لکھنؤ بھیج دی اور خود شاید بس سے میرٹھ چلے گئے۔ ان کی اس بات نے مجھے خاصا متاثر کیا۔

چرن سنگھ دودھ کے دھلے نہیں تھے لیکن مغربی اتر پردیش میں وہ اس قدر مقبول تھے کہ جنتا پارٹی حکومت کی قیادت مرار جی دیسائی کے سپرد کی گئی تو میرٹھ اور آس پاس کے درجنوں دیہات میں ایک رات بالکل اندھیاری رہی، کسی نے ایک دیا روشن نہیں کیا... یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ان کی کمیونسٹ دشمنی سے سخت متنفر ہونے کے باوجود ان سے عوام کی محبت کے اس مظاہرے نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔

ٹھاکر ہرگووند سنگھ

لیجیے کتابیں بیچتے بیچتے بہت دور نکل آیا۔ کتابیں فروخت نہ کی گئیں تو میرا کام کیسے چلے گا؟ چلیے یہ کام جو سال سوا سال جاری رہا پھر شروع کریں۔ اس دوران بہت سے دلچسپ واقعات پیش آئے، کئی جگہوں پر ذلیل ہونا پڑا، دو ایک جگہ عزت بھی ملی۔ یہ بھی ہوا کہ جہاں سے بڑی توقعات وابستہ کی تھیں وہاں سے خالی ہاتھ لوٹا اور جہاں بس یوں ہی چلا گیا تھا وہاں اچھی خاصی تعداد میں کتابیں فروخت ہو گئیں۔ لیکن ان سب کا سلسلے وار ذکر ممکن نہیں۔ بہت سے واقعات ہی بھول گیا تو ان کی ترتیب کیا خاک یاد ہوگی۔ مزید یہ کہ میں آپ بیتی لکھ رہا ہوں، نامۂ اعمال نہیں۔ ویسے بھی کراماً کاتبین نہ خودنوشت کے مماثل کچھ لکھ سکتے ہیں اور نہ خودنوشت لکھنے والا نامۂ اعمال۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک میں انتخاب کا عمل لازمی ہے اور دوسرے میں مکھی پر مکھی بٹھانے سے مفر نہیں۔

ایک دن کتابیں لے کر ٹھاکر ہرگوبند سنگھ کے یہاں جن کی کوٹھی شاید پنچ بنگلیہ میں تھی گیا تو ان کے کمرے میں اسبابِ حیرت وافر مقدار و تعداد میں موجود پائے... تین الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں، سجی ہوئی نہیں۔ کتابیں دیکھ کر اندازہ ہوتا کہ انھیں بار بار چھوا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ آگے رکھی تھیں کچھ قطار میں ذرا دبی ہوئی، کچھ آڑی، کچھ بیڑی، ایک کتاب اسٹول پر رکھی ہوئی تھی۔

ٹھاکر صاحب نے پڑھے لکھے لوگوں کی طرح باتیں کیں، چائے پلائی اور ایک لمحہ کے لیے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ کتابوں کے کسی ہاکر سے بات کر رہے ہیں۔ انھوں نے تین چار کتابیں اور ایک رسالہ خریدا، کتابوں میں ترگنیف کا ناول ''باپ اور بیٹے'' (Fathers and Sons) بھی شامل تھا۔ میں رخصت ہونے لگا تو وہ پورٹیکو تک آئے۔ انھوں نے کہا کہ اگلے اتوار کو تو میں جونپور میں ہوں گا، چنانچہ اس کے بعد والے اتوار کو تشریف لائیے۔

اس وقت کے وزرا تک کس قدر شریف النفس، سیدھے سادے اور بھلے مانس ہوتے تھے۔ آج تو اس طرح کے کسی وزیر کا تصوّر تک محال ہے، ویسے ہوتے ضرور ہوں گے، اگرچہ کم کم۔ لیکن ہرگووند سنگھ کا معاملہ، کانگریس سے میری بدظنی کے سبب کچھ زیادہ ہی اہمیت کا حامل تھا بلکہ ایک طرح سے مقامِ حیرت۔ مکاں تو مکاں زماں تک بدل گئے لیکن حیرت اب تک باقی ہے۔

ایک اتوار چھوڑ کر اگلے اتوار کو ان کے یہاں گیا تو انھوں نے ''باپ بیٹے'' پڑھ لی تھی، اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ بزاروف کا کردار انھیں بہت پسند آیا تھا، مجھے بھی یہ کردار بہت پسند ہے۔ اس کردار کے علاوہ انھوں نے پچھلی اور نئی نسل کے رویّوں میں فرق کے بارے میں باتیں کیں۔

بات چیت کے دوران اس وقت کی ایک بے حد اہم اور خوب پڑھی جانے والی کتاب A Text Book of Marxist Philosophy کا بھی ذکر نکل آیا۔ یہ کتاب الٰہ آباد سے چھپی تھی اور اس کا ایڈیشن ختم ہو چکا تھا۔ ان کے پاس یہ کتاب نہیں تھی۔ میں نے ایڈیشن ختم ہو جانے کی اطلاع دیتے ہوئے شاید انھیں متاثر کرنے کے لیے بتا دیا کہ یہ کتاب میرے پاس موجود ہے، کہیے تو مطالعے کے لیے دے دوں۔

انھوں نے کہا، ''زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں واپس کر دوں گا''

تھوڑی دیر بعد میں رخصت ہونے لگا تو حسبِ سابق پورٹیکو تک آئے اور کہا کہ وہ کتاب ضرور لیتا آؤں۔ اگلی بار یہ کتاب میں نے انھیں دے دی۔

اس کے بعد بھی کتابوں کی فروخت کے سلسلے میں دس بارہ بار تو ان کے یہاں گیا ہی ہوں گا، ہر بار انھوں نے کچھ نہ کچھ کتابیں خریدیں، قیمت ہمیشہ نقد ادا کی لیکن میری کتاب واپس نہ کی، کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ پڑھے لکھے آدمی تھے اور کتابوں کے شوقین بھی۔ مجھے کتاب سے محروم ہو جانے کا افسوس تو تھا لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ اب بھی وہ ہے کسی قدرداں کے پاس ہی۔

ایک روسی کہاوت ہے، ''کتاب ادھار دینے والا بے وقوف ہے اور اسے واپس کرنے والا اس سے بڑا بے وقوف''۔ برسوں بعد میں نے یہ کتاب ایک ایسے صاحب سے جنھوں نے اسے خریدنے کے بعد کے دس برسوں میں اس کا ایک ورق بھی نہ پڑھا تھا، اور اسے اپنی ''متاعِ عزیز''[1] کہتے تھے حاصل کر لی اور خود کو بڑا بے وقوف ثابت نہ ہونے دیا۔

پاس ہی کے بنگلے میں ٹھاکر حکم سنگھ رہتے تھے وہ بھی کابینی وزیر تھے لیکن زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اور یہ بات چھپانے کی کوشش بھی نہ کرتے۔

ایک دن میں کچھ کتابیں لے کر ان کے یہاں گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں کچھ کتابیں دکھائیں تو انھوں نے نظر ڈالے بغیر تخت پر رکھ دیں۔ اس دوران میں

۱۔ اس کتاب کے مالک نے اسے اپنی ''متاعِ عزیز'' قرار دیتے ہوئے ابتداً معذرت کر لی تھی۔

نے "سویت یونین" اور دو ایک دوسرے رسائل جو بہت عمدہ کاغذ پر کئی رنگوں میں چھپتے تھے، نکالے تو انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک رسالہ میرے ہاتھ سے تقریباً چھین لیا اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے اور اپنی بولی میں جس کی نقل مطابق اصل میرے لیے ممکن نہیں، جو کہا وہ کچھ اس طرح تھا۔

"بھیا ہم پڑھت لکھت تو جانت نہیں، آٹھ دس روپے کے کھبسورت کتابیں دے جایا کرو، ہموٗ دیکھیں اور بچے بھی۔"

حافظ ابراہیم

ٹھاکر حکم سنگھ اور ٹھاکر ہرگوِند سنگھ کے بنگلوں کے درمیان یا ان سے پہلے حافظ ابراہیم کا بنگلا تھا۔ ایک دن مَیں صبح صبح ان کے یہاں پہنچ گیا۔ سائکل کے دونوں ہینڈلوں اور کیریئر پر کتابوں کے تھیلوں کے ساتھ۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ دھڑ دھڑاتے ہوئے کہاں گھسے چلے جا رہے ہو۔ برآمدے میں ایک لمبی سے میز جس کی اونچائی کم تھی، رکھی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کئی میزیں ملا کر رکھ دی گئی ہوں لیکن میں یقین سے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ میز پوش خاصے نیچے تک لٹک رہا تھا۔ چاروں طرف نیچی کرسیاں تھیں، میز سے مطابقت رکھتی ہوئی۔ ان کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے تھے، باقی خالی تھیں، پھر بھی کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ جو لوگ کھڑے تھے ان میں ایک وہ صاحب تھے جن کو امین آباد میں متعدد بار دیکھا تھا۔ وہ مقامی بلکہ ریاستی سیاست میں ایک مخلص اور ایماندار مسلم رہنما کے طور پر ابھر رہے تھے۔ شاید ان کا نام شفیق الرحمٰن یا ایسا ہی کچھ تھا۔ ان کے بارے میں کوئی غلط بات کبھی کسی سے نہ سنی تھی۔ لوگ ان کی عزّت کرتے۔ افسوس چند ہی برس بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

میں نے باہر چھجے میں کھمبے سے ٹکا کر سائکل کھڑی کی، ہینڈلوں سے دونوں تھیلے نکالے، اس کے بعد کیریئر پر سے دہرا کیا ہوا تھیلا نکالا اور ایک ہاتھ میں دو اور دوسرے میں ایک تھیلا لے کر دو تین زینے چڑھنے کے بعد کوٹھی کے اس حصّے میں پہنچ گیا جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ حافظ جی بید کی نیچی سی کرسی پر، لمبی سی میز کی چوڑائی میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے میز پر ایک ایسا پیالہ رکھا تھا جس کا اوپری حصّہ چوڑا اور پیندا چھوٹا تھا۔ پاس ہی طشتری میں بسکٹ رکھے ہوئے تھے جنھیں ایک ایک کر کے چائے میں ڈال کر وہ چمچے سے کھا رہے تھے۔ میں نے سلام کیا جس کا انھوں نے سر ہلا کر جواب دیا اور میں محفل کو محوِ تماشا چھوڑ کر ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کچھ لوگوں نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

حافظ جی نے بھی میری طرف دیکھا لیکن اس میں مجھ ناآزمودہ کار کی جرأت کی داد تھی نہ بیداد بلکہ کچھ اس طرح کا انداز تھا کہ میاں کیوں آئے ہو، کچھ کام ہے؟

میں نے کہا، ''روس اور کمیونسٹ پارٹی کی کچھ کتابیں لایا ہوں۔''

''وہ تو پڑھے لوگوں کو دکھایئے،'' انھوں نے کہا۔

اس زمانے میں کمیونسٹوں کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ ان کا جواب، ایک طرح سے، بلکہ یقیناً طنز تھا۔

''جی ہاں، انھیں تو دکھاؤں گا ہی لیکن آپ بھی دیکھیے،'' میرے مُنہ سے نکل گیا۔

حافظ جی کو اس جواب کی توقع نہ رہی ہوگی جو تھا بھی تھوڑا سا شوخ۔ وہ اس جواب سے کچھ گھبرا سے گئے اور انھوں نے وردی پوش چپراسی سے، جو اُن کے پاس ہی کھڑا تھا، کہا۔

''عتیق میاں کو بلاؤ''۔

تقریباً سات آٹھ منٹ بعد عتیق میاں آئے، سفید کرتے اور پتلی مہری کے پاجامہ میں۔ وہ ایک ہاتھ سے آنکھ مل رہے تھے۔

''جی میاں،'' انھوں نے حافظ جی سے کہا۔

حافظ جی نے ان کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولے۔

''ایسے میاں!'' ان کے لہجے میں نو سوا نو بجے دن میں آنکھیں ملتے ہوئے آنے پر اظہار ناپسندیدگی تھا۔ پھر انھوں نے عتیق میاں سے کہا۔

''دیکھو یہ صاحب کتابیں لائے ہیں، انھیں دیکھ لو''۔

عتیق میاں نے مجھے اشارہ کیا اور جس جانب سے آئے تھے اسی طرف بڑھے۔ وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دو تین کرسیاں پڑی تھیں پہلے خود بیٹھے پھر پاس والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے مجھ سے کہا اور کتابیں دیکھنے لگے۔ وہ کتابیں دیکھتے ہوئے ان پر یا مصنف کے بارے میں مختصراً تبصرہ بھی کرتے جاتے۔ ان میں سے چند کتابوں کے نام سے وہ یقیناً واقف تھے۔ داس کیپٹل دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا،

''اس کا دوسرا حصّہ نہیں ہے؟''۔

''جی وہ تو ابھی لکھا نہیں گیا۔''

یہ جملہ انھیں کچھ اچھا نہیں لگا، تھا بھی ایسا ہی۔ لیکن انھوں نے خود کو سنبھال لیا۔ میرے اس جواب کا فائدہ یہ ہوا کہ زیادہ تر کتابیں خرید لی گئیں۔ اس دوران اردو اور انگریزی میں کچھ روسی ناولیں اندر بھیجی گئی تھیں جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس گھر میں ایسی خواتین بھی ہیں جنھیں انگریزی ناولوں سے دلچسپی ہے۔

کتابیں تو میں نے ساری ہی دکھائیں، شروع میں کچھ زیادہ پر امید نہ تھا لیکن بعد میں اوپر سے جب کتابیں الگ الگ گڈیوں میں واپس آئیں تو معلوم ہوا زیادہ تر خرید لی گئی ہیں۔ دو چار عتیق میاں نے بھی خریدیں۔ کل ملا کر چالیس پچاس روپوں کی کتابیں فروخت ہوگئیں۔ یہ خاصی بڑی رقم تھی۔

بعد میں عتیق میاں منسٹر ہوگئے تھے۔ اس موقع پر سکریٹریٹ میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ جانے کیسے میں بھی وہاں موجود تھا۔ افسوس عتیق میاں کو بہت کم عمر ملی۔

کئی سال بعد جب حافظ ابراہیم مرکزی حکومت میں وزیر آبپاشی تھے لکھنؤ تشریف لائے جہاں ان کا قیام اسلم رضوی (احمد حسین دلدار حسین) کے یہاں تھا۔ ان دنوں شہر زبردست سیلاب کی زد میں تھا۔ اس سیلاب کے سلسلے میں حافظ جی سے منسوب ایک عجیب وغریب جملہ شہر میں گشت کر رہا تھا، کشتیوں پر سوار ہو کر۔

سیلاب کے دنوں میں اسلم صاحب نے جہاں ایک طرف، بظاہر فرنگی محل کی طرف سے، ٹیلے والی مسجد پر سیلاب زدگان کے خورد ونوش کے لیے تین یا چار دن تک لنگر کھولے رکھا وہیں انھوں نے حافظ جی سے ملاقات کے لیے شہر کے معززین کو چائے پر مدعو بھی کیا۔ میں کئی برسوں سے اسلم صاحب اور بعد میں ان کے چھوٹے بھائی اشفاق محمود رضوی کے بچوں کو پڑھاتا تھا، اس لیے مجھ سے بھی اس چائے پارٹی میں شریک ہونے کے لیے کہا گیا۔

حافظ ابراہیم نے مجھے پہچان لیا اور لان سے اسلم رضوی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے جب وہ میرے پاس سے گزرے تو انھوں نے مجھے غور سے دیکھا اور دھیرے سے کہا۔

''آپ ہی کتابیں لے کر میرے یہاں تشریف لائے تھے؟''

''جی ہاں،'' میں نے جواب دیا۔ وہ مسکرائے اور صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں اندازہ نہ کرسکا کہ اس مسکراہٹ میں طنز تھا یا میری جرأت رندانہ پر تبصرہ یا قدرت کے کھیل کا احساس کہ جو شخص چند سال قبل کتابیں بیچتا پھرتا تھا آج اس کا شمار معززین شہر میں ہوتا ہے۔ انھیں کیا معلوم

رہا ہوگا کہ میں اس گھرانے کے چند بچوں کا اتالیق ہوں۔

حافظ ابراہیم عالم فاضل نہ تھے لیکن لیکن نہایت شریف اور ایماندار سیاست داں تھے۔ ریاستی کانگریس کے امور میں ان کی رائے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی۔ پہلے ان کا تعلق مسلم لیگ سے تھا اور ریاستی اسمبلی کا پہلا الیکشن انھوں نے اسی کے ٹکٹ پر جیتا تھا لیکن بعد میں انھوں نے مسلم لیگ سے اختلاف کے باعث اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو کر کانگریس کے ٹکٹ پر الکشن لڑا اور کامیاب ہوئے اور پھر ریاستی اسمبلی کا الکشن ہو یا لوک سبھا کا وہ ہمیشہ بجنور سے تقریباً بلا مقابلہ منتخب ہوتے رہے۔

ایک دن قانون سے متعلق سوویت یونین کی کتابیں دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ کیوں نہ ہائی کورٹ کے وکلا کے چیمبر میں قسمت آزمائی کی جائے۔ چنانچہ میں نے کتابوں سے تینوں تھیلے بھرے اور ہائی کورٹ روانہ ہو گیا۔

روس کی مطبوعات بہت خوبصورت، معیاری اور سستی ہوتیں اس لیے آسانی سے فروخت ہو جاتیں۔ یہی وکلا کے چیمبر میں بھی ہوا۔ تقریباً ساری ہی کتابیں فروخت ہو گئیں۔ بعد میں بھی کتابیں لے کر وہاں گیا اور ہمیشہ شادکام واپس آیا۔

ایک صاحب تھے ڈاکٹر دھر، میڈیکل کالج سے متعلق تھے اور موجودہ ہنومان مندر سے گومتی کے کنارے کنارے جو سڑک جاتی ہے اسی پر بائیں ہاتھ کی ایک کوٹھی کی اوپری منزل میں رہتے تھے۔ وہ کتابوں اور خاص طور سے ناولوں کے بہت شوقین تھے۔ خوب کتابیں خریدتے اور وہ بھی نقد۔ میں ان سے یوں بھی واقف تھا کہ ان دنوں جب کمیونسٹوں کا ایک قدم جیل کے اندر اور دوسرا جیل کے باہر ہوتا تھا وہ ان کی ضمانتیں لیا کرتے۔ وہ خود بھی بہت خوبصورت تھے اور ان کی اہلیہ تو اور بھی۔ جب بھی ان کے یہاں میرا جانا ہوا ان دونوں نے چائے پلائے بغیر واپس نہ آنے دیا۔ وہ خاتون یوں بھی یاد ہیں کہ میں نے کسی عورت کو دو ڈھائی انچ لمبے بندے پہنے ہوئے پہلی بار انھی کی صورت میں دیکھا۔ بعد میں جب برج موہن ناتھ کاچر کے یہاں آنا جانا بڑھا تو ان کی والدہ اور بیوی کو بھی ایسے ہی بندے پہنے ہوئے دیکھا۔

سائکل کی ضبطی

ساری کتابیں نقد نہیں فروخت ہوتی تھیں، کچھ ادھار بھی بیچنا پڑتیں۔ ایسے زیادہ تر

خریداروں کی یادداشتیں خراب ہوتی ہیں، انھیں پیسے دینا یاد ہی نہ رہتا اور مجھے چشم مروّت
اشارے اور کنایے سے بھی کچھ کہنے نہ دیتی۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے تھے جن کے بارے میں
میرے لیے آج بھی یہ سوچنا مشکل ہے کہ وہ جان بوجھ کر قرض ادا کرنے سے گریز کرتے تھے،
ممکن ہے یہ سوچتے رہے ہوں کہ آٹھ دس روپوں کا کیا، جب چاہیں گے دے دیں گے اور یہ بات
شاید ان کے خیال میں بھی نہ آتی رہی ہوگی کہ اتنے سے روپے کسی کے لیے بڑی رقم ہو سکتے ہیں۔
اس کے علاوہ یہ بھی ہوتا کہ میں اپنے حصے کی رقم سے زیادہ خرچ کر دیتا اور اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ
پیپلس بک ہاؤس کا قرض بڑھتا گیا اور اس کے منیجر محمد مسعود کا تقاضہ بھی۔ وہ بھی تو کسی کو جواب دہ
تھے۔ آخر ایک دن مسعود نے میری سائکل رکھ لی اور کہا قرض ادا کر دیا ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد
سے کہلا دو، سائکل واپس کر دوں گا۔ ڈاکٹر احمد پی پلس بک ہاؤس کے نگراں تھے۔

رات تو اسی وقت اترنے لگی تھی جب میں پی پلس بک ہاؤس میں تھا۔ پوچھتے پاچھتے
ڈاکٹر احمد کے گھر بلکہ اس کے باہر تک پہنچا تو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ ماڈل ہاؤسیز میں خلیق الزماں
صاحب کے مکان کے تقریباً سامنے، سڑک کے دوسری طرف ایک بڑا سا مکان تھا جس کا لوہے کا
پھاٹک کھٹکے سے بند ہوتا اور باہر سے کھولا جا سکتا تھا لیکن پھاٹک کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہ ہوئی
کیوں کہ اندر کے مکانوں کے سامنے کے میدان میں بڑے بڑے کتے اپنے خطرناک اردلیوں
کے ساتھ ٹہل رہے تھے اور ان میں سے دو تو مانس گن سونگھتے ہوئے پھاٹک تک آ گئے تھے۔
ڈاکٹر احمد اندر کے کسی مکان میں بطور کرایے دار رہتے تھے۔ مجبوراً میں واپس چلا آیا۔

تھوڑے سے روپوں کے لیے سائکل کا رکھ لیا جانا میرے لیے شرمندگی کا بھی باعث
تھا اور مجھے غصہ بھی تھا۔ کم از کم پانچ چھے سال کمیونسٹ تحریک میں حصہ لینے، کئی بار جیل جانے اور
طرح طرح کی تکلیفیں اٹھانے کا صلہ کیا یہی تھا کہ بیس پچیس روپوں کے لیے سائکل رکھ لی
جائے؟ میں نے چار پانچ دن تک پی پلس بک ہاؤس کا رخ کیا نہ ڈاکٹر احمد سے ملنے کی دوبارہ
کوشش کی۔ پھر ایک دن بشیشر ناتھ روڈ سے گذرتے ہوئے دل نہ مانا اور پی۔ بی۔ ایچ۔ چلا ہی
گیا۔

مسعود شرمندہ شرمندہ سے نظر آئے اور اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے انھوں نے
ہنستے ہوئے کہا، ''ارے بھائی اتنے دنوں کہاں غائب رہے۔ میں نے تو مذاق کیا تھا، آپ
ناراض ہو گئے۔ ہر روز دوکان کھولتے وقت سائکل باہر رکھنا پڑتی ہے اور بند کرتے وقت اندر،

مجھے اس ذمے داری سے نجات دلائیے... باہر رکھی ہوئی ہے، آج ضرور لے جائیں''۔

سائکل میں نے پہلے ہی دیکھ لی تھی۔

کئی مہینے بعد درگا مسرانے، جو خود بھی یہی کام کرتا تھا، بتایا کہ مسعود نے ڈاکٹر صاحب کو ساری بات بتائی تو وہ ان پر بہت خفا ہوئے اور سائکل فوراً واپس کر دینے کی ہدایت کی۔

اس واقعے کے بعد کتابیں فروخت کرنے سے میرا دل اچاٹ ہو گیا۔

کتابیں فروخت کرنے کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن ہر تیسرے چوتھے پی پلس بک ہاؤس کا ایک آدھ چکر لگانا جاری رہا کیونکہ وہ ایک طرح سے ہم خیال دوستوں کی ملاقات کا اڈا بھی تھا۔

دوکان سے ملحق ایک پتلا سا راستہ تھا جس کے باہر لوہے کا گیٹ لگا تھا جو صبح شام ڈاکٹر رشید جہاں کے مطب کے وقت، مریضوں کے لیے کھول دیا جاتا۔ ویسے تو پاس کے پھاٹک سے بھی اندر جایا جا سکتا تھا لیکن مریض معلوم نہیں کیوں یہی راستہ استعمال کرتے۔

ڈاکٹر رشید جہاں کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ پی۔ بی۔ ایچ۔ میں مسعود سے باتیں کر رہی تھیں۔ رنگ سفید[1] زیادہ تھا، سرخ کم۔ بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ ان کا یہ رنگ ایک بیماری کا نتیجہ تھا۔ بوٹا سا قد، خوش مزاج، ملنسار۔ ان کے شوہر ڈاکٹر محمود الظفر بہت بڑے مورّخ تھے۔ انھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا یا ممکن ہے دیکھا ہو اور بھول گیا ہوں۔ ان کا بیٹا کرسچین کالج میں میرے ساتھ تھا اور غالباً اس کا نام جاوید تھا۔

ڈاکٹر رشید جہاں پارٹی کے کل وقتی کارکنوں کی، جنھیں بس تیس چالیس روپے مشاہرہ ملتا تھا، مدد کیا کرتیں۔ وہ کبھی کبھی سرور صاحب کے بیرور روڈ کے مکان پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں بھی شرکت کرتیں۔ ایک جلسے میں انھوں نے Species پر مضمون پڑھا تھا۔ انھوں نے Species کا ترجمہ جنس کیا تھا۔ سرور صاحب اس ترجمے سے متفق نہ تھے اور جب انھوں نے اس سلسلے میں شک وشبہ کا اظہار کیا تو ڈاکٹر رشید جہاں نے کہا کہ میں اردو فارسی سے زیادہ واقف نہیں۔ مجھے تو یہ ترجمہ فارسی اور عربی کے ایک عالم نے بتایا ہے۔

علیم صاحب نے کہا، ''ٹھیک ہے'' تو سرور صاحب خاموش ہو گئے۔

بات چل رہی تھی پی پلس بک ہاؤس کی اور پہنچ گئی سائکل کی ضبطی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے تک۔ کیوں نہ وہیں لوٹ چلیں جہاں سے چلے تھے۔

۱۔ حال ہی میں معلوم ہوا کہ رشید جہاں سانولی تھیں۔

یہ بات ان دنوں کی ہے جب ڈاکٹر ردر دت بھرڈ واج کو طویل عرصے تک جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد دق کا مرض ہوگیا تھا اور وہ بھوالی سینی ٹوریم میں زیر علاج تھے۔ ان دنوں دق کا مرض اور موت ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ پی۔ پی۔ ایچ۔ میں ٹین کا ایک مقفل ڈبہ رکھا ہوا تھا جس پر انگریزی میں Comrade Bharddawaj Relief Fund لکھا تھا۔

راج رشی ٹنڈن

ایک دن میں دوکان میں تھا کہ راج رشی ٹنڈن آ گئے۔ کتابیں دیکھتے رہے، دو چار خریدیں بھی۔ اسی وقت ان کی نظر اس ڈبے پر پڑی تو انھوں نے مسعود سے ڈاکٹر بھردواج کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ مسعود نے جواب میں کچھ زیادہ تو نہیں کہا لیکن ان کے مختصر سے جواب کا انداز اور پھر خاموشی بہت کچھ کہہ گئی۔

ٹنڈن جی نے اپنی ایک ایک جیب ٹٹولی اور ان میں جتنے بھی روپے پیسے تھے سب اس ڈبے میں ڈال دیے۔ ان کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی۔ سیاسی اختلافات اپنی جگہ اور ذاتی تعلقات، محبتیں، مروتیں، ضرورتیں اور مجبوریاں اپنی جگہ۔

کم ہی لوگوں کو شاید علم ہو کہ ٹنڈن جی الٰہ آباد میں ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد کے ساتھ کسانوں کی تنظیم میں کام کر چکے تھے۔ ڈاکٹر احمد معاشیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی تھے لیکن ہندوستان میں کسانوں کو منظم کرنے اور کسان سبھا کی تعمیر میں ان کا بنیادی رول تھا۔ دو تین سال قبل ٹائمز آف انڈیا کے ایک مضمون میں انکشاف کیا گیا تھا کہ آزادی سے قبل شمالی ہندوستان کے دیہی علاقوں میں پنڈت نہرو کے جلسوں میں بھیڑ اکٹھا کرنے کا کام انھی کے سپرد ہوتا تھا۔

نظری اعتبار سے اب ٹنڈن جی کا حال ان کے ماضی سے بالکل مختلف تھا۔ سیاست اور زندگی کی جانب اپنے رویّے میں وہ قدامت پسند ہو گئے تھے۔ لیکن فرقہ پرستی اور ناانصافی ان کی قدامت پسندی کو چھو کے نہیں گئی تھی۔ اس بات کا بھی علم کم ہی لوگوں کو ہوگا کہ ٹنڈن جی کی مادری زبان اردو تھی اور فارسی سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ ہندی ان کی اکتسابی زبان تھی اور اس کے فروغ کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔

ٹنڈن جی ریاستی اسمبلی کے اسپیکر ہونے کے علاوہ ہندی ساہتیہ سمیلن یا اسی طرح کی کسی دوسری انجمن سے بھی متعلق تھے۔ اس انجمن نے اپنے ان ممبروں پر جو اسمبلی یا کونسل کے

رکن تھے ایوان میں اردو کے الفاظ استعمال کرنے پر پابندی لگانے کے ساتھ ایک آنہ فی لفظ کے حساب سے جرمانہ بھی مقرر کر دیا تھا۔

اتفاق سے چند دن قبل ٹنڈن جی نے اپنے ایک بیان میں اردو کو قوم دشمن (Anti-national) قرار دیا تھا اور اردو حلقوں اور اخبارات میں ان کے خیالات پر خاصی لے دے ہوئی تھی۔ حیات اللہ انصاری نے قومی آواز میں اداریہ بھی لکھا تھا۔

ٹنڈن جی کی جیپ پی۔ بی۔ ایچ۔ کے باہر کھڑی تھی اور انھوں نے دوکان سے نکل کر ڈرائیور کے پاس والی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے پائدان پر پیر رکھا ہی تھا کہ میں نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور کہا، ''میں یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں اور آپ کے پانچ دس منٹ چاہتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ نام کیا ہے تمھارا؟'' ٹنڈن جی نے کہا۔

میں نے اپنا نام بتایا اور کہا، ''ٹنڈن جی آپ نے کچھ دنوں پہلے اپنے ایک بیان میں اردو کو قوم دشمن کہا ہے۔ مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کوئی زبان قوم دشمن یا قوم پرست کیسے ہو سکتی ہے۔ انسان میں تو یہ برائی اور اچھائی ہو سکتی ہے...لیکن؟''

مجھے نہیں یاد کہ میں نے یہ بات کتنے جملوں اور کن الفاظ میں کہی تھی لیکن نفسِ مضمون یہی تھا۔

ٹنڈن جی نے کیا جواب دیا اور اپنے نکتہ نظر کی حمایت میں کیا کیا دلیلیں دیں یہ تو نہیں یاد مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ بحث آدھے گھنٹے سے زیادہ چلی تھی۔ شروع میں تو ٹنڈن جی نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن جب وہ اپنی دلیلوں کو میرے حلق کے نیچے نہ اتار سکے اور میں ان کی بات ماننے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوا تو انھیں غصہ آ گیا اور انھوں نے اس عالم میں اردو اور فارسی کے الفاظ اور اشعار تک کا خوب خوب استعمال کیا۔

اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ بے چین ہو رہے ہیں، جگہ جگہ کھجلی ہو رہی ہے، اس لیے میں نے بحث کو طول دینے کی کوشش نہ کی۔ یوں بھی وہ عالم تھے، مجاہد آزادی تھے، اسمبلی کے اسپیکر تھے اور میرے بزرگ۔ ظاہر ہے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ مجھ ایسے ایرے غیرے سے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گھنٹوں بحث کریں۔ چنانچہ میں نے بحث ختم کر دی لیکن خود کو ایک تیکھا جملہ کہنے سے باز نہ رکھ سکا۔

''ٹنڈن جی اس وقت کی بات چیت سے ہندی کا بہت فائدہ ہوا۔''

''وہ کیسے؟'' انھوں نے پوچھا

''ہندی ساہتیہ سمّیلن کا فیصلہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا، آدھ گھنٹے کی اس بات چیت میں آپ صرف اردو بلکہ فارسی آمیز اردو بولتے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو جرمانے کے طور پر پچاس روپے تو ادا کرنا ہی چاہیے۔''

''بہت شیطان ہو،'' انھوں نے کہا اور اچک کر جیپ میں بیٹھ گئے اور میری طرف دیکھے بغیر انھوں نے کہا، ''کبھی گھر آنا۔''

میں نے جرمانے کی بات میں ایک گھپلا کر دیا تھا۔ فیصلہ اسمبلی یا کونسل میں اردو بولنے تک محدود تھا لیکن میں نے ان کی دیواریں توڑ کر حدیں وسیع کر دی تھیں۔ انھیں اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔

ان دنوں ٹنڈن جی شاید ''علی منزل'' میں رہتے تھے، جو محض چند قدم پر تھی لیکن افسوس میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

ایک بار ٹنڈن جی پر کسی نے اسمبلی میں عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ اس وقت ڈپٹی اسپیکر مسند صدارت پر تھے۔ جوں ہی ٹنڈن جی کو پتہ چلا انھوں نے اسپیکر کی کرسی سنبھالی اور ایوان کی کارروائی روک کر کہا، ''تحریک عدم اعتماد تو بعد کی بات ہے۔ ایک شخص بھی کھڑے ہو کر کہہ دے کہ اسے میری غیر جانبداری پر شبہ ہے تو میں فوراً استعفا دے دوں گا۔''

ایک آواز نہ بلند ہوئی۔ وہ شخص بھی خاموش بیٹھا رہا جس نے عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا۔

◆◆◆

سونے کی ہنسلی

دادی امّاں سرخ سفید اور دبلی پتلی تھیں۔ وہ کشمیری تھیں۔ سکینہ بیگم نام تھا۔ بھوپال اور رتھیڑی والی پھوپیاں رنگ کے معاملے میں انھی پر پڑی تھیں لیکن ابا دادے ابا پر گئے تھے، ذرا سا نکلتا ہوا گندمی رنگ، چچا کا رنگ کم تھا۔ فتح یاب بڑے ابا کو تو میں نے دیکھا ہی نہیں، لیکن لکھنؤ آنے کے بعد بڑی امّی کو ضرور دیکھا۔ ان کا مکان کلے اسکوائر میں تھا۔ ان کی طالب علمی کے زمانے کی ایک تصویر دیکھ کر جس میں وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ تھیں میں نے کہا تھا کہ ان کی صورت لیاقت علی خان کی بیگم رعنا لیاقت علی سے کتنی ملتی ہے۔ میری بات سن کر وہ ہنس دی تھیں اور انھوں نے کہا تھا یہ وہی ہیں، شادی کے بعد رانا سے رعنا ہو گئیں۔ معلوم نہیں کتنا سچ، کتنا جھوٹ۔

بڑی امّی والدہ سے ملنے اکثر آتیں لیکن دادی امّاں کی موجودگی کے دنوں میں مَیں نے انھیں اپنے گھر، یعنی ماموں جان کے گھر میں، کبھی نہیں دیکھا۔ انھوں نے دوسری شادی کر لی تھی اور شاید وہ اپنی صورت دکھا کر دادی امّاں کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھیں۔ ان کے دوسرے شوہر پھٹیچر سے تھے۔ گھر کے نوکر معلوم ہوتے۔ بڑی امّی نے ان سے شادی شاید اپنی جائداد کی دیکھ بھال کے لیے کی تھی۔ ان کے مکانات الٰہ آباد میں بھی تھے۔ میں الٰہ آباد میں بھی ایک بار ان کے گھر گیا تھا۔ تصویر والا واقعہ الٰہ آباد ہی کا ہے۔

فتحیاب بڑے ابا کے بیٹے سید اعجاز حسن جوبلی ٹریننگ کالج میں بی۔ ایڈ۔ کر رہے تھے اور ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ہر سنیچر کو وہ پیدل کلے اسکوائر جاتے اور ماں کے ساتھ ایک دن گزار کر دوشنبہ کی صبح کو اسی طرح لوٹ آتے۔ بے حد بااصول، شریف اور عملی انسان تھے۔ برسوں بعد انیس نصرت کے بھائی محمد ابراہیم کو پہلی بار دیکھا تو اعجاز بھائی بہت یاد آئے۔ بات چیت کے انداز، برتاؤ اور رویّوں میں دونوں کے درمیان بہت مماثلت تھی۔ اعجاز بھائی بھی پاکستان چلے گئے تھے۔ وہ وہاں پبلک سروس کمیشن میں سائکالوجسٹ تھے۔ میں نے رابطہ قائم کرنے کی کوشش

تو کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

اب دادی امّاں زیادہ تر محی الدین پور میں رہتیں لیکن سال میں ایک بار پھوپی اور امّاں کے پاس ضرور آتیں۔ بھوپال جاتے ہوئے پہلے لکھنؤ میں رکتیں اور آموں کا موسم ہوتا تو کئی جھابے آم ساتھ میں ضرور ہوتے اور بھوپال سے ہوتے ہوئے آتیں تو گھر میں استعمال کی دو چار چیزیں لاتیں اور رخصت ہوتے وقت سب کو نہال کر دیتیں۔ میں اور ئی سے آیا ہوا ہوتا تو دس روپوں کا مستحق قرار پاتا۔ لیکن وہ یہاں چار چھے دن سے زیادہ نہ رکتیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ہم ہی لوگ بار بنے ہوئے ہیں۔

ماموں جان کا مکان تو زیادہ بڑا نہ تھا، محی الدین پور میں مَیں نے دیکھا کہ وہ آنگن لمبائی میں پار کرتیں، بے خیالی میں کمر بند لٹک جاتا اور چابی کا گچھا جیسے ہی ان کے گھٹنے سے ٹکراتا تو وہ رک جاتیں، ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے کمر بند نیفے میں گھرس لیتیں۔

گھر میں ان کے کاموں کے لیے ایک عورت اور باہر کے کاموں کے لیے ایک آدمی تھا جسے وہ منشی جی کہتیں۔ منشی جی سے وہ پردہ کرتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ان دنوں سے پہلے جب وہ بہت بڈھی ہوگئی تھیں، منشی جی نے ان کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی ہوگی۔ وہ منشی جی سے بات اپنی ملازمہ کے توسط سے کرتیں۔ ایک بار منشی جی سے اس طرح بات کرتے ہوئے میں نے انھیں دیکھا تھا۔ وہ بوا کے پیچھے پھاٹک کی اوٹ میں کھڑی تھیں۔ لیکن چوں کہ ان کا قد نکلتا ہوا تھا اس لیے ممکن ہے ان کے سر کے بالوں پر منشی جی کی نظر پڑ گئی ہو۔ ان کی گردن پر ہلکی ہلکی جھریاں تو پڑ گئی تھیں لیکن رنگ ذرا بھی مٹ میلا نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میں دروازے پر ان کے ساتھ نہیں تھا، بس اُچکتا پھاندتا اُدھر سے گذر گیا تھا۔

دادی امّاں کے پاس سونے کی ایک بھاری ہنسلی تھی۔ میں نے بھی دیکھی تھی۔ ایک بار چچا نے اس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہنسلی کھوگئی ہے۔ دادی امّاں سے کوئی ذکر کرتا تو خاموش رہتیں اور ان سے بہ اصرار پوچھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ آخر وہ سید وزیر حسن کی بیوہ تھیں، اور لیے دیے بھی رہتیں۔ وہ کھڑی ہوتیں تو نواب چچا اس عمر میں بھی ان کے سامنے بیٹھنے کی ہمت نہ کرتے۔

نواب چچا بہت غصور تھے لیکن دادی امّاں کے سامنے کسی پر غصہ کرتے بھی میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ امّاں کو دادی امّاں بہت چاہتی تھیں اس لیے نواب چچا کا خیال تھا کہ یا تو

دادی امّاں نے ہنسلی انھیں دے دی یا انھوں نے رکھ لی۔ امّاں کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ دادی امّاں نے ان سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا تھا اور کچھ دنوں بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال سے امّاں کے محی الدین پور مستقلاً رہنے کا آخری امکان بھی ختم ہو گیا۔ خبر ملتے ہی امّاں، عمران اور نجمہ گاؤں گئے تھے۔ اورئی میں میرے چھماہی امتحان ہو رہے تھے اس لیے امّاں نے مجھے مطلع بھی نہیں کیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں بلوغت کی قانونی عمر کیا تھی لیکن وہ منزل شاید قریب تھی، جبھی تو میرے نام سے وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ جن وکیل صاحب کے سپرد یہ کام ہوا تھا ان کا نام تو نہیں یاد لیکن مکان یاد ہے۔ کرسچین کالج سے امین آباد جانے والی سڑک کے پہلے موڑ پر داہنی جانب چار پانچ گھر چھوڑ کر ان کا مکان تھا۔ نیچے دوکانیں تھیں اور اوپر کی منزل پر وہ رہتے تھے۔ ان کے یہاں دو تین بار کا جانا یاد ہے۔ ایک بار ماموں جان کے ساتھ گیا تھا۔

اس سلسلے میں جلدی کے کئی سبب تھے۔ اورئی کے ڈاک خانے میں ابّا کا اکاؤنٹ تھا، ان کی ڈیڑھ پونے دو مہینے کی تنخواہ باقی تھی اور کوآپریٹیو سوسائٹی میں ایک ہزار روپے جمع تھے۔ مزید یہ کہ اورئی کے تینوں مکان میرے نام تھے۔ پوسٹ آفس کا اکاونٹ جانے کیسے پہلے ہی حنا پوسٹ آفس (چوک) میں منتقل کرالیا گیا تھا اور امّاں مجھ سے کبھی پانچ کبھی دس روپے نکلواتیں۔ ایک بار دو روپے بھی نکلوائے تھے۔ ان دنوں حنا پوسٹ آفس کے پوسٹ ماسٹر خبیر لکھنوی تھے جو مرزا محمد جعفر اوج کے شاگرد اور زبردست دبیریے تھے۔

کوئی ایک مد اور تھی جس کا چیک یا ادائیگی کے کاغذات اورئی سے ملے تھے اور رقم لکھنؤ میں اسٹیٹ بینک سے حاصل کرنا تھی۔ میں امّاں کے ساتھ بینک گیا تو معلوم ہوا کہ دستخط کی شناخت کرانا ہوگی۔ یہ بات کبھی سوچی بھی نہ تھی۔ مجھے فوراً اسد اسرن مسرا کا خیال آیا اور میری نظریں انھیں تلاش کر رہی تھیں کہ انھیں جلدی جلدی بینک میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے کام بتایا تو بولے دو دن بعد آیا ہوں، اندر جا کے اپنی صورت تو دکھا دوں۔ ابھی آیا۔ یہ کہتے ہوئے وہ سینے کی اونچائی تک کے کیبنوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک تو میری نظروں نے ان کا پیچھا کیا۔ پھر وہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ میں سمجھا کہ بہانہ بنا کے چلے گئے۔ ایسے موقعوں پر برے خیال پہلے آتے ہیں لیکن مشکل سے پندرہ منٹ بعد وہ آ گئے اور

بولے کہاں دستخط کرنے ہیں۔ میں نے بلکہ کلرک نے بتایا تو انھوں نے Signature verified لکھ کر دستخط کر دیے اور متعلقہ کلرک سے کہا، "یہ میرے دوست ہیں، ان کا کام جلدی کر دینا"۔ سدا سرن میرے کافی ہاؤس کے دوست تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ بات کم سے کم ۱۹۵۰ء کے آخر یا اگلے سال کے شروع کی ہے۔

سَو روپے کی چوری

میرا خیال ہے کہ چار پانچ ہزار روپے امّاں کو ملے تھے اور میں نے انھیں دکھا کر یا چھپا کر... زیادہ امکان ہے کہ چھپا کر ہی... سو روپے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔ امّاں کے ہاتھوں میں چھید تھے۔ پیسے ان کے ہاتھ میں ٹکتے ہی نہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ قمر بھائی کے یہاں جاؤں گی، بہت دن سے ان کی بیوی بچوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ روپے کاٹ رہے ہیں۔

قمر بھائی لال باغ میں دعا گھر کی قطار والے مکانوں میں اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ راستہ قندھاری بازار لین سے تھا۔ ہم دونوں رکشے پر تھے۔ میں پی پلس بک ہاؤس کے سامنے اتر گیا۔ وہ چلی گئیں۔ شام کو گھر یعنی قاضی باغ پہنچا تو امّاں اس وقت تک آئی نہ تھیں لیکن ذرا سی دیر میں آ گئیں، تانگے پر، لدی پھندی۔ میرے خیال میں گھر میں کوئی ایسا نہ ہوگا جس کے لیے وہ کچھ نہ کچھ لائی نہ ہوں، علاوہ اپنے بچوں کے۔ وہ اپنے بھائی اور ان کی اولادوں پر فدا تھیں... میں نے اوپر لکھا ہے کہ امّاں کے ہاتھوں میں چھید تھے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ انھوں نے یہ چھید اس بوجھ کی تلافی کے لیے بنا لیے ہوں جو ہم لوگ ماموں جان پر بن گئے تھے۔

ماموں جان میونسپلٹی میں سینیٹری انسپکٹر تھے۔ یافت کم تھی، اگرچہ کچھ ایسی کم بھی نہ تھی کیوں کہ تنخواہ کے علاوہ آمدنی کے اوپر کے ذرائع بھی تھے، لیکن انھوں نے شوق طرح طرح کے پال رکھے تھے۔ ویسے کوئی نہ کوئی شوق تو ہر شخص پالتا ہی ہے لیکن کوئی پان، سگریٹ اور ریس کے علاوہ شامِ اودھ کی رنگینی کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے پر اتر ہی آئے تو بھلا کیا کِیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ممانی جان ہمیشہ پریشان رہتیں۔ چار بیٹی بیٹے تھے۔ بیٹا آرٹس کالج میں تھا اور بیٹیاں کشمیری محلہ گرلس اسکول میں۔ امّاں، مَیں، عمران اور نجمہ اوپر سے بوجھ بن گئے تھے۔

انھی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میری زندگی پر بہت اثر ڈالا۔ ایک دن میں کھانا

کھا رہا تھا، اکیلا۔ میں نے ایک روٹی اور مانگی۔ روٹی تو خیر آ گئی لیکن اسی وقت مَیں نے چار آنکھوں میں جو کہانی پڑھی اس نے ہر وقت کے کھانے میں ایک روٹی کم کر دی... اس دن مجھے احساس ہوا کہ یتیمی عزّتِ نفس کی محرومی کے علاوہ اپنے ساتھ اور کیا کیا لاتی ہے۔ کچھ دنوں بلکہ دو چار مہینے بعد مجھے خیال ہوا کہ جوتا پھٹتے پھٹتے اب پہننے کے قابل نہیں رہ گیا ہے۔ میں نے امّاں سے کہا، لیکن وہ نیا جوتا خریدنے کے لیے روپے کہاں سے لاتیں۔ اسٹیٹ بینک سے جو روپے ملے تھے وہ ختم ہو چکے تھے۔ انھوں نے جانے کہاں سے جوڑ بٹور کے دو پونے دو روپوں کا انتظام کیا اور میں نے کسی کے ساتھ جا کر ایک جوڑ جوتا خریدا... مرمّت، ٹھونک پیٹ اور خوب پالش کر کے بظاہر نئے کو منہ چڑاتا ہوا؛ نخاس میں اتوار کے دن، اِس وقت کی "حاجی صاحب کی کپڑوں کی پرانی دکان" کے سامنے کی سڑک کے کنارے سے۔ لیکن پرانا جوتا خریدنا کچھ ایسا برا نہ لگا کہ آہستہ آہستہ اس زندگی کا عادی ہونے لگا تھا۔

بہت سی باتیں جو اس وقت سمجھ میں نہ آتی تھیں بعد میں سمجھ میں آئیں۔ ہر روز دو تین لوگ ماموں جان کو پوچھنے آتے۔ اکثر کہلا دیا جاتا کہ گھر پر نہیں ہیں۔ کبھی کبھی انھیں باہر آنا ہی پڑتا تو گفتگو کچھ ایسے لہجے میں ہوتی کہ مجھے اچھی نہ لگتی۔ اس طرح اونچی آواز میں بات ابّا سے، دادے ابّا سے، پھوپا سے یا خود مجھ سے کسی نے کبھی نہ کی تھی، نہ اورئی میں، نہ بھوپال میں اور محی الدین پور کی تو بات ہی دوسری تھی۔ وہاں تو ہم میں سے کوئی بھی اندر سے آتا تو سب کھڑے ہو جاتے، نوکر چاکر، کارندے اور دوسرے بھی۔

تینوں مکان جو میرے نام تھے فروخت کرنے کے لیے امّاں کے ساتھ اورئی جانا تو یاد ہے لیکن ان کی قیمت کیسے طے ہوئی تھی، رجسٹری کہاں ہوئی تھی کچھ بھی یاد نہیں۔ مگر دو تین باتیں یاد ہیں۔ اس وقت میں نے انٹر پاس ہی کیا تھا۔ تینوں مکان اٹھائیس ہزار میں فروخت ہوئے تھے اور ان سردار جی نے جنھیں میں نے مکان کی چابی دی تھی، دو دن پہلے کہا تھا، "پُتر، مکان بیچ کیوں رہے ہو، ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ..."

تینوں مکان انھیں نے خریدے تھے۔

اورئی سے یہ روپے لکھنؤ کیسے آئے، مجھے نہیں معلوم... لیکن ایک بات جیسے یکا یک معلوم ہو گئی۔ ماموں جان پاکستان جا رہے ہیں۔ اتنے دن انتظار انھوں نے اس لیے کیا تھا کہ مستعفی ہوں تو پنشن پر اثر نہ پڑے۔ وہ مستعفی ہو کر پنشن فروخت کر چکے تھے۔ کچھ ایسے لوگوں

کا، جو ہر تیسرے چوتھے دن چکر لگاتے تھے، اب آنا بند ہو گیا تھا۔ گھر کا کچھ سامان نہایت خاموشی سے نخاس میں فروخت کر دیا گیا۔ جو لے جایا جا سکتا تھا باندھا جانے لگا۔ لیکن کچھ روپے وہاں کے لیے بھی چاہیے تھے۔ اس کا انتظام ہو گیا تو ایک دن ماموں جان اپنی چھوٹی بیٹی عطیہ کے علاوہ بیوی بچوں سمیت پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔

ماموں جان کے جانے کے چند دنوں بعد لوگوں نے انھیں پوچھتے ہوئے آنا شروع کیا، لیکن چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔ لوگ آتے، آواز لگاتے اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ پاکستان جا چکے ہیں برا بھلا کہتے ہوئے لوٹ جاتے۔

ہائی اسکول یا انٹر کا امتحان دینے کے بعد عطیہ بھی پاکستان چلی گئی۔

سنا تھا کہ پاکستان سے ہر ماہ کچھ رقم آیا کرے گی، کوئی خط بھی نہ آیا، یا آیا ہو تو مجھے نہیں معلوم۔

اب چار کمروں، دو دالانوں، باورچی خانے اور دو آنگنوں میں ٹڑوں ٹوں ہم چار رہ گئے، لمّاں، میں عمران اور نجمہ۔ اور ہم چار بھی کیا۔ میں کالج چلا جاتا، پھر پارٹی کے کاموں میں لگ جاتا، ہر اتوار کو انجمن کا جلسہ ہوتا۔ عمران اور نجمہ چھوٹے تھے، انھیں لے کر لمّاں بدرالدین ماموں کے یہاں چلی جاتیں۔

اورئی سے خط آتے رہتے، ایسوں کے جو سگے سمبندھی جیسے تھے۔ وہ ہم لوگوں کو بلاتے کہ وہاں ٹھور ٹھکانے کی کیا کمی ہے... لمّاں لکھنؤ ہی میں رہنا چاہتی تھیں لیکن یہاں مستقل رہنا ہو تو گھر گرہستی کی بھی تو ضرورت ہوگی۔ لمّاں بھی ہماری بہت سیدھی تھیں۔ یہیں رہنا تھا تو روزانہ کے استعمال کا سامان ہی نہ بکنے دیا ہوتا۔ آخر جھوا ابھر روپے دیے تھے۔ بھائی کی محبت میں ٹسوے بہاتی رہیں، اپنے بارے میں کچھ نہ سوچا۔

مجبوراً مجھے محی الدین پور بھیجا گیا کہ گرہستی کا تھوڑا بہت سامان لے آؤ۔ اس بار میں نے محی الدین پور کے گھر میں اپنی چیزوں کو پہلی بار دوسری نظروں سے دیکھا... آنگن میں ایک بڑی سی ٹنکی تھی، بڑے بڑے پلنگ تھے، دہری ستلی سے بنے ہوئے، ایک بڑی سی مسہری تھی اور یہ تو پہلے سے یاد تھا کہ بڑے والے کمرے سے ملحق کوٹھری میں ہمارا ہی سامان بھرا ہوا ہے۔ چینی کے برتن لکڑی کے ایک بڑے بکس میں تھے۔ بہت کچھ استعمال بھی ہو رہا تھا۔

نواب چچا میرے آنے سے خوش تو ہوئے تھے لیکن کوئی خاص گرم جوشی نہ تھی۔ اگلے

دن کھانے کے دوران میں نے کہا کچھ سامان لینے آیا ہوں تو بولے۔

''یہاں سے کوئی سامان نہیں جائے گا''۔

نوالہ میرے منہ کے قریب تھا، سینی میں رکھ دیا۔ چھوٹا سا ٹین کا بکس لے کے گیا تھا، اسے اٹھایا، سلام کیا اور بڑی امّی کے مکان میں چلا گیا۔

چچی چپ چاپ کھڑی آنسو بہا رہی تھیں۔

دوسرے دن میں لکھنؤ لوٹ آیا۔

اب تو امّاں کو اورئی جانا ہی تھا لیکن ماسٹر ماموں اور ان کا خاندان چار چھے مہینے میں پاکستان جانے والا تھا۔ امّاں نے سوچا کہ ان جان سے پیاروں سے ملاقات اب بھلا کب ہوگی۔ یہ چلے جائیں تو اورئی کا رخ کریں۔ اور یہی انھوں نے کیا بھی اور ماسٹر ماموں کے یہاں منتقل ہوگئیں۔ اب یہ پورا مکان میرے قبضے میں تھا۔

امّاں ہمیشہ عورتوں کے بیچ گھری رہنے کی عادی تھیں۔ اورئی میں منیر کی امّاں تو ہر وقت گھر ہی میں رہتیں، رفیق بھائی کی بہنیں سلائی کڑھائی سیکھنے آجاتیں، پھر ان کی دوستوں کا ایک حلقہ تھا۔ کچھ نہ ہوتا تو ناولیں اور رسالے پڑھتیں، بینجو بجاتیں، یہاں بچوں سے کتنی دیر باتیں کرتیں اس لیے ماسٹر ماموں کے مکان میں منتقل ہو کے خوش تھیں۔

اس واقعے کے کوئی پندرہ برس بعد، میں انیس اور میری بڑی بیٹی صبا محی الدین پور گئے تو چچا بہت بڑھے ہو چکے تھے۔ انھوں نے بار بار کہا کہ میں اپنا سامان لے جاؤں لیکن چینی کی بھاری بھاری پلیٹیں اور دوسرے برتن، بڑے بڑے پلنگ، مسہری اور دوسری چیزیں میں اپنے دو کمروں کے کرایے کے مکان میں کہاں رکھتا۔ اس سلسلے میں انھوں نے دو تین خطوط بھی لکھے تھے۔

اصل میں ہوا یہ تھا کہ کئی سال پہلے منشی جی نے یہ راز افشا کر دیا تھا کہ مالکن نے ہنسلی بیچ کر عیدگاہ اور اپنے مرحوم شوہر کی بنوائی ہوئی جامع مسجد کی مرمّت کرادی تھی۔

مکان خاصا بڑا تھا اور اس میں رہنے والا تنِ تنہا میں۔ دن کا زیادہ تر حصّہ تو باہر گذر جاتا لیکن راتیں کاٹے نہ کٹتیں اور پھر پندرہ روپے مہینے کرایے کی بھی فکر کرنی تھی۔ آمدنی کا واحد ذریعہ ٹیوشن تھے اور اب ان میں اضافہ کی گنجائش نہیں تھی۔

ایک پریشانی اور تھی لیکن فوری طور پر نہیں کیونکہ امّاں ابھی یہیں تھیں۔ ان کے اورئی جانے کے بعد کھانے کا انتظام کسی بالکل معمولی سے معمولی ہوٹل میں کیا تو بھی اس کے لیے مزید

روپوں کا سیتا تو کرنا ہی ہوگا۔

بڑا مکان، چھوٹا سمدھیانہ

عجیب دن تھے، عجیب سے احساسات تھے۔ غم تھے کہ قطار اندر قطار چلے آتے، انھیں کے بیچ میں خوشیاں بھی آجاتیں، اگرچہ چھپی چھپائی، ڈری سہی... اس بیچ نئی دوستیاں قائم ہو رہی تھیں جو پالنے پوسنے کے لیے وقت مانگتیں لیکن وقت کہاں تھا۔ بعد میں ایک ہی ٹیوشن رہ گیا تھا لیکن وہ صبح کا سارا وقت کھا جاتا۔ اکرام احمد خان کے دونوں بچے... نصر اللہ اور شہزاد... اور ان کی چھوٹی بہن جس کا نام بھول گیا، ایک لڑکی تھی عزت جمال شاید انٹر میں پڑھتی تھی اور کبھی کبھی انگریزی الفاظ یا جملوں کے معنی پوچھ لیتی... یہ تھے میرے شاگرد اور اکرام احمد خاں تو تھے ہی۔ انھی سے تو سلسلہ شروع ہوا تھا۔

دوستوں میں کچھ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے تھے جیسے عارف نقوی، جواہر، کچھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے تھے جیسے مجید پرویز، برج موہن ناتھ کاچر، تقی حیدر، کچھ پاس پڑوس کے تھے جیسے خواجہ فائق اور خواجہ رائق اور بالکل پاس کے عبدالقوی ضیا کے چھوٹے بھائی عبدالسمیع۔ کتابی دنیا کا بھی ایک حلقہ تھا لیکن وہاں سینیر لوگوں سے ملاقات ہوتی جیسے شوکت صدیقی، کمال احمد صدیقی، سلام مچھلی شہری، منظر سلیم اور ایک صاحب تھے مظہر جنھوں نے ''موت کے بعد'' کے نام سے ایک ناول لکھا تھا۔ معلوم نہیں چھپا یا نہیں۔

برج موہن ناتھ کاچر کشمیری محلے کی چڑھائی پر پولیس چوکی سے ملحق مکان میں رہتے۔ پاس ہی کشمیری محلہ گرلس اسکول جانے والی سڑک کے موڑ پر نہال رضوی لکھنوی کی بیڑی سگریٹ اور چھوٹی موٹی چیزوں کی دوکان تھی جس کی حیثیت ہم ادبی دوستوں کے اڈے کی تھی۔ کامریڈ شکیل بھی کبھی کبھی آجاتے۔

دو تین برس بعد کی ایک بات یاد آ گئی۔ لکھ دوں، تا کہ کہیں کھو نہ جائے۔ کاچر کا کمیونسٹ پارٹی کیا اسٹوڈنٹس فیدریشن سے بھی تعلق نہیں تھا لیکن انجمن کی حد تک بائیں بازو کے ضرور رہتے۔ سیاسی منظر نامے میں بایاں بازو معدوم ہونے لگا تو وہ مجلسیں پڑھنے لگے۔ ایک دن بہت فخر سے کہنے لگے کہ پچھلے اتوار کو علی ظہیر (ریاستی وزیر اور سجاد ظہیر کے بڑے بھائی) کے یہاں مجلس پڑھی تھی۔ کامریڈ شکیل بھی موجود تھے۔ انھوں نے فوراً کہا۔

''فضائل ہی فضائل سے کام چلایا ہوگا، مصائب تو بیان کیے نہ ہوں گے!''

ذہن پر ذرا سا زور ڈالیے۔ اس مختصر سے جملے میں معانی کا ایک جہان آباد ہے۔

کامریڈ شکیل ٹریڈ یونین لیڈر زیادہ تھے اور ادیب کم لیکن انھی دنوں ان کا افسانہ ''جہنم سے ایک خط'' غالباً ادبِ لطیف میں شائع ہوا تو وہ ذرا کی ذرا میں بطور ادیب مشہور ہو گئے۔ پھر کتابی دنیا نے ''گرتی دیواریں'' کے نام سے ان کے ایک ناول کا اعلان کیا۔ غالباً وہ چھپا نہیں۔ بعد میں اسی نام سے اوپیندر ناتھ اشک کا ناول کئی جلدوں میں شائع ہوا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دنوں مجید پرویز اور میں نے (مجید پرویز نے زیادہ، میں نے کم) کلکتہ کے Signet Press کی چھپی ہوئی "Best Short Stories of Modern Bengal" کے، جو دو حصّوں میں تھی، بہت سے افسانے کیسے اور کس وقت ترجمہ کر ڈالے تھے۔ میرے ترجمہ کیے ہوئے افسانوں میں سے صرف ایک افسانہ ''الجھاؤ'' کے نام سے ''ماہِ نو'' میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ بدھ دیو بوس کا تھا اور انگریزی میں اس کا نام "An Intricate Affair" تھا۔ اس کا معاوضہ پاکستان سے بذریعہ منی آرڈر آیا تھا۔

مجید پرویز اور برج موہن ناتھ کا چر کے ساتھ ہی میں پہلی بار انجمن کے جلسے میں گیا تھا۔ اس وقت میں نے غالباً، یاد آ گیا یقیناً، انٹرمیڈیٹ بھی نہیں کیا تھا۔ سرور صاحب کے مکان کے اس جلسے میں علیم صاحب کو دیکھ کر میں کونے میں دبک گیا تھا۔ علیم صاحب نے مجھے دیکھ کر شوکت صدیقی سے پوچھا تھا، ''کیا لکھتے ہیں؟''۔ انھوں نے کہا تھا، ''افسانے۔'' یہ سن کر انھوں نے کہا تھا، ''خدا کا شکر ہے۔'' اس گفتگو کی تفصیلات مجھے اس وقت معلوم نہیں تھیں، بس یہ اندازہ ہوا تھا کہ میرے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ شوکت صدیقی نے تفصیلات بعد میں بتائی تھیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے وہاں کمال احمد صدیقی، مسیح الحسن رضوی اور منظر سلیم وغیرہ کے علاوہ چیتن اور اچل سنگھ بھی تھے۔ سلام مچھلی شہری اور ایاز انصاری بھی اکثر انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے لیکن رجسٹر پر دستخط نہ کرتے کیوں کہ انجمن سیاسی تنظیم قرار دے دی گئی تھی۔

خیال ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو سب سے پہلے صلاح الدین عثمان کی شادی میں دیکھا۔ ان کی شادی مسیح منزل کے مالک داروغہ عبدالعلی کی بیٹی زیبا سے ہوئی تھی جنھیں میں زیبا باجی کہتا۔ شادی کے کچھ دن بعد وہاں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس میں سارے ہی ترقی پسند شاعر اور ادیب موجود تھے۔ ان دنوں میرے ماموں محمد عقیل داروغہ صاحب کے مکان میں کرایے پر رہتے تھے۔

مذاق کا رشتہ

مسیح الحسن رضوی قاضی باغ کے پاس ہی ڈاکٹر عظیم کے مکان کے اوپری حصے میں رہتے تھے۔گلیوں گلیوں تھوڑی دور آگے جا کر تھوئی ٹولے میں ایک چبوترے پر تقی حیدر کا مکان تھا، دراصل یہ محلہ ہی اونچے سے چبوترے پر آباد تھا۔راجہ بازار بلکہ رستوگی ٹولے سے اس کا سیدھا راستہ تھا۔

ایک دن تقی حیدر کے یہاں گیا تو تھوڑی دیر میں شہاب جعفری آئے۔ان کو پہچانتا تو تھا اور وہ شاید مجھے بھی لیکن باقاعدہ تعارف نہ تھا۔تقی حیدر جتنے سنجیدہ مزاج تھے اس سے زیادہ سنجیدگی وہ اپنے اوپر لادے رہتے۔برخلاف اس کے شہاب جعفری کھلی ڈلی شخصیت کے مالک تھے۔تقی حیدر سے سنجیدہ بات چیت میں بھی وہ مذاق کے پہلو نکال لیتے۔ان کی باتیں سن کر میں نے بھی رنگ پکڑا اور ایک آدھ جملہ ایسا کہہ دیا جو شہاب جعفری کو پسند نہ آیا۔انھوں نے اس وقت تو کچھ نہ کہا لیکن بعد میں تقی حیدر نے بتایا کہ شہاب جعفری کہہ رہے تھے میرا اور سہیل صاحب کا مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔بات ٹھیک ہی تھی۔میں ان سے چھوٹا بھی تھا۔اس کے بعد ملاقاتیں ہوئیں تو میں نے ذرا سی احتیاط برتی لیکن کسی قسم کی رنجش کا اظہار نہ ہونے دیا اور تھی بھی نہیں۔تقریباً دو ہفتے بعد ایک رات شہاب جعفری میرے یہاں آئے۔معلوم نہیں ان کو میرا پتہ کیسے معلوم ہوا، ممکن ہے تقی حیدر سے معلوم ہوا ہو۔خیر، میں نے انھیں اپنے کمرے میں عزت و احترام سے بٹھایا اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا، ''سہیل ایک غزل کہی ہے، سناؤں''۔

وہ اپنی مخصوص کیفیت میں تھے۔

اب مجھے مذاق کی سوجھی۔میں نے نہایت سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

''شہاب صاحب، میرا آپ کا مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

یہ جملہ سنتے ہی ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا لیکن کہتے کیا۔اپنے ہی تیر کا شکار ہو گئے تھے۔تھوڑی دیر تک تو انھوں نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھی لیکن پھر اپنے مزاج اور اس سے زیادہ اس وقت کی کیفیت سے مجبور ہو کر ہنس دیے۔میں بھی ہنس دیا اور ہماری دوستی ہو گئی۔پھر انھوں نے میری فرمائش پر اپنی تازہ اور کئی دوسری غزلیں سنائیں، ان میں سے کوئی غزل یا اس کا کوئی شعر تو یاد نہیں لیکن ان کا ایک شعر یاد ہے۔ممکن ہے آپ کو بھی یاد ہو۔

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے
نشے کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے

افسوس شہاب جعفری اب ہم میں نہیں لیکن ان کا ایک نہایت عمدہ شعری مجموعہ ''سورج کا شہر'' ضرور میرے پاس موجود ہے۔ آخری ملاقات بیس بائیس سال قبل دہلی میں ماڈل ٹاؤن کے آگے شالیمار باغ کے پاس پل کی جانب جو سڑک مڑتی ہے اس کے فٹ پاتھ پر ہوئی تھی۔ اس خلاف توقع ملاقات پر ہم بے تحاشہ ایک دوسرے سے چمٹ گئے تھے۔ ہلکی سی جھلمل کرتی کھادی کا کرتا، اس پر کھادی ہی کی واسکٹ اور پتلی مہری کا پاجامہ پہنے تھے۔ لمبوترے سے چہرے پر چشمے سے جھانکتی ہوئی ذہین آنکھیں...وہی صورت آنکھوں میں بسی ہے۔

عجب پریشانی ہے۔ کبھی آگے نکل جاتا ہوں کبھی پیچھے رہ جاتا ہوں۔ زندگی میں بھی تو یہی ہوتا ہے۔ واقعات ایک دوسرے کو کاٹتے رہتے ہیں۔ ہر واقعہ میں حال کے علاوہ پورا ماضی بھی ہوتا ہے اور مستقبل کا بیج بھی جو کبھی کبھی انکھوا نکلنے سے پہلے ہی تناور درخت بن جاتا ہے۔

انھی دنوں تقی حیدر نے کہا کہ آپ کے پاس اتنا بڑا مکان ہے اور آپ اکیلے رہتے ہیں، ہمیں بھی اپنے ساتھ رکھ لیجیے۔ میرے لیے یہ مکان واقعی بڑا تھا اور پھر اس کا پندرہ روپے مہینے کا کرایہ ایک بڑا بوجھ۔ میں نے سوچا کہ سات آٹھ روپے بچیں گے اور تقی کا ساتھ بھی رہے گا۔ فوراً! ''ہاں'' کر دی، لیکن اس کا ایک سبب اور بھی تھا۔

دو لڑکیاں

اپنی کلاس فیلو آمنہ آپا کے یہاں ایک دن نزہت اور ثروت نام کی دو لڑکیوں سے تعارف ہوا تھا۔ نزہت ذرا سی شوخ تھی اور گوری جب کہ ثروت کا رنگ خاصا کم تھا لیکن وہ اپنی سنجیدہ مزاجی اور لیے دیے رہنے کے انداز کے سبب زیادہ اچھی لگتی۔ میرا خیال ہے یہ انھی دنوں کی بات ہے جب تیغ الہ آبادی پاکستان جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ شمیم رضا بھی جو امیر رضا صاحب کی بھتیجی تھی پہلے ہی الہ آباد سے مستقلاً ان کے یہاں آ گئی تھی۔ اس نے بعد میں کرسچین کالج کے میرے کلاس فیلو متل سے شادی کر لی تھی۔ بعد میں وہ دونوں انگلینڈ چلے گئے تھے اور اب بھی وہیں ہیں۔ لندن سے وہ جب بھی آئے مجھے ڈھونڈ نکالتی ہے۔ برسوں بعد ہم نصرت

پبلشرز میں ملے تھے۔ وہ سب کے سامنے مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ جاڑوں کے دن تھے وہ خوب موٹا سا اوورکوٹ پہنے تھی۔ اس کے پاس ایک البم تھا جس میں مثّل اور ان کے بچوں کی تصویریں تھیں۔ شمیم بیڈمنٹن کی بہت اچھی کھلاڑی تھی اور فائنل میں بس مینا شاہ سے ہارتی۔ تیغ الٰہ آبادی پاکستان جاکر مصطفیٰ زیدی کے نام سے شاعری کرنے لگے۔ وہ پاکستان میں ایک بڑے افسر اور احتجاجی شاعری کے ایک غیر معمولی شاعر کے طور پر مشہور ہوئے۔ جوش ملیح آبادی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کا ایک شعر یاد آ رہا ہے اور لکھنے سے خود کو روک نہیں پا رہا ہوں:

جب بھی تاریخ کے قصّے ہمیں دہرائیں گے
خیمۂ شہر میں ہم لوگ نظر آئیں گے

بات پھر آگے جا پڑی۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ صبح صبح یہ دونوں بہنیں موجود ہیں۔ میں حیران رہ گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ ان کو میرا پتہ کیسے ملا۔ آمنہ آپا سے بھی نہیں مل سکتا تھا کیوں کہ وہ اس وقت تک لندن سے ملنے آئی نہ تھیں۔ خیر، ثروت تو کچھ نہ بولی البتہ نزہت نے کہا بلکہ بضد ہوگئی۔ عابد بھائی آپ اتنے بڑے مکان میں رہتے ہیں، خالی پڑا رہتا ہے اور ہمارے پاس رہنے کا ٹھکانہ نہیں۔ آپ تو اتنے بڑے مکان کی صفائی ستھرائی بھی نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کا کھانا بھی پکا دیا کریں گے۔

معذرت تو میں نے شروع ہی میں کر لی تھی لیکن نزہت کو یہ سمجھانے میں بہت وقت لگا کہ کسی نوجوان کے ساتھ دو لڑکیوں کا رہنا، خاص طور سے اس صورت میں جب گھر میں کوئی بڑی بوڑھی نہ ہو، بہت سی پریشانیاں پیدا کر سکتا ہے۔ بڑی مشکل سے اسے ٹالا۔

نزہت اور ثروت کے بارے میں جو لکھا ہے اس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ وہ دونوں آمنہ آپا کے یہاں کی ایک ملاقات یا تعارف کے بعد ہی میرے گھر چلی آئی تھیں۔ مجھے خود حیرت ہو رہی تھی لیکن اب بیچ کی ایک بات یاد آ گئی جو نزہت نے چودھری محمد علی ردولوی کے بارے میں کہی تھی اور میں نے جب اس کا ذکر شارب ردولوی سے کیا تو انھوں نے کہا تھا کہ چودھری صاحب اس قدر رکڑھے ہوئے انسان تھے کہ اس طرح کی بات کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ اور یہ خیال جاتا رہا کہ ان دونوں سے ملاقات صرف ایک بار کی تھی۔ مجھے ڈر لگا ہوا تھا کہ وہ دونوں پھر نہ آ جائیں، ڈر اُن سے نہیں اپنے آپ سے لگتا تھا۔ میرے لیے انکار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اگرچہ اس کم ہمتی اور بزدلی کے سبب زندگی برباد کر چکا ہوں۔

تقی حیدر

تقی حیدر کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی بھی تھے۔ انھیں تھوئی ٹولے کے مکان میں دیکھا تو تھا لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ وہ ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انھیں لوگ میر صاحب کہتے، خود تقی بھی۔ سیدھے سادے تھے اور نام ٹھیک ہی لگتا۔ تقی حیدر ڈیڑھ دو مہینے تو مستقل رہے اس کے بعد غوطے مارنے لگے، کبھی دو دو دن کے لیے غائب ہو جاتے، پھر رضیہ سجاد ظہیر کے یہاں منتقل ہو گئے۔ ویسے وہ دسویں بارہویں آتے رہتے اور تاثر یہی دینے کی کوشش کرتے کہ وہ کچھ دنوں بعد آ جائیں گے لیکن یہاں رہے صرف میر صاحب۔

میر صاحب غالباً شیعہ کالج میں پڑھتے تھے۔ ان سے مجھے بڑی سہولت ہوئی۔ ایک تو کرایے کا بوجھ نصف ہو گیا دوسرے وہ میرے لیے بھی کھانا پکانے لگے۔ میں نے لاکھ کہا کہ پکائی نہ سہی اجناس کی قیمت تو لے ہی لیں لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ پھر بھی میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کرتا کہ بارِ خاطر نہ بن جاؤں۔

میر صاحب بڑے مزے کے آدمی تھے۔ ان سے کسی انگریزی لفظ کے معنی یا ہجے پر اختلاف ہوتا تو وہ میری ڈکشنری کی سند نہ مانتے اور اپنی ڈکشنری نکالتے۔ کہتے آپ کی ڈکشنری میں جانے کیا لکھا ہوتا ہے، اگرچہ دونوں کے پاس تھی آکسفورڈ کنسائز ڈکشنری ہی۔

ان دنوں دو دلچسپ واقعات ہوئے۔

ایک دن تقی حیدر نے مجھے ایک بڑی سی تصویر دکھائی۔ پولیس کے کسی افسر کی معلوم ہوتی تھی لیکن ان کے مطابق ان کے بھائی کی تھی جو پاکستانی فوج میں ایک اعلیٰ افسر ہونے کے سبب کسی وفد میں ہندوستان آئے تھے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دہلی کے کسی اخبار میں وفد کی تصویر چھپی تھی جو انھوں نے Enlarge کرالی ہے۔ اب وہ یہ تصویر بھیج کر انھیں ایک Surprise دینا چاہتے ہیں۔ بعد میں میر صاحب نے بتایا کہ پچھلے مہینے پاکستان سے ان کے سب سے بڑے بھائی آئے تھے جو وہاں ڈرل ماسٹر ہیں۔

دوسرا واقعہ کچھ اس طرح تھا۔ ایک صاحب الٰہ آباد سے آکر میر صاحب کے ساتھ آٹھ دس دن رہے۔ اس وقت میں کتابت اور طباعت کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ وہ صاحب دن میں زیادہ تر وقت ایک گھٹنے پر بڑی سی دفتی کے اوپر پیلا کاغذ رکھے کچھ لکھا کرتے۔

ایک دن وہ کہیں چلے گئے اور میں نے میر صاحب کی موجودگی میں وہ تحریر دیکھی تو حیرت میں پڑ گیا۔ اس میں ساری عبارت الٹی لکھی ہوئی تھی اور بہت خوبصورتی سے۔ جانے کیسے میں یہ سمجھتا تھا یا مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ میر صاحب کے گاؤں کے رہنے والے ہیں اور لکھنؤ کسی کام سے آئے ہوئے ہیں۔ کچھ دنوں میں وہ چلے گئے۔ پھر ایک دن جانے کیسے ان کا ذکر نکل آیا تو میر صاحب نے بتایا وہ ان کے والد ہیں، کتابت کرتے ہیں اور معکوس نویس ہیں۔ معکوس نویسی کی غرض و غایت اس وقت سمجھ میں نہ آئی لیکن جب میں نے ماہنامہ کتاب کا سلسلہ شروع کیا اور لیتھو طباعت سے واسطہ پڑا تو کتابت کے فن کی اس نوعیت سے نامی پریس کے مالک خواجہ انور الدین کے ذریعے واقف ہوا۔ خدارا اس واقعے کو علی گڑھ کے مشہور واقعے کی توسیع یا اس کی بنیاد پر اختراع نہ سمجھیے۔ یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا تھا۔

آٹھ دس مہینے بعد امتحان دے کر میر صاحب گھر چلے گئے تو میں یہ مکان چھوڑ کر ماسٹر ماموں کے یہاں چلا گیا۔ وہ اور ان کا خاندان پاکستان بس جانے ہی والا تھا۔ ان کی روانگی کے بعد اماں اور ئی چلی گئیں، خورشید کا بی۔ ایس۔ سی کا آخری سال تھا، وہ آئی ٹی کالج کے ہوسٹل منتقل ہوگئی اور میں پانچ چھے کمروں کے اوپر نیچے کے اس مکان میں تنہا رہ گیا۔ اس مکان کی یادوں کے کئی حوالے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مولانا آزاد سبحانی جب بھی لکھنؤ آتے یہیں قیام کرتے اور یہ کہ آمنہ آپا اماں سے ملاقات کرنے اسی مکان میں آئی تھیں۔

اس مکان کا اصل حوالہ تو ماسٹر ماموں کا ہے۔ جو مجھ سے ناراض رہتے تھے اور پھر بے حد خوش ہوگئے تھے۔ ایک بار گھر سے کوئی چیز غائب ہوگئی تو ان کو مجھ پر شبہ تھا اور وہ مجھے رکاب گنج سے سٹی اسٹیشن جانے والی سڑک پر لکڑی کی ایک ٹال کے مالک کے پاس لے گئے تھے۔ یہ ٹال اس سڑک کے داہنی جانب تھی۔ ٹال کے مالک نے کوئی عمل پڑھ کے مجھ ہی کو چور ٹھہرایا تھا لیکن کچھ دنوں بعد وہ چیز مل گئی۔ اب ماسٹر ماموں کا حال نہ پوچھیے۔ میرا سامنا ہو جاتا تو دوسری طرف دیکھنے لگتے اور ایسا لگتا جیسے کسی نے ان کے چہرے پر شرمندگی کوچی سے پوت دی ہو۔

ہائے، پہلے کے لوگ کیسے ہوتے تھے، اپنی غلطی پر شرمندہ ہونا جانتے تھے۔ اب تو لوگ اپنی غلطی کا احساس کرنے کے بجائے الٹے الزام تراشیوں پر اتر آتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے پروفیسر ولی الحق انصاری کی خودنوشت ''مدوجزر'' کی چند سطریں پڑھ لیجیے۔ یہ خودنوشت حال ہی میں شائع ہوئی ہے:

''آئندہ سال کے سکریٹری نے یہ جدت پیش کی کہ مشاعرہ گومتی کی سطح پر منعقد کیا جائے۔ چنانچہ بڑی کشتیوں کا انتظام کیا گیا اور ان پر شاعروں کے لیے ڈائس اور سامعین کے لیے پلیٹ فارم بنایا گیا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ حسین آباد اسکول کے ماسٹر بدر صاحب بالائی کی برف کے کوزوں سے ضیافت فرما رہے تھے۔ صفی صاحب کا مصرعہ'' دریا کی روانی ہے، بہتا ہوا پانی ہے'' بطور مصرعۂ طرح دیا گیا۔ ایک نئی اختراع یہ بھی تھی کہ ایسی نشستوں کی پسندیدہ غزلیں مشہور طوائفیں گایا کرتی تھیں''۔[1]

حسین آباد اسکول کے یہی بدرؔ صاحب میرے ماسٹر ماموں تھے۔ سنا ہے کہ پہلے یہ عالم تھا کہ جس گلی سے گذر جاتے وہ، ان کے عطریات اور تیل پھلیل سے مہک جاتی۔ شاعروں اور احباب کی خوب خوب دعوتیں ہوتیں اور پھر چار چار بیٹیوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلانے کے جتن میں پہلے کنجوس مشہور ہوئے، پھر واقعی کنجوس ہو گئے اور پھر سارے گھر سے الگ تھلگ پڑ گئے... گھر کے پاس والے چوراہے پر ہولی جلتی تو دو تین دن بعد مجھ سے کہتے چلم کے لیے کوئلے لے آؤ۔ میں حکم بجا لاتا اور ان دنوں جب مجھ سے خوش نہ ہوتے امّاں سے طرح طرح کی شکایتیں کرتے۔ ایک بار انھوں نے شکایت کی، ''عابد بہت فضول خرچ ہو گیا ہے۔'' امّاں نے کہا، ''اس کے پاس پیسے ہی کہاں رہتے ہیں کہ فضول خرچی کرے۔'' تو بولے، ''سائکل ہاتھ میں لے کر چلتا ہے، جوتا بھی گھستا ہے ٹائر بھی گھستا ہے۔''

پھر جب خوش ہو گئے تو ایک دن اپنی غزل سنائی۔ میں نے مقطع دہرایا تو دوسرے مصرعے کو تھوڑا سا بدل دیا۔ بہت خوش ہوئے کہنے لگے یہی مصرع رکھوں گا۔ مقطع یہ تھا:

بدرؔ ناشاد سے واقف ہے زمانہ لیکن

فرق بس یہ ہے کہ بدنام ہے مشہور نہیں / یا فرق اتنا ہے

پاکستان جانے لگے تو پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ پندرہ سولہ برس بعد امّاں کے پاس مہ جبین کا خط آیا۔ ابا عابد بھائی کو بہت یاد کرتے ہیں، روتے ہیں۔ ان سے کہیے ایک بار پاکستان ہو جائیں۔ کسی رسالے میں عابد بھائی کی کوئی چیز چھپی تھی۔ کئی بار پڑھوا کے سن چکے ہیں۔ اب آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ رسالہ تکیے کے نیچے رکھے رہتے ہیں۔ امّاں نے علی گڑھ سے مجھے خط لکھا۔ میں بھی ماسٹر ماموں، ممانی، زیبن باجی، شہزادی باجی، خورشید اور مہ جبین کو یاد کر کے خوب

۱۔ مدوجزر۔ صفحہ۔ ۳۴

رویا، ہچکی بندھ گئی۔ وہ بیٹے سے محروم تھے۔

خورشید کبھی اتوار کی صبح اور کبھی سنیچر کی شام میں آئی۔ ٹی۔ کالج سے آجاتی۔ پہلے بھی کم بولتی تھی اب اور بھی چپ رہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی جانے کیسے اس کی ٹھڈی ہلنے لگتی۔ پتہ ہی نہ چلتا کہ یہ خوشی کے عالم میں ہوتا ہے یا جب غمگین ہوتی ہے۔ میں گھر گھسنا کبھی نہ تھا لیکن وہ آجاتی تو کوشش کرتا کہ زیادہ سے زیادہ وقت گھر میں رہوں تاکہ کچھ تو گھر کا ماحول اسے ملے، ہوسٹل سے جداگانہ۔ پھر امتحان کے بعد پاکستان جانے سے آٹھ دس یا پندرہ دن پہلے ہوسٹل سے آ گئی۔ مجھے بہت چاہتی تھی لیکن مجال ہے جو ذرا سا اظہار ہو جائے۔

میں اسے اسٹیشن چھوڑنے گیا۔ واپس آ کر بستر پر لیٹا تو تکیہ کچھ اونچا معلوم ہوا۔ دیکھا تو پندرہ بیس رومال رکھے ہوئے تھے اور ایک کاغذ جس پر لکھا ہوا تھا'' بہت پیارے عابد بھائی کے لیے... چھوٹی بہن خورشید۔'' معلوم نہیں وہاں جا کے کیا پڑھا، کیا کِیا۔ بیس پچیس سال اُدھر معلوم ہوا تھا یورپ کے کسی ملک میں ہے، بہت اچھی جگہ پر۔

پاکستان جا کر اس نے ایک خط لکھا تھا۔ وہ تو میرے پاس نہیں۔ ہاں اس کا جواب ضرور موجود ہے، جو پوسٹ نہ کیا جا سکا تھا:

کتابی دنیا

نظیر آباد

Lucknow-UP

خورشید!

کل ایک عرصہ کے بعد... خلاف امید... تمھارا خط ملا۔ خیریت معلوم کر کے خوشی ہوئی... مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمھیں کسی ایسی اسکیم کے ماتحت داخلہ ملا ہے جس میں کچھ روپیہ بھی ملے گا۔ اس کا کیا ہوا؟

تمھارا ایک Negative میرے پاس ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے پہلے ہی کیوں نہ بھیج دیا جب کہ مجھے وہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے نہیں کیا۔ بہرصورت اب بھیج رہا ہوں۔

کتابیں میں نے مس موہنی کو تمھارے جانے کے بعد ہی بھیج دی تھیں اور اس وقت نہ جانے کیوں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ بعد میں اس قسم کی کوئی بات پیدا نہ ہو اس لیے رسید

بھی محفوظ کرلی تھی۔ تمھاری اطلاعات غلط ہیں۔ ڈاکخانہ کی رسید بھی منسلک ہے۔
تم نے ماہ نو چھان مارا لیکن میرا افسانہ نظر نہیں آیا۔ بھائی غضب ہے۔ جون کے شمارہ میں صفحہ ۳۴ پر میرے ہی نام سے شائع ہوا ہے۔ اگر ضرورت سمجھو تو دیکھ لینا۔
میں نے روپیہ کے لیے دوسرا انتظام کرلیا تھا، بیکار تم لوگوں کو زحمت ہوتی۔ اگر ہو سکے تو بیرنگ جواب بھیج دینا۔ (یہاں روپے کا ذکر سمجھ میں نہیں آتا۔ سہیل)

تمھارا بھائی

۲۴ر ستمبر ۵۱ء

سہیل

۲۸ر ستمبر ۵۱ء

میں نے یہ خط تقریباً چار پانچ یوم قبل لکھا تھا۔ اس کے ساتھ Negative بھی نکالا تھا۔ میری لاپروائی سے Negative حضرت عمران کے ہاتھ پڑ گیا اور انھوں نے حسب عادت کسی قدر (کسی حد تک) بے کار کردیا ہے لیکن صرف تمھارے اطمینان کے لیے بھیج رہا ہوں۔

سہیل

ایک بات اور۔ یہ خط تاخیر کے بعد ارسال ہے۔ آج ۱۵را کتوبر ہے۔

سہیل

۲۵را کتوبر ۵۲ء۔ یہ خط نہ بھیج سکا اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھارا Negative ضائع ہو گیا۔ تمھاری تصویر بھی میرے پاس سے لاپتہ ہوگئی اور میں خود بھی اس طویل عرصہ تک ذہنی طور پر قریب قریب لاپتہ رہا۔

سہیل

۷را کتوبر ۲۰۰۹ء: یہ خط ڈاک کے سپرد نہ کیا جا سکا اور کیا جاتا بھی کیسے، اسے تو ''جو یادرہا'' کا حصہ بننا تھا۔

خورشید سے ان دنوں جب وہ آئی۔ ٹی کالج کے ہوسٹل میں تھی وہاں صرف دو تین بار ملاقات ہوئی تھی۔ ایک بار پانچ روپے قرض لینے گیا تھا اور دوسری بار یہ رقم واپس کرنے۔ دونوں بار ملاقات سامنے والے بلند محرابوں والے دالان میں ہوئی تھی، بس کھڑے کھڑے۔

◆◆◆

یگانہ چنگیزی

مجھے ٹھیک سے نہیں یاد کہ ندان محل روڈ کی پبلک لانڈری میں کپڑے دینے گیا تھا یا پاس کی دوکان پر سائکل کی مرمت کرانے، جہاں اس وقت سامنے سڑک پر ایک جلوس نکل رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یگانہ نام کے ایک راندۂ درگاہ شاعر نے حضور اکرم کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے ہیں اور اس کی سزا دی جارہی ہے۔[1]

ستر اسّی افراد کے اس مختصر سے جلوس میں زیادہ تر شرکا پندرہ سولہ برس کے نوجوان تھے، کچھ کی عمریں تو اس سے بھی کم تھیں۔ جلوس میں چار چھے لوگ ایسے بھی تھے جو بیس بائیس سال کے رہے ہوں گے۔ ان میں سے دو کو بعد میں بار بار دیکھنے کے مواقع ملے اور وہ بطور شاعر تھوڑے، بہت مشہور بھی ہوئے۔

میں اردو کا طالب علم نہ ہونے کے باوجود یگانہ چنگیزی کے نام سے واقف تھا اور ان کی کچھ غزلیں اور اشعار دوسروں سے سنے یا رسالوں میں پڑھے تھے۔ لکھنؤ آنے کے بعد ماموں زاد بھائی عارف صدیقی نے جو بعد میں پاکستان چلے گئے، آرزو لکھنوی کی ایک غزل سنائی تھی جس کے دو شعر اب بھی یاد ہیں:

ہاتھ سے کس نے پٹکا ساغر موسم کی بے کیفی پر
ایسا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا مے خانہ بھی
حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے
حسن کا پرچم جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

لکھنؤ کے دوسرے شعرا کی چیزیں بھی پڑھنے اور سننے کے مواقع ملے تھے اور اس میں سے بہت کچھ اچھا بھی لگا تھا لیکن یگانہ کے جو اشعار اس وقت تک پڑھے تھے دوسرے شعرا کے

۱۔ یہ جلوس ۱۳ر مارچ ۱۹۵۳ء کو نکالا گیا تھا۔ تاریخ مجھے یاد نہیں تھی، لیکن شعیب نظام کی کتاب یگانہ چنگیزی میں یہی تاریخ دی ہوئی ہے، اس کی دوسرے ذرائع سے بھی تصدیق ہوئی۔

کلام سے بالکل مختلف معلوم ہوتے۔ ان میں ایک عجیب طرح کی تازگی تھی، خیال اور اظہار کی۔ ان کے اشعار میں نام نہاد شعری موضوعات زیادہ نہیں چمکتے تھے، ان میں اس طرح کی چمک تھی بھی نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی لگتا کہ ان کے اشعار کے الفاظ کھر درے ہیں اور مسائل سے جوجھ رہے ہیں۔

سمجھ میں نہ آتا کہ ایسے اچھے شاعر کو اس قدر بے ہودہ حرکت کرنے کی کیا سوجھی۔ کچھ سمجھ میں تو نہ آیا لیکن میں جلوس کے ساتھ ہولیا۔ تماش بینوں کی طرح، تھوڑا سا فاصلہ بنائے ہوئے۔

یگانہ کو ایک گدھے پر بٹھایا گیا تھا۔ ان کے گلے میں سفید پھولوں کے ہار پڑے تھے جو پان کی پیک سے جگہ جگہ سرخ ہوگئے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جس کا جی چاہتا ان کی ٹوپی اور چہرے پر پیک کی پچکاری مار دیتا۔ اس وقت تو خیال نہیں آیا لیکن اب ضرور سوچتا ہوں کہ بیشتر شرکائے جلسہ کی عمریں پان کھانے کی نہ تھیں، ممکن ہے انھوں نے پان اسی کارِ نیک کے لیے کھایا ہو جو وہ انجام دے رہے تھے۔

یگانہ جن کو اس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا صبر و ضبط کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی حرکت پر غصہ آتا اور ان کی حالت پر افسوس ہوتا۔ ایک آدھ بار تو جی چاہا کہ لوگوں کو ان کے چہرے پر پچکاری مارنے سے روکوں لیکن شرکائے جلوس کی تعداد دیکھ کر ہمت نے جواب دے دیا۔ پھر بھی جلوس کے ساتھ ساتھ رہا اور قبل اس کے کہ وہ رکاب گنج کا پل پار کرے میں تیز تیز چل کر بائیں جانب کی ایک دوکان کی طرف بڑھا جہاں مختلف اقسام کے خوردنی تیل فروخت ہوتے تھے۔ مجھے اس دوکان کا علم یوں تھا کہ پاس ہی پل کمہاراں پر میرے عزیز دوست عبدالحلیم کا گھر تھا اور وہ خرید و فروخت کے لیے یہاں آتے تو کبھی کبھی میں بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس دوکان پر ٹیلی فون ہے۔ میں نے ڈائرکٹری میں نمبر دیکھ کر وزیر گنج تھانے کو اس واقعے کی اطلاع دی لیکن ظاہر ہے کسی نے اس کا نوٹس بھی نہ لیا۔

اتنے میں صلاح الدین بھائی (صلاح الدین عثمان، رپورٹر نیشنل ہیرالڈ) مولوی گنج کی جانب سے سائکل پر آتے ہوئے نظر آئے۔ انھوں نے ٹیلی فون کے بارے میں دریافت کیا تو میں تیلی کی دوکان کی طرف اشارہ کرکے ان کے ساتھ ہولیا۔ صلاح الدین عثمان نے اپنا تعارف کراکے وزیر گنج تھانے کو واقعے کی اطلاع دی۔ اتنے میں مولوی گنج کی طرف سے رضا

انصاری آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ ان دنوں قومی آواز میں رپورٹر تھے۔

دس بارہ منٹ میں، جب جلوس مینا ٹرانسپورٹ کے آگے بڑھا ہی تھا، امین آباد کی طرف سے پولیس کی دو جیپیں آ گئیں اور سپاہیوں نے یگانہ کو گدھے پر سے جیپ میں بٹھانے کی کوشش کی تو مظاہرین پولس سے دھینگا مشتی کرنے لگے۔ لیکن سپاہیوں نے صبر و ضبط کا ثبوت دیا اور زمین پر لاٹھیاں پٹکنے اور دو ایک بار ہوا میں لہرانے سے زیادہ کچھ نہ کیا۔ ابھی سپاہی نخاس کی جانب واپس جانے کے لیے بھیڑ کو سمجھا بجھا اور ڈرا دھمکا ہی رہے تھے کہ پولس کی جیپ یگانہ کو لے کر امین آباد کی جانب روانہ ہوگئی۔

تھوڑی دیر کے بعد مجمع ایک ایک دو دو کر کے منتشر ہوگیا۔ مجھے نہیں یاد کہ پولس کے ساتھ دھینگا مشتی یا اس کی طرف سے لاٹھیاں ہوا میں لہرانے اور زمین پر پٹکنے میں کوئی زخمی ہوا تھا یا نہیں۔

میرا خیال ہے ادب اور صحافت سے تعلق رکھنے والے یہی تین لوگ اس وقت موجود تھے۔ اپنے بارے میں یہ بھی بتادوں کہ اُس وقت تک ادب سے میرا تعلق انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شرکت، دو چار غزلوں، نظموں، تین چار سال قبل ہفت روزہ ''ریاست'' میں ایک افسانے، ماہنامہ ''شعاعیں'' میں موپساں کے ایک افسانے کے ترجمے اور ''آجکل'' کے بچوں کے حصے میں دوسرے ناموں سے دو ایک مضامین کی اشاعت تک محدود تھا اور صحافت سے بس اس قدر کہ یونیورسٹی میں قومی آواز کا نامہ نگار مقرر کیا جا چکا تھا۔

اس بدقسمت واقعے کو پسندیدگی کی نظر سے شاید ہی کسی نے دیکھا ہو، الّا ان کے جو یگانہؔ سے ذاتی اور ادبی پرخاش رکھتے تھے۔ برسوں بعد ایک دن اس واقعے کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنی موجودگی پر احساسِ ندامت نے مجھے گھیر لیا۔ اُس وقت تک اس واقعے کے عینی شاہد ہونے کو اپنے لیے وجۂ امتیاز سمجھتا تھا لیکن جیسے یکا یک احساس ہوا کہ یہ بات قابلِ فخر نہیں وجۂ شرمندگی ہے۔ کاش میں اس وقت ندان محل روڈ نہ آیا ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ یگانہؔ نے ایک نہایت غیر مصلحت اندیشانہ اور بدبختانہ خط نیاز فتح پوری کو لکھا تھا۔ نیاز فتح پوری نے یہ خط مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھیج دیا جنھوں نے اپنے ہفت روزہ ''صدق'' میں یگانہ کو خوب مطعون کیا لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بعد میں مولانا نے ہفت روزہ ''سرفراز'' کو غیرت دلائی تو اس نے یہ ''کارِ نیک'' اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کا نتیجہ اس

جلوس کی شکل میں ظاہر ہوا۔

برسوں پہلے یگانہ، نیاز فتح پوری اور مولانا عبدالماجد دریابادی گہرے دوست رہ چکے تھے اور اس دوستی کی بنیاد شعر و ادب سے مشترکہ دلچسپی کے علاوہ مذہب کے قید و بند اور رسم و رواج کی مخالفت سے حاشیہ گیر ہو جاتی۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں اس زمانے میں ایک Anti-God Front (خدا مخالف محاذ) بھی بنایا گیا تھا۔ بعد میں مولانا نے مذہب سے اپنے رشتے دوبارہ استوار کر لیے، نیاز فتح پوری نے جو تعقل پسندی سے ہی اس نئی منزل میں داخل ہوئے تھے، عقلیت کو ایک نئی طرح سے اپنی زرہ بکتر بنا لیا اور سیدھے سادے یگانہ جن کا ظاہر و باطن ایک تھا گدھے پر بٹھائے جانے کے لیے یکہ و تنہا رہ گئے... اور یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ نہ یگانہ کا خط شائع ہوا نہ نیاز اور نہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے علاوہ کسی نے اسے دیکھا۔

لکھنؤ میں یاس یگانہ چنگیزی کے ساتھ جو افسوسناک سلوک ہوا وہ محض ایک اتفاقی ہنگامہ نہیں تھا۔ اس کے پس منظر میں تیس پینتیس برسوں سے چلی آ رہی وہ رنجشیں اور رقابتیں تھیں جو ان کے اور لکھنؤ اسکول کے شعراء عزیز، محشر، صفی، ظریف، آرزو، ثاقب، ضاحک اور دیگر ثقہ بزرگوں بشمول ماہر القادری، شاہد احمد دہلوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتح پوری وغیرہ کے درمیان جاری تھیں۔ کچھ لوگ ان کی مخالفت پر یوں کمربستہ تھے کہ وہ لکھنؤ کیا یوپی کے بھی نہ ہونے کے باوجود زبان کی باریکیوں سے واقف تھے، کچھ یوں ان کے مخالف ہو گئے کہ وہ غالب کے خلاف تھے۔ ان چشمکوں اور ہنگامہ آرائیوں میں خود یگانہ نے بھی بھرپور حصہ لیا اور حریفوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اپنے معاصر شعرا میں چاہے وہ حسرت ہوں، فراق ہوں یا جوش انھوں نے کسی کو نہیں بخشا۔ مولانا بیخود کو انھوں نے "غالب کا ایک دلچپا مولوی ٹھینگا موہانی" کہا تو عزیز کی زبان کو پایۂ اعتبار سے ساقط بتایا اور ان کی "مصنوعی شاعری" کی قلعی کھولنے کے لیے "شہرت کاذبہ" کے نام سے رسالہ شائع کیا یہاں تک کہ اپنے دور کی سب سے بڑی تحریک یعنی ترقی پسند تحریک کے شعراء کے بارے میں لکھا کہ "چرکین کے ہاتھوں بھی فن شاعری اتنا ذلیل نہ ہوا تھا جتنا ترقی پسندوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔"

یگانہ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ آئے تو یاس عظیم آبادی تھے اور خود کو خاک پائے آتش کہتے تھے لیکن لکھنؤ کے لوگوں نے انھیں بہاری قرار دیتے ہوئے ان کے ساتھ یوں سلوک کیا کہ ان کے شعری مجموعہ "نشتر یاس" پر تقریظیں لکھنے والے نواب انجم، حضرت اوج (خلف مرزا دبیر) اور

عارف (نبیرہ میر انیسؔ) جیسے بزرگ بھی حریف پارٹی کے نشانے پر آ گئے۔ ظریف لکھنوی نے تو ایک مشاعرہ میں خود یگانہؔ کے سامنے ان کی ہجو پڑھی۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ جس مشاعرہ میں یگانہ کو بلایا جاتا لکھنؤ کے تمام شعرا اس کا بائی کاٹ کر دیتے۔ اس صورتِ حال میں یاس عظیم آبادی کی شخصیت میں جو بانکپن تھا اس پر جھلاہٹ اور غصہ کا رنگ چڑھنے لگا اور جوں جوں ان کے یہاں جھلاہٹ بڑھتی گئی لکھنؤ والوں کی لے بھی تیز ہوتی گئی اور حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ خاکِ پائے آتشؔ یاس عظیم آبادی سے امام الغزل، ابوالمعانی اور یگانہ علیہ السلام بن گئے۔

۳۱/ مارچ ۱۹۵۳ء کو لکھنؤ میں ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس اشتعال انگیز فضا کا نتیجہ تھا جو اُن کے نامور حریفوں نے ان کے خلاف پیدا کی تھی اور جس میں ان پر شاتم رسولؐ ہونے کے الزام کے ساتھ ان کے بہاری ہونے، عزیزؔ، غالبؔ و اقبالؔ کے مخالف ہونے اور شیعہ ہونے کے جذباتی سوال بھی اٹھائے گئے تھے۔

اس واقعے کی تفصیلات بہت کچھ بھول چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جو کچھ بھی یاد ہے وہ بھی ذہن سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ دس بیس برس بعد ممکن ہے کہ اہلِ لکھنؤ کو یہ بھی یاد نہ رہے کہ اس طرح کا کوئی واقعہ ہوا تھا لیکن یگانہؔ کے درجِ ذیل اور درجنوں دوسرے اشعار ادب دوستوں کے حافظے میں ضرور محفوظ رہیں گے:

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو ظالم کے سادگی برستی ہے

....

اسیرِ حال نہ زندوں میں ہیں نہ مردوں میں
زبان کٹتی ہے آپس میں گفتگو کرتے

....

موت آئی آنے دیجیے پروانہ کیجیے
منزل ہے ختم، سجدۂ شکرانہ کیجیے

....

پسینہ تک نہیں آتا تو ایسی خشک توبہ کیا
ندامت وہ کہ دشمن کو ترس آجائے دشمن پر

خاک و گل دونوں کو اپنے بانکپن پہ ناز ہے
دیکھیے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدانِ بہار

....

ایسی آزاد روح ، اس تن میں؟
کیوں پرائے مکان میں آئی

....

اب یگانہ کی ایک نعت ملاحظہ فرمایئے

اے آئینۂ انوارِ ازل — اے جلوہ گہہ ہر حسنِ عمل
ہے دیر سے ٹھنڈا دل کا کنول — دیدار دکھا، پردے سے نکل

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

جانِ جہاں مقصود دو عالم — فرش نشیں اور عرش کا محرم
اشرفِ انساں، افضلِ آدم — خاک کا پتلا ، نورِ مجسّم

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

آشفتہ بیانی سن تو سہی — کچھ دردِ نہانی سن تو سہی
ہاں میری زبانی سن تو سہی — یہ رام کہانی سن تو سہی

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

دیوانہ ہوں لیکن مست وِلا — گم گشتۂ منزل سہو و خطا
کچھ دھیان نہ کر جو ہوا سو ہوا — گم راہ کو شمعِ جمال دکھا

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

روشن کردے شمع امید — مار نہ ڈالے حسرتِ دید
جلوہ ترا سَو عید کی عید — دید کوئی جس کی نہ شنید

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

شمع جمال کے پروانے — تیری طلب میں دیوانے
سنتے ہیں کیا کیا افسانے — کس روپ میں تو ہے خدا جانے

میرے اندھیرے گھر کے اجالے
اٹھ مرے کالی کملی والے

یگانہ کے انتقال کے بعد ماہنامہ ''نیا دور'' نے ایک خاص نمبر شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو صباح الدین عمر کے اصرار پر میں نے اپنے دوست من موہن تلخ سے یگانہ پر نظم یا مضمون اور مرحوم کے چند خطوط بھیجنے کی درخواست کی۔ تلخ نے ایک نظم اور چند خطوط بھیج دیے۔ دو خطوط پوسٹ کارڈ پر چند سطروں کے تھے اور ایک خط مقابلتاً طویل تھا۔ اس خط کا سرنامہ ''استادِ عروض تلخ'' تھا۔

افسوس یہ خطوط صباح الدین عمر کے یہاں سے چوری ہو گئے۔ وہ اُن دنوں ادارۂ فروغِ اردو کی پشت پر اس مکان میں رہتے تھے جس میں اِن دنوں اردو کی پہلی نیوز ایجنسی (ا۔ن۔س) کے مالک اور ایڈیٹر امین سلونوی کے بیٹے حسین امین مقیم ہیں۔ یہ چور شاید خاصے پڑھے لکھے تھے۔ فلسفے پر میرے دو مضامین بھی ساتھ لے گئے۔

◆◆◆

بی۔اے۔کی لمبی پالی

یونیورسٹی میں داخلہ تو لے لیا لیکن بی۔اے۔کی خاصی کی لمبی پالی کھیلی۔ یہ پالی کتنی لمبی تھی اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ پھر بھی حساب لگاتا ہوں۔

۱۹۴۷ء میں ابا کا انتقال ہوا تو میں نویں درجے میں تھا۔ اگلے سال ڈی۔اے۔وی کالج، اورئی سے ہائی اسکول پاس کیا۔ میرے ہائی اسکول کے سرٹیفکیٹ پر ۱۹۴۸ء لکھا ہوا ہے اور پرمانند کی مہر لگی ہے۔ لکھنؤ کے کرسچین کالج میں داخلہ لیا اور اسٹوڈینٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں، ریلوے اسٹرائک میں جیل جانے، حاضری کم ہونے اور جیبیں خالی ہونے کے سبب تین سال میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ فیل ایک بار بھی نہیں ہوا۔ اب یہ نہیں یاد کہ امتحان کس سال نہیں دیا تھا۔

انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال کا امتحان شاید اتفاق سے پاس کرلیا اور ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ لیکن اسٹوڈنٹس فیدریشن کے طفیل یونیورسٹی آنا جانا باقاعدہ داخلہ لینے سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔

بالکل شروع کی دو تین باتیں یاد ہیں۔ ان میں سے ایک ضرور داخلے سے پہلے کی ہے... اچاریہ نریندر دیو کو، جو یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، بنارس یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا تو طلبہ نے ہڑتال کردی۔ ہڑتال ختم کرنے کی ان کی اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا تو انھوں نے طلبہ کو خطاب کیا۔ کیسی شاندار تھی یہ تقریر۔ اردو، فارسی اور ہندی کے مناسب ترین الفاظ کے استعمال اور آر پار نظر آنے والی سچائی اور خلوص نے ان طلبہ کو جو ذرا دیر پہلے ان کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے اپنے آپ میں گم ہو جانے، آنسو بہانے اور سر پکڑ کے بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

یہ لفاظی نہیں۔ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی کا ایک مجمل سا بیان ہے۔

اچاریہ جی نے بہت کچھ کہا تھا لیکن اب بہت تھوڑا سا یاد رہ گیا ہے۔ ایک جملہ کچھ اس طرح تھا۔

"میرے بچو، تم میری حمایت میں ہڑتال کر کے اب کیا کرلوگے۔ دوسروں کو آگے

کرکے۔ مجھے تعمیری کاموں میں لگادیا گیا۔ عوام کی نظروں سے دور، (اشارہ شاید کانگریس قیادت کی طرف تھا) اب ہڑتال سے فائدہ! چڑیاں تو کھیت چگ گئیں۔''

ہم لوگ کچھ سمجھے، کچھ نہ سمجھے۔ بہت سے تو محض الفاظ میں الجھ کے رہ گئے۔ لیکن اقتدار کے گلیاروں میں ہلچل مچ گئی اور سیاسی نقصان کے ازالہ کے لیے ان کے نام سے بعد میں ایک ہوسٹل بنادیا گیا۔ وہ نہیں ہیں تو کیا ہوا، ہوسٹل تو ہے۔

یوپی۔ کانگریس کی قیادت کئی حصّوں میں تقسیم تھی اور ہر قابلِ ذکر کانگریسی کسی گروپ کا قائد تھا یا اس کا حصّہ۔ گوبند بلبھ پنت، سمپورنا نند، سی۔ بی۔ گپتا، کملاپتی ترپاٹھی... تھے تو سب کانگریس کے لیڈر لیکن ان سب کی حمایت علاقوں اور ذاتوں تک محدود تھی۔ وہ ایک دوسرے کو زچ کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے۔ نظریاتی طور سے قدامت پسند سب ہی تھے، پنڈت نہرو کی عظیم الشان مقبولیت سے فیضیاب وہ سب ہوتے مگر ان کے سے خواب نہ کوئی جاگتے میں دیکھتا نہ سوتے میں اور یہ بھی تھا کہ اچاریہ جی کے مقابلے میں سب ایک تھے۔

اچاریہ جی اور ان کے تیرہ چودہ ہم خیالوں نے اسمبلی کی رکنیت سے استعفے دے دیے لیکن سوشلزم سے اپنی وابستگی ختم کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ یہ سب کے سب ضمنی انتخابات بھی ہار گئے لیکن دانشوروں اور نظریہ کی سیاست کرنے والوں میں ان کا وقار کچھ بڑھ ہی گیا۔

اچاریہ جی کا ایک واقعہ میرے دوست لطیف صدیقی نے سنایا۔ کانگریس نے اپنے اوادی اجلاس میں Socialistic Pattern of Society کی تجویز منظور کی تو اس نے ایک نظریاتی بحث کو جنم دیا۔ چند دنوں بعد نیشنل ہیرالڈ کے سینیئر رپورٹر صلاح الدین عثمان نے اچاریہ جی سے ایک انٹرویو میں اوادی رزرلیوشن کا ذکر کیا تو انھوں نے براہ راست جواب دینے کے بجائے غالب کا یہ شعر پڑھا:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

یہ تھے اچاریہ نریندر دیو۔ اور لہو تو پنڈت نہرو کے زمانے میں بھی آنکھوں سے نہ ٹپکا تھا... اور اب، چھوڑیے کوئی اور بات کریں۔

ایک طویل عرصے سے میرا خیال ہے کہ ایودھیا کے قضیہ کا فیض آباد میں اچاریہ جی کی ہار سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ میں نے ان کے بیٹے سے ذکر کیا تو انھوں نے اس خیال کو

دوراز کار قرار دیا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ضمنی انتخاب مسجد میں مورتیوں کے ''پرکٹ'' ہونے سے پہلے ہوا تھا۔ لیکن ۱۰رجولائی ۲۰۰۹ء کے راشٹریہ سہارا میں فیض آباد کے ایک غیر مسلم اخبار نویس کے اس دعوے نے میرے خیال کو تقویت بخشی کہ ۲۲ اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں مسجد میں مورتیاں رکھنے سے قبل ۲۰رجولائی ۱۹۴۹ء کے ایک سرکاری خط میں کہا گیا تھا کہ جگہ کی پیمائش کرلی گئی ہے، یہ مسجد سرکاری زمین پر ہے اور یہاں مندر بن سکتا ہے۔ میں نے ان کے اس دعوے کا ذکر ٹائمس آف انڈیا کے اپنے کالم میں کیا تو انھوں نے کسی کے ذریعے میرا فون نمبر حاصل کر کے از راہِ عنایت شکریہ ادا کیا۔ میں نے فوراً اچاریہ جی کے الکشن کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں اپنے ایک مضمون میں واضح طور پر لکھ چکا ہوں کہ اس ضمنی انتخاب میں کانگریس نے اچاریہ جی کو ناستک کے طور پر پیش کیا تھا اور اس الکشن کو ایک ''ناستک'' اور ایک ''آستک'' کے درمیان مقابلے کی شکل دے دی گئی تھی۔ اچاریہ جی فیض آباد کا انتخاب جیت جاتے تو شاید بابری مسجد میں مورتیاں رکھنا ممکن نہ ہوتا۔

صرف رگوں میں دوڑتے پھرنے کے باوجود، لہو فکر و خیال کو کچھ نہ کچھ گرمی تو بخشتا ہی ہے اور اتنی سی گرمی کے سبب پنڈت نہرو اور اچاریہ جی کی ذہنی قربت سے ریاستی کانگریس کے لیڈروں کو خوف آتا۔ اچاریہ جی کو ریاست کی سیاست کے مرکز سے دور پھینک دینے کے دو ہی سبب تھے۔ پنڈت نہرو سے ان کی قربت اور طلبہ میں ان کی بے پناہ مقبولیت۔

اچاریہ جی اپنی ڈھائی تین سو روپے مہینے کی تنخواہ میں سے بمشکل سو روپے لیتے اور باقی روپے غریب اور مستحق طلبہ کو بطور اسکالرشپ دے دیے جاتے۔ رہنے کے لیے وی۔سی۔ لاج اور سواری کے لیے یونیورسٹی کی کار کے باوجود وہ نیو حیدرآباد کے اپنے مکان میں رہتے اور اِکّے پر یونیورسٹی آتے۔ کار آرام کرتی رہتی۔ جب بھی موقع ملتا وہ سنسکرت کے کلاس بھی لیتے۔ وہ اردو، ہندی، فارسی، انگریزی، پالی، پراکرت، سنسکرت اور کئی دوسری زبانوں اور بولیوں کے ماہر تھے۔

سکھوں کا مظاہرہ

پنڈت نہرو کنووکیشن کے سلسلے میں یونیورسٹی آئے تو سکھ پناہ گزینوں نے، جو اُن دنوں رفیوجی کہلاتے تھے، زبردست مظاہرہ کیا۔ اسٹاف کلب کے کنارے والے اس گول کمرے کے آس پاس سے جہاں پی۔ایچ۔ڈی۔ کرنے والے طلبہ خود کو ڈاکٹر کہلوا کر ہی پھولے نہیں سماتے،

یونیورسٹی کی اصل عمارت کے اس کمرے کی پشت تک جسے بعد میں ڈی۔ پی۔ مکھر جی اور بہت بعد میں ڈاکٹر رضوان علوی کا دفتر بننے کی سعادت نصیب ہوئی، ہر طرف سکھ ہی سکھ نظر آرہے تھے... عورتیں، مرد، بچے، طیش میں ڈوبے، مصائب سے ٹوٹے لیکن ایک بہتر زندگی کے خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے۔

اسٹوڈینٹس فیڈریشن نہ صرف سکھوں کے مطالبات کی حمایت کر رہی تھی بلکہ سرگرمی سے احتجاج میں شامل تھی۔ اس کا اور ہم سب کا خیال تھا کہ حکومت کو مشکل میں ڈال کر ہم انقلاب کی منزل کچھ نہ کچھ قریب ضرور کر لیتے ہیں۔ ہمارے ارادے نیک تھے اور نیتیں بخیر اور ہمیں یقین تھا کہ انقلاب ملک کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور یہ ایسا حرفِ شفا یا اسم اعظم ہے جس سے آن کی آن میں سارے دلدر دھل جائیں گے۔

پنڈت نہرو اس مظاہرے اور تقریر کے دوران کی ٹوکا ٹاکی اور نعرے بازی سے اس قدر بددل ہوئے کہ انھوں نے غصے میں یہ تک کہہ دیا، ''آپ لوگ ان سہولتوں سے جو حکومت نے فراہم کی ہیں مطمئن نہیں ہیں تو جہاں سے آئے ہیں وہاں واپس جا سکتے ہیں۔''

پنڈت نہرو کے اس درشت جملے کے بعد پولس نے ریفوجیوں کو کھدیرا تو ایک سردار جی نے جن کی بھنوؤں کے بال تک سفید ہو چکے تھے، کہا، ''کمیونسٹوں نے ہمارا کھیل بگاڑ دیا''۔

یہ جملہ دوسروں کے کانوں سنا سنایا نہیں، اپنے کانوں سنا ہوا ہے۔

پرتھوی راج کپور

جہاں تک یاد ہے مندرجہ بالا دونوں واقعات، اور پہلا تو یقیناً، اس وقت کے ہیں جب میں یونیورسٹی کا طالب علم نہ تھا لیکن پرتھوی راج کپور کی یونیورسٹی میں آمد کے وقت میں بی۔اے میں داخلہ لے چکا تھا۔ وہ ایک کرکٹ میچ کے سلسلے میں لکھنؤ آئے تھے۔ ان کی ٹیم کا کسی مقامی ٹیم سے میچ تھا۔ وہ اپنی ٹیم کے کپتان ہونے کے باوجود کھیلے نہیں تھے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر طلبہ کی یونین نے انھیں مدعو کر لیا اور وہ طالب علموں کو خطاب کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ تقریر انھوں نے آرٹس فیکلٹی کی عمارت کے تین طرف سے گھرے ہوئے میدان کے اس کنویں پر سے کی تھی جسے پاٹ کر گول چبوترے کی شکل دے دی گئی تھی۔ اب اس چبوترے کا بھی نام و نشان نہیں۔

اتنا بڑا امیدان جو اس وقت کی یونیورسٹی کے ایک ایک طالب علم کو اپنی آغوش میں لے سکتا تھا، چھلکا پڑ رہا تھا کہ ہزاروں نہیں تو سیکڑوں طلبہ دوسرے کالجوں سے آ گئے تھے۔

پرتھوی راج کپور گول چبوترے پر کھڑے تھے... لمبے چوڑے، ڈھیلی ڈھالی شلوار پر ڈھیلا ڈھالا کرتا اور اس پر واسکٹ پہنے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، ہوا کے ہلکے جھونکے میں لہرا جانے والے بال،...وہ مضبوط اور متحد ہندوستان کی تجسیم معلوم ہوتے۔ اتنی زبردست بھیڑ اور ایسا سناٹا کہ کوئی تھوڑے سے فاصلے سے بھی بولے تو لگے کانوں میں چیخ رہا ہے ... اتنے میں ان کی آواز ابھری۔ نیگرو موسیقار پال رابسن کی آواز کو خدا کی آواز کہا جاتا تھا، مجھے پرتھوی راج کی آواز بھی آسمانوں سے آتی ہوئی معلوم ہوئی... بلکہ اس کے بھی اوپر سے، آسمانوں کو چیرتی ہوئی، بھاری لیکن میٹھی اور کانوں میں رس گھولتی۔

پرتھوی راج کپور نے ہر بات ایسی کہی تھی کہ کوئی چاہے تو سونے میں تول لے، لیکن کسے پکڑا جائے اور کسے چھوڑا۔ بہت سی باتوں پر پچپن چھپن برسوں نے گرد ڈال دی، کچھ آنسوؤں میں بہہ گئیں اور جو کچھ بھی یاد رہ گیا اس میں سب سے اوپر یہ ہے،''پہلے آسمان سے تارے توڑ لاؤ، پھر انھیں کسی زلف میں ٹانک دو یا کسی کی ٹائی میں۔''معلوم نہیں کتنوں کو وہ زلفیں ملیں، کتنوں کو وہ ٹائی اور کتنوں کے خواب آنسوؤں میں بہہ گئے۔

احتشام حسین اور آل احمد سرور

احتشام حسین کے مقابلے میں آل احمد سرور کے ریڈر منتخب ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہ تھا اور یہ واقعہ یونیورسٹی میں میرے پہنچنے سے خاصا پہلے کا ہے لیکن ہم میں سے بیشتر، وہ جونیر ہوں یا سینیر، سارا قصور انھی کے سر منڈھ دیتے۔

ہوا بس یہ تھا کہ انٹرویو میں مولوی عبدالحق نے احتشام صاحب سے پوچھا،''آپ Matter کے لیے اردو میں کیا لفظ استعمال کرتے ہیں؟''

''مواد'' سامنے کا جواب تھا اور وہی احتشام صاحب نے دیا بھی۔

''یہ تو بہت گندا ہے، بو آتی ہے''مولوی عبدالحق نے کہا اور سرور صاحب ریڈر منتخب ہو گئے۔

آل احمد سرور اور احتشام حسین دونوں ہی عالم تھے لیکن ان میں ایک فرق بھی تھا۔ احتشام صاحب سائنسی اور تجزیاتی ذہن کے مالک تھے، تشبیہ و استعارہ سے گریز کرتے، مسائل

سلجھاتے، انھیں اور زیادہ مشکل نہ بناتے اور ژولیدہ بیانی کو پاس پھٹکنے نہ دیتے۔ برخلاف اس کے سرور صاحب اچھی خاصی نثر کو شاعری کی قبا اڑھا دیتے، تشبیہ واستعارے کے دوٹانکے اوپر مارتے دو نیچے، دو دائیں، دو بائیں اور زبان اتنی ''خوبصورت'' بنا دیتے کہ پینتالیس منٹ کی تقریر کے بعد، جس کا ہر استاد عادی ہو جاتا ہے، سننے والا ہاتھ کھولتا تو اسے ان لکیروں کے علاوہ کچھ نہ ملتا جو پہلے ہی سے ایک دوسرے کو کاٹ رہی ہوتیں۔

آل احمد سرور کی شخصیت میں ایک موہنی تو تھی لیکن کچھ کانٹے بھی تھے جو پاس سے گذرنے والے کے لباس میں کھرونچے لگا دیتے۔ گھر بلاتے تو آدھے گھنٹے کے بعد ڈرائنگ روم کھلتا اور اتنی ہی دیر بعد وہ برآمد ہوتے۔ دوسری طرف بارود خانے میں ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم جو دوسری بار گھنٹی بجانے سے پہلے کھل جاتا، احتشام حسین کرتے پاجامے میں بکھرے ہوئے سر کے بالوں کے ساتھ سامنے آ کھڑے ہوتے۔ تھوڑے سے غم پسند ہو گئے تھے لیکن مسکرانے کی کوشش کرتے رہتے۔ چہرے پر غم اور خوشی کا یہ ملن اچھا لگتا۔ گفتگو میں علم کی جھالر دل موہ لیتی، دماغ کی کھڑکیاں کھول دیتی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں زیادہ تر طلبہ احتشامیے ہو گئے تھے۔ میں ذرا متشدد تھا۔

گوتم بدھ پہلے ہی سے اچھے لگتے تھے۔ انھیں گہرائی سے پڑھنے کے لیے فلسفے کا انتخاب کیا تھا۔ باقی دو مضمون تھے اردو اور انگریزی ادب۔

پہلے دن اردو کے کلاس میں گیا تو تھوڑی دیر میں آل احمد سرور رجسٹر لیے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے۔

''اللہ اللہ یہ ہمیں اردو پڑھائیں گے،'' میں نے زیرلب کہا اور مضمون بدل دیا۔

اب سوچتا ہوں تو اپنی حماقت پر افسوس ہوتا ہے، شرم آتی ہے۔ کلاس روم میں ان کا شاگرد نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا، ان سے اختلاف بھی کیا لیکن ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ خدا جب کسی کو برباد کرنا چاہتا ہے تو اس کی عقل پر پردے ڈال دیتا ہے۔ یہی اس نے میرے ساتھ کیا۔ اردو کے بجائے اکنامکس نہ لی ہوتی تو آج یہ حساب نہ دینا پڑتا کہ بی۔ اے کتنے سال میں کیا۔

میرے بی۔ اے کے پہلے سال میں اسٹوڈینٹس فیڈریشن کی سرگرمیاں کچھ ایسی زیادہ نہ تھیں۔ انگریزی اور فلسفے کے کلاسوں میں باقاعدگی سے حاضری دیتا، اکنامکس کے کلاس میں بھی

چلا جاتا لیکن غوطے بھی لگا دیتا۔ شری چند میرے ساتھ اکنامکس اور فلسفہ میں تھا، اس سے دوستی ہوگئی اور پھر یہ دوستی ہم دونوں کی دنیا بن گئی۔

عبدالحلیم خاں، جمال اور عارف نقوی ابھی پیچھے تھے۔ انھیں ساتھ لینے کے لیے ایک سال ضائع کرنا ضروری تھا اور پھر انھیں آگے نکل جانے کا راستہ دینے کے لیے ایک اور سال۔ لیکن یہ بعد کی کہانی ہے اور میری بربادی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

فی الحال تو معاملہ شری چند سے ہے۔ ہم اکنامکس کا کلاس اکثر گرنانی کی چھوٹی سی کینٹین میں کرتے، کئی کئی دن۔ یہ کینٹین ٹیگور لائبریری کے کونے پر تھی، ایک چھوٹے سے کمرے میں لیکن طلبہ باہر کرسیاں ڈال کر خاصی جگہ گھیر لیتے۔

شری چند ہلکا سا ناک میں بولتا اور مجھے اس کی آواز بہت اچھی لگتی۔ میری کیا بات اسے پسند تھی نہیں معلوم لیکن ایک دن بھی ملاقات نہ ہوتی تو وہ پریشان ہو جاتا اور مجھے انگریزی کے کلاس میں تلاش کرتا۔ ان دنوں انگریزی کے کلاس یونیورسٹی پلے گراونڈ کے سامنے والے حصّہ میں اوپری منزل کے کمروں میں ہوتے تھے۔ سنیچر کی رات اور پھر اتوار کا پورا دن ہم ساتھ ساتھ گذارتے۔ میں شام کے دونوں ٹیوشن پڑھا کر اس کے ہوسٹل آجاتا، شاید محمود آباد ہوسٹل۔ گھر میں کون رونے والا تھا۔

ہوتے ہوتے امتحان آگئے لیکن ہم دونوں نہ امتحان کی فیس دے سکے تھے نہ سال کے آخر کی دو قسطیں۔ مجھ پر شاید تین قسطیں باقی تھیں۔ قرض ادھار کر کے جانے کہاں سے امتحان کی فیس کا انتظام کیا کہ وہ ضروری تھی، دو ماہی قسطیں تو بعد میں بھی ادا کی جاسکتی تھیں۔ رو، گا کے شری چند نے بھی کچھ روپے ٹانڈہ سے منگا لیے اور ہم دونوں نے خصوصی اجازت حاصل کر کے امتحان کی فیس ساتھ ساتھ جمع کی۔ امتحان کے ہال میں داخلے کے فارم جن پر رول نمبر ہوتے تقسیم ہو چکے تھے، سیٹیں لگ چکی تھیں اور ہم لوگوں نے فیس چوں کہ تقریباً عین وقت پر دی تھی اس لیے ہماری سیٹیں بھی ساتھ ساتھ لگی تھیں۔

اکنامکس کے پرچے سے ایک دن قبل ہم نے امین آباد کے فرینڈس بک ڈپو سے کتاب خریدی۔ ایک گھنٹے میں ایک ایک صفحہ پلٹ کے سارا کورس ختم کر لیا اور آئی۔ ٹی۔ کالج کے چوراہے کی اس پلیا پر جو اس جگہ کے آس پاس تھی جہاں اب پٹرول پمپ ہے، بیٹھ کے چائے پینے چلے گئے۔ سڑک کی دوسری جانب ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا، وہاں سے چائے کبھی میں لے آتا،

کبھی شری چند۔ مجھے نہیں یاد کہ ہم نے وہاں چائے کے ساتھ کبھی ایک بسکٹ بھی کھایا ہو۔ وہ دن اس طرح کی عیاشیوں کے نہ تھے۔ صبح کے وقت البتہ شری چند اپنے بکسے سے نکال کر چار مٹریاں لے لیتا جو وہ گھر سے بنوا کے لایا تھا۔

اس پلیا کے انتخاب کی کوئی خاص وجہ ہمارے ذہن میں نہ تھی اور لڑکیوں کا کوئی چکر تو ہرگز نہ تھا کہ کالج کا گیٹ دور تھا اور ہوسٹل کی لڑکیاں ہوٹل کے سامنے والے چھوٹے سے دروازے سے آ کر ڈبل روٹی، انڈے اور بسکٹ لے جاتیں۔ ہوسٹل بھی اسی طرف کہیں تھا۔ یہ بات مجھے یوں معلوم تھی کہ ماسٹر ماموں کی بیٹی خورشید ہوسٹل میں رہتی تھی اور میں اس سے ملنے جب بھی گیا وہ اسی طرف سے آئی۔ میرا خیال ہے میں اس سے ملنے دو یا زیادہ سے زیادہ تین بار کالج گیا ہوں گا۔ اتوار کو تو وہ اکثر گھر آ ہی جاتی۔ لیجیے اکنامکس کے پرچے سے پاکیٔ داماں کی فضول حکایت کی طرف نکل آیا۔ آیئے امتحان دینے چلیں۔

پرچہ آیا۔ جواب تو سارے سوالوں کے آتے تھے لیکن بس ایک دو سطروں میں۔ بہت کھینچتے تو چار پانچ جملے ہو جاتے۔ ہم دونوں نے مسکاوٹ کی اور ایک ہی طرح کے جواب لکھنے کا فیصلہ کر لیا، جیسے اکنامکس کا نہیں فلسفے کا پرچہ کر رہے ہوں۔ ایک سوال تھا Law of Diminishing Return پر۔ جواب میں ہم دونوں نے لکھا کہ بارکلے کے مطابق مادی دنیا کا وجود ہی نہیں تو منافع میں کمی اور زیادتی کا کیا سوال۔ یہی سلوک دوسرے سوالوں کے ساتھ بھی کیا لیکن میں فیل ہو گیا اور شری چند پاس کیوں کہ اس کے ساتھ ''لکھا تھا نامۂ اعمال میرا ہندی میں'' کا معاملہ تھا۔ ان دنوں ہندی کی کاپیوں میں جواب کے صفحے گن کے پاسنگ مارکس یا کچھ اور نمبر دے دیے جاتے۔ کلاس تو اسے مل گیا لیکن فلسفے میں اس کے نمبر مجھ سے کم تھے۔

اکنامکس میں میرے نمبر بس برائے نام تھے لیکن باقی دونوں مضامین میں اتنے کہ اردو لی ہوتی تو فرسٹ ڈویزن ضرور آتا۔ اپنی بے وقوفی پر بہت غصہ آیا اور اسے سرور صاحب کے لیے نازیبا کلمات کا نتیجہ سمجھنے لگا۔ لیکن سانپ نکل چکا تھا، اب لکیر پیٹنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔

بھوک ہڑتال

اچاریہ جگل کشور جنھوں نے اچاریہ نریندر دیو کی جگہ لی تھی، ان کے پاسنگ بھی نہ تھے۔ پھر انھوں نے یونیورسٹی کی اسٹوڈینٹس یونین سے کھلواڑ کیا۔ اس کے باوجود طلبہ کی تحریک وہ

رخ اختیار نہ کرتی جو آخر کار اس نے اختیار کرلیا بشرطیکہ ان کے سر پر سی۔ بی۔ گپتا کا بھوت نہ منڈلا رہا ہوتا۔ بدعنوانیوں میں گپتاجی کے ملوث ہونے کے سلسلے میں اس وقت بھی خاصا اختلاف رائے تھا، اب بھی ہے لیکن کچھ ایسا ہوا کہ وہ بدعنوانیوں کی علامت بن گئے۔ وہ ایک مخصوص طبقے کے نمائندے سمجھے جانے لگے اور نتیجتاً اس طبقے کی بدعنوانیاں بھی انھی کے کھاتے میں لکھ دی گئیں۔ طلبہ نے ہڑتال کردی۔ ان دنوں اس جگہ جہاں اب اسپورٹس اسٹیڈیم ہے چاروں طرف ٹین کی چادروں کی دیوار کے اندر ''بھارت میں اتر پردیش پردرشنی'' نام کی ایک نمائش لگی تھی۔ طلبہ نے سب کچھ توڑ پھوڑ ڈالا اور تین یا چار لڑکے یونین بلڈنگ میں بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔ ان دنوں گومتی اس جگہ کے پاس سے بہتی تھی جہاں اب ہوٹل کلارک ہے اور موجودہ ہنومان مندر اور اس کے پیچھے کی زمین خالی پڑی تھی۔ طلبہ دن رات بھوک ہڑتالیوں کی حفاظت کرتے لیکن ان کی حالت بگڑی تو رات کے اندھیرے میں پولس نے دھاوا بول دیا اور ہڑتالی طلبہ کو اٹھالے گئی۔ شہر کے بڑے حصے پر کرفیو لگادیا گیا اور بدقسمت حالات میں میڈیکل کالج کا ایک طالب علم گنیند رجو کسی دوا کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا پولس فائرنگ میں ہلاک ہوگیا۔ اس کی موت سے احتجاج کی آگ بھڑک اٹھی۔

غلط یا صحیح، کہا جاتا ہے کہ ایک دن شعبہ سوشیولاجی کے ڈاکٹر سرن حاضری کا رجسٹر لے کر کلاس لینے گئے اور وہاں سارا کلاس خالی دیکھ کر انھوں نے رجسٹر میں لکھ دیا The class could not be held due to the inglorious behaviour of C.B. Gutpta۔ گپتا جی کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے ڈاکٹر سرن کے لیے نازیبا کلمات استعمال کیے۔ اس واقعے کے بعد اساتذہ کے اس مختصر سے گروپ میں بھی جو گپتاجی کا حامی تھا، پھوٹ پڑ گئی۔

ان دنوں میڈیکل کالج کا نظم ونسق یونیورسٹی کے ماتحت تھا اور یونیورسٹی اور میڈیکل کالج کے اساتذہ میں کمیونسٹ گروپ خاصا مضبوط۔ یہ گروپ اساتذہ کی یونین (LUTA) پر قبضہ تو نہیں کرسکتا تھا لیکن اس کی مدد کے بغیر کوئی اس پر قابض بھی نہ ہو پاتا۔ سمپورنانند جو خاصے قدامت پسند تھے، سی۔ بی۔ گپتا کے اصل حریف تھے اور گپتاجی کی مخالفت سمپورنانند کی حمایت بن جاتی لیکن اس سے بچا بھی نہ جاسکتا۔ کچھ عجیب صورت حال تھی۔

اس وقت یونین کے صدر تھے ترپاٹھی اور سکریٹری تھے رابن مترا۔ یہ ایک طرح سے کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی کا متحدہ محاذ تھا۔ اس تحریک نے چندر جیت یادو، ٹانگڑی اور

شیام لال باجپئی کو طلبہ کی تحریک کی قیادت میں صف اوّل پر پہنچا دیا اور کرفیو پاس کی موجودگی کے باوجود مجھے جیل۔ یہ پاس قومی آواز سے تعلق کی بنا پر ملا تھا۔

قومی آواز نے اسی سال یعنی جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا مجھے اعزازی نامہ نگار مقرر کر دیا تھا۔ یونیورسٹی میں ہنگامے شروع ہوئے تو مقامی اور قومی اخباروں کے نمائندوں میں میری اہمیت یکا یک بڑھ گئی۔ لکشمی کانت تواری، وِدّیا ساگر، سپرو، ایس۔ ایم۔ جعفر اور دوسرے سینیر رپورٹروں کے لیے سارا دن یونیورسٹی میں گذارنا ممکن نہ تھا۔ وہ شام میں آتے اور مَیں دن بھر کی سرگرمیوں سے انھیں مطلع کر دیتا۔ اسٹوڈینٹس فیڈریشن سے میرے تعلق اور اخباری نمائندوں کو دن بھر کی خبریں دینے کے سبب سی۔ آئی۔ ڈی۔ نے میری گرفتاری کی ایک سازش رچی۔ یہ واضح کر دوں کہ اس وقت اور بعد میں بھی میری اپنی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن پولس سمجھتی تھی کہ اخباروں کے مخالفانہ رویّے کا ذمّے دار میں ہی ہوں، کیوں کہ انھیں خبریں مجھ ہی سے ملتیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کچھ طلبہ بھوک ہڑتال پر تھے اور شب و روز ایک بڑی بھیڑ، جس میں کالجوں کے طلبہ بھی ہوتے، ان کی حفاظت کیا کرتی۔

یونین کی عمارت کے باہر تیس پینتیس برس کے ایک شخص نے خود کو دہلی کے کسی اخبار کے نمائندے کے طور پر متعارف کرایا اور شام کے وقت، شام کے وقت کیا دو تین بجے کے قریب، امین آباد جانے کے لیے میری مدد چاہی۔ ظاہر ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

ان دنوں اس جگہ کی صورت جو اَب پریورتن چوک ہے بالکل مختلف تھی۔ موجودہ بیگم حضرت محل پارک کے چاروں طرف درخت لگے ہوئے تھے اور بیچ میدان میں لڑکے کرکٹ کھیلا کرتے۔ حضرت گنج سے منکی برج آنے والی دونوں سڑکوں کے درمیان درخت ہی درخت تھے۔ کرفیو کی وجہ سے سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ معلوم نہیں کیوں ہم دونوں نے منکی برج سے قیصر باغ ہوتے ہوئے امین آباد جانے کے بجائے چائنا گیٹ (موجودہ پریس کلب) کا راستہ اختیار کیا۔ اور علی منزل اور پی پلس بک ہاؤس ہوتے ہوئے نشاط سینما کے پاس پہنچے تو دہلی کے ''رپورٹر'' نے چائے پینے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے یہ کہنے پر کہ کرفیو کے سبب سارے ہوٹل بند ہوں گے اس نے کہا گلیوں کے چھوٹے چھوٹے ہوٹل کرفیو میں بھی کھلے رہتے ہیں اور نشاط سینما سے متصل گلی کی طرف مڑ گیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا ہوٹل واقعی کھلا ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے وہاں ایک ایک پیالی چائے

پی۔ پیسے اسی نے دیے۔

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے اس واقعے کے باوجود اس پر شک کیوں نہیں ہوا۔ وہاں چائے پی کر ہم لوگ قیصر باغ پولس تھانے کے سامنے سے ہوتے ہوئے امین آباد کی چڑھائی پر مڑ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ نوری ہوٹل کے سامنے پولس کی ایک جیپ کھڑی ہے۔ ہم دونوں وہاں پہنچے تو پولس نے مجھے پکڑ کر جیپ میں بٹھا دیا۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا کہ میں صحافی ہوں اور میرے پاس کرفیو پاس ہے لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیپ امین آباد کے چوراہے پر جا کر رک گئی اور دس بارہ منٹ کے بعد جب اسی ڈھال پر واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ ''دہلی کا صحافی'' پولس والوں سے بات چیت کر رہا ہے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہو نہ ہو اس شخص کا تعلق خفیہ پولس سے ہے۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بعد میں وہ ''اخبار نویس'' کبھی نظر بھی نہیں آیا۔

تھانے پہنچا کر پولیس کی جیپ کہیں چلی گئی اور مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایک مجسٹریٹ صاحب حوالات کے لوہے کے گیٹ کے پاس میز کرسی پر بیٹھ کر پولیس کے تیار کیے ہوئے گرفتاری کے وارنٹوں پر دستخط کرنے لگے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور لوہے کے گیٹ کے پاس آ کر ان سے کہا، ''سر، میں جرنلسٹ ہوں، یہ لوگ مجھے جانے کیوں پکڑ لائے''۔ میں نے جیب سے اپنا کرفیو پاس نکال کر آگے بڑھایا تو سپاہی سے منگوا کر انھوں نے اسے دیکھا اور بولے، ''ارے یہ تم لوگوں نے کیا کیا۔ انھیں کہاں پکڑ لائے۔ جلدی سے دروازہ کھولو۔'' سپاہی نے فوراً ہی لوہے کا دروازہ کھول کر مجھے باہر نکال دیا۔ بدقسمتی سے مجسٹریٹ صاحب مجھ سے بات کرنے لگے اور اتنے میں قیصر باغ تھانے کے انچارج برگوتری وہاں آ گئے اور مجھے دیکھتے ہی بولے، ''تم باہر کیسے آ گئے؟'' مجسٹریٹ (یا جو بھی وہ تھے) نے میری پیروی کی لیکن برگوتری نے یہ کہتے ہوئے ''جرنلسٹ ورنلسٹ کچھ نہیں، انھیں فوراً بند کرو'' مجھے پھر حوالات میں پہنچا دیا۔ تھوڑی دیر میں حوالات کے سارے قیدیوں کے ساتھ مجھے بھی جیل بھیج دیا گیا۔

ان دنوں اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک صحافی کے اس طرح گرفتار کیے جانے کی خبر اخباروں میں چھپی تو اگلے دن اسمبلی میں حزب مخالف نے تحریک التوا پیش کی اور حکومت نے ایوان میں اعلان کر دیا کہ صحافی کو رہا کیا جا چکا ہے۔ کچھ کچھ خیال ہوتا ہے تحریک التوا میں ایک نام اور بھی تھا اور اسے بھی رہا کر دیا گیا تھا لیکن یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

اسمبلی میں حکومت کے اعلان کے بعد ہی مجھے جیپ میں بٹھا کر امین آباد میں نوری

ہوٹل کے سامنے لاکر چھوڑ دیا گیا۔

میرا خیال تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہونے کے سبب حیات اللہ انصاری میری یونیورسٹی کی نامہ نگاری ختم کر دیں گے۔ میں ڈرتے ڈرتے قومی آواز پہنچا تو مجھ پر نظر پڑتے ہی انھوں نے کہا۔

''آج تو آپ اسمبلی کی اسٹوری میں آ گئے''

حیات اللہ انصاری کا جملہ من وعن یہی تھا لیکن میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ تحریک التوا اگلے دن پیش کی گئی تھی یا ایک آدھ دن بعد۔ بہر حال، قومی آواز میں تحریک التوا، میری رہائی کی خبر اور طلبہ کی تحریک کے سلسلے میں میری دی ہوئی خبریں ساتھ ساتھ شائع ہوئیں۔

'وزیر اعظم' رفیع احمد قدوائی؟

رفیع احمد قدوائی یوپی کی سیاست میں وزن و وقار رکھتے تھے اور کانگریس میں مولانا آزاد کے علاوہ پنڈت نہرو کے قریب ترین مسلم رفیقوں میں تھے۔ آزاد ہندوستان کی پہلی کابینہ میں وہ وزیر مواصلات اور ۱۹۵۲ء کے پہلے عام انتخابات کے بعد وہ مرکزی حکومت میں وزیر غذا کے طور پر شامل تھے۔ ریاستی کانگریس میں ان کا ایک مضبوط گروپ تھا اور یوپی کی سیاست پر زبردست اثر۔ ان دنوں ملک شدید غذائی قلت کا شکار تھا اور تاجروں کی ذخیرہ اندوزی کے سبب اجناس کی قیمتوں میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔ مزید یہ کہ غلّہ کی فراہمی کے لیے مرکزی حکومت سے ریاستی حکومتوں کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔

رفیع صاحب نے لوک سبھا میں ریاستی حکومتوں کے مطالبات پر اپنے بیان میں اعداد و شمار دیتے ہوئے بتایا کہ ہر ریاست کو اس کے مطالبے سے زیادہ غلّہ بھیجا جانا شروع کر دیا گیا ہے۔ ان کے اس اعلان سے ذخیرہ اندوزوں میں کھلبلی مچ گئی اور اس خیال سے کہ اب دام بری طرح گر جائیں گے، تاجروں نے سارا غلہ باہر نکال دیا اور قیمتیں ایک دن میں آسمان سے زمین پر آ گئیں۔ کہا جاتا تھا کہ مرکزی حکومت نے ریاستوں کو ایک دانہ غلّہ بھی نہیں بھیجا۔ اس کے پاس زیادہ اسٹاک تھا ہی نہیں۔

یہ دور رفیع احمد قدوائی کی انتہائی مقبولیت کا تھا۔

پنڈت نہرو ان دنوں پریس کانفرنسوں میں اور یوں بھی کام کی شدّت سے تکان،

طویل آرام کی ضرورت، وزارت عظمیٰ چھوڑ کر آرام کرنے اور حد یہ ہے کہ رٹائرمنٹ تک کی باتیں کیا کرتے۔ اس صورتِ حال نے تشویش کی ایک فضا پیدا کر دی تھی۔ اخباروں میں ''نہرو کے بعد کون؟'' (After Nehru who?) کی بحث اسی زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ مختلف نام لیے جا رہے تھے لیکن ان میں رفیع احمد قدوائی کا نام شاید ایک بار بھی نہیں لیا گیا۔ اس وقت ملک کی فضا ایسی تھی کہ وزارت عظمیٰ کے لیے کسی مسلمان کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا تھا۔

رفیع احمد قدوائی مرکزی حکومت میں ضرور شامل تھے لیکن اتر پردیش کی سیاست سے ان کی دلچسپیاں برقرار تھیں اور وہ لکھنؤ سے مسلسل زندہ تعلق قائم رکھ کر اس رشتے کی آبیاری کیا کرتے۔ بے حد دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے گروپ میں شاید ہی کوئی مسلم رہنما شامل رہا ہو۔

طلبہ کی تحریک کے زمانے میں قدوائی صاحب لکھنؤ آئے تو کونسل ہاؤس کے سامنے والے بنگلے میں مقیم ہوئے۔ یہ وہی بنگلہ ہے جس میں اب ریاستی بھارتیہ جنتا پارٹی کا دفتر ہے۔ طلبہ کو ان کی آمد کا علم ہوا تو ان کے پاس فریاد لے کے گئے۔ قدوائی صاحب پس پردہ سیاست کے کھلاڑی تھے، سامنے آ کر صرف ''جلوہ'' دکھاتے۔ معنی کو کسی قسم کی غیر ضروری وسعت دیے بغیر بھی یہ شعر ان کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبری کنند
چوں بہ خلوت میں روند آں کار دیگری کنند

چھوٹا سا بنگلہ، باہر چھوٹا سا دالان، دالان کے بعد چھوٹی سی کھلی جگہ اور پھر چو حدّی (چوراہے کی صورت بدل کر اب بنگلے کو وسعت دے دی گئی ہے)۔ سوڈیڑھ سو طلبہ ایک ایک دو دو کر کے ہی وہاں جمع ہو سکے تھے کیوں کہ منکی برج کے آس پاس کرفیو نافذ تھا ایسے میں جلوس کی اجازت بھلا کیسے ملتی، اخبار نویس بھی پہنچ گئے جن میں ودیا ساگر، صلاح الدین عثمان، جعفر اور سپرو کے نام یاد ہیں۔ میں بھی پیچھے پیچھے لگا تھا۔ ہم چاروں پانچوں طلبہ کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کی طرح رفیع احمد قدوائی کے برآمد ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں قدوائی صاحب برآمد ہوئے۔ وہ تقریر تو کرتے نہیں تھے، باتیں کرتے۔ طلبہ سے باتیں کرنے لگے۔ ان کا میمورنڈم لیا، ایک نظر ڈالی اور جیب میں رکھتے ہوئے کہنے لگے، ''فرصت سے پڑھوں گا۔''

طلبہ اور پریس والے کچھ سوالات بھی کر رہے تھے اور وہ بالکل غیر رسمی انداز میں ان کا جواب بھی دیتے جاتے۔ اسی دوران مَیں نے بھی ایک سوال اچھال دیا۔ سوال کچھ اس طرح کا تھا

جس میں طلبہ کے نقطۂ نظر کی نمائندگی ہوتی تھی، لیکن پوچھا گیا تھا بطور صحافی۔

رفیع صاحب نے پوچھا، ''آپ طالب علم ہیں یا صحافی؟''

میں نے نہایت بے وقوفی کا جواب دیا، ''دونوں۔''

رفیع صاحب کو حالات کی سنگینی ختم کرنے کا موقع مل گیا، جو انھوں نے اچھے سیاست داں کی طرح ہاتھ سے نہ جانے دیا اور کہا، ''ایسے ہی لوگ تو ساری گڑبڑ کرتے ہیں۔''

ان کے اس جملے پر سب لوگ ہنس دیے۔ تھوڑی دیر میں طلبہ منتشر ہو گئے، لیکن ہم اخبار والے باہر ان کا انتظار کرتے رہے۔ دس پندرہ منٹ میں رفیع احمد قدوائی باہر نکلے، چپراسی یا ان کے پی۔اے۔ نے ایک موٹی اور ایک پتلی سی فائل باہر منتظر جیپ[1] میں لا کر رکھ دی۔ وہ جیپ میں بیٹھنے جا ہی رہے تھے کہ اخبار والوں نے ان سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ ہنس ہنس کر جواب دیتے رہے۔ اتنے میں پنڈت نہرو کی وزارت عظمیٰ کے کاموں سے طویل چھٹی پر جانے اور رٹائرمنٹ تک کی باتوں کے پس منظر میں وڈیا ساگر نے کہا۔

''آپ وزیر اعظم کیوں نہیں ہو جاتے؟''

رفیع صاحب نے وڈیا ساگر کے کندھے پر محبت سے ہاتھ مارا اور جیپ میں اچک کے بیٹھتے بیٹھتے کہا، ''میاں چھ مہینے میں نہرو کو بھول جاؤ گے[2]۔'' اور گاڑی میں یہ جا وہ جا۔

طویل رخصت اور رٹائر ہونے کی دھمکیوں کے دوران ہی پنڈت نہرو چین کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ اور ابھی وہ اندرون ملک کا دورہ کر ہی رہے تھے کہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں رفیع احمد قدوائی کا انتقال ہو گیا، دل کے شدید دورے میں، ایک جلسۂ عام کے دوران۔

پنڈت نہرو بیجنگ (ان دنوں پیکنگ) لوٹ کر آئے اور ایک پریس کانفرنس میں کسی اخبار نویس نے ان کے رٹائرمنٹ لینے کی دھمکی یا خواہش کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے

۱۔ اب یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جیپ تھی یا کار لیکن مجھے جیپ کے پائیدان پر ان کا پیر رکھنا اور پھر وڈیا ساگر کے ایک سوال کا جواب دے کر اچک کے جیپ میں بیٹھنا یاد آ رہا ہے۔

۲۔ مجھے رفیع صاحب کا یہ جملہ لفظ بہ لفظ یاد ہے لیکن اس واقعے پر پچپن چھپن برس کی دھول پڑ چکی تھی اس لیے سوچا کہ تصدیق ہو جائے تو کیا خوب ہو۔ خوش قسمتی سے ایک تعلیمی ادارے کی سالانہ تقریب میں وڈیا ساگر سے ملاقات ہو گئی، میں نے پوچھا تو انھوں نے کہا، ''تم نے اچھا یاد دلایا۔ میں تو بھول گیا تھا۔ کسی اخبار میں تو یہ بات چھپ بھی گئی تھی، غالباً پائنیر میں۔''

دوٹوک انداز میں کہا، "I am not retiring type"
رفیع احمد قدوائی کے انتقال کے بعد پنڈت نہرو مرتے مر گئے لیکن انھوں نے ریٹائر ہونے کا کبھی نام نہ لیا۔

یہ بات ۱۹۵۴ء کی ہے۔ کشمیر کا مستقبل طے کرنے کے لیے اقوام متحدہ سے ہندوستان اور پاکستان کا رائے شماری کا وعدہ ابھی زیادہ پرانا نہیں ہوا تھا اور ریاست میں اقوام متحدہ کا دفتر قائم کر دیا گیا تھا۔ اقوام متحدہ نے پورے کشمیر پر ہندوستان کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے کے باوجود اسے کشمیری عوام کی خواہشات سے مشروط بھی کر دیا تھا۔ پاکستان کو حملہ آور مانتے ہوئے اس نے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ وہ اس علاقے سے جو اس کے قبضے میں ہے اپنی فوجیں واپس بلا لے۔ پاکستان نے اپنی فوجیں واپس نہیں بلائیں اس لیے عوام کی امنگوں کا اندازہ نہ کیا جا سکا۔ پنڈت نہرو کشمیری تھے۔ انھیں کشمیر عزیز تھا، وہ اسے ہندوستان کے حصے کے طور پر دیکھتے تھے لیکن عام رائے شماری کی تلوار ہندوستان کے سر پر لٹک رہی تھی۔

میرا خیال ہے، بلکہ سوچی سمجھی رائے ہے، کہ پنڈت نہرو رفیع احمد قدوائی کو وزیر اعظم بنا کر کشمیر میں رائے شماری کرانا چاہتے تھے لیکن رفیع صاحب کے انتقال سے یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور پنڈت نہرو نے اس کے بعد کم سے کم بالاعلان "تکان" کبھی نہ محسوس کی۔

حیرت، در حیرت، صرف پندرہ بیس سال بعد قدوائی صاحب کی برسی کے موقع پر مسولی میں ریاست کے ایک کانگریسی منسٹر نے کہا، "رفیع صاحب کا بہت بڑا یوگ دان ہے فلم انڈسٹری میں۔ وہ گانا بہت اچھا گاتے تھے۔"

اخباروں میں اس احمقانہ تقریر کا خوب خوب مذاق اڑایا گیا لیکن متعلقہ منسٹر کا کچھ نہ بگڑا... یہ ہے ہمارے ملک کی سیاست کی بلیہاری!

حکومت ہند کی سطح پر کشمیر کے جمہوریہ ہند کے جزو لازم (Integral part) ہونے کا سلسلہ اس وقت تک شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ نقطۂ نظر ۱۹۶۰ء میں خرشچف کے دورۂ ہند کے بعد واضح انداز میں پیش کیا گیا تھا۔

لیجیے، یونیورسٹی کے طلبہ کی تحریک کے حوالے سے رفیع صاحب کی بات کرتے کرتے کشمیر کی سیر کر ڈالی۔ آیئے پھر لکھنؤ یونیورسٹی چلیں۔

قدوائی صاحب نے طلبہ کو کوئی یقین دہانی نہیں کی، سچ پوچھیے تو ان سے کوئی سنجیدہ بات

چیت بھی نہیں ہوئی، اخبار نویسوں تک کو کچھ پتہ نہ لگا اور پس پردہ سب کچھ طے ہو گیا۔ نہ طلبہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا نہ حکومت کی سبکی ہوئی۔ طلبہ کی یونین کے مسائل طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی گئی، طلبہ نے تحریک واپس لے لی، سارے طلبہ غیر مشروط طور پر رہا کر دیے گئے، رہائی سے پہلے ان کا منہ میٹھا کرانے کے لیے جیل میں بہت سی مٹھائی بھیجی گئی، اس کے علاوہ جیل سے ہر طالب علم پھولوں سے لدا پھندا باہر آیا۔

کہا جاتا تھا کہ یہ مٹھائی اور ہار پھول رفیع صاحب نے بھجوائے تھے۔

پڑھنے والوں کا بھی مُنہ میٹھا ہو گیا ہوگا...لیکن اب اس میں تھوڑی سی کھٹاس بھی گھول لیجیے۔

جن دنوں پنڈت نہرو بہت زیادہ تھک جانے، لمبی چھٹی پر جانے اور رٹائرمنٹ لینے کی باتیں کر رہے تھے، ایک دن رامنوہر لوہیا کے کسی ''پرستار'' نے کافی ہاؤس میں ان سے کہا۔

''لوہیا جی، آپ وزیر اعظم کیوں نہیں بن جاتے؟''

''جس کرسی پر نہرو بیٹھا ہے،'' لوہیا نے کہا، ''اس پر میں اپنا جوتا بھی رکھنا پسند نہ کروں گا''

دو میزیں ملائی گئی تھیں۔ بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر اٹھ کے چلے گئے۔

رام منوہر لوہیا کا ذکر آ گیا ہے تو ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ یہ چشم دید تو نہیں لیکن واقعے کے کرداروں کو آپ جانتے ہوں تو چشم دید ہی معلوم ہوگا۔

نیشنل ہیرالڈ کے اوستھی جو لوہیا سے کم ٹیڑھے نہ تھے اور سیاسی طور پر انھیں کے ساتھ، ایک دن کافی ہاؤس میں آلو چاپ کھا رہے تھے کہ لوہیا، جو کسی بات پر ہاں کہنا جانتے ہی نہ تھے، آ گئے۔

اوستھی کو آلو چاپ کھاتے ہوئے دیکھا تو بولے، ''آلو چاپ کیا کھانا؟ آلو چاپ نہ کھایا ایک چمچہ شکر پھانک لی۔''

اوستھی کو دور کی سوجھی، اگرچہ خلافِ معمول۔

انھوں نے لوہیا جی کے لیے کافی منگائی اور جیسے ہی کافی آئی، آلو چاپ سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کے پیالی میں ڈال دیا۔

''یہ کیا؟'' لوہیا جی نے کہا

''شکر نہ ڈالی آلو چاپ ڈال دیا۔'' اوستھی نے جواب دیا

لیجیے بی۔اے۔کا حساب دیتے دیتے کافی ہاؤس پہنچ گیا۔

ایک سال فیل ہوا۔دوسرے سال نہ فیس جمع کر سکا، نہ حاضری ہی پوری تھی۔

بی۔اے کے پہلے سال میں فیل ہونے کا اثر بہت تھا۔یہ واقعہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔لیکن ایک پریشانی سے نجات بھی ملی تھی۔ان دنوں بھی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے ٹرانسفر سرٹیفکٹ داخل کرنا ضروری تھا۔اگرچہ عارضی داخلہ مل جاتا، اس شرط پر کہ یہ سرٹیفکٹ بعد میں داخل کردیا جائے اور سال بھر میں داخل نہ کیا جاتا تو نتیجہ روک لیا جاتا۔چنانچہ پہلے سال کے پاس اور کمپارٹمنٹل کے طلبہ کی فہرست کے ساتھ ان طلبہ کی بھی فہرست رجسٹرار آفس اور آرٹس فیکلٹی میں لگائی جاتی جن کے نتیجے یہ کمی پوری نہ کرنے کے سبب روک لیے جاتے۔میرا رول نمبر پاس ہونے والے طلبہ میں تو تھا ہی نہیں، ان طلبہ کی فہرست میں بھی نہ تھا جن کے نتیجے روک لیے گئے تھے۔یہ تحفہ مجھے کسی ایسے کلرک سے ملا تھا جس کی نظر چوک گئی تھی۔

ٹرانسفر سرٹیفکٹ کرسچین کالج کے بقایاجات ادا کرنے کے بعد ہی حاصل کیا جاسکتا تھا اور میں اتنے بہت سے روپے کہاں سے لاتا۔سال ڈیڑھ سال بعد کرسچین کالج سے کئی خطوط آئے کہ واجبات ادا کر کے اپنا انٹر کا سرٹیفکٹ لے جائیے۔میں نے کسی خط کا جواب نہ دیا اور آخر تنگ آ کر کالج نے سرٹیفکٹ بھیج دیا۔ٹرانسفر سرٹیفکٹ کی رکاوٹ تو میں نے پار کر ہی لی تھی۔سرٹیفکٹ مل جانے سے ایک اور دھڑکا جو دل کو لگا ہوا تھا جاتا رہا۔انٹر کا نتیجہ خود میں نے نہیں دیکھا تھا، دوستوں نے بتایا تھا۔کبھی کبھی خیال آتا کہیں ایسا تو نہیں کہ انھوں نے مذاق کیا ہو۔سرٹیفکٹ آنے سے یہ کانٹا بھی نکل گیا۔

لیکن دوسرے سال امتحان نہ دے سکنے سے نہ صرف یہ کہ پہلے سال کے فیل ہونے کا غم جاتا رہا بلکہ زندگی کو تباہی کے راستے پر ڈالنے کا ایک طرح سے عادی ہوگیا۔

دو سال گذر چکے تھے لیکن میں صرف انٹر پاس تھا اور حالات نے آوارگی میں زمانے کی سیر کرنے کے مواقع فراہم کردیے تھے۔

یونین بلڈنگ اور کیرم

پڑھاکو لڑکے تو عام طور سے یونین کا رخ بھی نہ کرتے لیکن باقی، خاص طور سے آرٹس فیکلٹی کے، خالی پیریڈ میں اس کا ایک آدھ چکر لگا لیتے۔چائے پیتے، شطرنج کی ایک آدھ بازی اور

کیرم کا ایک آدھ بورڈ کھیلتے اور لوٹ جاتے، کلاس یا لائبریری کے لیے۔ لیکن میرے لیے تو یونین کی عمارت ہی یونیورسٹی بن گئی تھی۔ میں براہ راست یونین بلڈنگ آتا، جیب میں ٹین کے ایک چپٹے اور گول ڈبے میں بورک پاؤڈر اور ہاتھی دانت کا اسٹرائکر ہوتا۔ ان دنوں یونیورسٹی میں کیرم کے بہترین کھلاڑی تین تھے۔ عارف نقوی، رئیس اور میں۔ لیکن عارف نقوی کی پہلی محبت شطرنج تھی اور رئیس مجھ سے مشکل ہی سے جیت پاتا۔

میرے پاس کیرم بورڈ نہ تھا، جی للچاتا لیکن خرید نہ پاتا۔ یہ دن سخت گردش ایام کے تھے... پھر بھی ''مرد باید کہ ہراساں نہ شود'' سے امید کی ڈور باندھے باندھے ایک دن یہی کیرم یونین بلڈنگ میں چائے پانی اور سگریٹ کا وسیلہ بن گیا۔ اگرچہ اس کے لیے ایک منصوبہ بھی بنانا پڑا۔ سورج، جمال پاشا اور حلیم خاں نئے رنگروٹوں سے جو تھوڑا بہت کیرم کھیلنا جانتے، میری طرف اشارہ کر کے کہتے کہ اسے کھیلنا کھالنا تو آتا نہیں، بیکار کی ڈینگیں مارتا ہے۔ میں ظاہر یہ کرتا جیسے مجھے ان لوگوں کی باتوں کی کوئی خبر نہ ہو اور اپنے کھیل کے بارے میں بڑھ چڑھ کے باتیں کرتا رہتا۔ یونین کے آفس سکریٹری قدرت میاں (متوفی ۲۰۰۸ء) جو سال سوا سال سے یہ کھیل دیکھ رہے تھے، چپکے چپکے مسکراتے۔ اتنے میں کوئی رنگروٹ مقابلے کے لیے تیار ہو جاتا لیکن اس شرط پر کہ پہلے دو ایک بورڈ کھیل کے دیکھ لے۔ میں کھیل بظاہر بہت سنجیدگی سے کھیلتا، لیکن اس طرح کہ گوٹ پاکٹ کے آس پاس ہی رہ جاتی اور نتیجتاً ہار جاتا۔ پھر اسے الگ لے جا کر سمجھایا جاتا کہ شرط بدلو، ایک ایک پیالی چائے اور سموسے کی۔ اس شرط سے مستفیض ہونے والے وہ بھی ہوتے جو یہ سوانگ رچتے اور پھر وہی ہوتا جو ہونا ہوتا۔ کھیل یک طرفہ ہوتا اور مقابل کو اندازہ ہو جاتا کہ اسے پھانسا گیا ہے۔ پھر چائے پی جاتی، سموسہ کھایا جاتا اور یہ بھی ہوتا کہ اس دن کا شکار بعد میں خود شکاری بن جاتا اور کسی نئے رنگروٹ کو پھانستا۔

اب یونیورسٹی جانے کے معنی ہو گئے تھے یونین میں سارا سارا دن گذار دینا۔ پندرہ پندرہ بیس بیس دن گذر جاتے اور کلاس کی صورت دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔

پھر اس پروگرام میں ایک شق کا اضافہ ہو گیا۔ عارف نقوی نے کہا یونیورسٹی جاتے ہوئے مجھے بھی لے لیا کرو۔ حلیم خاں مقدمے میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ کچہری ہوتے ہوئے یونیورسٹی جاتے یا وہیں سے گھر لوٹ جاتے، جمال کو دوستوں کی بھلائی تھی جو وہ خود کو کسی ایک سے باندھ دیتا اور حسن عابد اور آغا سہیل حسین آباد سے آتے تھے۔ عارف نقوی کا مکان میرے

راستے میں تھا۔ بورڈ آف ریونیو کے آگے کے چوراہے کا آخری مکان۔ ایک لالچ بھی تھی۔ وہاں چائے بسکٹ سے ضیافت ہوتی۔ یہ ضیافت شطرنج کی بساط پر ان چار پانچ بازیوں سے حاصل ہونے والی اتنی ہی ماتوں کا اجر ہوتی جو عارف یا اس کے گھر والے ادا کرتے۔

شطرنج مجھے آتی نہ تھی۔ بس اتنا معلوم تھا کہ پیادہ ایک گھر چلتا ہے، گھوڑا ڈھائی گھر، اونٹ ترچھی مار کرتا ہے اور ہاتھی آگے، پیچھے، دائیں بائیں روندڈالتا ہے۔ میں بھولا بھالا نہیں تھا لیکن دور تک نہیں دیکھ پاتا۔ برخلاف اس کے عارف نقوی شطرنج کی بساط کیا زندگی میں بھی دور تک دیکھ لیتے، لیکن ایک دن انہونی ہوگئی۔ جانے کیسے میں نے پانچویں یا چھٹی چال میں شہ دی اور عارف کے بادشاہ کی فوج کو نہ جوابی حملے کا یارا تھا نہ راہِ فرار... عارف ویسے ہی گورا چٹا تھا، غصے سے چہرہ سرخ ہوگیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنے اور میرے سارے مہرے بکھیر دیے، پھر ایک ایک مہرا جتن کے سجایا اور مجھے کئی ماتیں دیں۔

یونین بلڈنگ میں نئے رنگروٹ پھانس کر ان سے چائے سموسے کھانے کا کھیل کچھ دنوں تو چلا لیکن پھر سینہ کائنات کا یہ راز فاش ہوگیا اور چائے سموسے کے بھی لالے پڑ گئے جو دن کے کھانے کے نعم البدل بن گئے تھے۔ ان دنوں ٹیوشن کنگھی والی گلی میں غلام محمد آزاد صاحب کے یہاں کا تھا اور قیام بھی وہیں، باہر کے کمرے میں۔ صرف ایک ٹیوشن تھا، بیس روپوں کا۔ کوئی لاکھ جی مارے پھر بھی روپوں کی تو ضرورت ہوتی ہی ہے۔ دونوں وقت کے کھانے کے لیے، چاہے وہ بھینسے کا گوشت اور تندوری روٹی ہی کیوں نہ ہو، آٹھ دس آنے تو چاہیے ہی ہوتے اور آٹھ دس آنے، بہر حال آٹھ دس آنے ہوتے تھے۔ کچھ شوق بھی تھے، مثلاً قومی آواز ہمیشہ منگایا، صاف ستھرے کپڑے ہمیشہ پہنے۔ لیکن بندۂ مزدور پر یہ ایام بہت سخت تھے۔ ایک شوق اور بھی تھا اور وہ کڑے کوسوں میں بیس پچیس روپوں کا وسیلہ بن گیا۔

گرما گرم کلیجی

نخاس میں سندیلہ ہاؤس کے سامنے اور پرکاش سینما کے پاس سڑک کے کنارے ایک شخص بھنی ہوئی گرما گرم کلیجی بیچتا تھا، چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سیخ پر لگا کے۔ اس کے ذائقے سے مجھے عارف بھائی نے متعارف کرایا تھا، نمش (مکھن ملائی) کی طرح۔ ایک سیخ دو پیسے کی ملتی۔ جیب جب بھی اجازت دیتی دو سیخیں ضرور خرید لیتا۔ ایک دن میں نے فرمائش کی تو ایک شخص نے

جس نے دونا بھر کلیجی خریدی تھی، کہا، ''دو سیخوں سے کیا ہوگا؟'' میں نے کوئی جواب نہ دیا تو بولا، ''ایک میری طرف سے۔'' لیکن میں اس کے تیار نہ ہوا۔ پھر اس سے دھیرے دھیرے جان پہچان ہوگئی۔ کئی لوگوں کو اسے ''استاد'' کہتے ہوئے سنا۔ اسی جگہ سے ایک گلی اندر جاتی جو ایک کھلے میدان میں نکلتی۔ برسوں سے قاضی باغ میں رہنے کے باوجود سوچا بھی نہ تھا کہ یہ پتلی سی گلی اتنے بڑے میدان میں نکلے گی۔ پتہ اس دن چلا جب وہ ضد کر کے مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں بہت سے رکشے اور چار پانچ اکّے تانگے کھڑے تھے۔ معلوم نہیں کیوں وہ مجھ پر اس قدر مہربان ہوگیا تھا۔ ایک دن بضد تھا کہ میں اس سے پانچ روپے لے لوں لیکن میں نے اس کی بات نہ مانی۔ کئی دن بعد میں نے اس سے کہا رات میں رکشہ چلانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا، ''سنبھال لوگے؟'' میں نے کہا، ''ہاں،'' اس کی بات سمجھے بغیر۔ لیکن دو دن بعد جب رکشہ لے کر نکلا تو پہلے ہی دن سنبھالنے کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ معمولی رفتار سے چلتا ہوا رکشہ بھی موڑو تو اس کے پچھلے حصّے کا سارا وزن جانے کیسے ہینڈل پر آ جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے سر پر آ رہے گا۔

مجھے ایسا لگتا جیسے نِدان محل روڈ کے اس حصّے میں ہر شخص مجھے جانتا ہے اور سب سے بڑی پریشانی تو پبلک لانڈری سے تھی۔ اس لانڈری کے سامنے سے، جو دیر تک کھلی رہتی، گذرتا تو کسی نہ کسی کی نظر ضرور پڑ جاتی، اس لیے میں پارک کے پاس سے اندر اندر رکشہ لیے وہاں نکلا جہاں نہرو کراسنگ ہے لیکن، پہلی سواری امین آباد میں ملی، لال باغ کے لیے، ڈیڑھ روپے میں۔ واپسی میں اتنے ہی روپے کی سواری امین آباد کے لیے ملی اور پھر وہاں سے نخاس کے لیے۔ آخر میں سوا چار روپے جیب میں تھے۔ پیروں کا سارا درد جاتا رہا۔

رکشہ چلانے کا کام باقاعدہ نہیں کیا۔ مشکل سے پانچ چھے بار چلایا ہوگا۔ لیکن اس دوران دو قابلِ ذکر واقعات ہوئے۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ حضرت گنج نہ جاؤں گا۔ وہاں دیر رات گئے بھی کسی جان پہچان والے سے ملاقات ہو جانے کا ڈر تھا لیکن ایک دن قیصر باغ میں سواری اتاری ہی تھی کہ ایک صاحب رکشہ پر بیٹھ گئے۔ انھیں الٰہ آباد بینک کے چوراہے تک جانا تھا، چرچ ہی کے سامنے، جہاں سڑک کافی ہاؤس کی طرف مڑتی ہے۔ وہ پیسے دے ہی رہے تھے کہ جانے کہاں سے رضیہ سجاد ظہیر آ گئیں۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ انھوں نے وزیر حسن روڈ چلنے کے لیے کہا لیکن میں نے جواب نہ دیا کہ وہ آواز ضرور پہچان لیں گی۔ انھیں پہنچا کر میں نے سر جھکائے جھکائے

پیسے لیے۔ میرا خیال تھا کہ انھوں نے مجھے پہچانا نہیں کیوں کہ دونوں کی آنکھیں ایک بار بھی ملنے نہ پائی تھیں۔ اس کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جس سے ذرا بھی خیال ہو کہ انھوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ پھر کئی مہینے بعد انھوں نے انجمن کے جلسے میں افسانہ سنایا۔ یہ جلسہ احتشام صاحب کے یہاں ہوا تھا۔ افسانہ سناتے ہوئے وہ اپنے مخصوص انداز میں کنکھیوں سے مجھے دیکھتیں اور کبھی کبھی مسکرا دیتیں۔ ان کی مسکراہٹ میں شرارت اور محبت کی بڑی دلکش آمیزش تھی۔ یہ کہانی اسی واقعے سے متعلق تھی اگرچہ انھوں نے بہت کچھ تبدیل کر دیا تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے کہانی کا نام ''ہاتھ'' تھا۔

دوسرا تجربہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھا۔

سفید بارہ دری سے ذرا آگے بلکہ میوزک کالج کے سامنے ایک لڑکے اور ایک عورت نے سٹی اسٹیشن کے پاس جانے کے لیے رکشہ کیا۔ ابھی جاڑے نہیں شروع ہوئے تھے اگرچہ ان کی آمد آمد ضرور تھی پھر بھی لڑکے نے ہڈ چڑھانے کے لیے کہا۔ مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی لیکن پھر سمجھ گیا۔ میری بھی تو وہی عمر رہی ہوگی۔

سواریوں کی ہدایت کے مطابق رکشہ نواب سعادت علی خاں کے مقبرے سے مڑ کر اس سڑک سے ہوتا ہوا جس پر اب ٹیلی فون کے بل جمع کرنے کا دفتر ہے گذر رہا تھا کہ مجھے کچھ گڑبڑ کا شبہ ہوا۔ وہ جو کہتے ہیں ڈرائیوروں کی دو آنکھیں سر کے پیچھے ہوتی ہیں، وہ دو چار دن ہی رکشہ چلا کر میرے سر پر اُگ آئی تھیں لیکن اسی وقت یہ بھی اندازہ ہوا کہ ڈرائیوروں کے کان بھی آنکھیں بن جاتے ہیں اور تجربہ انھیں کانوں میں پڑنے والی آواز کو نظر آنے والے خاکوں میں تبدیل کر دینے کی صلاحیت بخش دیتا ہے۔ سڑک سنسان تھی، شام کے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت رہا ہوگا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی پیچھا کر رہا ہو۔ میں نے ذرا سا سر موڑ کے کنکھیوں سے دیکھا تو سائکل پر سپاہی تھا، جو دوسری طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ دو ہیں۔ میں سواریوں کو آگاہ کرنا چاہتا تھا کہ سپاہی پیچھا کر رہے ہیں لیکن وہ رکشے سے بس ذرا سا پیچھے تھے، میری بات سن ضرور لیتے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ دونوں پر مصیبت آنے والی ہے لیکن کیا کرتا۔ آخر ناری شکشا نکیتن کے سامنے دونوں سپاہیوں نے سائکلیں بڑھا کر رکشہ روک لیا اور سواریوں کی ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ لڑکے نے ایک پولیس افسر کا نام لیا اور کہا میں ان کا رشتہ دار ہوں تو ایک سپاہی نے پوچھا، ''ان کی پوسٹنگ کہاں ہے؟'' لڑکا جواب نہ دے سکا تو دوسرے نے کہا،

”قیصر باغ تھانے چلو۔“ عورت کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ لڑکے نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن یا تو وہاں کچھ تھا نہیں یا وہ روپے جیب سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ عورت نے فوراً پرس کھولا اور پانچ روپے کا نوٹ سپاہی کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے نوٹ لیتے ہوئے دوسرے سپاہی کی طرف اشارہ کیا اور کہا، ”اور انھیں“ تو عورت نے جھنجھلاتے ہوئے دوبارہ پرس میں ہاتھ ڈالا اور سپاہی سے پانچ روپے کا نوٹ واپس لے کر دس کا نوٹ اس کے حوالے کر دیا۔ دونوں سپاہی ہنستے ہوئے چلے گئے۔

تقریباً اسی وقت بجلی کے کھمبے کے بلب کی روشنی عورت کے چہرے پر پڑی تو مجھے یکا یک احساس ہوا کہ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا اور وہ مجھے بھی۔ اس دن کے بعد سے اب تک اس کو درجنوں بار تو دیکھا ہوگا، ملاقات کی بھی نوبت آئی لیکن نہ اس نے مجھے کبھی بطور رکشہ ڈرائیور پہچانا نہ میں نے کبھی اسے اس شام کی سواری کے طور پر۔

کبھی کبھی جانی پہچانی صورتیں کیسی انجانی بن جاتی ہیں... یا حالات انھیں ایسی بنا دیتے ہیں۔

دو تین سال قبل، رئیس انصاری کے دو بیٹوں کی شادی میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے بھنی ہوئی کلیجی کے اس خوانچے یا ”دوکان“ کا خیال آیا تو فوراً گردن موڑ کے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس جگہ سے آگے نکل چکا تھا۔ ویسے اب دو چار روپوں کے لیے کون سڑک کے کنارے یہ کاروبار کرتا ہوگا۔ وہ دن لد گئے جب لوگ محنت سے کمائی سوکھی روٹی کو خوان یغما پر ترجیح دیتے تھے۔

ایک دن مشہور مصوّر مصلح احمد سے خودنوشت کا ذکر نکلا تو انھوں نے رکشہ چلانے کے مختصر سے تجربے کا ذکر نہ کرنے کا مشورہ دیا اور میں نے نیم رضا مندی بھی ظاہر کر دی۔ لیکن پھر سوچا تو احساس ہوا کہ ان پانچ چھے دنوں کو درگذر کر دیا تو وہ دو چار لوگ جنھیں یہ بات معلوم ہوگی یا جنھوں نے اس بارے میں سنا ہوگا، سوچیں گے کہ میں ہتک کے خیال سے ان دنوں کو جان بوجھ کر بھول گیا اور واقعات کی اعتباریت مشکوک ہو جائے گی۔ قطع نظر اس کے، ضمیر نے بھی اس کی اجازت نہ دی۔ سب سے بڑی بات یہی تھی۔

سینما گھر اور سڑک کے کنارے کی کلیجی کی دوکان کے پاس 'استاذ' سے ملاقات کئی بار ہوئی۔ ایک بار اس نے کلیجی اور چائے کی دعوت بھی کی۔ وہ بانک اور بنوٹ سے بھی واقف تھا اور

شاید اسی لیے لوگ اسے استاد کہتے۔ ایک دن اپنے دوست وسیم (آج کل کے مشہور وکیل) کے یہاں جاتے ہوئے اس گلی سے ہو کر نکل گیا تو دو تین سیدھی لائنوں میں جھگیوں سے ذرا بہتر مکانوں پر نظر پڑی۔ وہاں کی دنیا ہی عجیب تھی۔ اُس عمر میں وہاں ''جا ایں جاست'' کی بہت سی ترغیبیں تھیں لیکن نہ اس وقت رکنے کی ہمت ہوئی نہ دوبارہ کبھی جانے کی۔ میں بزدل اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہوں ورنہ دنیا شاید بہتر سلوک کرتی۔

ایک بات بتانا بھول گیا۔ استاد نے رکشے کا کرایا ایک بار بھی قبول نہ کیا، میرے اصرار کے باوجود۔

ان دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں جب یونین بلڈنگ ہی میں سارا دن گذار کر لوٹ آتا تو سمجھ میں نہ آتا کہ میں اپنی زندگی تباہ کر کے کس سے انتقام لے رہا تھا، کیوں خود کو تباہ کر رہا تھا۔ کبھی قسمت کو کوستا اور نظیر آباد میں ڈی ویلڈن اور کتابی دنیا کے بیچ کی ایک دوکان سے بھینسے کے گوشت اور ایک تندوری روٹی سے پیٹ بھر لیتا (بہت دنوں بعد مجیب سہالوی نے غصّے میں کہا تھا: کھائیں گے بھینسے کا گوشت اور پئیں گے اتنا بڑا سگار) اور یہ بھی نہ ہوتا تو کتابی دنیا کے سامنے کی بھڑ بھوجن کے یہاں سے ایک آنے کے چنے سے کام چلا لیتا۔ ایک بات یاد آ گئی۔ اس میں ذرا سی خود ستائی کا پہلو ہے۔ کتابی دنیا کے اظہر صاحب نے دو روپے دیے۔ وہاں کاموں کا معاوضہ اسی طرح ملتا، ان کی بھی مجبوری تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے مفت کے روپے مل گئے ہوں۔ گورکی کی کتاب Articles and Pamphlets پر کئی دن سے رال ٹپک رہی تھی۔ سیدھے پی پلس بک ہاؤس جا کر ایک روپے چودہ آنے میں خریدی۔ کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد خیال آیا کہ صبح سے کھیل منہ میں نہیں پڑی ہے، سو دو آنے کے چنے خریدے، جنھوں نے رات میں بھی ساتھ دیا۔

کتاب اب بھی میرے پاس موجود ہے لیکن افسوس اس پر نہ نام لکھا ہے نہ خریداری کی تاریخ ہے۔ محسوس ہوا جیسے نام اور تاریخ سے محرومی نے ایک تاریخ ساز دن سے محروم کر دیا ہو۔ ان دنوں کی کوئی تاریخ گرفت میں آ جاتی تو جیسے زندگی کا ایک بیش قیمت دن زندہ ہو جاتا۔

کبھی کبھی خیال ہوتا کہ اماں نے مکانوں کی فروخت سے حاصل ہونے والے روپے اپنے بھائی کو نہ دے دیے ہوتے تو یہ حال نہ ہوتا۔ ان دنوں محی الدین پور کی زمینداری کا بھی چل چلاؤ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ دادے ابا نے باقی ساری زمینداری میرے ہی نام کر دی تھی، میرے نام نہیں بلکہ اپنے بڑے بیٹے کے بڑے بیٹے کے نام، جو صحیح الدماغ ہو۔ لیکن دادے ابا کی وصیت

سے قطع نظر نواب چچا کو آدھا حصہ دینے کے باوجود اتنا تھا کہ کھائے نہ چکتا، مگر مجھے زمینداری سے نفرت ہو چکی تھی پھر بھی کبھی کبھی امیر رضا صاحب کی بات یاد آتی، وہ کہتے کہ تم اپنا حق نہ لو گے تو کسانوں کو زمین مفت تھوڑی مل جائے گی۔ امیر رضا ڈپٹی لینڈ رِفارم کمشنر تھے۔

آل انڈیا ریڈیو، نیا دور

پھر ایک دروازہ کھلا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے (شاید پہلے کی کیونکہ گل محمد شاہ میرے سامنے حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے واپس آئے تھے) جب ریڈیو کے ڈراموں اور فیچروں میں حصہ لینے کے لیے میری آواز منظور ہوئی۔ جی۔ ایم۔ شاہ صاحب پروڈیوسر تھے۔ وہ ایک بار ڈرامے کی خواندگی اور تین بار ریہرسل کراتے۔ پھر ایک دن ڈرامہ نشر ہوتا، عام طور سے ساڑھے آٹھ بجے رات کے بعد۔ اس وقت تک پروگراموں کی رکارڈنگ کی سہولت نہ تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں تھا کیوں کہ گراموفون تو بہت پہلے سے موجود تھے۔ ان دنوں ریڈیو آرٹسٹ بھی بہت زیادہ نہ تھے۔ اس لیے مہینے میں ایک پروگرام تو مل ہی جاتا۔ معاوضہ دس یا پندرہ روپے ملتا، بیئرر چیک کے ذریعے جو حسین گنج کے پاس قندھاری بازار جانے والی سڑک کے نکڑ کی ایک دوکان سے ایک آنہ فی روپیہ (ایک آنہ برابر چھے سوا چھے پیسے) کمیشن پر اسی وقت کیش ہو جاتے۔ ریڈیو اسٹیشن کے سامنے سڑک کی دوسری جانب غالباً اس جگہ جہاں اب پنڈی ٹائر ہاؤس ہے مولانا کا ہوٹل تھا جس کے کباب بہت مشہور تھے۔ میں نے مجازؔ اور جلال لکھنوی کو کئی بار وہاں سے نکلتے دیکھا تھا لیکن مجازؔ سے میری دوستی تو دور کی بات قربت بھی نہ تھی۔ بس وہ مجھے پہچانتے تھے اور وہ بھی ڈاکٹر محمد حسن کے طفیل جنھوں نے ایک بار مجھے ان سے متعارف کرایا تھا۔ میں نے بھی ایک دو بار مولانا کے ہوٹل کے کباب کھانے کی عیاشی کی تھی۔

ہر مہینے چودہ پندرہ روپوں کی آمدنی کے علاوہ یونین بلڈنگ میں دن دن بھر گزارنے کے مشغلے میں ریڈیو کے پروگراموں نے پہلی سیندھ لگائی... ریڈیو کے پروگراموں نے اپنی اہمیت کا احساس بھی دلایا۔ ایسا لگتا کہ وہ ہزاروں لاکھوں لوگ جو یہ پروگرام سن رہے ہوں گے اس میں حصہ لینے والوں کے ناموں کے اعلان سے مجھے پہچان بھی لیں گے۔... اس احساس نے کیرم کے کھیل میں لڑکوں کو پھانس کر ان کے پیسوں کی چائے سموسوں کو بے ذائقہ نہیں تو کم ذائقہ ضرور کر دیا۔ بعد میں ایک سرخاب کے پر کا اضافہ ہو گیا۔ کم سے کم میں یہی سمجھتا تھا۔ ریڈیو

اسٹیشن کے پاس ہی چوراہے پر ایک بڑی سی عمارت ''رائل ہوٹل'' کہلاتی۔ اب وہاں ''باپو بھون'' ہے۔ اس عمارت سے ماہنامہ ''نیا دور'' شائع ہوتا۔ یہ دراصل محکمۂ اطلاعات کا دفتر تھا۔ ان دنوں ''نیا دور'' میں بچوں کا ایک گوشہ ہوتا تھا۔ اب یہ تو نہیں یاد کہ اس گوشے میں میری چیزیں کب سے چھپنا شروع ہوئیں لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے ۱۹۵۵ء میں ''ہیئت کی اہمیت'' کے نام سے ایک مضمون کے ذریعے ''نیا دور'' سے اس تعلقِ خاطر کی ابتدا ہوئی جس کا سلسلہ جاری ہے۔ اس مضمون کا معاوضہ غالباً دس روپے ملا تھا۔ لیکن ''بچوں کا گوشہ'' میں بھی شاید میری دو ایک چیزیں شائع ہوئیں، کچھ دوسروں کے ناموں سے بھی۔ ''آجکل'' کے بچوں کے گوشے میں بھی میری کئی چیزیں اس سے پہلے شائع ہو چکی تھیں۔ ان دونوں رسالوں کے بچوں کے حصوں میں نصر اللہ خاں، اختر جمال، عبدالحلیم اور دو ایک دوسرے ناموں سے جو اَب بھول گیا جو کچھ شائع ہوا وہ میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ لیکن مجھے نہیں یاد کہ نیا دور میں ان فرضی ناموں سے میری کوئی چیز دوسری بار شائع ہوئی ہو۔ بچوں کے مضامین یا کہانیوں کے لیے ''نیا دور'' سے دس روپے اور ''آجکل'' سے پندرہ روپے ملتے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اختر جمال کے نام سے ''آجکل'' میں میرا پہلا مضمون ''ایورسٹ کی فتح'' ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا، ''نیا دور'' میں میرے مضامین کی اشاعت کے آغاز سے پہلے۔ اس مضمون کے سلسلے میں عرش ملسیانی صاحب کا خط[1] میرے پاس محفوظ ہے۔ اسی زمانے میں ''آجکل'' میں میرے مضامین کی اشاعت شروع ہوئی، ''نیا دور'' سے پہلے۔

اسی دوران ایک دن شری چند سے ملاقات ہوگئی جسے میں بھول سا گیا تھا۔ اب وہ اچاریہ نریندر دیو ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۱۲ میں رہتا تھا اور ایم۔ اے کے پہلے سال میں تھا۔ میں نے پوچھا تو پتہ لگا کہ بی۔ اے۔ کے دوسرے سال اکنامکس کے پرچے میں ہندی نے ساتھ نہیں دیا۔ اس طرح میں بی۔ اے کے پہلے سال میں تین سال گزار چکا تھا۔ ریڈیو کے پروگراموں اور ''آج کل'' اور ''نیا دور'' میں مضامین کی اشاعت نے بے غیرتی کی اس چادر میں چھید کرنے شروع کیے جو میں نے گویا فخر سے اوڑھ رکھی تھی اور شری چند اور بشیر وارثی نے تو یہ چادر جیسے نوچ کے پھینک دی۔ اس کارِ نیک میں اشفاق اور کبیر شاہ نے بھی کچھ نہ کچھ کردار ادا کیا۔ کبیر شاہ سے میری پہلی ملاقات ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر ریڈیو کے لیے کئی فیچر تیار کیے

۱۔ خط کے لیے دیکھیے آخر کے صفحات

تھے۔ ان میں سے ایک بیربل ساہنی انسٹی ٹیوٹ آف پولیوباٹنی پر بھی تھا۔ جہاں تک یاد ہے کبیر شاہ ہی نے مجھے افضال سے، جو بعد میں افضال احمد ایڈوکیٹ کے نام سے جانے گئے اور کئی کتابوں کے مرتب اور مصنف ہوئے، متعارف کرایا تھا۔

بھدوہی کے ایک بڑے تاجر کے بیٹے کا نام اشفاق تھا۔ اس سے جانے کیسے دوستی ہوگئی۔ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ اس کے مضامین کیا ہیں۔ میں بی۔ اے۔ میں اتنے دنوں رہا کہ آدھے نہیں تو ان دنوں کے ایک چوتھائی طلبہ تو میرے کلاس فیلو ضرور رہے ہوں گے۔ اشفاق انھی میں سے ایک تھا۔

جاڑوں کے دن تھے۔ میں سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کئی سال پرانا کوٹ پہنے یونین بلڈنگ کی طرف جارہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو اشفاق تھا، حسب دستور ٹائی کے بغیر سوٹ پہنے ہوئے۔ اس کے کندھے پر ایک گرم کوٹ لٹک رہا تھا۔ اس نے کندھا اچکا کے نیا کوٹ ہاتھ میں لیا اور قبل اس کے کہ میں کچھ سمجھ سکوں میرا کوٹ بدن سے تقریباً کھینچ کر اس نے نیا کوٹ مجھے پہنا دیا اور ایسا منہ بنایا کہ میں ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ میری زبان جیسے گنگ ہوگئی، احتجاج تک نہ کرسکا، ایک لفظ مُنہ سے نہ نکلا۔ یہ بات ۱۹۵۵ء کی رہی ہوگی۔

بعد میں چند ملاقاتیں ہوئیں اور پھر آخری ملاقات غالباً ۱۹۹۵ء میں ہوئی۔ وہ بینک آف بڑودہ کے ڈائرکٹروں میں تھا۔ بینک کے ایک افسر سے بات چیت کے دوران جانے کیسے میرا نام آ گیا۔ اسی وقت انھیں ساتھ لے کر میرے یہاں آیا۔ ذرا سا گوشت چڑھ گیا تھا اور بس۔ بالکل وہی تھا۔ بینک آف بڑودہ کے جو صاحب اسے لے کر میرے پاس آئے تھے انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد خود اپنا بینک کھول لیا تھا۔ چار پانچ سو روپوں کے شیئر میں نے بھی لیے تھے۔ افسوس دو سال قبل ان کا انتقال ہوگیا۔ اب اسے اتفاق ہی کہیے، ان کا نام بھی اشفاق تھا۔

اب یونیورسٹی میرے لیے ایک نئی دنیا تھی۔ اساتذہ کو دیکھا تو پہلے بھی تھا، کلاس میں بھی، لیکن انھیں سمجھا اب اور ان کی خوبیوں کو پہچانا بھی۔ خوش قسمتی سے مجھے اساتذہ بہت اچھے ملے، ایک آدھ کے علاوہ، لیکن دو سال یونین بلڈنگ کے ''بن باس'' میں ضائع کرنے کے بعد،

اگرچہ اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔

سچ پوچھیے تو بی۔اے۔ اب شروع ہوا تھا اور میرے پسندیدہ اساتذہ تھے فلسفہ کے ڈاکٹر این۔ کے دیوراج۔، سوشیالوجی کے ڈاکٹر سیوارام اور ڈاکٹر سرن، انگریزی کے ڈاکٹر مترا، ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر خواجہ جمیل۔ کپلنگ پر ان کی ڈاکٹریٹ کی تھیسس کی بڑی شہرت تھی۔ مسٹر لمبا اخلاقیات (Ethics) پڑھاتے تھے وہ بھی پسند تھے لیکن اس کا سبب کچھ اور تھا۔

بی۔اے۔ فائنل

امتحان چڑھے آ رہے تھے، بلکہ آ ہی گئے تھے۔ میں تیار تھا لیکن بس ایک الجھن تھی... انگریزی، معاشیات اور فلسفہ ایک مشکل یک جائی تھی۔ ممکن ہے دو چار دوسرے طلبہ نے بھی یہی مضامین لیے ہوں لیکن میں ان سے واقف نہ تھا۔ امتحان کی اسکیم بناتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ مختلف مضامین کے پرچوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ وقفہ ملے۔ چنانچہ انگریزی، فلسفہ اور معاشیات کے امتحانات مسلسل تھے، اتوار کے وقفے کے علاوہ۔ مابعد الطبیعات کے پرچے بالکل آخر میں تھے۔

یہ بتانا بھول گیا کہ دو تین سال کے "بن باس" کے بعد میں نے بی۔اے کے پہلے سال کا امتحان پہلی ہی کوشش میں پاس کر لیا تھا اور اب دوسرے سال کا امتحان دینا تھا۔

فلسفہ اور انگریزی کے سلسلے میں کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی لیکن معاشیات کا بھوت خواب میں بھی ڈراتا رہتا اور میرے اور ایم۔اے۔ میں داخلے کے درمیان اس بھوت کے علاوہ کوئی رکاوٹ نہ تھی کیوں کہ جنرل انگلش کا امتحان میں نے اسی وقت پاس کر لیا تھا جب میں بی۔اے۔ کے پہلے سال میں فیل ہوا تھا، بی۔اے۔ میں نہیں صرف معاشیات میں۔

خیر امتحان دے دیا۔ سارے ہی پرچے اچھے ہوئے، حد یہ ہے کہ اکنامکس کے پرچے بھی لیکن ایک پرچے کے بارے میں شبہ تھا اور میں سوچتا تھا کہ کہیں سارے کیے دھرے پر پانی نہ پھر جائے۔

معاشیات کا ایک پرچہ ڈاکٹر سیٹھ پڑھاتے تھے۔ وہ نہایت خاموش مزاج اور شریف انسان تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اپنا مسئلہ ڈاکٹر ویر بہادر سنگھ کے سامنے رکھوں جن سے انجمن اور کمیونسٹ پارٹی کے ذریعے یاد اللہ تھی۔ ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ معلوم نہیں کیسے

پتہ چل گیا کہ میری کاپیاں سیٹھ صاحب کے پاس ہیں اور میں نے اپنی بپتا براہ راست انھی کو سنانے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن ہمت نہ پڑتی۔

فیض آباد روڈ پر اس جگہ جہاں اب یونیورسٹی کے اساتذہ کے فلیٹس ہیں، چھوٹے چھوٹے بنگلے تھے اور انھی میں سے ایک میں سیٹھ صاحب رہتے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سیٹھ صاحب ہی باہر آئے۔ میں نے سلام کیا، انھوں نے جواب دیا۔ ان کے چہرے پر ذرا بھی حیرت نہ تھی، سمجھ گئے ہوں گے۔ میں نے اپنی پریشانی بتائی اور یہ تک کہہ دیا کہ اکنامکس کا امتحان کبھی نہ پاس کرسکوں گا۔ وہ مسکرائے اور بولے۔

"پہلے سال کا امتحان بھی ایسے ہی پاس کیا تھا؟"

"معلوم نہیں کیسے، لیکن ایسے نہیں۔"

"پاس ہوگئے تو یہ کہنے تو نہ آؤ گے کہ ایم۔ اے میں داخلہ دے دیجیے"۔

میری کچھ ہمت بڑھی اور امید بھی۔

"ڈپارٹمنٹ کے سامنے سے نہ گذروں گا،" میں نے کہا۔

وہ مسکرائے اور دروازے کے پاس کی چھوٹی سی کھونٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا، "اس کے نیچے اپنا رول نمبر لکھ دو۔"

میں اس طرف بڑھا تو انھوں نے روک دیا اور کہا، "میں پینسل لاتا ہوں۔"

مشکل سے دو منٹ بعد پینسل دینے کے بجائے انھوں نے دروازہ کھول دیا اور کہا، "اندر آجائیے۔"

ان کے ہاتھ میں پینسل بھی نہیں تھی۔

انھوں نے دوسرے پرچوں کے بارے میں پوچھا۔ ذرا دیر میں چائے آگئی۔ دو چار بسکٹ بھی تھے۔ چائے پیتے پیتے انھیں معلوم نہیں کیا سوجھی کہ رول نمبر پوچھا اور کچھ کہے بغیر اندر چلے گئے۔ تین چار منٹ کے بعد واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں امتحان کی کاپی تھی۔ یہ میری ہی تھی۔ انھوں نے اوراق پلٹے تو میں نے دیکھا وہ نمبر دے چکے تھے۔ پھر انھوں نے سوالوں کے نمبر جوڑے اور کہا ٹھیک تو ہیں۔" لیکن نمبر نہیں بتائے۔

"سر وہ دوسرا پیپر!"

وہ پھر مسکرائے۔

اس کے بعد میں وہاں سے چلا آیا بعد میں مارکس شیٹ ملی تو میں اکنامکس کے سارے پیپرس میں پاس تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے ''ٹھیک تو ہیں'' کے بعد کتنے نمبروں کا اضافہ کیا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس سال بی۔اے نہ کیا ہوتا تو اکنامکس کے طفیل بی۔اے۔کا امتحان اب تک دے رہا ہوتا۔

بہر حال اب یہ طے ہو گیا کہ میں نے بی۔اے۔پانچ سال میں کیا تھا۔

◆◆◆

بدھم، شرنم، گچھامی

۱۹۵۶ء میں گوتم بدھ کا ۲۵۰۰واں سال پیدائش ہندوستان اور دنیا کے ایک بڑے حصے میں تزک و احتشام سے منایا گیا۔ اس کارِ نیک میں فطری طور سے ہندوستان پیش پیش تھا کیونکہ یہیں انھوں نے جنم لیا اور یہی سب سے پہلے ان کی فکر سے سیراب ہوا۔

خوش قسمتی سے ان دنوں ہندوستانی فلسفہ کے مشہور شارح ڈاکٹر رادھا کرشنن ملک کے نائب صدر جمہوریہ تھے اور عام خیال یہ تھا کہ اس منصوبے کے اصل محرک وہی ہیں۔ اس سلسلے کی ملک گیر تقریبات کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے ایک کل ہند کمیٹی تشکیل دی گئی اور ظاہر ہے کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن ہی اس کے صدر یا چیرمین منتخب ہوئے۔ اس کمیٹی نے پورے سال کی تقریبات کا جو منصوبہ تیار کیا اس کا زبردست خیر مقدم ہوا۔ عام خیال یہ تھا کہ ان تقریبات سے ہندوستان کو ان پڑوسی ممالک سے جن کی آبادی کے بڑے حصے پر گوتم بدھ کے افکار کی حکمرانی ہے، گہرے تعلقات قائم کرنے اور خود ہندوستان کو ذات پات کی ہزاروں سال پرانی لعنت سے نجات دلانے میں مدد ملے گی۔ لیکن ایک حلقہ ایسا بھی تھا جو گوتم بدھ اور اس کے فلسفے سے حکومت کی اس دلچسپی کے بارے میں یہ سمجھتا تھا کہ اس کی حیثیت ہندوستانی سماج کی ایک بڑی لعنت پر پردہ ڈالنے یا سماجی تضادات میں ایک طرح کی مصنوعی ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش سے زیادہ نہیں۔

اس سلسلے کی تقریبات سارے ملک میں دھوم دھام سے ہوئیں لیکن ان کے نتائج کچھ غیر متوقع قسم کے برآمد ہوئے۔ ہوا یہ کہ گوتم بدھ اور ان کے افکار کی تشہیر نے ان لاکھوں کروڑوں لوگوں میں جنھوں نے اپنے وجود اور اپنی زندگی کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا بیداری کی ایک لہر دوڑا دی اور ان کو اپنے مفادات کی نگہبانی کے لیے ایک بڑے نام اور بڑی فکر کی سرگرم حمایت

حاصل ہوگئی۔ چند ہی برس بعد امبید کر اور ان کے ہزاروں پیروؤں نے جگہ جگہ اجتماعی طور سے بدھ دھرم قبول کرنا شروع کر دیا اور پھر ہندوستان کی سیاست نے جو رخ اختیار کیا وہ ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی کا ایک الم ناک/تابناک باب بن گیا۔

سارے ملک کی طرح اتر پردیش میں بھی گوتم بدھ کے سلسلے کی تقریبات جوش و خروش سے منائی گئیں، سیمنار ہوئے، جلسے منعقد کیے گئے، اخباروں میں مضامین شائع ہوئے اور رسائل و جرائد نے گوتم بدھ کی فکر اور فلسفے پر خصوصی نمبر شائع کیے۔ ان دنوں ریاست کے محکمۂ اطلاعات سے ''اتر پردیش'' نام کا ایک انگریزی ماہنامہ بھی شائع ہوتا تھا اور محکمہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر صباح الدین عمر اس کے ایڈیٹر تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ''اتر پردیش'' کا گوتم بدھ نمبر شائع کیا جائے۔ ہندوستانی فلسفہ کے چند پہلوؤں پر میرے دو تین مضامین ''نیا دور'' میں شائع ہو چکے تھے، شاید اسی سبب اس خاص نمبر کے لیے مضمون لکھنے کی ''فرمائش'' مجھ سے بھی کی گئی۔

گوتم بدھ کے سلسلے کی تقریبات کے مجوزہ سیاسی اور سماجی مضمرات سے اپنی ناواقفیت اور اس سے زیادہ اپنی معذوریوں کے سبب میں نے اپنے مضمون کو گوتم بدھ کے فلسفیانہ افکار تک ہی محدود رکھا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ مابعد طبیعات کی دنیا کے خاصی حد تک سکڑ جانے کے باوجود اس کے سروکاروں میں اب بھی کائنات میں انسانی وجود اور اس کے مقام سے متعلق سارے امکانات اور سوالات شامل ہیں اور مذہب، سیاست، سماجی اکھاڑ پچھاڑ اور خدا اور انسان کے درمیان کے رشتے اور ان کی نوعیتیں بھی اس کے دائرۂ کار میں آ جاتی ہیں۔ جہاں تک یاد ہے میں نے اپنے مضمون میں خدا کے وجود کے بارے میں گوتم بدھ کے نقطۂ نظر، اس کے مضمرات اور اخلاقیات کے بارے میں اس کے تصورات سے بحث کی تھی۔ میں نے دوسری باتوں کے علاوہ لکھا تھا کہ گوتم بدھ خدا کے وجود کا قائل نہیں، اس لیے ملحد ہے۔ الحاد کا یہ تصور مغرب کی دین ہے جب کہ ہندوستانی فلسفہ میں ملحد (Atheist) وہ فکر قرار پاتی ہے جسے ویدوں کی سندی حیثیت (Authenticity) قبول نہ ہو۔ مضمون پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے یقین کے ساتھ تو کچھ کہنا مشکل ہے تاہم خیال ہے کہ میں نے خدا کے وجود کے بارے میں واضح طور سے عدم انکار کے باوجود اسے ملحدیوں بھی قرار دیا ہوگا کہ اس کے نظامِ کائنات میں خدا کی موجودگی اور مداخلت کو کوئی مقام نہیں دیا گیا ہے۔ میں نے بہ اصرار یہ لکھا تھا کہ وہ ناستک تھا کیوں کہ اس کو ویدوں کی سندی

حیثیت قبول نہ تھی۔

صباح الدین عمر نے مضمون پسند تو کیا لیکن وہ چاہتے تھے کہ میں انھیں قائل کر دوں کہ خدا کے وجود اور ویدوں کے بارے میں گوتم بدھ کے خیالات وہی تھے جو میں نے پیش کیے تھے۔ اس وقت میں بی۔ اے کا طالب علم ہونے کے باوجود ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر داس گپتا کی فلسفۂ ہند کی تاریخوں کے بیشتر حصّوں کے علاوہ دتّا اینڈ چٹرجی کی کتاب پڑھ چکا تھا۔ میں نے تینوں مصنّفوں کی کتابیں صباح الدین عمر کے سامنے پیش کر دیں لیکن وہ ان سے مطمئن ہونے کے لیے تیار نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ ان تینوں میں سے کوئی واضح الفاظ میں لکھ دے کہ میں نے خدا کے بارے میں گوتم بدھ کے جن خیالات کا ذکر کیا ہے وہ صحیح ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ ڈاکٹر داس گپتا کا انتقال ہو چکا ہے، شاید یہی صورت دتّا اور چٹرجی کی ہے اور ڈاکٹر رادھا کرشنن سے ان کی منصبی مصروفیات کے سبب شاید ہی تحریری سند حاصل کی جا سکے۔ لیکن وہ اپنے مطالبے پر مصر رہے۔ اب میرے لیے اس مضمون کی اشاعت یا عدم اشاعت سے زیادہ اصل مسئلہ یہ ہو گیا تھا کہ انھیں کسی نہ کسی طرح قائل کر دیا جائے کہ میں نے گوتم بدھ کا نقطۂ نظر ٹھیک پیش کیا ہے۔

میں نے ڈاکٹر رادھا کرشنن اور بعد میں مسز داس گپتا (ڈاکٹر داس گپتا کی اہلیہ جو لکھنؤ یونیورسٹی میں مجھے فلسفہ پڑھاتی تھیں) کو خطوط لکھے اور ان سے اپنے موقف کی سند چاہی۔

رادھا کرشنن کا خط

خوش قسمتی سے ان دنوں ہندوستان کا محکمۂ ڈاک و تار (اس وقت یہ دونوں محکمے ایک ہی تھے) کا نظام بہت اچھا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں خطوط نہ صرف اپنی منزلوں تک پہنچ گئے بلکہ ان کے جواب بھی مل گئے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کا جواب تو تیسرے دن میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے یہ خط ۴/اپریل ۱۹۵۶ء کو لکھا تھا اور ان کا جواب مجھے ۶/اپریل کو موصول ہو گیا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے خط کا متن اور لفافے پر ڈاک خانہ کی مہر میرے دعوے کی تصدیق لیے کافی ہیں۔ اپنے خط میں ڈاکٹر رادھا کرشنن سے میں نے گوتم بدھ کے ملحد یا ناستک ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی جواب کی درخواست کی تھی لیکن انھوں نے میرے دوسرے خط کے جواب میں بھی واضح طور سے کچھ کہنے سے احتراز کرتے ہوئے اپنا پہلے والا مشورہ دہرایا تھا۔ افسوس دوسرا خط محفوظ نہ رکھا

جا سکا۔ بہر حال پہلے خط کا عکس پیش ہے۔[1]

Monogram

VICE PRESIDET
INDIA
NEW DELHI
5 April, 1956

Dear Sir,
Thanks for your letter of the 4th April,
If you read my Gautama the Buddha, the introduction to DHAMPADDA you will be able to find answers to the Question you raise.

Your's sincerely
Sd.
(S. Radha Kirshnan)

Shri syed Abid Suhail
Kitabi Dunya
Nazirabad, Lucknow, U.P.

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنی کتاب میں اور دوسرے مقامات پر وہی لکھا ہے، جو میں نے اپنے مضمون میں ان کے اور ڈاکٹر داس گپتا کے حوالے سے لکھا تھا۔ لیکن ان کے لیے یہ سب کچھ دہرانا اور وہ بھی واضح الفاظ میں، اس وقت شاید ممکن نہ تھا کیونکہ وہ نائب صدر جمہوریہ کے پروقار عہدہ پر فائز تھے۔

میرے نقطۂ نظر کی واضح ترین حمایت ڈاکٹر مسز داس گپتا نے کی۔ جانے کیوں یہ خط اس قدر دیر سے لکھا گیا ممکن ہے مہینہ کے اندراج میں ان سے غلطی ہو گئی ہو۔

مسز داس گپتا کا خط[2]

انھوں نے لکھا:

Sultan's Bunglows
Badshahbagh, Lucknow-UP
6.9.56
Dear Sir,
Yours of 4th
Yes, the Buddha was a nastika in the Indian sense.

---

(۱) اصل خط کا عکس آخر کے صفحات میں۔ (۲) خط کا عکس آخر کے صفحات میں دیکھیے۔

Nastika means one who does not admit the authority of the Vedas and the Upanishads.

The Buddha was an atheist in the western sense too. There is no place of a personal permanent being as God in Buddhism.

Yours faithfully

Sd.

Mrs. S. Das Gupta

اس ضمن میں سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذہب سے گہرے شغف اور گوتم بدھ کے فلسفے سے متفق نہ ہونے کے باوجود مسز داس گپتا نے اس کے فلسفے کے اس قدر حساس نکتے کی وضاحت میں کسی قسم کی جانبداری سے کام نہیں لیا تھا۔

ڈاکٹر مسز داس گپتا ایک بے حد شفیق اور نیک دل خاتون تھیں۔ ان کی آنکھوں سے زیادہ ٹھنڈی اور پرسکون آنکھیں میں نے زندگی میں نہیں دیکھیں (کچھ یہی حال ڈاکٹر استھانا کا تھا جو شعبہ کی سیاست سے بددل ہو کر بنارس ہندو یونیورسٹی سے متعلق ہو گئے تھے) مسز داس گپتا اپنے لیکچرس میں متعلقہ موضوع کے سارے پہلو اور نکات طلبہ کے ذہن میں منتقل کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھیں۔ میں نے ان کو ہمیشہ سفید ساڑی میں، جس کی لمبائی میں کنارے پر ایک نیلی یا سبز پٹی ہوتی، ہی دیکھا۔ ان کا رنگ سرخ و سپید تھا اور بال سیاہ جنھیں وہ ہر وقت ساڑی سے ڈھکے رکھنے کی کوشش کرتیں۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کرتیں۔ بس ایک نظر دیکھتیں اور نظریں نیچی کر لیتیں۔ ان کی شخصیت طلبہ سے احترام کا خراج اس طرح وصول کرتی کہ ان کی موجودگی میں وہ دھیرے دھیرے چلتے اور شعبہ کے زینے سے اترتے ہوئے ان کے جوتوں سے آواز تک پیدا نہ ہوتی۔ ان کی انگریزی کی تحریر ایسی تھی کہ لگتا ایک ایک لفظ موتی کی طرح چن دیا گیا ہے۔

حسنِ اتفاق سے، ہندوستان ہی کیا اپنے وقت میں گوتم بدھ کی فکر کے سب سے بڑے ماہر اور اس پر سب سے بڑی سند مہاپنڈت راہول سنکر تاین کا پتہ مجھے مل گیا۔ وہ مسوری میں مقیم تھے۔ میں نے انھیں بھی خط لکھ دیا۔ اس سلسلے کے سارے خطوط انگریزی میں تھے۔ مسز داس گپتا اور ڈاکٹر رادھا کرشنن نے میرے خطوط کے جواب ظاہر ہے انگریزی ہی میں دیے تھے لیکن راہول جی نے میرے انگریزی کے خط کا جواب اردو میں دے کر مجھے حیرت زدہ اور شرمندہ کر دیا

تھا۔ ان کا خط پڑھتے ہوئے ہر بار یہ احساس ہوا کہ وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوں گے کہ عابد میاں یہ سمجھتے ہیں کہ راہول سنکر تاین اردو سے بھی واقف نہیں۔ انھوں نے اپنے خاصی تفصیلی خط میں لکھا تھا:

راہول سنکر تاین کا خط

Mussoorie

24/4/56

جناب سہیل صاحب

آپ کا ۱۰/ اپریل کا خط ملا۔ جواب میں عرض ہے:

۱۔ بدھ نے پولیٹیکل مساوات اور حق کے لیے سدھے نہیں کیا پر ویشالی کے ریپبلکن سسٹم کے بڑے مداح تھے اور اُسی کے طرز پر انھوں نے اپنے سنگھ (Community) کو قائم کیا، وہی ووٹ کے طریقے، اکثریت کا فیصلہ آخری وغیرہ۔ سوشل مساوات کے لیے اونھوں (انھوں) نے کھل کر کہا اور اوس (اس) پر عمل کیا۔ Community کے اندر ذات پات کے خیال کو بالکل مٹایا۔ نیشنل تفرقہ کا خیال ہٹا (کر) عالم گیر اخویت (اخوت) پر عمل کیا اور ویسا کرنا فرض مانا۔ بدھزم کی کامیابی کا یہ سب سے بڑا راز ہے۔

۲۔ بدھ خدا کی ہستی کے منکر تھے۔ وہ انسان کو (کے) قول و فعل میں کسی باہری عقلِ کُل یا سب پر حاوی ہونے والی ہستی کو نہیں مانتے تھے۔ انسان خود اپنا مالک ہے۔ یہی اونکا (ان کا) نعرہ تھا۔

Atheism. Attahi attono natho کو بدھزم نے اپنی ساری تاریخ میں مانا۔

۳۔ ہندوازم دراصل ایک کلچر کا نام ہے۔ وید، بھگوان (اللہ) اور روح کی ہستی سے بھی منکر ہونے (والے) ہندوستان کے بدھسٹ اپنے کو ہندو کہتے رہے۔ بدھ نے اپنے اہل وطن کو فری تھنکر بنایا۔ دماغی پابندیوں سے نجات دلائی۔ Tolerance سکھلایا، جس پر بودھوں نے ہر ملک میں عمل کیا۔ انسان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اوس (اس) کے احساسات کے ساتھ بھی۔ اس لیے کلچر میں بہت آگے بڑھی قوموں کو بھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔

۴۔ Dependent origination بدھسٹ فیلوسوفی (فلسفہ) کے بنیادی پتھروں میں سے

ایک ہے۔ بدھ بغیر استثنا کے ہر چیز کو ہر لمحہ فنا ہونے والی بتلاتے ہیں۔ Cause اور Effect (علت و معلول) دونوں ایک لمحے میں موجود نہیں رہتے پھر اونکا (انکا) آپسی تعلق کیا ہے؟ یہی کہ Cause کا ہر حالت (میں) اپنے Effect وجود میں آنے سے پہلے موجود رہنا لازمی ہے۔ بدھ کہتے ہیں ''اسکے ہونے پر یہ ہوتا ہے جس کے پہلے وجود میں نہ رہنے پر بھی جو وجود میں آسکتا ہے وہ اس کا Effect نہیں ہوسکتا۔ بدھ ہر Effect کو بالکل نیا مانتے ہیں ۔بس فرق اتنا ہی ہے کہ ہر ایک Effect صرف صورت میں اپنے Cause جیسا ہوتا ہے۔ اسی لیے تو ایک ہونے یا Permanent ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔

آپکا

(دستخط راہول سنکر تاین)[1]

علم حاضر کے اس بے حد نادر نمونے میں راہول سنکر تاین نے چند سطروں میں گوتم بدھ کے فلسفے کا نچوڑ اس طرح پیش کر دیا ہے کہ نہ صرف ہندوستانی فلسفہ کے دوسرے مدارس بلکہ مغربی فلسفے کے متعدد مسائل و مباحث نئے انداز میں سامنے آگئے ہیں۔ حیرت خیز بات یہ ہے کہ انسان کے اپنے قول و فعل کے لیے خود اپنا مالک ہونے اور Cause اور Effect کی بحث نے تو مغرب میں بہت بعد میں جنم لیا۔

راہول جی کا یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے کہ ''ہندو ازم دراصل ایک کلچر کا نام ہے'' لیکن اس کے بعد کا جملہ ''وید، بھگوان (اللہ) اور روح کی ہستی کے منکر ہونے والے ہندوستان کے بدھسٹ اپنے کو ہندو کہتے رہے'' کسی قدر محلِ نظر معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے طویل عرصے تک بدھسٹ خود کو ہندو کہتے اور سمجھتے رہے ہوں کیونکہ سنسکاروں کو تبدیلیٔ مذہب کے بعد بھی نیا رنگ روپ اختیار کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ ماضی کسی نہ کسی طرح لمبے عرصے تک ساتھ ساتھ چلتا ہے، لیکن ہندوستان کے بدھسٹ اگر خود کو ہندو کہتے اور سمجھتے رہے ہوتے تو نہ اس عظیم دھرم اور نہ

۱۔ راہول جی کے خط کی فوٹو کاپی پڑھی نہیں جاتی پھر بھی اسے اسکیننگ کرا کے پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دیکھیے آخر کے صفحات میں۔

خط نقل کرتے وقت کوشش کی گئی ہے کہ راہول جی کا املا بھی برقرار رہے۔ دو تین جگہ الفاظ جو خط لکھنے میں چھوٹ گئے تھے بڑھا دیے گئے ہیں یا ایک آدھ جگہ املا کی غلطی جس سے معنی میں خلل پڑنے کا خطرہ تھا بریکٹ میں درست کر دی گئی ہے لیکن ''علت و معلول'' خود راہول جی نے بریکٹ میں لکھا تھا۔

اس کے ماننے والوں کو ہندوستان سے دیش نکالا ملتا اور نہ گوتم بدھ کی ایک ایک مورتی کے ناک، کان، آنکھیں اور ہاتھ وغیرہ توڑے گئے ہوتے۔ یہ کام مسلمانوں کا نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کا مقابلہ بدھ حکومتوں سے نہیں ہوا۔ بدھسٹ مسلمان بادشاہوں کے دور میں غالب پوزیشن کے مالک بھی نہ تھے۔ ان کو بہت پہلے برما، نیپال، جاپان اور چین کھدیر دیا گیا تھا۔ لیکن راہول جی سے یہ سوال مجھے اسی وقت پوچھنا چاہیے تھا۔ افسوس اس وقت مجھے اس کا شعور نہ تھا۔ بہت ممکن ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی مسکت جواب رہا ہو۔

راہول جی کے بارے میں مجھے ایک بات اور بھی کہنی ہے اگر چہ اس خودنوشت یا گوتم بدھ کے فلسفے سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن وہ بات اگر یہاں نہ کہی گئی تو جب بھی اور جہاں بھی کہی جائے گی کچھ الگ تھلگ اور ٹوٹی پھوٹی لگے گی۔ اس لیے تسلسل کو ایک بار پھر قربان کرتا ہوں۔

راہول جی پکے مارکسسٹ اور کمیونسٹ تھے۔ ایسے میں بدھسٹ فلسفے سے ان کا لگاؤ تو سمجھ میں آتا ہے کیوں کہ اس میں انسان اور انسان کے درمیان مساوات پر زور دیا گیا ہے لیکن ''ہندو کلچر'' کی چھتری کچھ اٹ پٹی سی لگتی ہے۔ شاید اسی چھتری نے انھیں ایک مختصر سے وقفہ کے لیے کمیونسٹ پارٹی سے باہر کی راہ دکھائی تھی۔

آزادی کے بعد جب اردو کو اس کے سارے حقوق سے محروم کیا گیا تو کمیونسٹ پارٹی نے اس سلسلے میں سخت احتجاج کیا۔ وہ ''ہندستانی'' کے حق میں ہمیشہ پرجوش رہی تھی لیکن بدلے ہوئے حالات میں اس موقف کی پرزور حمایت ممکن نہ تھی۔ تاہم کمیونسٹ پارٹی کا اصرار تھا کہ اردو بولنے والوں کو نہ تو اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت سے محروم کیا جانا چاہیے اور نہ اسے سرکاری دفتروں سے خارج۔ اس سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی نے ایک سخت رزولیشن پاس کیا تو راہول سنکرتاین اور یشپال جی نے اس کے خلاف ایک بیان جاری کر دیا اور کمیونسٹ پارٹی نے ان دونوں کو پارٹی سے نکال دیا۔ راہول جی تو کھلے عام معافی مانگ کر فوراً پارٹی میں واپس آ گئے لیکن یشپال جی کو اپنا نقطۂ نظر تبدیل کرنے میں خاصا وقت لگا۔ یشپال فرقہ پرست ہرگز نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے سماج میں توہم پرستی کے خلاف جیسی بے جگری سے لڑائی اپنے افسانوں اور ناولوں میں لڑی اس کی عشر عشیر بھی کسی اردو ادیب کے حصے میں نہیں آئی۔ لیکن سوال یہاں صرف یہ ہے کہ راہول جی نے اردو کو اپنے ''ہندو کلچر'' کی چھتر چھایا میں کیوں نہیں لیا۔ میرے پاس اس کا نہ کوئی جواب ہے اور نہ یہ جاننا اب ممکن ہے کہ وہ اس بارے کیا کہتے لیکن یہ ضرور

چاہتا ہوں کہ سارے ترقی پسند اس مسئلے پر غور کریں۔ یہاں یہ بات بھی بہ اصرار کہنی ہے کہ راہول جی مرتے مر گئے لیکن انھوں نے اس کے بعد اردو کے خلاف کبھی ایک لفظ مُنہ سے نہیں نکالا۔

یشپال جی نے بھی بعد میں اردو کی جانب اپنے رویے میں لچک پیدا کی اور اس کے جائز مطالبات تسلیم کیے جانے کے محضر پر دستخط کر دیے۔

اب گوتم بدھ اور ماہنامہ ''اتر پردیش'' کی طرف لوٹتا ہوں۔

صباح الدین عمر

میں نے راہول جی کا خط صباح الدین عمر کو دکھایا تو وہ اس سے خاصے متاثر ضرور ہوئے لیکن بعد میں انھوں نے (شاید مجبوراً) خود کو ''ہندو کلچر'' کی چھتری میں ڈھکیل دیا اور مجھ سے کہا کہ حتمی رائے کے لیے رادھا کرشنن سے پھر رجوع کروں۔ میں جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں رادھا کرشنن یہ لکھ کر کبھی نہ دیں گے کہ گوتم بدھ نہ تو خدا کو مانتے تھے اور نہ ویدوں کو مقدس تسلیم کرتے تھے، شاید اس لیے کہ ملک کے حالات اور سیاست انھیں اس کی اجازت نہ دیتے۔ چنانچہ میں نے صباح الدین عمر سے واضح ترین الفاظ میں کہہ دیا کہ مضمون میں کسی قسم کی قطع و برید مجھے منظور نہیں اور براہ مہربانی اسے شائع نہ کیجیے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ یا تو مضمون من و عن شائع ہوگا یا معذرت کرلوں گا۔ لیکن ''اتر پردیش'' کا گوتم بدھ نمبر چھپ کر آیا تو اس میں میرا مضمون موجود تھا، مگر اس میں خدا کے وجود سے متعلق بحث حذف کر دی گئی تھی، ظاہر ہے میں اس کے علاوہ کیا کر سکتا تھا کہ اس رسالے میں اس کے بعد کبھی کچھ نہ لکھوں۔

اس وقت میں صباح الدین عمر سے بہت دل برداشتہ تھا لیکن بعد کے دنوں میں ان سے ملاقاتوں اور کسی قدر قربت سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ''وفاداری بشرط استواری'' کے قائل تھے۔ سرکاری ملازمت کے دوران انھوں نے حکومت کی پالیسی سے سر مو تجاوز نہ کیا اور جب اردو اکادمی کے قیام کا کام ان کے سپرد کیا گیا تو وہاں بھی کام انھوں نے بے حد دلجمعی سے کیا اور زبان کے مفادات پر حتی الامکان آنچ نہ آنے دی۔

ہندوستانی فلسفے سے مجھے دلچسپی تو بی۔ اے۔ کی تعلیم سے پہلے ہی پیدا ہوگئی تھی لیکن ذرا گہرائی سے مطالعے کا موقعہ ملا تو اس کی وسعت سے بہت متاثر ہوا اور دھیرے دھیرے اس کے

قریب ہوتا گیا۔ اتفاق سے شروع ہی میں میری دوستی شری چند[1] سے ہوگئی۔ وہ ٹانڈہ کا رہنے والا تھا اور جماعت اسلامی کے توسط سے اسلام سے بے حد متاثر، اور میں بدھزم سے۔ مذہبی امور اور خاص طور سے ان کے فلسفیانہ پہلوؤں پر ہم دونوں میں بحثیں برابر ہوتی رہتیں۔ ان میں کسی قسم کے تعصب کا نام ونشان نہ ہوتا۔ ان بحثوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کو قائل چاہے نہ کر سکے ہوں لیکن ان کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ہم جہاں تھے وہیں رہے اور ہمارے دل و دماغ مذہبی تعصبات سے بالکل پاک ہوگئے۔ ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ میں مارکسزم اور کمیونزم اور چارواک سے ہوتا ہوا بدھزم کے اور بھی قریب آ گیا اور اس کا اثر تقریباً ۱۹۸۵ء تک اس قدر ضرور رہا کہ سال میں دو تین بار، جب بھی حالات اجازت دیتے، لاٹوش روڈ کے بودھ مندر چلا جاتا اور گوتم بدھ کی مورتی کے سامنے چند منٹ خاموش کھڑے رہنے کے بعد، تھوڑے بہت پیسے، مالی امداد کے لیے رکھے ہوئے چھوٹے سے ڈبے میں ڈال کر لوٹ آتا۔

اس سلسلے کا خاتمہ ایک دلچسپ لیکن عبرت ناک طریقے سے ہوا۔

ایک بار بودھ مندر جانا ہوا تو آس پاس کے بچے مندر کے بھکشو کو چڑا رہے تھے۔ میں نے کوئی مداخلت نہیں کی اور حسبِ معمول گوتم بدھ کی مورتی کے سامنے آنکھ بند کر کے خاموش کھڑا ہوگیا۔ لیکن ذرا دیر میں جب بھکشو نے ان بچوں کو بری بری گالیاں دینی شروع کر دیں تو میں نے آنکھیں کھول دیں اور بوجھل قدموں سے واپس چلا آیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے اس بودھ مندر کا کبھی رخ نہیں کیا۔

گوتم بدھ کے کسی پیرو کا اس طرح کا برتاؤ میرے لیے ناقابلِ یقین اور ناقابلِ برداشت تھا... مذاہب اور عقائد کو ہم صرف ان کے پرشکوہ اصولوں سے نہیں، ان کے مقلدوں کے عمل سے بھی ناپتے ہیں۔

۱۔ شری چند نے بعد میں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا، لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرار اور پھر ریڈر ہوئے۔ مغرب کے مختلف مکاتب فلسفہ پر اسے زبردست عبور حاصل تھا۔ افسوس اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۹۹۰ء کے آس پاس اس کا انتقال ہوگیا۔ مجھے خبر بہت دیر میں ملی۔ اپنی اس بے خبری پر دل مسوس کے رہ گیا۔ مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا، چنانچہ اچاریہ نریندر دیو ہوسٹل میں، جہاں وہ محمود آباد ہوسٹل سے منتقل ہوگیا تھا، اس کے کمرے کے سامنے چند منٹ خاموش کھڑے رہ کر لوٹ آیا۔ اس کمرے میں ہم مہینوں ساتھ ساتھ رہے تھے۔ شری چند میرے عزیز ترین دوستوں میں تھا۔ اس کی موت سے میری زندگی کے وہ دن جو ہم نے فلسفہ کے مسائل پر گہرائی سے بحث وتمحیص میں گزارے تھے آگ کے شعلوں کے نذر ہوگئے۔

میں نے ان دنوں میں، جب بدھزم سے بہت متاثر تھا، فیصلہ کیا تھا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد بھکشو بن جاؤں گا، پالی، پراکرت اور سنسکرت سیکھوں گا اور کمنڈل لے کر نکل جاؤں گا...

لیکن بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی بہن کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بے سہارا چھوڑنا میرے لیے ممکن نہ تھا، پھر ملازمت مل گئی، شادی ہوگئی اور سارے منصوبے خواب وخیال ہوگئے ...تاہم "دکھ" ہمیشہ ساتھ رہا اور زندگی کے ان سارے دنوں میں جب تھوڑے سے پیسوں کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کمنڈل بھی ساتھ رہا، بس اس فرق کے ساتھ کہ اسے ایک چٹکی آٹے تک کے لیے کبھی کسی کے سامنے نہ بڑھایا... اور نہ کبھی کسی سے خوشی کی بھیک ہی مانگی۔ ویسے بھیک میں ملی ہوئی خوشی، خوشی کہاں ہوتی ہے اور یہ احساس بھی رہا کہ خوشی شاید بھیک مانگنے پر بھی نصیب نہ ہوتی:

اے دل بہ زمانہ رسمِ احساں مَطلب
وز گردشِ دوراں سرو ساماں مَطلب
درماں طلبی دردِ تو افزوں گردد
با درد بساز و درماں مَطلب

اسٹالن کی موت

عبدالحلیم خاں کو ان کے زیادہ تر دوست خاں صاحب کہتے۔ مزاجاً وہ خاں صاحب ضرور تھے لیکن صورتاً نہیں۔ ان کا رنگ آبنوسی تھا، قد نکلتا ہوا، دبلے پتلے تھے لیکن سائکل بہت تیز چلاتے اور کیریئر پر کوئی بیٹھا ہوتو اور بھی تیز۔ جا بجا فارسی کے اشعار اور مصرعے سنانے کا شوق تھا، چاہے وہ کتنے ہی بے محل کیوں نہ ہوں۔ میں ان کے گھر میں دو ڈھائی سال رہا۔ کرایے یا کھانے کے نام پر انھوں نے ایک پیسہ قبول نہ کیا اور ابتدائی دنوں میں کچھ دینے کی میری حیثیت بھی نہ تھی۔ لیکن پھر حالات ذرا سے بہتر ہوئے تو کچھ تلافی کی کوشش ضرور کرتا لیکن ان کے احسانات سے سبکدوش ہونا میرے لیے ممکن نہیں۔

کرسچین کالج سے بارود خانہ ہوتے ہوئے منظر سلیم کے گھر کے سامنے سے ڈاکٹر رضوان علوی کے گھر پہنچنے کی کوشش کیجیے تو ایک نالا پڑے گا۔ نالے سے ذرا پہلے ایک کمرے میں خاں صاحب رہتے تھے اور نالے کے دوسری طرف ایک بڑے سے مکان میں ایک فوجی افسر،

جو رٹائرڈ کیپٹن تھے اور اب اپنی بیوی اور ایک بیٹی کے ساتھ سبکدوشی کی زندگی گذار رہے تھے۔ وہ صاحبِ حیثیت تھے، لکھنؤ میں ان کے دو دو مکان تھے اور غازی پور میں خاصی بڑی زمینداری، جو عالمی جنگ میں کارناموں کی ستائش کے طور پر حکومت نے دی تھی۔ ایک دن جانے کیا سوجھی کہ انھوں نے غازی پور کی زمینداری کا لکھنؤ کے پاس کی ایک زمینداری سے تبادلہ کرلیا اور وہ بھی آزادی سے ایک آدھ سال قبل۔

موت کا وقت کس کو معلوم ہے۔ ان کی بیوی تین دن میں چٹ پٹ ہوگئیں اور وہ صدمے سے پاگل... اور پاگل بھی ایسے ویسے نہیں۔ رات ہو یا دن، گرمی ہو یا جاڑا یا برسات، یا دسمبر جنوری تک کی آدھی رات، بیوی کی یاد آجاتی تو شب خوابی کے لباس ہی میں عیش باغ کے قبرستان کے لیے روانہ ہوجاتے۔ اللہ اللہ کیسی بیویاں ہوتی تھیں جو اتنا پیار دیتیں کہ شوہر فرقت میں پاگل ہوجاتے اور کیسے شوہر بھی جو کسی دوسری طرف پلٹ کے نہ دیکھتے... اور بیٹی... رات برات آنکھ کھلتی اور باپ کو موجود نہ پاتی تو جمیل کی اماں سے جو کھانا پکاتیں، زنجیر لگانے کے لیے کہہ کے بندوق ہاتھ میں لیتی، رکاب گنج سے رکشہ پکڑتی اور عیش باغ میں ماں کی قبر سے باپ کو پکڑ کے لاتی۔ یہ جمیل کی اماں وہی تھیں جن کا بیٹا جمیل برسوں ماہنامہ کتاب کا "ایڈیٹر" رہا۔ یہ سمجھیے دوسری منیر کی امّاں تھیں، بس ذرا سا ان سے کم۔

عمر کے تقاضے نے کیپٹن صاحب کی بیٹی اور حلیم خاں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے دلچسپی پیدا کردی اور جمیل کی امّاں نے یہ سوچ کر کہ گھر میں ایک مرد کی، جس کے ہوش وحواس اس کے پاس ہوں، موجودگی ضروری ہے، تھوڑے سے چھوہارے خریدے، دو گواہ تیار کیے، قاضی کو بلایا اور محلّے کے دو چار لوگوں کو مدعو کر کے نکاح پڑھوادیا... کیپٹن صاحب کو معلوم ہوا تو بندوق لے کر دوڑے اور داماد پر گولی داغ دی... یہ کلوٹا کہاں سے گھس آیا۔ وہ تو کہیے نالی میں کارتوس نہیں تھا ورنہ اسی وقت ڈھیر ہوگئے ہوتے دولھا میاں۔

یہاں تک جو کچھ بیان کیا اس کا بڑا حصّہ شنیدہ ہے، دیدہ نہیں لیکن بعد کے واقعات نے اس کی توثیق کردی۔

داماد کو دیکھ کر بگڑنے لگتے، کلوٹے کی تکرار کرتے لیکن تاگے، ہار مان لی، اگرچہ پسند کر کے نہ دیا۔ بیوی کی یادیں بھی کافی وقت لے لیتیں... بیوی بھی کیا غضب کی تھیں، جان دے دی، قبر میں سر سے پیر تک کفن پوش ہوگئیں لیکن شوہر کو سوغاتوں سے نوازنا نہ چھوڑا... سوغاتوں کے

خوان بھجتیں اور کیپٹن صاحب کو مطلع بھی کر دیتیں کہ فلاں دن، فلاں وقت جنّات خوان لے کے آئیں گے۔ گھنٹوں پہلے سے تیاریاں شروع ہو جاتیں، نہاتے دھوتے، صاف کپڑے پہنتے، جتنے بھی بال بچے تھے ان میں کنگھی کرتے، عطر لگاتے اور آنکھیں آسمان پر گاڑے، ایک پیر چھت اور دوسرا زینے پر مضبوطی سے جما کر کھڑے ہو جاتے۔ تھوڑی دیر میں جنّات سوغاتوں کا خوان لیے دور آسمان میں پرواز کرتے ہوئے نظر آتے تو ان کے ہاتھ بلند ہونا شروع ہوتے اور پھر خوان کی مناسبت سے وہ دونوں ہاتھ برابر کرتے، چہرے پر فخر اور مسرّت کا رنگ چھا جاتا، خوان خود سنبھالتے، پھر جھک کے بیٹی کی طرف بڑھا دیتے، دونوں ہاتھوں کا فاصلہ کم یا زیادہ ہوتا تو انھیں خوان کی مناسبت سے ٹھیک کرنے کو کہتے۔ وہ خوان شوہر کی جانب، جو نیچے کے زینے پر ہوتے کہ ان کی نظر اور عتاب سے محفوظ رہیں، بڑھا دیتیں، وہ اسے جمیل کی امّاں کو دے دیتے اور جمیل کی امّاں انھیں عزّت و احترام کے ساتھ تخت پر سجا دیتیں۔ ہر بار تین یا چار خوان آتے۔ پھر جب انھیں دور دور تک کوئی جنّات نظر نہ آتا تو مسرور و شادماں نیچے آتے، کسی خوان کا کوئی کونا دوسرے خوان سے ذرا بھی دب رہا ہوتا تو اسے کھسکا دیتے، خوان پوش اٹھا کر سوغاتوں کو دیکھتے، مسکراتے، پاس کی آرام کرسی پر بیٹھ کر ایک ٹک انھیں دیکھتے رہتے اور دیکھتے دیکھتے نیند آ جاتی... آنکھ کھلتی تو کہاں کا خوان، کہاں کا خوان پوش اور کہاں کی سوغاتیں، کچھ اور دُھن دماغ میں سما چکی ہوتی۔

حلیم کی عدم موجودگی میں دو ایک بار میں نے بھی اس خواب رُو کی آخری کڑی کے طور پر اس میں شرکت کی تھی۔ مجھ سے ناخوش نہ رہتے لیکن کوئی ایسی بات بھی نہ کی جس سے معلوم ہوتا کہ پسند کرتے ہیں۔

کیپٹن صاحب کے ہوش و حواس جاتے رہے تو سارے زیور، ہزاروں روپے نقد اور جو بھی قیمتی سامان تھا بیٹی نے باپ کے ایک بے حد عزیز دوست کے پاس رکھا دیا۔ وہ بھی صاحبِ حیثیت تھے کہ ایسی سرکاری ملازمت میں تھے جہاں دھن برستا، تنخواہ تو بس ایک رسم تھی جو دستخط کر کے پہلی تاریخ کو وصول کر لی جاتی۔ حلیم خاں ابھی تاریخ میں ایم۔اے۔ ہی کر رہے تھے کہ انھیں ریلوے میں نوکری مل گئی۔ کبھی ''گدّی'' پر بیٹھتے تو بانٹ بونٹ کے شام میں سو سوا سو تو لے ہی آتے اور جب ''سوکھی'' ڈیوٹی پر ہوتے تو شام میں منہ لٹکائے ہوئے آتے۔ ایسے دنوں میں بھابی باپ کے دوست کے یہاں سے کبھی سو، کبھی دو سو منگوا لیتیں۔ لیکن ان روپوں میں ایسا گھن لگا کہ بس ڈیڑھ سال میں ختم ہو گئے۔ ادھر کچھ خرچ بھی زیادہ ہوئے تھے کہ زمینداری کا مقدمہ

زوروں پر تھا۔ لیکن ایسا بھی کیا خرچ، آخر زیور کیا ہوئے؟ گھما پھرا کے پوچھا تو جواب ملا وہی بیچ بیچ کے تو روپے دیے جا رہے تھے، نقد تو کب کے ختم ہو گئے تھے۔

آپ بھی کہتے ہوں گے کہ باب کا عنوان ہے ''اسٹالن کی موت'' اور تین صفحے پڑھ ڈالے اب تک اسٹالن کی صورت بھی نہ دکھائی دی، تو وہ مرے گا کب؟ صبر سے کام لیجیے، اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے، اسٹالن نظر بھی آئے گا اور مرے گا بھی۔

زمینداری کا خاتمہ ہوا تو کیپٹن صاحب بھی لپیٹے میں آ گئے۔ ان کے ورثا نے کہا کہ زمینداری فوجی خدمات کے عوض ملی تھی اور ضبط نہیں ہو سکتی۔ جواب ملا جو زمین ملی تھی وہ کہاں ضبط کی گئی ہے، اس کے مالک کو تو نوٹس بھی نہیں دیا گیا۔ اِدھر سے کہا گیا کہ یہ تو تبادلہ کی زمینداری ہے، معافی کا قانون اسی پر نافذ ہوگا، اُس پر نہیں۔ جواب ملا نہیں۔ غرض انھوں نے مقدمہ دائر کر دیا۔

میں حلیم کے ساتھ اکثر ان کے وکیل کے یہاں جاتا۔ حسین آباد کے آخری سرے تک تو یاد ہے، اس کے آگے کتنی دور جانا ہوتا تھا یاد نہیں، الا اس کے کہ بہت معمولی سا مکان تھا، وکیل صاحب لنجے تھے اور صورت سے وکیل تو دور کی بات ان کے بستہ بردار بھی معلوم نہ ہوتے، لیکن جب بھی جاؤ دو چار موکل ضرور موجود ملتے۔

میں کیا ہوں اس وقت چھپانا نہ آتا تھا، اب بھی نہیں آتا۔ انھیں معلوم تھا کہ سر تا سر کمیونسٹ ہوں۔ ایک دن بولے، ''آپ کے اسٹالن صاحب تو اس سال مر جائیں گے۔''

''ہائیں کیا کفر بکتے ہو، اسٹالن اور مر جائیں۔'' میں نے کہا تو نہیں لیکن سوچا ضرور اور جو سوچا وہ چہرے پر آ گیا تو انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب کا ایک صفحہ کھول کر میرے سامنے کر دیا، لکھا تھا:

"The week of mourning in the Soviet Union, most probably the death of Stalin."

میں نے عبارت پڑھی، کتاب واپس کی اور بھول گیا۔ اسٹالن کی موت ہوئی (۵/مارچ ۱۹۵۳ء) تو بھی یہ پیشن گوئی نہ یاد آئی لیکن مہینوں بعد حلیم کے ساتھ وکیل صاحب کے یہاں گیا تو ایک دم خیال آیا۔ کتاب مانگی، متعلقہ مہینے کے صفحات کھولے تو وہی تاریخیں تھیں۔

''کامریڈ، میں بھی چاہتا تھا کہ یہ پیشن گوئی غلط ثابت ہو جائے،'' وکیل صاحب نے

افسردہ لہجے میں کہا۔ معلوم ہوا وہ خود بھی کمیونسٹ تھے۔ یہ وہ دن تھے جب کھیت مزدور، کارخانوں میں کام کرنے والے، پڑھے لکھے لوگ، یونیورسٹی کے اساتذہ اور وکیل بھی کمیونسٹ ہوتے تھے۔

پھر ۱۹۶۱ء میں اسٹالن کی نفی (De-Stalinisation) شروع ہوئی۔ اس کے مجسمے ہٹائے گئے، لینن کے پاس کی قبر سے لاش ہٹا دی گئی، تصویر تو خیر کوئی چھوڑی ہی نہیں گئی، قومی ترانے سے اس کی تعریف نکال دی گئی۔ لیکن اب؟ وہ واپس آرہا ہے۔ قومی ترانے میں ''اسٹالن نے ہم کو ملک وقوم سے وفادار بنایا، کام کرنا اور جرأت مندی سکھائی،'' دوبارہ شامل کردیا گیا ہے اور ماسکو کے عالی شان میٹرو اسٹیشن میں اس کی تعریف میں یہ الفاظ سونے کے حروف میں دوبارہ لکھ دیے گئے ہیں (آؤٹ لک۔ ۳۰ر نومبر ۲۰۰۹ء۔ صفحہ۔ ۸۰)

مقدمہ چلتا رہا، بلکہ تاریخوں پر تاریخیں پڑتی رہیں، پھر حلیم کا تبادلہ سلی گوڑی ہوگیا۔ پھر بھابی یکایک بیمار پڑ گئیں، حلیم کو تار دیا، طبیعت بگڑی تو جمیل کی اماں کی مدد سے انھیں کوئن میری میں داخل کرایا۔ حلیم آ گئے۔ طبیعت کچھ بہتر ہوگئی، لیکن یہ آخری سنبھالا تھا۔ دائی نے سونے کے زیور اتار کر حلیم کے حوالے کیے تو ڈاکٹر کٹی نے کہا، '' مریض نے کوآپریٹ (Co-operate) نہیں کیا۔''

شوہر کے علاوہ چار بچے تھے رونے کو۔ سب سے چھوٹی تھی عینی، بمشکل چھے سات مہینے کی۔ اورئی سے آ کر اسے اماں لے گئیں اور آٹھ دس برس کی تھی جب پال پوس کے حلیم کے حوالے کردیا۔ حوالے کیا کردیا، حلیم میوہ والی سرائے کے ہمارے کرایے کے مکان سے اٹھا لے گئے۔ خفا ہوگئے تھے خاں صاحب۔ یہ بات ۱۹۶۵ء کی ہے... لیکن عینی کسی نہ کسی بہانے اماں سے ملنے آ جاتی۔ پھر اماں علی گڑھ چلی گئیں اور جب بھی بیمار پڑتیں انھیں دیکھنے جاتی۔ ہم لوگ اس کی شادی میں بھی شریک ہوئے تھے۔

تازہ ترین ملاقات غالباً جولائی ۲۰۰۹ء میں یونٹی کالج میں ہوئی جہاں وہ پڑھاتی ہے۔ اس نے ایسے چاؤ سے ''چچا'' کہا کہ سب اسے اور مجھے دیکھنے لگے۔

۱۹۹۸ء کے آس پاس حلیم بیمار پڑے تو بیٹے سے مجھے بلوایا، ''معافی'' مانگی، رو رو کے سارا چہرہ تر کرلیا۔ میں بھی خوب رویا۔ ہر ہفتے دیکھنے جاتا۔ پھر ایک دن ہفتے کے بیچ رخصت ہوگئے۔ مجھے پتہ اس وقت چلا جب حسبِ دستور اُن کے گھر گیا۔

سورج، جمال پاشا، حلیم خاں اور عابد سہیل کا مربع جو جمال کی موت سے مثلث رہ گیا

تھا اب ایک لکیر کے دو آخری نقطوں کی شکل میں باقی رہ گیا ہے۔ ان میں سے کوئی ٹپکا تو بس ایک نقطہ ہی رہ جائے گا اور نقطہ کی لمبائی چوڑائی نہیں ہوتی۔

ہم لوگ انگریزی کی اسٹیڈی مل کر کرتے۔ لٹن اسٹریچی کی کوئن وکٹوریا کا مطالعہ کرتے تو سورج کسی طرح ڈیوک نہ کہہ پاتا۔ کئی بار منہ لمبا سا بناتا، پھر جی جان لگا کے ڈیوک کہنے کی کوشش کرتا تو منہ سے نکلتا... ڈوبک۔

خیر، کوئی بات نہیں۔ اب نہ ڈیوک ہیں، نہ اسٹالن، نہ حلیم نہ جمال، جس کو جو چاہے کہو، جس کے بارے میں جو چاہو کہو۔ رہے نام اللہ کا۔

◆◆◆

ایم۔اے (سال اوّل)

بی۔اے کیا پاس کیا ایسا لگا دنیا فتح کر لی ہے۔اس احساس کے اور بھی اسباب تھے، محض ''معاشیات'' سے نجات نہیں۔ اسلم صاحب کے یہاں سو روپوں کا ٹیوشن تو تھا ہی لیکن آس پاس بھی بہت کچھ ہو رہا تھا، کلیاں چٹک رہی تھیں یا چٹکنے کو بے چین تھیں اور چٹیل میدانوں میں بھی سبزہ سر اٹھانے لگا تھا اور اپنے اندر سے لگتا کہ کچھ اچھا ہونے والا ہے۔

ہوا بس یہ تھا ریڈیو پر فیس کچھ بڑھ گئی تھی اور چھوٹے موٹے ایسے پروگرام ملنے لگے تھے جس میں نام بطور مصنف براڈ کاسٹ ہوتا اور ''نیا دور'' اور ''آج کل'' سے بھی معاوضے میں اضافہ ہو گیا۔ ایک بات اور بھی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ کتابی دنیا نے منظر سلیم، سلام مچھلی شہری، ڈاکٹر احسن فاروقی اور سلامت علی مہدی کے ناولوں کے علاوہ جاسوسی ناولوں کے تراجم بھی چھاپنا شروع کر دیے تھے کیوں کہ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں نے حیرت و استعجاب کے علاوہ رفتار اور ٹھہراؤ کے سبب پڑھنے والوں کی ایک بالکل نئی لہلہاتی فصل پیدا کر دی تھی اور اس کے مطالبات بھی پورے کرنے تھے۔ کتابی دنیا کے لیے ترجمے زیادہ تر انور مسعود یا مسعود انور کرتے جو حسین آباد کالج سے متعلق تھے۔ ان کی کتابیں پسند تو کی گئیں لیکن انھیں وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جو عام جاسوسی ناولوں کی تھی۔ آخر ایک دن سلامت علی مہدی نے کہا کہ لندن، گلاسگو، نیویارک اور الافرڈ ،جیمس اور جانسن کے مقابلے میں پڑھنے والوں کو اپنے ملک کے لوگ، شہر اور ماحول زیادہ پسند آتے ہیں اور وہ ان سے اپنائیت آسانی سے قائم کر لیتے ہیں۔ بات روپے میں سولہ آنے صحیح تھی، اظہر نگرامی کے دل کو لگی اور مشہور غیر ملکی جاسوسی ناولوں کو ہندوستانی بنا کر پیش کیا جانے لگا۔ یہ کام دو لوگ کرتے تھے، مسعود صاحب اور میں۔

اس طرح کی کتابوں کا باقاعدہ ترجمہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خاص طور سے اس صورت میں جب ہر مہینے دو ناولیں تو چھاپنی ہی ہوں۔ اس لیے ہوتا یہ کہ ترجمہ کے بجائے مفہوم پر زور دیا جاتا

اور ہر کردار اور شہر کو ہندوستانی نام۔ کام شروع کیا جاتا تو اسے چاہے ترجمہ کا نام دیں یا آزاد ترجمہ کا یا خیال کی چوری کا، ہوتا بس یہ کہ جو بھی کردار یا مقام آتا اسے مقامی نام دے کر فہرست ایک کاغذ پر بنالی جاتی پھر انگریزی کا پورا پیراگراف ایک بار میں پڑھ کے اردو میں جو کچھ سمجھ میں آتا وہی لکھ دیا جاتا۔ ایک چھوٹی سی ناول جو فلسطین کے پس منظر میں لکھی گئی تھی ترجمہ در ترجمہ چھپی، کسی فرضی نام سے۔ یہ کام میں نے کیا تھا۔ اس طرح کے کاموں کا معاوضہ پچاس ساٹھ روپے فی کتاب کے حساب سے ملتا۔ مسعود صاحب کو پچھتّر روپے ملتے، یہ بات مجھے معلوم تھی، لیکن میرے لیے پچاس ساٹھ ہی بہت تھے۔ آمدنی میں اس اضافے نے بھی موسم کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوشگوار بنا دیا تھا۔

یہ وہ دن تھے جب کچھ خاص لکھے پڑھے بغیر ادیب ہونے کے احساسِ فخر نے دل میں سر اٹھایا تھا اگرچہ میرے اس وقت کے سارے ترجمے ان ناموں سے شائع ہوئے جو بچّوں کی کہانیوں اور مضامین میں استعمال ہوئے تھے۔ اس طرح کی کتابوں میں ممکن ہے ایک آدھ نام ایک سے زائد بار استعمال ہوا ہو۔ یہ ناولیں عام طور سے ڈیڑھ پونے دو سو صفحوں کی ہوتیں لیکن ایک ناول جس کا نام ''سبز بھوت'' (مصنف ایڈگر ویلیس) تھا غالباً دو ڈھائی سو صفحات کی تھی۔ جانے کیوں جی چاہا کہ اسے اپنے نام سے چھپوا دوں، یہ بات غالباً ۱۹۵۷ء کی ہے۔ اظہر صاحب سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ وہ ادیبوں کی بہت قدر کرتے تھے، چاہے کوئی ادیبوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہی ادیب نہ سمجھا جانے لگا ہو، جیسا کہ میرے ساتھ تھا۔ اپنے نام سے کتاب چھپوانے کی محرک ایک بات اور بھی تھی۔ کئی ماہ پہلے منظر بھائی نے ایک دن حلیم خاں کے یہاں میرے کمرے میں بید کی ایک الماری میں سلیقے سے سجی ہوئی دس بیس کتابیں اور بستر پر دو چار ادبی پرچے دیکھ کر کہا تھا، ''آپ ادیبوں کی طرح رہنے سہنے تو لگے، مگر...'' اس کے بعد کے الفاظ یاد نہیں لیکن مطلب اس کا یہ تھا کہ ادیب نہ بن پائے۔ ان کی بات کا میں نے ذرا بھی برا نہ مانا تھا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ ایک تو میں انھیں اپنا خیر خواہ مانتا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ تلخ سے تلخ بات شکر میں لپیٹ کر کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن دل پر ایک بوجھ سا ضرور بیٹھ گیا تھا۔ ممکن ہے کتاب اپنے نام سے چھپوانے کا محرّک یہی بوجھ رہا ہو۔ بہر حال سبز رنگ کے گرد پوش کی کتاب چھپ کر آئی تو اور کچھ چاہے نہ ہوا ہو، دل پر سے وہ بوجھ ضرور ہٹ گیا۔ کتاب پر اپنے نام کو دسیوں بار تو ضرور دیکھا ہوگا۔

انھی دنوں یا شاید اس سے پہلے ''بیسویں صدی'' میں ایک افسانہ بھیجا جو خطوط کی شکل میں تھا۔ عنوان تھا '' کوئی مسافر، کوئی منتظر'' ۔ خط اسی طرح کا لکھا تھا جیسا بعد میں بھی اجنبی ایڈیٹروں کو لکھتا رہا یعنی'' مکرمی، تسلیم۔ ایک افسانہ بھیج رہا ہوں، پسند آئے تو شائع فرما دیجیے ورنہ واپس۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ نیاز کیش، عابد سہیل۔'' رام لعل سے معلوم ہوا تھا کہ بیسویں صدی معاوضہ دیتا ہے۔ سو کچھ اس طرح کی بات بھی لکھ دی تھی کہ اشاعت کی صورت میں معاوضہ ضرور دیں۔ سات آٹھ دن میں جواب آ گیا کہ افسانہ خاص نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ اشاعت کے لیے خط بھیج دیجیے۔ یاد آیا، انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ معاوضہ ہم دوسرے افسانے سے دیتے ہیں۔ یہ خط بالکل دوسرے قسم کے ہوتے۔ ان میں رسالے کی تعریف ہوتی، خوشتر گرامی کے گھر کے لوگوں کی خیر و عافیت پوچھی جاتی۔ ایسے خط کرشن چندر ایم۔ اے۔ تک لکھتے جو اُن دنوں مقبولیت کی معراج پر تھے، میں کس کھیت کی مولی تھا۔ چنانچہ میں نے خط تو لکھ دیا لیکن اس میں یہ جملہ بھی ٹانک دیا کہ معاوضہ آپ دوسرے افسانے سے دیتے ہیں تو وہ افسانہ واپس کر دیجیے، میں دوسرا بھیج دوں گا۔ خوشتر گرامی افسانہ خاص نمبر میں شامل کر چکے تھے اور یہ خط ایسا تھا کہ شائع کرنا پسند نہ کرتے، چنانچہ چھاپا انھوں نے وہی دوسطری خط، اگرچہ پندرہ روپے بطور معاوضہ بھی بھیجے۔

گومتی سمندر بن گئی

''سبز بھوت'' پر نام کی اشاعت کچھ اتنی اچھی لگی کہ ایک اور ناول پر اپنا نام دے دیا۔ کتاب کا نام تھا'' سرخ انگلیاں'' (چھے سات سال پہلے تک علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری کے کیٹیلاگ میں میری یہی ایک کتاب تھی)۔ اس ناول کے ساتھ ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔

میں نے آزاد ترجمہ شروع کیا تو ناول کا میدانِ کارزار لکھنؤ کو بنایا۔ آدھی کتاب ترجمہ کر چکا تو معلوم ہوا کہ ڈاکو جہاز پر بیٹھ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ بعد میں کوئی ترکیب نکالوں گا، جہاز گومتی میں ڈال دیا۔ جتنے بھی صفحات روز تیار ہو جاتے اظہر صاحب کو دے آتا۔ میں نے انھیں بتا بھی دیا کہ اس طرح کی مشکل آن پڑی ہے، بعد میں ٹھیک کر دوں گا لیکن جہاں دو تین کتابیں ہر مہینے چھپتی ہوں ''بعد'' کہاں آتا۔ پروف ریڈنگ تک تو ہوتی نہ تھی۔ غرض کتاب میں ڈاکو گومتی سے جہاز کے ذریعے ہی فرار ہو گئے۔

کئی مہینے بعد کتابی دنیا کے پتے پر ڈھاکہ سے میرے نام ایک خط آیا۔ مکتوب نگار نے

لکھا تھا کہ میں بھی لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔ شہر کی ترقی کا حال معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی، میرے زمانے میں گومتی ایک چھوٹی سی ندی تھی جو اَب ترقی کر کے ماشاء اللہ سمندر بن گئی ہے۔ کبھی لکھنؤ جانا ہوا تو ضرور دیکھوں گا۔

کتابی دنیا سے جاسوسی کتابوں کی اشاعت کا ذکر یوں ضروری تھا کہ آمدنی میں اضافہ کا ایک ذریعہ یہ بھی تھا۔ غرض بہتر دن آ گئے تھے۔ مکّھن زین کے ایک نہیں دو پینٹ سلوائے، نیا جوتا خریدا اور خود سے یہ عہد کیا کہ گھر سے جتنی بار بھی دن میں نکلنا ہو کپڑے مختلف ضرور ہوں گے۔ ظاہر ہے قمیص اور پتلون اتنے تو تھے نہیں کہ یہ ممکن ہوتا چنانچہ کرتا بس یہ تھا کہ کبھی پینٹ تبدیل کر دیتا کبھی قمیص۔ یہ ایک طرح سے، بلکہ ہر طرح سے، بھیانک مفلسی کے دنوں کا بدلہ لینے کی کوشش کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو جیب میں پانچ دس روپے ضرور ہوتے اور یونیورسٹی جاتا تو اس بات کا خیال رکھتا کہ پتلون کی پیچھے والی جیب میں ایک دو روپوں کی ریزگاری بہر صورت ہو، تاکہ پہلی منزل کے کلاس میں شرکت کے لیے زینے پر تیز تیز چڑھوں تو آس پاس والوں کو سکّوں کی کھنکھناہٹ سنائی دے۔

دبتا ہوا گندمی رنگ، اوسط سے ایک آدھ انچ چھوٹے قد اور شکل وصورت میں کسی بھی قابل ذکر بلکہ پسندیدہ عنصر کی عدم موجودگی کے باوجود میں حاضر جوابی، خوش مزاجی، کمیونسٹ رجحان، کلاس میں مشکل سوال پوچھنے اور مشکل سوالوں کا جواب دینے اور شرافت کی شہرت اور کچھ پوز کے سبب فلاسفی ڈپارٹمنٹ کا مقبول ترین طالب علم تھا۔ اس مقبولیت میں اخبار سے تعلق، ریڈیو سے کبھی کبھی نام کے نشر ہونے اور ''ادیب'' ہونے کو بھی دخل تھا۔ شعبے میں طلبہ کی انجمن ''درشن پریشد'' کی روایت تھی کہ ایم۔اے۔ کے دوسرے سال کا طالب علم ہی صدر ہوتا تھا لیکن طلبہ بضد تھے کہ مجھے ہی صدر بنائیں گے۔ آخر میری ہی درخواست پر ڈاکٹر دیوراج نے مداخلت کر کے طلبہ کو روایت کی پاسداری پر آمادہ کیا۔

یہ سطریں لکھتے وقت ایسا معلوم ہوا جیسے جھوٹ بول رہا ہوں یا تخیل کو بے لگام چھوڑ دیا ہے۔ اٹھ کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی۔ آئینے کی ایک بڑی خوبی ہے کہ نہ وہ ماضی میں جھانکتا ہے، نہ مستقبل میں۔ معلوم نہیں ''دائمی لمحۂ موجود'' کے مبلّغ جان ڈیوی نے اپنے Pragmatism کی حمایت میں آئینے کی مثال کیوں نہیں دی۔ ممکن ہے نہ سوجھی ہو۔

کلاس میں ایک لڑکی تھی۔ سب اسے ''مس بسو'' کہتے۔ حاضری بھی مس بسو کے نام

سے لی جاتی۔ وہ کلاس کے ایک لمبے چوڑے لڑکے کو پسند آ گئی اور وہ اسے، لیکن شیلندر کو، شاید یہی نام تھا، جانے کیا تکلیف ہوگئی کہ چھڑی لے کے چلنے لگا۔ پہلے تو خیال ہوا کہ دو چار دن کی بات ہے، ٹھیک ہو جائے گا لیکن پھر چھڑی اس کی شخصیت کا حصّہ بن گئی۔ ایک تو مستقل ہوتی ہوئی بیماری دوسرے مس بسو سے ممکنہ جدائی کے احساس نے اندر سے اسے ضرور توڑ دیا ہوگا لیکن مجال ہے کہ چہرے پر افسردگی کی ایک لکیر نظر آئے، وہی مسکراہٹ، وہی پہلے کی طرح ہنستے ہنستے یکا یک خاموش ہو جانے کی ادا، کچھ بھی تو نہ بدلا تھا اس میں۔ اس محبت کا ہم سب کو بس اندازہ تھا۔ کوئی اوچھی حرکت دونوں نے کبھی نہ کی، ساتھ ساتھ چلتے تو اس طرح کہ ایک کے کپڑے بھی دوسرے سے نہ چھو پائیں۔ مجھے مقابلتاً دراز قامت شیلندر اور چھوٹی سی مس بسو بہت اچھے لگتے۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ دونوں کی شادی اَب بالکل بے جوڑ ہوگئی تھی، چنانچہ نہیں ہوئی۔ برسوں بعد شیلندر سے امین آباد میں ملاقات ہوگئی۔ کار سے اتر رہا تھا، چھڑی ہاتھ میں لیے ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پیر کی تکلیف کے باوجود اس نے ایک ہاتھ سے مجھے سینے سے بھینچ لیا۔ میں نے مس بسو کے بارے میں پوچھا تو اس کے چہرے پر بس ایک لہر آئی، ہلکی سی اداسی کی، اور چلی گئی۔ پڑھائی میں وہ بہت تیز تھا۔ نیم معذور نہ ہوگیا ہوتا تو اگلے سال نسیم طاہر مرزا کو ٹاپ کرنے میں مشکل پڑ سکتی تھی۔

نسیم طاہر مرزا

نسیم مرزا، معمولی سی شکل و صورت کی لڑکی تھی، خورشید بک ڈپو کے مالک خورشید صاحب کی رشتے کی بہن۔ وکٹوریہ اسٹریٹ پر میرے گھر سے تھوڑے فاصلے پر رہتی تھی۔ وہ اور معزز قیصر، جو بہت خوبصورت تھی، رکشے پر برقع اوڑھ کے اپنے اپنے گھروں سے نکلتیں، جو میڈیکل کالج کے پاس اتار دیے جاتے۔ تقریباً ہر دن، اسٹاف کلب کے سامنے کونے والے درخت کے نیچے جہاں ان کا رکشہ آ کے کھڑا ہو جاتا، نسیم طاہر مرزا سے بات چیت کے دوران، معزز قیصر بھی موجود ہوتی، لیکن حیرت ہے کہ ایک بار بھی، جی ہاں ایک بار بھی، اس سے بات نہیں ہوئی، بس ایک مرتبہ اس کا نام حوالے کے طور پر آ گیا تھا لیکن یہ حوالہ بھی دلچسپ ہے۔

سلام سندیلوی کی دوسری شادی ہوئی۔ میں نے بس سنا تھا اور یہ تو قطعاً معلوم نہ تھا کہ نسیم طاہر مرزا ان کو جانتی ہیں۔ ایک دن نسیم طاہر مرزا نے ان کی نئی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے کہا،

''اس قدر خوبصورت ہے کہ آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔''اس میں کچھ کچھ افسوس بھی شامل تھا۔

''تصور بھی نہیں کر سکتا؟''میں نے حیرت سے کہا۔

''اچھا تو اُس خوبصورت سے خوبصورت لڑکی کا نام لیجیے جسے آپ جانتے ہوں''

''ارے یہی معزز قیصر!''میں نے کہا

''معزز قیصر شرما کر اور چھوٹی سی گڑیا بن گئی۔''

''معزز قیصر!''نسیم مرزا نے کہا''اس کے پاؤں کی دھوون بھی نہیں۔''

اور یہ سچ بھی تھا۔ میں نے سلام سندیلوی کی اہلیہ کو برسوں بعد گورکھپور میں دیکھا، ریڈیو کے کسی پروگرام میں گیا تھا۔ سلام سندیلوی بیمار تھے۔ ان کی عیادت کے لیے گیا۔ کسی نے بتایا کہ بیوی کی ایک جھلک نہیں دیکھنے دیتے کسی کو لیکن جس کو ملنا ہوتا ہے گرلس کالج میں جا کر مل آتا ہے، جہاں وہ پڑھاتی تھیں۔ شعبۂ اردو کے ایک لکچرر/ پروفیسر اپنے کسی کام کے لیے ان سے ملنے کالج گئے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ نسیم طاہر مرزا نے کسی مبالغہ سے کام نہیں لیا تھا۔

ایک مزے کی بات اور یاد آ گئی، ڈاکٹر راج نرائن نفسیات پڑھاتے تھے۔ ایک دن انھوں نے جذبات (Emotion) کے موضوع پر ٹیسٹ لیا۔ انھوں نے شاید James Lange تھیوری پوچھی تھی۔ مجھے تینوں تھیوریاں یاد تھیں لیکن ان میں سے دو کے بارے میں یہ بھول گیا کہ کون کون سی ہے۔ آخر ایک ترکیب سوجھی اور یہ جملہ کہ James Lange theory cannot be understood without discussing the two other theories of emotion. لکھ کر تینوں تھیوریاں لکھ دیں۔ ڈائگرام بھی بنائے۔

چار پانچ دن بعد کاپیاں واپس کرتے ہوئے ڈاکٹر راج نرائن دلچسپ تبصرے بھی کرتے رہے۔ میری باری آئی تو بولے،''اور یہ ہمارے سہیل صاحب (رجسٹر پر نام کچھ بھی لکھا ہو مجھے کالی پرشاد عابد اور باقی سارے ٹیچر سہیل کہتے تھے۔) ہنومان ہیں۔ ان کو سنجیونی بوٹی نہیں ملی تو پورا پہاڑ اٹھا لائے۔''لیکن انھوں نے نمبر بہت اچھے دیے تھے۔

◆◆◆

قومی آواز

ایک دن منظر سلیم سے، جنھیں میں نجی گفتگو میں ہمیشہ منظر بھائی کہتا، پل جھاؤلال پر ملاقات ہوگئی۔ وہ کرسچین کالج کی طرف سے آرہے تھے اور میرا رخ اسی طرف تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی اپنی سائکلوں سے اتر پڑے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگے۔

گفتگو کا آغاز منظر بھائی نے ہی کیا

''قومی آواز میں نوکری کیجیے گا؟''

''مجھے مل جائے گی؟''

''آپ کو نہیں ملے گی تو کس کو ملے گی؟'' انھوں نے جواب دیا۔

قومی آواز پر میرا تھوڑا سا حق تھا۔ پانچ سال تک یونیورسٹی میں اعزازی نامہ نگاری کرنے کے سبب اس کے مزاج سے کچھ نہ کچھ واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے مزاج سے انحراف کس حد تک برداشت کرلیتا ہے۔ ان پانچ برسوں میں قومی آواز بائیں بازو سے میری ہمدردیوں کو برداشت کرتا رہا تھا اور میں نے بھی کبھی اپنے سیاسی نظریات کو خبر یا سرخی کے ذریعے اخبار پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مقررہ تاریخ اور وقت پر قومی آواز پہنچا تو منظر سلیم پہلے عشرت صاحب کے پاس لے گئے پھر حیات اللہ انصاری کے پاس۔ ظاہر ہے ان ملاقاتوں کی نوعیت، رسمی تھی کیوں کہ دونوں مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ عشرت صاحب سے تو قرابت داری بھی تھی لیکن اس سے نقصان کا امکان زیادہ تھا۔ وہ خود کو غیر جانب دار ثابت کرنے کے لیے دوسرے کے جانب دار بھی ہوسکتے تھے۔

بہر حال طے یہ پایا کہ میں اگلے دن رات کی ڈیوٹی میں سات بجے شام کو دفتر پہنچوں۔

یہ بات ۱۹۵۷ء کی ہے۔ ریاستی اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے اور ہر روز

تھوڑے بہت کانگریسی امیدواروں کے ناموں کا اعلان ہوتا۔ جس دن میں قومی آواز میں Apprentice سب ایڈیٹر کی حیثیت سے پہلی بار گیا، اسی دن تھا کہ ہرگووند سنگھ نے اپنی جگہ پر کسی اور کو ٹکٹ دیے جانے کے خلاف بطور احتجاج پارٹی سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس واقعے سے متعلق دو خبریں مجھے دے دی گئیں۔ ان دنوں خبریں اردو میں آتی تھیں نہ ہندی میں اور یو۔ پی۔ آئی (یونائیٹڈ پریس آف انڈیا) نام کی صرف ایک نیوز ایجنسی سارے ملک کو انگریزی میں خبریں فراہم کرتی تھی، چنانچہ اردو اخبار میں کام کرنا انگریزی سے واقفیت اور ترجمے کی صلاحیت کا امتحان بھی ہوتا۔ ایک بات اور بھی تھی۔ اردو اور ہندی اخباروں میں کام کرنے والے کو پِتّہ ماری کا عادی ہونا ضروری تھا کیوں کہ ان دنوں آج کے مقابلے میں کسی قدر مشکل انگریزی کا رواج تھا اور اردو کی حد تک صحتِ زبان کے سلسلے میں اخبار پڑھنے والوں کے مطالبات آج سے کہیں زیادہ ہوتے۔ قومی آواز میں تو زبان و بیان کی غلطی پر کبھی کبھی مولانا آزاد تک حیات اللہ انصاری کو خط لکھ دیتے تھے۔

میں نے دونوں خبروں کا ترجمہ بہت محنت سے کیا اور سرخی لگا کر کاپی مسیح الحسن رضوی کو دے دی۔ سرخی دیکھ کر وہ مسکرائے تھے لیکن اس مسکراہٹ کا راز اگلے دن کھلا جب ان دونوں خبروں کی سرخیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ میری دی ہوئی سرخی تو شاید آٹھ کالموں میں بھی نہ سما پاتی۔ ترجمے کی غلطیاں بھی درست کی گئی تھیں لیکن اس کی نوبت کم کم ہی آئی تھی۔ دو دن بعد منظر سلیم نے مجھ سے کہا عشرت صاحب کہہ رہے تھے زیادہ تعریف نہ کرنا ورنہ دماغ خراب ہو جائے گا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ بات عشرت علی صدیقی کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ ان دنوں واضح الفاظ میں میرے کام کی تعریف و توصیف تو کسی نے نہ کی لیکن مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ محمد حسن قدوائی اور مسیح الحسن رضوی میرے کام سے خاصے مطمئن ہیں۔ تاہم بعد میں نو آموز کار کی حیثیت سے میرا تین مہینے کا تقرر مزید تین ماہ کے لیے بڑھا دیا گیا۔ اس کے معنی میں نے یہ نکالے کہ میرے کام میں کم سے کم ایک آنچ کی کسر ضرور ہے چنانچہ زیادہ محنت سے کام کرنے لگا اور مزید تین مہینے کی مدت پوری ہونے کے لیے ایک ایک دن کا انتظار۔ یہ تین مہینے پورے ہوئے تو ایک پریشان کن صورت حال پیدا ہو گئی۔ میرے دوست اور پارٹی کے ساتھی نجم الحسن بھی اس جگہ کے لیے امیدوار ہو گئے۔ نجم الحسن کا امیدوار کی حیثیت سے سامنے آنا تھا کہ میرے ایک حامی کسی قدر غیر جانب داری کا مظاہرہ کرنے لگے۔ اب منظر سلیم کے علاوہ دفتر میں کوئی بھی کھلے عام میرا حمایتی نہ رہ گیا۔ اس وقت کرنل

بشیر حسین زیدی ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین تھے۔

یہ صورت ظاہر ہے میرے لیے پریشان کن تھی کیوں کہ اسّی روپوں کی ملازمت اور سو روپوں کے اسلم رضوی کے یہاں کے ٹیوشن پر چار زندگیوں... بیوہ ماں، دو چھوٹے بھائی بہن، اور میری بنیادی ضرورتوں کا انحصار تھا۔ میں مہینے میں ریڈیو کے پندرہ روپوں کے ایک آدھ پروگرام اور ''آجکل'' یا ''نیادور'' سے کبھی کبھی پچیس تیس روپے کما لیتا۔ سلائی کڑھائی سے امّاں کی بھی کچھ نہ کچھ یافت ہو جاتی۔ لیکن اس طرح کہیں گھر گرہستی چلتی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ اور ئی میں امّاں جس مکان میں رہتی ہیں وہاں سے ہم لوگوں کے تینوں مکان ایک فرلانگ بھی نہیں تھے۔ وہ کبھی ادھر سے گذرتی ہوں گی تو ان مکانوں کو دیکھ کر ان پر کیا بیت نہ جاتی ہوگی۔ صبح شام اسی ادھیڑ بن میں گذر رہے تھے کہ ایک دن حیات اللہ انصاری نے بلایا اور کہا۔

''اب دو امیدوار ہو گئے ہیں۔ آپ دونوں کا مقابلہ ہو جائے۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا سا مسکرائے۔

''میں کسی مقابلے میں نہیں بیٹھوں گا،'' میں نے کہا۔

''کیوں، کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟''

''جی نہیں'' میں نے کہا۔ ''ڈرتا نہیں لیکن ایک تو انجمل میرے دوست ہیں اور دوسرے یہ کہ میری چھوٹی موٹی ادبی حیثیت ہے (اللہ اللہ، کیا کیا خوش فہمیاں تھیں ان دنوں) اور آپ کسی دباؤ یا مصلحت کے تحت انھیں لینے پر مجبور ہو گئے تو کہیں گے یہی کہ وہ بہتر صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ میں آپ کو اس کا موقع نہیں دینا چاہتا''۔

جملہ بے حد سخت تھا اور اس عمر ہی میں ممکن تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حیات اللہ انصاری میرے اس جواب کے بعد اپنی فراگ چیئر پر نیم دراز ہو گئے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ کرسی کے چوڑے ہتھے پر تھا جس پر پیڈ رکھ کر وہ اداریہ لکھتے تھے اور دوسرا پیشانی پر۔ انھوں نے مجھ سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

''آپ کام کرتے رہیے، میں بعد میں بتاؤں گا۔''

اور انھوں نے اسی دن کسی مقابلے کے بغیر میری ملازمت مستقل کر دی۔

اگر چہ مجھے یقین تھا کہ تقرر میرا ہی ہوگا لیکن میں چھے مہینے کی نو آموز کاری اور پانچ سال تک یونیورسٹی کی نامہ نگاری کے بعد کسی ایسے شخص سے مقابلے کے لیے تیار نہ تھا جسے اخبار

میں کام کرنے کا ایک دن کا بھی تجربہ نہ ہو... پھر بھی میں نے سوچا تھا میرے موافق فیصلے میں تین چیزیں حائل ہوسکتی تھیں۔ کرنل زیدی کی نجم الحسن کو حمایت، ایک موقعے پر لٹریسی ہاؤس کی ملازمت کی حیات اللہ انصاری کی پیش کش قبول کرنے سے میرا انکار اور ایک غیر متعلق لیکن دلچسپ واقعہ...اب وہ واقعہ سن لیجیے۔

سلطانہ حیات کی تجویز

ایک دن حیات اللہ صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور سلطانہ حیات صاحبہ کی جانب، جو وہاں موجود تھیں، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کے لیے ایک تجویز لے کر آئی ہیں۔ ایک آدھ دن میں کسی وقت گھر تشریف لائیے۔"

تجویز کے معنی بالکل نہ سمجھنے کے باوجود میں نے فوراً ہامی بھر لی تھی، یوں بھی، کیا کوئی نو آموز کار اس وقت "تجویز" کے معنی پوچھ سکتا تھا؟ خیر، منگل کا دن مقرر ہوا۔ میں پہنچا تو سلطانہ حیات کو کچھ زیادہ ہی مہربان پایا۔ تھوڑی دیر میں ناشتہ آ گیا۔ چائے، بسکٹ اور خشک و تر میوے اور اس سب کے ساتھ ایک کالی سی خاتون جو کھادی کے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ تعارف ہوا۔ شکل وصورت اور باقی باتیں تو یاد ہیں لیکن نام بالکل بھول گیا ہوں۔ مراد آباد کی رہنے والی تھیں... بجز کانگریسی اور گاندھی جی کی زبردست بھگت۔ بتایا گیا کہ ایم۔ ایل۔ سی ہونے والی ہیں جو وہ نہیں ہوئیں، ممکن ہے یہ بات کچھ اس قسم کی رہی ہوگی جیسی ایسے موقعوں پر کی جاتی ہیں اور اکثر صورتوں میں جھوٹی ہوتی ہیں۔

حیات اللہ انصاری کے نظر باغ کے مکان میں داخل ہوتے وقت بھی مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ "تجویز" کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں۔

میں گاندھی جی کی عظمت کا تو قائل تھا، کسی ماڈرن گاندھی وادی کے ماتحت کام بھی کرسکتا تھا لیکن کسی کھدر پوش گاندھی وادی خاتون کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی میرے لیے محال تھا۔ چنانچہ آغاز ہی حرف اختلاف سے ہوا۔ انھوں نے عدم تشدد کا راگ الاپا تو میں نے طبقاتی جدوجہد کا اور سلطانہ حیات کی صورت ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم والی ہوگئی۔ بات بننے کے بجائے بگڑتی جارہی تھی۔ آخر انھوں نے ایک صورت نکالی۔ بولیں۔

"آج تو تمھارا آف ہوتا ہے نا! انھوں نے لکھنؤ کا زو نہیں دیکھا ہے، ذکر بھی کر رہی تھیں۔ ایسا کرو تم انھیں لے جا کر زو دکھا لاؤ۔"

"لیکن سلطانہ آپا،" میں نے گویا مذاق میں کہا، "اور زو کے جانور ہمیں دیکھنے کے لیے اپنے اپنے کٹہروں سے نکل پڑے تو کیا ہوگا؟"

میری بات سن کر سلطانہ آپا برا سا منہ بنا کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں لیکن ظاہر انھوں نے یہی کیا جیسے انھیں کوئی کام یکا یک یاد آ گیا ہو۔

اب اکھاڑے میں صرف دو پہلوان تھے اور کشتی اس حد تک غیر دلچسپ ہوگئی کہ ہم دونوں نے نہایت سنجیدگی سے گاندھی واد کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔

اردو، اہنسا، دھرم، عدم تشدد کی اخلاقیات اور مذہب کی جانب گاندھی جی کے رویے سے ہوتے ہوئے بحث اس قدر نازک موڑ پر پہنچ گئی کہ میں نے یکا یک پوچھ لیا۔

"اچھا یہ بتایئے کہ گاندھی جی جنت میں جائیں گے یا دوزخ میں"۔

یہ ایک بہت مشکل سوال تھا۔ وہ بی بی اس قدر مذہبی اور پنج وقتہ نمازی تھیں کہ گاندھی جی کو جنت میں بھیج نہیں سکتی تھیں کہ وہ کلمہ گو تو تھے نہیں اور گاندھی جی اور دوزخ...آپ بھی کمال کرتے ہیں... پھر میں نے ہر فیصلہ اس سوال کے اطمینان بخش جواب پر چھوڑ دیا اور ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے۔

متین صاحب

میرا خیال تھا کہ سلطانہ حیات نے یہ واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر "تاتی[1]" کو بتایا ہوگا اور وہ مجھ سے سخت ناراض ہوں گے، لیکن حیات اللہ انصاری اس طرح کی باتوں سے بلند تھے۔ وہ گاندھی وادی ضرور تھے لیکن عقل و خرد کے پیمانے بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

قومی آواز میں کام میں نے سیکھا محمد حسن قدوائی، مسیح الحسن رضوی اور منظر سلیم سے۔ محمد حسن قدوائی صحافت کو چیلنج کے طور پر لیتے، مسیح الحسن رضوی اس پر حاوی ہونے کے قائل تھے اور منظر سلیم اسے بس پیشہ گردانتے اور بطور پیشہ اس کے سارے مطالبات پورے کرتے۔ مسیح الحسن کی سرخیاں لوگوں کو خبر پڑھنے پر مجبور کرتیں، محمد حسن قدوائی کے ترجمے سے انگریزی زبان کے

۱۔ حیات اللہ صاحب کو سلطانہ حیات گھر میں "تاتی" کہتی تھیں۔

واقف کار یہ پتا لگا لیتے کہ یہ بات اصلاً کن الفاظ میں ادا کی گئی ہوگی اور منظر سلیم کے ایڈیشن میں ایک شاعرانہ انداز ہوتا۔ مجیب سہالوی بھی خاصے سینیئر تھے لیکن ان کی شفٹ میں کبھی کسی کام کے سلسلے میں ذرا جلدی جانا چاہتا تو وہ کہتے ''دیکھ لو کام پورا ہوگیا؟'' میں اشتہارات، تصاویر اور ڈاک ایڈیشن کے ان صفحات سے ہوتا ہوا جو رات کے ایڈیشن میں کھولنے ہوتے اس وقت تک کا کام جوڑ کر انھیں بتاتا کہ اب خبروں کی ضرورت نہیں ہے تو وہ مسکرا کر شکایت بس یہ کرتے کہ تم حساب اشتہاروں سے کیوں شروع کرتے ہو۔ یعنی یہ کہ اخبار بھر جانا ہی کافی ہے، تازہ خبریں تو اگلے دن بھی جا سکتی ہیں۔

ایک تھے متین صاحب۔ تعلق تو ان کا شعبۂ پروف ریڈنگ سے تھا لیکن حیات اللہ صاحب کو یہ یقین دلا کر کہ وہ پاکستان جا رہے ہیں اور لوٹ کے نہ آئیں گے سب ایڈیٹر بن گئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ سب ایڈیٹر کا سرٹیفکٹ لے کر جاؤں گا تو وہاں کسی اخبار میں ملازمت آسانی سے مل جائے گی۔ چنانچہ وہ سب ایڈیٹر کی حیثیت سے پاکستان گئے اور خالی ہاتھ واپس آ کر قومی آواز میں مستقل سب ایڈیٹر ہو گئے۔ اس طرح انھوں نے پارکنس لا کو بھی شکست دے دی۔ اس قانون کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

بال پین ان دنوں چلن میں نہ آئے تھے اور دفتروں میں قلم دوات ہی سے کام چلایا جاتا۔ مدار بخش نب، قلم دوات دھوتے اور میز پر سجاتے لیکن متین صاحب کی دوات کو جانے کیا ہوتا کہ وہ بائیں جانب کھسک جاتی اور اگرچہ اس میں روشنائی پہلے کی طرح بھری رہتی۔ دراصل انھیں میرے داہنی طرف رکھی ہوئی دوات میں قلم ڈبونا پڑتا۔ میں احتجاج کرتا کہ عشرت صاحب کہتے ہیں تمھاری دوات کی سیاہی اتنی جلدی سوکھ جاتی ہے جب کہ متین صاحب کی روشنائی ویسی کی ویسی رہتی ہے تو وہ اپنا غیر مسلح کر دینے والا رخِ زیبا میری طرف کر دیتے اور سامنے اس کے کوئی بات بنائی نہ گئی والی صورت پیدا ہو جاتی۔

بات یہ تھی کہ متین صاحب کو Cow has four legs ایسے جملوں کے بھی معنی پوچھنے پڑتے اور پھر یہ کہنا ہوتا کہ ''میں بھی یہی لکھنے جا رہا تھا'' اور ان کے لیے دفتر میں لے دے کے نرم چارہ میں ہی تھا کہ قیصر تمکین ان کی بات کا جواب تک نہ دیتے اور باقی سب ان سے بہت سینیئر تھے۔

پاکستان سے واپس آنے کے بعد متین صاحب اپنا یہ دعوا بار بار دہراتے کہ جعفری

(پورا نام بھول گیا) انھیں اپنے ماہنامہ ''سائکالوجی'' کا نائب مدیر بنا رہے تھے لیکن وہ لکھنؤ اور قومی آواز کی محبت میں لوٹ آئے۔ یہ بات سنتے سنتے کان پک گئے تو میں نے ایک دن ان سے کہا۔

''متین صاحب آپ Psychology کی Spelling بتا دیں تو میں آپ کی بات مان لوں گا۔''

تھی تو یہ بات نامناسب لیکن مجبوری انسان سے کیا نہیں کراتی۔ اس دن کے بعد متین صاحب نے ماہنامہ ''سائکالوجی'' کا نام بھی نہیں لیا۔

لیکن متین صاحب میں ایک بڑی خوبی تھی۔ وہ جو سوچ لیتے اسے کر کے چھوڑتے اور کسی کی بات ماننا کسرِ شان سمجھتے۔ عشرت صاحب کہہ کہہ کے تھک گئے کہ مہلوک کوئی لفظ نہیں ہے لیکن انھوں نے اسے اردو صحافت کو قومی آواز کا ''تحفہ'' بنا کے چھوڑا۔ اور ایک بار تو انھوں نے غضب ہی کر دیا۔ شاہجہاں پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تو وہاں کے نمائندے نے رپورٹ بھیجی کہ فلاں فلاں پارٹی کا لیڈر برقعہ پہن کر اپنے گھر سے بھاگ گیا۔ عشرت علی صدیقی نے نہ صرف یہ کہ خبر میں نام نہ دینے کی واضح الفاظ میں ہدایت کی بلکہ اس کا نام کاٹ بھی دیا۔ لیکن متین صاحب اور کسی کی بات مان لیں! انھوں نے خبر دوبارہ لکھی اور اس لیڈر کا نام بھی شامل کر لیا۔

اگلے دن عشرت صاحب نے اخبار میں خبر دیکھی تو سر پیٹ لیا لیکن اب کیا ہی کیا جا سکتا تھا۔ سانپ نکل چکا تھا، لکیر پیٹنے سے حاصل۔

چھے سات دن بعد شاہجہانپور سے اس لیڈر کے وکیل کا نوٹس موصول ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ خبر کی تردید اور معافی نامہ تین دنوں تک مسلسل صفحہ اوّل پر شائع کیا جائے ورنہ ہتک عزّت کا مقدمہ دائر کر دیا جائے گا۔ حیات اللہ انصاری نے جواب تو کوئی نہیں دیا لیکن فون پر وکیل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسے معاملوں میں تردید اسی جگہ شائع کی جاتی ہے جہاں خبر شائع ہوئی ہو مگر وہ اپنی بات سے ٹس سے مس نہ ہوا اور مقرّرہ مدّت گذر جانے کے بعد اس نے باقاعدہ مقدمہ دائر کر دیا۔ پہلی پیشی میں حیات اللہ صاحب خود شاہجہاں پور گئے اور انھوں نے متعلقہ شخص اور اس کے وکیل کو منانے کی بہت کوشش کی لیکن انھیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد پکار ہوئی تو حیات اللہ انصاری نے ان سے کہا اب تک تو ہم غلطی تسلیم کر کے تردید شائع کرنے کے لیے تیار تھے لیکن اب عدالت میں یہی ثابت کریں گے کہ واقعہ سچا ہے اور یہ مہاشے واقعی برقع

پہن کرفرار ہوئے تھے۔ اس دھمکی سے مدعی اور اس کے وکیل کے پسینے چھوٹ گئے اور یہ سوچ کر کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں انھوں نے مقدمہ واپس لے لیا۔ قومی آواز میں تردید تک شائع نہ ہوئی۔

برسات کے دنوں میں ایک خبر میں It rained in cats and dogs کا فقرہ استعمال ہوا تھا، سب ایڈیٹر نے خبر تو خبر سرخی میں بھی کتے بلّیاں برسا دیں اور شفٹ انچارج چونکہ وہی تھے اس لیے غلطی کسی سطح پر پکڑی نہ جا سکی۔ رات میں تین بجے انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بھاگے بھاگے دفتر آئے لیکن اس وقت تک اخبار کی طباعت شروع ہو چکی تھی۔

آفسیٹ کی طباعت کا اس وقت تک آغاز نہیں ہوا تھا اور قومی آواز لیتھو کی جس مشین پر شائع ہوتا تھا وہ اس کی اپنی خریدی ہوئی نہیں تھی۔ دراصل مشہور خوردنی تمباکو (احمد حسین دلدار حسین) کے کارخانے کے اس وقت کے مالک احمد حسن کو صحافت سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اردو کا ایک اخبار نکالنا چاہتے تھے۔ انھوں نے وکٹوریہ اسٹریٹ پر اس جگہ جہاں سڑک اکبری گیٹ کی طرف مڑتی ہے اخبار کے دفتر کے لیے ایک نہایت عمدہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔ لیکن اخبار کی اشاعت میں کسی سبب تاخیر ہوئی اور اس دوران قومی آواز کی ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو رفیع احمد قدوائی احمد حسن صاحب سے یہ مشین لے آئے۔ یہ مشین جرمنی سے منگائی گئی تھی۔

یہ تو خیر ایک جملہ بلکہ پیراگراف معترضہ تھا، اصل میں ذکر ہو رہا تھا اخبار میں غلطیوں کا۔ صحافتی تحریر کو لٹریچر ان اے ہری (Literature in a hurry) بھی کہا جاتا ہے۔ یہی بات لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایچ۔ کے۔ اوستھی کے چھوٹے بھائی رام کرشن اوستھی جو نیشنل ہیرالڈ میں سب ایڈیٹر تھے یوں کہا کرتے، ''اخبار نکالتے ہیں کوئی گیتا قرآن تو لکھتے نہیں۔'' چلپت راؤ یہ تو تسلیم کرتے تھے کہ اخبار میں صرف پوسٹ مارٹم ممکن ہے لیکن وہ بہ اصرار کہتے تھے کہ کسی کو وہی غلطی دوسری بار نہیں کرنی چاہیے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ غلطیاں صرف اردو کے اخباروں میں ہوتی ہیں۔ جی نہیں، انگریزی کے اخبار بھی ان سے مبرّا نہیں ہوتے۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی کوشش یہی کی جاتی ہے کہ الفاظ بار بار اور قریب قریب نہ دہرائے جائیں۔ ایک غلطی یہی ''سقم'' دور کرنے کی کوشش میں ہو گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک خبر یوں شروع ہوئی تھی Half a league, half a

league, half a league onward ۔ایک انگریزی اخبار کے سب ایڈیٹر نے سوچا کہ ایک نقرہ میں Half a league کا تین بار استعمال کسی طرح مناسب نہیں چنانچہ اس نے اسے One and a half league onward کردیا۔

کوٹایم فائرنگ

کیرالا میں دنیا کی پہلی جمہوری طور پر منتخب کمیونسٹ حکومت کے خلاف تحریک زور و شور سے جاری تھی اور ہر روز فائرنگ اور لاٹھی چارج کی نوبت آجاتی۔ انھی دنوں ایک رات کچھ ایسا ہوا کہ سینیئر لوگوں نے چھٹی لے لی اور تن تنہا اخبار نکالنے کی ذمے داری مجھ پر آن پڑی۔ اس رات میں نے ایک نہایت ''شاندار'' سرخی لگائی اور وہ بھی سہ کالمہ اور صفحہ اوّل پر۔ سرخی یہ تھی:

''کوٹایم فائرنگ میں ہلاک ہونے والا چل بسا۔''

اس غلطی پر عشرت علی صدیقی نے ڈانٹ پلائی تھی، سخت ڈانٹ۔ یہ کام وہی کرتے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ قومی آواز سے میرے تعلق کے دوران حیات اللہ انصاری نے ادارتی یا پروف ریڈنگ کے عملے کے کسی رکن کو اس کی غلطی کی طرف متوجہ بھی کیا ہو۔ اس طرح کے کام ان کے لیے بہت چھوٹے تھے۔ وہ قومی آواز کے فلاسفر ایڈیٹر تھے۔ وہ اخبار کی پالیسی طے کرتے، ترجمے کے اصول بناتے۔ اس پالیسی پر عمل درآمد ہم لوگ کرتے۔ اپنی غلطی پر بھی وہ زیادہ توجہ نہ دیتے اور ہیڈ پروف ریڈر نصیر ناطقی تک سے اسے درست کرنے کی توقع رکھتے۔

اپنے ایک اداریہ میں انھوں نے کسی ندی کو خلیج بنگال میں گرادیا تھا۔ شاعر اور صاف گو پروف ریڈر نصیر ناطقی نے ٹیلی فون کرکے ان سے کہا کہ یہ ندی خلیج بنگال میں نہیں گرتی تو انھوں نے کہا بحرِ عرب میں گرادیجیے۔ یہ سن کر نصیر ناطقی نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا کہ بحرِ عرب میں بھی نہیں گرتی۔ نصیر ناطقی کا جواب سن کر انھوں نے نہایت نرم لہجے میں کہا، ''تو جہاں گرتی ہے وہاں گرادیجیے''۔ اصل میں وہ ندی کسی دوسری ندی میں مل کر آگے کا سفر طے کرتی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ انھوں نے اگلے دن یہ بھی دیکھا ہوگا کہ وہ ندی کہیں گری یا اب بھی اداریہ میں ہی راستہ تلاش کر رہی ہے۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ قومی آواز کے ادارتی اور انتظامی امور سے بالکل بے نیاز رہتے۔ شعبۂ ادارت کے کمرے سے کاتب حضرات کے کمرے میں خبریں بھیجنے میں کبھی کبھی

دیر ہو جاتی۔ ہر ڈیوٹی میں چپراسی ایک ہی ہوتا اور اسے چائے یا سگریٹ وغیرہ لانے کے لیے بھیج دیا جاتا تو دفتر کے کاموں میں تاخیر ہوتی۔ اس تاخیر سے نمٹنے کے لیے انھوں نے شعبۂ ادارت اور کاتبوں کے کمرے کے درمیان دیوار سے لگی لگی چار پہیوں کی ایک چھوٹی سی گاڑی بنوائی تھی جس کے چھوٹے چھوٹے پہیے گاڑی کو ہلکا سا دھکا دینے سے اسے شعبۂ ادارت کے کمرے سے کاتبوں کے کمرے میں پہنچا دیتے اور اس طرح خبریں چپراسی کے انتظار کی محتاج نہ رہ جاتیں۔ چار چھے مہینے کے بعد یہ گاڑی خراب ہوگئی اور پھر اس کا کیا ہوا نہیں معلوم۔

کوئی حریف اخبار نہ ہونے کے باوجود حیات اللہ انصاری چاہتے تھے کہ بارہ ساڑھے بارہ بجے رات تک کی ہر اہم خبر صبح کے اخبار میں ضرور موجود ہو۔ اسے یقینی بنانے کے لیے انھوں نے بڑا خوبصورت طریقہ نکالا تھا۔ ان دنوں نیوز ایجنسی سے غالباً ایک بجے رات کو ''نیو یارک ٹائمز'' آتا تھا۔ انھوں نے عشرت صاحب سے کہا کہ یہ خبر ٹیلی پرنٹر سے پھاڑ کر ان کی میز پر رات ہی میں رکھا دیا کیجیے۔ لیجیے کام ہو گیا۔

حیات اللہ انصاری تین ہفتے کے لیے مصر کے دورے پر گئے۔ واپس آنے کے بعد انھوں نے مصر کے سیاسی اور سماجی حالات اور وہاں کی معاشرتی زندگی پر ایک طویل مضمون کی پہلی قسط لکھی۔ اسی دن حاضری کا رجسٹر سامنے آیا تو اس میں تقریباً ایک مہینے کی تاریخیں خالی پڑی تھیں۔ انھوں نے قلم اٹھایا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک دستخط کر دیے۔ متعلقہ کلرک نے اماشنکر دکشت کو جو ان دنوں مینیجنگ ڈائرکٹر تھے اس سلسلے میں مطلع کیا تو انھوں نے صرف یہ کہا کہ حیات اللہ صاحب کو دکھا دینا، شاید بھولے سے دستخط کر دیے ہوں۔ متعلقہ کلرک نے ڈرتے ڈرتے انھیں متوجہ کیا تو انھوں نے کہا: ''میں رہوں کہیں بھی، ذہنی طور پر قومی آواز ہی میں موجود رہتا ہوں۔'' ان کے اس جملے سے سارا معاملہ ختم ہو گیا۔

قومی آواز اور نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر اپنے اخبار کے بادشاہ ہوتے تھے۔ میں نے اماشنکر دکشت کے کمرے کا رخ کیے ہوئے نہ کبھی حیات اللہ کو دیکھا نہ چلپت راؤ کو۔

ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں

ایک دن حیات اللہ اپنے کمرے میں بظاہر بالکل بیکار بیٹھے تھے، یعنی کوئی کام کرتے ہوئے نظر نہ آ رہے تھے۔ اتنے میں اماشنکر دیکشت کا چپراسی آیا، اس پیغام کے ساتھ کہ صاحب

نے سلام کہا ہے۔ جواب ملا کہہ دو ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں۔ یہی دوسرے دن بھی ہوا اور پھر تیسرے دن بھی۔ دیکشت جی سمجھ گئے، خود ہی آئے اور ہنستے ہوئے بولے۔

''دہلی سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کو راجیہ سبھا کی رکنیت پر کوئی اعتراض تو نہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات ابھی سے موضوع گفتگو بنے اور اب تو کاغذات بھی آ گئے ہیں۔ دستخط کر دیجیے۔''

انھوں نے شیروانی سے کاغذات نکال کر حیات اللہ انصاری کی طرف بڑھا دیے جس پر انھوں نے فوراً دستخط کر دیے اور یہ بھی نہیں دیکھا کہ راجیہ سبھا کی ممبری کے نامزدگی کے کاغذات ہیں یا قتل کے ملزم کا اقبالی بیان۔

مجھے نہیں یاد کہ انھوں نے شعبۂ ادارت کے کسی رکن کی کبھی سرزنش کی ہو لیکن وہ تعریف ضرور کرتے تھے اور ہمیشہ کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر۔ میرے پاس اس طرح کے تین دوسطری پرچے تھے لیکن اب صرف ایک رہ گیا ہے۔

۱۳ راگست ۱۹۵۹ء کے خط میں وہ لکھتے ہیں۔

عابد سہیل صاحب

اخبار آپ نے اچھا نکال دیا۔ سرخیاں خوب ہیں۔

اور حلقوں کی سرخیاں تو بہت ہی خوب۔

حیات اللہ

۱۳ راگست ۱۹۵۹ء[1]

حلقوں کی سرخیوں کے ذکر پر خیال ہوتا ہے کہ ان دنوں روس اور امریکا کی سرد جنگ، گرم جنگ کے دہانے پر پہنچ گئی تھی اور ہر وقت ڈر لگا رہتا کہ تیسری عالمی جنگ معلوم نہیں کس وقت پھوٹ پڑے۔ انھی دنوں جاپان کی لڑکیوں نے اپنے بالوں کی ایک ایک لٹ تراش کر دونوں ملکوں کے سربراہانِ حکومت کو بھیجتے ہوئے ان سے امن قائم رکھنے کی اپیل کی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ خبر حلقہ میں صفحۂ اوّل پر اس سرخی کے ساتھ دی تھی:

ہے کافی زلف کا سایہ ہی آشتی کے لیے

ہوا یہ تھا کہ رات کی شفٹ میں محمد حسن قدوائی کی اتفاقی رخصت اور ایک سب ایڈیٹر

۱۔ حیات اللہ انصاری کے خط کی عکسی نقل کے لیے دیکھیے آخر کے صفحات۔

کے یکا یک بیمار پڑ جانے سے میں تنہا رہ گیا تھا۔ میں نے حیات اللہ صاحب کو جو اُن دنوں دفتر کے قریب ہی نظر باغ میں رہتے تھے پرچہ بھیجا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ انھوں نے جواب میں لکھا میں جانتا ہوں آپ اکیلے اخبار نکال سکتے ہیں۔

میں سمجھتا تھا کہ پرچہ ملتے ہی وہ بھاگے بھاگے چلے آئیں گے۔ عشرت صاحب ہوتے تو ایک منٹ تاخیر نہ کرتے۔ جب یہ خواب دیکھ کر کہ قومی آواز میں آگ لگ گئی ہے وہ رات میں چار بجے چلے آئے تو ایک نوسکھیا کے ہاتھ میں ایڈیشن کی باگ ڈور سونپنے کے بجائے وہ اپنی نیند ضرور غارت کر دیتے۔ میرا خیال ہے کہ عشرت صاحب ان دنوں لمبی چھٹی پر تھے ورنہ حیات اللہ انصاری کو پرچہ بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

حیات اللہ انصاری نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ آپ اکیلے اخبار نکال سکتے ہیں لیکن وہ ہر گھنٹے آدھ گھنٹے بعد ''نوجیون'' کے دفتر میں فون کر کے سینئر کاتب خنداں لکھنوی کو بلاتے اور کام کی صورتِ حال دریافت کرتے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

محمد حسن قدوائی کے دفتر نہ آسکنے کی اطلاع بھی دلچسپ طریقے سے ملی تھی۔ تقریباً ۹ بجے رات میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور کہا گیا، ''آج دولھا بھائی نہیں آئیں گے''۔

میں نے پوچھا، ''کون دولھا بھائی؟''

جواب ملا، ''محمد حسن قدوائی۔''

میں نے پوچھا، ''آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟''

جواب ملا ''میں ان کا سالا بول رہا ہوں۔''

محمد حسن قدوائی کا یہ سالا خورشید کامل قدوائی تھا جو بعد میں یو۔این۔آئی (اردو) کا نیوز ایڈیٹر ہوا۔ افسوس وہ اب ہم میں نہیں۔ میں اسے یہ واقعہ اکثر یاد دلایا کرتا اور پھر ہم دونوں خوب ہنستے۔ ایک بار تو میں نے اس کی بیٹی نائلہ کو بھی سارا واقعہ سنایا تھا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی تھی۔ اس وقت خورشید حیات تھے۔ ان کے انتقال کے بعد آج پہلی بار یہ واقعہ دہرا رہا ہوں۔ نائلہ کو یاد دلاؤں تو وہ رو دے گی۔ ہمت بھی نہیں کر سکتا۔ پہلی بار جب میں نے اسے یہ واقعہ سنایا تھا وہ پائنیر میں صحافت سیکھ رہی تھی۔ یہ ۱۹۹۵ء یا اگلے سال کی بات ہے۔ میں اور ظفر جورڈن (افسوس اب جورڈن ہم میں نہیں) ان دنوں پائنیر سے متعلق تھے۔

قومی آواز کی ایک مشہور چیز جس کا ذکر شہر کے ادبی حلقوں میں بھی اکثر ہوتا پہلی منزل

پر قومی آواز کے سامنے کا چھجّا تھا جس کی شہرت بطور ''غیبت محل'' دور دور تھی۔ یہاں غیبت کے بجائے دل کی بھڑاس نکالی جاتی اور ہر اس شخص کی ٹانگ گھسیٹی جاتی جو وہاں موجود نہ ہوتا لیکن جو لوگ لذت آشنائے غیبت ہیں وہ جانتے ہیں کہ دل کی بھڑاس نکالتے وقت زبان و بیان پر قابو رکھنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

برسوں بعد ایک دن میں نے دلاور حسین صاحب سے جو ہیرالڈ میں میرے بزرگ دوست تھے ''غیبت محل'' کا ذکر کیا، بہت ہنسے پھر ایک دن شکرو پان والے کی دوکان سے واپس آتے ہوئے انھوں نے عمارت کے اس حصّے کی طرف دیکھا اور پوچھا، ''کیا نام بتایا تھا ''تبرّ المحل؟''۔ میں نے کہا ''تبرّ المحل'' نہیں ''غیبت محل''۔ کہنے لگے، ''ایک ہی بات ہے۔''

دلاور حسین مذہب کے سخت پابند تھے لیکن کسی قسم کا تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ مدح صحابہ اور تبرا ایجی ٹیشن کی رپورٹنگ انھوں نے ہی کی تھی اور پھر دونوں فریقوں نے اپنے اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مقدمے میں ان کی رپورٹ کے مختلف حصّے عدالت میں پیش کیے تھے۔

قومی آواز کی ایک اور چیز کو بھی شہرت حاصل تھی اور ہم لوگ اسے ''چگّی بازی'' کہتے۔ اسے بے ضرر جھوٹ یا White lie بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں مہارت قیصر تمکین کو حاصل تھی اور منظر سلیم ہنسنے ہنسانے کے اس کھیل میں قیصر تمکین کے ذہن رسا کے قائل تھے۔

قیصر تمکین اپنے ۲۲ر جنوری ۱۹۶۵ء کے مختصر سے خط میں لکھتے ہیں:

یا شیخ المفکرین

کیا کبھی فرصت سے ملنا، گپ لڑانا اب کی بھی قسمت میں نہیں ہے۔

مرحوم

قیصر [1]

کبھی فرصت ملتی اور قسمت یاوری کرتی اور گپ لڑانے کا موقع بھی تو چگّی بازی بھی خوب خوب ہوتی۔

چگّی بازی کا فن قومی آواز کے حدود پار کر گیا تھا اور اس فن میں کمال لطیف صدیقی، سینئر جھیلا اور یوپی کی جماعت اسلامی کے صدر، م۔ نسیم اور کئی دوسروں کو حاصل تھا۔ یہ سب قومی آواز سے براہ راست متعلق نہ ہونے کے باوجود اس سے غیر متعلق بھی نہ تھے۔

۱۔ قیصر تمکین کے خط کی فوٹو کاپی آخر کے صفحات میں دیکھیے۔

ایک دن اکبری گیٹ سے کشمیری محلّے جانے والی سڑک کے اجاڑ سے پارک کے پاس والے عثمان غنی کے گھر پر چند احباب جمع تھے۔ اتنے میں قیصر تمکین آ گئے۔ ان کے جوتے میں گوبر لگ گیا تھا اور بدبو آ رہی تھی۔ انھوں نے جوتے اتارتے ہی اس کا ذکر کیا تو لطیف صدیقی نے کہا، ''یہ بدبو جوتے کے گوبر کی نہیں بلکہ اس گوبر کی ہے جو تمھارے دماغ میں بھرا ہوا ہے۔'' سب لوگ ہنسنے لگے۔

قیصر تمکین نے عابد سہیل کے لیے ایک بات کہہ دی اور وہ چل نکلی۔

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اِک مضمون لکھا

شہر میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

انھوں نے کہا کہ ''عابد سہیل سے کسی نے پوچھا، تم نے 'اسٹریپ ٹی مائی سین' پڑھی ہے تو انھوں نے کہا، کئی بار، بے حد عمدہ ناول ہے۔''

مجھے خود بھی یہ مذاق پسند تھا۔

یہ مذاق یا چگی بازی بالکل بے بنیاد نہ تھی۔ ان دنوں عابد سہیل ٹیگور لائبریری سے چار چار موٹی موٹی کتابیں اشو کراتے، سینے سے لگائے لگائے یونیورسٹی میں گھومتے اور پھر چند روز بعد اُن پر نظر ڈالے بغیر واپس کر کے دوسری اشو کرا لیتے۔ اصل بات یہ تھی۔

چگی بازی کا دائرہ قومی آواز تک محدود نہیں رہ گیا تھا اور اس کا ایک مرکز کافی ہاؤس بھی تھا۔ مجازؔ نے کافی ہاؤس میں جبیلا کے بارے میں کہا، ''ان کی بیوی نے جو کشمیری محلّہ گرلس اسکول میں پڑھاتی تھیں جبیلا کو اسکول بس ڈرائیور کی نوکری دلا دی۔ انھوں نے پہلے ہی دن گردن پیچھے کی طرف کر کے بس چلائی تو ایکسی ڈینٹ ہوتے ہوتے بچا۔ نوکری سے نکال دیے گئے۔''

جبیلا کے والد کی لاٹوش روڈ پر لوہے کے سامان کی خاصی بڑی دوکان تھی لیکن وہ جبیلا کے اخراجات کی کفالت نہ کر سکی اور بالآخر ختم ہو گئی۔ پھر نہ جانے کہاں سے ان کے والد کی سو بیگھہ زمین نکل آئی۔ انھوں نے اس وقت کے لاکھوں روپے کا یہ خزانہ بھی حضرت گنج کے دوستوں پر کافی ہاؤس، کیورس، بلیرڈس روم، اور باروں میں لٹا دیا۔ جبیلا بلیک پرنس بھی کہلاتے تھے۔

اور م۔ نسیم نے تو کمال ہی کر دیا۔ جماعت اسلامی سے متعلق ہونے کے باوجود ان کی داڑھی بقدر ''یک مشت'' سے کم تھی۔ ان کے زیادہ تر دوست غیر مسلم تھے۔ وہ اپنی زندگی کا سب سے دلچسپ واقعہ مزے لے لے کے بیان کرتے۔ ان کی شادی کلکتہ کی ایک مشہور تجارتی کمپنی

کے مالک کے یہاں ہوئی تھی۔ وہاں انھوں نے چکّی بازی یہ کی کہ ایک بار اپنی بیوی کو جو برقع میں تھیں کیبرے دکھانے لے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ہال میں کیبرے کم اور ان کی بیوی کا برقع زیادہ دیکھتے رہے۔

میں نے کہا، ''اس دن سارا کیبرے تم نے اکیلے ہی دیکھ لیا''۔

اس جملے میں کہے بغیر جو بات کہی گئی ہے اس کا لوگوں نے خوب خوب لطف لیا۔

م۔نسیم کی شخصیت میں چکّی بازی، کشادہ قلبی اور مذہبی عدم تفریق باہم دگر آمیز ہو گئے تھے۔ م۔نسیم ہر چیز تھوک میں خریدتے، رومال چھے، موزے چھے، بنیائن چھے۔ ہندوستان میں ایمرجنسی کے دوران قیصر باغ میں ان کی دوکان پر تالا ڈال دیا گیا۔ لٹ لٹا کے امریکا پہنچے۔ اسلام نے ساتھ وہاں بھی دیا۔ یہاں لاکھوں میں کھیلتے تھے وہاں کروروں میں کھیلنے لگے۔ وہاں ان کے پاس ذاتی ہیلی کاپٹر تھا اور ہیلی پیڈ، کوٹھی کے پیچھے۔

پن چکّی

عشرت علی صدیقی کو میں نے کہیں ''پن چکّی'' لکھا ہے، جو پھک پھک کیے بغیر ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ وہ قومی آواز کی پن چکّی ہی تھے۔ ان کی میز طرح طرح کے کاغذات اور اخباروں کا ڈھیر معلوم ہوتی لیکن معلوم نہیں کیسے وہ اس میں سے اپنے کام کا کاغذ ذرا کی ذرا میں ڈھونڈھ نکالتے۔ وہ قومی آواز کے سرنامہ سے لے کر پرنٹ لائن تک ایک ایک سطر ہر روز پڑھتے، چھوٹی موٹی غلطیوں کو تو درگزر کر دیتے لیکن بڑی غلطی دیکھ کر ان کا خون کھولنے لگتا۔ دوسری مرتبہ ان کا خون اس وقت کھولتا جب وہ ''ملزم'' کی ڈانٹ پھٹکار کرتے۔ اس طرح غلطی کرنے والے کا خون ایک بار کھولتا اور ان کا دو بار اور اس پر مستزاد تھے اخبار کے سارے کام جو انھیں کرنے ہوتے۔ وہ اکثر اداریہ لکھنے کے علاوہ کاتبوں کی فاضل کارگزاری کی ایک ایک سطر گنتے۔

ایک بار مسیح صاحب نے اپنے جوتے کا سول بدلوایا، خوب پالش کی، جوتا چمک گیا۔ دفتر پہن کر آئے، کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا، کرسی سے پیر لٹکا کے کھڑے ہوئے، کسی نے توجہ ہی نہیں دی، پھر اس پر وہ چھوٹا سا ڈنڈا جو وہ رات کی ڈیوٹی سے واپسی میں کتّوں کو بھگانے کے لیے لاتے تھے دھیرے دھیرے مارا، کسی کو کیا غرض تھی کہ ادھر دیکھتا، چوٹ جوتے کو لگ رہی تھی۔ آخر تنگ آ کر بولے، ''میں نے سول بدلوایا ہے، کوئی دیکھتا ہی نہیں۔''

میں نے فوراً توجہ کی اور کہا، ''ارے یہ وہی ہے جس نے منہ کھول دیا تھا؟''
بولے، ''بالکل نیا ہوگیا ہے۔''
میں نے کہا، ''مسیح صاحب اگلی بار اپر (Upper) بدل دیجیے گا۔ نیا ہو جائے گا۔''
فوراً ہنس دیے، پھر کچھ سوچ کر خفا ہو گئے لیکن پھر اور سوچا تو ہنس دیے۔
ان دنوں جب میں ہیرالڈ میں تھا، ایک دن میں نے عشرت صاحب سے کہا، ''آپ اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔ اپنا قیمتی وقت کاتبوں کی فاضل کارگزاری کی سطریں گننے میں صرف کرتے ہیں، پان سو روپوں کا ایک آدمی رکھ لیجیے''
کچھ سوچنے لگے پھر بولے، ''اور وہ بے ایمان نکلا تو؟''
میں اپنا سا منہ لے کے رہ گیا۔
قومی آواز کی عام فضا دفتر کے بجائے ایک کنبے کی سی تھی جس میں ''خوش مزاج سنجیدگی'' کی حکمرانی رہتی۔ ہنسی مذاق بھی ہوتا۔ دوستیاں تو تھیں ہی، کبھی کبھی من مٹاؤ کی صورتیں بھی نکل آتیں لیکن ان کی حیثیت گرم ہوا کے ایک جھونکے سے زیادہ نہ ہوتی، جو آتا اور نکل جاتا۔ پھر احمد جمال پاشا کی آمد کے بعد اس فضا میں مسکراہٹیں گھل گئیں اور کبھی کبھی قہقہے بھی سنائی پڑنے لگے، خاص طور سے اس وقت جب عشرت صاحب حیات اللہ انصاری کے کمرے میں نماز پڑھ رہے ہوتے۔
ایک دن جمال دفتر میں آئے، منہ بسورے ہوئے۔ ہر ایک کو حیرت ہوئی کہ کل تک تو اچھے خاصے تھے، ایک دن میں کیا ہوگیا۔ بولے، ''ابا کا انتقال ہوگیا''۔ ماحول ذرا کی ذرا میں سنجیدہ ہوگیا۔ کوئی کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ بول اٹھے، ''مسیح صاحب ایسے میں کیا کیا جاتا ہے؟ میرا پہلا پہلا تجربہ ہے۔''
سب لوگ ہنس دیے۔
میں نے کہا، ''چلو اچھا ہوا۔ تجربہ اگلی بار کام آئے گا۔''
سب لوگ پھر ہنس دیے۔ ان میں جمال بھی شامل تھے۔
یوں تو قومی آواز سے ملنے والے اسّی روپوں سے زندگی کے بہت سے کام نکلتے تھے لیکن اس سے تعلق کی نوعیت محض معاشی کبھی نہ تھی۔ یہ روزنامہ اپنے سارے متعلقین کی زندگی کا حصہ تھا اور اخبار کے ادارے کی ساری کمیونسٹ دشمنی کے باوجود، ایک ایسا فکری کنبہ بھی جس کی

حاوی لَے ترقی پسندی تھی۔

قومی آواز کے اداریوں سے سارے پڑھنے والے متفق نہ ہوتے لیکن حیات اللہ انصاری کو برا بھلا کہتے رہنے کے باوجود ہر روز اسے پڑھتے ضرور۔ یہ اخبار اپنے ادارتی عملے کے بعض ارکان اور ان کے تخلیقی کاموں سے بھی پہچانا جاتا۔ حیات اللہ انصاری، رضا انصاری، مسیح الحسن رضوی، منظر سلیم، احمد جمال پاشا، اور قیصر تمکین وغیرہ ایسے نام تھے جو اپنی ادبی حیثیت کی بنا پر کم سے کم ہندو پاک کی اردو دنیا میں جانے مانے جاتے، اگر چہ قومی آواز سے تعلق بھی ان کی ایک بڑی شناخت تھا۔

حیات اللہ انصاری کو عمر عزیز کے ساٹھ سال پورے کرنے کے بعد سبکدوشی کے بجائے ملازمت میں ایک سال کی توسیع ملی تو ظاہر ہے کچھ لوگوں کو مایوسی ہوئی لیکن انھیں جوں ہی اس کا علم ہوا انھوں نے مستعفی ہوجانے میں ایک لمحہ کی دیر نہ کی اور ادارے کے ایک ایک فرد سے خوشگوار رشتے ساری زندگی قائم رکھے۔ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا گیا تو وہ ادارتی عملہ کو مبارکباد دینے خود دفتر آئے جب کہ کیا خوب ہوتا کہ مبارک باد دینے ہم سب ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتے کہ یہ لڑائی قومی آواز نے ان کی قیادت ہی میں لڑی تھی۔

میں قومی آواز سے باقاعدہ طور پر چار سال متعلق رہا اور یونیورسٹی میں اعزازی نامہ نگاری کے چھے سال بھی جوڑ لیے جائیں تو یہ مدت دس سال ہوجاتی ہے لیکن حیات اللہ انصاری کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے دس برسوں کے ماتحت اور حاکمِ اعلیٰ کے رشتے کو، میرے نیشنل ہیرالڈ میں منتقل ہوتے ہی، دوستانہ تعلقات کی نوعیت بخش دی۔ یہ کام وہی کر سکتے تھے ورنہ کہاں حیات اللہ انصاری، کہاں عابد سہیل۔

۱۹۸۲ء میں ان کا مشہور ناول ''گھروندا'' شائع ہوا تو انھوں نے نہ صرف اس کا پہلا نسخہ عنایت کیا بلکہ ایک مختصری تحریر سے اسے میرے لیے باعثِ افتخار بنا دیا، انھوں نے لکھا:

> پہلا نسخہ
>
> اپنے پرانے دوست، قومی آواز کے ساتھی، جرنلسٹ اور ادیب
> عابد سہیل کے نذر کرتا ہوں۔
>
> حیات اللہ انصاری
> ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۲ء!

حیات اللہ انصاری نے ''لہو کے پھول'' کا مکمل سیٹ بھی عنایت کیا تھا۔ لیکن لوگ

ایک ایک جلد مطالعے کے لیے لے گئے اور وہ تبرک ہوگیا۔ یہ کتاب بھی انھوں نے بڑی محبت سے دی تھی۔ لیکن یہ قطعی نہیں یاد آ رہا ہے کہ انھوں نے اس پر لکھا کیا تھا اور میں قیاس کے گھوڑے دوڑانا نہیں چاہتا۔

پھر ۱۹۸۹ء میں میرے ایک خط کے جواب میں انھوں نے لکھا:

حیات اللہ انصاری (حکومت ہند کا مونوگرام) ۲۴۔۲۵ ویسٹرن کورٹ

جن پتھ۔ نئی دہلی

Member of Parliament

(Rajy Sabha)

(مورخہ ۹/۶/۱۹۸۹ء)

مکرمی عابد صاحب السلام علیکم

آپ نے اتنی محبت، اتنی محبت کا خط لکھا کہ دل باغ باغ ہوگیا۔ آپ کا واسطہ ہے اس لیے توقع ہے کہ اُدھر سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور اب ہم لوگ نقصان کی سطح سے کافی بلند بھی ہوگئے ہیں اور بات بھی پرانی ہوگئی ہے۔ اس کو بھول جایئے۔

پندرہ روزہ "سچ رنگ" کا نقشہ ابھی تک بنا نہیں ہے۔ کیا طباعت دہلی میں ہو اور کتابت لکھنؤ میں... اس چکر میں ہوں۔

لکھنؤ آنے والا ہوں۔ آ کر ملوں گا۔

والسلام

حیات اللہ انصاری[۲]

اُدھر کدھر تھا؟

ذہن پر بہت زور ڈالتا ہوں کہ یہ "اُدھر" کدھر تھا اور نقصان کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک خیال ہوتا ہے کہ کہیں اس کا تعلق اس واقعے سے تو نہیں جس میں "الہلال" کی رسم اجرا کے موقع پر نائب صدر جمہوریہ، ڈاکٹر شنکر دیا شرما، کے یہاں چائے پارٹی میں میری حمایت میں انھوں نے اپنے دو نہایت قریبی عزیزوں کو ڈانٹ دیا تھا۔ یہ شاید وہی معاملہ تھا جس میں ہم چاروں کے علاوہ کسی نہ کسی طرح دہلی اردو اکادمی بھی ملوث تھی۔

۱۔۲۔ دونوں خطوں کے عکس کے لیے دیکھیے آخر کے صفحات۔

''الہلال'' کی مکمل فائل کی رسم اجرا کے سلسلے میں یو پی اردو اکادمی کے چیرمین، ڈاکٹر محمود الٰہی، کی خواہش کے مطابق میں نے شرکت کی تھی، اگرچہ جہاں تک یاد ہے میں اس وقت اکادمی کی جنرل کونسل کا بھی ممبر نہ تھا۔

شنکر دیال شرما جی کو میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں غالباً ۱۹۵۳ء میں ایک بار دیکھا تھا۔ دو تین دن بعد نیشنل ہیرالڈ کی ایک خبر کے مطابق وہ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ بنائے جا رہے تھے۔ رسم اجرا کے بعد بات چیت کے دوران میں نے شرما جی سے کہا کہ میں نے آپ کو لکھنؤ یونیورسٹی میں اس دن دیکھا تھا جس کے چند روز بعد آپ نے مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔

یہ سن کر شنکر دیال جی خیالوں میں ڈوب گئے اور انھوں نے اپنے وزیر اعلیٰ بنائے جانے کی ساری کہانی دہرادی۔

انھوں نے کہا کہ میں تو معلّمی کا پیشہ چھوڑ کر جنگ آزادی میں شامل ہوا تھا اور ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد میں نے اپنا پرانا پیشہ پھر اختیار کر لیا تھا۔ میں کوئی سیاستداں تو تھا نہیں۔

پھر ایک دن مجھے پیغام ملا کہ پنڈت نہرو سے فوراً ملوں۔ میں نے دہلی جا کر پنڈت جی سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا کہ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھال لو۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ میں تو درس و تدریس سے متعلق ہوں اور اسی میدان میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنا چاہتا ہوں لیکن اگر یہ حکم ہے تو جو آپ فرمائیں۔ پنڈت جی نے میری بات مان لی لیکن یہ بھی کہا کہ اصل میں یہ تجویز مولانا آزاد کی ہے اس لیے ان سے مل لو۔ میں نے مولانا آزاد سے بھی یہی بات کہی۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، اپنی ڈیسک کھولی، ہوائی جہاز کا ٹکٹ نکالا اور کہا، کل دن میں ۱۱ بجے حلف برداری ہے۔

یہ کہنے کے بعد شنکر دیال جی نے کہا آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ مولانا کی وجہ سے ہی ہوں۔

قومی آواز کے دفتر میں چیف سب ایڈیٹر کی میز کے پیچھے کی دیوار پر ایک گروپ فوٹو آویزاں تھا۔ یہ تصویر پنڈت نہرو کے ساتھ ادارتی عملے کی تھی۔ ''پنڈت جی اور حیات اللہ انصاری ،جن کا قد پنڈت نہرو سے کچھ نکلتا ہوا تھا، درمیان میں تھے۔ یہ تصویر دیکھ کر مجھے کچھ ایسا لگا جیسے حیات اللہ صاحب اپنی دراز قامتی پر شرمندہ شرمندہ سے ہوں۔ میں نے اپنے اس خیال کا ذکر

محمد حسن قدوائی سے کیا تو انھیں یہ بات صحیح معلوم ہوئی۔ انھوں نے اس کا حیات اللہ صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا بات بہت پرانی ہے، ٹھیک سے یاد نہیں لیکن اس طرح کا احساس ضرور رہا ہوگا۔

قومی آواز متعدد بحرانوں سے گذرا لیکن ان سے ہمیشہ کامران برآمد ہوا۔

ان دنوں اشتہارات کی وہ مارا ماری نہیں تھی جو اَب ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ بازار میں اخبار کی مانگ تھی کہ روکے نہیں رک رہی تھی۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ تعداد اشاعت زیادہ ہو تو فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اخبار کی کفالت کے لیے کافی ہوتی ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیوں کہ کسی اخبار کے مالی استحکام کے لیے اشتہارات اور فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کے درمیان تناسب بالترتیب ستر اور تیس کا ہونا چاہیے۔ اخبار کی مقبولیت اشتہار کے حصول میں معاون ضرور ہوتی ہے لیکن اشتہار ہوں تب نا۔ یوں تو چھوٹے بڑے بحرانوں کا سامنا ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے سارے اخباروں کو کرنا پڑتا لیکن قصائی کی چھری نظر آتی ہمیشہ اردو کی رگِ جاں کے قریب۔

اس زمانے میں جب فیروز گاندھی ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے ڈائرکٹر تھے، ادارہ کو مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ رفیع صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے کسی صنعتی ادارہ سے بیس ہزار روپوں کا چیک کمپنی کو دلوایا۔ کسی طرح یہ بات پنڈت نہرو کو معلوم ہوئی تو انھوں نے رفیع احمد قدوائی سے کہا کہ یہ سب نہ کیا کیجیے خواہ مخواہ بدنامی ہوتی ہے۔ رفیع احمد قدوائی نے آہستہ سے کہا کہ اس کے بغیر اخبار چل نہیں سکتا تو پنڈت نہرو جھنجھلا گئے اور بولے، ''بند ہو جانے دیجیے۔'' پنڈت نہرو کو تو ان اخباروں کی ضرورت تھی نہیں، ضرورت تو کانگریس کو تھی چنانچہ رفیع احمد قدوائی صاحب نے وہ چیک واپس کر کے اتنی ہی رقم کا چیک فیروز گاندھی کے نام کٹوا دیا جنھوں نے وہ ساری رقم گویا اپنی طرف سے کمپنی کو دے دی۔ بظاہر تو مسئلہ حل ہو گیا لیکن اگلے سال محکمہ انکم ٹیکس نے فیروز گاندھی کو نوٹس جاری کر دیا کہ یہ بیس ہزار روپے تم نے اپنی آمدنی میں کیوں نہیں دکھائے۔

فیروز گاندھی نے کافی ہاؤس میں متعدد لوگوں کے سامنے کہا تھا، ''میں وزیر اعظم کا داماد نہ ہوتا تو انکم ٹیکس والے جیل بھیج دیتے۔''

قومی آواز کو پہلے بحران کا سامان ۱۹۵۴ء میں کرنا پڑا۔ یہ بات قومی آواز سے میرا باقاعدہ تعلق قائم ہونے سے پہلے کی ہے اس لیے دیدہ نہیں شنیدہ ہے، لیکن ہے صحیح۔ اس زمانے

میں مالی بحران لاکھوں کروڑوں کے نہیں ہزاروں کے ہوتے تھے اور تنخواہوں میں معمولی کمی سے بھی ان پر قابو پانے میں مدد ملتی تھی۔ حیات اللہ انصاری نے جنھیں اس وقت بمشکل ڈھائی تین سو روپے مل رہے ہوں گے، بوجھ سارے عملے پر ڈالنے کے بجائے ایک روپیہ مہینے کی تنخواہ پر کام کرنے کی پیش کش کی اور یہ پیش کش بہ اصرار منوا بھی لی۔ چند ماہ بعد حالات بہتر ہوئے تو کمپنی نے پوری تنخواہ دینا از خود شروع کر دی لیکن اس واقعے سے یہ ثابت ہو گیا کہ اخبار سے ان کے تعلق میں اقدار اور اصول کارفرما تھے۔

قومی آواز کو دوسرے مالی بحران کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب ورکنگ جرنلسٹس کی تنخواہوں پر نظر ثانی کرنے والے پہلے کمیشن نے اپنی سفارشیں پیش کیں اور ان سفارشوں کو حکومت نے تسلیم کر لیا۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے۔ اس اوارڈ سے پیدا ہونے والی مالی مشکلات کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ عملہ کی تعداد کم کی جائے۔ اسے چھٹنی کہتے ہیں۔ چھٹنی میں بعد میں آنے والے سے سب سے پہلے نجات حاصل کی جاتی ہے۔ (Last come, first go)۔ مَیں چوں کہ سب سے جونیر تھا اس لیے مجھے سب سے پہلے جانا پڑتا۔ دفتر میں ماحول خاصا پریشانی کا تھا، اور ہر شخص متفکر۔

ایک دن حیات اللہ انصاری اپنے کمرے سے ادارتی عملے کے کمرے میں آئے، پروف ریڈروں کو بھی وہیں بلا لیا گیا اور انھوں نے بہ آواز بلند اعلان کیا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ہم سب ایک ساتھ ڈوبیں گے یا ساتھ ساتھ تیریں گے۔ ان کے اس اعلان کا پر جوش تالیوں سے خیر مقدم ہوا اور سارے عملے میں دل شکستگی کی جگہ حوصلے اور مسرت نے لے لی۔

ہر ادارے میں کچھ محنتی کارکن ہوتے ہیں اور کچھ کام چور اور پھسڈی۔ ایک پھسڈی کارکن کا ذکر ہو چکا ہے۔ کام چور کا باقی ہے۔ رضا انصاری صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے تو ہفت روزہ ادبی ضمیمہ کی تیاری کے علاوہ منظر سلیم رپورٹنگ بھی کرنے لگے۔ اس وقت شہر چھوٹا تھا، کام کسی نہ کسی طرح چل جاتا لیکن اسمبلی اجلاس کے دنوں میں ایک شخص ناکافی ثابت ہوتا چنانچہ شہر کی خبروں کے لیے بطور رپورٹر ایک صاحب کا تقرر کیا گیا جنھوں نے کام چوری کے سلسلے میں شہرت بہت جلد حاصل کر لی۔ کام چوری کر کے یہ ظاہر کرنے میں کہ کام جم کر کیا جا رہا ہے جتنی محنت صَرف ہوتی ہے اس سے کم مشقت میں کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن کام چوری کا بھی ایک مزا ہے۔

ان رپورٹر صاحب کا خبریں حاصل کرنے کا طریقہ بہت دلچسپ تھا۔ شام میں پانچ پونے پانچ بجے منہ میں سگار دبائے وہ ایسوشی ایٹیڈ جرنلس آتے اور تھوڑا وقت نوجیون اور نیشنل ہیرالڈ کے رپورٹروں کے ساتھ گزارنے کے بعد قومی آواز کے آفس میں داخل ہوتے، ایسے تھکے تھکائے جیسے سارے دن خبروں کا پیچھا کرتے رہے ہوں۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر ہیرالڈ اور نوجیون کے رپورٹروں نے سوچا کہ یہ ''یک طرفہ'' آدان پردان کب تک چلے گا۔ ان سے تو کوئی خبر ملتی نہیں۔

ان کی کام چوری کا راز ایک نہ ایک دن تو کھلنا ہی تھا، اتفاق سے جلد کھل گیا لیکن ایک بدبختانہ واقعے کے بعد۔ نیشنل ہیرالڈ اور نوجیون کے رپورٹروں نے مل کر ایک سازش رچی۔ ایک ایسی خبر تیار کی جس کا کوئی وجود ہی نہ تھا اور دونوں اخباروں کے رپورٹروں نے یہ ''خبر'' نہایت رازداری سے انھیں اس ہدایت کے ساتھ بتائی کہ کسی کو اس کی ہوا نہ لگنے پائے۔ چنانچہ قومی آواز میں یہ خبر آن بان سے شائع ہوئی جب کہ دنیا کے کسی اخبار میں اس کا ذکر تک نہ تھا۔ اس واقعے سے ان کی بڑی تھوتھو ہوئی۔

پاکستان سے لڑائی ہوئی تو انھوں نے ایک دن حیات اللہ انصاری سے کہا، ''پاکستان ریڈیو نے اعلان کیا ہے کہ اس کے بمباروں نے چار باغ ریلوے اسٹیشن اور لکھنؤ یونیورسٹی کی عمارتیں تباہ کردیں۔'' اس وقت اتفاق سے مَیں اور منظر سلیم بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے کہا کہ بھائی چار باغ ریلوے اسٹیشن کے سلسلے میں تو کوئی ملک اس طرح کی جھوٹی خبر بھی نشر کرسکتا ہے لیکن یونیورسٹی کی عمارت کو تباہ کرنے کی خبر، خواہ وہ سچ ہی کیوں نہ ہو، نشر کرکے کوئی ملک ذلّت کا طوق اپنے گلے میں نہیں لٹکائے گا۔

خیر، اتنی نازک بات سمجھنے کی انھیں فرصت تھی نہ دماغ، چنانچہ انھوں نے نہایت جوش میں آکر حیات اللہ صاحب سے کہا، ''اب پاکستان کی حرکتیں برداشت نہیں ہوتیں، مجھے فرنٹ پر بھیج دیجیے۔ میں وطن پر جان دے دینا چاہتا ہوں''۔

یہ سن کر منظر سلیم نے فوراً کہا ''پیارے! جان دے دوگے لیکن کام نہیں کروگے۔''

پارکنسن لا

پارکنسن نام کی بیماری سے تو سب ہی واقف ہیں لیکن اس شخص سے جس نے بیسویں صدی کے بالکل ابتدائی برسوں میں دفاتر میں کام کے متعلق کچھ قوانین وضع کیے تھے واقفیت عام

نہیں۔ ان قوانین کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کام اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اسے مکمل کرنے کے لیے وقت ہو۔

پارکنسن کے دو اور قوانین بھی اتنے ہی صحیح اور دلچسپ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی شخص کام کے لیے ملازم نہیں رکھا جاتا بلکہ وہ اپنا کام ساتھ لے کر آتا ہے۔

فرض کیجیے ایک دفتر میں کسی شخص کی تقرری کی جاتی ہے تو اس کے لیے ایک میز کرسی، کچھ کاغذات کا انتظام کرنا ہی ہوگا اور پھر اسے بیٹھنے کے لیے تو ملازمت دی نہیں گئی ہے چنانچہ کچھ کام بھی فراہم کرنا ہوگا۔ کچھ فائلوں پر اس کے دستخط لازمی بنا دیے جائیں گے، کچھ لوگوں کے کام کی نگرانی وہ کرے گا اور اسی طرح کچھ دوسرے اس کے کام کی۔ لیجیے اچھا خاصا کام پیدا ہوگیا جس نے اس کی اور دوسروں کی ملازمت ناگزیر بنادی۔

پارکنسن کا ایک اور قانون بہت دلچسپ ہے اور سچ پوچھیے تو کام کی حد تک جتنی گڑبڑیاں ہیں ان کی توضیح اس قانون سے ہوجاتی ہے۔

بات چوں کہ اخبار کے ادارتی عملے کے حوالے سے ہو رہی ہے اس لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مثال بھی اسی سے دی جائے۔ فرض کیجیے کوئی سب ایڈیٹر اپنا کام نہایت عمدگی سے انجام دیتا ہے تو اسے ترقی دے کر سینیئر سب ایڈیٹر بنا دیا جاتا ہے اور یہاں بھی عمدہ کارکردگی ہو تو چیف سب ایڈیٹر۔ لیکن اگر وہ اس جگہ پر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرتا تو ظاہر ہے نہ اسے ترقی دی جاسکتی ہے نہ اس جگہ پر واپس بھیجا جاسکتا ہے جہاں اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ اس جگہ مستقل ہوجاتا ہے جہاں اس نے خود کو نااہل ثابت کیا ہے۔

'میزبان'

قومی آواز سے سبکدوش ہونے کے بعد شاید حیات اللہ انصاری نے اخبار زیادہ توجہ سے پڑھنا شروع کردیا تھا۔ وہ کبھی کبھی قومی آواز کا مزاحیہ کالم ''گلوریاں'' بھی لکھتے تھے ''میزبان'' کے فرضی نام سے۔ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے پہلے دورۂ لکھنؤ کے موقع پر جو ''گلوریاں'' انھوں نے لکھی تھیں انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں ایک نہایت عمدہ مزاح نگار چھپا ہوا ہے۔ ایک بار کسی نے گلوریاں شاید نادانستہ طور پر ان کے فرضی نام سے لکھ دیں تو انھوں نے مدیر اخبار کو مطلع کیا کہ یہ فرضی نام ان کا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اس نام سے

''گلوریاں''، نہیں لکھی گئیں۔

محمد حسن قدوائی کی وفات پر حیات اللہ انصاری نے قومی آواز میں ایک مختصر سا مراسلہ لکھا تھا جس میں ایک بھی جذباتی لفظ استعمال کیے بغیر انھوں نے ہفت روزہ ''ہندستان'' اور قومی آواز کے اپنے ساتھی کو اس قدر جذباتی خراجِ عقیدت پیش کیا تھا کہ شاید و باید۔

محمد حسن قدوائی ''مضراب'' کے نام سے نئی فلموں پر تبصرے لکھتے تھے اور اس وقت تک سرکاری دفاتر اور تعلیمی اداروں سے اردو کے اخراج کے باوجود قومی آواز کے ''اچھے'' اور ''برے'' تبصرے یہ طے کرنے کے لیے کافی تھے کہ فلم کتنے دن چلے گی۔ قدوائی صاحب کی عدم موجودگی میں یہ تبصرے دوسرے لوگ لکھتے۔ دو چار تبصرے میں نے بھی لکھے تھے۔ انھی دنوں ایچ۔ جی۔ ویلس کے ناول The Invisible Man کی بنیاد پر ایک فلم بنائی گئی تھی۔ اس سائنسی فانتسی کا اردو ترجمہ میں نے تقریباً پینتیس سال قبل کیا تھا جو غیر مطبوعہ صورت میں اب بھی میرے پاس موجود ہے۔

فلم کا نام تو یاد نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ ڈائرکٹر اور پروڈیوسر نے اپنی عدم مہارت کے ثبوت اس حد تک فراہم کیے تھے کہ نظر نہ آنے والے قاتل کے ہیولے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والی ڈوریاں نظر آتی تھیں۔ میں نے اپنے تبصرے میں ساری تکنیکی خامیوں کی نشاندہی کر دی اور نتیجتاً فلم دو ہفتے سے زیادہ نہ چل سکی۔ لیکن ایک خراب فلم سے شائقین کو محفوظ رکھنے کا سہرا میرے سر نہیں قومی آواز کے سر جاتا ہے۔ یہی تبصرہ کہیں اور شائع ہوتا تو اس کا خاک اثر نہ ہوتا۔

جہاں تک یاد ہے اردو اخباروں، بلکہ سارے ہی اخباروں میں سینما گھروں اور فلموں کے اشتہارات کا سلسلہ آزادی کے کئی سال بعد شروع ہوا۔ اس سے قبل تو میں نے فلموں کی پبلسٹی کے لیے باجے گاجے اور جوکر کے ساتھ پندرہ پندرہ بیس بیس لوگوں کے جتھے دیکھے تھے جو دفتی یا لکڑی کے فریم پر فلم کی دو چار تصویریں بھی لیے ہوتے۔

ان دنوں سینما گھروں پر اشتہارات اور بڑے بڑے پوسٹر زیادہ تر اردو میں ہوتے تھے۔ ہندی بعد میں متعارف ہوئی اور اب تو اردو خال خال ہی نظر آتی ہے۔ غالباً ۱۹۶۰ء یا اس کے ایک آدھ سال قبل قیصر باغ چوراہے کے ایک سینما گھر کے اشتہارات اور بڑے بڑے پوسٹروں سے اردو غائب ہوگئی۔ اردو کی چند انجمنوں نے احتجاج کیا لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے

بعد رضا انصاری نے قومی آواز میں ایک خبر لکھی جس کی سرخی غالباً دو کالمہ تھی۔ الفاظ تو یاد نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ اس خبر میں سینما کے مالکوں سے کہا گیا تھا کہ اگر انھوں نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو اردو والے اپنی زبان کے ساتھ ناانصافی کا جواب دینا جانتے ہیں، یعنی وہ سینما گھر کا بائیکاٹ کرنے کے طریقے سے بھی واقف ہیں۔ اس خبر کے نتیجے میں اس سینما گھر کے اشتہارات میں اردو دوسرے ہی دن نمودار ہوگئی۔

اردو سے بڑھتی ہوئی عدم واقفیت کے نتیجے میں ''آج شب کو'' سارے سینما گھروں میں ''آجسبکو'' ہوگیا تھا اور ان دنوں یہ لطیفہ مشہور تھا کہ کسی شخص نے ''آجسبکو'' دیکھ کر کہا کہ یہ اس قدر مقبول فلم ہے کہ شہر کے ہر سینما گھر میں دکھائی جارہی ہے۔

غیر مطبوعہ خودنوشت

حیات اللہ انصاری قومی آواز سے سبکدوش ضرور ہوگئے لیکن اخبار کے ادارتی عملے سے انھوں نے ذاتی تعلقات استوار رکھے۔ کبھی دو کبھی تین لوگوں کو رات کے کھانے پر مدعو کرتے جہاں مختلف ادبی اور سماجی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ مجھے بھی تین چار بار ان دعوتوں میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس سلسلے کی دو تین باتیں یاد ہیں۔

ایک بار اتفاق سے مدعوئین میں سے صرف میں شریکِ طعام ہوسکا۔ کھانے کا اہتمام ریور بینک کالونی کے ان کے مکان کے پیچھے کے دالان میں تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور بہت بھلی لگ رہی تھی۔ حیات اللہ صاحب نے کہا، ''کیسی عمدہ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے''۔ ابھی انھوں نے جملہ بمشکل پورا ہی کیا کہ سلطانہ حیات بول اٹھیں، ''تم لکھنؤ والوں کو اردو نہ آئی۔ چاندنی تو بچھائی جاتی ہے۔ اسے چاندنا کہتے ہیں۔ حیات اللہ صاحب مسکرا کر رہ گئے لیکن مجھے یاد آیا کہ رتھیڑی (ضلع مظفرنگر) میں چاندنا میں نے بھی سنا تھا۔ سلطانہ حیات اسی طرف کی تھیں۔

ایک مرتبہ مجھے حیات اللہ صاحب کے اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھنے کا موقع ملا جس میں وہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ ان کے اس کمرے میں پنڈت نہرو کی بڑی اور گاندھی جی کی چھوٹی سی تصویر آویزاں تھی۔ میں نے ان کی کمیونسٹ دشمنی پر شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو قومی آواز کے شعبۂ ادارت کے لیے کمیونسٹوں اور کمیونسٹ حامیوں کے علاوہ کوئی ملتا ہی نہ تھا۔ انھیں یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔

حیات اللہ انصاری اپنی غیر مطبوعہ خودنوشت کے ایک حصے میں جس کا ایک صفحہ روزنامہ صحافت ۳۱؍ مارچ ۱۹۹۷ کے ہفت روزہ ضمیمے میں، جو اُن کی شخصیت اور اکتسابات پر اردو اکادمی کے سیمنار کے موقعہ پر شائع ہوا تھا، لکھتے ہیں ''علی گڑھ میں میرا رجحان کمیونزم کی طرف زیادہ ہوگیا تھا اور کبھی کبھی ایسا بھی لگتا کہ میں نے اس کے حق میں فیصلہ کرلیا ہے۔'' بعد میں انھوں نے تسلیم کیا تھا کہ ''پندرہ سال کی کشمکش کے بعد کمیونزم کے اثرات سے نکل سکا۔''[۱]

وہ کمیونزم سے اس قدر متاثر تھے کہ قومی آواز کی ایڈیٹری ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور سجاد ظہیر کے ایک عزیز شبّر حسین قتیل کو قدوائی صاحب نے تقرری کا خط بھی جاری کردیا تھا۔ حیات اللہ انصاری کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے ایک مربّی سے جو پنڈت نہرو اور رفیع احمد قدوائی کے بہت قریب تھے فریاد کی اور انھوں نے رفیع صاحب کو یقین دلایا کہ حیات اللہ متشدد کمیونسٹ نہیں، تب کہیں وہ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

سال ڈیڑھ سال قبل قتیل صاحب کے پوتے یا نواسے سے میری ملاقات ہوئی اور انھوں نے یہ دعوا کیا کہ قتیل صاحب قومی آواز کے پہلے ایڈیٹر تھے تو میں نے یہ کہہ کر کہ رفیع صاحب کی پیش کش انھوں نے قبول نہیں کی تھی، بات ٹال دی تھی۔ روزنامہ ''صحافت'' کے ضمیمے میں حیات اللہ انصاری کی تحریر کی فوٹو کاپی شائع ہوئی تھی۔ بعد میں انھوں نے اس ضمیمے کی پیشانی پر لکھا تھا، ''جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ صرف صحیح ہے بلکہ دلچسپ بھی ہے۔'' ''صحافت'' کا یہ شمارہ میرے پاس موجود ہے۔ روزنامہ ''صحافت'' کا ضمیمہ میں ہی دیکھتا تھا۔ ان دنوں میں اس کا'' مشیر خصوصی'' اور عملاً ایڈیٹر تھا۔

حیات اللہ صاحب کے یہاں کی اس دعوت میں جس میں حسن واصف عثمانی کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا دورانِ گفتگو عثمانی صاحب نے ان سے کہا تھا، ''حیات اللہ صاحب پرانے لوگوں میں اب صرف تین رہ گئے ہیں۔ عابد سہیل، عثمان غنی اور میں۔ عثمان تو خیر قومی آواز سے وابستہ ہیں۔ میں اور سہیل صاحب آپ کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ آپ اخبار کیوں نہیں نکالتے؟''

حیات اللہ انصاری کے جواب نے ہم دونوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا اور ان کی شخصیت کی عظمت کا نقش اور گہرا ہوگیا تھا۔ جواب میں انھوں نے کہا تھا۔

۱۔ حیات اللہ صاحب کی خودنوشت کے متعلقہ صفحے کا عکس آخر کے صفحات میں۔

''صحافت بہت آگے نکل چکی ہے اور اب یہ کام میرے بس سے باہر ہے۔''
یہ بات اس شخص نے کہی تھی جو جدید اردو صحافت کا بانی تھا۔

عثمان غنی، حسن واصف عثمانی

عثمان غنی کا ذکر اب تک نہ ہو سکا کیونکہ ہم دونوں قومی آواز میں بہت کم ساتھ رہے، لیکن ان کا ذکر ضروری ہے۔ اور حسن واصف عثمانی کے ساتھ تو میں نے ایک دن بھی کام نہ کیا وہ قومی آواز سے میرے بعد متعلق ہوئے لیکن ان کے بغیر اس دور کی اردو صحافت کی تصویر پوری نہ ہوگی۔ چنانچہ دو چار سطریں ان کے بارے میں بھی لازمی ہیں۔ عثمان غنی کو میں خاصے پہلے سے جانتا تھا جب ۱۹۵۴ء کے آس پاس نوجوان ادیبوں کی ایک انجمن، انجمن ترقی پسند مصنفین میں ضم ہوگئی تھی۔ ٹھیک سے یاد نہیں لیکن خیال ہوتا ہے کہ عثمان غنی، آغا سہیل اور حسن عابد اس انجمن میں سرگرم تھے۔ حسن واصف کو بعد میں دیکھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب رضا انصاری عثمان غنی کو لے کر، غالباً ۱۹۶۰ء میں قومی آواز آئے تھے اور پوسٹ آفس جو کبھی پنڈت نہرو، کا دفتر ہوا کرتا تھا، کے ملحق زینے پر انھوں نے ہمیں متعارف کرانے کی کوشش کی تو ہم دونوں نے تقریباً ساتھ ساتھ کہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ مجھے کم و بیش پچیس برسوں کی سیکڑوں ملاقاتیں یاد ہیں جو ہم دونوں کے ایک ہی ادارے سے متعلق ہونے کے سبب تقریباً روزانہ ہوتی تھیں۔ ان ملاقاتوں میں ان کی شرافت، خلوص، ذہانت اور دلداری کے ایسے نقش دل و دماغ پر ثبت ہیں جو تا زندگی قائم رہیں گے۔

عثمان غنی سے آخری ملاقات انتقال سے سات آٹھ دن قبل ان کے گھر پر ہوئی تو وہ مسہری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ دو چار باتیں کیں اور ہلکی سی غنودگی ان پر طاری ہوگئی، ڈیڑھ دو منٹ بعد ایک دم آنکھیں کھول دیں، مسکرائے، اپنی غنودگی پر اور اس پر بھی کہ اب دو چار منٹ بات چیت کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے سر پر ہاتھ رکھا اور آنسو پینے کی کوشش کرتا ہوا چلا آیا۔

عثمان غنی نے قومی آواز کے اداریوں کو ایک نئی جہت دی تھی۔ وہ الفاظ سے کھیلتے نہ تھے اور جو بھی کہنا ہوتا واضح اور مدلل انداز میں کہتے۔ زندگی کے آخری دنوں میں انھوں نے روزنامہ

''قومی خبریں'' کے اداریے لکھے اور مجھے کہنے دیجیے کہ ان کے اداریے، وہ ''قومی آواز'' میں ہوں یا ''قومی خبریں'' میں، بے مثال تھے۔ اردو صحافت ان کو طویل عرصے تک یاد رکھے گی۔ میں نے انھیں اداریہ لکھنے کے علاوہ ایک دن میں دو دو ایڈیشن تن تنہا نکالتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ تھکنا نہیں جانتے تھے۔ یہی حال حسن واصف عثمانی کا بھی تھا۔ اسلامیات اور مسلمانوں کے مسائل پر ان کے اداریے اور مضامین بے پناہ ہوتے۔ لیکن ان کے جوہر پوری طرح کھل نہ سکے۔ لوگ انھیں پیار سے سگار عثمانی بھی کہتے تھے۔

◆◆◆

شادی

میرا نکاح ۱۷/اپریل ۱۹۵۸ء کو ہوا اور انیس میرے یہاں رہنے کے لیے ۹/مئی ۱۹۶۴ء کو یعنی چھے سال بعد آئیں۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔

شہر میں مشہور یہ تھا کہ مَیں پینتیس بیگھہ کھیت، بینک کے تیس ہزار روپوں، رہنے کے لیے مکان اور اسکوٹر کے لیے بضد تھا اور یہ بھی کہتا کہ جنگل کے کاروبار میں جس حصّے داری کا وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا کیا جائے لیکن جب ان کوششوں میں کامیاب نہ ہوسکا تو مُنہ پٹا کے رخصتی کرالی۔

میں کچھ اور کہتا، جھوٹ ہی رہا ہوگا، ممکن ہے اپنی ترقی پسندی کی آبرو بچانے کے لیے یہ سب کہتا رہا ہوں۔ لیکن اس سب کی نوبت آئی کیسے؟

تحریک رضیہ سجاد ظہیر نے منظر سلیم کے ذریعے کی۔ اس وقت مجھے قومی آواز سے اسّی روپے ملتے تھے۔ سَو روپوں کا اسلم رضوی صاحب کے یہاں ٹیوشن تھا۔ ہوئے ایک سو اسّی روپے۔ اس کے علاوہ اوسطاً سو روپے ریڈیو، نیا دور، آج کل، شمع اور کتابی دنیا وغیرہ سے حاصل ہوجاتے۔ کل ہوئے دو سو اسّی ...اور ذمّے داریاں تھیں بیوہ ماں، دو چھوٹے بھائی بہن جو اورئی میں رہتے، زیرِ تعلیم تھے اور لکھنؤ میں میرے قیام کے اخراجات۔

منظر بھائی کی بات میں نے ہنس کے ٹال دی۔ اسّی روپے کی ملازمت اور شادی! پھر رضیہ سجاد ظہیر نے ڈورے ڈالے۔ کوئی فرق نہیں پڑا۔

انھی دنوں رضیہ سجاد ظہیر کی بیٹی نجمہ ظہیر کی سالگرہ منائی گئی جس میں شریک ہونے والی خواتین اور لڑکیوں کی تعداد پچیس تیس تو ضرور رہی ہوگی اور مردوں میں تھے مولانا اسحٰق سنبھلی، تقی حیدر، کیپٹن لُمبا، میں اور چند دوسرے لوگ جن کے نام یاد نہیں۔ منظر سلیم شاید روس جا چکے تھے۔

لڑکیاں اور عورتیں باورچی خانہ کے پاس والے بڑے دالان میں تھیں اور ہم لوگ آنگن کے کونے میں دوسرے دالان سے متصل اس چھوٹے سے کمرے کے پاس جسے بنّے بھائی

(سجاد ظہیر) پاکستان سے واپس آنے کے بعد اپنی اسٹڈی کے طور پر استعمال کرتے۔

پارٹی ختم ہوئی اور خواتین چلی گئیں تو رضیہ سجاد ظہیر نے پچھوانا شروع کیا... ہرا دوپٹہ، سبز رنگ کی قمیص، سفید شلوار یا کوئی اور کامبینیشن۔ لڑکیاں پندرہ بیس تو رہی ہوں گی۔ میں کیسے پہچانتا؟ پہلے سے بتا دیا گیا ہوتا تو ممکن ہے دماغ میں رنگوں کے تانے بانے محفوظ رکھتا۔ اصرار بڑھا تو میں نے کہا۔

''کیا اسے معلوم ہے کہ پسند کرنے کے لیے کوئی یہاں موجود ہے؟''

''لو تم بھی کیسی بات کرتے ہو۔ ارے اسے نہ معلوم ہوگا... تمھارا بر دکھوا بھی تو ہونا تھا!''

میں نے ذرا سا سوچا اور کہا، ''میں کسی لڑکی کی یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا کہ اسے دیکھنے کے بعد مسترد کر دیا جائے''۔

رضیہ سجاد ظہیر نے تقریباً بلائیں لے لیں۔

کچھ دنوں بعد نکاح پر اصرار شروع ہوا۔ پھر اس میں شدت آ گئی۔ میں کہتا کچھ وقت دیجیے، ہزار پان سو جمع کر لوں تو سوچوں... اسی وقت یہ ترکیب سجھائی گئی کہ اسلم رضوی صاحب سے ایک ہزار قرض لے کر ایک دن بعد واپس کر دوں، روپے مل جائیں گے۔ میں مان گیا... عملاً یہ قرض میں نے بیس مہینوں میں ادا کیا، پچاس روپے ماہانہ۔

آشیانہ شاخ نازک پر بنا تھا اور جڑوں میں بھر دی گئی تھی بارود۔ چنانچہ کبھی پلاسٹر جھڑتا، کبھی ایک اینٹ گرتی، کبھی دوسری اور پھر خشت باری کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ماشاء اللہ جاری رہا۔

ظاہر ہے یہ عمل بہت دنوں یک طرفہ نہیں رہ سکتا تھا۔ نتائج انیس نے بھی بھوگے۔ میں نے بھی اشاروں کنایوں میں بہت کچھ کہا اور کبھی کبھی طنز کے نشتر چلائے۔ انیس غصور تھیں، اب بھی ہیں۔ ہائی بلڈ پریشر پہلے بھی تھا، اب بھی ہے۔ میں بے غیرت تھا، اب بھی ہوں۔ اس لیے آسانی سے سب کچھ سہہ لیا۔ انیس نے زیادہ ہی دکھ اٹھائے۔ تقریباً پینتیس برسوں کے دکھوں نے اسے بھی توڑ کے رکھ دیا، مجھ سے زیادہ... میرے لیے تو دفتر تھا، ماہنامہ کتاب تھا، نصرت پبلشرز تھا، کچھ وقت لکھنے پڑھنے میں گذر جاتا اور خانۂ خالی کی صورت پیدا نہ ہوتی۔ برخلاف اس کے انیس کے لیے ایک عرصہ تک صرف گھر کی چہار دیواری تھی یا پھر اپنا پرانا گھر جہاں کچھ ایسا ہوتا رہتا کہ سسرال کی پریشانیاں شدید تر ہو جاتیں۔ مالی حالات اس پر مستزاد۔ یہ سارے مصائب اس نے جس طرح برداشت کیے اس کا بیان مشکل ہے۔

انیس کا ایک کارنامہ بھی ہے۔ پبلک اسکولوں میں بچوں کی تعلیم انیس کے اصرار اور ضد کے بغیر ممکن نہ تھی اور یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ ان طویل اور مشکل برسوں میں نہ اس کی سسرال نہ مائکے میں کسی نے ترازو کے پلڑوں کو پاسنگ بھی فراہم کرنے کی کوشش کی... دونوں ہی ساری زندگی اپنے زخم چاٹتے رہے اور اب ان کے پھل بھی کھا رہے ہیں۔ جب ان سے لطف اندوز ہونا مستعار اور بھولی ہوئی یادوں سے گایا ہوا گیت بن گیا ہے۔

تینوں بچے... صبا، ساجد، اور زرّیں... خدا کے شکر سے خوش حال اور پر مسرت زندگیاں جی رہے ہیں اور ہم دونوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ شاید و باید۔ بڑی بیٹی کے شوہر مقبول قریشی دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو میں چیف انجینئر ہیں، ساجد میاں کا العین میں کمپیوٹر کا اپنا کام ہے اور ان کی اہلیہ سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر، زرّیں ہیرے جواہرات کی ایک کمپنی میں برانڈ منیجر ہے اور اس کے شوہر ایر۔ فرانس سے متعلق۔ اور کیا چاہیے!

◆◆◆

ابراہیم بھائی

جولائی یا اگست میں انیس کے بڑے بھائی جنھیں مَیں بعد میں ابراہیم بھائی کہنے لگا، آ گئے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، دو چار یا زیادہ سے زیادہ دس منٹ تک اجنبیت کی ایک پتلی سی دیوار ہمارے درمیان رہی اور پھر انھوں نے مجھے فتح کر لیا۔ ہم دونوں دوست بن گئے، ایسے جیسے دوستی برسوں پرانی ہو۔ وہ عراق میں برسرِ روزگار تھے۔

میری طرح وہ بھی کچھ حسین و جمیل نہیں تھے، نہ اس کا انھیں احساس تھا، نہ یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ غلط ہے لیکن یہ خیال بھی دو چار دن کی باتوں میں غائب ہو گیا۔ ان دنوں ان کے بال کالے تھے، اب بالکل سفید ہیں، میرے بالوں کی طرح، لیکن بالکل ویسے ہی لگتے ہیں جیسے اس وقت لگتے تھے۔ معلوم نہیں میری آنکھوں نے سفید بالوں کو سیاہ دیکھنا کب اور کیسے سیکھا، شاید جیسے جیسے اپنے بالوں کی سپیدی سیاہی کو ڈھکتی گئی۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، میری نہیں ان طلبہ کی جن کے میں ٹیوشن لیتا تھا۔ قومی آواز میں ہر ہفتے کی ایک شام راتوں تک آزاد ہوتی اور ہم ہفتے میں ایک دو بار حضرت گنج ضرور جاتے، کبھی کبھی پکچر دیکھتے اور جہاں جی چاہتا گھومتے پھرتے۔

گومتی کے کنارے شہید اسمارک کی لاٹ نئی نئی بنی تھی، شام میں وہاں بھیڑ ہوتی۔ لاٹ کے بالکل اوپری حصے میں بلب قطار اندر قطار اس طرح لگائے گئے تھے کہ بھلے لگتے۔ انھیں دیکھنے ہر شام کو بھیڑ جمع ہو جاتی۔ کیا دن تھے! لوگوں کے پاس وقت تھا، فرصت تھی، ضرورتیں اتنی نہ تھیں، دولت کی ہوڑ نہ تھی۔

شہر میں بسوں کا جال پھیلنے کے بعد سکڑ چکا تھا، اس لیے ہم رکشے سے سفر کرتے، ویسے پیدل بھی چلتے۔ رکشے کا کرایہ زیادہ تر، زیادہ تر کیا بلکہ تقریباً ہمیشہ، وہی ادا کرتے، لیکن کچھ اس طرح کہ محسوس بھی نہ ہوتا کہ یہ کام مَیں نہیں وہ کر رہے ہیں۔ دو چار بار میں نے ادا کیا، انھوں نے

مجھے روکا بھی نہیں۔ انھیں دوسرے کے حق، دوسرے کی خوشی کا احترام کرنا بھی آتا تھا، آتا ہے۔
ہم لوگ رکشے پر بیٹھتے اور کہیں رکشے والا بریک لگاتا تو سر اور سینہ تو ہم دونوں کا آگے کی طرف یکساں جھکتا البتہ پائیدان کی ٹھوکر پر میرے دونوں پیر برابر بوجھ ڈالتے لیکن ان کا ایک پیر زیادہ بوجھ ڈالتا اور دوسرا کم، اس بات کا احساس مجھے رکشے میں ساتھ ساتھ بیٹھنے کے کئی دنوں بعد جانے کیسے ہوگیا... پھر بہت دنوں بعد ان کی ایک تصویر دیکھی، بغداد میں اپنے گھر کے باہر، کار سے ٹیک لگائے ہوئے۔ جانے کیسے اسی وقت احساس ہوا کہ ایک پیر کے کم اور دوسرے کے زیادہ بوجھ کا تعلق ہو نہ ہو کار ڈرائیونگ سے رہا ہوگا۔ لیکن اس موضوع پر ان سے کیا کسی سے بات نہ ہوئی، آج پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط۔
میں نے ایم۔اے پارٹ ون کیا تھا۔ نمبر ایسے تھے کہ ذرا سی محنت کروں یا محنت کرنے کا موقع ملے تو فرسٹ ڈویزن آسکتی تھی ورنہ سیکنڈ تو خیر آتی ہی۔ اور رہی بہت تھا۔ تقریباً مستقل رات کی ڈیوٹی کرتا اور شام میں ایک ٹیوشن، کبھی ''نیادور'' کے لیے کچھ لکھتا، کبھی ریڈیو کے لیے۔ ان دنوں ہر ہفتے ریڈیو سے ''آج اتوار ہے'' نام سے ایک پروگرام ہوتا۔ اے پی۔سی۔ سکینہ صاحب دیکھتے تھے مجھ سے اکثر کچھ نہ کچھ لکھواتے۔ پیسے ضرور ملتے لیکن وقت بھی تو صرف ہوتا، جس کا استعمال کتابیں پڑھنے میں ہونا چاہیے تھا۔
ایک دن ہم لوگ زندہ عجائب گھر گھومنے گئے۔ دنیا بھر کی باتیں کیں، ہنسی مذاق بھی، شاید کچھ کھایا پیا بھی۔ اسی وقت ایسا لگا جیسے ابراہیم بھائی کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں انھوں نے کہا
''عابد بھیا''، اور بھی کچھ کہا لیکن ایسا لگا جیسے جملہ بدل دیا ہے، جو کہنا چاہتے تھے وہ نہیں کہا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے کہہ ہی دیا۔
''عابد بھیا! ایک بات کہوں۔''
پھر کہا، ''ایک بات کہوں، آپ ایسا کیجیے، آپ ایسا کیجیے کہ اگلے سال قومی آواز سے ایک سال کی چھٹی لے لیجیے...''
''لے لوں گا،'' میں نے کہا۔ سمجھ گیا کیا بات ہے۔
پھر بولے، رک رک کر، ''میں ایک ہزار روپے بھیج دوں گا''۔
یہ بات انھوں نے ایسے کہی جیسے ایک ہزار روپے مجھ سے مانگ رہے ہوں۔

''لیکن یہ قرض ہوگا،''میں نے کہا۔''روپے واپس کردوں گا۔''

وہ کھل اٹھے یہ جان کر کہ ان کی بات مان لی گئی ہے۔ بولے،''خوشی سے۔ روپے کسے برے لگتے ہیں۔''

''ایسا کیجیے کہ فرسٹ ڈویزن آجائے۔''

''یہ کونسی مشکل بات ہے۔''میں نے اپنے آپ سے کہا۔

پھر ہم لوگ کچھ دوسری باتیں کرنے لگے۔ نہ میرے دل پر کوئی بوجھ تھا، نہ ان کے دل پر۔ اس کے بعد وہ بغداد چلے گئے۔

کچھ دنوں بعد ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ آنے لگا، پھر ایک دن سادہ ڈاک سے تین کتابیں آئیں۔ فلسفہ کی یہ تینوں کتابیں میرے ایم۔ اے۔ کے دوسرے سال میں کام آئیں۔ معلوم نہیں انھیں کیسے معلوم ہوگیا کہ یہ میرے کام کی ہیں۔

پھر ان کا خط آیا۔ گہرا سبز کاغذ، موتی کی طرح چنے ہوئے حروف، پورے چار صفحات کا۔ روپوں کا کوئی ذکر نہ تھا، کتابوں اور ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کا بھی نہیں، نہ کوئی تعریف و توصیف، نہ محبت کا کوئی خاص اظہار لیکن ہر لفظ سے محبت تھی کہ پھوٹی پڑ رہی تھی۔ خط میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔

◆◆◆

ایم۔اے (دوسرا سال)

یونیورسٹی کھلی تو درشن پریشد کی صدارت میرے انتظار میں تھی۔ الکشن تو ہوا لیکن اس کی حیثیت رسم سے زائد نہ تھی۔ اس سال یونین خاصی سرگرم رہی۔ سب سے اہم پروگرام یوگ درشن پر سمپورنا نند کے لکچر تھے۔ سمپورنا نند وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ یوگ درشن پر حرفِ آخر سمجھے جاتے۔ یونیورسٹی میں فلسفہ کے صدر شعبہ ان کے خاص آدمی تھے۔ میں نے یوگ درشن پر سمپورنا نند جی کے پانچ لیکچر کرانے کی تجویز رکھی تو کالی پرشاد خوش ہوگئے۔ سمپورنا نند جی نے ذرا بھی نازنخرے نہ دکھائے اور شعبے کے زینوں پر پہلی بار کسی وزیر اعلیٰ نے قدم رکھا۔

سمپورنا نند ایسے تھے کہ ان کے بال بکھرے نہ ہوں تو پتہ چلانا مشکل تھا کہ پیشانی کہاں ختم ہوتی ہے لیکن چہرے پر علم کی روشنی تھی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ پانچوں لیکچر میری صدارت میں ہوئے۔ اسٹیج پر میں تھا اور سمپورنا نند، ہاں کالی پرشاد تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے آکے بیٹھ جاتے۔ یہ لیکچر عالمانہ تھے، توجہ سے سنے گئے۔ لیکن آخری دن، سوال جواب کے سیشن میں مسز داس گپتا نے ایک مختصر سا سوال پوچھا۔ سمپورنا نند نے جواب دینے کے بجائے کہا، ''میں نے یوگ درشن سَو بار تو پڑھا ہوگا'' میرے منہ سے نکل گیا'' پھر بھی'' اور وہ بھی اتنی زور سے کہ کالی پرشاد نے جو اس وقت پہلی قطار میں بیٹھے تھے سن لیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں وزیر اعلیٰ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر اس کی تلافی کردی اور اگلے دن اپنے آفس میں بلا کر مجھے خوب ڈانٹ پلائی۔

کالی پرشاد کی خفگی کا ایک سبب اور بھی تھا۔ شعبہ میں جنگ آزادی پر ایک جلسہ ہوا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ مولانا آزاد کی قربانیاں گاندھی جی کی قربانیوں سے زیادہ تھیں کیونکہ انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کی مخالفت کے باوجود اپنا راستہ ترک نہیں کیا تھا اور ذلتیں برداشت کی تھیں۔ کالی پرشاد کو یہ بات بری لگی تھی۔

کالی پرشاد کی مادری زبان اردو تھی۔ ڈاکٹر محمد حسن کی ادبی انجمن میں انھوں نے ایک مقالہ بھی پڑھا تھا لیکن اب وہ اردو کو ترچھی نظروں سے دیکھتے تھے۔

کالی پرشاد بمشکل ہی کوئی کلاس لیتے۔ مجھے نہیں یاد کہ انھوں نے ہمارا ایک بھی کلاس لیا ہو۔ مشہور یہ تھا کہ انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے تھرڈ ڈویژن میں ایم۔اے کیا ہے۔

ایم۔اے کے پہلے سال میں راجن سرین نام کی ایک بے حد ذہین لڑکی بھی کلاس میں تھی لیکن امتحان دینے سے پہلے ہی اس کی شادی ہوگئی اور وہ پڑھائی چھوڑ کر سسرال چلی گئی۔ میں اور سمیع (عبدالقوی ضیاؔ کے چھوٹے بھائی) اس کی شادی میں شرکت کے لیے شاہجہاں پور گئے تھے۔ راجن کی دوست سدرشن اور ساجدہ باجی بھی شریک ہوئی تھیں۔ دوسرے سال میں اس کی کمی نہ صرف مجھے بلکہ ڈاکٹر دیوراج ایسے شفیق استاد تک کو محسوس ہوتی۔ اس نے کیلاش ہوسٹل کی کئی لڑکیوں سے تعارف کرایا تھا۔ ان میں چندر نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ نہایت خوبصورت، لمبی، اردو شعر و شاعری کی عاشق۔ اس کا یہ عشق مجھے بہت مہنگا پڑا۔

یہ سب اپنی جگہ، لیکن میرا شمار کلاس کے اچھے طلبہ میں ہوتا۔ ڈاکٹر دیوراج، مسز داس گپتا اور ڈاکٹر راج نرائن خاص طور سے مجھ سے بہت خوش تھے، کلاس میں اچھے سوال کرتا، اچھے جواب دیتا، ہر دوسرے مہینے ٹیسٹ ہوتے اور ان میں اچھے نمبر ملتے، لیکن پریشان بھی رہتا کہ سکون سے پڑھائی کرنے کے لیے کافی وقت نہیں ملا تو فرسٹ ڈویژن آنے سے رہی۔

ایک دن ڈاکٹر دیوراج نے افلاطون کے عین (Idea) کے بارے میں کہا یہ Idea کے بجائے Ideal ہوتا تو بہتر تھا۔ پھر اس کی Copy of the copy کی تھیوری سمجھانے لگے۔

وہ افلاطون پڑھا رہے تھے اپنا فلسفہ نہیں اس لیے ان پر تو کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا تھا اور افلاطون پر، جس کے بارے میں برٹرنڈ رسل نے کہا ہے کہ بعد کا سارا فلسفہ اس کی ''جمہوریہ'' پر حواشی کی حیثیت رکھتا ہے، اتنا کہا اور لکھا جا چکا ہے کہ اب کہنے کے لیے شاید ہی کچھ نیا باقی بچا ہو۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور میں نے وضاحت چاہی۔

"Sir, are the ideas substantive or unsubstantive?"

ڈاکٹر دیوراج نے میری طرف دیکھا، کسی قدر حیرت سے، اور یہ کہتے ہوئے کہ میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو، دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے بیٹھ گئے، کہنیاں میز پر ٹکائے ہوئے۔ تقریباً پانچ منٹ وہ اسی طرح بیٹھے رہے، پھر انھوں نے سر اٹھایا اور وہ کہا جس کا میں تصوّر

بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"I cannot meet your objection and do not know how Plato would have met it"

میں حیران رہ گیا۔ میں اس توصیف کا مستحق بالکل نہ تھا۔ میں نے تو صرف ایک بات پوچھی تھی۔ میں نے قطعاً، قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بس ایک دھندلا دھندلا سا خیال ذہن میں تھا کہ Ideas اگر غیر حقیقی، غیر وجودی ہیں تو ان سے ایسی چیزیں کیسے جنم لے سکتی ہیں جن پر حقیقت کا اشتباہ کیا جا سکے اور حقیقی اور وجودی ہیں تو دنیا مایا جال کیسے ہوگئی اور اس کی نمائندگی یا نقل درنقل سے بڑے فن پارے، شہ پارے کیسے وجود میں آ گئے۔

اس میں سے بہت کچھ ممکن ہے بعد میں سوچا ہوا ہو، کہنا دراصل یہ تھا کہ ڈاکٹر دیوراج ایسے تھے جو کہہ سکتے تھے I cannot meet your objection۔ اس وقت بھی یونیورسٹی میں شاید ایک آدھ ہی ایسا استاد رہا ہو جس میں اس طرح کا اعتراف کرنے کی جرأت ہو اور اب تو ہر جاہل عقلِ کل ہے اور علم کا سمندر بھی۔

ایک دن قومی آواز میں بیٹھے بیٹھے میں نے سوچا کہ سال بھر تو یونیورسٹی کھلی بھی نہیں رہتی، پڑھائی بھی بمشکل چار چھے مہینے ہی ہوتی ہے۔ اسی وقت ذہن میں آیا کہ ان روپوں کا مقصد یہ ہے کہ ریڈیو اور ماہنامہ نیا دور وغیرہ سے بھی ہاتھ کھینچ لوں۔ یہی کیا بھی اور قومی آواز سے پورے چھے مہینے کی چھٹی کی درخواست دے دی جو منظور ہوگئی لیکن آج کل، آج کل ہوتے ساڑھے چار مہینے، پھر چار مہینے کی رہ گئی۔ اسلم صاحب کے یہاں کا ٹیوشن بہرحال باقی رکھا کہ قرض ادا کرنا تھا، پھر بھی پڑھائی میں دل تو بہت لگانا چاہتا لیکن حالات ساتھ نہ دیتے۔

پھر مجھ سے دفتر کے لوگ پوچھنے لگے کہ کب سے چھٹی پر جا رہا ہوں۔ میں کیا جواب دیتا؟ کبھی مسکرا کے رہ جاتا، کبھی ٹال جاتا۔ ریڈیو کے دو پروگراموں کے لیے معذرت کر چکا تھا، سوچتا کہ یہاں سے بھی چھٹی لے لی تو اسلم صاحب کے یہاں کے صرف پچاس روپے رہ جائیں گے۔ پچاس روپے مہینہ تو ابھی کٹ رہے تھے۔ بلکہ میں کٹا رہا تھا اور ان ایک ہزار روپوں کا کوئی پتا نہ تھا۔

ایک بری بات ذہن میں آئی۔ میں نے ابراہیم بھائی کو بتایا تھا کہ ایک ہزار روپے کے لیے مجھ پر کس طرح بوجھ بنا دیے گئے ہیں اور یہ کہ اس پر مجھ سے اظہار افسوس کیا جائے۔ انھوں نے کہا تھا لوگ اب اپنی حیثیت کے ہوگئے ہیں، میں کسی کو مجبور نہیں کر سکتا۔ مجھے اس سے جانب داری

کی بو آئی تھی لیکن یہ بوجھ سے چپکی نہیں رہی۔ ہوا میں تحلیل ہوگئی...پھر انھوں نے ایک دن ایسا جملہ کہا تھا جس کا اس وقت کی بات چیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ جملہ کچھ اس قسم کا تھا کہ ''کسی کو زیادہ امیدیں نہیں رکھنا چاہیے'' اور پھر ایک دن کہا، ''بتاشہ بیٹھ چکا ہے'' (یہی چار الفاظ تھے)۔

لیکن روپے نہیں آرہے تھے۔ ایک دن سلطانہ حیات دفتر آئیں۔ آتی ہی رہتی تھیں۔ مجھے بلایا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں پھر پوچھا کہ چھٹی لی ہے، کب سے جارہے ہیں۔ میں نے کہا جلد ہی، کہنے لگیں کیا کسی چیز کا انتظار ہے، میں ہوں ہاں کرتا اور الجھتا رہا۔ پھر ایک منسٹر کی بیوی نے ایک شاعر کے ذریعے بلوایا۔ میں جا نہ سکا تو کچھ ایسی ہی بات انھوں نے بھی انھی شاعر سے کہلائی۔ میں سمجھا ''اظہار افسوس کرنے'' کی بات دور تک چلی گئی ہے۔

میں نے شاید ایک مہینہ پہلے چھٹی لی اور باقی کینسل کرادی۔

ان حالات میں جیسے پرچے ہونے چاہیے تھے ویسے ہی ہوئے۔ دو پرچوں میں نمبر اچھے تھے، دو میں پچھلے سال ہی ایسے۔

وائیوا لینے علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ کے سربراہ پروفیسر عمرالدین آئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے زیادہ تر سوال Epistemology پر کیے جن کے جواب میں نے بہت اطمینان بخش دیے۔ شام میں طلبہ کی طرف سے دی جانے والی پارٹی میں میری تعریف بھی کی لیکن نمبر اچھے نہیں ملے۔ انھوں نے سہیل کو تخلص سمجھ کر وائیوا کے بعد پارٹی میں غزل سنانے کی فرمائش بھی کی تھی۔ یہ غزل میں نے ڈالی گنج پل سے ندوہ روڈ پر جو اُن دنوں سنسان پڑی رہتی تھی کہہ لی تھی۔ دو شعر اب بھی یاد ہیں:

منزلیں اَور بھی دشوار ہوئی جاتی ہیں
کتنی دشوار ہوئی جاتی ہے ہر اِک منزل
ہم تو بس ایک تمنا پہ جیے جاتے ہیں
کبھی انسان کا دیکھیں گے حسیں مستقبل

ایم۔اے پارٹ ون کے طلبہ نے فیئرویل پارٹی کی تو ڈاکٹر راج نرائن نے میری نسیم طاہر مرزا سے زیادہ تعریف کی۔ میں نے احتجاج کیا تو انھوں نے کہا، ''طاہر مرزا کو کیمسٹری میں بٹھا دو تو وہاں بھی ٹاپ کریں گی، تمھیں فلسفے سے دلچسپی ہے۔''

نسیم طاہر مرزا نے ٹاپ کیا۔ میری سیکنڈ ڈویژن تھی۔ نسیم نے کچھ دنوں ناری شکشا نکیتن

میں پڑھایا، پھر پاکستان چلی گئی اور کسی یونیورسٹی سے متعلق ہوگئی۔ جب بھی آتی خورشید صاحب کے ذریعے مجھے مطلع کرادیتی۔ ذرا نہ بدلی تھی۔ سرمے کی پتلی سی لکیر اب بھی آنکھوں میں ہوتی۔ آخری ملاقات ہوئی تو وائس چانسلر ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ بس موجودہ وائس چانسلر کی مدتِ کار ختم ہونی تھی۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔

اس کے یکا یک انتقال کی خبر دینے خورشید بک ڈپو کے مالک خورشید صاحب کے بھائی نصرت پبلشرز آئے تھے۔ اس کی یاد اب بھی آتی ہے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں ابراہیم بھائی پھر آئے۔ گھومنے پھرنے کا پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

ایک دن ہم لوگ کیپٹل پکچر ہاؤس کے سامنے کھڑے تھے، یاد نہیں، ٹکٹ لے کے شو چھوٹنے کا انتظار کر رہے تھے یا یوں ہی۔ کچھ کہتے کہتے انھیں کچھ یاد آ گیا اور انھوں نے کہا، ”عابد بھیّا روپے بھیجنے میں دیر ہوگئی۔“

”کیا آپ نے بھیجے تھے؟“

”آپ کو نہیں...“ کہتے کہتے ان کے ہاتھ سے چابی کا گچھا چھوٹ گیا۔

جن صاحب کے ذریعے روپے بھیجے گئے تھے انھوں نے مجھے مطلع تک نہ کیا تھا، روپے دینا تو دور کی بات۔

ابراہیم بھائی نے روپے براہ راست یوں نہیں بھیجے تھے کہ معلوم نہیں بینک میں میرا اکاونٹ ہے یا نہیں۔ اور یہ بات ٹھیک ہی تھی، کوئی اکاونٹ نہ تھا۔ پوسٹ آفس میں ضرور تھا جس میں پندرہ بیس روپے پڑے رہتے۔

ایک دن معلوم ہوا کہ فیس کی دو قسطیں ادا کی گئی تھیں۔ مجھے کیا معلوم ہوتا، دو کیا زیادہ قسطیں چڑھی ہوئی تھیں، بات آئی گئی ہوئی۔ پھر ایک دن ابراہیم بھائی نے کہا، ”ایسے لوگ نہ ہوں تو بات بگڑے ہی کیوں۔“

اور پھر بات بگڑتی ہی گئی۔

ابراہیم بھائی ایک ایسی صاف شفاف اور آر پار نظر آنے والی شخصیت کے مالک ہیں کہ دوسری مشکل سے ملے گی۔

برسوں بعد پاکستان سے آئے۔ ہمارے گھر بھی آئے تو انیس نے جانے کیوں اس

دوران آنے جانے والوں سے کہہ دیا کہ امریکا سے آئے ہیں۔ جاتے وقت بولے، ''بھائی بہت ہو گیا، اتنی دیر غلط بات پر خاموش رہنا بھی مشکل ہے۔''

یہ تو پہلے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ بغداد سے آنے والے روپوں سے فیس کی دو قسطیں جمع کی گئی ہیں۔ لیکن میرے لیے اس وقت ان کی واپسی ممکن نہ تھی۔ پھر ایک بار ابراہیم بھائی آئے تو یہ روپے میں نے واپس کر دیے۔ اپنے ہاتھوں سے نہیں ان کی چھوٹی بہن انیس کے ہاتھوں۔

کام بنانے والے دور تھے، بگاڑنے والے قریب۔ سو کام بگڑتے ہی گئے... اور اب کیا؟ بنیں یا بگڑیں، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں۔

◆◆◆

پی۔ایچ۔ڈی

ایم۔اے۔ میں فرسٹ ڈویژن تو نہیں آئی لیکن پی۔ایچ۔ڈی میں داخلے کے لیے جتنے نمبروں کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ ضرور تھے۔

ڈاکٹر دیوراج نے اے۔جے۔ایئر کے Logical Empiricism پر کام کرنے کا مشورہ دیا، مجھے بھی دلچسپی تھی۔ نام رجسٹر کرایا۔ فیس کی پہلی قسط تو دینی ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ جمع کردی یہ قسط شاید دوسو روپے کی تھی۔ معلوم ہوا خزانہ ادھر سے ادھر منتقل ہوگیا۔

دیوراج صاحب کی نگرانی میں Synopsis بنایا، مسترد ہوگیا، دوسرا بنایا، دیوراج صاحب ہی کے مشورہ سے، یہ بھی مسترد ہوگیا۔ دیوراج آستینیں چڑھانے والے انسان نہ تھے، چنانچہ چپ رہے، اگرچہ غصہ انھیں بہت آیا۔ لیکن اس بار Synopsis خود انھوں نے بنایا۔

یہ Synopsis بھی مسترد ہوگیا اور سوال وہی پوچھا گیا جو پہلے بھی پوچھا گیا تھا۔

"At what conclusion will you arrive at?"

میں اس کا کیا جواب دیتا؟ خاموشی سے لوٹ آیا۔

لیکن کالی پرشاد کا یہ رویہ بلا سبب نہیں تھا۔ دو باتیں تو تھیں، وہی سمپورنا نند اور مولانا آزاد والی، اور ایک یہ کہ ان کے خلاف جو تحریک چلی تھی اس کے سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ میرے پاس دو ''خطرناک'' خطوط ہیں۔ یہ خطوط واقعی خطرناک تھے۔ ایک طرف ان کی قیمت یونیورسٹی میں ملازمت آنکی گئی تھی اور دوسری طرف دس ہزار روپے نقد اور یونیورسٹی میں ملازمت کا حتمی وعدہ۔

ایک طرف سے کہا گیا، "A University Job is assured provided you prove yourself worthy of it"

میں نے "prove yourself worthy of it" کے معنی سمجھ کے نہ دیے۔ ان کا کہنا

تھا، "You are intelligent enough to understand it"

میں اتنا عقلمند نہ تھا۔ بات اسی پر ٹوٹی۔

دوسری جانب کی پیش کش پر میرا جواب تھا۔ وہ میرے استاد ہیں، غلط یا صحیح، میں جو چاہوں کروں لیکن کوئی ان پر حملہ کرے گا تو اس کا وار پہلے میرے سینے پر ہوگا۔

ایک بات اور بھی تھی۔ یونیورسٹی میں ایک لڑکی تھی، بے حد خوبصورت اور شعر وشاعری کی عاشق جس سے اس کا حسن کچھ اور نکھر آیا تھا۔ میرے صدر شعبہ کو غلط فہمی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں، نام ایک جگہ آ گیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہوں گا۔ علاوہ اس کے کہ یہ وہی لڑکی تھی جس کے لیے سائکالوجی کے نوٹس اور Lab experiments نقل کرنے میں مَیں نے مدد کی تھی۔

(کچھ دنوں بعد خشونت سنگھ کے ''السٹریٹیڈ ویکلی'' نے ملک کے اہم شہروں پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا اور لکھنؤ پر مضمون کے لیے ایم۔ سی۔ کو جانے کیسے راضی کرلیا۔ ایم۔ سی۔ نے اپنے مضمون میں لکھنؤ یونیورسٹی کو ایک جملے میں نپٹا دیا تھا:

> Lucknow has a University also where teachers vie with students in love-making.)

پھر کالی پرشاد وائس چانسلر ہو گئے اور کچھ دنوں بعد سی۔ بی۔ گپتا وزیر اعلیٰ، جنھوں نے نہایت خوبصورتی سے ان سے استعفیٰ لے لیا۔ استعفیٰ دے کر کالی پرشاد اپنی قیام گاہ تک یونیورسٹی کے اندر سے نہیں اپنی پسندیدہ سڑک، یونیورسٹی روڈ سے، ہوکر گئے۔ فٹ پاتھ پر میں دوسری طرف سے آ رہا تھا۔ ان دنوں بھی سڑک تقریباً اتنی ہی چوڑی تھی جتنی اب ہے اور دائیں بائیں کا کچھ ایسا معاملہ نہ تھا۔ انھوں نے داہنی جانب گاڑی روک دی۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب دینے کے بجائے کہا، ''اب تو تمھارے سینے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ میں نے استعفیٰ دے دیا''۔

میں جذباتی ہوگیا، ''آپ میرے گرو ہیں... مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دیجیے۔''

انھوں نے جیب سے رومال نکالا، موٹے کالے فریم کا چشمہ اوپر کیا، اور آنسو پونچھے۔

''میں نے بھی کیا چھوڑا تھا؟'' انھوں نے کہا اور یہ جا وہ جا۔

میں بھی رو رہا تھا۔

آخری ملاقات شاید دو تین برس بعد ہوئی۔ ان کے گھر پر، جب سپریم کورٹ کے حکم پر

پولیس وہاں آئی۔ ان کا بیٹا اپنا بچہ لے کر جرمنی سے بھاگ آیا تھا۔ ماں نے سپریم کورٹ سے دادرسی کی تھی۔ میں بھی دوسرے رپورٹروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو کہا۔

"Abid. This is not my doing, my name may better not be involved"

جہاں تک یاد ہے، لکھنؤ کے ہر اخبار میں خبر تو تھی، ان کا نام کہیں نہیں تھا۔

کالی پرشاد سے زیادہ ذہین انسان میں نے نہیں دیکھا۔ وہ فلسفہ کی کسی کتاب کے صرف اوراق پلٹنے کے بعد اس پر گھنٹوں بے تکان بات کر سکتے تھے۔

◆◆◆

نیشنل ہیرالڈ

کسی انگریزی اخبار سے متعلق ہونے کی بات میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھی اور نہ میں خود کو اس کا اہل ہی سمجھتا۔ ہائی اسکول کے بعد کلاس روم میں اردو نہ پڑھنے کے باوجود خیال تھا کہ اردو صحافت میں اتنی اہلیت تو پیدا کر ہی لوں گا کہ لشتم پشتم زندگی گذار لوں۔ سچ پوچھیے تو میرے ذہن میں مستقبل کا کوئی نقشہ ہی نہ تھا لیکن قسمت نے کوئی نقشہ ضرور بنا رکھا تھا جو خاصا ٹیڑھا میڑھا تھا اور شاید اس کے روشن ترین مقام کا نام تھا نیشنل ہیرالڈ۔ ایم۔اے۔ کر کے پی۔ایچ۔ڈی۔ کے Synopsis کی منظوری کے لیے کوشش کر رہا تھا کہ آل انڈیا ریڈیو پر ملک بھر کی یونیورسٹیوں کی ٹیموں کے درمیان مباحثوں کے مقابلے کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیم کی قیادت میرے سپرد ہوئی۔ اس ٹیم میں صدیق اشرف، عبدالمنان اور آفتاب اختر شامل تھے۔ پہلا مقابلہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر بنارس یونیورسٹی کی ٹیم سے ہوا جس میں لکھنؤ یونیورسٹی سرخرو ہوئی۔ اس کے بعد کے مقابلے دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ہوئے اور فائنل لکھنؤ اور غالباً بمبئی (اب ممبئی) یونیورسٹیوں کے درمیان ایک بڑے اسٹوڈیو میں منتخب حاضرین کی موجودگی میں ہوا۔ حاضرین میں انجم الحسن اور ان کے توسط سے بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جن کا کسی نہ کسی طرح لکھنؤ سے تعلق تھا۔ نتیجے کا اعلان ہوتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ کچھ لوگ تو کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ انجم الحسن ان میں پیش پیش تھے۔

اگلے دن ایک قومی اخبار کے صفحہ اوّل کی خبر کی سرخی تھی Lucknow boys bag AIR award/۔ ہم چاروں دریا گنج میں انجم الحسن کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ یہ تو نہیں یاد کہ اس وقت گولچا سینما تھا یا نہیں لیکن اب اسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ انجمل کا مکان اس کے تقریباً سامنے سڑک کی دوسری طرف پہلی منزل پر تھا۔ جب بھی دہلی جاتا ہوں تو اس سڑک سے گذرتے وقت اپنے مرحوم دوست کے مکان کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔

ان دنوں نجم الحسن کا پولینڈ کے سفارت خانے میں آنا جانا لگا رہتا۔ اتفاق سے ایک آدھ دن بعد پولینڈ کے قومی دن کے موقع پر اشوکا ہوٹل میں ایک پر تکلف عصرانہ دیا گیا۔ نجمل نے ہم لوگوں کے لیے بھی دعوت نامے حاصل کر لیے اور ہم سب اشوکا تک دو گاڑیوں میں گئے۔ ان میں سے ایک ٹیکسی تھی اور دوسری نجمل کے کسی دوست کی کار۔ اس وقت دریا گنج سے اشوکا تک ٹیکسی کا کرایہ پانچ روپے تھا۔

عصرانے میں ایک سے ایک لوگ موجود تھے... سفارت کار، وزرا، بڑے اخباروں کے نامی گرامی صحافی، ہندی، اردو اور انگریزی کے بڑے بڑے ادیب جن میں سے بیشتر سے میں واقف نہ تھا۔

انگور کی بیٹی سے میرا تعارف اسی ہوٹل میں ہوا اور چوں کہ یہ پہلا تجربہ تھا اس لیے حلق سے دماغ تک پہنچنے میں اسے دیر نہ لگی۔ اسی حالت میں مجھے اشوکا کے وسیع وعریض ہال کا ایک ستون دوسرے ستونوں سے کچھ زیادہ چوڑا نظر آیا اور میں نے پاس جاکے دیکھا تو پتہ چلا ایم۔سی۔ اس سے ٹیک لگائے کھڑے ہیں۔ گلاس ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا، "Congratulations"

ایم۔سی۔ کی آواز ایسی تھی کہ آسان سے آسان لفظ بھی مشکل ہی سے سمجھ میں آتا۔ لیکن اس وقت سیاق وسباق نے مشکل آسان کر دی اور میں نے کہا، "Thank you"

گلاس مئیں پہلے ہی میز پر رکھ چکا تھا لیکن یہ خیال ضرور تھا کہ ہوسکتا ہے انھوں نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا ہو۔ یہ سوچ کر کچھ کچھ ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن ایک بات پر حیرت بھی تھی کہ ہمیشہ تو وہ لوگوں میں گھرے رہتے تھے، اس وقت تنہا کیوں کھڑے ہیں۔ لکھنؤ میں ان کے بیشتر دوست کمیونسٹ یا ایسے دانشور تھے جو کمیونسٹ پارٹی کے قریب تھے۔ خود ان کا شمار ترقی پسندوں میں ہوتا لیکن سمجھ میں نہ آتا کہ اس وقت صورت اس قدر مختلف کیوں ہے۔

اسی وقت دماغ میں ایک کوندا لپکا کہ ان کو نظر انداز کرنے کی کوشش شاید اس لیے کی جارہی ہے کہ انھوں نے کیرالا کی کمیونسٹ حکومت کے خلاف چرچ کی تحریک کی پُر زور حمایت کی تھی۔ کمیونسٹوں کو ان سے یہ امید نہ تھی۔ وہ انھیں اپنا سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھیں تکلیف بھی زیادہ ہوئی اور ان کا ردِ عمل بھی سخت تھا۔

ان دنوں یہ بات مشہور تھی کہ نمبودری پد حکومت کو برطرف کرنے کے سلسلے میں پنڈت

نہرو کچھ ایسے پر جوش نہ تھے لیکن کابینہ کی میٹنگ میں نیشنل ہیرالڈ کے اداریے کا تراشہ دکھاتے ہوئے وزیر داخلہ گووند ولبھ پنت نے جب کہا کہ "ہوسکتا ہے آپ میری بات کو ایک رجعت پسند بڈھے کی بکواس سمجھیں، لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ یہ نوجوان کیا کہہ رہا ہے" تو پنڈت جی خاموش ہوگئے۔ پنڈت نہرو کے تذبذب کا ایک سبب تو یہ تھا کہ بنگال، اس وقت کے صوبہ مدراس، مشرقی اتر پردیش اور متعدد دوسرے علاقوں میں کمیونسٹ پارٹی کی مقبولیت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور دوسرا سبب تھا ان کا ماضی جس کے وہ سارے لوگ جو قدامت پسندی کی یلغار میں ان کے شانہ بہ شانہ کھڑے تھے، آج ان کے سامنے سینہ سپر تھے۔ کچھ ویسی ہی صورت تھی جیسی ۱۹۴۲ء میں پیش آئی تھی جب کانگریس نے ہٹلر اور مسولینی کے خلاف جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دینے سے انکار کردیا تھا۔ کانگریس میں اُس وقت کے ان کے دست و بازو، ڈاکٹر زیڈ احمد، ڈاکٹر مظفر احمد، نمبودری پد، ڈاکٹر علیم اور ڈاکٹر ادھیکاری وغیرہ ان سے جرأت انکار کے متقاضی تھے۔ پنڈت نہرو نے کانگریس کے اس فیصلے کو قوم پرستی کے ہاتھوں بین الاقوامیت کی شکست قرار دے کر اپنی پریشانی کا اظہار تو کیا لیکن اس جذباتی فیصلے کی مخالفت نہ کرسکے جس سے آخر کار قوم پرستی کو فرقہ پرستی کی چادر اوڑھ لینے میں مدد ملی۔

ایسا ہی کچھ اس بار بھی ہوا اور یہ آزاد ہندوستان میں وسیع النظری پر تنگ نظری کی سب سے بڑی فتح ثابت ہوئی۔ اس فتح نے برطانیہ کی طرح کے دو جماعتی سیاسی نظام کے تصور کو تقویت بخشی۔ ہندوستان میں عملی طور سے اس کا مطلب تھا ایک بائیں اور دائیں بازو کے درمیان کی پارٹی (سینٹرِسٹ) اور دوسری سراسر رجعت پسند پارٹی۔

میں رَو میں بہت آگے نکل گیا جب کہ کہنا صرف یہ تھا کہ ایم۔ سی۔ کے الگ تھلگ پڑ جانے کا سبب نمبودری پد حکومت کی جانب ان کا رویہ تھا۔

دو چار دن دہلی میں گذار کر لکھنؤ واپس آیا اور دفتر گیا تو عشرت صاحب نے کہا، "ایم۔ سی۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" جان ہی تو نکل گئی۔ خیال ہوا کہ انھوں نے ضرور میرے ہاتھ میں گلاس دیکھ لیا ہوگا۔ اب ڈانٹ پڑے گی۔ ساتھ ہی یہ ڈر بھی لگ رہا تھا کہ ان کی بات سمجھ میں نہ آئی تو کیا ہوگا۔

ایم۔ سی۔ تک رسائی خاصی مشکل سے ہوئی۔ ان کے سکریٹری گلاب رائے سریواستوا کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ انھیں قومی آواز کے ایک جونیر سب ایڈیٹر سے کیا کام ہوسکتا ہے۔ ان کا

خیال تھا کہ مجھے ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، لیکن میرے اصرار پر وہ ان سے تصدیق کے لیے گئے تو منہ لٹکائے ہوئے واپس آئے اور مجھے ان کے کمرے میں پہنچا کر لوٹ گئے۔

ایم۔سی۔ کے پہلے ہی جملے نے مجھے حیران کر دیا۔ انھوں نے انگریزی میں پوچھا، ''کیا تم ہمارے ساتھ کام کرنا پسند کرو گے؟''

شاید اس سوال سے حوصلہ پا کر ہی میں نے اپنے سیاسی خیالات کے سلسلے میں ان کے سوال کے جواب میں صاف صاف الفاظ میں انھیں بتا دیا تھا کہ میں کمیونسٹ تحریکوں میں سرگرم رہا ہوں۔ میں نے تو جوشِ جہاد میں ان سے یہ تک کہہ دیا تھا کہ میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہوں۔ سچ پوچھیے تو کیرالا کے مسئلے پر نیشنل ہیرالڈ کے رویے سے میں دل ہی دل میں ان سے ناراض بھی تھا۔

انھوں نے بی۔اے۔ اور ایم۔اے۔ میں میرے مضامین کے علاوہ یہ بھی پوچھا کہ امتحان میں سوالات کے جواب ہندی میں دیے تھے یا انگریزی میں اور دو چار دوسری باتیں دریافت کرنے کے بعد یکا یک "Now you may go" کہہ کر مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

لیکن جب تین چار دن بعد ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے مینجنگ ڈائرکٹر اما شنکر دیکشت نے مجھے بلا کر کہا کہ تمھاری ملازمت قومی آواز سے نیشنل ہیرالڈ منتقل کی جا رہی ہے تو میں خوش بھی تھا، حیران بھی اور پریشان بھی کیوں کہ مجھے اپنی انگریزی کے بارے میں کوئی خاص خوش فہمی نہ تھی اور انگریزی صحافت سے تو بالکل ہی ناواقف تھا۔ خوشی کا سبب تو ظاہر ہے۔

اس وقت مجھے حیات اللہ انصاری کے ایک فیصلے سے بڑی مدد ملی۔ انھوں نے دیکشت جی کو لکھا کہ قومی آواز سے میری منتقلی چھے ماہ بعد ہی ممکن ہو سکے گی کیوں کہ اس دوران کسی نئے شخص کی تقرری کے بعد اسے تربیت بھی دینی پڑے گی۔ اُس وقت تو اس فیصلے سے میری خوشیوں پر اوس پڑ گئی تھی لیکن انگریزی صحافت میں مجھے جو تھوڑی بہت کامیابی ملی اس کی بنیاد انھی چھے مہینوں میں پڑی۔

میں نے ایم۔سی۔ کی اجازت سے قومی آواز میں اپنی پوری ڈیوٹی کرنے کے علاوہ نیشنل ہیرالڈ میں کام سیکھنا شروع کر دیا۔ پہلے ہی دن معاملہ مسٹر کرپلانی سے ہوا جو چیف سب ایڈیٹر تھے۔ وہ اچاریہ کرپلانی کے رشتے دار تھے۔ انھوں نے ایسی دس بیس خبریں جوڑی کی

ٹوکری میں پھینک دی جاتیں مجھے ''سب'' کرنے کے لیے دے دیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کا کیا کروں کیوں کہ کام مجھے بالکل نہ آتا تھا۔ میں نے کرپلانی سے پوچھا کہ ان کا کیا کروں تو انھوں نے جھنجھلاتے ہوئے خود سے کہا، ''ایسے آدمی کو کیا کام سکھایا جائے جو جانتا ہی نہیں کہ اسے سکھنا کیا ہے۔'' مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی آواز اتفاق سے بلند ہوگئی تھی یا ارادتاً لیکن مجھے ان کی یہ بات اس قدر بری لگی کہ میں نے کسی قدر خفگی کے ساتھ اونچی آواز میں کہا، ''یہ بات تو آپ کو ایم۔سی۔ سے پوچھنی چاہیے''۔

انھوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا، پھر اپنا کام کرنے لگے۔

کیا کرتا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اے۔ کے۔ ورما نیشنل ہیرالڈ کی گھوڑے کی نال کی شکل کی میز پر میرے پاس بیٹھے تھے۔ انھیں میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے بتایا کہ پیراگراف کا نشان ''] '' ہے، جس حرف کو کیپٹل کے طور پر لکھنا ہو اس کے نیچے ایک چھوٹی سی لکیر کھینچ دی جاتی ہے، ٹیلی پرنٹر کی خبروں میں الفاظ کبھی کبھی دوبارہ ٹائپ ہو جاتے ہیں، انھیں کاٹ دیا جاتا ہے اور گرامر اور اسپیلنگ پر توجہ دینی ضروری ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان چھوٹی خبروں پر سنگل کالم کی سرخیاں لگانی ہوں گی۔ یہ ابتدائی باتیں بتا کر انھوں نے وہ لمبی سی دفتی جس پر سرخی کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے ٹائپ کے نمونے اور دو کالمہ سرخی میں ان حروف کی تعداد دی ہوئی تھی، میری طرف بڑھا دی۔

میری ایک اور دقت یہ تھی کہ گرامر بالکل نہ آتی (اب بھی نہیں آتی) اور اسپیلنگ میں بے حد کمزور تھا (اب بھی ہوں)۔ خیر، میں نے یہ چھوٹی چھوٹی خبریں نہایت توجہ سے ''سب'' کرنا شروع کیں اور اپنا کام مکمل کرنے کے بعد کرپلانی کی طرف بڑھا دیں۔ انھوں نے اسی طرح کی دوسری خبریں مجھے دیتے ہوئے کہا...

''ایڈیشن ریلیز کرنے کے بعد انھیں دیکھوں گا۔''

اس وقت بھی ان کی آواز میں کرختگی برقرار تھی۔ میں نے سوچا شاید ان کی آواز ہی ایسی ہے لیکن بعد کے ایک واقعے سے پتہ چلا کہ معاملہ صرف آواز کا نہ تھا۔

اس طرح میں انگریزی صحافت کے بالکل ابتدائی اسباق دھیرے دھیرے سیکھتا رہا اور جس دن میری ''سب'' کی ہوئی ایک نہایت مختصر سی خبر اندر کے کسی صفحے پر شائع ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ اس دن کا اخبار میرے لیے ہی شائع ہوا ہے۔ اس خبر کی سرخی تھی:

کرپلانی مجھے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کرتے جب کہ میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا۔ایک دن میں نے نرم سا احتجاج کیا تو انھوں نے کہا In fact آپ تو ہر ایک کو کہنا چاہیے لیکن وہ مجھے ''آپ'' اور دوسروں کو ''تم'' سے یا نام لے کر مخاطب کرتے رہے اور اس طرح انھوں نے غیریت کا پردہ، جو کچھ ایسا باریک بھی نہ تھا، پڑا ہی رہنے دیا۔

کرپلانی کے ایک مخصوص رویّے کا میں نے اشارتاً ذکر تو کر دیا لیکن مجھے اس بارے میں ان سے کوئی شکایت نہیں۔ کسی کو میرے بالکل دوسرے قسم کے رویّے کے بارے میں بھی تو شکایت ہو سکتی تھی۔ایک بار دہلی اردو اکادمی کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے دیویندر اِسّر نے میری موجودگی میں کہا تھا، ''سہیل میرے بارے میں کہتے ہیں کہ اِسّر آدمی تو اچھا ہے لیکن کمیونسٹ مخالف ہے۔'' خیر یہ تو ایک مذاق تھا۔

کرپلانی سب اڈیٹر بہت اچھے تھے۔ان کے کام کی رفتار بہت تیز تھی اور وہ آٹھ کالمہ سرخی تک حروف گنے بغیر لگا دیتے۔ایم۔سی۔ان کے کام سے بہت خوش تھے اور انھیں یقین تھا کہ ان کے ذاتی خیالات کچھ بھی ہوں وہ اخبار کی پالیسی پر ہمیشہ عمل کریں گے اور انھوں نے ہمیشہ کیا بھی یہی۔ ان کی سرخی خبر سے چپک کے رہ جاتی تھی۔ میں نے سرخی لگانا ان سے اور ''سبنگ'' ایچ۔کے۔گوڑ سے سیکھی۔اب اسے اتفاق ہی کہیے کہ دونوں ہی میرے نظریات کے داہنی جانب تھے، ایک زیادہ، دوسرا کم۔صحافت سے رشتہ توڑنے کے بعد کرپلانی آر۔ایس۔ایس۔کے صدر دفتر میں کسی کلیدی عہدے پر چلے گئے جب کہ ایچ۔کے۔گوڑ نے قوم پرستی اور Democratic Socialism کا پردا ہمیشہ ڈالے رکھا۔

ہیرالڈ میں اضلاع کے نمائندوں کی کاپی ''سب'' کرنا ایک مشکل مرحلہ ہوتا کیوں کہ ایم۔سی۔اصرار کرتے کہ یہ کاپی دوبارہ لکھنے کے بجائے صرف ''سب'' کی جائے تا کہ ہر خبر کی زبان کا اپنا ''ذائقہ'' باقی رہ جائے۔مسٹر لوتھر کی تقرری سے پہلے یہ کام سارے ہی جونیر سب ایڈیٹروں کو کرنا پڑتا۔سب جان بچاتے، میں بھی بچاتا لیکن کابل جانا ہے تو کوہان سے سابقہ پڑے گا ہی۔ایسے مواقع پر قومی آواز کی محنت کی عادت ساتھ دیتی۔اسی نے ترقی کے راستے کھولے لیکن دشمن بھی پیدا کیے اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ ایم۔سی۔نے مینجمنٹ کو لکھ دیا کہ میری ''خدمات'' قومی آواز کو لوٹا دی جائیں۔

یہ کہانی دلچسپ ہے اور سبق آموز بھی۔ اسی لیے اسے بیان کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس میں نازک مقام بھی آتے ہیں، چنانچہ ضمیر کو گواہ بھی بنانا ہوگا۔

مسز فرینکلن

ایم۔سی۔ شعبۂ ادارت میں لڑکیوں اور خواتین کو رکھنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی موجودگی کام میں حارج ہوتی ہے اور غیر ضروری رقابتیں جنم لیتی ہیں۔ مسز مینن کا اسکینڈل پہلے ہو ہی چکا تھا۔ لیکن یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ خیر، عشرت علی صدیقی کے مطابق تو ایم۔سی۔ Woman-hater تھے۔ انھوں نے نہ شادی کی تھی نہ کوئی عورت ان کے دوستوں میں شامل تھی۔ دل کے دورے کے بعد بلرام پور اسپتال میں ایک لیڈی ڈاکٹر ان میں بہت دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس نے گھر کا فون نمبر حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انھوں نے سنی اَن سنی کر دی۔ بعد میں انھوں نے عشرت علی صدیقی سے کہا تھا کہ ٹیلی فون نمبر دے دیتا تو اسکینڈل ضرور ہو جاتا۔

لیکن جانے کیا ہوا کہ ایک دن دفتر میں مسز فرینکلن نام کی ایک خاتون نمودار ہوئیں۔ یہ غالباً ۱۹۶۲ء کے شروع کی بات ہے۔ ان کی انگریزی اچھی تھی اور وہ خاصی قبول صورت تھیں۔ ان کی ثانی الذکر خوبی کی وجہ سے کئی لوگ انھیں کام سکھانے کے لیے بے چین نظر آتے۔ انھوں نے تھوڑی بہت ''سبنگ'' تو بہت جلد سیکھ لی لیکن شاید اپنے مسائل کی وجہ سے، جن میں اقتصادی بدحالی، جسے ماضی کی خوش حال زندگی اور بعض دوسری باتوں نے اور بھی تکلیف دہ بنا دیا ہوگا، وہ کام سیکھنے کی رفتار برقرار نہ رکھ سکیں۔ وہ مطلقہ تھیں۔

مسز فرینکلن کی سنجیدگی، ان کی خاموش مزاجی اور لیے دیے رہنے کے انداز کے باوجود چند لوگ ان کے چاروں طرف جال بچھانے لگے۔ کبھی کبھی وہ خاصی پریشان نظر آتیں لیکن نہ وہ اپنی شکل وصورت تبدیل کر سکتی تھیں نہ انگریزی بولنے کا خوبصورت انداز اور نہ شائستہ مزاجی۔ کچھ لوگوں نے ان پر ڈورے ڈالنے شروع کیے جن میں ہلدر (نام بدل دیا گیا ہے) خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ وہ اصل شکاریوں کے لیے لاسے کا کام انجام دیتا تھا۔ مسز فرینکلن سے میرے تعلقات بس صورت آشنائی کی حد تک تھے، دو چار بار بات چیت بھی ہوئی تھی، لیکن محض رسمی۔

ایک دن میری ڈیوٹی مڈ کی تھی (یہ ڈیوٹی دن کے ۲ بجے سے ۸ بجے رات تک رہتی اور اس میں ڈاک ایڈیشن تیار کیا جاتا) شفٹ انچارج کے سامنے میں اور مسز فر-ینکلن بیٹھے تھے۔ وہ بہت اداس تھیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں لیکن وہ اپنے آنسو اس خوبصورتی سے پونچھ لیتیں کہ شفٹ انچارج کو جن کی کرسی کچھ فاصلے پر تھی، شاید ہی اندازہ ہوتا ہو۔ اس سارے دوران نئی صورت حال کے پیشِ نظر میں کچھ زیادہ ہی احتیاط برتنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہلدر اور وہ، جن کا وہ آلۂ کار تھا، اور مرکزِ اقتدار کے قریب کا ایک شخص میرے لیے مشکلیں کھڑی کر سکتے ہیں۔

اسی دوران شفٹ انچارج مجھ سے یہ کہہ کر کہ ابھی آتا ہوں کسی کام سے باہر گئے تو مسز فر-ینکلن نے مجھ سے کہا، "Mr. Suhail, may I talk to you in confidence?"

"Of course, why not"، میں نے جواب دیا۔ انکار کرنا ممکن نہ تھا۔

میرا جواب سن کر انھوں نے انگریزی میں کہا کہ ہلدر مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔ کل اس نے میری ''سب'' کی ہوئی کئی خبریں پروف ریڈنگ سیکشن سے حاصل کر کے مجھے دکھائیں اور کہا کہ اس طرح کی ''سبنگ'' کر کے تم بہت دنوں ہیرالڈ میں نہ رہ سکو گی۔ ان کاپیوں پر جگہ جگہ لال پینسل سے نشان لگے ہوئے تھے۔

یہ سب سن کر مجھے بہت تکلیف ہوئی لیکن مجھ ایسا جونیر سب ایڈیٹر کیا کر سکتا تھا، چنانچہ میں نے کہا۔

''آپ مسٹر شیلیندر سے بات کیجیے''۔

''شیلیندر سے؟ وہ جو چیف سب ایڈیٹر ہیں؟ ہلدر مجھے انھی کے گھر تو بلا رہا ہے یا پھر حضرت گنج میں اپنے گھر۔ وہ کہتا ہے کہ ان دونوں جگہوں میں سے کہیں آ جایا کرو۔ ہم لوگ تمھیں ''سبنگ'' سکھا دیں گے۔'' جملہ پورا کرتے کرتے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور انھوں نے آنسو چھپانے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔

اسی وقت میں نے دیکھا کہ ٹیلی پرنٹر کے پاس والے چھوٹے سے کمرے میں جہاں بعد میں اسسٹنٹ ایڈیٹر بیلور بیٹھتے تھے، ہلدر کھڑا تھا۔ اس کی ڈیوٹی رات کی تھی اور وہ صرف مسز فر-ینکلن پر نظر رکھنے کے لیے دفتر آیا تھا۔ میرا خیال ہے اس نے ہم دونوں کو بات کرتے ہوئے دیکھ کر موضوعِ گفتگو کا اندازہ ضرور کر لیا ہوگا۔

دو تین دن بعد مجھے دادے ابا کے وار بونڈس(War Bonds)[1] کے مقدمے کے سلسلے میں اورئی جانا پڑا اور پھر کچھ کاغذات حاصل کرنے کے لیے الٰہ آباد۔ میں نے چھٹی کی توسیع کی درخواست الٰہ آباد سے بذریعہ تار بھیجی۔ میری غیر حاضری نے ہلدر اور اس کے مربیوں کا کام آسان کر دیا اور اورئی جانے کے لیے چھٹی لے کر اس کی توسیع کے لیے الٰہ آباد سے درخواست نے میرے خلاف میدان خاصا ہموار۔ مجھے اورئی سے پھولپور تحصیل جانا پڑا تھا۔

ہفتے کے آخر کی دو چھٹیاں ملا کر آٹھ دن بعد دفتر آیا تو وہاں ماحول خاصا سرد تھا۔ کسی نے مجھے کام دیا نہ مجھ سے بات کی۔ اسی دوران صلاح الدین عثمان بھائی نے مجھے اشارے سے باہر بلایا اور کہا۔

'Don't you know? M.C. has transferred your services to Qaumi Awaz'

''کیوں؟'' میں نے پوچھا تو صلاح الدین بھائی نے کہا۔

''ٹھیک سے نہیں معلوم لیکن کام میں کچھ غلطیاں دیکھ کر ایم۔ سی۔ نے کاپیاں نکلوائی تھیں اور وہ تمھاری سب کی ہوئی تھیں۔''

پہلا خیال دل میں یہی آیا کہ یہ ہلدر کی شرارت ہے لیکن پھر اپنے غیر اطمینان بخش کام پر کڑھنے لگا۔ سچ پوچھیے تو اس وقت مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ یہ بھی لگتا کہ مجھے بہت ذلیل کیا گیا ہے۔ میں ایم۔ سی۔ سے ملنے گیا تو انھوں نے کہا۔

"Abid, I have transferred your services to Qaumi Awaz. You have a bright future there."

میں نے کہا:

"M.C. I am not interested in any bright future, I want to work under you and know my fault"

میرا یہ کہنا تھا کہ ایم۔ سی۔ نے اپنی میز کی دراز سے ''میری'' ایڈٹ کی ہوئی چند خبریں، جن میں جگہ جگہ انھوں نے لال پنسل سے گھیرے بنا دیے تھے، نکال کر میری طرف بڑھا

۱۔ میرے حق میں تین چار ہزار کی ڈگری ہو گئی تھی۔ لیکن اورئی پوسٹ آفس کی پیدا کردہ رکاوٹوں کے سبب میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ بہت دن بعد میں نے شمس الرحمن فاروقی صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے وعدہ بھی کیا کہ کام ہو جائے گا لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ میں ان سے مدد نہ لے سکا۔ چند بونڈ اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔

دیں۔

میں نے ان پر نظر ڈالی اور کہا، "Sir, this is not my work"

میرا جملہ سن کر انھوں نے کہا:

"What do you mean; a senior sub and Rai have identified your hand- writing."

میں نے کہا:

"May be, but none of these copy has been subbed by me"

'' گلاب رائے، گلاب رائے''

گلاب رائے آئے تو ایم۔ سی۔ نے کہا۔

"Abid says these are not the copy subbed by him, had you yours..f checked the handwriting?"

"Yes sir, in fact Haldar had done that and I believe.........."

لیکن ان کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ایم۔ سی۔ نے غصّے سے کہا۔

"You believed Haldar, that rogue; is Sinha there?"

گلاب رائے فوراً باہر نکلے۔ سنہا چیف پروف ریڈر تھے۔

سنہا آئے تو ایم۔ سی۔ نے کاغذات ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"Sinha, Whose, work is this?"

سنہا نے جگہ جگہ سے ہینڈ رائٹنگ غور سے دیکھی اور کہا:

"Sir, I am not sure, but it seems to be the work of that apprentice,"

ایم۔ سی۔ نے مجھ سے کہا، "You go and work"

میں نے کام شروع کر دیا اور اس کے بعد کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ ایک دن میں ڈیوٹی پوری کر کے باہر نکل رہا تھا تو ایم۔ سی۔ نے اپنے کمرے سے آواز دے کر مجھے بلایا۔ میں چق اٹھا کر ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے مجھ سے آنکھ ملائے بغیر کہا۔

"I am sorry, you were unnecessarily harassed"

یہ ایک طرح سے اظہار معذرت تھا جو دنیا کا کوئی اتنا بڑا ایڈیٹر نہ کرتا... یہ صرف ایم۔ سی۔ کر سکتے تھے، کوئی اور نہیں۔ کوئی اور ایڈیٹر نہیں۔

مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے سارے معاملے کی تحقیق خود کی اور سازش اور اس کے محرکات کا پتہ لگالیا۔

مسز فرینکلن سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ شاید اس کا موقع بھی نہیں ملا۔ چھٹی سے واپسی کے بعد میری ان سے ملاقات بھی نہ ہوسکی۔ پہلے انھوں نے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور پھر گھر سے استعفیٰ بھیج دیا۔ مسز فرینکلن کے اس طرح ہیرالڈ سے جانے کا مجھے بہت افسوس ہوا، خاص طور سے ان حالات کی وجہ سے جن میں ایک غم زدہ اور شریف عورت کو مزید غم سہنا پڑے۔

سال سوا سال بعد ایک دن ہیرالڈ کی عمارت کے سامنے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہم دونوں ہی رکشوں میں تھے، مخالف سمتوں میں۔ سڑک پر بہت بھیڑ تھی اس لیے رکشے رکوا کر ملاقات کرنا مشکل تھا۔ وہ اس سال سوا سال میں خاصی بڈھی ہوگئی تھیں۔

اس دن کے بعد سے آج تک نہ ان سے ملاقات ہوئی نہ انھیں دیکھا، البتہ ایک واقعے نے ان کی یاد دل میں پھر سے تازہ کردی۔ غالباً ۱۹۹۶ء میں جب میں پائنیر میں تھا ایک دن مکند نے جو ہیرالڈ میں میرے ساتھ رہ چکے تھے اور ان دنوں پائنیر میں تھے، مجھے بتایا کہ مسز فرینکلن آپ کی بہت تعریف کررہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں ہیرالڈ میں ایک ہی شریف انسان تھا۔

میں نے کسی قدر بے چینی سے پوچھا، ''وہ کہاں ہیں؟''

مکند نے کہا، ''میں تعزیت کے لیے گیا تھا۔ طویل بیماری کے بعد ان کے بیٹے کا میڈیکل کالج میں انتقال ہوگیا۔''

میں نے کہا، ''اس عمر میں انھوں نے اتنا بڑا غم کیسے برداشت کیا، وہ بالکل ٹوٹ گئی ہوں گی؟''

مکند نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھتا رہا اور آنسوؤں کے دو قطرے اس کی آنکھوں سے گر کر کوٹ کے کالر میں جذب ہوگئے... مکند سے ان کی دور کی عزیز داری ہے۔ مکند عیسائی ہیں۔

میں نے ان کا پتہ حاصل کیا۔ پکا ارادہ کیا کہ تعزیت کرنے ضرور جاؤں گا لیکن نصرت پبلشرز، پائنیر اور صحافت کی اداریہ نگاری سے وقت نہ نکال سکا۔ وہ آئی۔ ٹی۔ کالج اور پٹرول پمپ کے درمیان کہیں رہتی تھیں۔ ان کا گھر علی گنج کے میرے مکان سے کچھ ایسا دور نہ تھا۔

کبھی کبھی قدرت بھی بے سہارا اور ستم رسیدہ لوگوں کے ساتھ کیسا مذاق کرتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں اس کے کھیل وہی جانے لیکن وہ بھی نہ جانے تو کیسا رہے؟ شاید ایسا ہی جیسا مسز فرینکلن کے ساتھ ہوا۔

اب جب ان سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں، میں ان کی شرافت اور ان کے دکھوں کو سلام کرتا ہوں اور اگر وہ ہم میں نہیں ہیں تو ان کی روح کو... بے حد ادب اور احترام کے ساتھ۔

گروپ بندی

ان دنوں ہیرالڈ میں زبردست گروپ بندی تھی۔ پال صاحب اور ایچ۔ کے گوڑ کے علاوہ سارے ہی سینیئر لوگ نیوز ایڈیٹر چارلی بپٹسٹا (Charlie Baptista) کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔

لکشمی کانت تواری اور صلاح الدین عثمان جو ایم۔ سی۔ کے چہیتے تھے، بپٹسٹا کے مخالفوں میں شامل تھے۔ آٹھ دس لوگوں نے بپٹسٹا کے خلاف ایک میمورنڈم ایم۔ سی۔ کو دیا کہ انھیں فوراً برطرف کر دیا جائے اور یہ مطالبہ منظور نہ ہو تو اس محضر نامے کو استعفیٰ تصور کیا جائے۔ تواری نے یہ میمورنڈم پریس کلب کے صدر کی حیثیت سے اپنے خط کے ساتھ ایم۔ سی۔ کو بھیجا تھا۔

ایم۔ سی۔ بھی نیوز ایڈیٹر بپٹسٹا کے کام سے خوش نہ تھے لیکن ان سے بندوق کی نوک پر کام نہیں کرایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے مع لکشمی کانت تواری، سب کے استعفے قبول کر لیے۔ اب صرف دو تین سینیئر لوگ اور ہم، یعنی مجھ ایسے چار پانچ جونیر سب ایڈیٹر رہ گئے جو کام کرتے کرتے چار پانچ دن میں چور ہو گئے۔ ایسے میں جو جہاں سے ملا بھرتی کر لیا گیا۔ پائنیر سے ایک صاحب آئے جنھوں نے زندگی میں کبھی کام کیا ہی نہ تھا اور سینیئر سب ایڈیٹر ہو گئے۔ ایک صاحب ٹائمس آف انڈیا کے شعبۂ اشتہارات کے دس سال کے تجربہ کو اخبار کا تجربہ بتا کر سینیئر رپورٹر ہو گئے اور محکمۂ اطلاعات کے پی۔ این۔ بہل وزرا کے بیانات لکھتے لکھتے نیشنل ہیرالڈ کے چیف رپورٹر بن گئے۔

دو تین سال بعد اخبار نویسوں کی تنخواہوں کا اوارڈ آ گیا۔ میرے لیے خوشی بلکہ فخر کی بات یہ تھی کہ مجھے دو اضافی ترقیاں دی گئیں اور میں ان کے برابر آ گیا جو پت جھڑ میں پائنیر سے آ گئے تھے، لیکن سینیئر وہ مجھ سے بہر حال رہے۔ اس سب کے باوجود مجھ میں خود اعتمادی کی کمی تھی

جس کی وجہ سے اپنے کام پر بار بار نظر ڈالتا اور کبھی کبھی اپنی غلطیاں پکڑ بھی لیتا۔ ایک دن ایچ۔ کے۔ گوڑ نے ایک پریس نوٹ کی بنیاد پر خبر لکھنے کے لیے کہا۔ انگریزی کی پچیس تیس سطریں لکھنا تھیں، گھبرایا لیکن لکھ کرلے گیا تو انھوں نے دو کالمہ سرخی سے خبر کا آخری لفظ تک پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا، "You have arrived" اور کاپی پریس بھیج دی۔ گوڑ ایسے صحافی سے یہ بات سن کر بہت خوشی ہوئی اور اطمینان بھی۔

ایم۔سی۔ میرا بہت خیال تو کرتے لیکن کام کے سلسلے میں کوئی مروّت نہ برتتے۔ ایک واقعے کا ذکر تو آہی چکا ہے، ایک اور سن لیجیے۔ ان صاحب نے جو شعبۂ اشتہارات کے طویل تجربے کی بنیاد پر نیشنل ہیرالڈ کے شعبۂ ادارت میں بار پا گئے تھے گنگا پرشاد میموریل ہال کے ایک جلسے کی رپورٹنگ کی اور ان کی کاپی سب کرنے کے لیے مجھے ملی۔ میں نے زبان و بیان کی جو غلطیاں سمجھ میں آئیں درست کیں لیکن پہلے جملے کو جو بے حد طویل تھا ہاتھ بھی نہ لگایا، جب کہ اسے کم سے کم تین جملوں میں تقسیم کر دینا ضروری تھا۔ شاید اس وقت تک میں چھوٹے جملے لکھنے کی خوبیوں سے واقف نہ تھا۔

ایم۔سی۔ نے اخبار کے تراشے میں زبان و بیان کی دو ایک غلطیاں درست کر کے پہلے پیراگراف کے چاروں طرف لال پینسل سے گھیرا کھینچا اور لکھا:

> "The reporter wrote down a whale of a sentence and the sub-editor gobbled it up"

اس طرح کی غلطیوں کی نشاندہی ایم۔سی۔ لاگ بک میں کرتے لیکن کسی سب ایڈیٹر یا رپورٹر سے کوئی بڑی غلطی ہو جاتی تو اس کو ان کا خط ملتا جسے ہم لوگ Love Letter کہتے۔ مجھے بھی ضرور ملے ہوں گے لیکن کسی کی تفصیل یاد نہیں۔

پرسنل فائل میں اس طرح کی غلطیوں کا رکارڈ ہر اخبار کے دفتر میں رکھا جاتا ہے لیکن ہیرالڈ شاید واحد اخبار تھا جہاں اچھے کام کا بھی رکارڈ رکھا جاتا۔

صحافتی اخلاقیات کا جو معیار ایم۔سی۔ نے متعین کیا اور جس پر وہ زندگی بھر عمل پیرا رہے اس کا کچھ نہ کچھ حصہ شعبۂ ادارت کے بیشتر کارکنوں کو بقدر توفیق ملا اور بہت تھوڑا سا میرے حصے میں بھی آیا۔ نیشنل ہیرالڈ سے متعلق ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ ادارتی عملے کے کسی فرد کو کسی دوسرے اخبار (ہفت روزہ اور ماہنامے وغیرہ سب اخبار کی تعریف میں آتے ہیں) میں لکھنے کی اجازت

نہیں ہے۔ میرے لیے یہ خبر خاصی پریشان کن تھی کیوں کہ میں نیا دور، آج کل اور دوسرے جرائد میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتا اور اس سے تھوڑی بہت یافت بھی ہوجاتی، چنانچہ میں نے ایم۔ سی۔ سے درخواست کی میں غیر سیاسی، ادبی اور ہندوستانی فلسفہ کے موضوعات پر مضامین ادبی رسائل میں اکثر لکھتا رہتا ہوں، براہ مہربانی یہ سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت دی جائے۔ ایم۔ سی۔ نے میرے خط پر ہی لکھ دیا۔

"Yes, Abid you may continue to write on literary and philosophical subjects, but I hope you will sell the articles not yourself." M.C.

میرا خیال ہے کہ میں نے اس سلسلے میں ایم۔ سی۔ اور شاید خود کو بھی کبھی مایوس نہیں کیا۔
۱۹۶۲ء میں ماہنامہ کتاب'' کا ابرا ہوا۔ میں اس کی تیرہ چودہ سال کی زندگی میں نیشنل ہیرالڈ ایسے بااثر اخبار سے متعلق تھا۔ چاہتا تو اس تعلق کی بنا پر خوب خوب اشتہار بٹورتا اور خسارے کے اس سودے کو اپنی حیثیت بھر کی سونے کی کان میں تبدیل کر دیتا۔

وزیر اعلیٰ اور وزرا کے یہاں افطار پارٹیوں کا سلسلہ انھی دنوں شروع ہوا تھا۔ ایسی دو پارٹیوں میں اپنی شرکت یاد ہے۔ پہلی ہی پارٹی میں افطار اور پھر عشائیے میں کھانے کی لوٹ دیکھ کر اس قدر بددل ہوا کہ آئندہ سے ان میں شرکت نہ کرنے کا خود سے عہد کرلیا۔ لیکن دوبار اور جانا پڑا۔

پہلی افطار پارٹی کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔ سن لیجیے۔

ان دنوں خاندانی منصوبہ بندی کا بہت زور تھا۔ افطار اور پھر مغرب کی نماز کے بعد وزیر اعلیٰ نرائن دت تواری نے خاندانی منصوبہ بندی کے '' فضائل'' بیان کیے۔ بعد میں محسنہ قدوائی کو، جن سے میری یاد اللہ تھی اور ہے، میں نے اسی مسئلے پر ڈاکٹر پی۔ ڈی۔ کپور سے بات کرتے ہوئے دیکھا۔ محسنہ قدوائی نے مجھے شناسا نظروں سے دیکھا تو میں ان کی طرف مڑا اور اسی وقت انھیں یہ کہتے ہوئے سنا، '' لیکن اس کے لیے کام کرنے والوں کی ضرورت ہوگی''۔

ڈاکٹر کپور نے جواب دیا، '' آدمیوں کی کوئی کمی نہیں''۔

میں نے فوراً کہا، '' اصل مسئلہ تو یہی ہے۔''

میرے اس جملے پر محسنہ قدوائی اتنی زور سے ہنسیں کہ آس پاس کے لوگ انھیں دیکھنے لگے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ کیا ڈاکٹر کپور ان دنوں کانگریس میں تھے؟ بعد میں تو وہ جن سنگھ کی وزارت میں وزیر صحت تک ہو گئے تھے۔

ہندوستان۔چین لڑائی

یہ بات ہندوستان۔چین لڑائی کے دو تین سال قبل کی ہے۔ احتشام صاحب کافی ہاؤس کم ہی جاتے تھے پھر بھی دوسرے تیسرے مہینے ایک آدھ چکّر لگ ہی جاتا۔ ان کی اکثر شامیں ''دانش محل'' میں گذرتیں۔ ایک بار وہ کافی ہاؤس سے نکلے تو میں بھی ساتھ لگ گیا۔ مے فیر تک تو خیر پیدل آنا ہی تھا، وہاں سے بسنت سینما کی طرف مڑتے وقت انھوں نے کہا کہ احمد مسعود (منیجر پی پلس بک ہاؤس) سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی، ان سے مل لیں۔ یہ اشارہ تھا کہ پیدل ہی چلیں گے۔ موسم اچھا تھا، فاصلہ معلوم بھی نہ ہوا۔ میں ایک قدم پیچھے مودّب چل رہا تھا۔ وہ کچھ کہتے تو دماغ میں بٹھانے کوشش کرتا۔ اتفاق سے مسعود دوکان پر موجود نہیں تھے۔ وہاں سے احتشام صاحب چلے تو نشاط پکچر ہاؤس کے تقریباً سامنے، سڑک کی دوسری جانب، انھوں نے کہا۔

''چین اتنی سی زمین کا کیا کرے گا؟''

میں ان دنوں نظریاتی طور سے خاصا متشدد کمیونسٹ تھا اور میرے لیے یہ تصور بھی محال تھا کہ کوئی کمیونسٹ ملک کسی دوسرے ملک کی زمین ہڑپ کرسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے یہی بات ان سے کہہ دی۔ احتشام صاحب نے دھیرے سے کوئی بات کہی جس کے معنی تھے معاملہ اتنا آسان نہیں لیکن مجھے ان کے جملے سے زیادہ ان کا اس وقت کا چہرہ یاد ہے جس پر تشویش نمایاں تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ اس سلسلے میں انھوں نے مزید کچھ کہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا مسعود تو ملے نہیں، اظہر نگرامی صاحب سے ملتے چلیں۔ اب اسے اتفاق ہی کہیے کہ اظہر نگرامی بھی کتابی دنیا میں موجود نہ تھے۔ اس کے بعد امین آباد تک ہم دونوں ساتھ ساتھ آئے، احتشام صاحب گولا گنج چلے گئے اور میں کہیں اور۔

میرا خیال ہے کہ یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ حسن شاہ کے ناول کا جو ترجمہ سجاد حسین کسمنڈوی نے ''نشتر'' کے نام سے کیا تھا اس کا نیا ایڈیشن کتابی دنیا نے احتشام صاحب کے کہنے ہی سے چھاپا تھا۔

چین نے ہندوستان پر فوج کشی کی تو۔ کمیونسٹ پارٹی کے دفتروں پر جگہ جگہ حملے ہوئے۔ میری کیا حیثیت تھی لیکن ہیرالڈ میں ڈھکی چھپی جملہ بازیوں کا شکار مجھے بھی ہونا پڑا۔

ہندوستانی افواج کی پس قدمی کی قیمت کرشنا مینن کو وزارت خارجہ سے علاحدگی کی شکل میں ادا کرنی پڑی اور پنڈت نہرو کی بیماری کا جو سلسلہ ان دنوں شروع ہوا وہ ان کی موت کے بعد ہی تھما۔

چین کی فوجیں کامیابی کے جھنڈے گاڑتی برابر آگے بڑھ رہی تھیں اور کانا پھوسی کے مطابق ہندوستانی فوجیں اپنی تھری ناٹ تھری رائفلوں سے ان کا مقابلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔

اس وقت کی دو باتیں یاد آرہی ہیں۔ حکومت نے ملک کے عوام سے اپیل کی تھی کہ فوجیوں کے لیے ٹرانسسٹر بھیجے جائیں اور اس اپیل پر جوش وخروش سے لبیک کہا گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سارے ٹرانسسٹر کلکتہ کے بازاروں میں فروخت ہوگئے۔

لیکن دوسری بات زیادہ اہم ہے۔ غالباً میجر جنرل تھاپا نے لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ کو مالویہ ہال میں خطاب کیا۔ کئی فوجی گاڑیاں آئیں۔ بڑے بڑے نقشے آئے جو دیواروں پر ٹانگ دیے گئے۔ میجر جنرل تھاپا نے ایک لمبی سی چھڑی کی مدد سے مختلف مقامات کی نشاندہی کر کے اپنی بات سمجھائی لیکن ان کی تقریر شروع ہونے سے قبل ہال کے سارے دروازے بند کردیے گئے۔ دو دو سپاہی دروازوں کی طرف پشت کیے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ اسی وقت ایک پریس نوٹ اخبار والوں میں تقسیم کیا گیا۔ میں بھی اخبار والوں میں موجود تھا۔ یہ پریس نوٹ جنرل تھاپا کی "مجوزہ" تقریر پر مشتمل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز "Gentlemen of the press" کے فقرے سے کیا تھا۔ اس ابتدائی جملے کا باقی حصہ کچھ اس طرح تھا، جی نہیں یہی تھا:

> "Gentlemen of the press, what I will say here will be altogether different from what has been given in the press note. But if anything other than the press release is published, either your head will be chopped off or my head will be chopped off."

اب یہ تو نہیں یاد کہ پریس نوٹ میں کیا کہا گیا تھا لیکن تقریر میں جو انھوں نے کہا تھا وہی ہوا بھی۔

انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان اور چین کی سرحد اتنی طویل ہے کہ ایک ایک انچ کا تحفظ ہندوستان کیا دنیا کی کوئی طاقت نہیں کرسکتی۔ جنگ جس علاقے میں لڑی جارہی ہے اس میں چین فائدے میں ہے۔ ہماری فوجیں نیچے ہیں اور چین کی فوجیں پہاڑیوں کی چوٹیوں پر۔ ہم ظاہر یہ کررہے ہیں کہ پوری طاقت کے استعمال کے باوجود ہار رہے ہیں۔ یہ انھیں آگے بڑھنے کی

دعوت ہے اور اگر چین یہ دعوت قبول کرنے کی بے وقوفی کرتا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کا ایک بھی سپاہی زندہ واپس نہیں جائے گا۔

بڑے بڑے نقشوں پر پہاڑوں، ان کی اونچائیوں، پہاڑیوں اور سطح مرتفع کی نشاندہی انھوں نے لمبی سی چھڑی سے کی تھی۔

ہوا وہی جو انھوں نے کہا تھا۔ میدانی علاقے میں داخل ہونے سے قبل ہی چین نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ ہندوستان نے جنگ بندی قبول نہ کی تو اس نے فوجیں واپس بلا لیں لیکن میدانی علاقے میں داخل ہونے کی حماقت نہیں کی۔

اس سارے دوران کم سخن کرشنا مینن نے عوام کے جذبات ٹھنڈے کرنے کے لیے ایک بھی فوجی راز نہیں افشا کیا لیکن پنڈت نہرو نے وزارت دفاع کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ اوادی ٹینک Ordnance factory (اسلحہ بنانے والے کارخانہ) سے بس نکلنے ہی والے ہیں۔

کرشنا مینن نے پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ مجھے اپنی وطن پرستی ثابت کرنے کے لیے کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔ سچ پوچھیے تو کسی کو بھی نہیں۔ اپنی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں وطن پرست نہیں تو کوئی ہندوستانی وطن پرست نہیں۔ لیکن، اور یہ ''لیکن'' بہت اہم ہے اور میرے سیاسی شعور کی بنیاد بھی، کہ میری وطن پرستی مجھے کسی ملک یا قوم سے نفرت پر مجبور نہیں کرتی۔ میرا ملک میرے لیے سب سے اچھا ضرور ہے تاہم کسی دوسرے کے لیے اس کا ملک ہی سب سے اچھا ہوسکتا ہے۔ اقبال صرف اپنے ملک کو سب کے لیے سب سے اچھا قرار دیتے ہیں جو مجھے قبول نہیں۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اور دوسری سانس میں ''ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے''۔ لطف یہ ہے کہ ان کو اپنے فکری تضاد کا احساس بھی نہیں، ممکن ہے اس میں قصور قافیہ کی مجبوریوں کا رہا ہو۔

پنڈت جی کا انتقال

پنڈت نہرو کا انتقال تو شاید دل کے دورے سے ہوا لیکن عام تاثر یہی تھا کہ چین کی لڑائی نے انھیں توڑ کے رکھ دیا تھا اور یہ قرین قیاس بھی تھا۔ انھیں چین سے ایسی امید کبھی نہ رہی ہوگی۔

چند دنوں بعد ایک سینیئر کمیونسٹ لیڈر کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ پنڈت نہرو نے ڈاکٹر زیڈ۔اے۔احمد کو اپنی پیٹھ دکھاتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ پھنسیاں ٹھیک نہیں ہو رہی ہیں۔ یہ بات صحیح تھی یا غلط، اس کی ذمہ داری راوی کی ہے جس کا نام بھی مجھے اب یاد نہیں۔

۱۹۶۴ء کے پنڈت نہرو وہ تو نہیں رہ گئے تھے جس نے انھیں نوجوانوں کا خواب بنا دیا تھا، تاہم ۲۷ رمئی کو ان کے انتقال کی خبر ملی تو میں چکرا کے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ بقول مخدوم ان کی نغمہ آرائی اب اگرچہ بزم سے دور تھی اور وہ بھی تنہا تنہا لیکن ایک ایسے دور میں جب سوشلزم کی لے کمزور پڑ گئی تھی کوئی تو تھا جو Pattern کے طور پر ہی سہی اس کا نام لیتا تھا۔

پنڈت جی کے انتقال نے ''نہرو کے بعد کون؟'' کی بحث کو جو کم و بیش دس سال قبل خود ان کے بار بار کے ان بیانوں کے بعد کہ بہت تھک گیا ہوں، اب آرام کرنا چاہتا ہوں، اخباروں میں اور ذہنوں میں شروع ہوئی تھی، حقیقت کی شکل دے دی تھی۔

تقریباً سارے ملک پر حکمراں کانگریس اس وقت دائیں اور بائیں دھڑوں میں تقسیم تھی، اگرچہ یہ بایاں بازو بھی ایسا نہ تھا جس کو اچاریہ نریندر دیو نے ''جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے'' سے مشروط کر دیا تھا۔ اس لہو کا بڑا حصہ تو پنڈت نہرو کے زمانے ہی میں پانی ہو چکا تھا اور اس میں شفق کی ہلکی سی سرخی کا صرف عکس جلوہ گر ہوتا۔ پھر بھی وہ ایسے نہ تھے کہ ملک کو قدامت پسندی کے حوالے کر دیتے۔ سوشلزم کا ایک پردہ بہر حال قائم تھا۔

پنڈت جی کے انتقال کے بعد وزارت عظمیٰ کے مضبوط ترین امیدوار تھے مرار جی دیسائی لیکن کانگریس میں ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ عارضی طور پر گلزاری لال نندا کو مسند پر بٹھا دیا گیا۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نندا نے ۱۹۳۵ء میں احمد آباد کے مزدوروں کو پہلی بار منظم کیا تھا اور وہ ان کے بہت بڑے لیڈر تھے اور شاید اسی لیے مرار جی دیسائی کے لیے سب سے زیادہ ناقابلِ قبول۔ اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کمار اسوامی کامراج نے جو کانگریس کے صدر تھے، لال بہادر شاستری کو ''سمجھوتہ امیدوار'' کے طور پر پیش کر کے دیسائی کے وزیر اعظم بننے کے خواب کو اس وقت پورا نہ ہونے دیا۔

شاستری جی جو یو۔پی۔کے پارلیمنٹری سکریٹری کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے وزیر اعظم بن گئے تھے، علم، اسکالرشپ، عوامی مقبولیت، دور اندیشی اور قد و قامت میں نہرو کے پاسنگ تھے نہ سوشلزم سے قربت کے لیے مشہور یا بدنام تاہم وہ مرار جی دیسائی نہ تھے۔

اب ملک کی معاشیات اور اقدار کی بے حرمتی نے جو شکل اختیار کر لی ہے اس کے پیشِ نظر اس طرح کی بحث کارِ عبث معلوم ہوتی ہے لیکن مسائل کو بہر حال ان کے پس منظر میں ہی دیکھا جائے گا کہ اس سے مفر ممکن نہیں۔

حضرت گنج کی سڑکوں پر قدموں کی بہت ہلکی چاپ اور سانسوں کی آہٹوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا، علاوہ مکمل سناٹے کے... گاندھی جی کی شہادت کے بعد پہلی اور شاید آخری بار۔

لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں برٹش بک ڈپو کے سامنے اور سڑک کے اس پار والے فٹ پاتھوں پر بے آواز قدم بڑھاتے، سروں کو جھکائے ہوئے اور کچھ دوسرے سامنے دیکھتے لیکن انھیں کچھ بھی نظر نہ آتا جیسے اب دیکھنے کو کچھ بھی نہ رہ گیا ہو۔ اسی وقت یا ذرا دیر بعد سڑک پر کوئی کار گزرتی، بے آواز، دبے پاؤں، جسم وجاں چرائے لیکن فضا کی خانہ ویرانی میں ذرا سا بھی فرق نہ پڑتا۔

اس وقت کے مے فیئر کے سامنے، فٹ پاتھ پر، چار شناسا، دوست... بجیلا، شیو پوری، م۔ نسیم، اور سداسرن مسرا اور دو تین دوسرے... یکایک رک گئے۔ گورے چٹے شیو پوری نے قدم یکایک روک لیے، م۔ نسیم کے کندھے پر ایک ہاتھ رکھ دیا اور کہا، ''میاں اب لاکھوں کے جلسوں کے دن لد گئے، کوئی دور دور سے لوگوں کو لا کر بھیڑ چاہے جمع کر لے لیکن تماشہ ختم ہونے کے بعد بھی شہر کی سڑکیں ویران کی ویران ہی رہیں گی۔''

کچھ لوگوں کو یہ جملہ کچھ اُٹ پٹا ضرور لگا ہوگا کیوں کہ ہم میں سے کوئی نہ سمجھتا تھا کہ شیو پوری مستقبل میں اتنی دور تک دیکھ سکتے ہیں۔

شیو پوری ہشیار تو تھے، لیکن بہ کارِ خویش نہیں۔ صحافت کے میدان میں آئے تو اس کا حق ادا کر کے پولیس کو دشمن بنا لیا اور اخبار نے ساتھ نہ دیا۔ چنانچہ، کہا جاتا ہے کہ پولیس کے ہاتھوں اتنی تکلیفیں اٹھائیں اور بے عزت ہوئے کہ Persecution Mania کے شکار ہو گئے اور ہوتے ہوتے حالت یہاں تک پہنچی کہ مقامی انتظامیہ سے لے کر اقوام متحدہ تک کو یادداشتیں بھیجتے، ان عناصر تک کے خلاف جن کے لیے ان کی اب کوئی حیثیت ہی نہیں رہ گئی تھی... اور وہ اترا شحنہ مردک نام ہو گئے تھے۔ ایسے میں بھلا کام کیا کرتے، بڑے دن گھر آ کر بیٹھ رہے تھے۔ دوستوں کے سوا کوئی سہارا نہ تھا۔

ایک دن مُنہ میں صبح سے کھیل نہ پڑی تھی، گانٹھ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ چنانچہ کافی ہاؤس

کے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک دروازہ کھول کے اندر دیکھتے، پھر بند کر دیتے۔
آخر سدا سرن مسرا سے آنکھیں ٹکرا ہی گئیں، اشارہ سے بلا لیا اور کہا، ''ایک روپیہ نکالو۔''
''میں اتنی دیر سے تمھیں باہر ٹہلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں،'' سدا سرن نے دو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا، ''اندر کیوں نہیں آ گئے؟''
''وہ تمھارے ساتھ بل ڈاگ جو بیٹھا تھا۔''
سدا سرن مسرا مسکرا دیے۔
یہ بل ڈاگ دوہرے بدن اور گہرے گندمی رنگ کے جھیلا تھے جن کے ساتھ وہ اگلے دن دیر رات تک ٹہلتے دیکھے گئے۔
ایک شام بشیشر ناتھ روڈ پر، اس جگہ کے آس پاس جہاں سے راستہ پریس کلب کو پھوٹتا ہے، شیو پوری کو ایک ہاتھ سے سائکل کا ہینڈل پکڑے اور دوسرے میں ہتھوڑی لیے تیز تیز پیڈل چلاتے دیکھ کر میں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے تو انھوں نے ہتھوڑی ہلاتے ہوئے اشارہ کیا کہ پھر بتاؤں گا اور دو تین دن بعد بتایا، ''کمرے کی چابی کھو گئی تھی اور رات تھی کہ اتری آتی تھی۔ اندھیرا ہو جاتا تو پولیس تالہ توڑنے کے الزام میں پکڑ نہ لے جاتی۔''
...اور یہ بھی ہوتا کہ بے حد ذہین آنکھوں، چوڑی پیشانی اور کھلتے ہوئے گندمی رنگ کے حاضر جواب سدا سرن مسرا نومبر دسمبر کی سردیوں میں، کسی اور کا ہوتا تو شاندار اور اپنا ہوتا تو پھٹیچر سوئٹر پہنے ہوئے کافی ہاؤس میں داخل ہوتے، دونوں ہاتھ بغل میں دابے، سسواتے ہوئے۔
سدا سرن اسٹیٹ بینک آف انڈیا سے اچھی خاصی تنخواہ پاتے لیکن یہ روپے جاتے کہاں ہیں؟ بلا نوش نہیں، شادی بھی نہیں کی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے لیکن لاکھ چھپانے کی کوششوں کے باوجود سچائی نے ایک دن خود کو آشکارا کر ہی دیا... جانے کتنی غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادی کرا چکے ہیں، کئی لڑکوں لڑکیوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔
لیکن ...وہ جماعت اسلامی کے م۔ نسیم ہوں یا بلیک پرنس جھیلا، شیو پوری ہوں یا سدا سرن مسرا یا ایک دوسرے سے ناواقف کروڑوں لوگ...سب کے لیے ۲۷ مئی کی یہ شام، شامِ غم بن گئی تھی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ

ایوب خاں نے پنڈت نہرو کے انتقال کے بعد وزیر اعظم کے انتخاب کے مسئلے پر کانگریس کے اختلافات کو ہندوستان کی کمزوری سمجھا اور کچھ میں چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد پچیس تیس ہزار فوجی کشمیر کے ہندوستانی حصے میں داخل کر کے ایک ایسی جنگ کی بنیاد ڈال دی جس میں انھیں ہندوستان کی بری، بحری اور ہوائی فوجی طاقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لڑائی میں، جیسا کہ ہر جنگ میں عام طور سے ہوتا ہے، ہندوستان کو اپنا تھوڑا سا علاقہ ضرور کھونا پڑا لیکن پاکستان کا کہیں بڑا علاقہ اس کے قبضے میں آ گیا۔

نہ صرف یہ بلکہ ہندوستانی فوجوں نے لاہور کے ہوائی اڈہ کے نواح پر قدم جما کر شہر کے دروازے پر دستک دینی بھی شروع کر دی تھی۔

پانچ ہفتوں کی اس جنگ میں پاکستان نے چھتری بردار فوجی اور جاسوس ہندوستان میں اتارے جس کے نتیجے میں سیکڑوں بے گناہوں کو اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے بیشتر مسلمان تھے۔ اس جنگ میں فلائٹ لیفٹینینٹ لطیف نے آگرہ کی فضاؤں کی حفاظت کی کمان سنبھالی اور ایک بھی پاکستانی بمبار کو آگے بڑھنے نہ دیا۔ پھر بھی حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ رام منوہر لوہیا کو امین آباد کے جلسے میں کہنا پڑا کہ مسلمان ملک مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے شک کے گھیرے میں ہیں۔

شمالی ہندوستان کے سارے ہی شہر بلیک آوٹ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میری رات کی ڈیوٹی تھی اور میں نے وکٹوریہ اسٹریٹ پر سائیکل اس ڈھال پر موڑ دی جو سندیلہ ہاؤس کی پشت سے ہوتی ندان محل روڈ پر نکلتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ تاریکی میں نخاس کا تراہا پار کرنے کے مقابلے میں گلی سے راستہ طے کرنا آسان ہوگا۔ ابھی میں ڈھال پار کر کے مڑا ہی تھا کہ ایک صاحب نے جو میری ہی طرح سائیکل پر تھے پوچھا۔

''بھائی صاحب نخاس کا کون سا راستہ ہے؟''

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ صاحب نخاس میں کھڑے ہیں اور نخاس ہی کا پتہ دریافت کر رہے ہیں۔ میں نے سائیکل سے اتر کر ان سے کہا چلیے آپ کو بتاتا ہوں۔ سڑک پر آتے ہی انھوں نے کہا، اب راستہ سمجھ گیا لیکن میں نے انھیں پولیس چوکی پر پہنچا کر ہی دم لیا۔ وہ بے چارے ایک

سندھی تھے جو پاکستان کی مارکاٹ سے بچ کر کسی طرح ہندوستان آ گئے تھے۔ وہ عالم باغ میں رہتے تھے اور نخاس میں اپنے کسی عزیز کے یہاں جا رہے تھے۔ پولیس نے دو چار سوال کر کے انھیں چھوڑ دیا۔ مجھے اس بے قصور شخص کی پریشانی کا سبب بننے پر افسوس تھا لیکن میں خوش بھی تھا کہ اپنی ذمّے داری سے غافل نہ رہا۔

ٹیلی پرنٹر پر ساری خبریں جنگ کی صورت حال کے متعلق تھیں۔ میں اپنی کاپی ''سب'' کرنے کے بعد ٹیلی پرنٹر کیبن میں چلا جاتا اور جنگ کی تازہ ترین صورت حال سے خود کو واقف رکھتا۔ اسی دوران ٹیلی پرنٹر سے وہ مخصوص آواز بلند ہوئی جو کسی اہم خبر کا اشارہ ہوتی ہے اور پھر خبر آئی A Pakistani bomber downed۔ میں نے باہر نکل کے کہا، ''ایک پاکستانی بمبار گرا لیا گیا۔'' میرا جملہ بمشکل پورا ہوا تھا کہ کرونا شنکر سکسینہ نے جو ایک جونیر رپورٹر تھا، ہنستے ہوئے کہا، ''کل بھی تو آپ کا جہاز مار گرایا گیا تھا۔''

ہر چہرے پر بظاہر احتجاج تھا لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے چہرے پر کسی نے ایک زوردار گھونسہ جڑ دیا ہو اور میری آنکھیں نم ہو گئیں لیکن میں نے کسی پر یہ کیفیت ظاہر نہ ہونے دی۔ زندگی میں اس طرح کی ذلتیں کئی بار اٹھانی پڑی ہیں اور ہر بار یہ خیال آیا ہے کہ ہمارے ملک میں سیکولرزم ایک ڈھکوسلا ہوتا جا رہا ہے۔ سچ پوچھیے تو کچھ لوگوں کے نزدیک اس طرح کی باتیں جناح کو اور کچھ نہیں تو پیش بین ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اقوام متحدہ نے لاہور کی شہری آبادی کے انخلا کے مسئلے کے پیش نظر جنگ بندی کی اپیل کی جو کہا جاتا تھا کہ اتنی بڑی آبادی کے لیے راشن کی فراہمی کے مسئلے کے سبب ہندوستان نے قبول کر لی۔

سویت یونین نے دونوں ملکوں کے سربراہوں کو مدعو کر کے انھیں ''تاشقند'' سمجھوتے پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ ''مفتوحہ علاقہ'' تو ہندوستان واپس کر ہی دیتا لیکن سمجھوتے میں اس کی واپسی کی شق کی واضح شمولیت ہندوستان کے عوام کو جو اس وقت کامرانی کے نشے میں بجا طور سے چور تھے سخت گراں گزری۔ اس ردعمل سے فطری طور سے شاستری جی کو بہت پریشانی ہوئی اور بدقسمتی سے ۱۰-۱۱ر جنوری ۱۹۶۶ء کی درمیانی رات میں دل کے دو شدید حملوں کے بعد تاشقند ہی میں ان کی موت ہو گئی۔

شاستری جی کے جسد خاکی کا ملک میں ایک ہیرو کی طرح خیر مقدم کیا گیا... کچھ دن

بعد معلوم ہوا کہ پاکستان سے جنگ کے دوران مرکزی حکومت نے دہلی کا شہری نظم ونسق راشٹریہ سویم سنگھ کے سپرد کر دیا تھا۔ اس وقت دہلی کی حیثیت ایک علاحدہ ریاست کی نہ تھی۔

دہلی ایڈیشن

دہلی سے نیشنل ہیرالڈ کا اجرا ہونے والا تھا اور نجم الحسن کا انٹرویو اسی لیے ہوا تھا لیکن پھر ایک رکاوٹ پیدا ہوگئی تاہم کچھ دنوں بعد نجمل اور سرور صاحب کے بیٹے صدیق کا انتخاب ایک ساتھ ہوگیا۔ دہلی سے اخبار نکلنے میں دیر ہوئی تو ان دونوں کو کانپور بھیج دیا گیا اور وہاں ان دونوں نے اخبار کی مقبولیت میں کہیں زیادہ اضافہ کر دیا۔

۱۹۶۸ء کے شروع میں اندرا گاندھی نے دہلی ایڈیشن کا اجرا کرتے ہوئے کہا:

"Today we have opened a new window and we will be opening more windows shortly"۔ یشپال کپور نے جو بعد میں مینجنگ ڈائرکٹر ہوئے اس کے معنی یہ لیے کہ اندرا گاندھی جگہ جگہ سے نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیشنوں کی اشاعت کی خواہشمند ہیں۔ چنانچہ انھوں نے گوہاٹی، بھوپال اور ممبئی وغیرہ میں زمینیں خرید لیں لیکن معلوم نہیں کیا ہوا کہ معاملات آگے نہ بڑھ سکے۔

ایم۔سی۔ بہت بڑے ایڈیٹر تھے۔ ہندوستان میں ان کے پائے کے بلکہ ان سے ذرا سے دبتے ہوئے، واحد ایڈیٹر فرینک موریس تھے، لیکن ایم۔سی۔ میں ایک کمزوری تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ لکھنؤ ایڈیشن کی طرح دہلی کا ایڈیشن بھی صرف ان کے اداریے سے مقبول ہو جائے گا اور انھوں نے اخبار کو بہتر بنانے کی کوئی خاص کوشش نہ کی۔

جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں میری اور میرے چند ہم خیال لوگوں کی رائے تھی کہ اخبار کی مالی پریشانیاں نئی مرکزی حکومت کی پیدا کردہ ہیں لیکن اس حکومت سے متعلق پارٹیوں نے اپنے آپس کے جھگڑوں سے حکومت کو اتنی فرصت ہی کہاں دی کہ وہ ہیرالڈ کو پریشان کرتی اور بھلا اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ ہیرالڈ حزب مخالف کا اخبار بن ہی نہ پایا تھا، بالکل اسی طرح جیسے اس نے ایمرجنسی کی حمایت میں اداریوں کے علاوہ کوئی کردار ادا نہ کیا تھا اور یہ بھی کہنا ہوگا کہ ایمرجنسی کی حمایت میں ایم۔سی۔ کے اداریے وزن و وقار سے محروم تھے، نمبو دری پد حکومت کے خلاف اداریوں کی طرح۔

دہلی ایڈیشن کی ناکامی اور لکھنؤ ایڈیشن کی گرتی ہوئی ساکھ کا ایک اور سبب بہت بعد میں سمجھ میں آیا۔ نیشنل ہیرالڈ کو ایک طرف قدروں کی بے قدری تو دوسری طرف اس لوٹ نے تباہ کیا جس میں ہر اس شخص نے جو اس حیثیت میں تھا، اپنا دامن تر کیا اور لکھنؤ میں تالا بندی ہو گئی۔

ایم۔سی۔ اب دہلی میں رہتے اس لیے انھوں نے اخبار کی اشاعت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہونے پر، چترنجن کو لکھنؤ کا ریزیڈنٹ ایڈیٹر بنا کر بھیجا اور ان کی ''تاج پوشی'' کے لیے خود لکھنؤ آئے۔ انھیں شہر سے اور شہریوں کو ان سے متعارف کرانے کے لیے پریس کلب میں ایک جلسہ ہوا جس میں ایم۔سی نے یہ تک کہہ دیا کہ ''آپ لوگ جن مسائل کے سلسلے میں مجھ سے رجوع کرتے تھے، اب میرے بجائے چترنجن سے رجوع کیا کریں۔'' چترنجن کی اس سے زیادہ تعریف ممکن نہ تھی۔

بنگلا دیش

مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کی مسلّح جدوجہد نے زور پکڑا اور وہاں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی ساری ذمہ داری ہندوستان پر تھوپنے کی پاکستانی کوشش کچھ کچھ کامیاب ہونے لگی تو ہندوستان کا ایک ایک فرد پاکستان سے ہر ٹکراؤ کے زمانے کی طرح متحد ہو گیا۔

بنگلا دیش کی بغاوت سے قبل پاکستان کے عام انتخابات میں مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے پاکستان کی قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کی تو انھیں وزارت عظمیٰ سپرد کرنے کے بجائے گرفتار کرنے کے ساتھ ساتھ ہر وہ قدم اٹھایا گیا جس سے مشرقی پاکستان کی آگ بجھنے کے بجائے تیزی سے بھڑک اٹھی۔

مجیب الرحمان کا سیاسی سفر ڈھاکہ یونیورسٹی کی اسٹوڈینٹس یونین کے صدر کے انتخاب کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ انھوں نے یہ کامیابی مغربی پاکستان حامی امیدوار کو شکست دے کر حاصل کی تھی۔ اس وقت پاکستان کے بعض حلقوں نے الزام لگایا تھا کہ مجیب الرحمان کے انتخاب میں رفیع احمد قدوائی نے کلکتہ میں قیام کرکے گوٹیں بٹھائی تھیں لیکن ہندوستان اور مغربی ممالک کے میڈیا نے اس الزام کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ مجیب الرحمان کی اس کامیابی کے پیچھے عدم اعتماد اور بے چینی کی اس لہر کا بڑا ہاتھ تھا جو ۱۹۴۸ء میں محمد علی جناح کی اس تقریر کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی جس میں انھوں نے اردو کو قومی اور بنگلہ کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا تھا۔ دوسری شکایتوں کے علاوہ

بنگالیوں کو یہ بھی شکایت تھی کہ جو بھی بنگالی ...خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی اور محمد علی بوگرا... وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھا، اسے کسی نہ کسی بہانے جلد از جلد اس عہدے سے محروم کر دیا گیا۔

پاکستان اپنے قیام کے پہلے ہی دن سے ایک عجیب قسم کے تضاد سے دو چار رہا۔ اس کی شناخت کراچی اور بعد میں اسلام آباد سے ہوئی لیکن اس کی آبادی کی اکثریت ہزاروں میل دور مشرقی پاکستان میں آباد تھی۔ ایک تضاد اور بھی تھا۔ پاکستان کی مالیات میں مشرقی پاکستان کا تعاون صرف چالیس فی صد تھا جس کے سبب اس کی حیثیت مرکزی حکومت پر ہمیشہ ایک بوجھ کی رہی۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہاں جو بھی ترقی ہوتی اسے چار مہینوں کی بارش اور سیلاب بہالے جاتے۔ مغربی پاکستان میں مشرقی پاکستان کے بوجھ ہونے کا احساس شروع کے برسوں کے جوش کے تلے دبا رہا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق ابھر کر سامنے آنے لگے۔

مسلم اکثریتی بنگال اور آسام کو ملا کر ایک آزاد مملکت قائم کرنے کا خواب سب سے پہلے سہروردی نے دیکھا۔ جناح کو اس کا علم تھا اور وہ سہروردی سے پریشان بھی رہتے۔ لیکن ہندوستان کی حکمرانی سے نجات حاصل کرنے کی برطانیہ اور ماونٹ بیٹن کی جلدی نے سہروردی کو فیڈریشن کے بجائے دو حصّوں کے پاکستان کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ مغربی پاکستان نے بھی سہروردی اور ناظم الدین کو بطور مجبوری ہی قبول کیا تھا اور منظر نامے سے ان کے غائب ہوتے ہی مملکت کے دونوں حصّوں کے درمیان دوریوں میں اضافہ ہونے لگا۔ کراچی یہ سمجھتا تھا کہ ڈھاکہ ایک معاشی بوجھ ہے جب کہ ثانی الذکر کا خیال تھا کہ اوّل الذکر اس کے ساتھ منصفانہ برتاؤ نہیں کر رہا ہے۔ اس صورت نے علاحدگی پسند رجحانات کو جنم دیا اور بنگلا ایسی خوبصورت زبان، ٹیگور اور نذرالاسلام ایسے عظیم شاعروں کی روایت اور ہم زبان علاقہ کی قربت نے علاحدگی پسندی کے رجحان کو مضبوطی عطا کی۔ اس سب میں ہندوستان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔

مغربی پاکستان کی آبادی کا بڑا حصّہ اپنے معاشی مسائل کے لیے مشرقی حصّہ کو ذمّے دار تو مانتا تھا لیکن اس سے محروم ہونے کے لیے جذباتی طور پر تیار نہ تھا۔ اس پریشانی سے نجات پانے کے لیے مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے ملک کے دونوں حصّوں کے درمیان ٹکراؤ کو ہند۔ پاک مسئلہ بنا دیا۔

عام انتخابات میں عوامی لیگ کی کامیابی کے بعد مشرقی پاکستان سے نجات حاصل

کرنے کی حکمت عملی بھٹو اور یحییٰ خان نے تیار کی۔ مجیب الرحمان کی گرفتاری کا مقصد انھیں اقتدار سے دور رکھنے کے علاوہ ملک کے دونوں حصوں کے ساتھ ساتھ رہنے کے امکان کو معدوم کرنا بھی تھا۔ مجیب الرحمان نے اپنی رہائی کے بعد یہ معلوم ہونے پر کہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو ہیں حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وزیر اعظم تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔ یعنی متحدہ پاکستان کا تصور ان کے ذہن میں اس وقت بھی موجود تھا۔ ویسے بھی پورے پاکستان کے بجائے آدھے پاکستان پر، جو معاشی طور سے پسماندہ تھا، حکمرانی کون پسند کرتا۔ غرض مجیب الرحمان کی گرفتاری اور مشرقی پاکستان میں ظلم و ستم کا بازار گرم کر کے مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے دونوں حصوں کے متحد رہنے کے سارے امکانات ختم کر دیے تھے۔

پاکستانی فوج کے مظالم سے تنگ آ کر تقریباً ایک کروڑ بنگالیوں نے ہندوستان میں پناہ لی تو ہندوستانی فوج کو مداخلت کرنا پڑی اور ایک خونریز جنگ کے بعد پاکستان کی تقریباً ۹۰ ہزار فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

ان دنوں لکھنؤ کے نیشنل ہیرالڈ کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر چترنجن تھے جن کا واضح رجحان بائیں بازو کی طرف تھا۔ میں اپنے ملک کے ساتھ تھا لیکن یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے مفاد میں نہیں ہے تاہم عوام اس صورت حال کے خلاف کوئی بات، چاہے وہ کتنی ہی مدلل کیوں نہ ہو، سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر بھی میں نے ایک دن چترنجن سے یہ مسئلہ چھیڑا۔ میں جانتا تھا کہ وہ نہ صرف بالکل مختلف بلکہ مخالف رائے تک سننے اور اس پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

یہ ساری بات چیت جو انگریزی میں ہوئی کچھ اس طرح تھی۔

میں نے کہا کہ مشرقی پاکستان کی موجودہ لڑائی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو انھوں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے کہا، "ہم جیت رہے ہیں۔" میں نے جواباً دریافت کیا، "ہم جیت رہے ہیں یا ہار رہے ہیں؟" اور ان کے چہرے پر سوال مچلتا ہوا دیکھ کر میں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی۔ "فوری طور پر تو ہم یقیناً جیت رہے ہیں لیکن کیا ہم اس ہمیشہ کی جنگ کے لیے، جو فتح کے بعد ہمیں لڑنا پڑے گی، مشکلیں نہیں کھڑی کر رہے ہیں؟"

چترنجن نے اپنی میز پر سے کتابیں اور پیپر ویٹ ہٹاتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا، "کیا تمھارے خیال میں یہ کامیابی بعد میں ہمارے لیے نقصان دہ ثابت

ہو گی؟''

میں نے کہا،'' یقیناً، میرے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔''

'' کچھ شکوک تو میرے ذہن میں بھی ہیں لیکن تم اپنی بات واضح طور سے کہو،'' انھوں نے کہا

میں نے وہ سارا پس منظر جس کا ذکر کر چکا ہوں بیان کیا تو چترنجن سارے وقت میری طرف حیرت سے دیکھتے رہے اور میں ابھی کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ انھوں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

'' میرا خیال ہے اس میں اردو لادنے کا بھی ہاتھ ہے۔''

'' ضرور ہے، زبان بنگالیوں کے لیے ایک بڑا جذباتی مسئلہ ہے۔ جب کہ اصل مسائل معاشی ہیں۔ مغربی پاکستان نے ان کو اقتصادی طور پر کچلا ہے، ذلیل کیا ہے۔ وہ اس ذلت کو برداشت کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں۔''

اس سلسلے میں وہ مجھ سے متفق تھے لیکن یہ بات انھیں پوری طرح قابلِ قبول نہ تھی کہ بنگلا دیش کا قیام ہندوستانی مفادات کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا،'' پاکستان بنگالیوں کو غلام بنا کے رکھنا چاہتا ہے۔''

میں نے کہا،'' یہ تو وہ کر چکا ہے، اب وہ اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

'' وہ مشرقی پاکستان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تو اپنی فوجیں وہاں کیوں بھیجتا، مکتی واہنی کو قابض ہو جانے دیتا؟''

'' مسئلہ اس قدر سیدھا سادا نہیں ہے،'' میں نے کہا،'' پاکستان لڑائی ہار کر دنیا کے سامنے خود کو مظلوم اور ہندوستان کو ظالم اور Expansionist ثابت کرنا چاہتا ہے... جوناگڑھ، کشمیر، حیدرآباد اور اب آدھا پاکستان۔''

میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ انھوں نے کہا، "You have a point"

ان کے اس جملے سے مجھے اپنا نقطۂ نظر صاف الفاظ میں بیان کرنے کا حوصلہ ملا اور میں نے کہا:

"Not only this, Islamabad wants India to set up a government on its East with which it (India) will always be at loggerheads"

"How?" انھوں نے پوچھا۔

میں نے کہا،'' اس وقت بنگالی یقیناً مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت اور حکومت سے

ناراض ہیں لیکن بنگالی مسلمان ہندوستان کے دوست کبھی نہیں ہو سکتے۔ گھٹنا ہمیشہ پیٹ کی طرف مڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک بھوکی ریاست کے قیام میں مدد کر کے ہم اس کی ہر مصیبت میں آڑے آنے کا خود کو پابند کر رہے ہیں اور برسات کی صورت میں یہ بلا ہر سال آتی رہے گی۔ اب تک مشرقی پاکستان دس بیس ہزار بنگالیوں کو ہر سال ہندوستان میں ڈھکیلتا رہا ہے، اب ''دوست بنگلا دیش'' کیا کرے گا اس کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

اب چتر نجن کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔'' اس کے علاوہ ہم اقوام متحدہ میں ایک ایسے ووٹ کا اضافہ بھی کریں گے جو چند سال بعد ہر بند۔ پاک مناقشے میں پاکستان کے حق میں دیا جائے گا اور بنگلا دیش سے تعلقات خراب ہونے کی صورت میں پاکستان دنیا کو باور کرائے گا کہ ہندوستان اپنے ہر پڑوسی ملک کے لیے پریشانیاں پیدا کرتا ہے... شری لنکا سے اس کے تعلقات خراب، نیپال سے اس کے تعلقات خراب۔ یہی حال چین، بنگلا دیش اور پاکستان کے ساتھ بھی ہے... دنیا کی حدیں چار ہیں، چاروں سے لڑائی۔''

میری دلیلوں اور خدشات کو توجہ سے سننے کے بعد چتر نجن بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا،'' لیکن موجودہ حالات میں کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟''

'' کچھ نہیں،'' میں نے کہا'' علاوہ اس کے کہ حالات کا صحیح تجزیہ کرنے کا کام مستقبل کے مورخ پر چھوڑ دیا جائے۔ میرا تو خیال ہے کہ پاکستان نے ایک جال بچھایا اور ہم اس میں اپنی مرضی سے داخل ہو گئے۔''

اس وقت چتر نجن سخت پریشان نظر آ رہے تھے۔

''ایک بات اور،'' میں نے کہا،'' پاکستان کی ہر شرارت کے جواب میں ہمارے پاس ایک دھمکی ہوتی تھی... کوئی گڑبڑ کی تو ہم مشرقی پاکستان کی سرحد پر اس کا جواب دیں گے... اب ہم دھمکی دینے کی اس صلاحیت سے خود کو محروم بھی کر رہے ہیں۔''

اس جنگ نے تقریباً ایک لاکھ پاکستانی فوجیوں اور دوسروں کے آرام و آسائش سے جیلوں میں رکھنے کا بوجھ ہم پر کئی ماہ تک ڈالے رکھا۔ جنگی قیدیوں (POWS) کے بین الاقوامی معاہدے کے ہم پابند تھے۔ ان کو ہر طرح کا لاڈ پیار ہم نے دیا، پاکستانی فوج میں اتنی ہی نئی جگہیں پیدا کر کے، وہاں کے نوجوانوں میں نئی بھرتی کے ذریعے، پاکستان میں بے روزگاری کم

کرنے میں ہم نے مدد کی۔

چالیس سال کے بعد، سوچتا ہوں کہ افسوس جو باتیں مجھ ایسے معمولی صحافی کی سمجھ میں آ گئی تھیں، وہ ہمارے رہنماؤں کی سمجھ میں نہیں آئیں۔

سچ تو یہ ہے کہ کراچی میں ''مشرقی پاکستان'' سے سوتیلے پن کا سلوک یوم اوّل ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پاکستان کے قیام کے چند ماہ بعد جب کراچی میں دفتری اور رہائشی ضروریات کے لیے عمارتوں اور کوارٹروں کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو سینیٹری سامان کی ضرورت پڑی اور یہ سامان درآمد کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں وزیر خزانہ غلام محمد کے کمرے میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں چار وزیر اور چند افسر شریک ہوئے۔ وزیروں میں مولوی فضل الرحمٰن بھی تھے، جن کے پاس امور داخلہ، اطلاعات اور تعلیم کی وزارتیں تھیں۔

اس سلسلے کی ایک کہانی قدرت اللہ شہاب سے سنیے:

''کچھ بحث و تمحیث کے بعد جب سینیٹری کے سامان کا کوٹا طے ہو گیا، تو وزیر تعلیم مولوی فضل الرحمٰن نے دبے الفاظ میں تجویز پیش کی کہ اگر اس امپورٹ کا کچھ حصّہ ڈھاکہ کے لیے بھی مخصوص کر دیا جائے، تو مناسب ہوگا۔

اس تجویز پر بڑی ہنسی اڑی۔ کسی نے کہا کہ ڈھاکہ میں کوئی خاص تعمیری کام شروع نہیں ہوا، اس لیے وہاں سینیٹری سامان بھیجنے کی کوئی تک نہیں۔ کسی نے کہا کہ جو سامان ڈھاکہ جائے گا، وہ لازمی طور پر سمگل ہو کر کلکتہ پہنچے گا۔ ایک صاحب نے مذاہی مذاق میں یہ پھبتی اڑائی کہ بنگالی لوگ تو کیلے کے گاچھ کی اوٹ میں بیٹھ کر رفع حاجت کرنے کے عادی ہیں۔ وہ ابھی سے کموڈ اور واش بیسن لے کر کیا کریں گے۔

مولوی فضل الرحمٰن مسکرائے نہ بگڑے۔ انتہائی متانت اور سنجیدگی سے انھوں نے ایک بار پھر زور دے کر کہا کہ زیادہ نہیں تو اس سامان کا ایک قلیل علامتی سا حصّہ ڈھاکہ کے لیے ضرور مخصوص کیا جائے، کیونکہ نفسیاتی طور پر یہ مناسب اقدام ہوگا۔ کچھ مزید بحث و مباحثہ اور طنز و مزاح کے بعد مولوی فضل الرحمٰن صاحب کی بات مان لی گئی اور ڈھاکہ کے لیے سینیٹری سامان کا کچھ حصّہ مخصوص ہو گیا، لیکن ایسی بدمزگی کے ساتھ جس طرح دودھ مینگنیاں ڈال کر پیش کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں لاشعوری طور پر بنگلہ دیش کی بنیادوں کی کھدائی کا کام اسی روز شروع ہو گیا تھا۔''

(خطِ زیریں اضافہ۔ شہاب نامہ، صفحہ ۳۰۷، ۳۰۸)

بنگلا دیش کی کہانی نہ صرف مجیب الرحمان کے خون سے رنگی ہوئی ہے بلکہ ہندوستان میں بنگلا دیشیوں کا داخلہ روکنے کے لیے سرحد تک پر خاردار تار لگانے پڑ رہے ہیں، اگرچہ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے اور ان کی دراندازی کا سلسلہ جاری ہے۔ فرخا باندھ پر اب تک کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکا ہے جب کہ سیلاب کی تباہ کاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بنگلا دیش کی مدد ہندوستان کے بجٹ پر ایک مستقل بوجھ بن گئی ہے اور اب تو دہشت گردی کے تار بھی بنگلا دیش سے جڑ گئے ہیں۔ نہ صرف یہ، بنگلا دیش اب بھی اپنے اس مطالبے پر مصر ہے کہ فرخا باندھ کی وجہ سے پانی کی فراہمی میں رکاوٹ پڑ رہی ہے اور اس کا توڑا جانا نہیں تو اس میں تبدیلیاں ضروری ہیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ بنگلہ دیش میں ایک واقعتا سیکولر حکومت قائم ہے۔ ہندوستان اس سے سبق لے سکتا ہے لیکن افسوس نریندر مودی گجرات میں اب بھی برسر اقتدار ہیں۔

دوسری طرف موجودہ پاکستان پر نظر ڈالیے تو اس کی ساری ترقی مشرقی پاکستان کے بنگلا دیش بن جانے کے بعد ہی ممکن ہو سکی ہے کیوں کہ اس جنگ میں اس نے کرنافلی پیپر مل کے قیمت ادا کر کے ہزاروں کروڑ روپے کے بوجھ سے خود کو آزاد کر لیا۔

یشپال کپور اور ایم۔ سی۔ ایک دوسرے کو پسند نہ کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد یشپال کپور نے ایم۔سی کو چیف ایڈیٹر بنا کر چتر نجن کو ایڈیٹر بنا دیا۔ اس طرح عہدہ تو ایم۔ سی کا بڑھ گیا لیکن اقتدار ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ تاہم جلد ہی چتر نجن اور یشپال کپور کا ہنی مون بھی ختم ہو گیا اور چتر نجن مستعفی ہو گئے۔ پھر ساٹھ سال مکمل ہونے پر ایم۔ سی۔ کو ریٹائر کر دیا گیا اگرچہ ایڈیٹر کے سلسلے میں عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔

ہیرالڈ میں حالات اس حد تک خراب ہو گئے تھے، اور وہ بھی ان دنوں جب ایم۔ سی۔ ابھی ایڈیٹر تھے، اگرچہ ان کا قیام دہلی میں تھا، کہ ایک موقعہ پر ان کو آفس میں برا بھلا کہا جانے لگا۔ سی۔ بی۔ گپتا کے بھانجے یا بھتیجے اور اخبار کے ڈپٹی نیوز ایڈیٹر مسٹر پال گپتا، جو کانپور کی خبروں کی سرخی میں کرائسٹ چرچ کالج کو چے۔ چے کالج (Ch. Ch. College) لکھتے لکھتے خود چے۔ چے۔ پال کہلائے جانے لگے تھے، ریٹائر ہوئے اور انھیں الوداعی پارٹی دی گئی تو انھوں نے اپنی جوابی تقریر میں، جو وہ لکھ کر لائے تھے، اپنے دل کا غبار نکالا تو چترنجن، دلاور حسین اور عابد سہیل کے علاوہ باقی سب ان کے فرمودات صبر و سکون سے سنتے رہے۔ ان میں سے بعض تو کبھی کبھی زیر

لب مسکرا بھی دیتے۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا اور صبر و ضبط کا یارا نہ رہا تو یہ تینوں افراد الوداعی جلسے سے واک آؤٹ کر گئے اور راندۂ درگاہ قرار پائے۔

پال صاحب کو دو شکایتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ سینیئر ہونے کے باوجود ان کے بجائے گوڑ صاحب کو نیوز ایڈیٹر بنا دیا گیا تھا۔ ذاتی نظریات سے قطع نظر کہ اس سلسلے میں دونوں میں کوئی خاص فرق نہ تھا، کام کا جہاں تک تعلق تھا، گوڑ صاحب ان سے میلوں آگے تھے اور سب ایڈیٹر تو ایسے کہ ان کی "سب" کی ہوئی کاپی پر قلم لگانا مشکل کیا تقریباً ناممکن تھا۔ گومتی میں بڑے پیمانہ پر مچھلیوں کی یکایک موت کی اپنی دو کالمہ سرخی میں زبان کی معمولی سی غلطی سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے تھے کہ تین دن تک انھوں نے دفتر میں صورت نہ دکھائی تھی۔ ایم۔ سی۔ ان کی اس شرمندگی سے اس حد تک متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نے ڈاک ایڈیشن میں سرخی تو بدل دی تھی لیکن نہ لاگ بک میں اس غلطی کا اندراج کیا تھا نہ پرسنل فائل میں۔

پال صاحب کی خفگی کی دوسری وجہ تھی اخبار کی پالیسی۔ ایم۔ سی۔ تجارت پیشہ طبقہ کی بدعنوانیوں کے خلاف شمشیر بے نیام تھے۔ ایم۔ سی۔ کی یہ ادا ظاہر ہے پال صاحب کو سخت ناپسند تھی۔ یہ طبقہ ایمانداری سے ٹیکس ادا کرتا اور جمع خوری سے اجتناب برتتا ہوتا تو آج خردہ کاروبار میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی ضرورت نہ پڑتی۔ پال صاحب کا پورا نام پال گپتا تھا۔

دفتر میں ایک صاحب تھے جو ایک قریبی ضلع کے چھوٹے سے سابق زمیندار ہونے کے باوجود خود کو "راجہ صاحب" اور "ٹھاکر صاحب" کہلانا پسند کرتے، ایم۔ سی۔ کے دہلی منتقل ہو جانے کے بعد وہ ہر ریزیڈنٹ ایڈیٹر اور بعد میں ایک ایڈیٹر کی بھی ناک کے بال بنے رہے۔

اس کے برخلاف ایم۔ سی۔ کو دربار سجانے سے سخت نفرت تھی۔ ایک بار میں کسی ذاتی کام سے ان کے کمرہ میں گیا اور اپنی بات کہنے کے بعد بھی دو چار منٹ تک ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا رہا۔ میری بات کا جواب دینے بعد انھوں نے اپنی نظریں دہلی کے کسی اخبار پر گڑا دیں اور جب مجھ پر اس کا بھی اثر نہ ہوا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا What is your duty اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں ڈیوٹی پر ہوں انھوں نے کہا، You better go to your room, I will come there اور چند منٹ بعد وہ سب ایڈیٹرس کے کمرہ میں آکر میرے پاس کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

چلپت راؤ اقوام متحدہ کی کسی تنظیم میں ہندوستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے گئے تو دفتر میں ہدایت کر گئے کہ ان کی تصویر ہرگز ہرگز نہ شائع کی جائے اور تقریر کی اشاعت ایسی ہی

ضروری ہو جائے تو چار پیرا گراف سے زیادہ نہ ہو اور اسے ایک کالمہ سرخی کے ساتھ اندر کے کسی صفحہ پر ہی جگہ دی جائے۔ صفحہ اوّل پر کسی صورت میں نہیں۔

ایک طویل عرصہ تک ہیرالڈ میں صحافتی ایمانداری کا یہ معیار رہا اور پھر وہ وقت بھی ان آنکھوں نے دیکھا کہ نیوز ایڈیٹر کے انکار کے بعد عملہ کے ایک فرد نے اس کی عدم موجودگی میں ریزیڈینٹ ایڈیٹر کی منظوری سے اپنے ناتی پوتوں کی تصویر چھاپ دی۔

ایم۔ سی۔ کے بعد ہری جے سنگھ، خشونت سنگھ اور نہ جانے کس کس نے ہیرالڈ کی باگ سنبھالی لیکن کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا اور دہلی اور لکھنؤ میں ہڑتال، تالہ بندی اور تنخواہوں کی عدم تقسیم کے بعد دونوں جگہوں کے اخبارات بند کر دیے گئے۔

جنتا پارٹی کی حکومت کی ناکامی کی شکل میں مکمل انقلاب کے خواب کا بکھرنا دیکھنے کے لیے جے پرکاش نرائن زندہ تھے۔ چرن سنگھ کے شاہ کمیشن، اندرا گاندھی کی گرفتاری، بنسی لال کو ہتھکڑی پہنانے، جگجیون رام کے بیٹے کی ناگفتہ بہ حالت میں تصاویر اور پھر باپ بیٹے کے حامیوں کے درمیان کناٹ پیلس میں مار پیٹ نے عوام کو ایمرجنسی کے دنوں کی زیادتیوں کو ایک بھیانک خواب کی طرح بھول جانے پر مجبور کر دیا۔

مختصراً یہ کہانی یوں ضروری تھی کہ جنتا پارٹی کے بجھتے ہوئے شعلے کی راکھ سے نیشنل ہیرالڈ کا دوبارہ جنم ہوا۔

انتخابات کا اعلان ہوتے ہی اندرا گاندھی نے یشپال کپور سے ان کے انتخابی دورے کے پہلے حصے کا پروگرام بنانے کے لیے کہا۔ اس پروگرام کے مطابق چوتھے دن کی صبح کی فلائٹ سے اندرا گاندھی کو لکھنؤ پہنچنا تھا۔ یشپال کپور نے تھرسن (شروع سے دہلی ایڈیشن کے ایڈیٹر) کو دس ہزار روپے دے کر لکھنؤ بھیجا۔ لکھنؤ ایڈیشن کے بچے کھچے اسٹاف، جس کی قیادت ایچ۔ کے۔ گوڑ کے ہاتھ تھی، اور منیجر موہلا کی انتھک محنت نے ایک تقریباً ناممکن کام کو ممکن بنا دیا اور چوتھے دن کی صبح جب اندرا گاندھی اموسی ہوائی اڈے پہنچیں تو یشپال کپور نے ان کو لکھنؤ ہیرالڈ کا اس دن کا اخبار پیش کیا۔

شب و روز کام کرتے کرتے ایچ۔ کے۔ گوڑ بیمار پڑ گئے۔ ان کو ہچکیاں آنا شروع ہوئیں جن کا سلسلہ چھ سات دن جاری رہا۔ ان کی عدم موجودگی میں ذمے داری ایس۔ پی۔ سنگھ کو سونپی گئی جو دو ہی تین دن میں بیمار پڑ گئے۔ اب قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ اس وقت نجم الحسن لکھنؤ میں چیف رپورٹر

تھے۔ انھوں نے ایم۔سی۔ کو ایک یادداشت بھیجی کہ نیوز ایڈیٹر کی ذمے داری انھیں سونپی جانی چاہیے تھی۔ اسی یادداشت پر ایم۔سی نے لکھ دیا "None can supersede Abid in the Herald."

ایم۔سی۔ شاید تجمل سے خفا تھے ورنہ وہ انھیں لکھتے کہ نیوز ایڈیٹر صرف ڈیسک کا کارکن ہوتا ہے جو اخبار نکالنا جانتا ہے۔ مجھے بے حد افسوس تھا کہ انھیں اس طرح کا جواب ملا۔ پندرہ بیس دن کے بعد گوڑ نے چھٹی سے واپس آ کر اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ کچھ عرصے بعد گوڑ ریٹائر ہوئے تو ایس۔ پی۔ سنگھ کو نیوز ایڈیٹر بنایا گیا لیکن ڈیوٹی چارٹ بنانے کے علاوہ اخبار نکالنے کی باقی ساری ذمے داریاں میرے سپرد رہیں۔

اسی دوران ایک نہایت تکلیف دہ واقعہ ہوا۔ ایس۔ پریمی جو ہیرالڈ میں فوٹو گرافر تھا اخبار والوں کے ساتھ رہتے رہتے کام چلاؤ انگریزی بولنے لگا تھا۔ ایک دن اس نے ایک خبر دی۔ خبر تو خیر ٹھیک ٹھاک تھی اور شاید تجمل کی لکھی ہوئی، اسے شائع بھی کیا جا سکتا تھا لیکن پریمی کا اصرار تھا کہ اس پر اس کا نام دیا جائے۔ تجمل اور صدیق اس کی حمایت کر رہے تھے۔ میرے ہاتھ بندھے تھے۔ میں خبر تو شائع کر سکتا تھا لیکن فوٹو گرافر کی خبر کو "بائی لائن" نہیں دے سکتا تھا۔ معذرت کر لی۔ یہ تینوں اس قدر ناراض ہوئے کہ ہیرالڈ چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے ان کے استعفے کا بے حد افسوس ہوا اور اب بھی ہے۔ "بائی لائن" کی بات تو محض بہانہ تھی، اصل میں تجمل ایم۔سی۔ کے جواب سے سخت ناراض تھے۔ اپنے عزیز دوست تجمل سے تو اس کے بعد ملاقات نہیں ہوئی لیکن صدیق سے علی گڑھ میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور پریمی سے تو پہلے کے سے تعلقات برقرار رہے۔ افسوس اب پریمی اس دنیا میں نہیں۔

مرادآباد

صحافت سے متعلق ہونے کے بعد، اگرچہ اس کے مواقع کئی آئے لیکن کسی وزیر اعلیٰ کی دعوت قبول نہ کی، الّا دو مرتبہ کے، اور یہ ضروری تھا۔ ایک بار شری پتی مشرا نے چند اہم مسائل پر بات چیت کے لیے صرف پانچ چھے صحافیوں کو مدعو کیا جن میں عشرت علی صدیقی، نوجیون کے چیف رپورٹر چوہان، پائنیر کے نیوز ایڈیٹر، مَیں اور امرت بازار پتریکا کے ایم۔اے حفیظ شامل تھے۔ ان دنوں محکمۂ اطلاعات میں "اردو سیل" کے قیام کا بہت چرچا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس مسئلے پر

ذرا زور دوں۔ وزیر اعلیٰ وعدہ تو پہلے ہی کر چکے تھے لیکن افسر شاہی ہر ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی کررہی تھی۔ میں نے ساری معلومات حاصل کر کے اس دعوت میں شرکت کی تھی۔ کھانے کے دوران دو سینیر صحافیوں نے اپنے ذاتی مسائل چٹکیاں بجاتے حل کرا لیے۔ میں نے ''اردو سیل'' کی بات چھیڑی اور وزیر اعلیٰ کے بجائے محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر کو، جو باادب کھڑے تھے، مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ ''اردو سیل'' کس منزل میں ہے تو انھوں نے کہا کہ ''فائل منظوری کے لیے محکمۂ مالیات گئی ہوئی ہے۔''

میں نے کہا میری اطلاع کے مطابق فائل منظوری کے بعد واپس آ گئی ہے لیکن آپ کے محکمہ میں اب ڈھونڈ ھے نہیں مل رہی ہے۔''

میرا جواب سن کر ڈائرکٹر صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔ میں نے وزیر اعلیٰ سے کہا، '' ان حالات میں تو 'اردو سیل' قائم ہونے سے رہی۔ نہ فائل ہوگی، نہ سیل بنے گی۔'' وزیر اعلیٰ نے فائل Re-construct کرنے کے احکامات جاری کیے۔ ڈائرکٹر اطلاعات نے یہ حکم پینسل سے اپنی نوٹ بک پر لکھ لیا۔

میں نے سارا واقعہ اردو کی انجمنوں اور محکمہ اطلاعات میں اردو دوستوں کو بتا دیا۔ معلوم نہیں کس نے کتنی کوشش کی لیکن ''اردو سیل'' کا مسئلہ جہاں تھا وہیں رہا اور اب تو شاید کسی کو یاد بھی نہ ہو۔

ایک اندوہناک واقعہ ان دنوں پیش آیا جب وشوناتھ سنگھ وزیر اعلیٰ تھے۔ ان کی حکومت کے دوران مراد آباد میں عید الفطر کے دن زبردست فساد ہوا اور کئی دن جاری رہا۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے ایک بڑے طبقہ نے ان فسادات کو مسلمانوں کی نسل کشی اور اقتصادی طور پر ان کی کمر توڑنے کی کوشش قرار دیا۔ لکھنؤ میں اس دن صبح سے شام تک پانی برستا رہا۔ ہاشم میاں فرنگی محلی نے اکبری گیٹ کے ڈھال کی مسجد کے پاس مجھ سے کہا تھا۔

''اپنی زندگی میں ایسی بے کیف عید نہیں دیکھی۔'' جملہ لفظ بہ لفظ یہی تھا۔

مراد آباد کے فسادات میں پولیس، پی۔اے۔سی۔ اور انتظامیہ نے جانبداری کے سارے رکارڈ توڑ دیے، فسادات کا سلسلہ کئی دن جاری رہا اور پولیس اور پی۔اے۔سی نے ظلم وستم کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے۔ ملک کے بھی یک طرفہ فرقہ وارانہ فسادات کا مقصد عام طور سے یہی ہوتا ہے۔

پندرہ بیس دن بعد وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے پانچ چھے سینئر صحافیوں کو چائے پر مدعو کیا۔ میں اس وقت تک نیوز ایڈیٹر نہیں بنایا گیا تھا۔ دورِ جام مجھ تک نہ جانے کیسے آ گیا۔ ان دنوں یہ خبریں گرم تھیں کہ ان فسادات سے وزیر اعلیٰ بہت پریشان ہیں۔ مسلمان صحافیوں میں، مَیں اور عثمان غنی تھے۔

وشواناتھ پرتاپ سنگھ نے جن کی شہرت ایک نہایت ایماندار اور سیکولر سیاسی لیڈر کی تھی، بات چیت کا آغاز تو دوسرے مسائل سے کیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہو گیا کہ اصل مسئلہ مراد آباد کا ہے جس سے وہ بہت پریشان ہیں۔ انھوں نے اپنے ابتدائی جملوں میں کہا کہ عام احساس یہ ہے کہ پولیس اور پی۔اے۔سی۔ کے لوگ جانبداری سے کام لیتے ہیں۔ بات چیت کے دوران کسی صحافی نے پولیس اور پی۔اے۔سی کی حمایت نہیں کی، گرما گرم باتیں البتہ کی گئیں۔ لیکن میری باری آئی تو میں نے کہا کہ پولیس اور پی۔اے۔سی۔ کو خواہ مخواہ نشانہ بنایا جاتا ہے۔ عثمان غنی کو میرے رویّے پر سخت حیرت تھی۔ ممکن ہے انھوں نے سوچا ہو کہ میں ''عاقبت'' سنوار رہا ہوں۔ بعض دوسرے صحافی خوش تھے۔ میری بات پر سب سے زیادہ حیرت خود وشواناتھ پرتاپ سنگھ کو تھی۔ انھوں نے کہا۔

''سہیل صاحب نیشنل ہیرالڈ نے بھی پولیس اور پی۔اے۔سی۔ کی سخت نکتہ چینی کی ہے اور بعض لوگوں نے تو مراد آباد کو فوج تک کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔'' مطلب ان کا یہ تھا کہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

اب میں نے اصل بات کہی۔ میں نے کہا'' راجہ صاحب، پولیس کی ہر چوکی میں مندر بنا ہوا ہے۔ سرکاری کاموں کا آغاز اور سنگِ بنیاد رکھنے کی رسم ناریل توڑ کر ادا کی جاتی ہے، سرکاری دفتروں میں جگہ جگہ دیوی دیوتاؤں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ چنانچہ پولیس اور پی۔اے۔سی۔ سمجھتی ہیں کہ ہندوستان میں ہندو حکومت ہے اور جب ہندوؤں اور کسی دوسرے فرقے کے درمیان تصادم ہوتا ہے تو نہ صرف پولیس اور پی۔اے۔سی۔ بلکہ پورا سرکاری عملہ ہندوؤں کا ساتھ دیتا ہے۔ اس میں ان کی کیا غلطی۔ میں تو انھیں بالکل بے قصور سمجھتا ہوں۔''

میری وضاحت سے سناٹا چھا گیا اور چند منٹ تک کسی کے منہ سے ایک لفظ نہ پھوٹا۔ آخر یہ خاموشی میں نے ہی توڑی اور وزیر اعلیٰ کو مخاطب کر کے کہا:

''پولیس اور پی۔اے۔سی۔ کا معاملہ تو آپ کی حکومت کا ہے، جو چاہے کیجیے لیکن

آپ نے مرادآباد کا دورہ کیوں نہیں کیا؟''

راجہ صاحب کے چہرے پر افسردگی چھا گئی اور انھوں نے کہا، ''کیا مُنہ لے کے جاتا۔''

یہ بات جانے کیسے پھیل گئی اور مجھے لوگوں نے خوب خوب مبارکبادیں دیں۔

وی۔ پی۔ سنگھ ایک اور سلسلے میں بہت دل برداشتہ تھے۔ انھوں نے لاری صاحب کے یہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں کہا تھا، ''مرد کی زبان ایک'' چنانچہ چند ماہ بعد انھوں نے اس سلسلے میں ایک سرکاری حکم نامہ جاری کیا جس پر ہائی کورٹ سے ہندی ساہتیہ سمیلن نے حکم امتناعی حاصل کرلیا اور اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ مزید یہ کہ مرکزی حکومت نے بھی اس سلسلے میں خاصی سردمہری کا مظاہرہ کیا۔ ویسے بھی مرکزی قیادت اور وی۔ پی۔ سنگھ کے تعلقات میں ہلکی سی کھٹاس پیدا ہوگئی تھی چنانچہ انھوں نے ڈاکوؤں اور ڈکیتوں کو ختم کرنے میں ناکامی کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے وزیراعلیٰ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

لیکن اردو دوستوں کے ذہن میں یہی خیال جم گیا کہ وہ ''مرد کی زبان ایک'' کے اعلان پر قائم نہیں رہے۔

۱۹۸۲ء میں، پہلے مجھے نیوز ایڈیٹر کا گریڈ دیا گیا پھر اگلے سال یہ اطلاع ملی کہ ترقی دے کر نیوز ایڈیٹر بنایا جارہا ہے۔ اس خبر سے دفتر کے ایک صاحب کو سخت پریشانی ہوئی اور انھوں نے کہا کہ کسی اور کو نیوز ایڈیٹر بنایا گیا تو وہ استعفیٰ دے دیں گے۔ یہ معلوم ہونے پر میں نے یشپال کپور کو لکھا کہ نیوز ایڈیٹر کا سارا کام میں کرہی رہا ہوں اور گریڈ بھی مل چکا ہے۔ موجودہ صورت برقرار رہنے دیجیے... صاحب کو بہت پریشانی ہے۔ لیکن یشپال کپور نے میرے خط کا کوئی جواب دینے کے بجائے مجھے نیوز ایڈیٹر بنادیا... کسی نے استعفیٰ نہیں دیا۔

یہ بات ۱۹۸۳ء کی ہے۔

مصر کا دورہ!

۵ ستمبر ۱۹۸۳ء کو مجھے آفس کے ٹیلی پرنٹر پر یشپال کپور کا پیغام ملا جس میں یہ دریافت کرنے کے بعد کہ پاسپورٹ ہے یا نہیں، کہا گیا تھا کہ پاسپورٹ نہ ہو تو حکومت ہند کے PRO کو درخواست دے کر مجھے مطلع کیجیے۔[1] پاسپورٹ میرے پاس تھا۔

۱۔ اس سلسلے کی ٹیلی پرنٹر کاپی کے عکس کے لیے دیکھیے آخر کے صفحات۔

اگلے دن مختصر کوائف اور ایک درجن تصاویر طلب کی گئیں۔ تصاویر تین چار تھیں وہی بھیج دیں اور انھیں اطلاع بھی دے دی کہ ۹ ستمبر کی صبح پہنچ رہا ہوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مصر میں ایک ہفتے کے قیام کے بعد مجھے اقوام متحدہ بھی جانا ہے جسے وزیر اعظم اندرا گاندھی خطاب کرنے والی تھیں۔

میں مقررہ تاریخ کو دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ دفتر نے فرسٹ کلاس میں رزرویشن کرادیا اور دہلی کے اخراجات کے لیے ایک ہزار روپے دیے۔ اتفاق سے میرے دہلی ہیرالڈ کے دفتر پہنچتے ہی مصر کے سفارت خانے سے فون آیا، انصر قدوائی نے، جو ہیرالڈ کی ستم رسیدگی کے دنوں میں ایڈیٹر ہو گئے تھے، فون مجھے دے دیا۔ کوئی خاتون کہہ رہی تھیں:

"His photograph and a brief life-sketch have been published in Cairo dailies and his arrival is being keenly awaited."

ان کا خیال تھا کہ وہ ایڈیٹر سے بات کر رہی ہیں لیکن یہ معلوم ہونے پر کہ میں ان سے مخاطب ہوں انھوں نے مزید خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ سہ شنبہ کو روانگی ہے تو انھوں نے ''ویلکم، ویلکم'' کہا۔

ہیرالڈ کے اس وقت کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا کہ چیف انفارمیشن آفیسر مسٹر تواری سے فوراً ملاقات کروں اور ان کے نام یشپال کپور کا ایک خط دیتے ہوئے انھوں نے مجھے بتایا کہ غلطی سے دو Original خطوط تیار ہو گئے تھے، احتیاطاً یہ بھی اپنے پاس رکھ لیجیے۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ میں بھاگم بھاگ وزارت اطلاعات پہنچا۔ مسٹر تواری کسی میٹنگ میں تھے۔ ذرا سی دیر میں آ گئے۔ ان کا تعلق یو پی کیڈر سے تھا اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے کے صورت آشنا تھے۔ انھوں نے کہا سہیل صاحب آج جمعہ ہے اور بارہ بج چکے ہیں۔ کل مہینے کا دوسرا اسنیچر، چنانچہ سرکاری دفاتر بند رہیں گے۔ سہ شنبہ کی صبح روانگی ہے اور ابھی وزارت خارجہ سے منظوری اور ریزرو بینک سے Foreign Exchange حاصل کرنا ہے جو ظاہر ہے اب ممکن نہیں۔ دوسرے صحافیوں کے سلسلے میں خطوط کئی دن قبل آ گئے تھے۔ ان کے انتظامات مکمل کرائے جا چکے ہیں اور ہاں، ہوائی جہاز میں جگہ بھی بک کرانا ہے۔ انھوں نے یشپال کپور کے خط پر نظر ڈالی اور کہا تین دن سے یہ خط ہیرالڈ کے آفس میں کیا کر رہا تھا؟ بے حد افسوس ہے، اب کچھ بھی ممکن نہیں۔''

میں نے ہیرالڈ ہاؤس آ کر انصر قدوائی کو ساری روداد سنائی تو انھوں نے کسی قسم کی صفائی دینے کے بجائے صرف یہ کہا، "اب آپ لکھنؤ میں لوگوں سے کیا کہیے گا؟"

میں نے کہا:

"Only this that the tour did not materialize due to somebody's mischief."

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پوچھا، " آپ کا رزرویشن کس تاریخ کا کرایا جائے۔ آج تو کپور صاحب چلے گئے ہیں، آپ کل ان سے مل لیں تو بہتر ہے۔"

میں نے کہا اپنی سہولت کے مطابق رزرویشن کرالوں گا اور چلا آیا۔

اگلے دن میں نے یشپال کپور سے ملاقات کی اور ساری بات بتائی تو انھیں سخت حیرت ہوئی۔ انھوں نے کہا میں نے خط تو کئی دن پہلے ہی لکھ دیا تھا۔ خیر آئندہ کبھی دیکھا جائے گا۔ پھر وہ لکھنؤ ہیرالڈ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

یہ کہنا کہ اس واقعہ کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا غلط بیانی ہوگی۔ کوئی پوچھتا تو طرح طرح کی باتیں بناتا، کوشش کرتا کہ ایسے لوگوں سے ملاقات کی نوبت نہ آئے جو اس بارے میں کچھ پوچھ سکتے ہیں۔

میں عام طور سے جھوٹ نہیں بولتا، نقصان کا خطرہ مول لے کر بھی سچائی سے گریز نہیں کرتا لیکن یہ بھی بتادوں کہ خاصا دبو قسم کا انسان ہوگیا ہوں اور صرف اپنی بزدلی کے سبب اس وقت بھی خاموشی اختیار کرلیتا ہوں جب لوگ اپنے جھوٹے دعووں میں مجھے اس طرح شامل کرلیتے ہیں گویا میں اس سب کا گواہ ہوں۔ میں ہمیشہ ایسا نہ تھا۔ ابا کے انتقال سے قبل خاصا دبنگ تھا لیکن بعد کے حالات اور ایک "حادثے" نے، جس کی تفصیلات بھی اپنی بزدلی کے سبب بیان نہیں کرسکا ہوں، تباہ کردیا... تاہم ان حالات سے مجھے فائدہ بھی ہوا... باہر کی ناقابل برداشت دنیا سے فرار اور اپنے آپ میں گم رہ کر، میں اپنے کمرے میں ایک دنیا آباد کرلیتا ہوں، گھنٹوں سر جھکائے کام کرتا رہتا ہوں۔ اس "سہولت" نے، مجھے صحافتی دنیا میں ایک اچھا نہیں تو محنتی اور بھروسے کے قابل کارکن ضرور بنادیا اور چھوٹا موٹا ادیب بھی۔

ان دنوں ہیرالڈ میں اتل چندرا جو ٹائمس آف انڈیا، لکھنؤ، کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر اور رتن منی لال، جو ہندوستان ٹائمس کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر رہ چکے ہیں، چیف سب ایڈیٹر تھے۔ یہ دونوں اپنے کام میں بہت مستعد تھے۔

ایک دن ڈاک ایڈیشن میں راجستھان کی ایک سیاسی خبر غلط سرخی کے ساتھ صفحہ اوّل پر بطور Reflector[1] شائع ہوگئی۔

میں ڈھائی بجے کے قریب دفتر پہنچا۔ تھوڑی دیر میں ڈاک ایڈیشن پریس کے حوالے کردیا گیا۔ دن میں اتل چندرا انچارج تھے، اس لیے میں نے صفحہ اوّل پر نظر تک نہ ڈالی۔ ساڑھے سات بجے ڈاک ایڈیشن چھپ کے آ گیا۔ میں نے وہ خبر پڑھی، کانٹ چھانٹ کی، سرخی بدل دی۔ ان دنوں ریزیڈنٹ ایڈیٹر پی۔سی۔ ٹنڈن تھے۔ انھوں نے اس خبر کے بارے میں مجھ سے ذکر بھی نہ کیا۔ اگلے دن میں دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس غلطی کی سزا کے طور پر انھوں نے اتل چندرا کو اخبار نکالنے کے حق سے محروم کردیا ہے۔ میں نے ان سے سخت احتجاج کیا کہ مجھے بتائے بغیر انھوں نے اتنا سخت فیصلہ لے لیا۔ خیر، انھوں نے یہ حکم نامہ جو اس وقت تک اتل کو نہیں دیا جاسکا تھا واپس لے لیا۔ معلوم نہیں اتل کو اس کا علم بھی ہوا یا نہیں۔

نیشنل ہیرالڈ میں طریقہ یہ تھا (دوسرے اخباروں میں بھی رہا ہوگا) کہ ریاستی اور مرکزی بجٹ کے موقع پر ''بجٹ ڈیسک'' بنائی جاتی۔ یہ کام مجھے کرنا تھا لیکن ایک تو اسٹاف بے حد کم رہ گیا تھا دوسرے تنخواہیں وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے لوگ کام میں دلچسپی نہ لیتے تھے، میں بجٹ ڈیسک کیا بناتا۔ تاہم مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ مجھے اس سلسلے میں کم سے کم ریزیڈنٹ ایڈیٹر سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے تھا۔

بجٹ کے دن بھی میں نے حسب دستور پہلے ڈاک ایڈیشن کی چند خبریں ایڈٹ کیں، اس کے بعد کانپور اور پھر لکھنؤ کی۔ اس وقت تک ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ ورما نے یہ دیکھ کر کہ میرے سامنے اب کوئی مقامی کاپی نہیں ہے، بجٹ سے متعلق ساری خبریں میری طرف بڑھا دیں۔ اُس نے انھیں الگ الگ پن بھی نہیں کیا تھا۔ بجٹ سے متعلق خبریں ایڈٹ کرنے کے بعد میں نے چھے کالمہ شاہ سرخی لگائی لیکن سرخی میں اعداد و شمار شامل نہیں کیے۔ یہ غلطی تھی۔ بجٹ کی شاہ سرخی میں اعداد و شمار ضرور ہونے چاہیے۔

ا۔ صفحہ اوّل کے نیچے کے حصے میں چار پانچ کالم کی ایک سطری سرخی کی خبر کو Relief کے علاوہ Reflector بھی کہتے ہیں۔

بے رحم مذاق

پی۔سی۔ٹنڈن ۶ بجے شام کو، جس وقت اخبار میں اصل کام شروع ہوتا ہے، گھر چلے جاتے۔کبھی کبھی رخصت ہوتے وقت سب ایڈیٹرس کی میز کے سامنے کھڑے ہوکر دو چار باتیں کرتے اور بس۔اگلے دن انھوں نے آفس سے جاتے وقت ڈیسک کے پاس آ کر کہا، ''بجٹ کی سرخی میں اعداد وشمار نہیں ہیں۔'' مجھے اس وقت تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا آمدنی اور خرچ میں زبردست فرق کا توذکر ہے۔

انھوں نے کہا کہ ورما آئیں تو آپ انھیں اس غلطی کی طرف متوجہ ضرور کریں۔ میں نے کہا بجٹ اور متعلقہ خبریں میری بنائی ہوئی ہیں۔انھیں یہ بات معلوم تھی لیکن وہ براہ راست الزام مجھ پر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے مزاحیہ رخ اختیار کرلیا جس سے معاملات بگڑ گئے۔

یہ ساری بات چیت انگریزی میں ہوئی تھی اور آگے کی گفتگو انگریزی ہی میں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

انھوں نے کہا:

"Our lead story is like a music conference in which there is no stage, no singer, no instruments and also no audience."

مجھے ان کی یہ بات بہت بری لگی اور میں نے کہا:

"This applies more to the Herald. On the Union budget day, the Resident Editor absent, the assistant editor absent, no Budget desk and the lack of concern to the extent that the lead headline has not been changed even in the Dak edition."

مسٹر ٹنڈن نے کوئی ردِّعمل ظاہر نہیں کیا۔ایک آدھ منٹ کھڑے رہے، پھر چلے گئے۔

کچھ دن بعد ایک زیادہ سنگین واقعہ ہوا، اگرچہ اب اس کا سیاق وسباق بالکل یاد نہیں اور ان کی دلیل کی ایک آدھ کڑی بھی بھول چکا ہوں۔اس دن بھی پی۔سی۔ٹنڈن اپنے کمرے سے نکل کر سب ایڈیٹرس کی ڈیسک کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور انھوں نے پوچھا:

"Does anybody know why the Russians are called

Red?"

جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ اس لیے خاموشی چھائی رہی۔ انھوں نے کہا۔

"Russia borders Red Sea, seas have fish, the fish have fins, the Finns had fought a war with the Russians and that is why they are called Red."

اس پر کچھ لوگ ہنس دیے، میں بھی مسکرا دیا اگرچہ احساس ہوا کہ اس میں میرے کمیونسٹ ہونے پر ہلکا سا طنز ہے۔

میں نے ان کی عمر کا اندازہ لگانے کے لیے انھیں غور سے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ساٹھ کے آس پاس رہے ہوں گے لیکن اس خیال سے کہ وہ زیادہ آزردہ خاطر نہ ہو جائیں ان کی عمر میں سے دس سال کم کر دیے اور کہا، "ٹنڈن صاحب مجھے بھی ایک دلچسپ لطیفہ یاد آ گیا ہے"۔

انھوں نے کہا ضرور سنایئے۔

سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے تو میں نے کہا:

"In an interview, a candidate was asked: The length of this room is thirty and the breadth twenty, tell me what is my age?"

"The candidate lost no time and shot back: 'Fifty"

"How could you make it ?"

"Sir, a distant cousin of mine is twenty - five and he is half-mad."

وہ خاموش کھڑے، دھیرے دھیرے آگے پیچھے ہوتے رہے، پھر بولے۔

"The irony of the situation is that I cannot even protest."

واقعی یہ ایک ظالمانہ لطیفہ تھا۔

پی۔ سی۔ ٹنڈن خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ وہ بمشکل زینے تک پہنچے ہوں گے کہ دفتر میں ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ سچ پوچھیے تو مجھے اپنے ردِ عمل پر افسوس تھا۔ وہ بہت سینیر جرنلسٹ تھے۔ انھوں نے صرف ایک لطیفہ سنایا تھا جس میں مجھ پر طنز ضرور تھا لیکن میرا نشانہ براہ راست وہ خود تھے، مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ ایک شریف انسان تھے۔

میری چھوٹی بہن نجمہ کا انتقال ہوا اور میں علی گڑھ سے واپس آیا تو پی۔ سی۔ ٹنڈن

میرے دفتر پہنچنے کے بمشکل دس منٹ کے اندر اپنے کمرے سے نکل کر میری کرسی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔ "Your younger sister?"

میں نے کہا "Yes, younger by twelve years."

''آہ،'' ان کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا لیکن ان کی ساری تکلیف اور دردمندی اس ایک لفظ میں سمٹ آئی تھی۔ وہ دو تین منٹ سر جھکائے خاموش کھڑے رہے، پھر اپنے کیبن میں چلے گئے۔

اب دفتر کی فضا تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ دفتر میں میری شہرت ایک محنتی اور قابل اعتماد کارکن، کلچرڈ انسان اور پورے طور سے سیکولر شخص کی تھی لیکن اخبار سے ایم۔سی۔ کی علاحدگی کے بعد دوسری طرح کے لوگوں کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں سے کئی لوگ بھارتیہ جنتا پارٹی سے کھلی ہمدردیاں رکھتے تھے اور ان لوگوں پر جو ایم۔سی۔ کی علاحدگی سے بہت زیادہ ملول تھے، جملے بازیاں کیا کرتے۔

میں اور دلاور حسین ان جملے بازیوں کا خاص نشانہ ہوتے۔ ہم دونوں ایم۔سی۔ کی بڑی زیادہ تعریف کرتے، ظاہر ہے مخالفین اس کا برا مانتے۔ بہت دنوں پہلے ایک دن میں نے دلاور حسین سے محض برائے بحث، کہا تھا کہ کسی کی برائی کرنے کا تو برا مانا جا سکتا ہے لیکن کسی کی تعریف کا کوئی کیسے برا مان سکتا ہے؟ دلاور حسین مسکرا کر خاموش ہو گئے تھے۔ وہ بے حد مذہبی انسان تھے لیکن ان میں تعصب نام کو نہ تھا، میرا سوال بھی کسی مناقشے میں برتری حاصل کرنے کے لیے نہ تھا۔

ایک دن ایم۔سی۔ کی تعریف کا نگم نے بہت برا مانا تو دلاور حسین نے کہا، ''سہیل صاحب دیکھا آپ نے، تعریف سے کتنی تکلیف پہنچ سکتی ہے۔''

میں قائل ہو گیا۔

خلیج ٹائمس

نیشنل ہیرالڈ کے شعبۂ ادارت کے حالات روز بروز بگڑتے گئے تو دہلی آفس سے عارضی طور پر ساتوک کو بھیجا گیا۔ وہ ریزیڈنٹ ایڈیٹر نہ ہونے کے باوجود عملی طور سے اس وقت سب کچھ تھے۔ انھوں نے دفتر کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد جو رپورٹ بھیجی تھی اس کے بارے

میں عام خیال یہی تھا کہ لکھنؤ ایڈیشن میں دوسری پوزیشن کے لیے میرا نام تجویز کیا گیا ہے۔..لیکن تنخواہیں نہ ملنے، رپورٹروں کو سفر خرچ کی عدم ادائیگی اور عملہ کی کمی کی وجہ سے شعبۂ ادارت کے اسٹاف کو کبھی کبھی ہفتے کی چھٹی تک نہ مل پانے سے میں بھی بہت بددل ہورہا تھا۔ مزید یہ کہ علی گڑھ میں میری والدہ کی طبیعت خراب تھی، نجمہ[1] کی پہلی برسی بھی آرہی تھی۔ میں نے پندرہ دن کی چھٹی کی درخواست دی۔ ساتوک نے درخواست مسترد تو نہیں کی لیکن اس پر درج ذیل عبارت لکھ کر مجھے بھجوادی۔

Mr. Suhail
I understand your difficulties, let me shift here finally, I will decide everything by May 15-you are a responsible person in-charge of the news room."

۱۹۸۴ء کے ابتدائی مہینوں میں مجھے Khaleej Times کے بمبئی آفس سے تار ملا جس میں لکھا تھا۔ Final Interview at Nariman Point, on ..... at 11 am۔ تار میں پورا پتہ دیا گیا تھا، میں نے درخواست پندرہ سولہ سال قبل دی تھی لیکن کوئی انٹرویو نہیں دیا تھا۔

کسی طرح ممبئی پہنچا اور ریمان پوائنٹ گیا تو معلوم ہوا اتوار کے سبب سارے دفاتر بند ہیں۔ خیال ہوا کہ کسی نے یہ حرکت پریشان کرنے کے لیے کی ہے۔ اسی وقت اس بڈھے نے جس نے بتایا تھا کہ سارے دفاتر بند ہیں کہا کہ ایک میم صاحبہ تھوڑی دیر پہلے اوپر گئی ہیں۔ دیکھ لیجیے شاید وہی ہوں۔ اتوار کی وجہ سے لفٹ بند تھی، مجبوراً زینے چڑھنے لگا۔ چوتھی منزل پر ایک خاتون سے یہ معلوم ہونے پر کہ وہ میری منتظر تھیں، سانسیں ہموار ہوگئیں۔

تھوڑی دیر بعد اخبار کے ایڈیٹر مسٹر خالد بھی آگئے۔ انھوں نے چند رسمی باتوں کے بعد ہیرالڈ کے حالات دریافت کیے تو میں سمجھ گیا کہ موصوف مول تول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے میں جلد سے جلد جوائن کرلوں، ایک مہینے کی نوٹس کے زمانے کی تنخواہ بھی دینے پر آمادہ تھے۔ انھوں نے کم و بیش تیس ہزار روپے کی پیش کش کی، اس جملۂ معترضہ کے ساتھ کہ آپ کی موجودہ تنخواہ کی دس گیارہ گنی ہے۔ میں نے اسے وطن چھوڑنے کی قیمت قرار دیا تو وہ سالانہ چھٹی ایک مہینے سے ڈیڑھ مہینے کرنے پر راضی ہوگئے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ دوسری بار کی آمدورفت کا

۱۔ اس موقع پر میں نے ایک نظم بھی کہی تھی جو قومی آواز کے ضمیمہ میں میری ہی تحریر میں شائع ہوئی تھی۔ نظم کے لیے دیکھیے آخر کے صفحات۔

کرایہ خلیج ٹائمز نہ دے سکے گا۔ غرض ایک بھی تراشا دکھائے بغیر سارے معاملات طے ہو گئے۔ انھوں نے دو مزید لوگوں کے لیے فارم دیے اور ان کے انتخاب کا مجھے مجاز بھی کر دیا۔

چلتے چلتے، انھوں نے پوچھا، ''آپ کو ٹائپنگ تو آتی ہی ہوگی؟''

میں نے ٹائپنگ سیکھی تھی لیکن پہلے قومی آواز اور پھر ہیرالڈ میں ڈیسک سے متعلق ہونے کی وجہ سے اس کی مشق بالکل نہ تھی۔ تاہم دس پندرہ دن یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی مشق سے کام چلانے کے قابل ہو جاتا۔ مجھے یہی کہنا چاہیے تھا لیکن میں نے بے وقوفی کی حد تک کی ایمانداری سے کام لیتے ہوئے ''جی نہیں'' کہہ دیا۔

یہ سن کر وہ جیسے چونک پڑے اور انھوں نے کہا۔

''یہ عجیب بات ہے، پاکستان میں بھی یہی صورت پیش آئی۔''

اصل میں انھیں سینئر اور تجربہ کار صحافی کی ضرورت تھی جو کمپیوٹر پر کام کرنا جانتا ہو۔ پھر جب میں نے انھیں بتایا کہ Out of practice ہوں تو انھوں نے کہا کہ استعفیٰ دے کر مجھے Self-typed خط بھیج دیجیے گا، میں فوراً اپائنٹمینٹ لیٹر اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیج دوں گا۔

میں نے واپس آ کر ٹائپنگ کی مشق شروع کر دی لیکن امرتسر گردوارہ پر فوج کشی، اندرا گاندھی کے قتل اور بعد کے سکھ دشمن فسادات سے دل بجھ گیا۔ مزید یہ بھی کہ کسی کو میری صبح سے رات گئے تک کی محنت کا احساس تک نہ تھا۔ دفتر کے حالات سے بددل ہو کر ساتوک دہلی چلے گئے تھے۔ دفتر میں افراتفری کا ماحول تھا، اخبار نکالنا میری ذمہ داری تھی، چار پانچ دن تقریباً تن تنہا اخبار نکال کر بیمار پڑ گیا تو میں نے چھٹی لے لی۔ اور میں نے ٹائپنگ کی مشق چھوڑ دی۔

میری غیر حاضری کے دوران ان صاحب نے جو مجھے نیوز ایڈیٹر بنائے جانے سے بہت خفا تھے، ایک سازش رچ لی تھی۔

روزنامہ Patriot میں ندوۃ العلما یا دیوبند پر شکیل سہیل نام کے کسی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ مشہور کر دیا گیا کہ اس کا مصنف میں ہوں۔ کوئی کھل کے تو یہ بات نہ کہتا لیکن اشاروں اشاروں میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ اگلے دن منیجر دیش بندھو ٹنڈن نے کہا، ''سہیل صاحب ہیرالڈ کے ہوتے ہوئے آپ کو پیٹریاٹ میں مضمون لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اس مضمون سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے''۔ میں نے کہا

''لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ عابد سہیل اور شکیل سہیل میں کیا فرق ہے'' ٹنڈن نے کہا۔

''لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دیش بندھو ٹنڈن چور ہے، لکھنؤ ہیرالڈ بیچے کھا رہا ہے''
میں نے غصے سے کہا۔

ٹنڈن کو مجھ سے اس طرح کے جملے کی توقع نہ تھی، گھبرا گئے اور صرف ''سہیل صاحب!'' کہہ سکے۔ اس دوران پندرہ بیس لوگ جمع ہو گئے لیکن مکمل سناٹا چھایا رہا۔ کوئی ایک لفظ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد ٹنڈن اپنے پارٹیشن میں چلے گئے، میں نیوز روم لوٹ آیا۔

ایسوشی ایٹیڈ جرنلس سے اپنے تینتیس سالہ تعلق میں مجھے اس قدر شدید غصہ آنے کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ کسی چپراسی نے ٹھنڈے پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا اور میں نے پانی پی کر کام شروع کر دیا۔ اس واقعے پر مجھے خود بھی افسوس تھا۔ اس طرح کی بات میرے مزاج سے بالکل غیر ہم آہنگ تھی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دفتر میں لوٹ مچی تھی۔ روس سے ایک روٹری تحفے کے طور پر آئی تھی، اتنی بڑی تھی کہ اسے لگانے کے لیے ایک بڑا تہہ خانہ بنانا پڑا تھا۔ اس مشین سے چالیس صفحات کا متعدد رنگوں کا اخبار فولڈ کیا ہوا برآمد ہو سکتا تھا۔ مشین میں اٹھارہ یا بیس موٹر تھے جو چپکے چپکے فروخت کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ دفتر میں ہر وقت تعمیر کا کام جاری رہتا۔ پی۔ سی ٹنڈن کہتے، ''تاج محل بن رہا ہے۔ دیوار بنتی ہے، پھر گرا دی جاتی ہے۔'' "The more the work, the more the cut money"

اس وقت کے ایڈیٹر کی بیٹی کی شادی لکھنؤ میں تھی۔

شادی کی تقریب کا دعوت نامہ شعبۂ ادارت کے ایک ایک فرد کو دیا گیا تھا، علاوہ میرے۔ ان کی بیٹی کی شادی میرے ایک کرم فرما کے بیٹے سے ہونی تھی اور میں پہلے ہی مدعو کیا جا چکا تھا۔ لیکن شادی سے ایک یا دو دن قبل ایڈیٹر صاحب میری میز کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے کچھ کہے بغیر دعوت نامہ میری میز پر رکھ دیا۔ اس پر کسی کا نام نہ تھا۔ میں نے ان سے کہا آپ کا لفافہ غلطی سے گر گیا ہے۔ ''ارے اس پر نام لکھنے سے رہ گیا'' کہتے ہوئے انھوں نے اس پر میرا نام لکھ دیا۔

شادی کی تقریب میں جیسے ہی ان کے چھوٹے بھائی افسر کریم کی مجھ پر نظر پڑی وہ تیزی سے میری طرف بڑھے اور لپٹ گئے۔ افسر لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے کلاس فیلو تھے۔ انصر نے دیکھا تو وہ بھی آ گئے۔ بولے، ''ایک آپ دونوں ہیں، برسوں بعد ملے اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے، اور آپ کے ''دوست'' ہیں، کہتے ہیں کہ میرے کلاس فیلو تھے، لیکن مجھے یاد ہی نہیں آتا۔''

کلسی کا انتقال

تقریباً ایک مہینے بعد، یا ممکن ہے زیادہ دن گذر گئے ہوں، یہ دلدوز خبر سننے کو ملی کہ دفتر آنے کے لیے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے کلسی[1] پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اسی وقت چٹ پٹ ہوگیا۔ خبر ملتے ہی اخبار میں سوگ کا ماحول چھا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹنڈن اپنے پارٹیشن سے مسکراتے ہوئے نکلے اور بولے۔

''میں نے کل اسے ڈسمس کر دیا تھا۔''

''مسٹر ٹنڈن،'' میں نے احتجاج کیا،'' آپ اپنے کمرے میں بھی مسکرا سکتے ہیں۔''

ٹنڈن پر اس بات کا نہ صرف یہ کہ کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انھوں نے کہا،'' مہینوں سے اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا، بس جو خبریں دفتر میں آجاتیں، انھیں دوبارہ لکھ دیتا تھا۔''

ان کی یہ بات مجھے بہت بری لگی اور میں نے کہا:

"Will you please shut up Mr. Tandon, or I leave the office"

اب ٹنڈن کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا اور وہ اپنے پارٹیشن میں لوٹ گئے۔

میں نے تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا۔ ٹنڈن نے اس میں شرکت نہیں کی۔

آہ پیٹرک!

کچھ دنوں بعد ایڈون پیٹرک کی بیماری کی اطلاع ملی۔ پیٹرک کرسچین کالج میں ایک سال میرا کلاس فیلو تھا۔

ہیرالڈ میں ہم دونوں کی تقرری ایک ہی دن ہوئی تھی لیکن انگریزی کی زبردست مہارت کے باوجود وہ اب بھی سب ایڈیٹر تھا۔ شراب نے اسے بالکل تباہ کر دیا تھا۔ وہ درخواست دیے بغیر کئی کئی دن غائب رہتا۔ اس کی انگریزی اتنی اچھی نہ ہوتی تو شاید بہت پہلے اس کی چھٹی ہو چکی ہوتی۔ لیکن وہ بے حد شریف النفس انسان تھا۔ اس کے منہ سے کسی کی برائی کبھی نہیں سنی۔

میں لال باغ میں اس کے گھر گیا۔ وہ بستر پر تنہا پڑا تھا۔ میرے گھنٹے سوا گھنٹے کے قیام کے دوران اس نے بمشکل تین یا چار جملے بولے، اور وہ بھی ٹوٹے پھوٹے۔

۱۔ ہیرالڈ میں رپورٹر تھے اور جرائم کی مقامی خبریں دیتے۔

آخر میں نے کہا، ''اچھا اب چلتے ہیں۔''
''ہم بھی چلتے ہیں،'' اس نے کہا۔
میں تقریباً چکرا کر کرسی پر گر گیا اور دس پندرہ منٹ بعد کچھ کہے بغیر واپس چلا آیا۔
دفتر آ کر میں نے ٹنڈن سے کہا کہ پیٹرک کی تنخواہ میں سے ایک ہزار روپے دے دیجیے۔ وہ سخت بیمار ہے۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا میری کئی مہینوں کی تنخواہ میں سے دے دیجیے۔ کہنے لگے روپے نہیں ہیں۔ میں نے کہا:

"Mr.Tandon, he has to be hospitalised immediately, or else, he will die."

"Let him die." ٹنڈن نے سفاکانہ جواب دیا۔
میں نے نوجیون کے دفتر میں بیٹھ کر استعفیٰ لکھا، نظیر آباد میں ٹائپ کرایا اور شام ہو جانے کی وجہ سے اگلے دن سنگھ کو دے کر دوسری کاپی پر دستخط کرا لیے۔ ان کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ یہ بات ۸/اپریل ۱۹۸۵ء کی ہے۔ میری اسکوٹر پر پریس لکھا ہوا تھا اس لیے اس پر دفتر نہ گیا کیوں کہ استعفیٰ دے کر واپس آتے وقت میں اخبار نویس نہیں رہ جاؤں گا۔
اور اس طرح ایسوشی ایٹیڈ جرنلس سے اگست ۱۹۵۲ء میں قومی آواز کے اعزازی رپورٹر کے طور پر غیر رسمی اور ۱۷/اگست ۱۹۵۷ء کو جو باقاعدہ تعلق قائم ہوا تھا وہ بتیس تینتیس برس بعد ختم ہو گیا اور میں نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔
لیکن استعفیٰ منظور نہیں ہوا۔ ایک ہفتہ گذرا، دو ہفتے گذرے اور پھر تیسرا ہفتہ بھی گذر گیا، کوئی جواب نہ ملا۔ وشنو شنکر جو ٹیلی پرنٹر آپریٹر تھا، ہر دوسرے تیسرے دن آ کر بتاتا کہ دہلی سے پیغام آتے ہیں "Please try to persuade Mr. Suhail to withdraw his resignation" اور یہاں سے جواب دیا جاتا ہے "I have tried my best but he is adamant"۔ وہ مجھے دونوں پیغاموں کی ٹیلی پرنٹر کاپی بھی دکھاتا، جب کہ اس سارے دوران مجھ سے رابطہ کسی نے ایک بار بھی قائم نہیں کیا تھا۔
تقریباً بیس بائیس دن بعد میرا استعفیٰ منظور ہوا لیکن سنا ہے کہ حاضری رجسٹر پر بطور نیوز ایڈیٹر میرا نام دو ماہ تک باقی رہا۔ میرے استعفے کے تیسرے یا چوتھے دن ایڈون پیٹرک کا انتقال ہو گیا۔ دفتر میں شاید تعزیتی جلسہ بھی نہیں ہوا لیکن اس کے دوستوں کے دلوں میں اس کی یادوں کی شمع ہمیشہ روشن رہے گی۔

لکھنؤ ہیرالڈ میں اندر اندر لاوا پک رہا تھا۔ ملازمین کی یونین نے منیجر کو ایک محضر پیش کیا جس میں تنخواہوں کے بقایا جات کی ادائیگی کے مطالبے کے علاوہ یہ مانگ بھی تھی کہ میرا استعفیٰ نامنظور کر کے ملازمت کے تسلسل کے ساتھ مجھے واپس لایا جائے۔ معینہ مدت کے بعد جب مطالبات تسلیم کرنے کے بجائے تالا بندی کردی گئی تو مزدوروں نے دفتر پر قبضہ کر کے اخبار کی اشاعت شروع کردی۔ سنہا اور جوریا جو ایسوسی ایٹیڈ جرنلس کے ملازمین کی یونین کے صدر اور سکریٹری تھے، پندرہ بیس مزدوروں کے ساتھ نصرت پبلشر آئے۔ ان کا اصرار تھا کہ میں لکھنؤ ایڈیشن کے انچارج کے طور پر واپس آ جاؤں۔ لیکن میں نے معذرت کرلی۔ وہ یہ سمجھے کہ میں اس خیال سے تامل کررہا ہوں کہ لوگ کہیں گے استعفیٰ دے کر پچھتا رہا تھا چنانچہ چور دروازے سے داخل ہوگیا اور کئی بار طرح طرح سے کہا کہ ہیرالڈ کے سوڈیڑھ سو کارکن آپ کو کندھے پر بٹھا کر لے جائیں گے، نعرے لگاتے ہوئے۔ وہاں استقبال کے لیے ایک بڑا جلسہ ہوگا، ہیرالڈ، قومی آواز اور نوجیون کے علاوہ دوسرے اخباروں میں بھی خبر شائع ہوگی لیکن میں راضی نہ ہوا۔ خدا نے عقل دی ورنہ لالچ تو آرہی تھی۔ یونین نے میرے بقایا جات ادا کرنے کی بھی پیش کش کی جو میں نے منظور کرلی لیکن صرف اس شرط پر کہ سارے رٹائرڈ ملازمین کی باقی رقوم ادا کردی جائیں... اس وقت میرے سامنے ہیرالڈ کے فورمین ضمیر احمد کی تصویر تھی جو تیس سال کی ملازمت کے بعد خالی ہاتھ رخصت کردیا گیا تھا... گھر پہنچ کر اس نے چائے مانگی اور چائے آنے سے پہلے زندگی سے سبکدوش ہوگیا۔

ظاہر ہے اخبارات کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے اشاعت کا سلسلہ جاری نہ رہ سکتا تھا۔ انتظامیہ کا پھر قبضہ ہوگیا۔ تھوڑی بہت تنخواہیں ادا کر کے کام شروع ہوا۔ ایڈیٹر صاحب دوبار میرے گھر آئے، مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی، پیغام چھوڑ گئے۔ پھر ملاقات ہوئی تو انھوں نے اصرار کیا کہ میں ہیرالڈ جوائن کرلوں۔ وہ چاہتے تھے درخواست دے دوں، میں تیار نہ ہوا۔ کہنے لگے جنرل منیجر سگا دہلی سے آئے ہوئے ہیں، ان سے ملاقات کرلیجیے۔ میں ملنے گیا۔ وہ گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں مجھے سگا کے کمرے میں پہنچا کر غائب ہوگئے۔ سگا ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ان کی تلاش شروع ہوئی۔ ملے تو سگا نے میرے سامنے ان سے کہا، ''ابھی رپورٹ لکھ دیجیے، سہیل صاحب آج ہی سے کام شروع کردیں۔'' کہنے لگے دہلی جا کر رپورٹ دوں گا، میرے سامنے کی بات ہے۔ رپورٹ آج تک نہیں دی۔

ایں ماتم سخت است

دہلی اردو اکادمی کے ایک سیمنار میں جانا ہوا تو سوچا رامیشور تھا کرے اپنے بقایاجات کے سلسلے میں مل لوں۔ وہ تھے بہت بڑے چارٹرڈ اکاونٹینٹ۔ ان کے پاس ہیرالڈ کے لیے وقت کہاں تھا۔ سگا سے ملاقات کی۔ کہنے لگے آج ہی رات ریزیڈنٹ ایڈیٹر ہوکر پٹنہ چلے جائیے۔ میں نے معذرت کرلی۔ کہنے لگے لکھنؤ کے قومی آواز میں چیف ایڈیٹر ہوجائیے۔ عثمان غنی تو آپ سے جونیر ہیں۔ میں نے کہا جونیر ضرور ہیں لیکن وہ خود چیف ہیں، میں ان کا چیف نہیں بنوں گا۔

آخر نومبر ۱۹۹۸ء کے پہلے ہفتے میں نیشنل ہیرالڈ کی مکمل فائل، دس بارہ لاگ بکس جن سے انگریزی صحافت کے سارے گر سیکھے جاسکتے تھے اور تینوں اخباروں کے دفتروں کے پرانے کاغذات ردّی میں فروخت کرنے کے بعد نیشنل ہیرالڈ، قومی آواز اور نوجیون کو بند کردینے کا اعلان کردیا گیا۔

ہندوستان ٹائمس نے اس عظیم ادارہ کی تباہی پر ایک مختصر سا نوحہ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کی۔ میں نے یہ دعوت قبول تو کرلی لیکن یہ گیارہ بارہ پیراگراف لکھنے میں جس کرب سے گذرنا پڑا اس کا بیان مشکل ہے۔ شاید یہ مختصر سا نوحہ پڑھ کر اس کا کچھ اندازہ ہوسکے۔

A Requiem for AJL

The closure of all the three dailies published by the Associated Journals, with two of which I had been associated in humble manners for about 30 years, has not come as a surprise. Yet there was a feeble hope that some miracle would take place and the inevitable would be averted. But miracles happen no more.

I joined the institution way back in 1952, while still a student, as an honorary correspondent of Qaumi Awaz for the Lucknow University.

Hayatullah Ansari, father of modern Urdu journalism, was the editor when I joined the daily formally in 1957 as an apprentice sub-editor. About five years later, the first prize in an all-India debate competition organised by AIR brought me to the National Herald and I do feel proud that the doyen of English journalism of the country, M. Chhalapati Rao (MC), invited me to work under his stewardship.

Back from Delhi, I was informed by Mr. Siddiqui that M. C.

wanted me to meet him. I knew nothing about the purpose and was naturally quite confused.

In response to his query about my political views, I said: A committed Leftist. What does it mean? He inquired." A card-holder" I shot back despite knowing well that Herald was a Congress daily and there was no love lost between the ruling party and the Communists in the wake of the dismissal of the Kerala Government, My bravado struck a note and saw my services transferred to the Herald. This was somewhere in 1961.

Subbing-wise, the Herald used to be one of the best English dailies of the country and MC's editorials had made it one of the most-quoted newspapers, mentioned even in the United Nations' deliberations.

Despite having been founded by Nehru in 1937, the Herald was largely an independent daily.

There were occasions when chief ministers like C.B. Gupta and Sampurnand communicated their unhappiness about MC's editorials to Nehru. His editorial captioned "Alibi" beginning with the sentence",The UP Govt. continuing from budget session to budget session," was a great embarrassment to Sampurnanand but Nehru never intervened, upholding the tradition of the freedom of the press.

Once it so happened that the Congress put up a business tycoon for the Lok Sabha seat from the city....... M.C. had nothing personal against the candidate but was opposed to the entry of capitalists in the body politics and wrote a hard-hitting editorial against the decision. Nothing happened, but the paper, through its editorial and coverage, almost campaigned for his rival, Anand Narain Mulla, a former judge of the Allahabad High Court.

The flash point came when a full-page advert, urging the people to vote for V.R. Mohan was received by the paper. The advertisement manager was awkwardly fixed. He sought an interview with the editor to seek his advice. M.C. saw the advertisement pull-out and threw it away in the wastepaper basket saying, "How can an advertisement against the policy of the paper be published"? Indira Gandhi was at the helm of affairs in the Congress at that time.

Later, statalwarts like Khushwant Singh, PN Singh and

Chittaranjan took over the reigns of the paper, but somehow the future of he daily slipped into its past, ending up in the present straits under the hammer.

The three dailies, they say, have submerged due to being overstaffed and bad management bordering a lot of graft. That may be partly true. But the fact is that the eclipse of the cherished goals of the freedom struggle, democracy, socialism and secularism in our body politics, had made these papers out of tune with time and no pumping of money, even if it happens at this late hour of the day, can put them firmly back on the high pedestal they once used to occupy. Besides being a great tragedy for journalism, the extinct ion of this great tradition is a personal loss for thousands as it is for me. But facts are facts and they cannot be wished away, however one may cry over them.

ان دنوں میں روزنامہ ''صحافت'' سے متعلق تھا۔ میں نے اس اخبار میں بھی دو اداریے ان تینوں اخباروں اور خاص طور سے ''قومی آواز'' پر ''ایں ماتم سخت است'' کے عنوان سے لکھے تھے؛ جنھیں پڑھ کر مسیح الحسن رضوی نے، جو اُس وقت اپنی بیٹی زویا کے یہاں الٰہ آباد گئے ہوئے تھے، عثمان غنی کو لکھا تھا، ''عابد سہیل نے تو قومی آواز کا نوحہ لکھ دیا۔''

ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے ملازمین کی یونین نے ملازمین کے واجبات کی ادائیگی کے لیے مقدمہ دائر کیا تھا جس کا فیصلہ ملازمین کے حق میں ہوا اور انھیں ان کی باقی تنخواہوں اور دوسرے واجبات کا بڑا حصہ مل گیا۔

یونین چاہتی تھی کہ میں بھی اس مشترکہ مقدمے میں شامل ہو جاؤں لیکن میں راضی نہ ہوا۔ زندگی میں ایک ہی ادارہ میں تو باقاعدہ ملازمت کی اور نیشنل ہیرالڈ اور قومی آواز میں کام صرف ملازمت نہ تھی، یہ اخبار میری زندگی بھی تھے۔ ان اخباروں کے خلاف مدعی بن کر عدالت میں کھڑا ہونا اچھا نہ لگا۔

اس مقدمے میں شامل ہو جانے سے مجھے بہت مالی فائدہ ہوتا کیوں کہ فیصلے کے دن تک میں کمپنی کا ملازم قرار پاتا، جیسے شری کرشن اوستھی قرار پائے اور لاکھوں انھوں نے وصول کیے۔ قانون استعفے کو اس وقت قبول کرتا ہے جب سارے واجبات ادا ہو جائیں چنانچہ تنخواہ، ساری ترقیاں، گریچوئٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کی صورت میں مجھے بارہ پندرہ لاکھ روپے ضرور ملتے۔

وہ وقت جب ایک ایک پیسے کا محتاج تھا تو کسی نہ کسی طرح گذر چکا تھا، اب اتنے بہت سے روپوں کا کرتا کیا؟

پھر ایک دن، ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے دفتر سے فون آیا کہ اپنے بقایا جات لے جاؤں۔ میں کئی دن بعد گیا۔ لفافہ کھول کر نہ چیک کی رقم دیکھی نہ رجسٹر میں اس کا اندراج اور دستخط کر دیے۔ کنو جیہ (منیجر) نے کہا سہیل صاحب رقم تو دیکھ لیجیے۔ میں نے کہا، "کھیتی تو چگ لی گئی، دانوں کا شمار کیا کرنا۔" تاہم ان کے اصرار پر دیکھا تو چیک تقریباً پچیس ہزار کا تھا۔ کہنے لگے ٹھیک ہے؟ میں نے کہا اس سے زیادہ تو گریچوئٹی ہی ہوئی، آٹھ دس مہینوں کی تنخواہ اس کے علاوہ۔ خیر چھوڑو۔

نیشنل ہیرالڈ سے مستعفی ہونے کے بعد پراویڈنٹ فنڈ کی صورت میں چھتیس ہزار روپے ملے تھے جب کہ یہ رقم کم سے کم ایک لاکھ ہونی چاہیے تھی۔ یہ روپے ساڑھے چار ہزار روپوں کے ایک فریج کی خریداری کے علاوہ سارے کے سارے نصرت پبلشرز میں لگ گئے۔ ایسوشی ایٹیڈ جرنلس نے برسوں سے ملازمین کی تنخواہ سے کاٹی ہوئی رقم اور اپنا حصہ جمع نہیں کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لاکھ سوا لاکھ میرے حساب میں ضرور ہوں گے لیکن میں نے اس سلسلے میں کوئی بھاگ دوڑ نہ کی... جہاں روز کنواں کھودنا ہو وہاں کوئی طویل مدتی منصوبہ کیسے بنائے! پھر ۲۰۰۶ء کے جون یا جولائی میں اللہ کے کسی بندے نے ۱۹۹۵ء کی میرے نام کی پراویڈینٹ فنڈ سلپ انیس کی بہن یاسمین انجم کو پہنچا دی۔ اس سلپ کے مطابق اس وقت میرے حساب میں باون، ترپن ہزار روپے تھے۔ دو تین مہینے بعد میں نے اپنا دعوا پیش کیا تو دس بارہ دن بعد جواب ملا کہ آپ کی ساری رقم ۱۹۸۶ء میں ادا کی جا چکی ہے۔ میں نے متعلقہ محکمے کے کمشنر سے ملاقات کر کے کہا کہ کل رقم ۱۹۸۶ء میں ادا کر دی گئی تو ۱۹۹۵ء کی یہ سلپ کہاں سے آئی۔ وہ خود چکر میں پڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ رجسٹروں سے کمپیوٹر میں منتقل کرتے وقت میرا حساب منتقل کیے جانے سے رہ گیا تھا۔

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

پراویڈنٹ فنڈ کمشنر نے وعدہ کیا کہ ایک ماہ کے اندر آپ کی ساری رقم بینک میں آپ کے حساب میں منتقل ہو جائے گی۔ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ۲۰ رفروری ۲۰۰۷ء کو ایک لاکھ چھیانوے ہزار ایک سو بائیس روپے میرے بینک اکاونٹ میں آ گئے۔ میں نے انیس کی سالگرہ پر برسوں سے انھیں گلاب کا پھول بھی پیش نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس موقع کو تقریب سالگرہ مان لیا اور ایک لاکھ روپوں کا چیک انھیں پیش کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے میں کسی قدر کامیاب ہو گیا۔

روشن باب

بدقسمتی سے اس باب میں نیشنل ہیرالڈ کے دور ابتلا کا ذکر زیادہ رہا اور اس کے بہت روشن باب اور روشن چہرے نظروں سے اوجھل رہے۔ مختصراً ہی سہی ان کا ذکر ضروری ہے۔

نیشنل ہیرالڈ ہندوستان کا سب سے بہتر ایڈٹ کیا ہوا اخبار تھا جس میں کاما کی غلطی کا بھی نوٹس لیا جاتا۔ ایک بار لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایچ۔ کے۔ اوستھی کے بھائی شری کشن اوستھی کی ''سب'' کی ہوئی اسپورٹس پیج کی ایک خبر میں ایک جگہ کے کاما پر ایم۔ سی۔ نے لکھا تھا، "Correct, but not necessary"۔ نیشنل ہیرالڈ میں زبان و بیان کی معمولی معمولی غلطیوں تک کی گرفت کی جاتی۔

نیشنل ہیرالڈ اردو کے ساتھ زیادتیوں کے خلاف سینہ سپر رہتا۔ شاید اسی لیے اس میں اردو کے جلسوں اور دوسری تقریبات کی خبریں زیادہ شائع ہوتیں۔ ان دنوں شہر میں ہر سال ایک بڑا مشاعرہ ضرور ہوتا اور اس کی تفصیلی رپورٹ صفحہ اوّل پر نیچے کی جانب چھے چھے کالمہ سرخی اور شاعروں کی تصاویر کے ساتھ شائع ہوتی۔ یہ اور اس طرح کے کام، میرے ہی سپرد تھے۔

نیشنل ہیرالڈ میں بریگیڈیر عثمان کے بھائی محمد سبحان، صلاح الدین عثمان اور لکشمی کانت تواری ایسے رپورٹر تھے۔

شاید پال صاحب نے بتایا تھا کہ ۱۹۳۹ء میں سبحان نے ایک دن خبر دی کہ ریاست کی کانگریسی حکومت فلاں فلاں تاریخ کو مستعفی ہو جائے گی، اس اصرار کے ساتھ کہ خبر شاہ سرخی کے ساتھ شائع کی جائے۔ ہیرالڈ میں خبر کے سرچشمے کے حوالے کے بغیر اتنی بڑی خبر کی اشاعت ممکن نہ تھی لیکن سبحان کو سَو خون معاف تھے۔ اگلے دن ریاستی کانگریس کمیٹی اور حکومت نے اس خبر کی تردید کی۔ اس تردید کو بھی صفحہ اوّل پر جگہ ملی لیکن رپورٹر کے اس اصرار کے ساتھ کہ فلاں فلاں تاریخ کو حکومت بہر حال مستعفی ہو گی۔ مذکورہ تاریخ سے شاید ایک دن قبل کے اخبار میں U.P. Govt. to resign today کی سہ کالمہ سرخی کے ساتھ خبر صفحہ اوّل پر شائع ہوئی اور حکومت اسی دن مستعفی ہو گئی۔

صلاح الدین عثمان کی خوبی یہ تھی کہ طویل صحافتی زندگی میں ان کی دی ہوئی ایک خبر کی بھی تردید نہیں کی گئی اور لکشمی کانت تواری تو اڑتی چڑیا کے پر گنتے تھے۔ ننو لال کی پہلی گرفتاری

کی خبر صرف نیشنل ہیرالڈ میں شائع ہوئی تھی۔ وہ انھی کی دی ہوئی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ لکشمی کانت تواری نے گیارہ بجے رات میں ہیرالڈ سے گھر واپس جاتے ہوئے قیصر باغ چوراہے پر معمول کے خلاف پولیس کی ایک جیپ کے بجائے دو جیپیں کھڑی ہوئی دیکھیں۔ ان کا ماتھا ٹھنکا... اور معمولی سی چھان بین سے شاہ سرخی کی خبر برآمد ہوگئی۔

اردو پریس

۱۹۸۵ء میں نیشنل ہیرالڈ سے ترک تعلق کرنا کوئی آسان فیصلہ نہ تھا۔ ایک عظیم روایت سے علاحدگی کا غم مہینوں رہا، لیکن نصرت پبلشرز کے علاوہ جو وقت سے صرف اپنا خراج وصول کررہا تھا، کچھ نہ کچھ اور بھی کرتا رہا۔ ٹائمس آف انڈیا لکھنؤ کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر پرکاش چندر اردو دوست، اردو داں اور تقریباً سارے اہم اردو ادیبوں سے ذاتی طور سے واقف تھے۔ انھوں نے مقامی خبروں کے صفحات کے علاوہ اخبار کے دوسرے صفحات بھی اردو کے لیے کھول رکھے تھے۔ چنانچہ شہر کے اہم ادبی جلسوں اور اہم ادبی شخصیتوں پر میرے مختصر مضمون دو تین برسوں تک شائع ہوتے رہے، جن میں سے چند حیات اللہ انصاری، سیّد سبط حسن، علی جواد زیدی، احمد جمال پاشا وغیرہ سے متعلق تھے۔ پرکاش چندر سے میں نے دبے لفظوں میں متعدد بار کہا کہ ہندی کی ادبی سرگرمیوں کی جانب آپ نے توجہ نہ دی تو آپ کے رخصت ہوتے ہی اخبار سے اردو حرفِ غلط کی طرح غائب ہوجائے گی اور یہی ہوا بھی۔ ان کے جانشین اتم چند گپتا، کھلے دل و دماغ کے مالک اور بائیں بازو کے خیالات سے ہم دردی رکھنے کے باوجود اردو سے اتنی محبت نہ رکھتے تھے۔ پھر بھی وہ ایک ایسا کالم شروع کرنا چاہتے تھے جس سے ان کا اخبار اپنے پڑھنے والوں کو اردو اخباروں کے حوالے سے مسلمانوں کے دکھ درد کا احساس کراسکے۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے، انھوں نے کارتک بھیجنے کی پیش کش کی لیکن میں بہ وجوہ اس وقت یہ پیش کش قبول نہ کرسکا۔ پھر کچھ دنوں بعد عرفان صدیقی نے، جو پی۔ آئی۔ بی۔ سے رٹائر ہوچکے تھے From Urdu Press کے عنوان سے ایک ہفت روزہ کالم کا آغاز کیا۔ یہ کالم مہینے میں بس ایک دو بار ہی شائع ہوتا اور چند مہینوں بعد انھوں نے یہ سلسلہ بالکل ہی ترک کردیا تھا۔

سردار جعفری کو گیان پیٹھ انعام ملا تو میں نے کم وبیش ڈیڑھ ہزار الفاظ کا ایک مضمون لکھا اور اسے دینے خود ہی ٹائمس کے دفتر گیا۔ وہ مضمون تو خیر اگلے دن کے اخبار میں آخری صفحہ

پر سردار جعفری کے شایان شان شائع ہوا ہی، کالم کے سلسلے میں اتم چند نے کہا تو میں انکار نہ کر سکا۔ اگر چہ عنوان چند دنوں بعد From Urdu Press کے بجائے Urdu Press کر دیا گیا اور یہ سلسلہ اگست ۲۰۱۰ء تک جاری رہا، بارہ سال سے زائد۔

ٹائمس آف انڈیا میں اس کالم کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ پائینر سے قطع نظر جس کی اب کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے، ہندوستان ٹائمس اور انڈین ایکسپریس نے بھی اس طرح کے کالم شروع کر دیے۔ حق و انصاف کی لڑائی میں یہ ایک بڑی کامرانی تھی۔

◆◆◆

انجمن کے جلسے

انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پہلی بار مجید پرویز اور برجموہن ناتھ کاچر کے ساتھ جانا ہوا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۴۹ء کے آخری مہینوں کی بات ہے۔ قاضی باغ اور نخاس کی حیثیت گھر آنگن کی ہے۔ مجید پرویز کشمیری محلہ جانے والی سڑک پر رہتے تھے۔ ان سے پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی یہ تو نہیں یاد لیکن وہ میرے اوّلین ادبی دوستوں میں تھے۔ کاچر سے انھیں نے ملایا تھا۔ ہوسکتا ہے مجید پرویز سے ملاقات کامریڈ شکیل نے کرائی ہو جو اُن دنوں تانگوں یکّے والوں کی یونین کے صدر تھے۔ اسی سال مجید پرویز کی بڑی بہن، اختر جہاں کی شادی کامریڈ شکیل سے ہوئی تھی۔ وہ عربی میں ایم۔ اے تھیں اور کشمیری محلہ گرلس کالج سے متعلق۔ بعد میں وہ اس کالج کی پرنسپل ہوئیں۔

انجمن کے جلسے ان دو ادبی نشستوں سے بالکل مختلف تھے میں جن کی آخری صفوں میں موجود تھا۔ ان میں صرف واہ واہ ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے انجمن کے جلسوں میں غزل کے اشعار تک پر بحث ہوتی۔ یہ جلسے اس طرح بھی مختلف ہوتے کہ ان میں ادبی مضامین کے علاوہ علوم سے متعلق مضامین پڑھے جاتے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے جنھیں ہم لوگ ''ہندوستانی معیشت کا ڈھانچہ'' کہتے تھے، ملک کے معاشی حالات پر اور ڈاکٹر رشید جہاں نے Genes کے موضوع پر مضامین پیش کیے۔ بعد میں سرور صاحب امین آباد کی حاجی نعمت اللہ بلڈنگ میں منتقل ہوگئے جہاں مسعود حسن رضوی ادیب نے واجد علی شاہ پر ایک نہایت عمدہ مضمون پڑھا اور نہال رضوی لکھنوی نے اپنی مشہور غزل سنائی جس کا مطلع تھا

جو یہ کہوں تو قناعت پہ حرف آتا ہے
چراغ خود نہیں جلتا جلایا جاتا ہے

شوکت صدیقی نے بیرو روڈ کے جلسوں میں ''تا نتیا'' اور شاید ''غم دل اگر نہ ہوتا''

سنائے تھے۔ اوّل الذکر افسانے سے ہی ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ انھی دنوں شوکت صدیقی نے ''تیسرا آدمی'' لکھا۔ ان کے والد فاریسٹ کنٹریکٹر تھے۔ ممکن ہے جنگل کے کاموں میں وہ اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے رہے ہوں۔ اس افسانے میں جنگل بسا ہوا ہے۔

انجمن کے ایک جلسے میں ایک سرخ سپید اور وجیہہ بزرگ تشریف لائے۔ وہ بگلے ایسا سفید انگرکھا پہنے تھے۔ سرور صاحب، احتشام صاحب اور سارے حاضرین جلسہ نے کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اپنا بے حد عمدہ افسانہ ''دور کا نشانہ'' سنایا جو بعد میں غالباً ''نقوش'' کے کسی خاص نمبر میں شائع ہوا۔ افسانے پر بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ یہ چودھری محمد علی ردولوی ہیں، انجمن کے تاسیسی اجلاس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر۔

ایک جلسہ میں حیات اللہ انصاری نے کوئی مضمون پڑھا تھا جس میں کمیونسٹوں پر خوب خوب حملے تھے اور کشیدگی کی فضا پیدا ہو گئی تھی، لیکن اس وقت تک میں نے ان جلسوں میں جانا شروع نہیں کیا تھا۔ اگلے جلسے میں اس کی رپورٹ ضرور سنی تھی۔ شاید انجمن سے میرے تعلق کا وہ پہلا دن تھا۔

باقر مہدی جنھیں میں نے کمیونسٹ پارٹی کے کسی جلسے میں نہیں دیکھا متشدد کمیونسٹ سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے ایک جلسے میں غزل پڑھی تھی جس کے دو شعر یاد ہیں۔

مفلسی کیا گلا کروں تیرا
ساتھ تیرا کہاں کہاں نہ رہا
اس طرح کچھ بدل گئی یہ زمیں
اب ہمیں فکرِ آسماں نہ رہا

ڈاکٹر فریدی کی موجودگی سے انجمن کا ایک جلسہ یادگار بن گیا۔ ہوا یہ کہ اس وقت کی حکومت کی دعوت پر انھوں نے پندرہ بیس دن کا سوویت یونین کا دورہ کیا تھا۔ وہ لوٹ کے آئے تو انجمن نے انھیں اپنے دورے کے تاثرات بیان کرنے کے لیے مدعو کر لیا۔ فریدی صاحب نہ کمیونسٹ تھے نہ کمیونسٹ دوست اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان میں بھی نہیں تھے جنھیں اس نظامِ حکومت کے بارے میں کوئی حسنِ ظن ہو۔ عام خیال یہ تھا کہ وہ کمیونسٹ حکومت کی ناکامیاں آشکارا کریں گے چنانچہ جماعت اسلامی اور اس طرح کی دوسری تنظیموں سے متعلق خاصے حضرات جلسہ میں موجود تھے۔ لیکن انھیں سخت مایوسی ہوئی جب ڈاکٹر فریدی نے سوویت

یونین کے نظامِ حکومت کی خوب خوب تعریف کی اور یہ تک کہا کہ پندرہ روزہ دورے کے دوران انھیں صرف ایک فقیر نظر آیا اور معلوم ہوا کہ وہ بڈھا فوجی ہے جسے شراب کی لت پڑ گئی ہے اور جب انھوں نے کہا وہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں تو ایک صاحب سے ضبط نہ ہو سکا اور انھوں نے پوچھا۔

''وہاں ہندو مسلم فسادات بھی نہیں ہوتے؟''

اس سوال پر زوردار قہقہہ بلند ہوا اور یہ سوال ہی ''حاصلِ جلسہ'' قرار پایا۔

ان دنوں جب کمیونسٹ پارٹی پر بی۔ ٹی رندیوے کی حکمرانی تھی، نعمت اللہ بلڈنگ کے ایک جلسے میں اس مسئلے پر بحث چھڑ گئی کہ کیا قانون میں تبدیلی سماجی زندگی کے مطالبات کا زمانی ساتھ دے سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بحث کا مقصد سیاسی قانون شکنی کو اعتبار بخشنا تھا۔

جس جلسے میں احتشام حسین اور آل احمد سرور موجود ہوں، مجھ ایسوں کو لب کشائی کی ہمت بھی نہ ہوتی لیکن بحث میں سب حصہ لے رہے تھے، میں نے بھی دو چار باتیں کہہ دیں۔ میرا خیال تھا کہ سماجی تبدیلیوں کو قانونی شکل دینے کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب ایک بڑی اکثریت ان تبدیلیوں کو قبول کر لیتی ہے اور اس میں خاصا وقت لگتا ہے۔ چنانچہ قانون میں تبدیلی ہمیشہ وقت سے پیچھے رہتی ہے۔ مجھے قطعاً نہیں یاد کہ میرے الفاظ کیا تھے لیکن میری اس دلیل پر آل احمد سرور اور احتشام حسین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جس طرح تعریف کی تھی اسے میں اپنی اتنی بڑی کامرانی سمجھتا ہوں کہ خودستائی کے الزام کا خطرہ مول لے کر بھی اس کا ذکر کرنے سے خود کو روک نہیں پا رہا ہوں۔ انجمن کے جلسوں میں ایک افسانہ اور دو مضامین بھی میں نے پڑھے تھے اور میرے افسانے ''دو نقش ایک تصویر'' پر باقر مہدی نے کہا تھا کہ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہی اپنا آدھا گھنٹہ ضائع کیا۔

فراق گورکھپوری نے ایک مضمون میں امرد پرستی کی حمایت کی تھی۔ سردار جعفری نے مضمون کا سخت جواب دیا تھا اور انجمن کی حمایت کے لیے احتشام صاحب کو خط لکھا تھا۔ انجمن کے دو یا تین جلسوں میں اس پر بحث ہوئی لیکن کسی کی حمایت کی گئی نہ مخالفت۔ ایک جلسے میں فراق کے دوست مجنوں گورکھپوری بھی موجود تھے۔ اور انھوں نے معلوم نہیں کس سیاق و سباق میں ایک بہت کام کی بات کہی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ موضوع کے بارے میں مصنف کا ذہن صاف نہ ہو تو زبان گنجلک ہو جاتی ہے۔

انھیں دنوں فراق اور اثر لکھنوی میں ایک بحث چھڑ گئی تھی۔ فراق نے ''فنکار'' نامی سہ ماہی میں ایک غزل چھپوائی تھی جس کا مقطع تھا۔

فراق اپنی غزل پڑھتا ہے جس دم
اثر بیٹھے کیا کرتے ہیں ہی ہی

جواب میں اثر لکھنوی نے جو غزل کہی وہ بھی ''فنون'' ہی میں شائع ہوئی۔ اس غزل کا پہلا شعر تھا:

اثر کو کرتے دیکھا کس نے ہی ہی
فراق ہوتی ہے حد اک جھوٹ کی بھی

اور طویل غزل کا شاید آخری شعر تھا۔

بہت کچھ اور کہہ سکتا ہوں لیکن
جوابِ جاہلاں باشد خموشی

۱۹۴۹ء میں انجمن کو سیاسی جماعت قرار دے کر سرکاری ملازمین پر اس کے دروازے بند کر دیے گئے تھے اور ظاہر ہے کچھ لوگوں نے احتیاطاً جلسوں میں شرکت بند کر دی تھی لیکن خوب یاد ہے کہ سلام مچھلی شہری اور ایاز انصاری جو آل انڈیا ریڈیو سے متعلق تھے اکثر ان جلسوں میں آجاتے، رجسٹر پر دستخط البتہ نہ کرتے۔

سرور صاحب کے علی گڑھ جانے سے قبل ہی انجمن کا بکھراؤ شروع ہو گیا تھا۔ بعد میں صورت اور خراب ہوگئی۔ کچھ دنوں آغا سہیل سکریٹری رہے پھر یہ ذمہ داری عارف نقوی نے سنبھالی۔ جلسے احتشام صاحب کے یہاں ہونے لگے لیکن انجمن کا شیرازہ بکھر ہی گیا۔

بنّے بھائی (سجاد ظہیر) نے پاکستان سے آنے کے بعد انجمن میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ لکھنؤ میں کئی جلسے ہوئے لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر عبدالعلیم اور سجاد ظہیر نے اعلان کیا کہ اب انجمن کی ضرورت نہیں لیکن بنّے بھائی نے یہ کوششیں بھی جاری رکھیں کہ کسی طرح گذرا ہوا وقت لوٹ آئے۔ آخر قمر رئیس نے انجمن کو تنظیمی شکل تو دے دی لیکن... لیکن گذرا ہوا وقت کب لوٹ کے آیا ہے جو اَب آتا۔

◆◆◆

ماہنامہ کتاب

''کتاب'' کا پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۶۲ء، میں شائع ہوا اور آخری جولائی ۱۹۷۵ء میں۔ اس کی مجلس مشاورت میں احتشام حسین اور حیات اللہ انصاری کے ساتھ میرا نام تھا لیکن تکنیکی طور پر اس کا پبلشر اور ایڈیٹر نہ ہونے کے باوجود اس رسالہ کی ساری ذمّے داریاں میرے ہی سر تھیں۔ ایک عرصہ تک اس کے ایڈیٹر کے طور پر میرے عزیز دوست عبدالحلیم خاں کی ملازمہ کے بیٹے جمیل احمد کا نام شائع ہوتا تھا، بعد میں اس ''جلیل القدر'' عہدے پر شمیم الدین فائز ہوئے لیکن رسالے سے ان کا تعلق بس نام بھر کا رہا۔ ایک عرصے تک ادارت سے لے کر چپراسی تک کے سارے کام میرے ہی ذمّے تھے۔ لیکن بعد میں ''کتاب'' کی اشاعت کے کاموں میں متعدد لوگوں نے میری مدد کی۔ ان میں انیس اشفاق اور قمر احسن خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اب پلٹ کے دیکھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ کتاب سے یہ لوگ بھی وابستہ تھے۔ انیس اشفاق بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے متعلق ہوئے اور اب اس کے سربراہ ہیں اور قمر احسن نیشنل آرکائیوز میں اعلیٰ عہدوں پر پہنچے۔

''ماہنامہ کتاب'' کی بنیاد دلچسپ حالات میں پڑی۔ میں قومی آواز سے نیشنل ہیرالڈ میں منتقل ہو چکا تھا۔ وہاں تنخواہ سوا دو سو روپے تھی۔ فرحت اللہ انصاری نے اپنا مکان جو خاصا بڑا تھا صرف پندرہ روپے مہینے کے کرایے پر دے دیا تھا اور گھر میں رہنے والے تھے والدہ، چھوٹا بھائی عمران، چھوٹی بہن نجمہ، حلیم خاں کی بیٹی عینی اور میں۔ دونوں بھائی بہن زیر تعلیم تھے، ظاہر ہے تنگی ترشی سے بسر ہوتی۔

عمران کو پڑھنے لکھنے سے کچھ خاص دلچسپی نہ تھی۔ ایک دن میں نے کچھ سخت سست کہا تو انھوں نے خواب آور گولیاں اتنی تعداد میں کھالیں کہ خون کی قے ہوئی اور انھیں رات ہی میں میڈیکل کالج میں داخل کیا گیا۔ میں ایک بجے رات میں دفتر سے آیا تو صورتِ حال معلوم ہوتے

ہی اسپتال گیا۔ ان کی حالت ٹھیک تھی لیکن کیس Medico-legal ہو گیا تھا۔ اس سے تو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی لیکن سید محمود حسن اشفاق رضوی کو اپنے ایک عزیز سے جن کا نام طارق تھا اور جو وہاں ڈاکٹر تھے یہ بات معلوم ہو گئی۔ اشفاق صاحب نے جن سے میرے خاصے تعلقات تھے، اپنے ایک ملازم کو بھیج کر مجھے بلایا اور تفصیلات دریافت کیں۔ میں پہلے تو حیلے بہانے کرتا رہا لیکن تا کَے، آخر ساری بات بتانی پڑی۔ انھوں نے عمران کے سلسلے میں کئی تجاویز رکھیں جن میں کتابوں کے ایک اشاعتی ادارے کا قیام اور ایک ادبی ماہنامے کے اجرا کی تجویز بھی تھی۔

یہ دونوں کام میری دلچسپی کے تھے۔ میں نے ہامی بھر لی اور جلد ہی کتاب پبلشرز کے نام سے کتابوں کی اشاعت کا کام شروع ہو گیا پھر ''ماہنامہ کتاب'' جاری ہوا۔ پہلی تین چار کتابوں میں احتشام صاحب کے مضامین کا مجموعہ ''اعتبارِ نظر'' ڈاکٹر شارب ردولوی کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ''جدید اردو تنقید: اصول و نظریات''، منظر سلیم اور مائل ملیح آبادی کے ناول ''لب و رخسار'' اور ''برف کی دیوار'' شامل تھے۔ بعد میں مائل ملیح آبادی کا ایک اور ناول ''سپہ سالار خلجی'' شایع ہوا۔

کام کا آغاز تو گھر سے ہوا تھا لیکن اشفاق رضوی ایک باقاعدہ دفتر ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی فرم کے ہیڈ آفس کے سامنے تین در کی اپنی ایک دوکان باٹا کمپنی سے خالی کرا کے میرے حوالے کر دی۔ نیشنل ہیرالڈ سے متعلق ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے اس آفس کا کام میں سنبھال نہ سکتا تھا اور یہ کام عمران کو کرنا تھا لیکن انھوں نے بس کنڈکٹری کو جو وزیر رسل و رسائل مظفر حسین کی اعانت سے ملی تھی ترجیح دی اور سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ لیکن ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ تین چار برس بعد وہ والدہ کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے بی۔ اے، ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کیا اور میڈیکل کالج سے متعلق ہو گئے۔ اب رٹائر بھی ہو چکے ہیں۔

میں نے بہت شرمندگی کے ساتھ دوکان کی چابی اشفاق صاحب کو واپس کر دی لیکن اس وقت تک ''ماہنامہ کتاب'' اور کتابوں پر پانچ چھے ہزار روپے لگ چکے تھے اور یہ سلسلہ ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اشفاق صاحب، میرے طلب کیے بغیر، ہر ماہ ہزار ڈیڑھ ہزار روپے میری جیب میں ڈال دیتے لیکن جیسے ہی کتابوں اور رسالے سے کچھ روپے ملنے شروع ہوئے میں نے ان سے روپے قبول کرنا بند کر دیا۔ انھوں نے کل ملا کر ساڑھے نو ہزار روپے دیے تھے جن میں سے ساڑھے آٹھ ہزار دھیرے دھیرے واپس کر دیے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے ان کے

بیٹے سے ان باقی روپوں کا ذکر کیا تو انھوں نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ چنانچہ ایک ہزار روپوں کا مقروض اب بھی ہوں۔

بقول ا۔ ج۔

ایک قابل ذکر بات ابھی بتادوں، آگے بھول نہ جاؤں۔ ''لہو کے پھول'' کی کتابت کتاب پبلشرز نے ہی شروع کرائی تھی۔ خیال تھا کہ ضخامت زیادہ سے زیادہ پانچ سو صفحات ہوگی لیکن یہ معلوم ہونے پر کہ ایک ہزار صفحات بھی کم پڑ سکتے ہیں میں نے ہاتھ پیر ڈال دیے۔ شروع کے تقریباً چار سو صفحات کی کتابت میں نے ہی کرائی تھی اور پروف ریڈنگ خود کی تھی۔ بعد میں حیات اللہ انصاری نے کتابت کی رقم ادا کردی تھی۔ وہ سستے دن تھے۔ اورینٹ کا نہایت عمدہ کاغذ چوبیس روپے رم ملتا اور نیوز پرنٹ اور بھی سستا۔ ابتدائی دنوں میں کم و بیش پچاس صفحات کے ''کتاب'' کی چھ سات سو کاپیاں چھ ساڑھے چھ سو روپوں میں تیار ہو جاتیں۔ ڈاک خرچ بھی بہت کم تھا۔ رجسٹری پچاس پیسے میں ہوتی، رسالہ سادی ڈاک سے بھیجنے میں دو پیسے صرف ہوتے اور وی۔ پی۔ باسٹھ پیسے میں چلی جاتی۔ ہر مہینے نئے خریداروں سے سوسوا سو روپے آجاتے، دو ڈھائی سو روپے وی۔ پی سے اور سوسوا سو روپے اشتہار سے مل جاتے۔ یہ رقم کل ملا کر پانچ سو کے لگ بھگ ہو جاتی۔ مجھے خوش پوشی کا شوق تھا، وہ ''کتاب'' کے لیے تج دی، مہینے میں دو چار بار کافی ہاؤس چلا جاتا تھا، وہ بھی چھوڑ دیا، یہ سب کسی قسم کی قربانی نہ تھی۔ ''کتاب'' میرا شوق تھا، البتہ کتابوں کی اشاعت گلے کی ہڈی ثابت ہوئی۔

''کتاب'' کے ابتدائی شماروں نے ہی اہلِ علم و ادب کو اپنی جانب ملتفت کرلیا۔ جعفر علی خاں اثر نے جوش ملیح آبادی کی شاعری کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا لیکن ماہنامہ ''آجکل'' کے مدیر عرش ملسیانی نے یہ کہتے ہوئے کہ لوگ کہیں گے کہ جوش کے پاکستان جاتے ہی ''آجکل'' نے ان کے خلاف مہم شروع کردی، اسے شائع کرنے سے معذرت کرلی۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے یہ مضمون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اب اثر صاحب اسے اپنے نام سے چھپوانے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ اسے ا۔ ج کے نام سے شائع کیا گیا۔ کتابت کی ایک آدھ غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کا خط اگلے شمارے میں ''بقول آپ کے ا۔ ج'' کے نام سے شائع ہوا۔

ان دنوں شاہد احمد دہلوی جوش ملیح آبادی سے بہت ناراض تھے۔ وہ ''افکار'' کے جوش نمبر کے جواب میں ''ماہنامہ ساقی'' کا جوش شکن نمبر شائع کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ انھوں نے یہ مضمون حاصل کرنے کے لیے کئی خطوط لکھے ''گنجینۂ گوہر'' کا ایک نسخہ تحفتاً بھیجا۔ میں نے مضمون کا تراشہ انھیں اس شرط پر بھیج دیا کہ مضمون ''ا۔ ج'' کے نام ہی سے شائع ہو لیکن میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ''ساقی'' کے نمبر میں یہ مضمون کس نام سے شائع ہوا کیوں کہ شاہد صاحب نے نہ پرچہ بھیجا نہ کسی خط کا جواب دیا۔ ان دنوں ساری خط و کتابت جمیل احمد کے نام سے ہوتی تھی لیکن شاہد احمد صاحب کو میرا نام جانے کیسے معلوم ہو گیا تھا۔

جوش ملیح آبادی آخری بار لکھنؤ آئے اور وزیر گنج میں ایک ادبی نشست ہوئی۔ احمد جمال پاشا بھی وہاں موجود تھے۔ کسی نے ان کو متعارف کراتے ہوئے جوش سے کہا کہ ''ا۔ ج'' یہی ہیں۔ جوش کی معصومیت دیکھیے کہ انھوں نے جمال کو اپنے پاس بٹھا کر مضمون کی تعریف کی اور جمال کی ''سعادتمندی'' بھی قابلِ دید تھی کہ وہ گردن جھکائے جھکائے اظہارِ شرمندگی کے ساتھ داد وصول کرتے رہے۔ معلوم نہیں اس واقعے پر اس دن اثر لکھنوی پر اپنی آخری آرام گاہ میں کیا بیتی ہوگی۔

''کتاب'' کو ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً سارے ہی ممتاز ادیبوں کا تعاون حاصل تھا۔ عصمت چغتائی کو قلمی تعاون کے لیے لکھا تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ ''افسانہ بھیج تو دوں لیکن رسالہ نکلے گا کتنے دن۔'' میں خاموش بیٹھ رہا۔ سال سوا سال بعد عصمت چغتائی کا افسانہ ''سانپ کے تلوے'' موصول ہوا۔ خط میں انھوں نے لکھا تھا، ''کتاب کی بے غیرتی سے تنگ آ کر افسانہ بھیج رہی ہوں۔ کمبخت بند ہی نہیں ہو چکتا۔''

تین چار سال بعد ماہنامہ ''شب خون'' کا اجرا ہوا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین اس کے مدیر تھے۔ شروع میں یہ عام قسم کا ادبی ماہنامہ تھا لیکن دھیرے دھیرے اس پر جدیدیت اور ترقی پسندی کی مخالفت کا رنگ چڑھتا گیا۔

ترقی پسندوں کو ''شب خون'' کے مدیر کی حیثیت سے ڈاکٹر اعجاز حسین کے نام کی اشاعت پر افسوس تھا۔ دہلی کے ایک جریدے میں ان کا ایک انٹرویو شایع ہوا جس میں غالباً ڈاکٹر عبدالحق نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود ''شب خون'' سے تعلق کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب میں یہ شعر پڑھا۔

اس چشم مروّت نے کہیں کا نہیں رکھا
اللہ بدل دے اسے دشمن کی نظر سے

''شب خون'' کے مالکوں کو اعجاز حسین صاحب کا یہ جواب بہت برا لگا اور اس طرح مروّت کا وہ پردہ جو ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے درمیان قائم تھا یک اٹھ گیا۔

''کتاب'' کو ''شب خون'' سے نقصان کا آغاز اس وقت ہوا جب اس میں جنس سے متعلق ایک کتاب کے ترجمہ کی اشاعت شروع ہوئی۔ کتاب کے سالانہ خریدار بننے والوں کی رفتار کم ہوگئی، وی۔ پی کے پیکٹ واپس آنے لگے اور ایک وقت ایسا آیا کہ میں نے ہمت ہار دی لیکن دل اس کے لیے تیار نہ ہوا اور ایک بار پھر میں نے کمر کسی، ترقی پسند دوستوں سے نئے خریدار اور اپنے اثرات سے کام لے کر اشتہارات حاصل کرنے کی درخواست کی۔ اس دوران ترقی پسندوں کے دو بڑے اجتماعات ہوئے جن میں ''کتاب'' کو زندہ رکھنے کے لیے منصوبے بنائے گئے، کمیٹی بنی لیکن کوئی اجتماعی کوشش تو دور کی بات، ان اجتماعات میں جو لوگ آگے آگے تھے ان میں سے بھی کسی نے سالانہ خریداری تک قبول نہ کی۔ مگر ''پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے میں'' کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ ڈائرکٹریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وزول پبلسٹی (ڈی۔ اے۔ وی۔ پی۔) نے خود ہی نرخنامہ اشتہار منگایا اور اپنے نرخ پر اشتہارات بھیجنا شروع کر دیے۔ یہ کام غالباً راج نرائن راز کی ایما پر ہوا تھا۔ کوثر چاند پوری کی کوششوں سے کبھی کبھی ہمدرد کا اشتہار مل جاتا، کبھی فرم احمد حسین دلدار حسین کا سو روپے کا اور چھوٹے چھوٹے اشتہارات بھی مل جاتے دو بار سَو سَو روپے کے اشتہارات دارالاشاعت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بھی علیم صاحب کے توسط سے حاصل ہوئے۔ وہ اس ادارے کے ڈائرکٹر تھے۔ جدیدیت کا زور کم ہوا تو ''کتاب'' کی مقبولیت میں زبردست اضافے کا دور شروع ہوا اور یہی اس کے زوال کا سبب بنا، خاص نمبروں کی بہتات سے بھی نقصان پہنچا۔ تعداد اشاعت میں اضافے سے خسارہ بڑھتا گیا کیوں کہ اشتہار نہ تھے، کتاب کی مقبولیت کا حال یہ تھا کہ الوداعی شمارے کی چودہ سو کاپیاں شائع ہوئی تھیں۔

میں اس وقت نیشنل ہیرالڈ میں سینئر سب ایڈیٹر تھا۔ اپنی اس حیثیت کا استعمال کرتا تو ''کتاب'' کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا اور محکمۂ تعلقات عامہ سے جو سارے ہی محکموں کے اشتہارات جاری کرتا ہے، اتنے اشتہار ملتے کہ خوب کماتا۔ لیکن میں اپنی دیوانگی کے باوجود بکار خویش ہشیار نہ تھا۔

حکومت اتر پردیش کے محکمۂ اشتہارات کا وہ شعبہ جہاں سے اشتہارات جاری ہوتے ''گا۔ وبھاگ'' کہلاتا تھا، اب بھی یہی نام ہوگا۔ ''کتاب'' کا سلسلۂ اشاعت ختم ہونے کے بہت دنوں بعد اس شعبے کے انچارج جو رٹائر ہو چکے تھے، حضرت گنج میں موجودہ یونیورسل بک ڈپو کے پاس والے مندر کے سامنے بس کا انتظار کرتے ہوئے مل گئے۔ انھوں نے ''کتاب'' کی خیریت دریافت کی اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، ہندی میں کچھ کہا جس کے معنی تھے کہ اب میرا ذریعۂ معاش کیا ہے۔ انھیں یہ معلوم کر کے کہ ''کتاب'' میرا ذریعۂ معاش نہیں شوق تھا اور میں نیشنل ہیرالڈ کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہوں سخت حیرت ہوئی اور انھوں نے پوچھا کہ یہ بات میں نے اس وقت کیوں نہ بتائی۔

اس سوال کا یہ جواب سن کر کہ ''میں ''کتاب'' کے لیے اشتہار لینے جاتا تھا، نیشنل ہیرالڈ کے لیے نہیں'' تو ایسا لگا کہ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔ بعد میں جب اس کے معنی ان کی سمجھ میں آئے ہوں گے تو انھوں نے مجھے جھوٹا سمجھا ہوگا یا بے وقوف۔

غالباً ۱۹۶۴ء میں عید کے دن رام لعل تشریف لائے اور مجھے وزیر گنج میں ایک صاحب کے یہاں لے گئے۔ ان کا نام مولوی سعید تھا۔ وہاں علی عباس حسینی، مولانا اختر علی تلہری، سریندر پرکاش اور محمود ہاشمی پہلے سے موجود تھے۔ آخر الذکر دونوں حضرات سے میری پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ وہاں ایسے لوگ بھی تھے جو مجھے گڑبڑ معلوم ہوئے اور میں نے رام لعل سے چپکے سے کہا کہ یہاں تو اسمگلر ہی اسمگلر نظر آ رہے ہیں۔ جواب میں انھوں نے کہا تمھیں تو ہر شخص اسمگلر ہی نظر آتا ہے۔ اس واقعے کو ساقی نارنگ نے کچھ دوسری ہی طرح پیش کیا ہے۔

مولوی سعید

بھیڑ ذرا سی چھٹی تو رام لعل نے مولوی سعید دہلوی سے میرا اور ''کتاب'' کا باقاعدہ تعارف کرایا اور امین آباد کے پارک ویو ہوٹل کے ان کے دفتر سے دوسرے تیسرے مہینے ان کی ٹریولنگ ایجنسی کا چھوٹا سا اشتہار ملنے لگا جو پچیس تیس روپے کا ہوتا۔ تیسرے یا چوتھے اشتہار کے پیسے لینے گیا تو معلوم ہوا مولوی سعید دہلی گئے ہوئے ہیں۔ میں نے دو ایک چکر لگائے لیکن ان کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ وہ دہلی سے تو پہلے ہی شہر بدر ہو چکے تھے، اب جیل میں ہیں۔ مجھے ان کی گرفتاری کا تو نہیں ''کتاب'' کے بیس پچیس روپوں کا بہت افسوس تھا۔

کچھ دنوں بعد جب میری چھوٹی بہن نجمہ کی شادی کو دو تین دن رہ گئے تھے اور گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، کوئی صاحب ملنے آئے۔ میں نیچے گیا تو دیکھا گٹھے ہوئے جسم کا ایک اجنبی کھڑا ہے۔ اس نے کہا آپ سے کچھ بات کرنی ہے تو میں نے کہا فرمایئے۔ میری بات سن کر وہ بولا،''ایسے ہی، بیٹھ کے بات کرنی ہے۔''

اس وقت یہ ممکن نہ تھا، چنانچہ میں نے کہا،''پرسوں میری بہن کی شادی ہے اس لیے آپ کو یہیں بات کرنی پڑے گی اور میرے پاس وقت بھی کم ہے۔''

اسے میری یہ بات بری لگی اور اس نے کہا،''تو یہاں کھڑے کھڑے کیا بات ہوگی؟''
پھر اپنا نام اقبال بتایا اور پوچھا،''آپ رحمان صاحب کو کیسے جانتے ہیں''

میں نے کہا''وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے، کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ہوا۔ لیکن وہ تو پولیس انسپکٹر ظہیر صاحب کے داماد ہیں۔ میں مولانا رحمان کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے ذہن پر زور ڈالا اور کہا،''میں کسی مولانا رحمان کو نہیں جانتا۔''

میرا جواب سن کر وہ کسی قدر غصّے سے بولا،''بننے کی کوشش مت کرو۔''

''بدتمیزی مت کرو۔'' مجھے بھی غصہ آ گیا۔

اتنے میں اس کی نظر چھجے پر پڑی جہاں ممی جان کسی کام سے آئی تھیں تو اس نے پوچھا، ''ڈاکٹر علیم کی مسز یہاں کیسے؟''

''میری ممانی ہیں،'' میں نے کہا

''آپ اب بھی کمیونسٹ ہیں؟''

''اب بھی سے کیا مطلب؟''

''یونیورسٹی کے دنوں میں تو آپ اسٹوڈینٹس فیڈریشن میں تھے۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ ان دنوں میں بھی یونیورسٹی میں تھا جہاں سے میں نے اردو میں ایم۔ اے کیا تھا۔ میرا نام اقبال سنگھ ہے، آپ کچھ اور نہ سمجھیں''۔

اس کی اس بات سے مجھے کچھ اطمینان ہوا لیکن اس کے رویّے میں یکا یک تبدیلی کا سبب اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔

اب اس نے پوچھا،''مولوی رحمان کو نہیں تو آپ مولوی سعید کو تو جانتے ہی ہوں گے؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے اپنی ڈائری کھولی اور پوچھا، ''آپ کی ان سے ملاقات کہاں کہاں ہوئی؟''

میں نے یاد کر کے عید کے دن سے اس وقت تک کی ساری ملاقاتیں بتادیں۔ کل چھے یا سات تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ ڈائری میں نشان لگا رہا تھا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ آپ شادی سے فرصت پالیجیے۔ میں بعد میں ملاقات کروں گا۔ لیکن پھر آیا نہیں۔

رسیدہ بود بلائے...

آٹھ دس مہینے بعد شام کے پانچ چھے بجے چار پانچ لوگ آئے اور انھوں نے کہا آپ سے کچھ باتیں تفصیل سے کرنی ہیں۔ اس وقت کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میں نے انھیں گھر میں بلالیا۔

وہ چاروں پانچوں مدھیہ پردیش پولیس سے متعلق تھے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر تھا اور باقی سپاہی۔ انسپکٹر نے مولوی سعید کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد کہا آپ فلاں فلاں تاریخ کو ان کے ساتھ بم لے کر بنارس کا پل اڑانے گئے تھے تو میں نے انھیں بتایا کہ میں نے تو اب تک بنارس دیکھا بھی نہیں۔

''لیکن مولوی سعید نے تو یہی بیان دیا ہے۔ رام لعل بھی آپ کے ساتھ تھے۔'' اس بار پولیس افسر کا لہجہ کچھ سخت تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ نیشنل ہیرالڈ کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہوں، آپ وہاں جا کر معلوم کر لیجیے کہ ان تاریخوں میں وہاں میں نے ڈیوٹی کی تھی یا چھٹی پر تھا۔ نیشنل ہیرالڈ کا نام سن کر اس کا رویہ کچھ بدلا اور اس نے بتایا کہ مولوی سعید نامی شخص جبل پور کے فسادات کے سلسلے میں مطلوب تھا اور اب وہاں جیل میں ہے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے یہ بھی کہا کہ ہم لوگ اگلے چار پانچ دن تک یہیں ہیں۔ ضرورت ہوئی تو آپ سے پھر ملاقات کریں گے۔ لیکن وہ آئے نہیں۔ پولیس انسپکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ فی الحال ہمارے آپ کے یہاں ان کے آنے کا ذکر کسی سے نہ کروں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اسی رات انھوں نے رام لعل اور احمد جمال پاشا کے یہاں بھی چھاپے مارے تھے اور ان سے بھی فی الوقت یہ بات راز رکھنے کے لیے کہا تھا۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے اس واقعے کا ذکر چھے سات دن بعد ہی کیا تھا اگرچہ یہ قطعاً یاد نہیں کہ اس دوران

ہماری ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔

''ماہنامہ کتاب'' کی اشاعت کے دنوں میں کئی دلچسپ واقعات پیش آئے۔ ان میں سے ایک یاد آ گیا۔ سن لیجیے۔ قومی آواز سے متعلق رہ چکنے کے سبب کتابت کے بارے میں تو تھوڑا بہت واقف تھا۔ لیکن رسالے کی کاپی کیسے جوڑی جاتی ہے نہ جانتا۔ (کمپیوٹر کے سبب اس کام سے لوگ اب پھر ناواقف ہو گئے ہیں)۔

یہ کام افضل صاحب کرتے تھے لیکن تنگ بہت کرتے، تین تین دن انتظار کراتے۔ شوکت تھانوی نمبر میں تو انھوں نے کمال ہی کر دیا۔ ہر روز وعدہ کرنے کے بعد بھی پورے ایک ہفتے نہ آئے تو میں ڈھونڈھتے ڈھانڈھتے ان کے گھر پہنچ گیا اور انھیں اپنے ساتھ لے ہی آیا لیکن کھن کھن جی کی کوٹھی کے پاس انھوں نے کہا کہ یہاں مجھے دومنٹ کا کام ہے، آپ چلیے میں ابھی آیا۔ وہاں سے میرا گھر مشکل سے ایک فرلانگ رہا ہوگا۔ میں نے دو گھنٹے تک انتظار کیا پھر بھی انھوں نے آ کے نہ دیا تو میں نے سال سوا سال کے تجربے کی بنیاد پر کاپی خود ہی جوڑ ڈالی اور خوب اچھی طرح چیک کرنے کے بعد کاپیاں سرفراز پریس پہنچا دیں۔ ان دنوں رسالہ وہیں چھپتا تھا۔

دو دن بعد افضل صاحب آئے اور یہ معلوم ہونے پر کہ کاپیاں پریس جا چکی ہیں بولے، ''اب آپ کاپی بھی جوڑنے لگیں گے تو ہم کاتبوں کا کیا ہوگا؟'' بہر حال اس کے بعد میں نے آخری شمارہ تک، جن میں ڈھائی ڈھائی سو صفحات کے خاص نمبر بھی شامل تھے، کاپیاں خود ہی جوڑیں۔ کتاب کی اشاعت ختم کرنے کا فیصلہ تو مالی حالات کی وجہ سے کیا گیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ ان دنوں کمپیوٹر سے کمپوزنگ اور کاپی جوڑنے کا رواج ہوتا تو شاید ''کتاب'' بند کرنے کی نوبت نہ آتی۔ کاتب حضرات نے بھی کچھ کم پریشان نہیں کیا تھا۔

'کنڈاگام'

''کتاب'' نے تخلیقات کے انتخاب کے سلسلے میں کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ راجہ مہدی علی خاں کی ایک نظم کی اشاعت سے معذوری کا اظہار کیا تو انھوں نے وہی نظم ایک مشہور پاکستانی جریدے کے خاص نمبر میں چھپوا کر رسالہ مجھے رجسٹری سے بھیج دیا۔ ساتھ میں نئی نظم بھی تھی۔ میں نے جواب میں لکھا کہ افسوس پنجاب کے رسائل کو جو آزادیاں حاصل ہیں وہ ''کتاب'' کو نہیں حاصل۔ راجہ مہدی علی خاں نے کتاب سے رشتہ ہمیشہ برقرار رکھا اور اپنی زندگی کا آخری خط

بھی اسپتال سے اسے ہی لکھا۔ یہ خط انھی کی تحریر میں کتاب کے سرورق پر شائع ہوا۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے، جن سے اس وقت تک میں ذاتی طور سے متعارف نہ تھا، شاید ایک غزل اور ایک نظم یا دو غزلیں بھیجیں لیکن یہ شرط لگادی کہ ''قبول کی جائیں تو دونوں اور مسترد کی جائیں تو دونوں''۔ میں نے دونوں چیزیں دوسرے لفافے میں رکھیں اور یہ لکھ کر کہ ان میں سے ایک چھاپنا چاہتا تھا مگر آپ نے شرط ایسی لگادی ہے کہ مجبوراً دونوں واپس کر رہا ہوں، واپس کردیں۔ لوٹتی ڈاک سے دریافت کیا گیا کہ کونسی چیز چھاپنا چاہتے تھے۔ میں نے جواب میں لکھا، ''پڑھیں کس کمبخت نے تھیں۔ دونوں بھیج دیجیے،'' اور دونوں ایک ساتھ چھاپ دیں۔ یہی واقعہ ہماری دوستی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

کرشن چندر کی چیزیں ''کتاب'' میں آن بان سے شائع ہوتی تھیں لیکن ایک افسانہ میں نے واپس کردیا، یہ لکھ کر کہ آپ کے نام سے اسے نہیں چھاپ سکتا، کوئی اور نام ڈال دیجیے، فوراً چھپ جائے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ کرشن چندر، خفا ہو جائیں گے لیکن وہ بے حد عالی ظرف انسان تھے۔ انھوں نے ایک مہینے کے اندر ''کنڈا گام'' ایسا افسانہ بھیج دیا جو ''کتاب'' کے زیر ترتیب شمارہ میں آٹھ صفحات کا اضافہ کر کے شامل کرلیا گیا۔ حال ہی میں یہ افسانہ ایک تفصیلی نوٹ کے ساتھ آصف فرخی صاحب کے رسالے ''دنیا زاد'' (شمارہ ۲۳) میں دوبارہ شائع ہوا اور ادارتی نوٹ میں ان کے ذکر، متعدد مضامین اور ایک سیمنار کا سبب بھی بن گیا۔

ایک واقعہ معلوم نہیں شمس الرحمٰن فاروقی کو یاد ہے یا نہیں لیکن اس طرح کے دو معاملات بگڑ بھی گئے۔ وارث علوی نے ایک مضمون بھیجا، اس شرط کے ساتھ کہ اسے چھاپا جائے تو من وعن ورنہ واپس کردیا جائے۔ ان کا شاید خیال تھا کہ اس میں ترقی پسندی پر جو حملے ہیں انھیں حذف کردیا جائے گا اور یہ بھول گئے کہ ''کتاب'' نے ڈاکٹر عقیل رضوی کے نقطۂ نظر کے خلاف محمود ہاشمی کا مضمون شایع کیا تھا۔ یہ مضمون وارث علوی نے شاید غیض وغضب کے عالم میں لکھا تھا اور اسی ذہنی کیفیت کے سبب زبان و بیان اور املا تک کی غلطیاں راہ پا گئی تھیں۔ میں نے ان غلطیوں کی نشاندہی کی تو انھوں نے یہ تو تسلیم کیا کہ اس صورت میں مضمون کی اشاعت ممکن نہیں لیکن یہ بھی لکھا کہ مضمون فاروقی صاحب کو دے دیا جائے۔ ان دنوں فاروقی کی پوسٹنگ لکھنؤ میں تھی۔ میں نے مضمون انھیں دے دیا لیکن چند روز بعد وہ اور نیرّ مسعود میرے یہاں آئے تو انھوں نے کہا کہ وارث علوی کا مضمون اس نوٹ کے ساتھ چھاپوں گا کہ ''کتاب نے اس کی

اشاعت سے معذرت کر لی تھی۔" میں نے کہا نوٹ ضرور لگایئے لیکن زبان و بیان کی کوئی غلطی درست نہیں کی جائے گی۔ فاروقی نے زبان و بیان کی غلطیاں درست کر دیں اور نوٹ نہیں لگایا۔
اس واقعے کے باوجود وارث علوی سے تعلقات میں کوئی بگاڑ نہیں آیا، ویسے شاید سال دو سال بعد رسالے کی اشاعت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔
لیکن ایک معاملے میں بگاڑ کی صورت پیدا ہو گئی۔ باقر مہدی نے ایک نظم اور دو غزلیں بھیجیں۔ وہ چاہتے تھے کہ نظم دو صفحات پر اور غزلیں ایک ایک صفحے پر شائع کی جائیں۔ میں نے لکھا کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے نظم اور غزلوں کو ایک ایک صفحہ دے سکوں گا۔ انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور تینوں چیزیں اسی طرح شائع ہوئیں۔ ایک صاحب نے باقر مہدی کے خاکے میں لکھا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے "کتاب" میں اشاعت کے لیے کچھ نہیں بھیجا۔ یہ بالکل غلط ہے لیکن ممکن ہے انھیں بات ہی غلط بتائی گئی ہو۔ باقر مہدی نے شاید ۱۹۹۵ء میں ایک پوسٹ کارڈ میں، جو انھوں نے اپنے کسی کام کے سلسلے میں بھیجا تھا، یہ بھی لکھا تھا کہ میرے نام یہ ان کا پہلا خط ہے، جب کہ اس سے پہلے انھوں نے دو درجن خط تو لکھے ہی ہوں گے، دس بارہ اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔ ۱۹۹۵ء کا خط میں نے نیرّ مسعود کو بھی دکھایا تھا۔

ایک بڑی غلطی

ایک بڑی غلطی "کتاب" سے بھی ہوئی اور اس کا علم برسوں بعد ایک مضمون کے ذریعے اس وقت ہوا جب رسالہ کی اشاعت کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس مضمون کے مطابق سلام بن رزّاق کے ایک افسانے کے سلسلے میں دفتر سے انھیں مطلع کیا گیا کہ فلاں فلاں مہینے میں شائع ہوگا لیکن جب افسانہ اس مہینے میں شائع نہ ہوا تو اس سلسلے میں استفسار کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ ان کا کوئی افسانہ موصول ہی نہیں ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کی غلطی کیسے ہو گئی۔ میں نے ایک بار ذکر کیا تو سلام بن رزّاق نے نہایت کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات مسکرا کر ٹال دی۔ "کتاب" کے بند ہونے کے بعد نہ میں اس غلطی کی تلافی کر سکتا تھا اور نہ ان کو اس کی ضرورت ہی رہ گئی تھی لیکن میری شرمندگی اب بھی برقرار ہے۔ تاہم ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ان کا ایک افسانہ جون ۱۹۷۲ء کے شمارہ نمبر ۱۰۵ میں شائع بھی ہوا تھا۔
"کتاب" سے سب لوگ خوش نہ تھے، کچھ لوگ ناراض بھی تھے۔ کوثر چاند پوری کے

افسانہ ''چورراستے'' پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہوا۔ احتشام صاحب نے لکھا کہ بعض لوگوں کو اس افسانہ پر اعتراض ہے چنانچہ اظہارِ افسوس کر کے معاملہ ختم کیجیے۔ میں نے یہی کیا اور کوثر چاند پوری نے اسے اپنی تخلیقات سے خارج کر دیا۔ لیکن ہفت روزہ ''سرفراز'' میں احتجاج کا سلسلہ جاری رہا اور علی عباس حسینی نمبر کو دفتری کے یہاں سے لوٹنے کی کوشش کی گئی۔ احتشام صاحب نے اس سلسلے میں سرفراز میں ایک خط یا مضمون لکھا تو مجھ سے آئندہ ایسی غلطی نہ کرنے کی ضمانت مانگی گئی۔ اب احتشام صاحب کو واقعی غصہ آ گیا۔ انھوں نے ایک نہایت سخت خط میں ''سرفراز'' سے پوچھا کہ کیا مستقبل میں کوئی غلطی نہ کرنے کی ضمانت پنڈت نہرو یا آپ دے سکتے ہیں، کیا میں اس طرح کی ضمانت دے سکتا ہوں؟ اس کے بعد ''سرفراز'' کے سامنے کوئی چارہ نہ رہا اور اس نے ادارتی کالم میں میری تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ میں اس طرح کے قضیوں سے بلند ہوں۔ ان دنوں ''حرم'' اور ''محرم'' نام کے دو ہفت روزہ اخبار بھی شائع ہونے لگے۔ ایک ''چورراستے'' کی حمایت کر رہا تھا اور دوسرا اس کی مخالفت۔ لیکن صورت یہ تھی۔ ''نہ اُس کی دوستی اچھی نہ اِس دشمنی اچھی۔''

اس کے کچھ دنوں بعد لکھنؤ میں شیعہ سنّی فسادات کی بہار کے دن لوٹ آئے۔ ایک دن پانچ چھے نوجوان مجھ سے ملنے آئے اور انھوں نے پوچھا کہ ''کتاب'' کے کاموں کے لیے کیا مجھے کوئی سنّی نہیں ملتا؟ کاتب سارے شیعہ، پریس شیعہ، دفتری خانے کا مالک شیعہ اور حد یہ ہے کہ دفتر کے کاموں کا معاون بھی شیعہ۔ ان کی بات سن کر میں حیران رہ گیا۔ شکایت ''بجا'' تھی لیکن میں نے اس طرح کبھی سوچا نہ تھا۔ سر چکرا گیا۔ آخر ایک ترکیب سوجھ گئی جو کارگر ثابت ہوئی۔

میں نے کہا، ''آپ کی شکایت سر آنکھوں پر۔ شکرگزار ہوں کہ آپ نے اس جانب متوجہ کیا۔ خیر جو ہوا سو ہوا، اب ایسا کیجیے کہ ان کاموں کے لیے مجھے سنّی حضرات فراہم کر دیجیے۔''

وہ لوگ وعدہ کر کے گئے لیکن اب تک لوٹ کے نہ آئے۔

اس زبانی اعلان کے ساتھ کہ مقصد ''کتاب'' کو بند کرانا ہے۔ شہر سے ایک ادبی ماہنامے کا اجرا بھی کیا گیا۔ ادیبوں کو تخلیقات اور تعاون کے لیے خطوط لکھے گئے تو سجاد ظہیر نے لکھا کہ لکھنؤ سے ''کتاب'' شائع ہوتا ہے، تم لوگوں کو نیا پرچہ نکالنے کے بجائے عابد سہیل کی مدد کرنی چاہیے۔ غلام رضوی گردش نے جو مجوزہ ماہنامے سے متعلق ہونے کے باوجود میرے یہاں آتے جاتے تھے یہ خط مجھے دکھایا تھا لیکن جب انھوں نے سجاد ظہیر کے خاکے میں ان کا خط شائع کیا تو اس میں

سے یہ حصہ حذف کر دیا۔

''آہنگ'' نام کے اس ماہنامے کی اشاعت دھوم دھام سے شروع ہوئی لیکن دو تین شماروں کے بعد ہی اس نے بغیر کسی دھوم دھام کے دم توڑ دیا۔

''کتاب'' میں اشاعت کے لیے مضامین، نظم ونثر بڑی بڑی سفارشوں کے ساتھ آتے، بعض میں لالچ بھی ہوتی لیکن ایک صاحب نے تو کمال ہی کر دیا۔ انھوں نے کرنول سے اپنی چند غزلیں اس پیش کش کے ساتھ بھیجیں کہ ان کی کوئی شعری یا نثری تخلیق ہر شمارے میں شائع کی جائے تو وہ ہر مہینے تین روپے رسالے کو پیش کیا کریں گے۔

''ماہنامہ کتاب'' نے اپنی بارہ تیرہ سالہ زندگی میں، علاوہ ان پچاس ساٹھ روپوں کے، جو غلطی سے وصول کر لیے گئے تھے، کوئی عطیہ قبول نہیں کیا اور اردو کا یہ پہلا ماہنامہ تھا جس نے سلسلۂ اشاعت ختم کرنے کے بعد خریدار حضرات کی باقی رقوم واپس کیں۔ ''شب خون'' نے بھی بعد میں یہی کیا۔

علامہ خیرؔ بہوروی

مالی تعاون قبول نہ کرنے کا میرا فیصلہ اپنی جگہ لیکن لوگوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان میں سے بیشتر نیک نیتی پر مبنی تھیں۔

مقبول احمد لاری صاحب بھی جن کی امارت کے سبب ان کی جانب میری رائے کچھ خاص اچھی نہ تھی، ان لوگوں میں تھے جو چاہتے کہ اڑتالیس صفحات کا یہ ماہنامہ چراغِ سحری نہ ثابت ہو۔ لیکن میں نے لاری صاحب کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سن رکھی تھیں۔

آخر علامہ خیرؔ بہوروی صاحب کے دو ماہ کے مسلسل تقاضوں سے پتھر پگھل ہی گیا۔ لاری صاحب کے مکان کے باہری کمرہ میں مجھے بٹھایا گیا۔ پھر ناشتہ آیا جو اچھا خاصہ تھا۔ کئی طرح کے بسکٹ، کیتلی میں چائے۔ اپنی ''اہمیت'' کے احساس سے نفس کچھ موٹا ہوا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر کتاب کا ذکر شروع ہوا۔ دو چار باتیں خیرؔ صاحب نے کیں۔ پھر لاری صاحب نے کہا۔

''کتاب کو لکھنؤ کا نمائندہ پرچہ بنایئے۔'' (الفاظ بالکل یہی تھے)

''کوشش تو کرتا ہوں کہ لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کی چیزیں زیادہ سے زیادہ

چھاپوں۔''

''جی ہاں، پرچہ میں نے دیکھا ہے لیکن اسے لکھنؤ کی نمائندگی کرنی چاہیے۔''

''مزید کوشش کروں گا،'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس کے بعد غیر متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ ایسی باتیں جن کی نوعیت کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں۔ پھر لاری صاحب نے پوچھا۔

''آپ رسالہ چھاپتے کیسے ہیں؟''

میں نے اس سوال کو کوئی اہمیت نہ دی اور کچھ دوسری باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد لاری صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔

''آپ رسالہ چھاپتے کیسے ہیں؟''

''کتابت کرا کے کاپیاں پریس کے حوالے کر دیتا ہوں۔'' میں نے بے دلی سے جواب دیا۔

خاموشی دو تین منٹ چھائی رہی۔

''سالانہ چندہ کیا ہے؟''

''چندہ نہیں، زرسالانہ؟''

''جی ہاں، وہی وہی۔''

''چھے روپے۔''

اس ملاقات کے خاتمے پر چھے روپے میری جیب میں تھے۔

رسالہ ایک سال تک لاری صاحب کو بھیجا جاتا رہا اور بارہویں شمارے کے ساتھ یہ اطلاع دے دی گئی کہ زرسالانہ کی رقم ختم ہوگئی ہے۔ تجدید خریداری منظور ہو تو مطلع فرما دیجیے۔ کوئی جواب نہیں ملا اور رسالہ کی ترسیل روک دی گئی۔

(کئی برس بعد ایک دن رام لعل نے بتایا کہ لاری صاحب کہہ رہے تھے، سہیل صاحب نے کتاب بھیجنا بند کر دیا، زرسالانہ تو بھیج ہی دیا جاتا)

تخلیقات اور رسالہ کی تعریف میں خطوط ''کتاب'' میں ضرور شائع ہوتے تھے لیکن ''مدیر پس پردہ'' کی تعریف میں اس کا نام لے کر کوئی خط نہیں شایع ہوا۔ الاعلی عباس حسینی، ڈاکٹر صفدر آہ اور قاضی عبدالستار کے ایک ایک خط کے جو اوّل الذکر دو حضرات کی بزرگی اور ادبی

حیثیت کے سبب شائع کرنا پڑے اور قاضی عبدالستار کے مزاج اور ضد کے سامنے میری ایک نہ چلی۔ تصویر بھی اس کی صرف ایک یا دو بار گروپ فوٹو میں شائع ہوئی اور بس۔ ان سارے برسوں میں عابد سہیل کی بمشکل آٹھ دس چیزیں شائع ہوئیں۔

پچھلی صدی کے ۷۰ ویں اور ۸۰ ویں دہے کے دوران افسانہ نگاروں کی جس نسل نے اپنے بیانیہ کو چمکا کر شہرت پائی اس میں سے بیشتر کی پہلی تخلیقات یا وہ جن سے ان کی شناخت قائم ہوئی ''کتاب'' میں شائع ہوئیں۔ اور ''کتاب'' کی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو برسوں میں چند اداریے احتشام صاحب نے لکھے جو ان کے نام کے بغیر شایع ہوئے۔

کتاب کے آخری شمارے کا اداریہ رسالہ کے آخر میں ''الوداعیہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

ماہنامہ کتاب کو میں نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا اور اس کی ناز برداری ان سے زیادہ کی تھی۔ ''کتاب'' کی اشاعت کا سلسلہ ختم ہوا تو انجمن ترقی اردو کے ''ہماری زبان'' نے صفحہ اوّل کے مضمون میں اسے آزادیٔ ہند کے بعد اردو کا دوسرا سب سے بڑا المیہ قرار دیا۔ اس پر اردو اور ہندی میں کئی مضامین لکھے گئے۔ لیکن میرے لیے یہ ایک ذاتی غم تھا جس نے میری نیند چھین لی اور کاموز کے استعمال کا جو سلسلہ اس وقت شروع ہوا، ایلرجیکس کی شکل میں اب تک جاری ہے۔

کتاب پبلشرز

''اعتبارِ نظر'' اور چند دوسری کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان میں کتابوں پر رائلٹی کی شرح، اگر رائلٹی دی جائے، عام طور سے دس فیصد ہے لیکن کتاب پبلشرز نے ایک صاحب کی فرمائش پر انھیں پندرہ فی صد رائلٹی دی۔ دوسرے ادارے، رائلٹی کی رقم قسطوں میں ادا کرتے ہیں لیکن کتاب پبلشرز نے یہ رقم کتاب کی اشاعت کے بعد ایک ہی قسط میں ادا کر دی۔ احتشام صاحب رائلٹی لینے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ یہ رقم ''ماہنامہ کتاب'' میں لگا دی جائے۔ بڑی مشکل سے ان کو آمادہ کیا، یہ کہہ کر کہ ''کتاب'' کو جب بھی ضرورت ہوگی لے لوں گا۔ منظر سلیم نے تو کوئی رقم قبول ہی نہ کی۔ مصنف کو دی جانے والی کتابوں کا بھی کوئی حساب کتاب نہ رکھا، جس نے جتنی مانگیں دے دیں۔ بعض لوگوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور میں نے تجربہ، لیکن اس تجربہ سے کام نہ لے پایا۔ بہت سے لوگوں نے اردو اکادمی اور فخر الدین علی

احمد کمیٹی سے مالی امداد حاصل کر کے مسودہ کی کتابت کرادی اور باقی رقم خود رکھ لی۔ بعض ایسے تھے جنھوں نے کتابت بھی نہیں کرائی اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو کتابیں بھی لے گئے۔ تین چار کتابوں کی اشاعت میں ان کے مصنفین کا جزوی تعاون شامل تھا اور دو تین کتابوں کے اخراجات مصنفین نے خود برداشت کیے۔

کامرس میں پڑھا تھا کہ رقم کی ادائیگی میں پہل نہ کرو لیکن کوئی مانگے تو فوراً دے دو۔ یہاں کسی کے مانگنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ دوسرے ادارے اور افراد ایسے بے وقوف نہ تھے۔ مزید یہ کہ اس وقت میں کتاب پبلشرز پر منحصر نہ تھا۔ الٹا سیدھا کام تو ہیر اللہ کی تنخواہ سے چل ہی جاتا۔ ''کتاب'' کا خسارہ برداشت کرنے میں البتہ کتابوں کی فروخت سے مدد ملتی۔

یہ دور وہ تھا جب شمع معمّے کے علاوہ شہروں شہروں مقامی معمّوں کا زور تھا اور آٹھ آنے روز پر مطالعے کے لیے کتابیں فراہم کرنے کے لیے لائبریریاں گلی گلی قائم تھیں۔ معمّوں کے اشارے مطبوعہ کتابوں سے حاصل کرنے کے عدالتی حکم نے کتابوں کی فروخت میں خاصا اضافہ کر دیا تھا لیکن معمّوں کے کام آنے والی کتابیں دوسری طرح کی ہوتیں اور پھر اشارات پرانی کتابوں سے حاصل کیے جاتے۔ یہ بات اس وقت سمجھ میں نہ آئی۔ بازار کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ کتابوں کی تعداد اشاعت کا تعین مصنفوں کے ادبی قد سے کیا۔ چند شعری مجموعے ایک ایک ہزار چھاپ دیے جن کی بمشکل ڈیڑھ پونے دو سو کاپیاں فروخت ہوئیں اور وہ بھی بیس بیس برسوں میں، پھر کوئی سرمایہ بھی پاس نہ تھا۔

مولوی سعید کی گرفتاری کا تعلق کسی نہ کسی طرح جبل پور کے فسادات سے تھا، لیکن ان فسادات کا ابھی ایک حوالہ باقی ہے۔ مائل ملیح آبادی ان دنوں کمیونسٹ پارٹی میں تھے۔ ان کا ناول ''برف کی دیوار'' جبل پور کے فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا تھا۔ اور اس میں کمیونسٹ پارٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کی آنچ بھی تھی۔ یو۔ پی میں جن سنگھ مارکہ کانگریس کی حکومت تھی۔ اس نے ناول ضبط کر لیا لیکن مقدمہ نہیں چلایا، مشہور تھا کہ حکومت جانتی ہے کہ مقدمہ چلایا تو ضبطی بھی عدالتی چھان پھٹک میں مسترد ہو جائے گی۔ کسی طرح کتاب کی اس ضبطی کی آنچ پارلیمنٹ تک پہنچی اور دہلی میں اس کی تلاش شروع ہوئی۔

پابندی لگتے ہی میں نے ایک رات لکھنؤ میں موجود ساری کتابیں رکشے میں لادیں اور انھیں گومتی برد کر دیا۔ باقی کتابیں دہلی میں ایک جگہ تھیں جو میری خواہش کے مطابق ردّی میں بیچ

دی گئیں۔ پابندی لگتے ہی کتاب کی مانگ میں زبردست اضافہ ہوگیا، اس حد تک کہ دہلی کے ایک غیر مسلم پبلشر نے غیر مجلد کتابیں بھی چالیس فی صد کمیشن پر خریدنے کی پیش کش کر دی۔ مسروقہ بوسے کی طرح چوری چھپے بکنے والی چیز گراں قدر ہو جاتی ہے۔ ان دنوں مشہور یہ بھی تھا کہ بعض ادارے تو کوشش کر کے اپنی کتابوں پر پابندی لگواتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ میں نے تو پابندی لگنے کے بعد کتاب کی ایک جلد فروخت نہ کی... سرکاری سطح پر دہلی اور لکھنؤ میں کتاب کی تلاش خاصی تاخیر سے شروع ہوئی اور کہیں ایک کاپی نہ ملی۔

ایک دن شام کے وقت چار پانچ لوگ آئے۔ وہ ''برف کی دیوار'' کی ایک کاپی چاہتے تھے۔ میرے پاس کتاب کی ایک بھی جلد نہ تھی۔ میں نے معذرت کی تو وہ بضد ہو گئے کہ آپ نے چھاپی ہے، تلاش کیجیے ایک آدھ تو مل ہی جائے گی۔ جب وہ کسی طرح میری بات ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے تو میں نے گھر کی ساری چابیاں ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ ہمیں ایک ضروری کام سے جانا ہے آپ کتاب تلاش کر لیں اور جاتے وقت چابیاں سامنے والے گھر میں دے دیں۔ مایوس ہو کر وہ لوگ چلے گئے۔ ان کا تعلق ایل۔ آئی۔ یو۔ (لکھنؤ انٹلی جنس یونٹ) سے تھا۔ یہ بات انھوں نے شروع ہی میں بتا دی تھی۔

یہ اس دن کی بات ہے جب برجو مہاراج رویندرالیہ میں غالبؔ بیلے پیش کرنے والے تھے اور ہم لوگ رویندرالے جانے کے لیے تیار۔

اس واقعے کے بعد میں نے ادارے کا نام نصرت پبلشرز کر دیا۔ نصرت میری اہلیہ کے نام کا ایک حصہ ہے۔

◆◆◆

نصرت پبلشرز

اس ادارہ کے نام سے چند کتابیں تو کپور مارکیٹ ہی سے جہاں ہم فرحت اللہ انصاری کے مکان سے منتقل ہوگئے تھے، شائع ہوئی تھیں لیکن اسے لوگوں نے جانا اس وقت جب امین آباد میں ایک باقاعدہ ادارہ قائم ہوگیا۔ اس کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔

نیشنل ہیرالڈ کے حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے تھے۔ کئی کئی مہینے تنخواہیں نہ ملتیں۔ ایک دن امین آباد میں پڑائن کی مسجد (پنڈ تائن کی مسجد) کے سامنے سے گذرتے ہوئے ایک دوکان پر دفتی لٹکتی ہوئی نظر آئی جس میں موٹے موٹے حروف میں Shop available لکھا تھا۔ میں دفتر جارہا تھا، جہاں تالہ بندی ہوچکی تھی۔ میں نے سوچا یہاں دوکان مل جائے تو ساری مشکلیں حل ہوجائیں۔ یہ بات ۱۹۷۹ء کے شروع کی ہے۔ میں نے اپنے ایک عزیز، زاہد علی، کو معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تو پتہ چلا ایک نہیں کئی دکانیں ہیں۔ دوکان دیکھنے کے لیے اکیلے جانے کی ہمت نہ ہوئی تو اپنے دوست خواجہ انوارالدین (نامی پریس) کو ساتھ لے گیا۔ وہاں مسجد سے ملحق زمین پر درخت کے نیچے ایک صاحب پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے جنھیں لوگ داروغہ جی کہہ کر مخاطب کرتے۔ میں نے ہیرالڈ سے اپنے تعلق کا ذکر کرکے دوکان میں دلچسپی ظاہر کی تو انھوں نے کہا گرانی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دوکانیں بنیں گی کیسے۔ تین دوکانیں لوگوں نے لے لی ہیں اور وہ ان کی تعمیر میں مدد کررہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ دوکانیں پہلے بنیں گی۔ آپ ایسا کیجیے کہ اگلے ہفتے پانچ ہزار روپے دے دیجیے تو اس پر بھی کام لگادوں۔ میں نے کہا پراویڈینٹ فنڈ سے ایک ہزار روپے منگائے ہیں۔ سنا ہے آرہے ہیں، لیکن وہ تو گھر کی ضرورتوں میں لگ جائیں گے۔ میرے اس جملے میں خاصی مایوسی تھی۔ لیکن پندرہ بیس منٹ کی بات چیت میں انھیں میری جانے کیا بات پسند آگئی کہ انھوں نے کہا میں آپ سے اس قدر متاثر ہوں کہ دوکان چاہے جب بھی بنے، ملے گی آپ ہی کو۔

خیر، ہم دونوں لوٹ آئے۔ خواجہ انور مجھے اپنی کار پر لے گئے تھے۔

دروغہ جی کے ہمت افزا رویے کے باوجود میں مایوس تھا۔ اگلے ہفتے تک پانچ ہزار تو دور کی بات پانچ سو کا انتظام بھی میرے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا۔

اگلے ہفتے بارہ ایک بجے دن میں کار کے ہارن کی مسلسل آواز سنائی دی تو میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ خواجہ انور کی کار کھڑی تھی۔ نیچے جا کے معلوم کیا تو انھوں نے کہا دروغہ جی سے ملنے نہیں چلیے گا، انھوں نے ایک ہفتے بعد بلایا تھا۔ میں نے کہا کیا کروں گا جا کے تو وہ بولے چلیے دیکھیں تو آئیں... دروغہ جی مسجد کے زیر سایہ نہ ملے تو ہم لوگ ان کے گھر چلے گئے جو چودھری حیدر حسین کی کوٹھی کے پیچھے تھا۔ ہمیں ان کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ اسی وقت خواجہ انور نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں حالات کے اس موڑ سے خوش بھی تھا اور الجھن میں بھی۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں پوچھا کتنے روپے ہیں تو انھوں نے کہا وہ خود گن لیں گے۔ اب یہ قطعاً یاد نہیں کہ کتنے روپے تھے لیکن اتنے ضرور رہے ہوں گے کہ دروغہ جی انھیں گننے کے بعد مطمئن ہو گئے اور انھوں نے کہا اب دوکان آپ کو جلد ہی مل جائے گی۔

دوکان کا افتتاح نسیم بک ڈپو کے مالک نسیم انہونوی سے کرانا چاہتا تھا لیکن وہ شدید بیمار تھے۔ دانش محل کے نسیم صاحب عمرہ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ رسم ڈاکٹر شبیہ الحسن نے انجام دی۔ اس موقع پر شہر کے ادیبوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ ہمت افزائی کے طور پر لوگوں نے کتابیں خریدیں۔ کل چھ سات سو روپوں کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اگلے دو تین دنوں میں بھی کچھ نہ کچھ کتابیں فروخت ہوئیں لیکن چوتھے دن نہ کوئی آیا نہ ایک پیسے کا سیل ہوا۔ میں نے اسے اتفاق سمجھا لیکن بعد میں یہ اتفاق خوب خوب ہوا۔

نصرت پبلشرز کا سلسلہ کم و بیش اکیس سال قائم رہا۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ جو روکھی سوکھی، خاص طور سے ۱۹۸۵ء کے بعد جب میں نیشنل ہیرالڈ سے مستعفی ہو گیا، میسر آئی، اسی کے طفیل تھی۔ یہ بات دوسری ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کے جو بھی روپے اس وقت ملے تھے ان کا بیشتر حصہ اور بعد میں ریڈیو، دوردرشن اور لکھنے پڑھنے سے جو بھی حاصل ہوا سب اسی

میں لگ گیا۔ ان دنوں جب ہیر اللہ سے تنخواہ نہ ملتی اور یہ اکثر ہی ہوتا، میں گھر کے اخراجات کے لیے انیس کو صرف ۸۵۰ روپے ماہانہ دیتا لیکن بچوں کی تعلیم کے اخراجات میرے ذمے تھے۔ بیس اکیس برسوں میں جب یہ سلسلہ ۲۰۰۱ء میں ختم ہوا تو انیس کو دی جانے والی ماہانہ رقم بڑھ کر ڈھائی ہزار ہوگئی تھی۔ البتہ اِن ڈھائی پونے تین برسوں میں جب مَیں پائنیر سے متعلق تھا انیس کو ساڑھے تین ہزار روپے دیتا رہا۔ لیکن اس دوران نصرت پبلشرز سے گھر کے اخراجات کے لیے ایک پیسہ نہیں لیا۔ ان دنوں نصرت پبلشرز پر تین چار روپے روزانہ کی چائے کے علاوہ کوئی بوجھ نہ تھا۔ میں نے کبھی ایک پیسہ نہ لیا، ٹیمپو کے کرایے کے علاوہ۔

اکیس برسوں کی یہ کہانی خاصی طویل ہے، دلچسپ اور میری بے وقوفیوں سے بھری ہوئی۔ اسے سنانے پر آؤں تو صفحے کے صفحے سیاہ ہوجائیں۔ اس لیے صرف چند روشن اور تاریک پہلو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

شروع کے پانچ سوا پانچ برسوں میں انیس نے دوکان کو خاصا وقت دیا لیکن میں نے ہیر اللہ سے مستعفی ہونے کے بعد انھیں بری الذمہ کردیا۔ خالی ہاتھ بیٹھنے کے لیے دو لوگوں کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ دو دو لوگوں کے امین آباد آنے جانے کے مالی مضمرات بھی تھے۔ ان دنوں حالات کی خرابی نے یہ صورت اختیار کرلی تھی۔

''کتاب'' کب کا بند ہوچکا تھا لیکن اس کا درد باقی تھا۔ چنانچہ میں نے رسائل پر خصوصی توجہ دی اور نصرت پبلشرز سارے ہی ادبی رسائل کی فروخت کا مرکز بن گیا۔ یہ معلوم کرکے شاید حیرت ہو کہ نصرت پبلشرز سے ''آج کل'' کی ۴۵، ''ایوان اردو'' کی ۲۵، ''شبخون''، ''ذہن جدید''، ''نیا ورق''، ''سائنس''، ''سائنس کی دنیا'' اور دوسرے رسائل و جرائد کی پندرہ سے بیس تک کاپیاں فروخت ہوتی تھیں، ''نیا دور'' کے خاص نمبر تو ایک ایک ہزار فروخت ہوئے۔ لیکن ان سے کوئی خاص مالی منفعت نہ تھی۔ چند پرچے بھی بچ جاتے تو حساب برابر ہوجاتا۔ نصرت پبلشرز نے یہ کام ادبی صحافت کی خدمت کے طور پر کیا۔ اب کئی ادبی رسائل دانش محل میں مل جاتے ہیں۔

دانش محل کے نسیم احمد صاحب کہتے کہ کتابوں کی فروخت پر فائدہ دو فی صد ہوتا ہے تو بات میری سمجھ میں نہ آتی، میں سوچتا کہ کمیشن چالیس فی صد ملتا ہے، خریدار کو بیس فی صد کی رعایت دے دی تو اتنے ہی بچے۔ چنانچہ انفرادی خریداروں کو بھی خوب خوب کمیشن دیتا۔ لیکن جب امین آباد کا

سلسلہ ختم ہونے کے بعد حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اس سارے دوران گھر پھونک تماشہ دیکھتا رہا تھا۔ میں نے دوکان کے کرایے، ڈاک کے اخراجات، وی۔پی کی واپسی، نادہند دوکانداروں اور خریداروں اور دوکان سے کتابوں کی چوری کا کبھی حساب ہی نہیں کیا اور اپنے اس وقت کا بھی جو ادارہ کو دیتا تھا۔

اہل زبان

لکھنؤ میں کتابیں خریدنے کا رواج نہیں۔ اہل زبان کو سیکھنا کیا اور اردو گھر کی لونڈی ہے، گھر کی لونڈی کو منہ نہیں لگایا جاتا۔ دو تین واقعات سن لیجیے۔

ایک صاحب ہر مہینے کے شروع میں آتے اور ''نیا دور'' کی ورق گردانی کر کے چلے جاتے۔ تیسری چوتھی بار آئے تو انھوں نے میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ ان کی غزل شائع ہونے والی ہے۔ پھر نیا شمارہ آتا تو میں بھی دیکھ لیتا کہ ان کی غزل چھپی کہ نہیں۔ آخرکار، ان کی غزل شائع ہوگئی۔ وہ آئے تو میں نے مبارک باد دی۔ غزل دیکھ بہت خوش ہوئے۔ میرے خیال میں دس بار تو اپنی غزل پڑھی ہی ہوگی۔ اپنی خوشی چھپانے کے لیے کبھی کبھی دوسرے صفحات پر بھی نظر ڈال لیتے۔ میں نے سوچا کہ ''نیا دور'' کا یہ شمارہ تو خرید ہی لے جائیں گے لیکن انھوں نے رخصت ہوتے وقت رسالہ رکھ دیا اور کہا، ''یہ پرچہ تو مجھے وہاں سے مفت مل جائے گا۔''

اس وقت ''نیا دور'' کی قیمت پچاس پیسے تھی، محکمہ اطلاعات جانے آنے میں کم سے کم دو روپے تو خرچ ہوئے ہی ہوں گے لیکن انھوں نے رسالہ خرید کر اپنی ''ادبی حیثیت'' کی ''بے حرمتی'' نہیں ہونے دی۔

نصرت پبلشرز کی حالت ''گھر میں کیا تھا کہ ترا غم جسے غارت کرتا'' جیسی تھی۔ اکثر صورتوں میں کوئی معاون بھی نہ ہوتا۔ کسی کام سے ڈاکخانہ یا کسی اور کام کے سلسلے میں آس پاس جانا ہوتا تو دوکان کھلی چھوڑ کے چلا جاتا۔ لوگ رسالے اور کتابیں تو یوں بھی دوکان میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو سکتا تھا کہ کسی کو ایک آدھ کتاب زیادہ پسند آجاتی... ایسے ہی ایک موقعہ پر وجاہت علی سندیلوی صاحب تشریف لے آئے۔ چار پانچ منٹ انتظار کیا پھر ایک چھوٹا سا پرچہ لکھ کر میز پر رکھ دیا اور چلے گئے۔ انھوں نے لکھا تھا:

''اردو کی بے قدری دیکھ کر افسوس ہوا۔ اب اس بدقسمت زبان کو چور بھی نہیں ملتے۔''

افسوس نصرت پبلشرز میں یہ ان کی آخری تشریف آوری تھی۔ موت ان کے تعاقب میں تھی۔

ایک دن میرے ایک شناسا نے نیشنل بک ٹرسٹ کی کتاب جس کا نام شاید "سکّوں کی کہانی" ہے، دو دن کے لیے عاریتاً مانگی۔ میں نے کتاب فوراً پیش کردی۔ تھوڑی دیر بعد رخصت ہوتے ہوئے انھوں نے کہا، "کتاب کی مجھے نہیں فلاں فلاں صاحب کو ضرورت ہے۔ اصل میں انھیں ریڈیو پر ایک ٹاک دینی ہے"۔

میں نے کہا، "وہ صاحب لکھ پتی کروڑ پتی ہیں۔ پھر انھیں ریڈیو سے معاوضہ بھی ملے گا۔ حیرت ہے وہ نو ساڑھے نو روپے کی کتاب نہیں خرید سکتے"۔ ان صاحب نے کتاب رکھ دی۔ اگلے دن ایک صاحب وہ کتاب خرید لے گئے۔

ایک دن ایک خاتون جو نہایت عمدہ کپڑوں میں ملبوس تھیں، تشریف لائیں اور خاصی دیر تک کتابیں دیکھتی رہیں پھر انھوں نے "آگ کا دریا" اٹھائی اور بولیں، "یہ ناول پڑھنا چاہتی ہوں۔ آپ قیمت رکھ لیجیے۔ میں چار دن میں واپس کردوں گی، کرایے کے جتنے روپے مناسب سمجھیے کاٹ لیجیے گا۔

میں نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ یہاں پڑھنے کے لیے کتابیں کرایہ پر نہیں دی جاتیں، یہ کتابوں کی دوکان ہے۔

"آپ کا نقصان کیا ہے، کسی کو بالکل معلوم نہ ہوگا کہ کتاب پڑھی گئی ہے۔"

"سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ یہ تو اس کے خریدار کو دھوکا دینا ہوگا۔"

انھوں نے کہا، "اسے معلوم بھی نہ ہوگا کہ کسی نے اسے چھوا بھی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے"، میں نے کہا، "معاملہ معلوم ہونے کا نہیں۔ اصل میں کتاب کے پہلے قاری کو Untouched...۔"

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بھڑک اٹھیں، "آپ کو خواتین سے بات کرنی نہیں آتی،" انھوں نے کہا اور پرس کھولنے لگیں۔

"جی میں کتاب فروخت نہیں کروں گا، معلوم نہیں آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں،" میں نے کہا۔

انھوں نے لاکھ اصرار کیا لیکن میں نے انھیں کتاب نہ دی۔ دوکان سے ان کے

رخصت ہونے کے بعد میں نے گلی میں جھانک کر دیکھا تو وہ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار کا دروازہ کھول رہی تھیں۔

اگلے دن ایک صاحب ''آگ کا دریا'' پوری قیمت پر خرید لے گئے۔

دوکان کا سلسلہ شروع ہوا تو تین جانے مانے گھروں کے ملازم ہر مہینے تین چار ناولیں خرید لے جاتے۔ اس وقت شہر میں دوردرشن کا سلسلہ تو شروع ہو گیا تھا لیکن چینل نہیں آئے تھے۔ پھر چینل شروع ہوئے تو ناولوں کی فروخت کا سلسلہ یکا یک ختم ہو گیا۔ ناولیں پڑھنے کے لیے کسی کے پاس وقت ہی نہیں رہ گیا تھا۔

چوری اور ترک تعلق

کتابوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں Borrow, bear or steal انگریزی کی حد تک صحیح ہوتو ہو، اردو کا جہاں تک تعلق ہے، کتابیں چاہے ہاتھوں ہاتھ تقسیم کتنی ہی ہوں، خریدی کم ہی جاتی ہیں اور چوری کی نوبت بھی کم ہی آتی ہے کیونکہ اردو معاشرہ میں کتاب کچھ ایسی اہم چیز نہیں۔

لیکن کتابیں چرانے کا بھی اپنا ایک مزا ہے، سو یہ کاروبار شوق بھی ہوتا ہی رہتا ہے۔ ظاہر ہے نصرت پبلشرز بھی اس کا شکار ہوتا تھا۔

ادارہ قائم ہوا تو تنقید کی نئی کتابیں، جو کچھ زیادہ نہ تھیں، اس طرح پھیلا پھیلا کر رکھی گئی تھیں کہ الماری بھری بھری لگے۔ چنانچہ ایک کتاب بھی اٹھالی جائے تو جگہ خالی ہو جاتی۔ ایک شام ایک خاتون اور دو حضرات تشریف لائے، خاتون محترم کئی فائلیں سینے سے لگائے ہوئے تھیں۔ وہ لوگ تنقید کی کتابیں دیکھنے لگے۔ میں نیشنل ہیرالڈ گیا ہوا تھا اور انیس دوکان میں تھیں۔

ان تینوں نے یہ کتابیں خوب خوب دیکھیں اور پھر ایک دم رخصت ہو گئے۔ انیس نے کتابیں الماری میں سجانا شروع کیں تو تین کتابوں کی جگہ خالی رہ گئی۔ وہ ان لوگوں کی تلاش میں تیزی سے باہر نکلیں تو وہ تینوں والی آ سی کی دوکان کے باہر کھڑے تھے۔ والی صاحب نے انھیں روک لیا تھا۔

انیس نے ان سے کہا کہ ''آپ لوگ کتابیں لے جارہے ہیں تو ان کے نام تو لکھا دیجیے، قیمت بعد میں آتی ہی رہے گی۔''

وہ تینوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے جیسے ان پر الزام لگایا جارہا ہے یا کوئی انہونی ہوگئی ہے۔ اسی دوران ان خاتون نے اپنی فائلیں دیکھیں، مجبوراً، تو ان میں تین کتابیں موجود

تھیں جو انھوں نے ''ارے'' کہتے ہوئے لوٹا دیں۔

انیس کی ہمت تھی جو انھوں نے کتابیں ''برآمد'' کرلیں۔ میں ہوتا تو دیکھ کے بھی گردن جھکائے لوٹ آتا۔ لیکن اس چوری کی مار بھی ان ہی پر پڑتی تھی۔ بچے کھانا تو انھی سے مانگتے تھے۔

بعد میں انیس نے ان میں سے ایک صاحب کو طرح طرح سے پچھنوانے کی کوشش کی لیکن میری سمجھ میں نہ آیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک دن ہم لوگ دوردرشن پر ''اودھ پنچ'' کا انتظار کررہے تھے۔ پروگرام شروع ہوا تو انیس نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

''ارے یہ'' میں نے نام لیا۔ یہ تو میرے کلاس فیلو تھے، رائق سے ان دنوں ان کی گہری دوستی تھی، ان کے رینبو پریس میں بیٹھے رہتے تھے۔

لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ کانپور کے ایک ڈگری کالج میں اردو کے لیکچرر تھے اور میری چچازاد بہن کی بیٹی کے شوہر...وہ کانپور میں رہتے اور بیوی لکھنؤ میں ہمارے گھر کے پاس...وہ دن اور پانچ سال بعد، جب تک اس گھر میں ہمارا قیام رہا، غریب ایک بار ہمارے یہاں نہ آپائی پہلے ہر آٹھویں دسویں آتی تھی۔ اس پر پابندی لگادی گئی تھی۔

ان کے دودو راز فاش ہوجانے کا خطرہ تھا۔

ایک تو یہ کہ ان کے شوہر نامدار کتابوں کی چوری میں شامل تھے اور وہ بھی نصرت پبلشرز میں اور دوسرے یہ کہ ایک خاتون کے ساتھ گھوم رہے تھے۔

میں نے بھی لوگوں کو خاموشی سے رسائل لے جاتے ہوئے دیکھا لیکن ان کی کامرانی میں مخل نہ ہوا۔ اس امید میں کہ شاید اسی طرح پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوجائے۔

دوکان سے براہ راست فروخت کی نوبت تو اکثر دودو دن نہ آتی لیکن دو یونیورسٹیاں اور دو کالج ایسے تھے جہاں ہر سال کم سے کم نوے فی صدی اردو کتابیں نصرت پبلشرز ہی سے جاتیں۔ دونوں پی۔ جی۔ کالج لڑکیوں کے تھے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اور ڈاکٹر سید محمد عقیل نے بھی اس سلسلے میں بہت تعاون کیا۔ ایک بار محکمۂ تعلیم کے سکریٹری کے۔ کے۔ بخشی نے توجہ کی اور راجہ رام موہن رائے ٹرسٹ کے ذریعے خاصی کتابیں خرید کر لائبریریوں کو فراہم کیں۔ محمود ایاز مرحوم نے بھی کرناٹک اردو اکادمی کے لیے تین چار بار کتابیں خریدیں، ایک کتاب چھپوائی بھی۔ نصرت

پبلشرز کا سلسلہ ختم ہونے کا وقت قریب آیا تو حسنِ اتفاق سے ایک مقامی پی۔ جی۔ کالج کو بڑی گرانٹ مل گئی اور خاصی بڑی رقم کی کتابیں فروخت ہوگئیں۔

کچھ خوشگوار تجربات بھی ہوئے۔ پاکستان کی ایک پتلی سی کتاب تھی ''سب رس کا تنقیدی جائزہ''۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے پڑھی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ''سب رس'' پر کوئی اچھی کتاب نہیں ملتی، اسے چھاپ دو، طلبہ کے بہت کام آئے گی۔ میں نے چھاپ دی۔ قیمت رکھی ڈھائی روپے۔ طلبہ کے واقعی بہت کام آئی۔ دور دور سے طلبہ کے آرڈر آتے کہ ایک کتاب بذریعہ وی۔ پی بھیج دیجیے۔ وی پی کرتا تو ڈھائی روپے کی کتاب غریب طالبعلم کو کم وبیش سات آٹھ روپے میں ملتی۔ میں کتاب سادہ ڈاک سے بھیج کر پوسٹ کارڈ لکھ دیتا کہ کتاب مل جائے تو ڈھائی روپے بھیج دو۔ تمھیں خواہ مخواہ کی زیر باری سے بچانے کے لیے کتاب وی۔ پی سے نہیں بھیجی گئی ہے۔ نوے فی صدی صورتوں میں منی آرڈر سے روپے آجاتے، باقی کے بارے میں یقین کرلیتا کہ کتاب ڈاک کی گڑبڑی کی نذر ہوگئی۔ بعد میں اس کی قیمت بڑھ کر شاید ساڑھے چار روپے ہوگئی تھی۔

طالب علموں اور خاص طور سے طالبات کی جانب نصرت پبلشرز کا رویہ ہمیشہ ہمدردانہ رہا۔ دوکان پر بیٹھ کر لڑکیوں کو نوٹس بنانے کی سہولت تو اکثر مل ہی جاتی، یہ بھی ہوتا کہ کبھی خریدار یا یار دوست آجاتے تو میں طالبات کو کتاب گھر لے جانے کی اجازت دے دیتا۔ وہ کہتیں نام پتہ لکھ لیجیے تو میں کہتا کہ کتاب واپس نہ کرنے کا ارادہ ہوگا تو نام پتہ صحیح لکھاؤ گی۔ ایک بار بھی ایسا نہ ہوا کہ کوئی کتاب واپس نہ آئی ہو۔ لیکن ہزاروں روپے کی تنخواہ پانے والے اساتذہ دوکان میں بیٹھ کے پرچے بناتے یا کتابیں عاریتاً لے جاتے تو اچھا نہ لگتا، اگرچہ انکار نہ کرتا۔

ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔ ان اکیس برسوں میں نصرت پبلشرز سے کوئی وی۔ پی واپس نہ ہوئی اور کسی کو یہ شکایت کا موقعہ نہ ملا کہ اس ادارے سے جاری کیا ہوا چیک بینک سے واپس آگیا۔

دوکان کا آغاز کسی سرمایے کے بغیر ہوا تھا۔ میرے پاس چار چھے ہزار روپے بھی نہ تھے لیکن سارے ہی ناشروں نے دستِ تعاون بڑھایا اور خدا نے کچھ ایسا کیا کہ کسی کو اپنے فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑا۔

ساجد میاں دو تین سال سے یہ سلسلہ ختم کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ آخر مجھے ان کی

بات ماننی پڑی۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ کسی ادارہ کو ایمانداری سے ختم کرنا اسے شروع کرنے سے کم مشکل نہیں ہوتا۔ یہ بات میں نے انھیں بتائی نہ اس کی ضرورت ہی پڑی۔ پائنیر کی ملازمت کے دنوں گھر کے خرچ کے لیے ادارہ پر بوجھ نہ پڑنے کی وجہ سے بینک کی حالت اچھی تھی اور بالکل آخر وقت کے اس بڑے آرڈر سے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے مزید استحکام حاصل ہوا۔ چنانچہ ۲۰۰۱ء شروع ہونے سے قبل ہی ادائگیاں شروع ہو گئیں۔ ناشروں اور اداروں کی رقوم ادا کرنے کے بعد ان لوگوں کی طرف توجہ کی جو اپنی کتابیں فروخت کرنے کے لیے رکھ گئے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد خاصی تھی۔ ان سارے لوگوں کی فروخت شدہ کتابوں کی قیمت کی ادائیگی اور باقی کتابوں کی واپسی نصرت پبلشرز نے اپنے خرچ پر کی۔ اس طرح ناشروں اور افراد کو ایک لاکھ روپے سے زائد ادا کیے گئے۔ پھر بھی بیس بائیس ہزار روپے ادا نہ کیے جا سکے لیکن خدا کے شکر سے اب اس بوجھ سے بھی سبک دوش ہو چکا ہوں۔ دوسرے اداروں اور افراد پر کم وبیش لاکھ سوا لاکھ روپے نصرت پبلشرز کے تھے۔ ان میں بمشکل پندرہ بیس ہزار روپے وصول ہوئے۔ باقی کے لیے کچھ خاص تقاضہ بھی نہیں کیا گیا۔ ایک یونیورسٹی پر پندرہ ہزار روپے باقی تھے جو سابق اور نئے صدر شعبہ کے جھگڑے کی نذر ہو گئے اور بنگال کے ایک ادیب نے جو اَب پروفیسر بھی ہو گئے ہوں گے، کتابوں کی دس بارہ ہزار کی رقم خود ہی وصول کر لی۔ ان کا نام مشرقی یوپی کے ایک بہت بڑے عالم اور ادیب کے نام پر ہے۔ امین آباد میں اکیس سال گذارے لیکن یہ سلسلہ ختم کرنے کا افسوس ذرا نہ ہوا، کتابوں کی آخری گڈی لے کے حیدری مارکیٹ سے نکل رہا تھا کہ دو سندھی اور پنجابی دوکانداروں کا جملہ کان میں پڑا۔ ''آج حیدری مارکیٹ سے شرافت رخصت ہو گئی۔'' سارے غم دھل گئے۔

میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''سب سے چھوٹا غم'' ۱۹۷۵ء میں شایع ہوا تھا۔ دوسرا اس وقت چھپا جب نصرت پبلشرز اپنی بساط پلٹ رہا تھا۔ اس کے بعد کے آٹھ نو برسوں میں ٹی۔ بی، پروسٹریٹ کے آپریشن، کینسر، انجائنا اور انجیو پلاسٹی کے باوجود آٹھ نو کتابوں کی اشاعت ممکن ہو سکی ہے اور صحت اور زندگی نے ساتھ دیا تو امید ہے دو تین برسوں میں کچھ اور کتابیں شایع ہو جائیں گی۔

نصرت پبلشرز کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد ساجد میاں نے مجھے گھر کی ساری ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا ہے اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ امین آباد میں بیٹھنے کے بجائے گھر میں

بیٹھ کے لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا تو شاید مالی پریشانیاں بھی کم ہوتیں اور ممکن ہے دو ایک کام کی چیزیں لکھ لیتا۔

کسی نے کہا ہے کہ ہم بڈھے اس وقت ہوتے ہیں جب پچھتاوے ہمارے حوصلوں اور امنگوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ عمر طبعی کے حساب سے بھی بڑھاپے کے حدود میں کب کا داخل ہو چکا ہوں لیکن حوصلے ابھی باقی ہیں، پھر بھی دیکھیے کب تک چلوں، کوئی ہمیشہ کا پٹہ لکھا کے تھوڑی آیا ہوں۔

◆◆◆

اردو اکادمی

۱۹۷۹ء میں جب ڈاکٹر محمد حسن اردو اکادمی کے چیر مین تھے نیشنل ہیرالڈ بلکہ ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کے تینوں اخباروں میں ہڑتال کے بعد تالا بندی اور تالا بندی کے بعد ہڑتال کا چوہا دوڑ بلّی آئی کا کھیل ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی اخبار کی اشاعت کا سلسلہ شروع بھی ہو جاتا۔ بہر حال میرے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ محمد حسن نے اردو اکادمی کو اس حد تک فعال بنا دیا تھا کہ ان دنوں کسی رکشے والے سے اکادمی جانے کے لیے کہا جاتا تو وہ پلٹ کے نہ پوچھتا کہ اکادمی ہے کہاں۔

انھوں نے ایک ہفت روزہ پروگرام بنایا تو میں اسے کامیاب بنانے کے لیے جی جان سے لگ گیا۔ اس دوران اکادمی کا خبر نامہ روز نامہ بن گیا اور اس کی ادارت میرے سپرد کی گئی۔ اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل پر ایک کل ہند سمینار ہوا جس کا کنوینر میں ہی تھا۔ محمد حسن مجھے دن بھر کاموں میں لگائے رہتے۔ "لنچ" ہم لوگ حضرت گنج کے کپورس میں کرتے۔ ایک پیالی کافی، تھوڑے سے آلو چپس۔ ہوٹل کا بل وہی ادا کرتے۔ کتابوں کے میلہ کا بھی اہتمام کیا گیا، ایک مشاعرہ ہوا جس کی فہرست دیکھ کر دو افراد نے بذریعہ فون دریافت کیا کہ "مشاعرہ کتنے دن چلے گا؟"۔ بیت بازی کا مقابلہ ہوا جس کا اہتمام کاظم علی خاں نے کیا تھا، کتابوں، ادیبوں اور شاعروں اور ادب سے واقفیت میں اضافہ کے لیے ایک کوئز کا اہتمام کیا گیا جس میں رام لعل اور ڈاکٹر صبیحہ انور نے سرگرمی سے حصّہ لیا۔ اس سلسلے کے سارے سوالات انھی دونوں نے تیار کیے۔ شامِ افسانہ کی محفل بھی آراستہ کی گئی۔

اردو پبلشرز کے منشی امیر علی نے بھی کتابوں کے میلے میں اپنے ادارہ کا اسٹال لگایا۔ کسی نے شکایت کی کہ آپ کے یہاں کی کتابوں میں اغلاط بہت ہوتے ہیں کیا پروف ریڈنگ نہیں کی جاتی؟ انھوں نے جواب دیا، "سب کچھ ہم ہی پڑھ لیں گے تو کتاب کے لیے پیسے خرچ کرنے

والا کیا پڑھے گا۔"

ان سب کے علاوہ شہر میں شاید پہلی بار Light and Sound کی تکنیک سے اردو کی کہانی پیش کی گئی جس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کا پاس حاصل کرنے کے لیے اکادمی کے قیصر باغ کے دفتر کے سامنے سے گول چوراہے تک دوہری قطار لگتی۔ اس پروگرام کے روحِ رواں شہاب جعفری تھے۔

اکادمی کے پروگراموں میں میری شب و روز کی مشغولیت نے افواہوں کے بازار گرم کردیے۔ میں اس وقت چوں کہ اکادمی کی مجلس عام کا ممبر بھی نہیں تھا اس لیے کہنے والے کہتے کہ کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوگا ہی ورنہ کوئی خواہ مخواہ دن رات یوں تھوڑی کام میں لگا رہتا ہے۔ ان دنوں سب سے زیادہ قابلِ قبول افواہ یہ تھی کہ اکادمی کا اگلا سکریٹری میں ہی ہوں گا اور لطف کی بات یہ ہے کہ بہتیروں نے اسے آسمانی سچ کی طرح تسلیم کرلیا تھا، یہ سوچے بغیر کہ سکریٹری ہونے کے لیے سرکاری ملازم ہونا ضروری ہے اور میں اس ملازمت کے امیدوار ہونے کی عمر بھی برسوں پہلے پار کر چکا تھا۔ خیر یہ "الزام" تو کسی طرح برداشت کرلیا لیکن ایک بڑی مصیبت ابھی انتظار میں تھی۔ کتابوں کے انعامات کے اعلان کا وقت آیا تو لوگوں نے محمد حسن سے سفارش کے لیے مجھے گھیرنا شروع کیا۔ مجھے سفارش کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن ان کے بارے میں یہ ضرور معلوم تھا کہ شہر میں ان کی کتابوں کے ناشر کی پرزور سفارش کا انھوں نے جواب تک نہ دیا تھا۔ آخر ان صاحب نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے ان کے اصرار پر فون کیا تو انھوں نے کہا کہ خط میں جو حصہ میرے کام کا تھا وہ میں نے پڑھ لیا اور اس میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی، اس کے علاوہ اس میں کیا لکھا تھا مجھے معلوم ہی نہیں۔

بہتوں کو تو کسی نہ کسی طرح ٹال دیا لیکن ایک صاحب سے جن کے ساتھ قومی آواز میں کام کر چکا تھا جان چھڑانے میں کسی طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ انھوں نے اپنا شعری مجموعہ مجھے عنایت کیا تھا۔ اچھا تھا اور میرا خیال تھا کہ اسے انعام ضرور ملے گا۔ اس زمانے میں کتابوں پر کم سے کم ایک نظر ڈالے بغیر ان کی قدر و قیمت متعین نہیں کی جاتی تھی۔ میں نے اپنی مجبوری بیان کردی لیکن وہ کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور صبح شام چکر لگا لگا کر انھوں نے مجھے پریشان کردیا۔ آخر ایک دن عاجز آ کر میں نے دروغِ مصلحت آمیز سے کام لیتے ہوئے ان سے کہہ دیا کہ بھائی اشارتاً میں نے ذکر کردیا ہے لیکن کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ وہ اسی پر خوش

ہو گئے، بولے آپ کا اشارہ ہی کافی ہے۔

انعامات کا اعلان ہوا تو ان کے شعری مجموعے کو اچھا خاصا بڑا انعام ملا جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا۔ وہ ''شکریہ'' ادا کرنے بھی نہیں آئے، پھر بھی میں خوش تھا کہ حق بہ حقدار رسید لیکن ایک غم بھی تھا اور وہ اس خوشی سے بڑا تھا کہ میری مروّت، کمزوری اور جرأتِ انکار کی کمی سے ایک شاعر اپنے شعری مجموعے کی قدردانی پر بجا طور پر خوش ہونے سے محروم رہ گیا۔ اس کے دل میں تو یہ کانٹا ہر دم کھٹکتا رہے گا ہی کہ یہ ثمرۂ خوبی نہیں ثمرۂ سفارش ہے۔

ان دنوں ریاست میں جنتا پارٹی کی حکومت تھی۔ محمد حسن نے اردو کے مسائل کے سلسلے میں جے پرکاش نرائن سے ملاقات کر کے انھیں بہت سے مطالبات کے لیے ہمنوا بنالیا اور شاید انھیں کے اشارے پر ریاستی حکومت اردو کی تعلیم کے سلسلے میں شکایتیں دور کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ اس سلسلے میں فیصلہ یہ ہوا کہ حکومت، محکمۂ تعلیم اور اردو اکادمی کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل کمیٹی ان تمام اسکولوں اور کالجوں کا معائنہ کر کے جہاں اردو کی تعلیم کی سہولت نہیں ہے لیکن اردو پڑھنے والے موجود ہیں اور اردو ٹیچر کی تقرّری کا اسی وقت فیصلہ کرے۔ حکومت اس فیصلے کو ماننے کی پابند ہوگی۔

اردو اکادمی اور محکمۂ تعلیم نے تو اپنے نمائندے فوراً مقرر کر دیے لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی جب حکومت نے اپنا نمائندہ مقرر نہیں کیا تو محمد حسن نے بطور احتجاج چیرمین شپ سے استعفا دے دیا۔

نو اودے ودّیالئے

برسوں بعد وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے سارے ملک میں نو اودے ودّیالیوں کا سلسلہ شروع کیا تو ہندی ریاستوں سے اس کو تعاون ملا لیکن جنوبی ہند کی ریاستوں نے نہ صرف کسی جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ راہ میں روڑے ہی اٹکائے۔ ان اسکولوں کے لیے ریاستی حکومتوں کو صرف جگہ کا انتظام کرنا تھا جس کی خریداری کی رقم یا کرائے کی ادائیگی مرکزی حکومت کی ذمے داری تھی۔ اس کے باوجود ''غیر ہندی'' ریاستیں ٹال مٹول سے کام لے رہی تھیں۔ سبب اس کا یہ تھا کہ ان کے خیال میں یہ اسکول دراصل ہندی رائج کرنے کے لیے کھولے جارہے تھے۔ لیکن مرکزی حکومت کے اس منصوبے کو اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش اور

راجستھان وغیرہ میں خوب خوب تعاون ملا۔ دوسری ریاستوں کا حال نہیں معلوم لیکن اتر پردیش کے کسی نودے وڈیالے میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہ تھا۔ دھیرے دھیرے یہ بات پھیلی تو اردو والوں اور یو پی اردو اکادمی کو تشویش ہوئی اور اس نے محبانِ اردو کا ایک جلسہ قیصر باغ کے اپنے دفتر کے ہال میں کیا۔ اردو کی طرف حکومت کا رویہ، معاندانہ نہیں تو عدم دلچسپی کا ہمیشہ ہی سے تھا، اور ان اسکولوں میں، کم سے کم یو پی کی حد تک، خاص بات یہ تھی کہ ان میں ایسی زبانوں کی تدریس کا بھی اہتمام تھا جو ریاست میں بالکل ہی بولی نہیں جاتیں۔

میرا خیال تھا کہ اردو اکادمی کی مجلسِ عاملہ نے نو اودے وڈیالئے اسکیم کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہوں گی اور اس سلسلے کے جلسہ میں دھواں دھار تقریروں کے باوجود صحیح قدم اٹھایا جائے گا لیکن جب تقریباً کیا، مکمل اتفاق رائے ہو گیا کہ اکادمی کا وفد ریاستی وزیر تعلیم کو ایک یادداشت پیش کرے تو میں نے صدر جلسہ سے چند جملوں میں اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت مانگی اور کہا کہ اس اسکیم کا ریاستی وزیر تعلیم اور حد یہ ہے کہ ریاستی حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اسکیم مرکزی حکومت کی ہے اور ریاستی حکومتوں سے صرف عمارت یا عمارت کے لیے زمین فراہم کرنے کی امید کی جاتی ہے۔ وزیر تعلیم نرسمہاراؤ نے اپنے ایک بیان میں یہ تک کہا ہے کہ ریاستی حکومت سے تعاون نہ ملنے کی صورت میں مرکزی حکومت خود زمین یا عمارت حاصل کر کے یہ اسکول کھولے گی۔ اس لیے اکادمی کو چاہیے کہ میمورنڈم پیش کرنے کے لیے مرکزی وزیر تعلیم سے ملاقات کا وقت مانگے۔ اس اطلاع کے بعد پورا منظر نامہ ہی بدل گیا اور جلسے نے مرکزی وزیر تعلیم کو یادداشت دینے کا فیصلہ کیا۔

یادداشت تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی گئی اور اس کا ڈرافٹ تیار کرنے کا کام میرے سپرد ہوا۔ اس یادداشت کو حتمی شکل دینے کے لیے کئی میٹنگیں ہوئیں اور اس سلسلے کا آخری جلسہ بیگم حامدہ حبیب اللہ کے یہاں ہوا۔

مرکزی وزیر تعلیم سے وقت ملنے میں دیر لگی اور اس دوران اکادمی کی مدتِ کار ختم ہونے کے بعد نئی کمیٹی تشکیل دے دی گئی اور میں اس کی جنرل کونسل کا رکن بھی شاید نہ رہ گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے صدر اور وائس چیرمین کے عہدہ پر بیگم حامدہ حبیب اللہ اور ڈاکٹر محمود الٰہی برقرار رہے جس سے کاموں میں تسلسل قائم رہا۔

مرکزی وزیر تعلیم سے ملاقات کا وقت طے ہو جانے کا علم مجھے ڈاکٹر محمود الٰہی کے ایک

خط[1] سے ہوا جس میں انھوں نے دریافت کیا تھا کہ کیا میں وفد کے رکن کی حیثیت سے دہلی جانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے حیرت بھی تھی اور خوشی بھی کہ اکادمی سے باقاعدہ متعلق نہ ہونے کے باوجود مجھے وفد میں شامل کیا گیا ہے۔

یہ وفد آٹھ یا نو ممبروں پر مشتمل تھا جن میں سے دو یا تین کسی سبب شامل نہ ہو سکے اور ایک صاحب وائس چیرمین سے تو تو مَیں مَیں کے بعد واپس آ گئے۔

یہ ملاقات شاستری بھون میں ہوئی، جگہ دو بار تبدیل ہونے اور وزیر تعلیم کی مصروفیت کے سبب خاصی دیر کے بعد۔ بہر حال، ہم لوگوں نے یادداشت پیش کی تو انھوں نے توجہ سے اس کا مطالعہ کیا۔ بات چیت شروع ہوئی تو ایک صاحبہ نے اردو کے مسئلے پر بات کرنے کے بجائے یہ یاد دلایا کہ وہ ریاستی حکومت میں وزیر رہ چکی ہیں۔ ایک صاحب نے کانگریس کی صد سالہ تقریبات میں جو ممبئی میں ہوئی تھیں ان سے ملاقات کا ذکر کیا۔ لیکن جیسے ہی نو اودے وڈیالوں میں اردو کی تعلیم کا ذکر آیا نرسمہا راؤ نے پنجہ مارا۔

انھوں نے کہا کہ مجھے مولوی صاحب رکھ کر اردو پڑھائی جاتی تھی جب کہ مردم شماری کے کاغذات میں میری مادری زبان اردو لکھی تھی۔ یہ ردعمل تھا میمورنڈم میں ایسی بڑی آبادی کے ذکر کا جس کی مادری زبان اردو ہے۔ مجھے نرسمہا راؤ کی یہ بات بہت بری لگی لیکن اس سے زیادہ افسوس ہوا اس پر کہ وفد کے سینئر اراکین میں سے کسی نے اس کا جواب دینے کے بجائے مسکراتے رہنے کو ہی کافی سمجھا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور وزیر باتدبیر سے ''عرض'' کیا کہ مادری زبان کے معنی ہیں بچّے کی ماں کی زبان اور آپ کی والدہ اردو بولتی ہوں گی اس لیے آپ کی مادری زبان اردو سمجھی گئی۔ بچّے کی مادری زبان کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ ماں کے پیٹ سے عالم و فاضل بن کر پیدا ہوتا ہے۔ خود اتر پردیش میں جہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے، ان طالب علموں کو جن کی مادری زبان ہندی بتائی جاتی ہے، کلاس روم میں جل کے معنی پانی اور وایو کے معنی ہوا بتائے جاتے ہیں۔

میری اس بات سے نرسمہا راؤ حیرت زدہ (میرے خیال میں Taken aback زیادہ مناسب ہوگا) رہ گئے اور انھیں جواب کے لیے تیار ہونے میں کچھ وقت لگا۔ آخر میں انھوں نے

۱۔ خط کے لیے دیکھیے آخر کے صفحات۔

کہا کہ میں اس وزارت میں دو مہینے بھی رہ گیا[1] تو ان سارے علاقوں کے اسکولوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد ہے اردو کی تعلیم کی سہولت فراہم کردوں گا۔ نرسمہا راؤ سے یہ ملاقات ۱۴ر نومبر ۱۹۸۶ء کو ہوئی تھی۔

بعض معاملات میں نرسمہا راؤ کا کردار بہت خراب رہا لیکن اس معاملے میں تعریف کرنا ہوگی کہ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اردو علاقوں کے بیشتر نو ودے وِدیالے اسکولوں میں اس کی تعلیم کا انتظام کردیا۔

ہم لوگ جیسے ہی وزیر تعلیم کے کمرے سے باہر نکلے، وفد کے دو اراکین مجھ پر برس پڑے، ''مرکزی وزیر سے اس طرح بات کی جاتی ہے، وہ اگر اسی وقت سارے وفد کو کمرے سے باہر کردیتا تو...''

''ایسا ہوتا تو''، میں نے جواب دیا، ''ہم باہر آجاتے لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ ان اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہوا تو یہی انداز اختیار کرنے کے سبب ہوگا۔''

محمود الٰہی صاحب نے معاملہ ٹھنڈا کرادیا اور بیگم حامدہ حبیب اللہ نے کناٹ پیلس کے ایک ہوٹل میں پرتکلف ظہرانہ دیا۔ میں کامیابی کا سہرا اپنے سر ہرگز نہیں باندھنا چاہتا۔ میمورنڈم بے حد مدلل تھا، مطالبات جائز تھے اور وفد میں باوقار لوگ شامل تھے۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ ہمیں اپنے مطالبات واضح الفاظ میں پیش کرنا چاہیے۔ ذاتی تعلقات دلائل کے نعم البدل کبھی نہیں ہوسکتے۔

نائب صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ''الہلال'' کی رسم اجراء کے موقع پر بھی میں دہلی میں اردو اکادمی کے وفد میں شامل تھا۔ اس کا ذکر کہیں اور کیا گیا ہے۔

وظیفہ کمیٹی

اردو اکادمی میں وظیفہ کمیٹی کی رکنیت سے سب لوگ بچنے کی کوشش کرتے۔ کام مشکل تھا اور بے ایمانی یا کم سے کم لاپروائی کا الزام آسانی سے لگ سکتا تھا لیکن کمیٹی تو بہرحال بننا ہی تھی، سوبنی اور صباح الدین عمر، شجاعت علی سندیلوی اور مجھے اس کا رکن بنایا گیا۔ اسکالرشپ کی ایک ایک درخواست کا اس کے زمرے کی دوسری ساری درخواستوں سے موازنہ کرنا پڑتا، نہ صرف اردو

۱۔ اس زمانے میں راجیو گاندھی وزیراعظم تھے اور وزرا کے قلمدان جلدی جلدی تبدیل ہورہے تھے

کے نمبر بلکہ کئی اور بھی چیزیں دیکھنا پڑتیں۔ پہلی میٹنگ ہی میں اندازہ ہو گیا کہ تین چار نشستیں کرنا پڑیں گی اور ہر نشست میں تین گھنٹے سے کم نہ لگیں گے۔

میں صباح الدین صاحب کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا، بس یونہی، کوئی خاص وجہ نہ تھی علاوہ اس کے کہ وہ صلاح الدین بھائی کے بڑے بھائی تھے۔ لیکن کام کرتے کرتے دو گھنٹے ہو گئے تو طلب بڑھی۔ میں باہر جا کے دو چار کش لگانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ صباح الدین صاحب نے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ اب صبر کا یارا نہ رہا۔ ایک سگریٹ مانگ ہی لی۔ انھوں نے گھور کے دیکھا اور سگریٹ بڑھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے پان کی ڈبیہ کھولی اور پان مُنہ میں رکھ لیا۔ میں نے کہا تو کچھ نہیں لیکن ہاتھ بڑھا دیا۔ اب انھوں نے زیادہ دیر تک گھور کے دیکھا اور پان دیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ پان بھی کھاتے ہیں؟" آواز سخت تھی اور چہرے پر تناؤ۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جونہی انھوں نے ڈبیا سے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں تمبا کو گرائی میں نے اپنا ہاتھ پھر بڑھا دیا۔

اب ان کے غصّے کا پارا ایک دم چڑھ گیا اور انھوں نے نہایت سخت لہجہ میں کہا۔

"آپ تمباکو بھی کھاتے ہیں؟"

"میں ہر وہ کام کرتا ہوں جو آپ کرتے ہیں،" میں نے کہا۔

"تب تو مجھے انیس سے شکایت کرنا پڑے گی،" بے ساختہ ان کے مُنہ سے نکل گیا لیکن جوں ہی اس کے معنی سمجھ میں آئے تو ہنسنے لگے۔ پھر تو یہ ایک طرح سے ان کی چڑ بن گیا اور دھیرے دھیرے وہ اس کے ایسے عادی ہو گئے کہ مجھ سے پورا واقعہ دوسروں کو سنانے کی فرمائش کرنے لگے۔

اکادمی کے دنوں کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب انیس اردو میں ایم۔ اے۔ کر رہی تھیں۔ میں کبھی کبھی ان کو اسکوٹر سے یونیورسٹی پہنچا آتا اور اگر ایک آدھ ہی کلاس ہوتا تو اسٹاف روم میں بیٹھ کر کلاس ختم ہونے کا انتظار کرتا۔ اس دن مجھے اردو اکادمی میں کوئی کام تھا۔ چنانچہ واپسی میں اکادمی چلا گیا۔ اتفاق سے تھوڑی دیر میں شبیہ الحسن اور ملک زادہ منظور احمد بھی وہیں آ گئے۔ ان دنوں سکریٹری عزیز الجبار تھے اور وہ کسی مسودہ کی طباعت کے لیے امداد سے متعلقہ فائل دیکھ رہے تھے۔ اس

میں کوئی راز کی بات تھی نہیں۔ ملک زادہ صاحب کی جیسے ہی نظر پڑی انھوں نے کہا میں بھی سوچتا ہوں کہ اپنا شعری مجموعہ چھپوالوں۔

''ضرور، نیک کام میں دیر کا ہے کی،'' شبیہ الحسن صاحب نے کہا۔

''لیکن مجموعہ بے حد مختصر ہوگا'' ملک زادہ نے کسی قدر افسوس کے ساتھ کہا۔

''اس میں کیا پریشانی ہے،'' شبیہ الحسن نے مشورہ دیا، ''مقدمہ شعروشاعری شامل کر لیجیے گا۔''

زور دار قہقہہ بلند ہوا۔ ہم سب تو ہنس رہے تھے لیکن انیس سے نہ ہنستے بنتا تھا نہ ہنسی روکتے۔ دونوں ہی ان کے استاد تھے۔

◆◆◆

کمیونسٹ پارٹی اور مَیں

میں کمیونسٹ پارٹی کا باقاعدہ ممبر کبھی نہیں رہا اور نہ میں نے کبھی اس کا دعوا کیا، الا ایک بار کے اور وہ بھی اس وقت جب اس دعوے سے نیشنل ہیرالڈ میں ملازمت کے امکانات خطرے میں پڑ سکتے تھے۔ انگریزی میں پوچھا گیا تھا، ''تمھارے سیاسی خیالات کیا ہیں؟''

میں نے جواب دیا، "I am a committed Leftist"

دریافت کیا گیا۔ "What does it mean?"

میں نے جواب دیا، "A cardholder"

مقصد صرف یہ تھا کہ مستقبل میں کبھی کمیونسٹ پارٹی سے اپنے گہرے تعلق کے چھپانے کا الزام نہ آئے...اور ان سارے برسوں میں کتنے Committed Leftist, بھی cardholder رہ گئے!

لیکن میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر رہا ہوں یا نہ رہا ہوں، پارٹی نے مجھے ہمیشہ اپنا سمجھا اور میں نے پارٹی کو، اس حد تک کہ اس سے تعلق کے سبب دو مرتبہ جیل گیا اور ایک مرتبہ بہ حیثیت صحافی، کرفیو پاس رکھنے کے باوجود طلبا کی تحریک میں گرفتار کیا گیا اور اب بھی پارٹی کے ایک معمولی سے اشارے پر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر سکتا ہوں۔ پارٹی ممبر نہ ہونے کے باوجود اس وقت تک جب ہیرالڈ میں تنخواہیں نہ ملنے، ہڑتالوں اور تالا بندیوں کا سلسلہ شروع ہوا پارٹی کی لیوی (Levy) برابر ادا کرتا رہا۔

کمیونسٹ پارٹی نے بھی میرے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا۔ جبل پور فسادات کے بعد کمیونسٹ ممبران پارلیمنٹ کی اس تحقیقاتی رپورٹ کا، جو پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تھی، ترجمہ کرنے اور کتابچہ چھاپنے کا کام میرے سپرد کیا۔ یہ بات شاید اس وقت کی ہے جب میں ہیرالڈ میں کام سیکھ رہا تھا یا نیا نیا وہاں گیا تھا۔

کتابچے دو ہزار کی تعداد میں چھپنے تھے۔ پارٹی نے پچاس روپے دیے تھے۔ باقی سب کچھ مجھے کرنا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ احتشام صاحب اور دانش محل کے نسیم صاحب نے پانچ پانچ روپے دیے تھے۔ اس سے پہلے نہ میں نے کبھی کاغذ خریدا تھا، نہ کتابت کرائی تھی، نہ پریس کا کوئی تجربہ تھا۔ کتابت ہنا صاحب نے کی تھی، بہت تیز لکھتے تھے۔ وقت کم تھا۔ کتابچہ عید سے دو دن پہلے پارٹی آفس پہنچا دیا تھا اور یہ پمفلٹ عیدگاہ، آصفی امام باڑے اور شاید ٹیلے والی مسجد کے باہر تقسیم ہوا تھا۔

اس سلسلے میں مزے کی ایک بات یہ ہے کہ عید ہی کے دن شہر کے ایک رئیس کے حواریوں نے یہ خبر پھیلا دی تھی کہ اس کتابچہ کی اشاعت کے اخراجات انھوں نے برداشت کیے ہیں، جب کہ ان سے تعاون بھی نہیں مانگا گیا تھا۔

پھر جب میں ہیرالڈ میں تھا اور بنارس ایک یک۔طرفہ فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہوا تو ریاستی کمیونسٹ پارٹی نے ایک سہ رکنی تحقیقاتی کمیٹی کی تشکیل کی اور پارٹی ممبر نہ ہونے کے باوجود مجھے اس کا رکن بنایا۔ ایک رکن مولانا اسحاق سنبھلی تھے، تیسرے کا نام نہیں یاد۔ ہم لوگوں نے بنارس میں درجنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ رستم سیٹن اور نذیر بنارسی سے ملاقات کی تھی۔ ان دونوں کے گھروں کی دو دو باتیں یاد ہیں۔ رستم سیٹن کا مکان بڑا تھا، باہر کا کھلا ہوا حصہ بھی خاصا بڑا تھا۔ سینہ کے برابر اونچی ایک دیوار پر چند گملے رکھے ہوئے تھے اور انھوں نے ہمارے بے حد اصرار کے باوجود فسادات کی مذمّت میں بیان جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ سینڈیکیٹ ودھایک دل کی حکومت میں نائب وزیر داخلہ رہ چکے تھے۔ اس رپورٹ یا فسادات سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن ان کے وزیر ہونے کے چند ہفتوں بعد کا ایک واقعہ ڈاکٹر کے۔ کے۔ مسرا نے سنایا تھا۔ ''مے فیر'' کے سامنے، سڑک کی دوسری جانب، ایک دوکان میں جس میں گیس کے چولھے بھی فروخت ہوتے تھے وہ یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے تھے ... ''ڈپٹی ہوم منسٹر رستم سیٹن۔''

نذیر بنارسی کے مکان کا دروازہ بہت بڑا تھا، نیچے ایک کمرے میں بھرے ہوئے بورے رکھے تھے، معلوم نہیں ان میں کیا بھرا تھا۔ وہ فسادات سے پہلے خود کو وزیر اعلیٰ کملا پتی ترپاٹھی کا بے حد قریبی دوست سمجھتے تھے لیکن ملاقات کے دوران انھوں نے کہا تھا، ''فسادات پر مسلمانوں کا میمورنڈم جو میں نے پیش کیا تھا اس نے چوتڑ کے نیچے رکھ لیا اور کھول کے نہ دیکھا۔''

پریس کلب

اسی سال یا ایک آدھ سال بعد رمیش پہلوان (روزنامہ نوجیون کے چیف سب) اور چند دوسروں نے یوپی پریس کلب کی صدارت کے امیدوار کے طور پر میرا پرچۂ نامزدگی داخل کر دیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے بشن کپور سے جو میرے حریف تھے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے اور واپسی عین الکشن کے دن ہونی تھی۔ اس الکشن میں اہم یہ نہیں کہ میں کامیاب ہوا اور بشن کپور نے بھی اعلان کر کے مجھے ووٹ دیا، اہم یہ ہے کہ ضلع کمیونسٹ پارٹی نے جس کے پاس اس انتخاب میں سترہ یا انیس ووٹ تھے، کوئی حکم نامہ جاری نہیں کیا جب کہ بشن کپور پارٹی ممبر اور جرنلسٹ فریکش کے رکن تھے اور میں صرف ایک ہمدرد۔

لکھنؤ میں ریاستی کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس ہوئی تو ایک مشاعرہ ہوا جس میں مخدوم محی الدین نے شرکت کی۔ یہ وہی کانفرنس تھی جس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر یشپال جی تھے اور حیات اللہ انصاری نے اپنے تین مسلسل اداریوں میں کمیونسٹ پارٹی کو اردو دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اس موقع پر مقامی پارٹی کے سکریٹری بابو خاں کی جانب سے اس اداریے کا طویل جواب قومی آواز کے خطوط کے کالم میں شائع ہوا۔ یہ جواب میں نے ہی لکھا تھا۔

اس موقع کے مشاعرے کا، جو سفید بارہ دری یا اس سے متصل پارک میں ہوا تھا، کنوینر یہ حقیر فقیر ہی تھا۔ اس مشاعرہ میں مخدوم محی الدین شریک ہوئے تھے۔

۱۹۸۵ء میں جب حالات سے مجبور ہو کر میں نیشنل ہیرالڈ سے مستعفی ہوا اور اس کی خبر ''اجے بھون'' پہنچی تو قومی کونسل کے ممبر اتل کمار انجان مجھ سے ملاقات کرنے دو بار لکھنؤ آئے اور پارٹی نے ۲۵۔ بارہ کھمبا روڈ پر میری ملازمت کا انتظام بھی کر دیا۔ ایک رسمی انٹرویو بہر حال ہونا تھا... وہاں میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو میرے ساتھ ہیرالڈ میں کام کر چکا تھا، کثیر العیال تھا اور میرے خیال میں مجھ سے زیادہ ضرورت مند۔ میں واپس چلا آیا۔ اتل کمار انجان اس سلسلے میں مجھ سے کافی دنوں ناراض رہے۔ یہ بات ۱۹۸۶ء کی ہے۔

۲۰۰۶ء میں ایک میمورنڈم لے کر میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری اے۔ کے۔ بردھن سے ملنے اجے بھون گیا تو انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا، "How do I know you?"

میں نے جواباً کہا۔

"Whenever you would go to Ganga Parsad Memorial..."

"Abid Shuhail, Nusrat Pulishers?"

"Yes" ہم دونوں نے دوبارہ ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔

بردھن صاحب پہلی بار اتل کمار انجان کے ساتھ آئے تھے، نیشنل ہیرالڈ سے میرے مستعفی ہونے کے بعد۔ دوسری بار ماسکو کی رادوگا پبلشنگ ہاؤس کی اعلیٰ افسر ایس۔ بردوکوا کے ساتھ آئے تھے۔ رادوگا پبلشر کو مشورہ دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں روس کی اردو کتابوں کی تقسیم کا کام نصرت پبلشرز کے سپرد کر دیا جائے۔ میں تیار نہ ہوا، اس خیال سے کہ کتابیں دوکانوں پر تقسیم تو کر دی جائیں گی لیکن وہاں سے رقوم وصول نہ ہوئیں تو خواہ مخواہ بدنامی میری ہوگی۔ موصوفہ نے دارالاشاعت ترقی، ماسکو، کی کتاب ''مہ و سال آشنائی'' کا ایک نسخہ اردو میں اپنے دستخط کر کے مجھے دیا تھا۔ افسوس وہ کتاب جانے کیا ہوئی۔ تعریف کا پہلو نکلتا ہے، لیکن یہ بات لکھ ہی دوں۔ رادوگا پبلشرز کے ہندوستانی شعبے کی سربراہ نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا ''آپ ہیں عابد سہیل جن کا نام ماسکو سے سنتی آ رہی ہوں۔'' ماسکو سے ان کی مراد رادوگا پبلشرز رہی ہوگی۔ بردوکوا حسین و جمیل تھیں۔

اے۔ کے۔ بردھن صاحب نے مجھ سے ''نیو ایج'' (New Age) کے لیے کبھی کبھی کچھ لکھنے کے لیے کہا تو میں نے ساہتیہ اکادمی کے سجاد ظہیر سیمنار کی تفصیلی رپورٹ کے علاوہ رشید جہاں کے صد سالہ جشن پیدائش کے سلسلے کے دو جلسوں کی رپورٹیں ''نیو ایج'' کے لیے لکھیں جو اس ہفت روزہ میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد میں ڈاکٹر علیم کے مونوگراف، جو ساہتیہ اکادمی نے چھاپا، ان کے مضامین کے انتخاب جو نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کیا، دو جلدوں میں کلّیات جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں برسوں سے زیر اشاعت ہے اور دو سیمناروں میں، جن میں سے ایک میں خطبہ پروفیسر عرفان حبیب نے دیا تھا، ایسا مصروف ہوا کہ ان کے بارے میں نیو ایج میں ایک لفظ نہ لکھ سکا۔

کمیونسٹ پارٹی سے میرا غیر رسمی تعارف ۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء میں اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے ذریعے ہوا تھا۔ اس طرح ۲۰۱۰ء جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اس تعلقِ خاطر کی گولڈن جبلی کا سال ہے۔

کمیونسٹ پارٹی سے تعلق یا اس کے توسط سے کبھی کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا، حد یہ ہے کہ کسی کمیونسٹ ملک کا دو چار دن کا دورہ بھی نہیں کیا۔ ایک بار ISCUS (انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی) کی ریاستی کمیٹی نے روس کے دورے کے لیے مجھے یو پی کے نمائندے کے طور پر منتخب کیا تھا۔ اس کا تحریری اطلاع نامہ میرے عزیز دوست کے۔ این۔ ککڑ لے کر خود نیشنل ہیرالڈ آئے تھے۔ کچھ دنوں بعد سوویت یونین کے سفارت خانے سے بذریعہ فون وہاں کی سردی، کپڑوں کی ضرورت، وفد کی روانگی کی عارضی طور پر معینہ تاریخ اور دوسری باتوں سے مطلع کیا گیا تھا۔ یہ وفد حکومت سوویت یونین کی دعوت پر روس گیا تھا... لیکن اس اطلاع کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

کئی ماہ بعد دہلی جانا ہوا تو پتہ چلا کہ ایک صاحب نے جو روسی سفارت خانے کے بہت قریب تھے میرے بجائے اپنے کسی نمائندے کو بھیج دیا۔ ان کرم فرما سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنے دولت خانے پر مدعو کیا۔ میں نے حاضری بھی دی لیکن اس محنت کش اور غریب کمیونسٹ، کے خوان یغما سے اپنے کام و دہن کو آلودہ نہ کر سکا۔ اس مکان کی آرائش و زیبائش اور مشروبات وفواکہات دیکھ کر سوچنے پر مجبور ہو گیا، ''ہائے میں تو کمیونسٹ بھی نہ ہو پایا۔''

میں جن دنوں کمیونسٹ پارٹی کے قریب آیا شہر میں پارٹی کے پاس دو دفتر تھے۔ ایک امین آباد میں وہاب اینڈ سنس کے سامنے، اسٹیشن جانے والی سڑک کی دوسری جانب۔ راستہ گلی سے ہو کر تھا اور دوسرا مہدی بلڈنگ میں، جو قیصر باغ کے پاس لاٹوش روڈ کے تقریباً شروع میں، بائیں جانب کی عمارت کی پہلی منزل پر تھا۔ پہلے والے دفتر میں دو کمرے تھے اور کھلی چھت۔ یہ شاید اسٹوڈینٹس فیڈریشن کا دفتر تھا۔ پہلی بار فیڈریشن کے جلسے میں شرکت میں نے مہدی بلڈنگ ہی میں کی تھی۔ اوّل الذکر عمارت کی کہانی خاصی دلچسپ ہے۔

جن دنوں کمیونسٹ پارٹی نے کانگریس کی طرح مسلم لیگ میں کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا، فضل عباس کاظمی باقاعدہ طور سے پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ وجیہہ، عمدہ مقرر اور وکیل ہونے کے سبب جلد ہی مسلم لیگ کی شہر کمیٹی کے سکریٹری یا صدر منتخب ہوئے۔ غرض دفتر انھی کے نام تھا۔ ۱۵/اگست کو یا اس سے بھی پہلے جب مسلم لیگ منظرنامے سے غائب ہو گئی تو ایک رات انھوں نے مسلم لیگ کا جھنڈا اتارا اور کمیونسٹ پارٹی کا جھنڈا لہرا دیا۔ کئی برس تک اس عمارت کی پہلی منزل کمیونسٹ پارٹی کے قبضے میں رہی۔ کامریڈ شریمالی، ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد اور بی۔ ٹی۔ رندیو کے

بعد پارٹی کے جنرل سکریٹری اجے گھوش کو میں نے پہلی بار یہیں دیکھا تھا۔ پارٹی کا ایک اور دفتر
اس جگہ تھا جہاں شری رام روڈ لاٹوش روڈ سے ملتی ہے، پیپل کے درخت کے پاس۔ انردھ گپتا کو
پہلی بار میں نے یہیں دیکھا۔

ان دنوں کانپور میں مزدوروں کے مقبول ترین لیڈر مولانا یوسف تھے۔ ان کی گرفتاری
کے بعد ہم لوگوں نے درجنوں نکڑ میٹنگوں میں ''جیل کے پھاٹک ٹوٹیں گے، مولانا یوسف چھوٹیں
گے'' کے نعرے لگائے تھے۔ میں نے ایک بار دوہرے بدن کے مولانا کامریڈ یوسف کو رکاب گنج
کے سابقہ پل پر دیکھا تھا۔ اس وقت ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری تھا اور وہ روپوش
(Underground) تھے (معلوم نہیں لوگ Underground کا مضحکہ خیز ترجمہ ''زیر زمین''
کیوں کرتے ہیں؟) میں نے وہاں انھیں دیکھ کر سمجھا تھا کہ حکومت انھیں گرفتار کرنے کی ہمت
نہیں کر پا رہی ہے اور فخر محسوس کیا تھا۔

مولانا یوسف کی کہانی بھی خاصی دلچسپ ہے۔ وہ سکھ تھے اور پنجاب کے رہنے
والے۔ وہاں ان کا وارنٹ جاری ہوا تو وہ کئی شہروں کا چکّر لگا کر کانپور آئے اور مولانا یوسف
ہو گئے۔ پھر مسلمان کمیونسٹ مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے تو وہ شہر مسلم لیگ کے کسی اعلیٰ عہدے
پر فائز ہو گئے اور آزادی کے بعد کمیونسٹ پارٹی تو تھی ہی۔ ایک بار وہ کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر
ریاستی اسمبلی کے لیے منتخب بھی ہوئے تھے، مرتے مر گئے لیکن رہے ہمیشہ مولانا یوسف ہی۔ معلوم
نہیں ان کے آخری رسوم کس طرح ادا کیے گئے تھے۔

◆◆◆

چہ دلاوراست دزدے

تقریباً بیس پچیس برس قبل، یا شاید اس سے بھی پہلے، میں نے ایک کہانی لکھی۔ عنوان تھا "راہیں، سمتیں، راستے"۔ یہ افسانہ سب سے پہلے ریڈیو سے نشر ہوا۔ کئی ماہ بعد میں نے نظر ثانی کی اور اسے "نیا دور" میں اشاعت کے لیے دے دیا۔ دو تین سال بعد لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ایک عجیب وغریب پیش کش کی: مجھے آدھے گھنٹے کا وقفہ دیا اور وہ بھی اس طرح کہ ڈرامہ لکھنے، کرداروں کے انتخاب، ریہرسل اور پروڈکشن کی ذمہ داری بھی مجھ پر ڈال دی۔ اس پیش کش کو میں نے چیلنج کے طور پر قبول کیا اور اس افسانے کو ڈرامے کی شکل دے دی۔ ان دنوں شفاعت علی صدیقی اردو سیکشن میں پروگرام ایگزی کیوٹو تھے۔ انھوں نے ڈرامہ پسند کیا لیکن دو ایک ترمیموں کا مشورہ بھی دیا جو میں نے بہ خوشی قبول کرلیا۔ ان تبدیلیوں سے ڈراما زیادہ نکیلا ہوگیا۔ ریہرسل اور پروڈکشن میں بھی انھوں نے مدد کی، ڈرامے کی تعریف میں خاصے خطوط آئے۔ بعد میں مَیں نے اس کی ڈرامائی شکل "نیا دور" میں اشاعت کے لیے دے دی جو وہاں شائع ہوگئی۔

ایک دن اردو اکادمی (ان دنوں اکادمی کا دفتر قیصر باغ میں تھا) کے کسی جلسے میں ولایت جعفری نے جو اُن دنوں دوردرشن کے ڈائرکٹر تھے پوچھا، "سہیل صاحب ان دنوں کیا لکھ رہے ہیں؟" میں نے مذاقاً کہہ دیا، "آپ کے لیے ڈراما لکھ رہا ہوں" تو انھوں نے ڈرامے کے لیے تقاضا کرنا شروع کردیا۔ میں نے ٹی وی کے لیے کوئی ڈراما نہیں لکھا تھا چنانچہ ریڈیو والا مسودہ ہی میں نے انھیں دے دیا۔ خیال تھا کہ انھیں پسند نہ آئے گا اور میری جان چھوٹے گی۔ انھوں نے مسودہ پر ایک نظر ڈالی، ڈاکٹر رفیق خاں کو، جو اُن دنوں ڈرامے پروڈیوس کیا کرتے تھے، بلایا اور کہا اسے پڑھ لیجیے، سہیل صاحب یہیں بیٹھے ہیں۔" رفیق صاحب مسودہ لے کے چلے گئے۔ ولایت جعفری نے چائے منگائی اور چائے پیتے پیتے مجھ سے باتیں کرنے کے دوران فائلیں بھی نپٹانے لگے۔ تھوڑی دیر میں دفتر کے دو تین لوگ آگئے تو میں نے سوچا کہ ان کے کام میں زیادہ

مخل ہونا غلط ہے، کوئی بہانہ کر کے چلا آیا اور سیدھا رفیق خاں کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں پر ٹکائے مسودہ پڑھ رہے تھے۔ میں نے دھیرے سے کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا، اس وقت وہ مسودہ کا آخری یا اس سے پہلے والا صفحہ پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے آخری سطر تک مسودہ پڑھنے کے بعد سر اٹھایا تو مجھے دیکھ کر کہا، ''آپ کب آئے؟''

سچ پوچھیے تو میں مسودہ کے مطالعے میں ان کی محویت دیکھ کر بہت خوش تھا لیکن اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے جواب ٹال گیا۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا، ''اب اس کا اسکرین پلے لکھوانا ہوگا۔''

میں نے کہا، ''ڈراما مجھے دیجیے۔ میں ہی کوشش کر کے دیکھوں۔''

ٹی وی کے لیے اسکرین پلے لکھنا ایک بے حد تکنیکی کام ہے۔ انھیں میری اس پیش کش پر بجا طور پر حیرت ہوئی ہوگی۔ اس حیرت کو وہ چھپا نہ سکے اور انھوں نے پوچھا۔

''آپ نے پہلے کبھی اسکرین پلے لکھا ہے؟''

جواباً میں نے کہا، ''کبھی نہیں، لیکن سارے اسکرین پلے لکھنے والوں نے کبھی نہ کبھی تو یہ کام پہلی بار کیا ہی ہوگا؟''

رفیق خاں کو میرا جواب معقول معلوم ہوا اور انھوں نے مسودہ مجھے دے دیا۔

اس وقت تک اسکرین پلے کے بارے میں مجھے بس ایک بات معلوم تھی اور وہ یہ کہ اگلے منظر میں جو ہونے والا ہے اس کا ہلکا سا اشارہ اس سے پہلے والے سین کے آخر میں کرنا ضروری ہے۔ میرے خیال میں یہ بات اسکرین پلے کے سلسلے میں کنجی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کنجی سے اس مشکل کام کے سارے تالے نہیں کھل سکتے۔ چنانچہ میں نے اگلے ہی دن سے کوئی نہ کوئی سیریل صرف تکنیک کے نقطۂ نظر سے پانچ چھے دن تک دیکھ کر خاصا کچھ سیکھ لیا اور اپنے ڈرامے کا اسکرین پلے ایک ہفتے میں مکمل کر کے ڈاکٹر رفیق خاں کے حوالے کر دیا۔ تقریباً ایک مہینے بعد ایک دن مدرار انجھس سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ رفیق خاں تمھارے اسکرین پلے کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اور بقول مدرار انجھس انھوں نے کہا تھا، ''اسے ہندی میں کرا لوں تب تمھیں دکھاؤں گا، دیکھنا اسکرین پلے ایسے لکھا جاتا ہے۔''

ظاہر ہے یہ بات سننے کے بعد میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ کچھ دنوں بعد معاہدے کی کارروائی کا آغاز ہوا اور ابھی بمشکل اس کام کی تکمیل ہی ہوئی تھی کہ ایک دن رفیق خاں نے ٹیلی

فون کر کے بتایا کہ ''ڈراما اور اسکرین پلے پراسرار طور پر غائب ہو گئے ہیں۔ براہ مہربانی اسکرین پلے دوبارہ لکھ دیجیے، ڈرامے کی کاپی تو آپ کے پاس ہوگی ہی؟''

ڈرامے کی کاپی تو میرے پاس تھی لیکن اسکرین پلے دوبارہ لکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ مجھے یہ ڈر بھی ستا رہا تھا کہ ممکن ہے پہلی کوشش کی کامیابی محض اتفاق رہی ہو۔ میں نے کوشش ضرور کی لیکن دل نہ لگا اور پھر میں ایک شاندار موقع سے محرومی کے صدمے کو بھلانے کے جتن میں لگ گیا۔

شاید دو تین سال بعد ایک دن غلام عباس کا ایک افسانوی مجموعہ ہاتھ لگ گیا۔ میں یہ مجموعہ پہلے بھی پڑھ چکا تھا۔ میں نے ادھر ادھر سے افسانے پڑھنے شروع کیے لیکن ایک افسانہ پڑھنے کے دوران ہی بستر سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میرا افسانہ اور اس کی ڈرامائی صورت ان کے افسانے کے مرہون منت تھے۔

حیرت ہوئی، افسوس ہوا، شرمندگی ہوئی۔ تھوڑی دیر تک سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ پھر یکا یک اٹھا، اپنے کمرے میں گیا، الماری کا وہ خانہ کھولا جس میں مکمل اور نامکمل مسودات اور مطبوعہ چیزیں رکھی ہوئی تھیں، ''راہیں، سمتیں، راستے'' کا ایک ایک نشان، اس کی ایک ایک صورت نکالی اور ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ ایک خوشی تھی کہ ''چوری'' پکڑی نہ گئی لیکن ایک بات کا افسوس بھی تھا۔ ہزاروں نہ سہی تو سیکڑوں نے ضرور یہ افسانہ اور ڈراما پڑھا اور سنا ہوگا لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے غلام عباس کا افسانہ پڑھا ہو یا جسے ان کا افسانہ یا اس کا ایک آدھ کردار، ایک آدھ موڑ ہی یاد ہو۔

ممکن ہے دوردرشن اسے نشر کرتا تو ''چوری'' پکڑی جاتی، لیکن کون جانے؟

اس کاروبارِ ادب سے جس کے مال کا نہ کوئی خریدار ہے، نہ سینے سے لگانے والا، نہ پڑھنے والا، فائدہ؟ لیکن ریشم کا کیڑا پھر بھی ریشم بناتا رہے گا۔

◆◆◆

میرے کرم فرما

ڈاکٹر عبدالعلیم

علیم صاحب سے ملاقات کے موقعے کم ہی آئے۔ میں نے اپنے ہوش میں سب سے پہلے انھیں ۱۹۴۷ء میں دیکھا اور سب سے آخر میں نومبر ۱۹۷۵ء میں۔ ان اٹھائیس برسوں میں ان سے بس چالیس پچاس ملاقاتیں ہوئی ہوں گی؛ اسے کم بیانی سمجھیے تو پچاس ساٹھ رکھ لیجیے۔ ان سے زیادہ نہیں ہو سکتیں۔

پہلی ملاقات وہ تھی جو ابا کے انتقال کے دوسرے یا تیسرے دن ہوئی۔ دوسری ملاقات جو یاد ہے اس وقت ہوئی جب میں سال ڈیڑھ سال بعد انیسہ باجی کی شادی میں شرکت کرنے اورئی سے آیا۔ تڑ ہی کے یونیورسٹی ڈیلی گیسی سینٹر کے باہر کے دالان میں انھوں نے کہا یہاں دری بچھوادو۔ یہ دالان ان کے ڈرائنگ روم کو باہر کے حصے سے ملاتا تھا۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی، اس لیے میں نے کہا۔

''یہاں دری بچھوادوں؟''

''میں نے کوئی بہت بے وقوفی کی بات تو نہیں کہی،'' انھوں نے کہا۔

''جی ہاں بہت بے وقوفی کی بات تو نہیں۔''

ناک اور کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے منہ سے ایسا جملہ کیسے نکلا اور برسوں انھیں دیکھنے، انھیں جاننے اور ان کے بارے میں دوسروں کی باتیں سننے کے بعد زیادہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ انھوں نے بھی ایسی بات کیسے کہی۔ ویسے کبھی کبھی وہ بہت جلد جھنجھلا جاتے تھے لیکن بس دو ایک منٹ کے لیے۔

پھر میں نکاح پڑھانے کے لیے کسی کو لینے فرنگی محل چلا گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک بار نخاس میں اس جگہ جہاں شبیہ الحسن مرحوم کے مکان کی گلی نکلتی ہے، میں کھڑا تھا یا کہیں جا رہا تھا۔ یکا یک علیم صاحب پر نظر پڑی۔ میری انگلیوں میں سگریٹ تھی، خون جم کے رہ گیا اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے جلتی ہوئی سگریٹ جیب میں رکھ کر دونوں ہاتھ باندھ لیے اور سگریٹ نے اندر اندر ستانا شروع کیا تو بے چینی سے کبھی ایک پیر اٹھانے لگا تو کبھی دوسرا۔ اسی وقت انھوں نے آہستہ سے کہا، ''سگریٹ نکال لو قمیص جل جائے گی۔''

میں نے کہیں ''عندیہ تخاطب'' کی ترکیب پڑھی۔ معنی سمجھ میں نہ آئے تو علیم صاحب سے پوچھے۔ اس میں معنی معلوم کرنے سے زیادہ یہ خواہش تھی کہ انھیں پتہ لگ جائے کچھ لکھتا پڑھتا بھی ہوں۔ ان دنوں میں نے انجمن کے جلسوں میں جانا شروع کر دیا تھا اور کرسچین کالج میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔

انھوں نے معنی نہیں بتائے اور پوچھا، ''کیا ڈکشنری میں نہیں ہے؟''

لغات میں معنی انھی کے یہاں دیکھ لیے لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ انھوں نے کیوں نہیں بتائے۔ بات دس بارہ سال بعد سمجھ میں آئی جب ایم۔سی۔ نے ڈکشنری دیکھنے کے فیوض و برکات بتائے۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ بات وہی بتا رہے ہوں۔ دونوں دوست تھے اور ان میں بہت کچھ مشترک تھا۔

ان چھبیس ستائیس برسوں میں جب انھیں پہلی سے آخری بار تک دیکھا کبھی پندرہ بیس منٹ بھی ان کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا، علاوہ انجمن کے جلسوں کے، اور وہ اگلے سال یعنی ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ چلے گئے... مزید یہ کہ نہ میں نے ان سے کبھی کچھ مانگا نہ انھوں نے دیا، عیدیا بقرعید میں عیدی کے علاوہ۔ ویسے یہ کام ممی جان کے سپرد تھا لیکن جانے کیا تھا کہ مجھے اور عارف بھائی کو عیدی وہ بھی دیتے تھے۔

میں ان سے صرف Inspire ہوا۔ رہی روپے پیسے کی بات تو انھوں نے اماں سے میری تعلیم کے بارے میں کئی بار کہا لیکن میں ہی ٹیڑھا تھا۔

ایک بار میں نے سنا وہ مجھ سے ناراض ہیں۔ یہ اطلاع رضیہ سجاد ظہیر نے دی۔ انھوں نے بتایا، ''میں نے کہا عابد سہیل کے لیے کچھ کیجیے تو انھوں نے برا سامنہ بنا کے کہا وہ کچھ کر کے تو دکھائیں۔''

ممکن ہے یہ جملہ انھوں نے کہا ہو کہ بات ان دنوں کی ہے جب میں بی۔اے۔ کر کے

ہی نہ دیتا تھا لیکن براسامنہ وہ بنا ہی نہ سکتے تھے۔ یہ بات محض زیب داستاں ہے اور رضیہ سجاد ظہیر اس کی ماہر تھیں۔

پھر بھی میں نے خط لکھا۔ جواب آیا، ''تم سے خفا ہونے کی کوئی بات نہیں۔''

لکھنؤ میں قیام کے دوران علیم صاحب یونیورسٹی تانگے سے جاتے۔ پیچھے کی سیٹ پر گردن ذرا سی آگے کو موڑ کے بیٹھتے اور راس ہاتھ میں لے لیتے۔ سائیس کھسک کے دوسری طرف بیٹھ جاتا۔ ایک صبح گھوڑا مرا ہوا پایا گیا۔ سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ ہفتے عشرے میں دوسرا خریدا گیا، وہ بھی چار چھے دن بعد اسی طرح مر گیا تو یونیورسٹی سائکل سے جانے لگے۔ بہت تیز چلاتے تھے۔ میں ایک دن ان کے ساتھ شوکت صدیقی کے یہاں انجمن کے جلسے میں گیا تھا۔ شوکت صدیقی کا مکان باغ مولوی انوار کے پاس ایک چوڑی سی گلی میں تھا۔ ان کا مکان گلی سے تین چار زینے اوپر تھا۔ علیم صاحب کی سائکل شوکت صدیقی نے ہی اٹھا کر باہر کے کمرے کے پاس دیوار سے ٹکا کے رکھی تھی۔ شوکت صدیقی اپنا نیا افسانہ سب سے پہلے انھیں ہی سناتے۔ دو بار میں نے خود دیکھا تھا۔ وہ علیم صاحب سے بہت متاثر تھے۔ ''خدا کی بستی'' کا انتساب انھوں نے علیم صاحب کے نام ہی کیا تھا۔

ایک بار علیم صاحب علی گڑھ سے آئے تو ایم۔ سی۔ سے ملنے ہیرالڈ کے دفتر گئے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ علیم صاحب کو مجھ سے کچھ کہنا تھا۔ انھوں نے ایم۔ سی۔ سے کہا۔

" My nephew works with you."

"Your nephew?"

"Yes, Abid Suhail"

"But he never told me....."

"Why should he have told you that?"

ایم۔ سی۔ خاموش ہو گئے۔ میں دفتر میں نہیں تھا۔ یہ بات ایم۔ سی۔ کے پی۔ اے۔ گلاب رائے سریواستوا نے مجھے بتائی تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے حالات نے ہنگامہ کی صورت اختیار کی تو ایم۔ سی۔ دہلی سے علی گڑھ گئے اور علیم صاحب کے یہاں ہی مقیم ہوئے۔ واپس آ کر انھوں نے دو قسطوں میں ایک مضمون لکھا جس میں علی گڑھ کے ''جزیرہ نہیں تو جزیرہ نما ضرور'' ہونے کی بات بالکل اسی طرح پیش کی جس طرح علیم صاحب نے برسوں قبل اپنے مضمون میں کہی تھی، اور بھی دو ایک باتیں مشترک تھیں۔

ان دنوں جب کتاب پبلشرز کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا ایک دن احتشام صاحب نے مجھ سے کہا کہ علیم صاحب کے مضامین کتابی صورت میں چھاپ دیجیے ورنہ ضائع ہو جائیں گے۔ اس کام کی طرف میری توجہ اس طرح ہوئی۔

میں نے علیم صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا، ''مضمون ملیں گے کہاں؟'' لیکن میں نے مضامین کی تلاش جاری رکھی اور کچھ حاصل بھی کر لیے۔ پھر میرا علی گڑھ جانا ہوا تو انھوں نے بتایا کہ کچھ مضامین مل گئے ہیں لیکن اگلی ملاقات میں کہا، ''نقل مکانی میں وہ مضامین جانے کیا ہوئے۔'' تلاش کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا اور تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی لیکن اس بار پھر مضامین ادھر ادھر ہو گئے۔

میں نے مایوس ہو کر ان سے کہا، ''اپنی یادداشتیں ہی لکھ ڈالیے۔''

''بہت کچھ بھول گیا۔'' انھوں نے کہا۔

ان کی آنکھوں میں عجیب سی مایوسی تھی۔

برسوں بعد ایک صاحب نے جو ترقی اردو بورڈ میں اُن کے پی۔اے۔ تھے ''علیم صاحب'' نامی کتاب میں جو شعبۂ اسلامی مطالعات نے شائع کی تھی اعلان کیا کہ مرحوم کے تقریباً سارے مضامین ان کے پاس ہیں۔ ان میں سے چند ان کی تحریر میں ہیں اور ایک غیر مطبوعہ مضمون جس کا عنوان ہے ''عہد کا مفہوم کیا ہے؟'' وہ ان مضامین کو اب تک سینت رہے ہیں۔ معلوم نہیں ان کا کیا کریں گے۔ غیر مطبوعہ مضمون تک انھوں نے اب تک شائع نہیں کرایا ہے۔

ڈاکٹر عرفان حبیب نے ایک واقعہ لکھا ہے۔:

> ''(پارٹی کی) برانچ میٹنگ میں کسی نے ان کی سخت نکتہ چینی کی تو علیم صاحب نے دو جملوں میں جواب دیا اور پھر انھی کا نام لے کے کہا، ''میں جانا چاہتا ہوں ذرا رکشہ لے آؤ'' تو وہ صاحب رکشہ لینے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت ان کا اتنا اثر تھا کہ نکتہ چینی کرنے والا تک چاہتا تھا کہ جتنی خدمت وہ کر سکے کر لے۔ علیم صاحب رکشے[1] پر کم بیٹھتے تھے کہ انسان انسان پر بوجھ بنتا ہے لیکن علی گڑھ یونیورسٹی میں مجبوری تھی۔''

اسی مضمون میں عرفان حبیب صاحب نے ان کے مزاج اور زندگی کے نظریے کے

ا۔ پیر کی ہڈی کے فریکچر کے بعد علیم صاحب کبھی کبھی رکشے پر بیٹھنے لگے تھے۔

بارے میں پتے کی بات کہی ہے۔'' ان کی زندگی کا جو نظریہ تھا وہ آپ خاص طور سے اس وقت دیکھ سکتے تھے جب وہ کسی غریب سے بات کرتے۔ اس کو اپنے پاس بٹھاتے تھے، اس سے ہنسی مذاق کرتے تھے۔''

ڈاکٹر علیم انجمن ترقی پرقی پسند مصنّفین کے بانیوں میں تھے۔ انجمن کی قیادت صرف دو افراد کے ہاتھوں میں رہی سجاد ظہیر اور ڈاکٹر علیم۔ وہ انجمن کے جنرل سکریٹری طویل ترین مدت تک رہے۔ انجمن کی لکھنؤ کانفرنس کا منشور کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر ضرور ان کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ مختلف کانفرنسوں کی بیشتر تجاویز انھی کی تیار کی ہوئی ہیں۔ انجمن کو نظریاتی بنیاد، ان کے مضامین اور خطبات نے فراہم کی لیکن بعض لوگوں نے ان کے کاموں کو پس پشت ڈالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ان کے مزاج کی بے نیازی نے اس سلسلے میں لوگوں کی کامیابی کو آسان بنا دیا۔

علیم صاحب سے آخری دو ملاقاتیں اکتوبر اور نومبر ۱۹۷۵ء میں ہوئیں۔ میں ادیبوں کے ایک دورے کے سلسلے میں دہلی گیا ہوا تھا۔ وہاں شانتی پتھ پر ان کے یہاں گیا تو وہ چائے پی رہے تھے۔ کسی نے چائے بنا کر پیالی میرے سامنے کھسکا دی۔ علیم صاحب نے اپنے سامنے سے طشتری اٹھائی اور میری طرف بڑھا دی، اپنے ہاتھ میں لے کر، کھسکائی نہیں۔ اس میں دو بسکٹ تھے۔ میں نے اپنی بے وقوفی میں پوچھا۔

''دونوں اٹھالوں؟''

انھوں نے ایک لفظ بھی کہے بغیر صرف چہرے کے تاثر سے مجھے بتا دیا کہ دونوں نہیں، ایک اٹھالو، دوسرا میرے لیے چھوڑ دو۔

خاموشی کو گویائی کا اعجاز بخشنے کی ترکیب اسی وقت میرے ذہن میں آئی تھی۔

اس کے بعد آخری ملاقات ہوئی، چودہ پندرہ دن بعد۔

گھر کے باہر کھڑے تھے۔ لان بہت بڑا تھا۔ انھوں نے نظریں اٹھا کر مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔ شاید پہچان نہ پائے۔ تھوڑی دیر میں ان کی تیز آواز سنائی دی۔

''تو کوئی کیا کرے!''

میں کانپ گیا۔ یہ آواز، یہ لہجہ ان کا نہ تھا۔ اوپر کی منزل کی خاتون شکایت کر رہی تھیں کہ مالی نے لان میں پانی بھر دیا ہے۔

پھر مجھے دیکھ کر مسکرائے اور گھر میں لے گئے۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو مرتضیٰ

حسین بلگرامی نے فون سننے کے بعد کہا، ''ایم۔سی۔بات کرنا چاہتے ہیں''، لیکن فون کٹ گیا۔

تین ساڑھے تین مہینے بعد ۱۸ر فروری ۱۹۷۶ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علیم صاحب کا انتقال ہوا تو مہاراشٹر کی گورنری ان کی منظوری کا انتظار کر رہی تھی لیکن انھوں نے دوردرشن کے ایک انٹرویو میں گوپی چند نارنگ کے سوال کے جواب میں کہا تھا، ''میں اردو کی خدمت کرنا پسند کروں گا۔''

میں علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد اگلے دن آفس گیا تو ایم۔سی۔ لکھنؤ میں نہیں تھے، دو چار دن بعد دہلی سے آئے تو انھوں نے گلاب رائے سریواستو سے مجھے بلوایا۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہو کر خاموش کھڑا ہوگیا۔

انھوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کی جانب دیکھنے لگے۔ پھر بولے، "I was also very close to him."

میں ایک منٹ کھڑا رہا، پھر لوٹ آیا، یہ سوچتے ہوئے کہ انھوں نے Also کیوں کہا تھا۔ میرے مُنہ سے تو ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔

فرحت اللہ انصاری

فرحت اللہ انصاری کو پہلی بار رائل ہوٹل (موجودہ باپو بھون) میں دیکھا تو خیال آیا کہ یہ شاید وہی ہیں جو کبھی کبھی وکٹوریہ اسٹریٹ پر نظر آتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر ممکن ہے انھیں بھی کچھ ایسا ہی خیال آیا ہو۔ ان کی کرم فرمائیوں کا سلسلہ پہلی ہی ملاقات میں شروع ہوگیا۔ پیش لفظ میں ''سبزۂ بیگانہ میں تھوڑی سی ترتیب'' کا فقرہ استعمال کرتے وقت میرے ذہن میں ان کی بھی تصویر تھی، اگرچہ انھوں نے ایک آدھ بات ایسی بھی کی جس سے تکلیف پہنچی۔ لیکن جانے کیسے میری عادت ہے کہ اس طرح کی تکلیفوں اور ان کے پہنچانے والوں کو بھول جاتا ہوں۔ ویسے نفسیات کا اصول بھی یہی ہے کہ انسان تکلیف دہ واقعات بھول جاتا ہے اور خود کو خوشیوں کے فریب دیتا رہتا ہے۔

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

لیکن بعض زخم ایسے ہوتے ہیں کہ زندگی کے آخری لمحے تک رستے رہتے ہیں، بھلائے

نہیں بھولتے ،نفسیات کے اصولوں کو بے معنی بناتے ہوئے۔ اصل میں لوگ انھیں بھولنے ہی نہیں دیتے، کچوکے لگاتے رہتے ہیں۔

فرحت اللہ انصاری نے اسلم رضوی کے یہاں ٹیوشن دلایا جس سے اپنی چھوٹی سچی آن قائم رکھنے میں بہت مدد ملی، انھوں نے میرے مضامین کی زبان درست کی، ایک دن بچوں کی ایک کہانی جس کا آغاز ، ''سنو بچو'' سے ہوتا تھا پڑھ کر کہنے لگے، 'سنو بچو' سے کہانی بچوں کی نہیں ہوجاتی۔ اس کے بعد کسی لفظ کے بارے میں کہا،'' بچہ کہانی پڑھے گا یا ڈکشنری دیکھے گا'' اور آخر میں یہ کہتے ہوئے کہ'' نہیں، یہ نہیں چھپ سکتی'' کہانی واپس کردی۔ لیکن انھوں نے'' نیا دور'' میں پورے صفحے کی تصویر بھی چھاپی۔ یہ تصویر شاہجہاں پور میں راجن کے ایک فیملی فرینڈ نے معمولی سے کیمرے سے کھینچی تھی۔ اس تصویر کی خوبی یہ تھی کہ میں اس میں خوبصورت لگتا تھا، اور یہی اس کی خرابی بھی۔

فرحت صاحب نثر بہت اچھی لکھتے تھے، کھنکتی ہوئی۔ ان کی معلومات کا دائرہ وسیع تھا، افسوس محفل آرائی کے شوق نے معلومات کو علم نہ بننے دیا۔ پھر بھی، لکھنؤ کے ادیبوں کی تاریخ لکھی گئی تو'' نقوش'' کے شخصیات نمبر میں مجاز پر ان کا مضمون ہی انھیں یاد رکھے جانے کے لیے کافی ہوگا۔ اس مضمون کی پشت پر برسوں کی علی گڑھ کی رفاقت ہے۔ عمر میں وہ مجاز سے ذرا سے بڑے تھے۔ میرا خیال ہے ایک آدھ کلاس آگے رہے ہوں گے۔ علی گڑھ کی سینیر ٹی اور جونیر ٹی کے تصور سے قطع نظر بھی مجاز ان کا احترام کرتے اور کبھی کبھی ، جی ہاں بس کبھی کبھی، گم کردۂ ہوش وحواس ہونے کے باجود منکی برج سے فرنگی محل پہنچ جاتے اور رات وہیں گزارتے۔ لیکن فرحت اللہ انصاری اس کا ذکر کبھی نہ کرتے۔ جاننے والے جانتے اور بیان کرتے، ان میں رضا انصاری، ہاشم میاں، عصمت اللہ انصاری اور لطیف صدیقی شامل تھے۔ فرحت اللہ انصاری اور مجاز کا رشتہ تعلقِ خاطر سے شروع ہوتا اور وہیں ختم۔ مجاز اور ڈاکٹر محمد حسن کے رشتے کی نوعیت مختلف تھی۔ محمد حسن مجاز کے عاشق تھے اور مجاز ان کے دیوانے، اپنی ہر بات انھیں بتا دیتے۔

فرحت صاحب حاضر جواب تھے، یار باش تھے، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے۔ علی گڑھ کے دنوں میں اور اس کے بعد بھی کئی سال انھوں نے اپنی تقریر کے جوہر کو خوب خوب چمکایا۔ ان دنوں بھی علی گڑھ میں جونیر طلبہ، بلکہ'' نو واردان بساط ہوائے دل'' کا سینیر طلبہ سے تعارف کرایا جاتا، لیکن آج کی صورت نہ تھی جس میں خون خرابے کی نوبت آجاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بیگم اختر کے گلے میں پتی تھی جو مغنیہ کے لیے عیب بن جاتی ہے لیکن بیگم اختر نے اس عیب کو ہنر بنا دیا تھا۔ یہی حال فرحت اللہ انصاری کا تھا، انھوں نے ایک پیر کی خرابی اور ہاتھ کی خوبصورت چھڑی سے اپنی شخصیت میں ہنک پیدا کر لی تھی۔ علی گڑھ میں اپنا تعارف کرانے کے لیے ان کا نام پکارا گیا کہ اسٹیج پر آئیے اور بتائیے کہ آپ کون اور کیا ہیں۔ فرحت اللہ انصاری پیچھے کی صفوں سے اٹھے، کھٹ کھٹ کرتے اسٹیج پر پہنچے اور خاموش کھڑے ہو گئے۔ شور ہوا، ''چپ کیوں ہو؟'' جواب دیا، ''کیا اب بھی تعارف کی ضرورت ہے؟'' لوگ ہنس دیے۔ منزل سر ہو گئی۔

ان کی جرأت مندی کا ایک واقعہ میرے سامنے کا ہے۔ گوپی چند نارنگ صاحب کے مضمون پر اسمبلی میں ہنگامہ ہو گیا تو نیا دور کی اسسٹنٹ ایڈیٹری لے کر پمفلٹ لکھنے کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا۔ کئی دن بعد ایک دن محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر نے پچھوایا، ''پمفلٹ مکمل ہو گیا؟'' جواب دیا، ''ابھی شروع نہیں کیا، Creative work ہے، فائل پر دستخط کرنا نہیں۔'' یہ ڈائرکٹر پر چوٹ تھی۔ سرلا ساہنی جو رٹائر ہوتے ہوتے اطلاعات سکریٹری ہو گئی تھیں، ان سے جونیر تھیں، انھی کے ساتھ بیٹھتی تھیں۔ اس وقت محکمۂ اطلاعات کا دفتر اس جگہ تھا جہاں اب سبھاش اسپتال ہے۔

ایک دن کافی ہاؤس میں کسی نے فرحت صاحب کی برائی کی، مجھے اچھا نہ لگا اور میں نے اختلاف رائے کیا۔ اس نے کچھ اور برائی کی، میں نے سختی سے مخالفت کی، وہ چپ نہ ہوا تو تو تو مَیں مَیں ہونے لگی۔

میں نے فرحت اللہ انصاری سے ذکر کیا تو بولے، ''وہ صاحب برائی کیوں کر رہے تھے، میں نے تو ان کے ساتھ کوئی نیکی نہیں کی؟ اور تم کیوں لڑ پڑے۔ بے کار کی باتوں کا برا نہیں مانا کرتے۔''

چہرے پر ایک شکن نہ پڑی۔

میں میوہ والی سرائے کے جس مکان میں بطور کرائے دار رہتا تھا وہ انھی کا تھا، لیکن ذرا سا گھوم کے۔ اصل میں وہ مکان کاظمی نام کی ایک خاتون کا تھا جو کبھی کجن بائی کے نام سے مشہور تھیں۔ ان خاتون سے انھوں نے بعد میں شادی کر لی تھی۔ سرکاری ملازمین کی دوسری شادی پر پابندی لگنے سے بس ایک آدھ دن پہلے۔

اسی مکان سے ماہنامہ ''کتاب'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ ایک اتوار کو سردار جعفری نے جو لکھنؤ آئے ہوئے تھے، کتاب کے دفتر آنے کی خواہش ظاہر کی، آنے سے

صرف گھنٹہ، آدھ گھنٹہ قبل۔ میں نے فوراً فرحت اللہ انصاری کو مطلع کیا۔ وہ آئے تو سردار جعفری آچکے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی فرحت اللہ انصاری نے کہا، ''جو اماں ملی تو کہاں ملی''۔

سردار جعفری کی پیشانی عرق آلود ہوگئی اور پسینے کی بوندیں بہت سی کہانیاں کہہ گئیں۔

کسی مقدمے میں کاظمی بیگم عدالت میں برقع پہن کے گئیں۔ مخالف وکیل نے کہا، ''یہ کجن بائی ہیں، برقعے میں گواہی کیوں دیں گی۔''

فرحت اللہ انصاری نے وہیں سے اپنے وکیل سے کہا، ''کہو، رہی ہوں گی کبھی کجن بائی، اب تو میری بیوی ہیں۔''

عدالت نے مخالف وکیل کا مطالبہ مسترد کر دیا۔

ایک دن فرحت اللہ انصاری میرے یہاں آئے۔ اوپر کی منزل پر ان کا کچھ سامان رکھا تھا، سامان کیا رکھا تھا، رکھ چھوڑا تھا کہ مکان کرایہ داری کے قانون کے تحت نہ آنے پائے۔ لمّاں نے ان کو کمرے سے دیکھا، مجھے بلایا اور بولیں

''ارے یہ تو فرحت ہے، پوچھو میرا نام یاد ہے''۔

میں نے جا کے کہا، ''اماں کہہ رہی ہیں، آپ انھیں جانتے ہوں گے۔''

''کیا نام ہے تمھاری لمّاں کا؟''

''عائشہ''، میں نے کہا

سوچتے رہے پھر بولے یاد نہیں آرہا ہے۔ میں نے جا کر لمّاں سے کہا۔ انھوں نے پوچھا کیا نام بتایا تھا۔ میں نے کہا، ''عائشہ''

بولیں وہ عائشہ کیا جانے، کہو ''اچھن''۔

میں نے گھر کا نام بتایا تو بولے، ''اچھن، تمھاری لمّاں ہیں؟ غازی پور اور جونپور کا بچپن یاد آ گیا ہوگا۔ پھر دونوں بوڑھے بوڑھیاں دروازے کی اوٹ سے بچپن کی باتیں کرتے رہے، جن لوگوں کے نام وہ لے رہے تھے ہمارے لیے اجنبی تھے۔ ان کے چہرے بچپن کی یادوں سے چمک رہے تھے۔ مجھے "When we rebecome child" کا فقرہ یاد آ گیا۔

لمّاں نے کہا، ''بتادوں لنگڑے کیسے ہوئے تھے؟''

چہرے پر ایک رنگ آیا، ایک گیا۔ معلوم نہیں کیا کیا کہانیاں بُنی ہوں گی۔ آخر بچپن نے پالا مار ہی لیا۔

بولے،" بتادے، اچھن بتادے۔ دھمکیاں کیوں دیتی ہے؟"

"بتادوں؟"

"بتادے"۔

ہم سب کے چہرے چمک اٹھے۔ سب ایک دوسرے کو تجسس سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں لقاں نے کہا،" بھینس..."

فرحت اللہ مسکرائے، کچھ شرمائے۔

بھینس کی دُم پکڑ کے لٹک گئے تھے۔ وہ بھاگی اور بھاگتے بھاگتے اس نے جولات ماری تو یہ کھیت کی منڈیر پر توڈھم سے گرے، ٹانگ ٹوٹ گئی، پھر سوکھ گئی۔

فرحت اللہ انصاری کو میں نے پہلی بار شرمندہ ہوتے، نظریں چراتے دیکھا۔

ایک فرحت اللہ یہ تھے۔ کھیت کی منڈیر پر پڑے ہوئے، شرماتے ہوئے۔ لیکن ایک فرحت اللہ اور بھی تھے۔ ہوشیار، چالاک، اپنے معاملات پر دور تک نظر رکھنے والے۔ ان کے اس مکان میں جس میں مَیں رہتا تھا، احمد حسین دلدار حسین کارخانہ کی تمباکو کے لیے ٹین کے ڈبے بنتے تھے۔ پھر جانے کیوں یہ کام بند ہوگیا۔ اس کارخانے کے مینیجر یا نگراں سیتاپور کے ایک حافظ جی تھے۔ پورا مکان انھی کے نام الاٹ کرا رکھا تھا۔ مکان کی ضرورت پڑی تو ان کے نام مقدمہ دائر کردیا۔ وہ ان کے ملازم تھے۔ انھوں نے سَمَن تو قبول کرلیا لیکن ایک بھی پیشی میں نہ آئے۔ ظاہر ہے عدم پیروی میں فیصلہ یک طرفہ ہوا۔ افضال احمد وکیل کو، جو میرے دوست تھے، مقدمے کے فیصلے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے ایک حصہ میں مَیں رہتا ہوں۔ انھوں نے مجھے مطلع کیا۔ میں نے فرحت اللہ انصاری سے بات کی تو بولے،" آپ سے کیا تعلق، آپ سے مکان خالی کرنے کو کون کہہ رہا ہے،" لیکن میں نے دس پندرہ دن ہی میں مکان خالی کردیا اور کپور مارکیٹ آگیا۔

ایک فرحت اللہ انصاری یہ بھی تھے... لیکن ایک فرحت اللہ اور تھے۔ غصور، ناک پہ مکھی نہ بیٹھنے دیتے۔ ان کے سامنے کسی کی نہ بن پاتی۔

دفتر سے ان کی واپسی کا وقت آتا تو گھر والوں کے جسم میں قوت سماعت کے علاوہ کچھ نہ رہ جاتا۔ ہر شخص کے کان ایک ہی آواز پر لگے ہوتے۔ وہ فرنگی محل کے صدر دروازے میں داخل ہوتے اور سہارے کے لیے بید پر جسم کا وزن ڈال کر قدم بڑھاتے تو" کھٹ" کی آواز گھر تک پہنچتی اور پائے کا پانی رکھ دیا جاتا... لیکن اب صاحب فراش ہیں، زندگی کی ہاری ہوئی لڑائی لڑ

رہے ہیں، جی جان سے، حوصلہ مندی سے، لیکن ٹوٹ بھی رہے ہیں۔ کوئی شفیق دوست آتا ہے تو اس سے بڑی مشکل سے کہہ پاتے ہیں، ''ڈاکٹر کو بلایا ہے، جانچ کر لے۔ ممکن ہے، ٹھیک ہو گیا ہوں''۔

اور پھر ایک دن، ڈاکٹروں کی بتائی ہوئی انتہائی مدّت کو شکست دینے کے بعد، وہ ''ہیں'' سے ''تھے'' ہو گئے۔

انا للہ...

فرنگی محل کی مٹی سے اس آن بان کا کوئی دوسرا شخص شاید ہی اب اٹھے۔

سیّد حامد حسن اسلم رضوی

سید حامد حسن اسلم رضوی سے جنھیں ان کے احباب اسلم رضوی کے نام سے یاد کرتے، میں بھلا کیسے واقف ہو سکتا تھا۔ میں ایک غریب طالب علم جسے کبھی کبھی دو وقت کی روٹیوں کے لالے پڑ جاتے اور ان کا شمار شہر کیا پوری ریاست کے دس سب سے بڑے صنعت کاروں میں ہوتا۔ لیکن بھلا ہو میری مفلسی کا جس نے مجھے ان تک پہنچا دیا۔ اور پھر اس تعارف نے ہوتے ہوتے ایک ایسے تعلقِ خاطر کی شکل اختیار کر لی جس نے اظہار کے لیے الفاظ کا سہارا کبھی نہیں لیا۔

ہوا یہ کہ میں فرحت اللہ انصاری کے بیٹے اور بیٹی کو انگریزی پڑھاتا تھا۔ ان دنوں قومی آواز سے میرا تعلق بس یونیورسٹی کی اعزازی نامہ نگاری تک تھا اور میرا کام ریڈیو کے چھوٹے موٹے پروگراموں، ٹیوشنوں، شمع، نیا دور اور آجکل میں شائع ہونے والے مضامین و افسانوں کے معاوضوں سے چلتا۔ ظاہر ہے آمدنی کی یہ صورتیں مستقل نہ تھیں، علاوہ ٹیوشنوں کے جو کم سے کم سال کے دس مہینے تو جاری ہی رہتے۔ انھی دنوں روزنامہ اسٹیٹس مین (Statesman) میں حکومت بنگال کا ایک چھوٹا سا اشتہار شائع ہوا جس کے مطابق سوویت یونین کو چند ایسے مترجموں کی ضرورت تھی جو انگریزی سے اردو میں رواں ترجمہ کر سکیں۔ اس اشتہار کی اطلاع مجھے نجم الحسن نے دی اور میں نے ترجمے کی مختصر سی پونجی کی بنیاد پر درخواست داغ دی۔

اس اشتہار کا معاملہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ ہوا اصل میں یہ تھا کہ سوویت یونین نے حکومت ہند سے انگریزی۔ اردو مترجم فراہم کرنے کی درخواست کی۔ مرکزی حکومت نے یہ کام ایسی ریاستی حکومتوں کے سپرد کر دیا جن کے علاقوں میں اردو بولنے والوں کی قابلِ لحاظ آبادی رہتی

تھی۔ حکومت ہند کا منشا یہ تھا کہ یہ ریاستی حکومتیں اپنے ملازمین میں سے ایسے لوگوں کے نام جو اس کام کے اہل ہیں مرکزی حکومت کو بھیج دیں اور پھر ان کو انٹرویو کے لیے بلا کر انتخاب کرلیا جائے لیکن حکومت بنگال کی سکریٹریٹ کے کسی زیادہ چست افسر نے اشتہار جاری کر دیا۔

سوویت یونین میں ملازمت بڑی بات تھی اس لیے خیال تھا کہ درخواستیں بہت آئی ہوں گی لیکن ہوا اس کے برعکس کیوں کہ اشتہار صرف کلکتہ کے اخبار ''اسٹیٹس مین'' میں چھپا تھا، چنانچہ تھوڑے سے اردو والوں کو ہی اس کا علم ہوا۔

بہت کم لوگوں نے درخواستیں دیں اور سارے ہی امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔ مجھے بھی طلب کیا گیا۔ کلکتہ جانے کے لیے میرے پاس پیسے نہ تھے۔ میں نے فرحت اللہ انصاری سے ذکر کیا تو انھوں نے از خود دست تعاون بڑھایا لیکن وہ بات بھی کہی جو ہر شخص کہہ رہا تھا کہ شمالی ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ، بشمول ڈاکٹر محمد حسن، نے درخواستیں دی ہیں۔ خیال تھا کہ مرکزی حکومت اور ریاستوں کے محکمۂ اطلاعات سے بھی خاصی درخواستیں گئی ہوں گی۔ لیکن انھوں نے کم سے کم دو بار یہ کہا کہ روپے کا منہ نہ دیکھو اور انٹرویو کے لیے چلے جاؤ۔ میں ہی ہمت ہار گیا تھا۔

انٹرویو کی تاریخ گذرنے کے دو تین ہفتے بعد معلوم ہوا کہ درخواستیں بہت کم تھیں اور انٹرویو کے لیے آئے اور بھی کم لوگ تھے کیوں کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ یونیورسٹیوں سے متعلق لوگوں کے مقابلے میں وہ کس شمار قطار میں ہے۔ چنانچہ نو جگہوں کے لیے صرف سات امیدوار تھے اور وہ ساتوں لے لیے گئے۔

میں نہیں، فرحت اللہ انصاری یہ سمجھتے تھے کہ میں انھی کی وجہ سے اس سنہرے موقع سے محروم رہ گیا۔ چنانچہ اس کی تلافی کے طور پر انھوں نے مجھے ''احمد منزل'' میں ٹیوشن دلایا۔ یہ بات غالباً ۱۹۵۵ء کی ہے۔

مجھے فرحت اللہ انصاری اپنے ساتھ احمد منزل لے گئے اور اسلم رضوی کے سامنے پیش کیا۔ کئی ایکڑ پر تعمیر شدہ احمد منزل دیکھ کر میں نے سوچا کہ ایسے رئیسوں کے یہاں مجھے ٹیوشن کہاں ملے گا۔ ڈرائنگ روم جس میں مجھے انٹرویو کے لیے پیش کیا گیا تھا، پوری کوٹھی تھا جس میں ملاقات کے بڑے کمرے کے دو طرف متعدد کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ ڈرائنگ روم نہایت سادگی سے سجایا گیا تھا، اس کی میز کرسیاں اور قالین نہایت اعلیٰ درجے کے تھے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں

کہ دس سال کی ستم رسیدگی روح میں اتر چکی تھی اور یہ نہ ہوتا تو بھی ہماری حیثیت اس کوٹھی کے مکینوں کے سویں حصے کے برابر بھی نہ تھی۔

اسلم رضوی نے نام پوچھا، دو چار باتیں ادھر ادھر کی کیں اور بس۔ یہ تک نہ پوچھا کہ میاں بی۔اے بھی ہو یا نہیں۔ اسی وقت فرحت اللہ انصاری نے اشارہ کیا اور میں سلام کر کے چلا آیا۔

دوسرے دن میں بچوں کو پڑھانے فرحت اللہ انصاری کے یہاں فرنگی محل گیا تو انھوں نے کہا کل سے اسلم میاں کے بیٹے سعید اسلم رضوی کو پڑھانے شام کو جایا کرنا۔ وہ لامارٹینیر میں پڑھتے ہیں۔ ساٹھ روپے ملیں گے۔

ساٹھ روپے سن کے مجھے یقین نہیں آیا لیکن میں نے پوچھا نہیں۔ سوچا ہو سکتا ہے سننے میں غلطی ہوئی ہو، پھر بھی پچیس تیس تو ملیں گے ہی۔ اس وقت عام طور سے ایک گھنٹے کے دس بارہ یا زیادہ سے زیادہ پندرہ روپے ملتے تھے۔ تھوڑی دیر میں فرحت اللہ انصاری نے یہ بھی کہا کہ اب تمھیں فرصت کہاں ہوگی، کل سے نہ آنا اور بیس روپے مہینے کے حساب سے اس تاریخ تک کی فیس دے دی۔

اگلے دن سے میں نے سعید کو پڑھانا شروع کر دیا۔ دو تین دن بعد میں سعید کو پڑھا کے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ دیکھا سامنے اسلم رضوی آ رہے ہیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انھوں نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں ایسا گھبرایا کہ جواب بھی نہ دے سکا۔

کچھ عجیب طرح کے دن تھے، اس گھر کی ہر چیز، لوگوں کے چلنے پھرنے کے انداز، ملازموں کی ریل پیل، شان و شوکت، غرض ہر چیز کو ہونقوں کی طرح دیکھا کرتا۔ ذرا میں خوش ہو جاتا، ذرا میں رنجور۔ نہ مجھ میں استقلال تھا نہ حالات میں۔ لیکن اس گھر کی چیزیں کچھ عجیب سی لگتیں اور سمجھ میں نہ آتیں۔ پندرہ سولہ دن بعد مہینے کا اختتام ہوا تو ایک ملازم نے دالان سے ملحق گول کمرے میں آ کر پہلے جھک کر سلام کیا، پھر کہا کہ تشریف لے جانے سے پہلے میاں سے مل لیں۔ میں کمرے سے نکلا تو وہ ڈرائنگ روم کے باہر برآمدے میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں ان کی جانب بڑھا تو انھوں نے پاس والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا، پھر دو ایک باتیں کیں اور چپکے سے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں سمجھ تو گیا لیکن میں نے کچھ کہا نہیں اور اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

باہر آ کے دیکھا تو پورے ساٹھ روپے تھے، چودہ پندرہ دنوں کی ٹیوشن فیس، بہت

گھبرایا، سمجھا کہ معاملہ ختم ہوگیا۔ اگلے دن فرحت اللہ انصاری سے محکمۂ اطلاعات جا کر شکایت کی تو وہ ہنسنے لگے، پھر طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے، جس میں غصے اور مذاق اڑانے کا ایک بے حد لطیف عنصر شامل تھا، بولے، "میاں تم اسلم رضوی کے یہاں ٹیوشن کرتے ہو، فرحت اللہ انصاری کے یہاں نہیں کہ بیس روپے مہینے کے حساب سے جتنے دن پڑھایا ہے اس کے پیسے نکا دیے۔ وہاں تو پورے مہینے کی تنخواہ ہی ملے گی۔"

ایک اتوار کو فرحت اللہ انصاری کے یہاں اسلم رضوی کے سب سے چھوٹے بھائی اکرم رضوی کو دیکھا۔ وہ ان سے سفارش کرانے آئے تھے اور سفارش کرنا تھی بڑے بھائی حامد حسن اسلم رضوی سے۔

معاملہ یہ تھا کہ انھیں ایک کار (پلے متھ) پسند آگئی تھی اور وہ اسے خریدنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے بڑے بھائی سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ گھر میں اتنی کاریں تو ہیں، ایک اور لے کر کیا کرو گے۔ انھوں نے کار لینے سے منع نہیں کیا تھا بس اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ لیکن شرفا کے یہاں بزرگوں کی مرضی بھی حکم کا درجہ رکھتی ہے، چنانچہ اکرم صاحب نے اسے حکم سمجھا اور فرحت اللہ انصاری کے پاس آئے کہ سفارش کر کے اجازت دلوا دیجیے۔

تین بھائی تھے، اسلم رضوی، محمود حسن اشفاق رضوی اور اکرم رضوی۔ کارخانے میں تینوں کا برابر کا حصہ تھا۔ اکرم رضوی کوئی بھائی کے پیسے سے کار تھوڑی لے رہے تھے، اپنے پیسے خرچ کر رہے تھے لیکن ادب، احترام بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

فرحت اللہ انصاری کی بات اسلم رضوی ٹال نہیں سکتے تھے، اور بھلا ٹالتے بھی کیوں؟ انھوں نے کوئی منع تو کیا نہیں تھا، ہنس کے رہ گئے۔ اکرم رضوی نے اپنے پسند کی کار خرید لی۔

پھر امتحان ختم ہو گئے تو سعید میاں سے معلوم ہوا کہ وہ مسوری جائیں گے۔ اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئی تھیں یا ہونے والی تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہر جگہ ٹیوشن ختم ہو جاتا تھا۔ وہ دن زیادہ پریشانی کے ہوتے اور میں اس کا عادی ہو چکا تھا... دو چار دن بعد ان کے گھر کا پھر وہی ملازم آیا، اسلم رضوی کا ایک پیغام لے کر۔ مجھے ملاقات کرنے، ان کے پاس جانا نہیں پڑا۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی لپکے (کیا لوگ تھے!) اور بولے، "سہیل صاحب سعید میاں باہر جا رہے ہیں، ٹیوشن فیس کس پتے پر بھیجی جائے۔؟"

میں حیران رہ گیا، وہ سمجھ گئے اور بولے۔

''سعید میاں جا رہے ہیں، آپ نے تو پڑھانے سے معذرت نہیں کی۔''

میں نے کہا، ''میں آ کر لے لیا کروں گا۔''

یہ سنتے ہی وہ آفس کی طرف بڑھے اور وہاں ایک صاحب سے جو دفتر کے سربراہ معلوم ہوتے تھے بس یہ کہا، ''سہیل صاحب پہلی تاریخ کو آئیں گے، انھیں دوبارہ نہ آنا پڑے۔''

باقی باتیں انھوں نے میرے سامنے نہیں بتائیں۔ دو مہینے مجھے لفافہ وہیں سے ملا۔

میرے طالب علم بدلتے رہے۔ اسلم رضوی کے بچوں کے بعد میں اشفاق صاحب کے دو بیٹوں کو پڑھانے لگا، پھر اسلم صاحب اور اشفاق صاحب کی بیٹیوں کو اور آپ ہی آپ مجھے سو روپے ملنے لگے۔ میرا خیال ہے یہ سلسلہ چھے سال ضرور چلا ہوگا۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس گھر کی لڑکیوں کو مجھ سے پہلے یا بعد میں میرے علاوہ کسی مرد یا نوجوان نے نہیں پڑھایا۔ اسلم صاحب کے بیٹے سعید نے میرے سامنے کبھی سگریٹ نہیں پی، اپنی کار میری سائیکل سے کبھی آگے نہ بڑھنے دی۔ افسوس اسی سال (۲۰۰۹ء) وہ عید کے تیسرے دن چٹ پٹ ہو گیا۔ عید کے دن وہ میرے یہاں آنے والا تھا۔ عرفان احمد نے فون کیا تھا لیکن اسی دن بیمار پڑا اور تیسرے دن اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یہ لڑکیاں اب ماشاء اللہ نانی پوتوں والی ہو گئیں لیکن کبھی امریکا، کبھی کہیں اور سے آئی ہوتی ہیں اور میں کسی تقریب میں پہنچ جاتا ہوں تو مجھ سے ملاقات کرنے کا خاص طور سے اہتمام کرتی ہیں۔

ایک دن میں نے دیکھا اسلم رضوی اپنے ڈرائنگ روم سے گھر کی جانب اپنی کار کا ٹوٹا ہوا شیشہ لیے چلے جا رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ والدہ کو کار کے ایکسی ڈینٹ کی خبر دینے کے لیے گئے تھے۔

پھر جب میرا نکاح ہوا تو میں نے احمد منزل کے سارے حضرات کو مدعو کیا۔ میں نے اسلم صاحب سے کہا کہ آپ لوگ اپنی اپنی کاروں پر تنہا آئیں، یہ نہ ہو کہ دو تین کاروں میں سب لوگ بیٹھ کے آ جائیں، میرے اعزا اور دوست احباب بھی تو جائیں گے۔ چنانچہ صرف ایک گاڑی گھر پر چھوڑ دی گئی۔

حامد حسن اسلم رضوی اور محمود حسن اشفاق رضوی کی شکل میں ڈالی گنج نے یوپی کے دو امیر ترین لوگوں کو شاید پہلی بار یکجا دیکھا ہوگا۔

اس تقریب کے لیے میں اس وقت تیار نہ تھا، کیوں کہ میرے حالات اس کی اجازت

نہ دیتے تھے۔ مجھ ایسا شخص جس کی مستقل آمدنی اسی روپے ماہانہ ہو کوئی ایسا خرچ اپنے سر مول نہیں لے سکتا تھا جس میں ہزار سوا ہزار روپے خرچ ہوں۔ چنانچہ میں نے واضح الفاظ میں معذرت کی تو مجھ سے کہا گیا کہ اسلم صاحب (ان کا نام لیا گیا) سے ایک ہزار روپے قرض لے لیجیے، نکاح کے وقت ہم لوگ اسی قدر رقم تحفتاً دے دیں گے۔ آپ اگلے ہی دن روپے انھیں واپس کر دیجیے گا۔

مجھے روپوں کا ملال اس وقت نہ تھا تو اب کیا ہوگا۔ پریشانی صرف یہ تھی کہ چند دنوں میں واپسی کے وعدے کا کیا کروں گا اور اپنے ان کرم فرماؤں اور دوستوں کو کیا منہ دکھاؤں گا جو پہلے سے کہہ رہے تھے کہ یہی ہوگا۔ ظاہر ہے اسلم صاحب کو یہ سب معلوم تھا۔ میں نے ہفتے دس دن بعد فرحت اللہ انصاری کے ذریعے کہلایا کہ پچاس روپے مہینہ میری ٹیوشن فیس میں سے کاٹ لیے جایا کریں تو اسلم صاحب نے کہا کہ میں نے یہ روپے قرض سمجھ کے نہیں دیے تھے لیکن میری اس دھمکی کے بعد کہ وہ رقم کی ادائیگی کے لیے میری شرائط پر راضی نہ ہوئے تو میں ٹیوشن کا سلسلہ ختم کر کے یہ رقم قسطوں میں ادا کر دوں گا انھیں میری بات ماننی پڑی۔

میرا خیال ہے کہ اسلم رضوی میری بات ماننے پر راضی صرف یہ سوچ کر ہوئے ہوں گے کہ اس ضدی شخص نے واقعی ٹیوشن چھوڑ دیا تو اپنی اسی روپے ماہانہ کی تنخواہ میں سے پچاس روپے ادا کر کے زندہ کیسے رہے گا۔

خیر یہ تو میری اپنی رائے ہے، غلط بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن بعد کے بیس مہینوں میں جب تک پچاس روپے مہینہ وضع کرنے کا سلسلہ جاری رہا اسلم رضوی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک بار بھی مجھ سے بات نہ کی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میری ٹیوشن فیس سے پچاس روپے جبراً کاٹ رہے ہوں۔

اسلم رضوی نے لکھنؤ کے میئر کا الیکشن بھی لڑا تھا۔ مخالف امیدوار کو جن سنگھ کی حمایت حاصل تھی اور وہ بطور آزاد امیدوار میدان میں تھے۔ آخر میں معاملہ صرف تین ووٹوں پر اٹک گیا۔ انھی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ اتنے ہی کارپوریٹر سائیکلیں چاہتے ہیں۔ سنا یہ بھی کہ ان میں دو کارپوریٹر وہ ہیں جن کی کامیابی کے لیے میں نے اپنے ایک عزیز، سلیم بھائی، کی کھل کر مخالفت کی تھی۔ سائیکل کی بات اسلم رضوی سے کہنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی لیکن میں نے ڈاکٹر سدھو کو جو اُن دنوں روزانہ ہی آتے تھے، بتا دی۔ انھیں بھی بھنک لگ چکی تھی۔ انھوں نے اسلم رضوی سے کہا کہ سائیکلوں کا کیا ہے دے دیجیے۔ اسلم صاحب کو یہ بات اچھی نہ لگی اور انھوں نے ڈاکٹر سدھو سے

کہا، ''آپ چار سائیکلوں کی بات کرتے ہیں۔ میں ان کی قیمت کی پچاس گنی رقم جس تعلیمی ادارے کو کہیے دے دوں لیکن ووٹ توڑنے کے لیے ایک پیسہ خرچ نہ کروں گا۔ ان کے اس فیصلے نے ہی شکست ان کی قسمت میں لکھ دی۔

اس شکست سے قطع نظر، مجھے اللہ میاں سے یہ ضرور پوچھنا ہے کہ کیا تو نے وہ سانچے توڑ دیے ہیں جن میں اسلم رضوی ایسے شریف اور اصول پرست لوگ ڈھالے جاتے تھے۔

سید صدیق حسن

ان دنوں جب سمپورنانند یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے انڈین سوشلزم (Indian Socialism) کے نام سے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب کا موضوع سوشلزم اور ہندوستان سے متعلق تھا۔ سال دو سال قبل آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انگریزی ماہنامے میں سوشلزم پر پنڈت نہرو کا ایک مضمون شائع ہوا اور روسی اسکالر رودِن (Rudin) نے اس کا مفصل جواب دیا۔ بعد میں پنڈت نہرو نے ایک طویل مضمون لکھا جس کی حیثیت جواب الجواب کی تھی۔[1] سمپورنانند نے ان تینوں مضامین میں ظاہر کیے جانے والے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر پیش کر کے چاروں مضامین پر مشتمل ایک کتاب شائع کر دی۔

سمپورنانند یوگ درشن کے ماہر تھے اور سوشلزم کو ہندوستان کے قدیم فلسفے کے چوکھٹے میں سجا کر دیکھتے۔ انھیں سوشلزم کی سائنسی تعبیر کسی طرح قابلِ قبول نہ تھی اور وہ اس کی ایسی تعبیر کے مؤید تھے جو ہندوستان کی بے حد قدیم معاشرت اور فکر سے ہم آہنگ ہو۔

نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر ایم۔ چلپت راؤ نے، شاید اس خیال سے کہ مجھے سوشلزم سے دلچسپی ہے اور فلسفہ سے بھی، تبصرے کے لیے یہ کتاب مجھے دے دی۔ میں نے تبصرہ کیا جو اخبار کے اتوار کے ضمیمے میں تین یا چار کالمہ سرخی کے ساتھ شائع ہوا۔ ان دنوں کے اخباروں کے ہفت روزہ ضمیموں میں لمحۂ گریزاں کے کوائف کے ساتھ ایسے مضامین بھی شائع ہوتے تھے جن کی کچھ نہ کچھ ادبی اور فکری حیثیت ہوتی۔ (میں نے یہ تبصرہ اخبار کے سینیر سب ایڈیٹر اے۔ کے۔ ورما کو

ا۔ سوشلزم کی جانب پنڈت نہرو کے خیالات میں تبدیلی کو سمجھنے کے لیے تلاش ہند (Discovery of India) کے ساتھ ان دونوں مضامین کا مطالعہ ضروری ہے۔

دکھلایا تھا اور انھوں نے زبان و بیان کی چند خامیاں درست کی تھیں۔) یہ تبصرہ دلچسپی سے پڑھا گیا اور کافی ہاؤس میں تقریباً ایک ہفتے تک موضوعِ بحث رہا، خاص طور سے یوں کہ اس میں سمپورنانند کے نقطۂ نظر سے شدید اختلاف کیا گیا تھا، اگرچہ آخری جملہ کچھ اس طرح کا تھا کہ ان کے فرمودات بھی توجہ طلب ہیں۔

اسلم رضوی نے کتاب کے مطالعے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اپنی کتاب انھیں فراہم کردی۔ وہ مطالعے کے شوقین تھے اور ان کے ذاتی کتب خانے میں سیکڑوں کتابیں تھیں لیکن اس وقت تک حضرت گنج کی کسی انگریزی کتاب کی دوکان میں یہ کتاب دستیاب نہ تھی ورنہ انھیں اس کے لیے مجھ سے نہ کہنا پڑتا اور میں سید صدیق حسن صاحب سے متعارف ہونے کی سعادت سے محروم رہ جاتا۔

تبصرہ صدیق حسن نے بھی پڑھا تھا۔ وہ مجھ سے واقف نہ تھے۔ میرے بارے میں انھیں اسلم رضوی سے معلوم ہوا تو انھوں نے نیشنل ہیرالڈ فون کر کے کتاب کے مطالعے کے لیے اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔ چند روز بعد میں کتاب دینے ان کے گھر چلا گیا۔ پریس کلب کے پاس ہی ان کا گھر تھا، ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی پہلی بار تھا۔ ان دنوں آئی۔ اے۔ ایس افسران کے بارے میں جو تصور تھا وہ اس سے قطعاً مختلف تھے۔ ویسے وہ آئی۔ اے۔ ایس تھے بھی نہیں بلکہ اتر پردیش کے سب سے سینیر آئی۔ سی۔ ایس تھے۔

حسن صاحب کی شرافت، دوست داری اور انسان دوستی کے قصے مشہور تھے جن میں سے ایک، جس کا ذکر کئی لوگ مجھ سے کر چکے تھے، کچھ اس طرح تھا۔

ان کے ایک ہندو دوست جو سرگرم کانگریسی تھے، ۱۹۴۲ء کی تحریک میں گرفتار کر لیے گئے۔ انگریزوں کی حکومت کے دوران کسی اعلیٰ سرکاری افسر کا کسی کانگریسی اور خاص طور سے ایسے شخص سے جو جیل میں ہو ربط ضبط رکھنا مصلحت کے خلاف تھا لیکن وہ ہر ہفتے اپنے دوست سے ملنے جیل جاتے اور ان کے خاندان کے مسائل حل کرنے میں بھی مدد کرتے۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں اپنے دوست کے انتقال کے بعد صدیق حسن نے نہ صرف ان کے بیٹے کی تعلیم کا سارا بوجھ اٹھایا بلکہ ان کی بیٹی کی شادی بھی دھوم دھام سے کی۔

میں افسروں کے نازنخروں سے گھبراتا تھا (اب بھی یہی صورت ہے) اور ان سے دوری برقرار رکھنے میں ہی اپنی عافیت جانتا۔ ویسے میری حیثیت بھی ایسی نہ تھی کہ صدیق حسن

ایسے اعلیٰ افسر سے ربط ضبط رکھ پاتا لیکن ان کا معاملہ بالکل مختلف نکلا۔ ان کو کتاب دینے گیا اور ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بالکل ہی دوسری طرح کے افسر نکلے۔ ان میں افسری کی خو بو نہ تھی۔ بنگلے کے باہر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان میں کئی ایسے تھے جن سے میں کم سے کم صورتاً واقف تھا۔ ان میں قاضی باغ کے نوابو صاحب بھی تھے۔ جنھوں نے ''روغن شفا'' نام کا ایک تیل بنایا تھا۔ لیکن میں انھیں بالکل دوسری طرح جانتا۔ برسوں پہلے وہ میرے ایک افسانے ''مدد کا خواستگار'' کی جانے کس بات سے خفا ہو کر میری خبر لینے چڑھ دوڑے تھے، خواجہ رائق اتفاق سے وہاں نہ پہنچ گئے ہوتے تو نوابو صاحب میری دھنائی کر دیتے۔ میں پہنچا تو صدیق حسن صاحب نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ نام بتانے کی ضرورت یوں نہ پڑی کہ رضا انصاری نے مجھے دیکھتے ہی بتا دیا تھا اور انھوں نے تشریف لائیے سہیل صاحب، کہتے ہوئے مخاطب کیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں واپس ہونے لگا تو انھوں نے کہا کبھی کبھی تشریف لے آیا کیجیے۔ میں نے کہا، ''کتاب لینے کب آؤں؟'' ہنسنے لگے اور بولے، ''میں اس کے بعد کی بات کر رہا ہوں۔'' خیر میں کبھی کبھی حاضری دینے گا لیکن ملاقاتوں کی درمیانی مدّت دو ڈھائی مہینے سے کم نہ ہوتی، اگرچہ کتاب لینے پندرہ بیس دن کے بعد ہی پہنچ گیا تھا۔

انھوں نے کتاب پڑھ لی تھی۔ میرے تبصرے کے بارے میں کہنے لگے کہ ''میں نے پہلے ہی پڑھ لیا تھا اچھا ہے لیکن اب کتاب پڑھنے کے بعد یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا آخری جملہ ضروری تھا۔'' (میرے پاس ہفت روزہ ضمیمے کا وہ شمارہ محفوظ تھا لیکن جانے کیا ہوا۔ اس لیے وہ آخری جملہ تو نقل نہیں کر سکتا لیکن خیال ہوتا ہے کہ کچھ اس قسم کا تھا:

> However, Sampurnand's point of view also needs to be pondered upon.

''سارے تبصرے میں سمپورنا نند جی کے نقطۂ نظر پر سخت اعتراضات کیے گئے ہیں، میں نے سوچا کہ بالکل یک طرفہ نہ معلوم ہو،'' میں نے کہا۔

انھوں نے کچھ کہا تو نہیں لیکن میری بات سے کچھ زیادہ متاثر نہ معلوم ہوتے تھے۔

کچھ دنوں بعد ایک پریشان کن بات ہو گئی۔ ہوا یہ کہ میرا خالہ زاد بھائی عبدالرحمٰن کا جو محکمۂ سیلس ٹیکس میں ایک معمولی سی جگہ پر ملازم تھا، کانپور تبادلہ کر دیا گیا۔ دفتروں میں تبادلے ہوا ہی کرتے ہیں اور ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی لیکن یہ معاملہ مختلف تھا۔ خالو کا انتقال بہت پہلے

ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی بیوہ ماں اور چھوٹی بہن کا واحد کفیل تھا۔ اس تبادلے کا ایک پس منظر بھی تھا۔

محکمۂ سیلس ٹیکس کے کمشنر مجتبیٰ صدیقی تھے جو نہایت ایماندار اور اصول پرست افسر کی حیثیت سے مشہور تھے اور ہمارے دور کے عزیزوں میں تھے۔ عبدالرحمٰن کی تقرری انھی نے کی تھی اور اب وہ ریاستی حکومت کی ملازمت سے مستعفی ہو کر بطور مشیر مالیات سری نگر جا چکے تھے۔ عبدالرحمٰن کا تبادلہ دراصل اسے پریشان کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

مجتبیٰ صدیقی کے مستعفی ہونے اور سری نگر جانے کا بھی ایک پس منظر تھا۔ وہ بھی سن لیجیے۔

اتفاق سے ریاستی اسمبلی کا الکشن ان دنوں میں ہونا قرار پایا تھا جب محکمۂ سیلس ٹیکس اپنے واجبات سے تاجروں کو مطلع کرتا ہے۔ واجبات کی یہ رقم پچھلے سال کی ادائیگی سے ہمیشہ بڑھا چڑھا کر آنکے جانے کے سبب تاجروں کے دلوں میں حکومت کے خلاف رنجش ضرور پیدا کر دیتی ہے۔

سی۔ بی۔ گپتا نے جو وزیر مال تھے مجتبیٰ صدیقی سے کہا کہ سیلس ٹیکس کے یہ نوٹس الیکشن بعد بھیج دیجیے گا لیکن انھوں نے تحریری حکم کے بغیر برسوں کی روایت میں کسی قسم کی تبدیلی سے معذرت کر لی۔ اتفاق سے گپتا جی الکشن ہار گئے اور سمجھا یہ گیا کہ ان کی شکست کا سبب یہ ہے کہ تجارت پیشہ لوگوں نے بھی انھیں ووٹ نہیں دیے۔

گپتا جی نئی حکومت میں وزیر تو نہیں بن سکے لیکن حکومت بہر حال انھی کی پارٹی کی تھی جس نے بطور سزا مجتبیٰ حسین کو ترقی دے کر ایک غیر اہم عہدے پر منتقل کیا تو انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور کشمیر چلے گئے۔

عبدالرحمٰن کے تبادلے سے خالہ جان کے یہاں بہت پریشانی تھی۔

ایک دن مجھے خیال ہوا کہ صدیق حسن صاحب سے ذکر کروں۔ وہ بورڈ آف ریونیو کے سینیر ممبر (یعنی سربراہ) تھے۔ اس وقت مجھے اندازہ نہ تھا کہ ریاستی گورنر اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے بعد وہ بہ اعتبار عہدہ سب سے اوپر ہیں اور سارے سرکاری افسران ایک طرح سے ان کے ماتحت۔ غرض کسی اتوار کو خاص طور سے اسی سلسلے میں ان کے گھر گیا اور مسئلے کا ان سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ کسی ماتحت افسر سے سفارش حکم ہو جاتی ہے اس لیے یہ مناسب نہ ہوگا۔

میں نے ان کی بات خاموشی سے سنی، ظاہر ہے مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انھوں نے مجھ سے دو باتیں پوچھیں۔ ایک تو یہ کہ کیا مسئلہ یعنی پریشانی واقعی Genuine ہے اور دوسری یہ کہ تبادلہ کسی دفتری گڑ بڑ کے سبب تو نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے اپنے علم و یقین کے مطابق انھیں مطمئن کر دیا تو انھوں نے کہا کہ منگل کے دن انھیں لے کر ساڑھے دس بجے میرے دفتر آ جائیے۔

عبدالرحمٰن کے ساتھ میں مقررّہ وقت پر بورڈ آف ریونیو پہنچا تو انھوں نے ہم دونوں کو گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ ذرا سی دیر میں چائے بسکٹ آ گئے۔ دس پندرہ منٹ بعد انھوں نے ایک کلرک سے جو غالباً ان کا پرسنل سکریٹری تھا کہا کہ کل جو کاغذات ٹائپ کرائے تھے ان میں سے پہلا سیٹ لے آیئے۔ کاغذات آ گئے تو انھیں عبدالرحمٰن کی طرف بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان پر دستخط کر دیجیے اور ایک کاپی اپنے پاس رکھ لیجیے۔ یہ ڈویزنل کمشنر کے دفتر میں کسی جگہ کے لیے عبدالرحمٰن کی درخواست تھی۔ اس وقت ڈویزنل کمشنر کے۔ کے۔ داس تھے۔ اب دوسرا سیٹ منگایا گیا۔ یہ محکمۂ سیلس ٹیکس سے استعفےٰ کی دو کاپیاں تھیں۔ ظاہر ہے عبدالرحمٰن ان پر دستخط کرنے میں جھجھک رہے تھے لیکن میں نے اشارہ کیا تو اس نے دستخط کر دیے۔ اس کے بعد صدیق حسن صاحب نے اپنے دفتر کے ایک کلرک کے ذریعے استعفیٰ اور اس کی نقل سیلس ٹیکس آفس، جو ہلو اسیا مارکیٹ کے سامنے کی عمارت میں تھا، بھجوائی اور اسے ہدایت کی کہ نقل پر دستخط کرا کے مہر بھی لگوا لے۔ اس کے بعد چائے کا ایک اور دور چلا اور کچھ شعر و شاعری کی باتیں ہوئیں۔ اتنی دیر میں وہ کلرک آ گیا اور اس نے استعفےٰ کی وہ کاپی جس پر وصولیابی کی رسید کے طور پر دستخط کر کے مہر لگا دی گئی تھی صدیق حسن صاحب کے سامنے پیش کر دی۔ انھوں نے اس کاغذ کو غور سے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے کہ اسے حفاظت سے رکھیے گا، عبدالرحمٰن کی طرف بڑھا دیا۔

اب ایک دلچسپ بات ہوئی، انھوں نے عبدالرحمٰن کی یہ درخواست ڈویزنل کمشنر کے دفتر بھجوانے کے بعد ان سے کہا، ''برخوردار اب آپ میرے سامنے بیٹھ نہیں سکتے۔'' میرا خیال ہے انھوں نے سوچا ہوگا کہ وہ داس صاحب کے دفتر جا کر یہاں کی طرح فوراً بیٹھ نہ جائیں۔

دو دن بعد ڈویزنل کمشنر کے دفتر میں عبدالرحمٰن کا تقرّر ہو گیا۔

مجھے یہ سب ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ صدیق حسن صاحب سے ملاقات بس چار چھے بار کی تھی اور میں زیادہ سے زیادہ یہ دعوا کر سکتا تھا کہ ان سے واقف ہوں۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ

ان کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ اس دن بھی بس سلام کر کے چلا آیا تھا۔ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ شکریے کے الفاظ بہت چھوٹے لگتے اور ایسا کچھ مجھے آتا نہ تھا کہ یہ الفاظ بڑے ہو جاتے۔ ایک دقت اور تھی، شام میں جب بھی گیا چار پانچ لوگ ضرور موجود تھے۔ میں یہ بھی سوچتا کہ سب کے سامنے شکریہ ادا کر کے میں دوسروں کو انھیں پریشانی میں ڈالنے کی دعوت ہی دوں گا۔ پھر بھی عبدالرحمٰن کی نئی تقرری کے آٹھ دس دن بعد ایک شام میں ان سے ملنے گیا۔ حسبِ دستور وہاں چار پانچ لوگ بیٹھے تھے اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ دل میں ایک کھٹکا یہ بھی لگا تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ کہیں یہ نہ سوچیں کہ پھر کوئی کام لے کر آ گیا، لیکن انھوں نے جس خوش دلی سے ''اہا'' کہا اس سے سارے خدشات جاتے رہے۔

ابھی میں نے چائے پینا شروع ہی کی تھی کہ ایک صاحب تشریف لے آئے اور کچھ کہے سنے بغیر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ نو وارد کو اس حالت میں دیکھ کر انھوں نے کہا کہ سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی اپنی جگہ پہنچا کر تشریف رکھیے اور چوں کہ میں آپ سے واقف نہیں اس لیے اپنا تعارف کرائیے۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ آخر بے حد اصرار کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ تو گئے لیکن پریشانی پہلے کی طرح اب بھی ان کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

کئی بار کے کہنے کے بعد انھوں نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ کوئی مسٹر سریواستوا تھے، دفتر روزگار (Employment Exchange) کے ڈائرکٹر۔

''فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' صدیق حسن نے کہا۔

ان صاحب نے پھر ہاتھ جوڑ لیے اور تقریباً ہکلاتے ہوئے بولے۔

''حضور آپ براہ راست تقرریاں کر لیتے ہیں۔ آپ جس کو بھی رکھنا چاہیں اسے بھیج دیں۔ ہم اسی کا نام آپ کے پاس بھیج دیا کریں گے۔''

صدیق حسن نے کہا، ''آپ ہاتھ جوڑنا ختم کریں تو میں کچھ کہوں''۔

انھوں نے دھیرے دھیرے ہاتھ الگ کر لیے تو حسن صاحب نے کہا، ''ہر جگہ سر پھوڑنے کے بعد ہی کوئی میرے پاس آتا ہے۔ اب میں اس سے کہوں کہ Employment Exchange میں اپنا نام درج کرا کے آؤ تو یہ اس کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی؟''

''حضور ہمیں بھی خدمت کا موقع دیجیے... بس ذرا سی قاعدے قانون کی بات ہے،'' انھوں نے کہا۔

اب ہاتھ جوڑنے کی باری صدیق حسن کی تھی۔ انھوں نے دونوں ہتھیلیاں ملائی ہی تھیں کہ سریواستواجی اپنی کرسی سے اٹھ کر ڈرتے ڈرتے انھیں الگ کرنے لگے۔

"آپ کہتے ہیں قاعدے قانون کی پابندی... میں یہ غلطی کرتا رہوں گا اور ہر بار آپ سے معافی بھی..."

اتنے میں صرف ان کے لیے چائے اور بسکٹ آگئے کیوں کہ پہلا دور ختم ہو چکا تھا اور کوئی چائے کی دوسری پیالی پینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی دوران کچھ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ اب لوگوں نے رخصت ہونا شروع کیا جن میں پہلے سریواستوا صاحب تھے۔ صدیق حسن نے انھیں کھڑے ہو کر رخصت کیا۔

الٰہ آباد سے یا وہاں سے ہو کر ان سے ملنے لوگ تقریباً روزانہ آیا کرتے۔ شاید بورڈ آف ریونیو کا کوئی ذیلی دفتر وہاں بھی تھا۔ صدیق حسن دفتر سے واپس آنے کے بعد ایک پیالی چائے پیتے اور پھر ان لوگوں سے ملاقات کر کے درخواستیں اور میمورنڈم وغیرہ لے لیا کرتے۔ ایک دن رضا انصاری نے کہا، "آپ دفتر سے تھکے تھکائے آتے ہیں اور پھر یہاں دفتر لگا کر بیٹھ جاتے ہیں، اگلے دن صبح کے وقت ملاقات کر لیا کیجیے۔"

"رضا میاں،" صدیق حسن نے کہا، "کیا کروں، کوشش کے باوجود دفتر میں سب سے ملاقات نہیں کر پاتا تو یہاں ان کی بات سن لیتا ہوں اور وہ اسی رات اپنے گھر لوٹ جاتے ہیں۔ اگلی صبح ان سے ملوں تو خواہ مخواہ زیر بار ہوں گے۔"

ان دونوں واقعات کا عینی شاہد ہوں۔ اپنا ایک واقعہ بیان کر ہی چکا ہوں۔

عبدالرحمٰن کے واقعے کی شہرت سارے خاندان میں پھیل گئی اور لوگ سمجھے کہ صدیق حسن صاحب سے میرے تعلقات بہت گہرے ہیں جب کہ وہ مجھ سے صرف واقف تھے۔ میری اور ان کی حیثیتوں اور عمروں میں فرق اتنا تھا کہ قریبی تعلقات ممکن نہ تھے، لیکن یہ بات کوئی مان ہی کے نہ دیتا۔

ایک دن میرے سگے خالہ زاد بھائی نصیرالدین حیدر، جنھیں میں نجھو بھائی کہتا تھا، تین لوگوں کے ساتھ جون پور سے آگئے، بقول ان کے ایک معمولی سے کام کے لیے۔ یہ معمولی سا کام تھا شہر کے ڈپٹی کلکٹر کے تبادلہ کی منسوخی۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا کہ صدیق حسن صاحب سے میری

بس جان پہچان ہے اور اتنے بڑے کام کے لیے میں ان سے نہیں کہہ سکتا لیکن میری بات ماننے کے لیے وہ تیار نہ ہوئے۔

میں سمجھتا تھا کہ دو تین دن میں میری مجبوری ان کی سمجھ میں آ جائے گی لیکن انھوں نے اعلان کر دیا کہ کام کرا کے ہی واپس جائیں گے۔ نچھو بھائی بوجھ بن ہی نہ سکتے تھے لیکن جہاں ایک ایک روپے کے کام طے ہوں اور انسان خود اپنے آپ پر بوجھ بننے کے لیے مجبور ہو وہاں تین تین لوگوں کی مہمان داری مصیبت ہی بن سکتی تھی اور بن گئی تھی۔

آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ ان سب کو ساتھ لے کر صدیق حسن صاحب کے یہاں گیا۔ انھیں بنگلے کے باہر، جہاں سے دروازہ نظر نہ آتا تھا چھوڑ کر خود لان پار کر کے اس گیلری میں پہنچ گیا جس سے ہو کر میں نے انھیں اپنے گھر میں داخل ہوتے بارہا دیکھا تھا۔ وہاں ایک چپراسی کھڑا تھا اس نے کہا صاحب دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں، ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اس وقت تک سب کچھ میرے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ واپس آ کر کہہ دوں گا کہ انھوں نے کہا ہے کہ ایک بار احکامات جاری ہو جائیں تو واپس نہیں لیے جا سکتے۔ میں نے ایک کاغذ پر اپنا نام لکھا اور چپراسی کو دیتے ہوئے کہا کہ صاحب کو دے دینا اور میرا سلام بھی کہنا۔

اتنے میں گیلری میں کھلنے والی کھڑکی پاٹوں پاٹ کھلی۔ یقین مشکل سے آئے گا لیکن میں کہہ رہا ہوں تو ایک بار مان ہی لیجیے۔ سامنے تولیہ لپیٹے صدیق حسن کھڑے تھے۔

''سہیل صاحب، تشریف رکھیے میں ابھی آیا۔''

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ دس بارہ منٹ میں وہ آ گئے۔ چائے آ گئی اور انھوں نے پوچھا، ''کیسے زحمت کی؟''

''یوں ہی'' میں نے جھوٹ بولا، ''پریس کلب آیا تھا، سوچا آپ کو بھی سلام کرتا چلوں۔''

''آپ شام کو تو تشریف لاتے نہیں۔ اس وقت جب آپ کو معلوم ہے کہ میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا ہوں گا...''

میں نے انھیں جملہ پورا نہ کرنے دیا اور کہا، ''کام واقعی کوئی نہیں، بس یوں ہی چلا آیا۔''

لیکن انکار و اصرار کی اس لڑائی میں انھوں نے مجھے شکست فاش دے دی اور میں اپنا

سارا منصوبہ اگل دینے پر مجبور ہو گیا۔

"سہیل صاحب مجھے بے حد شرمندگی ہے کہ یہ کام ممکن نہ ہو سکے گا۔ وہ ڈپٹی کلکٹر بے حد بے ایمان ہے اور اس کا تبادلہ خود میں نے کیا ہے،" انھوں نے کہا

اس کے بعد تقریباً پانچ چھے منٹ تک میں یہ کہتا رہا کہ کسی قسم کی سفارش لے کر ہرگز نہیں آیا ہوں اور وہ معذرت کرتے رہے کہ ایک معمولی سا کام نہ کر سکے۔

آخر یہ کہتے ہوئے کہ" آپ کو آفس جانا ہے اور اور مجھے بھی،" میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے واپس آ کر ساری بات نچھو بھائی اور ان لوگوں کو جو اُن کے ساتھ تھے بتا دی۔ وہ بہت مایوس تھے۔

ہم لوگ ساتھ ساتھ قیصر باغ تک آئے۔ میں آفس چلا گیا اور وہ لوگ میرے گھر۔

دو بجے کے قریب کسی نے بتایا کہ میرا فون ہے۔ میں نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف صدیق حسن تھے۔ پھر وہی صبح والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ معذرت کرتے رہے کہ میرا معمولی سا کام نہ کر سکے اور میں اصرار کہ نہ میرا کوئی کام ہے نہ میں نے کوئی سفارش کی ہے۔

آخر انھوں نے کہا،" تبادلہ خود میں نے کیا تھا، کسی اور نے کیا ہوتا تو روک دیتا... لیکن میں نے ان صاحب کا تبادلہ منسوخ کر دیا ہے جو اُن سے چارج لینے جا رہے تھے۔"

میرے ہاتھ سے ٹیلی فون گرتے گرتے بچا۔

گھر آ کر میں نے نچھو بھائی کو یہ خوش خبری سنائی اور اگلے دن مطلع صاف ہو گیا۔

صدیق حسن صاحب کا انتقال ہند۔ پاک سرحد پر دورۂ قلب سے ہوا۔ ان کا جسدِ خاکی لکھنؤ پہنچا تو شہر میں جیسے کہرام مچ گیا۔ ان کے آخری سفر میں سوگواروں کی تعداد اتنی تھی کہ بزرگوں کے مطابق ان کی آنکھوں نے شہر میں اتنا بڑا جنازہ نہ دیکھا تھا۔

سیّد محمود حسن اشفاق رضوی

اشفاق رضوی حامد حسین اسلم رضوی کے منجھلے بھائی تھے اور میری اور ان کی عمروں میں اتنا زیادہ فرق نہ تھا کہ حدِ ادب دوستی کے رشتے استوار نہ ہونے دے۔ دھیرے دھیرے وہ میرے دوست نہیں تو دوست کے سے ضرور ہو گئے۔ تسلیم کہ ہم نے ساتھ ساتھ گنجنگ نہیں کی، پکچر

نہیں دیکھی، لیکن دونوں کے درمیان باہمی اعتماد کی ایسی چادر ضرور تن گئی کہ غلط سمجھے جانے کا خطرہ مول لیے بغیر ہم ہر قسم کی باتیں کر سکتے تھے۔ پھکڑ ہم دونوں نہ ہو سکتے تھے لیکن وہ اتنے لیے دیے بھی نہ رہتے کہ اسلم رضوی ہو جائیں۔

اشفاق رضوی کی مجھ سے دوستی میں فرقت کاکوروی نے خاصا رول ادا کیا۔ فرقت ان کے کلاس فیلو تھے، ان کے ہم عمر لیکن جانے کیسے مجھ سے تعلقات میں عمروں کا فاصلہ خاصا کم ہو گیا تھا۔ اپنی کتاب ''مرحبا'' انھیں دینے آئے تو میں بھی موجود تھا۔ اشفاق صاحب نے کہا کہ کتاب کے نام کی کتابت میں غلطی ہو گئی ہے۔ فرقت حیران تھے۔ انھوں نے آنکھیں گڑا کر دیکھا، کوئی غلطی نظر نہ آتی تو اشفاق محمود رضوی نے کہا، ''اتنی ہی عقل ہوتی تو یہ غلطی کرتے؟ کتابت نہیں اپنے آپ کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ کتاب کا نام ''مربے حیا'' ہونا چاہیے تھا تم نے ''مرحبا'' کر دیا۔'' ہم تینوں نے ایک ساتھ زوردار قہقہہ لگایا۔ میرا قہقہہ سب سے بلند تھا لیکن اب ہم دونوں، فرقت کاکوروی کے بغیر بھی قہقہے لگانے لگے۔ سراج لکھنوی کے بیٹے معراج سے بھی اشفاق رضوی کی دوستی تھی۔ معراج کنگھی والی گلی کے پاس رہتے اور میں غلام محمد آزاد کے یہاں جو اکرام صاحب کے بڑے بھائی اور لوہے کے کارخانے، آزاد انجینئرنگ ورکس، کے مالک تھے۔ مجھ میں اور معراج میں تھوڑی سی دوستی اس مکانی قربت کے سبب ہو گئی تھی۔ وہ اشفاق رضوی کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ عطریات کے تاجر حاجی عبدالقیوم کے بیٹے عبداللہ جب آتے، اور یہ اکثر ہی ہوتا، تو معراج ان کو پل غلام حسین کی دوکان سے تاگوں کے کباب دلوائے بغیر نہ جان چھڑانے دیتے۔ معراج کو اور مجھے ایک ہی طرف جانا ہوتا اس لیے میں بھی ساتھ رہتا اور کباب مجھے بھی ملتے۔ پھر ان کے بغیر بھی کبابوں پر میرا حق قائم ہو گیا۔ اشفاق رضوی سے غائبانہ تعارف نہایت دلچسپ انداز میں ہوا تھا، نئے تعارف سے بہت پہلے، غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔

اشفاق صاحب پاکستان گئے ہوئے تھے کہ نیا دستور نافذ ہو گیا اور آنا جانا پاسپورٹ کے بغیر ممکن نہ رہا۔ ظاہر ہے پریشانی کی بات تھی۔ خیر وہ کسی طرح واپس آئے اور آتے ہی آنریری مجسٹریٹ بنا دیے گئے اور انھوں نے کوئی امتحان بھی دیا۔ اردو کی کچھ کاپیاں ماسٹر بدرالدین کے پاس تھیں، جو انھوں نے مجھے دے دی تھیں کہ ان دنوں مہربان تھے۔ ایک دن فرقت کاکوروی آ گئے، ایک رول نمبر لیے۔ ماسٹر ماموں نے مجھے بھی بلا لیا۔ فرقت کاکوروی نے اور جو کچھ کہا وہ تو کہا ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بہت بڑے رئیس ہیں، لکھ پتی ہیں۔ ماسٹر ماموں

نے خیال رکھنے کا وعدہ کیا اور ان کے جانے کے بعد رول نمبر مجھے دے دیا۔ میں نے کاپی دیکھی، چھتیس نمبر تھے۔ ایک دوسرے امیدوار کے بھی اتنے ہی تھے۔ اس وقت کمیونزم کا سودا دماغ میں متشدد طور سے سمایا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ حضرت تو امیر کبیر ہیں، انھیں ملازمت کی تلاش بھلا کیا ہوگی جب کہ وہ غریب بچ مچ کا اسٹوڈنٹ ہوگا اور اس کے گری اُر کا سوال ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے نمبروں میں تین کا اضافہ کر دیا اور ان کے نمبر اتنے ہی رہنے دیے۔ اس وقت تو ان کی وجہ سے دوسرے کا فائدہ بالکل اتفاق سے ہوگیا، لیکن جانے کتنے ان سے فیض یاب ہمیشہ ہوتے رہے۔

اس وقت میں ان سے واقف نہ تھا۔ بعد میں جب ان سے واقفیت ہوئی اور قربت بھی، کئی بار امتحان کی کاپی کی بات منہ پر آتے آتے رہ گئی۔ ایک بار تو دو چار لفظ مُنہ سے نکل بھی گئے، لیکن پھر میں نے بات پلٹ دی۔

خیر یہ تو بہت پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں جب میں ان کے بچوں کو پڑھاتا تھا اور قربت کے دور کا آغاز ہو رہا تھا، وامق جونپوری کے چھوٹے بھائی حسن مجتبیٰ، جو محکمہ اکسائز میں افسر تھے، سٹی اسٹیشن کے سامنے مقبول احمد لاری کی پہلے والی قیام گاہ کے پاس ہی ایک مکان میں رہتے تھے۔ میری ان سے یاد اللہ تھی۔ ایک دن انھوں نے کشمیر میں کسی کو احمد حسین دلدار حسین کی خوردنی تمباکو کی ایجنسی دلانے کے لیے کہا۔ انھیں ضرور معلوم رہا ہوگا کہ اس کارخانے کے مالکان سے میرے تعلقات ہیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کام کے لیے کسی سفارش کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے چنانچہ میں نے ہامی بھر لی۔

اشفاق صاحب سے ذکر کیا تو وہ کچھ متفکر سے ہوگئے۔ انھوں نے پوچھا، ''ہر مہینے کتنی تمباکو چاہیے؟'' یہ بات میں نے سوچی بھی نہ تھی۔ آخر معلوم کر کے انھیں بتایا تو انھوں نے کہا، ''سہیل صاحب ہمارے کارخانے میں دستور یہ ہے کہ ایک شہر میں ایک ہی ایجنسی دی جاتی ہے۔ ایجنسی کا مالک یا اس کی اولادیں یہ کام چھوڑ دیں تب ہی نئی ایجنسی قائم کی جاتی ہے۔'' پھر انھوں نے متعلقہ شعبہ کے کسی کلرک کو بلایا اور اس سے کہا کہ مطلوبہ تمباکو کی فراہمی پر دوکاندار کو کتنا فائدہ ہوگا؟ اس نے حساب لگا کر رقم بتائی تو انھوں نے کہا، ''جب تک اسے ایجنسی نہ دی جا سکے فائدے کی آدھی رقم ہر ماہ منی آرڈر کر دی جایا کرے۔''

میں حیران و پریشان ان کی صورت دیکھتا رہا۔

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ کہ چوک میں الٰہ آباد بینک کی شاخ احمد حسین دلدار حسین کی فرم کے لیے ہی کھولی گئی تھی۔ ان دنوں یعنی بیسویں صدی کے دوسرے تیسرے دہے میں، پرانے لکھنؤ میں شاید ہی کوئی بینک رہا ہو۔ ان دنوں بینک کی شاخ اس وقت کھولی جاتی تھی جب کوئی فرد واحد کم سے کم پچاس ہزار روپے کا اکاؤنٹ کھولتا یا چند لوگ مل کر۔ اس فرم نے اکاونٹ کھولنے کے علاوہ پچاس ہزار روپے فکسڈ ڈپازٹ کے طور پر جمع کیے تھے جس پر کبھی کوئی سود نہیں لیا گیا۔ کارخانے سے ہر ماہ غریب اور مستحق طلبہ کو منی آرڈر بھیجے جاتے تھے۔ یہ کام اشفاق صاحب کے سپرد تھا۔ ایک دن میں نے کہا کہ سود کی رقم قبول کر کے غریب طلبہ اور دوسروں کی زیادہ مدد کی جا سکتی ہے۔ کہنے لگے خدا نے ہمیں بہت دیا ہے۔ آپ کی نظر میں جو مستحق طلبہ ہوں ان کی فہرست دے دیجیے۔

میں نے کہا کہ غریب غربا کی تعداد تو لامحدود ہے۔ سود سے حاصل ہونے والی رقم صرف اسی کام میں لائی جائے، اسے اپنے استعمال میں نہ لایا جائے تو میرے خیال میں اس رقم کا یہ استعمال کسی مذہبی حکم کی نفی نہیں ہوگی۔

اشفاق صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انھوں نے ایسا جواب دیا جس نے بحث کے سارے دروازے بند کر دیے۔

انھوں نے کہا، ''صحیح اور غلط استعمال کا فرق ہماری نسل تک رہے گا، لیکن ایک بار دروازہ کھل گیا تو ہماری اولادیں یہ فرق قائم نہ رکھ سکیں گی۔''

میں لاجواب ہو گیا۔

ایک دن ایک صاحب، جن سے میں قطعاً واقف نہ تھا، اپنی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ لے کے آئے۔ ظاہر ہے میں نے خوشی کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ ضرور حاضر ہوں گا لیکن الجھ بھی رہا تھا کہ یہ صاحب مجھے کیسے جانتے ہیں اور وہ بھی اس حد تک کہ بیٹی کی شادی میں مدعو کر رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے مقبول احمد لاری اور اشفاق رضوی کے کارڈ دکھاتے ہوئے تھوڑی بہت مدد کے لیے انھیں خط لکھنے کی درخواست کر کے ساری الجھن دور کر دی۔ میں نے یہ کام کبھی کیا نہ تھا۔ لیکن ان کی صورت دیکھ کر، جس پر مفلسی لکھی ہوئی تھی، تیار ہو گیا، تاہم صرف اشفاق صاحب کے لیے، لاری صاحب سے اس وقت میرے ایسے تعلقات نہ تھے، لیکن بعد میں ان کی ضد کے آگے ہار مان کے میں نے انھیں بھی خط لکھ دیا، اگرچہ بہت محتاط انداز میں۔

چار پانچ دن کے بعد وہ صاحب پھر آ براجے۔ لاری صاحب کے بارے میں انھوں نے کہا وہ کہتے ہیں، ''ہم لوگ اس طرح سے مدد نہیں کرتے۔'' مجھے برا تو لگا، لیکن کچھ ہی دنوں میں معلوم ہو گیا کہ ان کا فیصلہ صحیح تھا۔

''اور اشفاق صاحب نے؟'' میں نے پوچھا۔

''انھوں نے خط پڑھ کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور کہا، اچھا... آپ ایک بار اور خط لکھ دیں تو شاید کام ہو جائے؛'' ان صاحب نے کہا۔

''بھائی جب پہلی بار میں خط کا اثر نہیں ہوا تو دوسری بار میں کیا ہوگا،'' میں نے کہا تو بہت نرم انداز میں لیکن کچھ اس طرح کہ یہ کام ہر گز نہ کروں گا۔

خیر، وہ صاحب چلے گئے۔ خاصے ملول معلوم ہوتے تھے۔ ان کا دعوت نامہ میں نے میز پر سامنے ہی رکھا تھا لیکن تاریخ آئی تو اس شرمندگی کے سبب تقریب میں شرکت کا ارادہ ترک کر دیا کہ مدد تو کچھ کر نہ سکا اور دعوت کھانے پہنچ جاؤں۔

شام میں بچوں کو پڑھا کے کمرے سے باہر نکلا تو وہاں اشفاق رضوی کی کار کھڑی تھی، بڈ کھلا ہوا تھا اور اس میں سے برتن نکالے جا رہے تھے۔ میں حیرت سے ان برتنوں کو دیکھ رہا تھا۔ حیرت مجھے اس پر تھی کہ خود وہ برتن خریدنے گئے تھے۔ اتنے میں وہ اندر سے آ گئے اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں بولے۔

''یہ برتن آپ کے ہیں۔''

''میرے؟'' میں نے حیرت سے کہا

''اور کیا، آپ ہی نے تو خط لکھا تھا۔ شادی تو دور کی بات وہاں تو کوئی اس نام کا رہتا بھی نہیں۔''

پہلے ہی دن جب وہ صاحب کارڈ لے کے آئے تھے مجھے بھی خیال آیا تھا کہ امین آباد میں پنجاب سائیکل ورکس کے پاس کوئی رہائشی مکان تو ہے نہیں لیکن پھر سوچا کہ ان ڈھلانوں پر جو اس سڑک کو لاٹوش روڈ سے ملاتی ہیں ممکن ہے لوگ رہتے ہوں اور پھر بھول بھال گیا۔

میرے ابا اکثر اماں سے کہا کرتے تھے کہ غیر مستحق کی مدد کرنا نہ صرف یہ کہ ثواب نہیں بلکہ گناہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سن کر اماں کیا کہتی تھیں لیکن ایک دن میں نے ابا سے پوچھ لیا تھا، ''ابا یہ گناہ کیسے ہو گیا؟''

میری بات سن کر وہ مسکرائے تھے، اسی طرح جیسے وہ مسکراتے تھے۔ ہونٹوں کو معمولی سی جنبش ہوتی، آنکھیں ذرا سی پھیلتیں اور گالوں میں ہلکا سا گڈھا پڑ جاتا۔ پھر انھوں نے کہا تھا، ''دوسروں کا حق مارا جاتا ہے۔''

بات سمجھ میں تو اسی وقت آ گئی تھی لیکن پوری طرح سمجھ میں اب آئی۔

ظاہر ہے اب یہ برتن مستحق لوگوں کو دے دیے گئے ہوں گے۔ ان صاحب کو نقد روپے دے دیے جاتے تو ان غریبوں کا حق مارا جاتا۔

بی۔اے۔ کے طویل برسوں میں ایک سال ظہیر عباس نام کے ایک لڑکے سے قربت ہوگئی۔ اس کی حالت میری ہی ایسی تھی، میری ایسی تو نہیں بلکہ کچھ بہتر۔ میری تھوڑی سی دوستی تھی۔ دوستی بھی کیا بس ذرا سی جان پہچان کہہ لیجیے۔ معلوم نہیں کیسے پتہ لگا کہ وہ شدید بیمار ہے اور میڈیکل کالج میں داخل۔ ان دنوں میڈیکل کالج یونیورسٹی سے ملحق تھا اور یونیورسٹی کے طلبہ کے ساتھ وہاں دامادوں کا سا سلوک ہوتا۔ بہت سے لڑکے اس کا فائدہ اٹھاتے اور پندرہ بیس دن آرام کرنے، پھل پھلاری کا مزا لینے اور آنکھیں سینکنے کے بعد خود کو ڈسچارج کرا لیتے۔ پہلا خیال تو یہی ہوا۔ لیکن ظہیر عباس ایسا نہیں تھا۔ اسے دیکھنے گیا۔ وہ واقعی بیمار تھا۔

پھر ایک دن کیشیئر آفس کے باہر ''نادہندوں'' کی فہرست میں اپنا نام اور رقم ڈھونڈھ رہا تھا کہ یکا یک اس کے نام پر نظر پڑی۔ اسے امتحان کی فیس اور کئی قسطیں دینی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اس بیماری کے سبب معلوم نہیں امتحان وہ دے پائے یا نہ دے پائے لیکن فیس تو دینا ہی ہوگی۔

ایک دن اشفاق رضوی سے ذکر کیا۔ اس کی غربت کے بارے میں تو بتایا لیکن میڈیکل کالج میں بھرتی ہونے کا ذکر نہیں کیا کہ کہیں امتحان نہ دے سکنے کا امکان اس کی مدد میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ رؤسا کے پاس تفصیل میں جانے کا وقت کہاں ہوتا ہے۔

''ان سے کہیے کہ مجھ سے مل لیں،'' انھوں نے کہا اور تیزی سے گھر میں چلے گئے۔ وہ تیز تیز ہی چلتے تھے۔

میں بچوں کو پڑھا رہا تھا کہ ان کے ملازم نے چک اٹھا کر کہا، ''بھیا نے کہا ہے کہ جانے سے پہلے مجھ سے کہلوا دیجیے گا'' میں رخصت ہونے لگا تو کہلا دیا۔ ذرا کی ذرا میں آ گئے۔ بولے، ''اسے بھیجنے کی کیا ضرورت، آپ ہی دے دیجیے گا۔'' پھر ہم لوگ دوسری باتیں کرنے لگے۔ میں رخصت ہونے لگا تو انھوں نے کہا، ''ٹھہریے میں ابھی آیا۔'' ذرا دیر میں لوٹے، شاید

دو سو روپے مجھے دیے اور کہا" آپ ایسا کیجیے کہ خود ہی فیس جمع کر دیجیے، اسے بتایا بھی کیوں جائے۔"

اگلے دن ظہیر عباس کی فیس میں نے جمع کر دی۔ کچھ روپے بچے تھے جو میں نے رسید میں لپیٹ کر انھیں دے دیے۔ وہ سمجھے کہ صرف رسید ہے اور انھوں نے باتیں کرتے کرتے اسے پھاڑنا شروع کیا۔ معاً مجھے خیال آیا، میں نے کہا اس میں دو تین نوٹ بھی ہیں۔ انھوں نے جس تیزی سے جھک کر پھٹے ہوئے کاغذات اٹھائے اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ انھوں نے یہ حیرت میری آنکھوں میں پڑھ لی اور بولے" روپے ضائع نہیں کرنا چاہیے"۔

مقبول احمد لاری

مقبول احمد لاری صاحب کے یہاں کبھی کبھی آنا جانا دلچسپ طریقے سے شروع ہوا۔ ایک دن خط آیا کہ میرے افسانوی مجموعے" سب سے چھوٹا غم" کو میر اکادمی نے انعام سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حیرت خاص طور سے یوں تھی کہ میں نے کتاب داخل نہ کی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کام حضرت جمیل مہدی کا تھا۔

"ماہنامہ کتاب" کا سلسلہ اشاعت بند ہو چکا تھا اور ان دس بارہ برسوں میں لاری صاحب کی شخصیت پر سے بہت سی گرد چھٹ چکی تھی، الّا اس کے کہ نیپال میں ان کا شراب کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ شراب کے اسی کاروبار کے سبب ندوۃ العلماء نے لاری صاحب کی اس وقت کے لاکھوں روپے کی پیش کش ٹھکرا دی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ لاری صاحب کی گولڈن جبلی کے موقع پر جو نہایت شان وشوکت سے رفاہ عام کلب کے لان میں منائی گئی تھی، نیپال کے درجنوں روسا کے علاوہ مہاراجہ نیپال اور خود اپنے اور اپنی حکومت کے تحفے تحائف لے کر وزیر اعظم نیپال بہ نفس نفیس تشریف لائے تھے۔ لاری صاحب کو دولت کی کیا کمی تھی چنانچہ انھوں نے رقوم اور سارے تحفے اسی وقت مختلف اداروں میں تقسیم کر دیے تھے۔

لاری صاحب بے حد مخیّر تھے اور لوگوں کی مدد اس طرح کرتے کہ ایک ہاتھ کی خبر نہ صرف دوسرے کو بلکہ ایک آدھ اور کو بھی ہو جاتی۔ وہ دوسروں سے بھی یہی راستہ اپنانے کے لیے کہتے۔ ان کی دلیل تھی کہ اس طرح اوروں کو غیرت آئے گی... درجنوں غریب و نادار طلبہ کی مدد

کرتے، ہر کارنیک میں آگے آگے نظر آتے۔ لاری کارڈیالوجی بنوائی، لوگوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا لیکن جب اس ادارہ کے ذکر کی نوبت آئی تو ان کا نام تک نہ لیا گیا۔ خیر اس کا رونا کوئی کہاں تک روئے۔

ان کی زندگی کے آخری آٹھ دس برسوں میں میرا آنا جانا کچھ بڑھ گیا تھا لیکن بس مہینے دو مہینے میں ایک بار، اس سے زیادہ نہیں۔ ایک دن کہنے لگے، ایک کام اور کرنا چاہتا ہوں... لیکن بس ایک بار کا... ڈھائی تین لاکھ تک کا، کوئی مشورہ دیجیے۔"

میں نے کہا سوچ کے بتاؤں گا۔

ان دنوں میں چھوٹے پیمانہ پر فکشن مطالعات کے ایک ادارہ کی ابتدا کرنا چاہتا تھا، سو دو سو کتابوں سے، اپنے گھر کے ایک کمرہ میں۔ سوچا لاری صاحب سے یہی کام بڑے پیمانہ پر کرنے کے لیے کہوں۔ نام بھی سوچ لیا تھا۔ Prem Chand Institute of Fiction Studies نیر مسعود اور شمس الرحمٰن فاروقی کو بھی یہ تجویز پسند تھی۔

میں نے ان سے ذکر کیا تو بولے، "پریم چند کیوں۔" سمجھ تو گیا لیکن میں نے کچھ کہا نہیں۔

"حیات اللہ صاحب نے بھی یہی تجویز رکھی ہے۔"

مجھے خوشی ہوئی لیکن ابھی بڑی خوشی باقی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔

"حیات اللہ صاحب نے آپ کا نام تجویز کیا ہے۔"

میرا خیال ہے انھوں نے حیات اللہ صاحب کی تجویز کے بعد ہی مجھ سے مشورہ طلب کیا تھا۔

لیکن انھوں نے تفصیلات پر باتیں شروع کیں تو میرا دل ڈوبنے لگا۔

دس پندرہ ہزار سے کم کرایہ پر مناسب جگہ ملنے سے رہی، پھر فرنیچر بنوانا ہوگا کتابیں رکھنے کے لیے اور ہاں کتابیں بھی تو خریدنی ہوں گی... چلیے پچاس ہزار اور سہی...

میں جانتا تھا کہ ہندی اور اردو کے افسانوی مجموعے اور ناولیں تو بڑی تعداد میں تحفتاً مل جائیں گی، پانچ دس ہزار کی کتابیں تو میں خود ہی دے سکتا ہوں، البتہ تنقیدی کتابوں میں کچھ دقت ہو سکتی تھی اور انگریزی کی کتابیں تو ساری کی ساری خریدنا ہی پڑتیں... لیکن... لیکن... میں نے سوچا کہ ڈھائی تین لاکھ کا یہ بوجھ کیا میں سنبھال سکوں گا اور آمدنی کے وسائل اتنے نہ ہو پائے کہ اخراجات کے کفیل ہو سکیں تو کیا کروں گا اور یہی سوچ کر میں نے ہاتھ پیر ڈال دیے اور بعد

میں ان کے ساتھ جو ہوا اس کا ذکر کسی اور سے سنیے!

'' پھر ایک[1] دن شام کے وقت ملاقات ہوئی تو ایک صاحب برابر میں بیٹھے تھے اور دونوں کے چہروں پر فکر کی گہری لکیریں تھیں۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ جب بھی جاؤ لاری صاحب تنہا ہوتے تھے تو صاف محسوس ہوتا تھا کہ انھیں اس کا دکھ ہے کہ کوفہ کے عددوالے شہر کے حاضر باشوں نے ایک ایک کر کے ملنا چھوڑ دیا؟ اور کیوں انھوں نے ان کے اوپر لاکھوں روپے لٹائے؟ اور اب جو کوئی بھی آتا ہے وہ کیوں قابل قدر ہے؟

'' ایک دن خیال آ گیا کہ لاری صاحب کی مزاج پرسی کرتا چلوں... میں نے ٹیلی فون کیا تو مظفر میاں کی آواز آئی، میں نے دریافت کیا کہ کیا لاری صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ جواب آیا کہ آپ کس وقت آ سکتے ہیں؟ میں نے کہہ دیا کہ میں ابھی آ سکتا ہوں۔ مظفر میاں نے جواب دیا کہ ابھی آ جایئے، اس لیے کہ ہم نے اپنی کوٹھی کو میرج ہال بنا دیا ہے اور شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔ میری گاڑی جب گیٹ کے قریب پہنچی تو باہر کا منظر وہی تھا جو ہر شادی ہال کے باہر ہوتا ہے۔ غبارے والے، خوانچے والا، بچوں کا ادھم، بڑوں کا شور اور رنگ برنگی کرسیوں سے لدے ٹھیلے۔ اندر جا کر دیکھا تو وہاں کرسیوں کا رنگ دوسرا، خالی دیگیں اور بچوں کا شور... میں نے کسی سے دریافت کیا کہ لاری صاحب؟ بتایا گیا کہ وہ بیٹھے ہیں۔

'' یہ وہ جگہ تھی جہاں سردیوں میں صبح کی دھوپ پہلے آتی تھی اور ایک درجن کرسیاں لگا دی جاتی تھیں پھر دھوپ کے جاتے ہی کرسیاں پھاٹک میں آ جاتی تھیں لیکن اس دن صرف دو کرسیاں تھیں، ایک پر خود لاری صاحب بیٹھے تھے، دوسری پر گھٹنوں کی تکلیف کی بنا پر پاؤں رکھے تھے۔ برابر میں ایک بدرنگ بغیر میز پوش کی میز رکھی تھی، اس کے اوپر ٹوپی رکھی تھی، تیسری کرسی کوئی نہیں تھی۔ میں گیا... سلام کیا... انھوں نے جواب دیا اور میں نے محسوس کیا کہ شاید مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد انھوں نے اپنی مخصوص بارعب آواز میں محسن کو پکارا، ایک دو تین چار آوازوں کے بعد بھی محسن کو شور کی وجہ سے آواز

۱۔ حفیظ نعمانی کی کتاب '' بجھے دیوں کی قطار'' سے اقتباسات۔

نہیں پہنچی اور شادی والوں میں سے کسی نے سن لی۔ وہ دوڑے ہوئے آئے اور معلوم کیا کہ فرمائیں... کہا ایک کرسی بھجوا دیجیے۔ انھوں نے شادی کے مہمانوں کی کرسیوں میں سے پلاسٹک کی ایک کرسی برابر میں رکھ دی اور لاری صاحب نے فرمایا کہ تشریف رکھیے۔

''لاری صاحب خاموش تھے، میں بھی کیا بات کرتا۔ شور اس لیے زیادہ تھا کہ ایک بارات جا رہی تھی اور دوسری شادی کے منتظم آ رہے تھے، جو رات کو ہونے والی تھی۔ لاری صاحب اپنے اس خوبصورت لان اور ان حسین برجیوں اور فرش کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے بہادر شاہ ظفر نے کبھی لال قلعہ کو پامال ہوتا ہوا دیکھا ہوگا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میں نے آ کر غلطی کی اور لاری صاحب شاید شرمندگی کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ انھوں نے نہ پانی منگوایا، نہ چائے کو پوچھا، بمشکل ایک جملہ ان کے منہ سے نکلا کہ 'بس اب یہی ذریعہ معاش رہ گیا ہے۔' اسی لمحہ میرے کانوں میں ایک جملہ گونجا کہ ''سورج غروب ہونے سے پہلے میرے اکاؤنٹ میں دو لاکھ روپے جمع ہو جاتے ہیں۔'' میں نے رخصت لی، اٹھا اور چلا آیا۔ لاری صاحب چپ رہے...

''ایک دن (اخبار میں) پڑھا کہ لاری صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور انھیں گرین کراس نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا ہے۔ میں حیران رہ گیا... میں نے وہاں ٹیلی فون کیا... ڈاکٹر صاحب سے معلوم کیا کہ کیا لاری صاحب آپ کے یہاں ہیں؟ انھوں نے فرمایا، جی ہاں کمرہ نمبر ۲ میں ہیں... شام کو ڈرائیور سے کہا گرین کراس چلو، راستہ میں اسے تاکید کی کہ دیکھو وہاں گاڑیاں بہت ہوں گی ایسی جگہ کھڑی کرنا کہ آسانی سے واپس آ سکو... (لیکن) وہاں صرف دو گاڑیاں تھیں۔ اندر دیکھا تو تیمارداروں کی تمام کرسیاں خالی تھیں، کلیجہ دھک سے رہ گیا... (پھر معلوم ہوا) کمرہ نمبر ۲ میں ہیں... اندر گیا تو میرے سامنے لاری صاحب کی دختر صبیحہ ناز لاری کھڑی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا، بس منہ سے نکل گیا... آپ اکیلی ہیں؟ کہا، نہیں اور لوگ ابھی گئے ہیں۔ پھر طبیعت کے متعلق معلوم کیا تو کہا آپ خود دیکھ لیجیے۔ میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا،

وہ بالکل غافل تھے۔ سلام کیا تو آنکھ بھی نہیں کھول پائے۔ اب مزید رکنا اچھا نہیں لگا... چلا آیا۔ راستہ بھر سوچتا ہوا آیا کہ یہ شہر شاید احسان فراموشوں کا شہر ہے۔ اگر خود غرض نہیں آئے تھے تو وہ تو آتے جن کے تن پر کپڑے لاری صاحب کے تھے۔ جنھیں رمضان بھر خود کھڑے ہو کر شیر مال اور کباب کی افطاری تقسیم کیا کرتے تھے، جن کی اعلانیہ اور خفیہ طریقہ سے مدد کرتے تھے۔ جو ہر شام کو آنے میں اس لیے جلدی کرتے تھے کہ کوئی کرسی خالی مل جائے۔ جو عید کے دن صبح سے عشاء تک ایسا اور اتنا کھاتے تھے کہ کبھی نصیب نہ ہوا ہو۔

''اس وقت بے ساختہ وہ بھی یاد آیا جو انھوں نے اس وقت مجھ سے فرمایا کہ جب پوتے کے عقیقہ کی دعوت تین دن چلی تھی کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لکھنؤ والے مجھے بھول تو نہیں گئے؟ اس وقت تو واقعی نہیں بھولے تھے لیکن اس دن سے بھولنا شروع کر دیا جس دن سے پینے کے لیے تحفۂ درویش (ٹھنڈا پانی) پیش کیا جانے لگا تھا۔ گرمی کے موسم میں آنے والوں کے لیے محسن کو پیسے دے کر بازار سے فروٹی منگا کر اور سردی کے موسم میں قریب کے ہوٹل سے چھینکے میں رکھے ہوئے گلاسوں میں چائے منگا کر پیش کی جانے لگی تھی۔

''...اللہ ان کی مغفرت فرمائے'' وہ اچانک لکھنؤ آئے اور پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کی طرح لکھنؤ پر چھائے، پھر انھوں نے برسنا شروع کیا اور اتنا برسے کہ مے خانہ ڈوبنے لگا اور پھر سورج کی گرمی اور ہوا کے تیز تند جھونکوں نے کالے بادلوں کا رنگ بدلا، انھیں ہلکا کیا اور روئی کی طرح اڑا دیا۔ لاری صاحب نے روشن صبح بھی دیکھی، سورج کو سوا نیزے پر بھی دیکھا، سہ پہر کو آرام بھی کیا، اودھ کی شام بھی سجائی اور جب رات بھی گذار لی تو سب کو خدا کے حوالے کر کے چلے گئے۔

''میں نے صرف ایک بار اس کے متعلق صاحب زادۂ مکرم مظفر احمد لاری سے بس اتنا دریافت کیا کہ عقل حیران ہے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کہنے لگے ابا مرحوم ہر ایک پر اعتبار کر لیتے تھے۔ نہ جانے کتنے آدمیوں کے سپرد کام کر رکھے تھے۔ وہ سب بے ایمان ہو گئے اور سب نے روپیہ دبا لیا۔ مظفر میاں نے جواب دے

دیااور میں نے سن لیا لیکن استفہامیہ نشان آج بھی چمک رہا ہے۔''

....

اب خیال آتا ہے کہ یہ بات خدا ہی نے دل میں ڈالی تھی کہ لائبریری کے سلسلے میں ان کی پیش کش سے پیچھے ہٹ جاؤں، ورنہ...ورنہ میں تو فکشن انسٹی ٹیوٹ کا ایسا دیوانہ ہو رہا تھا کہ آخر میں پیش کش قبول ہی کر لیتا۔

مرزا جعفر حسین

''قدیم لکھنؤ کی آخری بہار'' کے مصنف مرزا جعفر حسین نے ادب اور اودھ کی تہذیب اور ثقافت پر کئی کتابیں لکھیں اور یہی ان کی پہچان ہے، لیکن ان کی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ امراؤ جان ادا والے مرزا ہادی رسوا کے کم عمر دوستوں میں تھے اور ان کی زندگی کے واقعات سنایا کرتے۔

مرزا رسوا کھلی ڈلی شخصیت کے مالک تھے اور انھوں نے انیسویں صدی کے آخری سورج کو غروب ہوتے اور بیسویں صدی کے پہلے سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ انھیں علم کیمیا سے دلچسپی تھی لیکن وہ کرسچین کالج میں فارسی اور منطق پڑھاتے تھے۔ مولوی جعفر حسن کی طرح، معلوم نہیں کالج کے اس وقت کے پنڈت جی سے ان کی دوستی تھی یا نہیں لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ ان کے ساتھ چلتے تو یہ خیال ہرگز نہ رکھتے کہ ان کی شیروانی ان کے کپڑوں سے مس نہ ہونے پائے اور نہ ہاتھ ملانے کے بعد اسے دھوتے۔

مرزا جعفر حسین نے مرزا ہادی رسوا کے بارے میں بتایا کہ ایک دن یہ معلوم ہونے پر کہ انھیں سائکل چلانا نہیں آتی، مرزا صاحب کے ایک دوست نے ان کا خوب مذاق اڑایا تو انھوں نے کسی کی مدد کے بغیر سائکل چلانا سیکھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اپنا ہاتھ توڑ بیٹھے۔ اتفاق سے اسی شام کوئی صاحب ان سے ملاقات کے لیے آنے والے تھے۔ مرزا صاحب نے اپنے ہاتھ کی مرہم پٹی کی اور گھر کے لوگوں کی مدد سے کھچیاں بندھوائیں اور شیروانی پہنی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے دوست کا انتظار کرنے لگے۔ ان کے دوست آئے اور ملاقات کر کے چلے گئے لیکن انھیں مرزا صاحب کی اس چوٹ کا اندازہ تک نہ ہو سکا۔ مرزا جعفر حسین نے یہ بات ان کی قوت برداشت کے سلسلے میں بتاتی تھی۔

حیرت ہوئی کہ مرزا رسوا کس دل گردے کے مالک تھے۔ پھر خیال آیا کہ وہ ایسے نہ ہوتے تو بھلا امراؤ جان ادا کیسے لکھتے۔ یہاں تو ہاتھ ہی ٹوٹا تھا، امراؤ جان لکھنے میں تو درجنوں بار دل پر آن بنی ہوگی۔

مرزا رسوا کی باتیں وہ اکثر کیا کرتے۔ ہم دونوں کی جان پہچان کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ میں کھود کھود کے ان کے بارے میں پوچھتا۔ وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے، اور دنیا سے شناسائی میں تو ان کے سامنے میری حیثیت ایک طفل مکتب کی تھی۔ وہ میرے غریب خانے پر جانے کتنی بار تشریف لائے لیکن اسے بس اتفاق ہی کہیے کہ ان کے یہاں میرا جانا صرف ایک بار ہوا، اور وہ بھی اس وقت جب وہ ہم میں نہیں تھے۔

مرزا صاحب سے تعارف کب اور کیسے ہوا یہ تو نہیں یاد لیکن ۱۹۶۴ء میں ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ سال یوں یاد رہا کہ اسی سال میرا چھوٹا بھائی عمران والدہ کے ساتھ اورئی سے لکھنؤ آ کر رہنے لگا تھا۔ ایک دن میں اس کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ مرزا صاحب مل گئے۔ عمران کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ انٹر میں پڑھتے ہیں۔ پوچھنے لگے شامیں تو خالی رہتی ہوں گی، عمران نے کہا جی ہاں، شام میں تو کوئی کام نہیں رہتا۔ بولے میں ایک ہفتہ وار نکالتا ہوں، شام کو اس کا کچھ کام کر دیا کرو۔

چنانچہ عمران اگلے دن شام میں ان کے یہاں گئے تو دیکھا وہ میز پر گلاس اور بوتل سجائے بیٹھے ہیں، اس انتظار میں کہ کب خالی ہو تو اسے پھر سے بھریں۔ عمران کو دیکھا تو ایک گلاس اور منگایا اور اس میں دختِ رز ڈالتے ہوئے بولے، ''پیو، میں سہیل سے کہہ دوں گا، وہ کچھ نہ کہیں گے۔''

ان کے ارادے بھانپ کر عمران جو بھاگا تو مہینوں کرسچین کالج کے سامنے کی سڑک سے نہ گزرا۔

مَیں وکٹوریا اسٹریٹ کے ایک مکان میں رہنے لگا تو نخاس سے ربط وضبط بڑھا۔ ایک دن رضوی منزل کے سامنے کتابوں کی ڈھیری سے اپنی پسند کی کتابیں تلاش کرتے کرتے جانے کیسے خیال ہوا کہ سامنے والے مکان میں، جس کے باہری حصے میں ان دنوں جوتوں کی ایک بڑی دوکان تھی، مرزا رسوا رہتے رہے ہوں گے۔ میں اپنے اس خیال کی کوئی معقول وجہ نہیں بتا سکتا لیکن جانے کیسے ایسا لگا کہ اس سے مرزا رسوا کی شخصیت کی، جس سے میں ناواقف تھا، خوشبو آ رہی

ہے۔ اگلی بار مرزا صاحب تشریف لائے تو میں نے مکان دکھا کر اپنی بات بتائی۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور کہا، ''ضرور کسی نے بتایا ہوگا۔ یہاں بس تھوڑے دن رہے، یہی کوئی سال سوا سال۔ وہ مکان جلدی جلدی بدلتے تھے۔ وزیر گنج کے دو مکانوں میں بھی رہے تھے اور گھسیاری منڈی میں تو بہت دنوں۔''

پھر ایک دن میں نے انھیں اکبری گیٹ کی ڈھلان پر مسجد سے متصل ایک مکان دکھایا جس میں داخل ہونے کا راستہ ڈاکٹر اشتیاق حسین کے گھر کے سامنے گلی میں کھلتا ہے۔ یہ گھر میں نے اندر سے کبھی نہیں دیکھا لیکن ''امراؤ جان'' کے مطالعے سے ذہن میں جس مکان کا نقشہ ابھرتا ہے اس سے یہ بہت کچھ ملتا جلتا معلوم ہوا۔ بس ایک فرق ہے، اس سے چھوٹا ہے۔

مرزا صاحب بولے کہ بات تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ''اتنے سے مکان میں وہ راس لیلا نہیں کھیلی جا سکتی جو ''امراؤ جان'' میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میں نے کہا راس لیلا تو مرزا رسوا کے ذہن کی پیداوار ہے۔ بولے ہے بھی نہیں بھی ہے، لیکن اس خیال کی حمایت نہیں کی کہ امراؤ جان کوئی حقیقی کردار تھا۔ ہاں یہ ضرور بتایا کہ ''جلی امراؤ جان'' نام کی ایک طوائف تھی جو سیاہ فام ہونے کے باوجود سیکڑوں دلوں کی ملکہ تھی۔ پھر انھیں جانے کیا یاد آیا اور کہنے لگے کہ اچھی صورت کی عورت بھی ہار جاتی ہے لیکن زبان میٹھی ہو اور دل بہ دست آوری جانتی ہو تو میدان پر میدان مارتی چلی جاتی ہے۔ حسن تو آتا جاتا کھیل ہے، زبان ساری زندگی ساتھ دیتی ہے۔

مَیں نے کہیں پڑھا تھا عورت زبان سے مرد کو جیتتی ہے۔ میں سمجھتا تھا خوش ذائقہ کھانے کھلا کے۔ اب پتہ چلا کہ یہاں زبان کے معنی کچھ اور تھے۔ کیسی سچی بات ہے۔

بعد میں مرزا صاحب نصرت پبلشرز بھی اکثر آتے۔ انھی دنوں انھوں نے لکھنؤ کی شاعری اور شعرا پر دو ڈھائی سو صفحات کا ایک مسودہ تیار کیا اور فخر الدین علی احمد کمیٹی یا اردو اکادمی سے اس کی اشاعت کے لیے مالی امداد بھی منظور کرالی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ پہلے تین جزو کا پریس پروف مجھے دے دو تا کہ میں نصف مالی امداد حاصل کرلوں اور تمھیں زیادہ زیر بار نہ ہونا پڑے۔ چنانچہ میں نے تین جزو کی کتابت کرا کے پریس پروف تیار کرا دیے۔ وہ یہ پروف اور مسودہ لے کے گئے تو تین چار مہینے بعد لوٹے۔ اس وقت تک مالی امداد بوتل سے ہوتی ہوئی پیٹ میں منتقل ہو چکی تھی۔ نہ میں نے کچھ پوچھا، نہ انھوں نے کچھ بتایا۔ شروع کے چند صفحات کے علاوہ باقی مسودہ میرے پاس محفوظ تھا۔ اب میں نے انجمن ترقی اردو، دہلی کو دے دیا ہے۔

ان کی تصنیف ''گذشتہ لکھنو کی آخری بہار'' میں نے کئی بار پڑھی تھی، پھر ان سے ملاقاتیں بھی خوب خوب رہیں۔ ان کے بارے میں خاصا جان گیا تھا۔ اب اسے اتفاق ہی کہیے کہ دوردرشن پر دو بار اور ریڈیو پر ایک بار ان کے انٹرویو لیے۔ آخری انٹرویو کے دوران احساس ہوا کہ ان کی یادداشت جواب دینے لگی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا، ''فیض آباد سے لکھنؤ آیا، تو ان دنوں سڑکوں کے کنارے ترکاری فروخت کرنے والیاں تک عربی بولتی تھیں''۔ میں نے غلط بیانی یا بھول کی سنگینی کو کم کرنے کے لیے کہا، ''فارسی''۔

بولے، ''جی نہیں عربی۔''

میں خاموش ہو گیا۔

مرزا صاحب نے آم کھانے چھوڑ دیے تھے اور سبب اس کا یہ بتایا تھا، بلکہ شاید کہیں لکھا بھی ہے، کہ فیض آباد میں ان کے والد نے آم چرانے پر کسی ملازم کی سخت پٹائی کی تھی اور اس واقعے سے انھیں اتنی تکلیف پہنچی کہ انھوں نے اپنے مرغوب پھل کو ہاتھ لگانا ترک کر دیا۔

اس بات میں انسان دوستی کا جو پہلو ہے اس کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے پہلی دونوں ملاقاتوں میں اس بارے میں ان سے سوال کیا اور انھوں نے تفصیل سے جواب بھی دیا۔ یہی سوال میں نے اس بار بھی کیا لیکن اس انٹرویو میں انھوں نے کوئی اور سبب بتایا۔ میں نے نرم لفظوں میں انھیں دوسرے راستے پر ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ پھر دوسری باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں انھیں یاد آ گیا کہ پہلے کیا کہہ چکے ہیں اور انھوں نے پہلے والی بات کہنے کی کوشش کی۔ لیکن سامنے فلور ڈائرکٹر، یا اسے جو بھی کہتے ہوں، پروگرام ختم کرنے کے لیے اشارے کر رہا تھا۔ چنانچہ میں دو چار اختتامی جملے ہی مشکل سے کہہ پایا۔

اسٹوڈیو سے باہر نکلتے ہی انھوں نے کہا، ''اماں تم تو مجھے مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔''

میں مسکرا دیا اور کیا کرتا۔ لیکن اس وقت مجھے ڈاکٹر جانسن کا یہ قول بھی یاد آیا جس میں اس نے کہا ہے، ''سچ بولنے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ کو یاد نہیں رکھنا پڑتا کہ کس سے کیا کہا تھا۔'' ایسا ہی ایک قول کسی اور کا بھی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مسلسل اور بے پناہ شراب نوشی نے دماغ سے یادوں کی لکیریں بالکل ہی مٹا دی ہوں۔

مہینے دو مہینے، یا کچھ زیادہ عرصے بعد ان کی دونوں بیٹیاں حیران و پریشان نصرت پبلشرز آئیں۔ اس سے قبل میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ اس وقت انھوں نے بتایا ہی کہ

وہ مرزا صاحب کی بیٹیاں ہیں۔ لیکن یہ بات میں نے فرض کرلی اور صحیح نکلی۔ مرزا صاحب نے اپنی دوسری بیوی کی تعریف کے علاوہ مجھ سے اپنے گھر والوں کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

ان دونوں لڑکیوں نے جو خبر دی اس سے معلوم ہوا کہ اب ''گذشتہ لکھنؤ کی آخری بہار'' کا آخری واقف کار بھی چل بسا... رہے نام اللہ کا۔

ڈاکٹر کے۔ کے۔ مسرا

ڈاکٹر کے۔ کے۔ مسرا سے تعلقات کا آغاز ایک عجیب طرح سے ہوا۔ کاظمی منزل میں بطور کرایے دار منتقل ہونے کے بعد میں نے والدہ کو اورئی سے بلالیا۔ حلیم کی بیٹی عینی کو انھیں نے پالا تھا۔ وہ بیمار پڑی تو کسی ڈاکٹر کی تلاش ہوئی۔ میں اسے لے کر ڈاکٹر مسرا کے کلینک گیا۔ انھوں نے وہاں مطب بمشکل ایک سال قبل شروع کیا تھا اور میری ان سے کوئی جان پہچان نہ تھی۔ یہ بات غالباً ۱۹۶۴ء کے آخر کی ہے۔ میں نے جاتے ہی انھیں بتایا کہ یہ بے ماں کی لڑکی ہے اور میری والدہ نے اسے پالا پوسا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ''اس وقت...'' لیکن اسی وقت کسی دوسرے مریض نے بات شروع کردی اور بات کٹ گئی۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور اس کو طبی امداد کی فوری ضرورت ہے۔ بات کٹ جانے کے باوجود میرا خیال ہے انھوں نے میری بات سمجھ لی کیوں کہ دوا اپنے یہاں سے دی اور بازار سے خریدنے کے لیے کوئی لکھی بھی نہیں۔ میں نے دوا لینے کے بعد انھیں شکر گذار نظروں سے دیکھا تو انھوں نے کہا، ''اس کے پیسے کون دے گا؟''

''میں دوں گا،'' میں نے کہا اور چلا آیا۔

یہ تھی تفصیل تعلقات کی ابتدا کی۔

ان کے پیسے میں نے چند دنوں میں ادا کردیے۔ مشکل سے ڈیڑھ دو روپے رہے ہوں گے۔ لیکن ان روپوں کی ادائیگی کے وقت ان کے تاثرات سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ انھیں اس کی امید کم تھی۔ شاید پہلے کے تجربات ناخوشگوار رہے ہوں گے۔ پھر دھیرے دھیرے وہ ہمارے فیملی ڈاکٹر ہوگئے اور اس سے زیادہ دوست۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے، میرے خیال میں پانچ چھے سال، لیکن یہ فرق تعلقات کے دوستی میں تبدیل ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ بنا۔ بلکہ ایک اختلاف اور ایک اتفاق تعلقات کی ثمر آوری میں معاون ہی ہوئے۔ معاملہ یہ تھا کہ میں شعلہ صفت کمیونسٹ

تھا اور وہ کانگریسی، ایسے جو مذہبی رسوم و قیود اور قدیم ثقافت سے علامتی وابستگی سے ہوتے ہوئے اس فکر کے قریب پہنچ گئے تھے جس کی نمائندگی ہندو مہاسبھا، رام راجیہ پریشد، جن سنگھ کرتی تھیں اور اور اب بھارتیہ جنتا پارٹی کرتی ہے۔ ان کے خیال میں گوتم بدھ بہت معمولی مفکر تھا جب کہ میری رائے میں اس نے چارواک کے حقیقت پسندانہ اور سادے الفاظ میں بیان کیے جانے والے نتائج کو فکر کی گہرائی عطا کی۔ لیکن ایک ہم آہنگی بھی تھی، ہم دونوں پڑھنے کے شوقین تھے۔ میں نے سارتر کی مختصری کتاب ''الفاظ'' (Words) انھیں سے لے کے پڑھی تھی۔ ایک بات اور تھی۔ سینیئر صحافیوں سے ان کی جان پہچان تھی۔ ایک دن کافی ہاؤس میں وِدّیا ساگر کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ تیزی سے میری طرف بڑھتے ہوئے بولے، ''ارے سہیل یہ تم تھے۔ ڈاکٹر مسرا نے تمھاری تعریف کی تو میں نے کہا، ''ارے وہ لڑکا؟ میں اس وقت نام اور تم کو ملا کے نہ دیکھ سکا، I am very sorry"، بات آئی گئی ہوئی۔

ان دنوں وہ کلینک میں رات گئے تک بیٹھتے۔ ایک بار تو ایک یا سوا بجے رات کو میں نے ان کے کمپاؤنڈر کو دکان میں تالے ڈالتے ہوئے دیکھا۔ غرض قربت اس قدر بڑھی کہ ہم لوگ کبھی کبھی، بس کبھی کبھی، حضرت گنج کے ہوٹلوں میں ساتھ ساتھ جانے لگے۔ رائل کیفے ہم دونوں کو پسند تھا اور نئی نسل کو شاید ہی معلوم ہو کہ پہلے یہ کیفے ''مے فیر'' کے تقریباً سامنے پیٹرول پمپ کے پاس تھا۔ اب وہاں پیٹرول پمپ بھی نہیں۔ ایک رات معلوم نہیں کیسے انھوں نے کلینک جلدی بند کر دیا، مجھے ساتھ لیا، سب سے پہلے امین آباد پارک کے مندر گئے، وہی مندر جو خلیق الزماں نے مسلمانوں کی شدید مخالفت کے باوجود خود کھڑے ہو کر بنوایا تھا۔ ان دنوں وہ میونسپل بورڈ کے چیرمین تھے اور ''پنڈت خلیق الزماں'' کہلاتے۔

وہاں سے واپسی میں ڈاکٹر صاحب نے باتوں باتوں میں بتایا کہ یہ پروہت غازی پور کا ہے تو میں نے کہا، ''آپ نے بھگوان تک پہنچنے کے لیے بھی اپنے وطن کے پروہت کا سہارا لیا''۔ میری بات پر وہ خوب ہنسے۔ اصل میں ان کا تعلق بھی یوپی کے اسی ضلع سے ہے۔ پھر ہم لوگ حضرت گنج گئے۔

انیس کو پیپٹک السر (Peptic ulcer) تشخیص ہوا اور ظاہر ہے انھی کے زیر علاج ہوئیں تو ایک دن انھوں نے فریج کی خریداری کا مشورہ دیا۔ میں ''ہوں ہاں'' کر کے رہ گیا کیونکہ ڈھائی پونے تین سو کی تنخواہ میں فریج کا تصور بھی محال تھا۔ یہ مرض دودھ، آئس کریم، ٹھنڈے پانی

اور ذرا ذرا دیر میں کچھ نہ کچھ پیٹ میں پہنچنے کا متقاضی ہوتا ہے۔ میرے لیے آٹھ نو بوتل دودھ ہی مشکل بنا ہوا تھا فریج کہاں سے خریدتا۔ ایک بار اور ڈاکٹر صاحب نے فریج کا ذکر کیا اور میں پھر ''ہاں ہوں'' کہہ کے رہ گیا۔

مہینے سوا مہینے بعد ایک دن ڈاکٹر مسرا نے دن کا مطب کرنے کے بعد اپنے کمپاؤنڈر منیر کو بھیج کے پتہ لگایا کہ میں ہوں یا نہیں اور پھر مجھے اپنی کار میں بٹھا کر حضرت گنج لے گئے۔ اس دن ہم لوگوں نے کئی ہوٹلوں میں کچھ نہ کچھ چکھا۔ پھر کھادی بورڈ کے پاس اندر کی طرف مڑتے ہوئے انھوں نے فریج کی ایک دوکان کے سامنے اپنی گاڑی روک دی اور بولے۔

''سہیل صاحب۔ مجھے دو فریج لینے ہیں۔ ایک اپنے لیے اور ایک اپنے دوست کے لیے۔ ان کے انتخاب میں میری مدد کیجیے۔''

خیر ہم لوگوں نے ایک طرح کے دو فریج پسند کیے۔ انھوں نے چیک سے ادائیگی کی۔ یہ دریافت کیے جانے پر کہ انھیں کہاں بھیجا جائے انھوں نے کہا کہ ابھی آ کے بتادوں گا۔

میری مڈ کی ڈیوٹی تھی۔ میں ہیرالڈ چلا گیا، یا وہ مجھے قیصر باغ تک چھوڑ گئے۔

رات میں گھر آیا تو فریج موجود تھا۔ پہلے تو مجھے حیرت ہوئی لیکن پھر بات سمجھ میں آ گئی۔ انیس کو کوئی خاص حیرت نہ تھی۔ وہ شاید سمجھتی تھیں کہ میں روپے ہونے کے باوجود مہینوں سے ٹال مٹول کر رہا تھا یا ممکن ہے کوئی اور بات رہی ہو۔

اس وقت فریج کی قیمت دو ڈھائی ہزار رہی ہوگی جو میں نے پچاس پچاس روپے کر کے ادا کی۔ ہاں یاد آیا، چند ماہ بعد نئے ویج بورڈ کی سفارشات کے تحت کچھ زیادہ روپے یکمشت ملے تو میں نے پانچ سو روپے کی ایک قسط ادا کی تھی۔

برسوں بعد، بلکہ یاد آ گیا، ۱۹۷۵ء کے آخر کی بات ہے... ان دنوں اسکوٹر حاصل کرنے کے لیے مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا لیکن اخبار نویسوں کا ایک کوٹا ہوتا اور انھیں مقابلتاً جلد مل جاتی۔ میں نے نہ کبھی اس بارے میں سوچا تھا نہ کبھی درخواست ہی دی تھی کہ سائکل کی چوری کے بعد نئی اپنے خسر سے پانچ سو روپے قرض لے کے خرید سکا تھا۔ یہ رقم بڑی مشکل سے قسطوں میں ادا کی تھی۔ آخری اس وقت جب وہ بستر مرگ پر تھے اور انھوں نے ہاتھ ہلا کر انیس سے کہا تھا ہم تم ادا ہیدا۔ حالات ایسے تھے، اسکوٹر کے بارے میں کیسے سوچتا۔ لیکن اس وقت جانے کیسے ریاستی وزیر نقل و حمل راج منگل پانڈے مہربان ہو گئے؛ انھوں نے خود ہی میری جانب سے درخواست

ٹائپ کرائی، کسی پرانی تاریخ میں، ٹرانسپورٹ کمشنر سے جن کو انھوں نے بلا رکھا تھا، میری درخواست فارورڈ کرائی اور اسی وقت کامرشیل موٹرس کے مالک کو جو وہاں موجود تھے، حکم دیا کہ سہیل صاحب کو اسکوٹر کل فراہم کردی جائے۔

کاٹو تو بدن میں ایک بوند خون نہیں۔ کل چار پونے چار ہزار روپے کا انتظام کہاں سے ہوگا؟ آخر واحد موجود اسکوٹر کا رنگ ناپسند کرکے، کسی طرح اسکوٹروں کی اگلی کھیپ آنے تک کی سات آٹھ دنوں کی مہلت حاصل کی۔ ڈاکٹر مسرا سے ذکر کیا اور انھوں نے اگلے دن چار ہزار روپوں کا لفافہ منیر سے مجھے بھیج دیا۔ یہ روپے بھی قسطوں میں ادا کیے گئے۔ تنخواہ میں اضافہ اور ماہنامہ کتاب کی اشاعت کا سلسلہ بند ہوجانے کی وجہ سے ادائگی میں وقت مقابلتاً کم لگا۔ لیکن ایک دلچسپ بات ہوئی۔ وہ چھوٹی سی ڈائری جس پر میں ادائیگیوں کا اندراج کرتا تھا کھوگئی تو اپنے سارے حساب کے باوجود پانچ سو روپوں کی ایک قسط کا گھپلا ہوگیا۔ انھوں نے کوئی ذکر بھی نہیں کیا البتہ سال چھ مہینے بعد جب ڈائری ملی اور اپنی بھول کی معذرت کرتے ہوئے آخری قسط ادا کی تو انھوں نے یہ روپے جن کی ان کے لیے کوئی حیثیت نہ تھی، کچھ اس طرح قبول کیے جیسے دولت غیر مترقبہ ہاتھ لگ گئی ہو۔

ڈاکٹر مسرا کے دونوں بیٹے بھی ڈاکٹر ہیں اور ان میں سے کسی کے لیے وہ علاحدہ کلینک چاہتے تھے۔ ڈالی گنج سے میرے تعلق کی بنا پر انھوں نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ لب سڑک کوئی بڑا کمرہ یا مکان مل جائے تو کیا خوب ہو۔ میں نے پتہ لگایا لیکن کامیابی ہاتھ نہ آئی۔ پھر دو تین برس بعد وہاں لب سڑک ایک مکان فروخت ہورہا تھا۔ میں نے ذکر کیا تو انھیں ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ بولے آپ کیوں نہیں لے لیتے؟ میں مسکرا کے رہ گیا۔ بولے کتنے کا ہے۔ میں نے کہا تیس ہزار کا۔ بولے لے لیجیے۔

میں پھر مسکرا کے رہ گیا۔

کہنے لگے، ''روپوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جب کہیے میں لیتا آوں۔''

میں نے کہا'' واپسی کیسے ہوگی؟'' تو بولے، ''آخر آپ کپور صاحب (ڈاکٹر پی۔ ڈی۔ کپور) کو کچھ کرایہ تو دیتے ہی ہوں گے۔''

میں نے کہا، ''سو روپے مہینہ''

ہنسے، کہنے لگے، ''بس پھر کیا ہے، وہ سو روپے ہر مہینے مجھے دیتے رہیے گا۔ دھیرے

ڈھیر ے ادا ہو جائیں گے۔"

یہ مذاق نہیں تھا۔ وہ سنجیدہ تھے۔ کہنے لگے، "ضرورت پڑے تو دام بڑھا دیجیے۔ پینتیس ہزار، چالیس ہزار۔ مکان لے ہی لیجیے۔"

میں نے پینتیس ہزار لگا دیے، چالیس ہزار لگا دیے لیکن اس مکان کی قسمت میں تو تیس ہزار میں فروخت ہونا لکھا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ عنایتیں، یہ نوازشیں صرف میری ایک مشت غبار پر نہیں تھیں۔ ویسے یہ مکان خریدنے کی خواہش اصلاً انیس کی تھی۔

◆◆◆

میرے ادبی دوست

رام لعل

رام لعل سے پہلی ملاقات ان دنوں ہوئی جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جو عورت ننگی ہے'' شائع ہوا تھا یا شائع ہونے والا تھا۔ اس کی کہانیاں تو یاد نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ اس مجموعے کی ایک کہانی کے ایک جملے پر تقریباً ہر تبصرہ نگار نے اعتراض کیا تھا۔

ان دنوں وہ کٹرہ ابوتراب میں رہتے تھے اور ان کے حوالے سے اس محلے کو ادبی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، یوں تو اس محلے کا ادب میں داخلہ نواب تجمل حسین خاں کے حوالے سے غالبؔ کے ایک شعر سے ہوا تھا اور دورِ حاضر میں اس کا ایک اشاریہ ماہنامہ ''مندر'' بھی تھا جو یہیں سے شائع ہوتا۔ جہاں تک یاد ہے، ''مندر'' کے تین شمارے شائع ہوئے تھے لیکن اس مختصری زندگی کے باوجود اس نے لکھنؤ کی ادبی صحافت میں اپنی جگہ بنالی تھی۔

رام لعل نے اس محلے میں قیام کے دوران ''تمھارا فیصلہ کیا ہے؟'' نام کا ایک افسانہ لکھا تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ نہ جانے کیوں انھوں نے بعد کے مجموعوں میں اسے جگہ نہ دی لیکن پھر میرے اصرار پر آخر کے ایک مجموعے میں اسے شامل کرلیا۔

رام لعل تقسیم ہند سے قبل ہی ریلویز سے متعلق ہوگئے تھے لیکن چار باغ اسٹیشن کے سامنے والا مکان انھیں محکمہ جاتی ترقی سے حاصل ہونے والے استحقاق کے کافی دنوں بعد ملا کیونکہ ہمارے سماج میں سہولتیں حق کی بنیاد پر نہیں پیروی اور سفارش سے حاصل ہوتی ہیں اور یہ دونوں کام انھیں آتے نہ تھے۔

چار باغ والے مکان میں وہ کٹرہ ابوتراب ہی سے منتقل ہوئے تھے اور اس مکان کو ادیبوں میں مرکزی حیثیت حاصل کرتے دیر نہ لگی تھی۔ باہر سے آنے والا ہر ادیب ٹرین سے اتر

کرانھی کے گھر کا رخ کرتا اور پھر شہر کے ادیب اس سے ملاقات کرنے ان کے یہاں جاتے۔ چنانچہ اس گھر میں تقریباً ہر وقت، خاص طور سے جب رام لعل موجود ہوتے، ادبی نشست کا سا سماں ہوتا۔ ویسے محفل آرائی کا انھیں شوق تھا اور شاگرد بنانے کا بھی۔ جانے کہاں کہاں سے لوگ انھیں اصلاح کے لیے افسانے بھیجتے اور وہ ان پر اپنے افسانوں سے زیادہ محنت کرتے۔ اس طرح، وہ لکھنؤ کے منشی تیرتھ رام فیروز پوری تھے، اس فرق کے ساتھ کہ حق المحنت نہیں لیتے تھے۔ خود میں نے اپنا ایک افسانہ اصلاح کے لیے انھیں سنایا تھا۔ اس افسانے میں دونو جوان محبت میں ناکامی کے بعد بھائی بہن بن گئے تھے۔ رام لعل نے کہا کہ اس طرح کے بھائی بہن مجھے اچھے نہیں لگتے تو میں نے افسانہ پھاڑ کے پھینک دیا تھا۔ یہ افسانہ کہیں شائع نہیں ہوا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے میں ان کو اپنا استاد پھر بھی مانتا ہوں۔

لطیف صدیقی نے ان کے بارے میں نہیں بلکہ ان کے حوالے سے ایک لطیفہ گڑھا اور وہ چل نکلا۔ وہ کہتے: ''رام لعل کے پڑوس کے مکان کی ایک بچّی نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو ریل گاڑی کا شور سن کر اس نے حیرت سے کہا، 'امّی، امّی! آج ٹرین ادھر سے گذر رہی ہے۔'' ماں نے یہ بات سنی تو کسی قسم کی حیرت کے اظہار کے بغیر کہا، ''پتر، ریل گاڑی ادھر سے نہیں جا رہی ہوگی، تیرے رام لعل انکل کہانی لکھ رہے ہوں گے۔''

یہ لطیفہ ایک طرح سے رام لعل کے افسانوں میں ریل گاڑی، اس کے ڈبوں، پلیٹ فارم، ریلوے اسٹیشن، قلیوں اور مسافروں کی جگہ جگہ موجودگی پر طنز تھا۔ لیکن اس سلسلے میں رام لعل کے افسانوں کے ایک اہم پہلو پر اب تک توجہ نہیں دی گئی ہے اور وہ ہے ان میں آباد دنیا۔ اپنی ملازمت اور قوت انجذاب کے طفیل رام لعل نے ہندوستان کی تقریباً ساری دنیا دیکھ لی اور اس کا بڑا حصّہ واقعات، کرداروں اور اقدار کی شکل میں اپنے افسانوں کے ذریعے عام کر دیا۔ ان کے افسانوں کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اتنی بڑی دنیا ان کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کے افسانوں میں جلوہ گر ہوئی ہو۔

احمد جمال پاشا کے مطابق رام لعل بیک وقت تین منصوبوں پر کام کرتے، ایک وہ جو عمل پذیر ہو رہا ہو، دوسرا وہ جس کے امکانات روشن ہو گئے ہوں اور تیسرا وہ جو ان کے ذہن میں تکمیل پا رہا ہو۔ اس مناسبت سے وہ انھیں اسکیمو کہتے، یعنی ایک ساتھ کئی اسکیمیں ساتھ لے کر چلنے والے...رام لعل نے غیر مسلم ادیبوں کی دوسری کانفرنس کی تو شہر کے ادیب دو حصّوں میں تقسیم

ہو گئے تھے، کچھ کا خیال تھا کہ اس کا منصوبہ انھوں نے پہلی کانفرنس سے پہلے بنایا تھا اور کچھ کا کہنا تھا کہ پہلی کانفرنس کے دوران لیکن اس پر سب ہی متفق تھے کہ ان کی ذات سے شہر کی ادبی دنیا کی چہل پہل قائم ہے۔

اس سلسلے کی پہلی کانفرنس کے سووینیئر میں انھوں نے غیر مسلم اردو ادیبوں کی فہرست چھاپی تو عابد سہیل نے کہا، ''ارے مسلمان تو اردو میں بھی اقلیت میں ہیں'' اور یہ جملہ بلٹز میں جگہ پا گیا تو اس کی گونج سارے ہندوستان میں سنائی دی لیکن ارباب حل وعقد اور اردو کے مخالف اسے مسلمانوں کی زبان ہی کہتے رہے، اپنے جائز حقوق سے اسے محروم رکھنے کے لیے۔

رام لعل نے اردو کو چند بہت عمدہ افسانے دیے جن میں ''او۔سی۔''، ''ایک شہری پاکستان کا'' اور ''کہرا اور کہرا'' خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

رام لعل نے خاصے سخت دن دیکھے لیکن حالات کے سامنے ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ موسم سرما میں کوٹ پینٹ اور ٹائی پر اوور کوٹ پہن کر ناپ تول کے قدم اٹھاتے تو ایسا لگتا کہ زندگی سے اپنی محرومیوں کا بدلہ لے رہے ہوں۔ حالات کچھ بھی کیوں نہ رہے ہو، انھوں نے زندگی سے معاملہ اپنی شرطوں پر کیا، خوش رہ کر، دوستوں کی ناز برداریاں کر کے اور اچھے افسانے لکھ کر۔ انھوں نے کینسر سے بھی ہار نہ مانی اور شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے اس مشورے کے باوجود کہ انھیں گھر لے جایئے کہ زندگی کے آخری چند دن اپنے چہیتوں کے ساتھ گزار لیں، دو سال، جی ہاں پورے دو سال، زندہ رہ کر اور وہ بھی اپنے معمولات کے ساتھ، جس میں افسانوں کی تخلیق شامل تھی، میڈیکل سائنس کو ایک طرح سے شکست دے دی۔ انھوں نے اپنا ایک افسانہ، جو ممبئی کے ایک ماہنامہ میں شائع ہوا تھا، اشاعت سے قبل مجھے بھیجا تھا۔ اس میں زندگی ہی زندگی تھی، موت کی پرچھائیں اس کے پاس سے بھی نہیں گزری تھی۔ پھر ایک دن صبح صبح اٹھ کر انھوں نے اپنی کتابیں قرینے سے لگائیں اور فرش صاف کرنے لگے۔ پھر یہ کام کرتے کرتے ان کا دل یکا یک اچاٹ ہو گیا۔ وہ دل کے سوداگر تھے اس لیے اپنی جان انھوں نے اسی کو سونپ دی۔ کینسر کھڑا منہ دیکھتا رہ گیا۔

لکھنؤ، اردو افسانہ اور احباب انھیں کبھی نہ بھولیں گے۔

احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا کے لیے لکھنا ایسا ہی تھا جیسے ہمارے آپ کے لیے سانس لینا۔ کچھ نہیں تو خط ہی لکھ رہے ہیں ۔ یار دوست غپ بازی میں مصروف ہیں لیکن وہ گردن جھکائے لکھے جارہے ہیں۔ کوئی ایک آدھ جملہ اُن کی طرف اُچھال دیتا ہے تو اس کا جواب بھی دے دیتے ہیں، جواب نہیں سوجھتا تو خاموش رہتے ہیں، اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن لکھنا برابر جاری رہتا ہے۔

جمال کی ساری ادبی زندگی کا نچوڑ ایک جملہ میں پیش کرنا ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک لکھتے رہنا ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ اس کنجی کا راز جمال کو ان دوستوں سے ہاتھ لگا تھا جو اسے اپنی تجوری میں مقفل کر کے بھول گئے تھے اور دوسروں کے کاموں میں کیڑے ڈالنے میں لگے رہتے تھے۔

جمال کی مزاح نگاری کا آغاز مذاق مذاق میں ہوا۔ یونیورسٹی میں سالانہ ہڑتال چل رہی ہے۔ اس سال اس میں جوش و خروش، غم و غصہ اور طلبہ کی عام حمایت کا مسالہ زیادہ شامل ہے۔ تین طلبہ یونین بلڈنگ میں بھوک ہڑتال پر ہیں اور خطرہ ہر وقت منڈلا رہا ہے کہ پولیس کی ٹکڑیاں جو سڑک کی دوسری جانب ذرا سے فاصلے پر، اس وقت کے ''منکی برج[1]'' کی اوٹ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں، کسی وقت بھی چھاپہ مار کر بھوک ہڑتالی طلبہ کو میڈیکل کالج منتقل کر سکتی ہیں۔ یونین بلڈنگ کے سامنے کی سڑک پر جو اس وقت تقریباً میدان کی طرح تھی، دریاں بچھی ہیں، جن پر سیکڑوں طلبہ بیٹھے ہیں، بھوک ہڑتالیوں کی حفاظت کے لیے۔ یہ سلسلہ دو دن سے جاری ہے۔ لیکن نہ ''معتبر'' ذرائع سے حاصل ہونے والی خبروں کا تانتا ٹوٹتا ہے، نہ پولیس چھاپہ مار کر بھوک ہڑتالیوں کی دلی مُراد بر لاتی ہے کہ کچھ پیٹ میں تو جائے۔

رات بھیگ چکی ہے، اکتوبر یا نومبر کا مہینہ ہے اور گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ پولیس کے چھاپے کی صورت میں مقابلہ کیا جائے یا صرف پُر جوش و پُر شور احتجاج۔ بحث میں شامل طلبہ میں کچھ کمیونسٹ ہیں کچھ سوشلسٹ، کچھ کانگریسی ہیں کچھ ونوبا بھاوے کے مقلد، کچھ انقلاب پسند رُومانی، کچھ رومان پسند انقلابی، کچھ ایسے جو مسئلہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور کچھ ایسے جو اسے

۱۔ اس وقت کا پُل ''منکی برج'' کہلاتا تھا اور موجودہ ہوٹل کلارک کے آس پاس تھا۔ ''ہنومان سیتو'' ۱۹۶۶ء یا ایک آدھ سال آگے پیچھے تعمیر ہوا۔

نظریہ کی چوکھٹ میں سجاتے ہیں۔ جب بحث میں گرمی کا عنصر دلیل سے زیادہ ہوگیا، بھویں تن گئیں، آستینیں چڑھالی گئیں، مونہہ سے جھاگ نکلنے لگے تو جمال ٹپ سے بولے۔

''بھائی میں تو عدم تشدّد کا قائل ہوں۔ بھولو پان والے کا قرض بہت بڑھ گیا ہے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گھور کر دیکھتا ہے تو جان ہی نکل جاتی ہے''۔

ان کے اس جملے نے ساری بحث ختم کردی۔ جمال کے تین دوستوں میں سے جو وہاں موجود تھے، عبدالحلیم اور مرزا پھویا (غضنفر صدیقی) تو خاموش رہے، لیکن عابد سہیل نے سینئر ادیبوں کی طرح مربیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے جمال کو مشورہ دیا۔

''جمال تم مزاحیے کیوں نہیں لکھتے، تم میں تو بلا کی صلاحیت ہے''

''مزاحیہ کیا؟'' جمال پوچھتے ہیں۔

''مزاحیہ... یعنی...'' عابد سہیل گڑبڑا جاتے ہیں...'' ارے یہی مزاحیہ مضامین''

معلوم نہیں اُس وقت جمال کی سمجھ میں آیا کہ نہیں کہ مزاحیہ کیا ہوتا ہے لیکن اگلے روز جمال قاضی باغ میں ''اختر منزل'' آئے، شرمائے شرمائے، لجائے لجائے، تو انہوں نے سگریٹ کی ڈبیا کے ساتھ جیب سے چار پانچ مڑے تڑے کاغذ نکالے۔

یہ جمال کا پہلا مزاحیہ تھا۔

لیجیے، جمال نے مزاحیے لکھنے شروع کردیے۔ وہی جمال جو دوستوں کی خاطر چھرا نکال لیتا ہے، حلیم خاں کو ذلیل کرنے کی والد کی کوشش کے بعد بطور احتجاج جس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی، چند روپے ہاتھ آتے ہی جو دوستوں کے گھر جا کر کہتا ہے...''یار کہیں چلو، روپے کاٹ رہے ہیں''، دیکھتے ہی دیکھتے اُدیب بن گیا۔ لیکن ادیبوں کی ایک ادا بھی تو اسے نہیں آئی ... نہ چہرے پر سنجیدگی کی مصنوعی چادر، نہ گفتگو میں تصنع، نہ بڑے بڑے ادیبوں کے اُلٹے سیدھے حوالے، نہ فلسفہ، نہ حکمت، نہ فرد کی تنہائی، نہ تنہائی کا فرد۔ لیکن یہ سب کچھ چاہے اسے نہ آیا ہو، مزاح نگار ہے وہ چوکھا۔

عابد سہیل نے اس قلب ماہیت کی اطلاع حلیم خاں کو دی، حلیم نے اقبال مجید کو، اقبال مجید نے قمر رئیس کو، قمر رئیس نے ڈاکٹر محمد حسن کو اور ڈاکٹر محمد حسن نے مجاز کو، جنھوں نے ان کا پہلا مزاحیہ ''سگریٹ پینا'' سن کر حضرت گنج میں یونیورسل بک ڈپو کے سامنے والے فٹ پاتھ پر پان کی دُکان کے سامنے'' بھئی خوب لکھتے ہو، خوب لکھتے ہو'' کہا تو جمال باقاعدہ مزاح نگار بن گئے۔

اُن دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں دوستوں کا ایک مثلث تھا، عبدالحلیم خاں، عابد سہیل اور احمد جمال پاشا... حلیم جنہوں نے تاریخ کے موضوعات پر چند بہت عمدہ مضامین لکھے تھے، عابد سہیل جنہوں نے اپنا افسانہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسہ میں پڑھا تو باقر مہدی نے کہا تھا، ''صرف موضوع کی اہمیت کی خاطر نصف گھنٹہ ضائع کیا'' اور احمد جمال پاشا تو خیر احمد جمال پاشا تھے ہی۔ پھر اس مثلث میں سے کوئی دُمدار ستارہ کی طرح ٹوٹ کر الگ ہوتا تو اس میں باری باری اقبال مجید، قمر رئیس، قاضی عبدالستار، حسن عابد اور آغا سہیل ایک ایک کر کے شامل ہوتے رہتے، لیکن رہتا یہ بہر حال مثلث ہی۔ عابد سہیل، جمال اور حلیم کے بعد اس نے اقبال مجید، جمال اور قمر رئیس کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد جمال، اقبال مجید اور غضنفر، پھر جمال، عابد سہیل اور حسن عابد۔ غرض لوگ بچھڑتے ملتے اور جدا ہوتے رہے لیکن اس میں جمال کی وہی حیثیت رہی جو علم الحساب میں ایل۔سی۔ایم (L.C.M) کی ہوتی ہے۔

یہ گروپ درجنوں بار بگڑا اور بنا لیکن تین دوسری چیزیں اپنی جگہ قائم رہیں، اقبال مجید اور رتن سنگھ کی افسانہ نگاری جنہوں نے بالترتیب ''عدّو چچا'' اور ''ہادی'' لکھ کر اپنی دھاک جما دی تھی اور جمال کی مزاح نگاری۔ اس مثلث میں جمال، عابد سہیل اور اور حلیم خان کی اقلیدسی شکل کو بہر حال خاصی پائیدار حیثیت حاصل تھی اور ٹوٹنے، بکھرنے کے بعد اس کے یہ تینوں زاویے جانے کیسے پھر یکجا ہو جاتے تھے۔

انہی دنوں اس مثلث کو ایک زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یونیورسٹی میں چند طلبہ سے ان کی کہا سُنی ہوگئی اور ان میں سے کسی کی ہمت بھی نہ پڑی کہ مخالف گروپ سے ''دیکھ لیں گے'' تک کہہ پاتا۔ اس دن ان تینوں پر صحت کی اہمیت آشکارا ہوئی اور انہوں نے کسرت شروع کرنے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنا ڈالا۔ فیس جس کا انتظام حلیم خاں نے کیا تھا، جمع کر کے ایک جیم میں داخلہ لے لیا گیا، اور طے پایا کہ حلیم جو مولوی گنج میں رہتے تھے صبح صبح اُٹھ کر یحییٰ گنج سے عابد سہیل کو لیں گے، پھر یہ دونوں امین آباد کے ''نہ گھر میرا نہ گھر تیرا'' والے ''رین بسیرا'' نامی مکان سے جمال کو اور پھر کچے حاطے والے جیم میں، جس کے روحِ رواں اکھن نامی ایک نہایت خوبصورت اور وجیہ نوجوان تھے، کسرت کی جائے گی۔ چند روز بعد اس پروگرام میں ایک مد کا اضافہ ہوگیا۔ کسرت کرنے کے بعد یہ تینوں نظیر آباد جاتے اور تاج ریسٹورنٹ کی مشہور پوری ترکاری کھاتے اور اس کے بعد لب دوز، لب سوز اور بقول کسے ''لب دھڑ'' چائے پیتے۔ پندرہ

بیس دن بعد کسرت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن تاج ریسٹورنٹ کا پروگرام مہینوں چلتا رہا۔

ان دنوں جب کسی پان یا ہوٹل والے کا بہت زیادہ قرض چڑھ جاتا تو وہ سڑک جس پر یہ دکان ہوتی ہم لوگوں کے لیے بند ہو جاتی۔ اور اسے ''بند سڑک'' کے نام سے یاد کیا جانے لگتا۔ عابد سہیل کو یحییٰ گنج سے یونیورسٹی جانے کے لیے راجہ بازار کی پیچ در پیچ گلیوں کا سہارا لینا پڑتا اور جمال کے اپنے گھر سے نظیر آباد پہنچنے کے لیے تین راستوں میں سے دو بند ہیں لیکن ان کو معلوم نہیں کیا ضد ہے کہ وہ ادبدا کے وہی راستے اختیار کرتے ہیں جو بند ہوں۔ ان میں سے ایک سڑک پر اس پان والے کی دوکان ہے جو جمال کے دوستوں کو دیکھتے ہی موچھوں پر تاؤ دینے لگتا ہے لیکن جمال کی شخصیت میں معلوم نہیں کیا سحر ہے کہ ان کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے اور چار مینار کی ڈبیا مانگے بغیر ان کے حوالہ کر دیتا ہے۔ حلیم کی حیثیت ''مشکل کشا'' قسم کی ہے۔ قرض کی رقم بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو پانچ دس روپے دے کر قرض خواہوں کی زبان بند کر دیتے ہیں اور جمال ہوں یا عابد سہیل دوبارہ شیر بن جاتے ہیں۔

دوستوں کی لڑائیاں بھی دوستی کی توسیع ہی ہوتی ہیں۔ حلیم اور جمال کے درمیان سخت قسم کی لڑائی ہو گئی ہے، لیکن عابد سہیل کے سبب، جن کا خود بھی اس لڑائی میں تھوڑا بہت ہاتھ ہے، یہ ڈورا بھی ٹوٹی نہیں ہے۔ انہوں نے جمال پر ایک طویل نظم لکھ کر حلیم کے حوالے کر دی ہے اور حلیم ٹیگور لائبریری کے سامنے والے لان کے اس کونے میں جو گرنانی کے ہوٹل کے پاس ہے، ایک درخت کے نیچے پتھر کی لمبی سی بنچ پر بیٹھے ہوئے یہ نظم مشترک دوستوں کو سناتے ہیں۔ جمال کے سرخ سپید چہرے پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے اور جب وہ اُن مصرعوں پر پہنچتے ہیں:

....

پان والے سے جاکے پوچھا پتا
بولا'' وہ اس گلی میں رہتا ہے
میرا بھی اس پہ قرض باقی ہے''

تو جمال کو ضبط کا یارا نہیں رہتا اور وہ اپنی چپل سے حلیم کو نشانہ بناتے ہیں۔ چپل تو خیر حلیم کے کان کے پاس سے نکل جاتی ہے لیکن یہ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں اور قبل اس کے کہ احباب بیچ بچاؤ کریں، جمال کا چشمہ حلیم کے حملہ کی تاب نہ لا کر گر جاتا ہے اور اس کے دونوں شیشے پتھر سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتے ہیں۔ سنہری کمانی کا یہ خوبصورت چشمہ جمال اسی دن پہلی بار پہن

کر آئے ہیں۔ حلیم کمانی اُٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیتے ہیں تو جمال کہتے ہیں:

''گھر کیسے جاؤں گا؟''

حلیم انہیں اپنی سائیکل پر بٹھا کر امین آباد تو پہنچا دیتے ہیں لیکن راستہ میں اُن سے بات نہیں کرتے۔ اس واقعہ کو بمشکل تین ہی چار دن گذرے تھے کہ ایک شام جمال نے حلیم کے مکان کے دروازے کی زنجیر کھنکھنائی۔ حلیم نے چھجے سے جھانک کر عابد سہیل سے کہا۔

''جمال ہے!''

''جمال۔۔؟''

حیرت اور خجالت دونوں کے چہروں پر تو بڑے لٹکائے تھی۔ حلیم نے دروازہ کھولا۔ جمال اندر آ گئے لیکن خاموشی نے دونوں کے زبانوں پر تالے ڈال رکھے ہیں۔

مکان کے بیرونی حصّے کی پہلی منزل کا بڑا سا کمرہ دوست یاروں کا اڈہ تھا، جس کے زینے پر جمال کچھ اس طرح چڑھ رہے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، کمرے میں داخل ہوتے ہیں لیکن خاموشی اب بھی ان تینوں کے درمیان دیوار بنی کھڑی ہے۔ اتنے میں جمال جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالتے ہیں۔

''صبح سے نوٹ کاٹ رہا ہے، خرچ کیسے کروں؟''

حلیم خان، جن کی پٹھانی ان کے آگے آگے چلتی ہے، نم آنکھوں سے جمال کو دیکھتے ہیں اور عابد سہیل جو اپنی شخصیت پر ایک دبیز نقاب ڈالے رہتے ہیں، دوسری طرف دیکھتے ہوئے اپنے آنسو پونچھتے ہیں لیکن اس طرح کہ دونوں میں سے کسی کی نظر نہ پڑے۔

جیب میں پیسے نہ ہوں تو جمال دوستوں سے بھی لڑ سکتے ہیں، اُن سے خفا رہ سکتے ہیں، لیکن روپے ہاتھ آئے نہیں کہ انھیں دوستوں کی یاد آئی، بے تحاشہ یاد، جسے کوئی خفگی، کوئی ناراضگی، کوئی غصہ روک نہیں سکتا... اس دن کے بعد ان تینوں کے درمیان ٹیگور لائبریری کے سامنے والے لان کے واقعہ کا کبھی ذکر تک نہ آیا۔

جمال یکایک چُپ چپاتے علی گڑھ چلے گئے اور وہاں سے اُردو میں ایم۔ اے کر کے لوٹے تو ''اسکالر'' کا پیروڈی نمبر ایڈٹ کر چکے تھے۔ ہندستان اور پاکستان کے بہترین ادبی جریدے ان کے مضامین۔ کے منتظر رہنے لگے تھے اور ان کے مزاحیہ مضمون ''ادب میں مارشل لا''

کو ادب میں وہی حیثیت حاصل ہو چکی تھی جو مارشل لا میں ایوب خاں کو حاصل ہے۔

بعض معاملات میں جمال انتہاؤں پر کار بند رہتے۔ کسی کی تعریف کرنے پر آتے تو اسے حُسنِ یوسف، ید بیضا، دم عیسیٰ اور ہر ممکن خوبی سے متصف کر دیتے اور کسی سے ناراض ہو جاتے تو کون سا عیب ہے جو اس میں تلاش نہ کر لیتے۔ بے پَر کی اُڑتے تو ایسی کہ بڑے سے بڑا داستان گو بھی پانی نہ پائے اور جھوٹ پکڑ جائے تو فوراً معافی مانگ لیتے۔ شہر میں کون ہے جو اُن کی اِن انتہاؤں کا شکار یا ان سے فیضیاب نہ ہوا ہو اور اگر کسی کو ان سے سابقہ نہیں پڑا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جمال نے اسے کسی قابل ہی نہیں سمجھا۔

جمال کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف جالے نہیں بُنتے، عظمت کے جالے، علم و فضل کے جالے، خوش اخلاقی کے جالے، تنگ مزاجی کے جالے، بوہیمیزم کے جالے... وہ جیسے ہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں۔ اور اُن کے لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔ ع

"دیتا ہے دھوکا یہ بازی گر کھلا"

ایک دن جمال نے کہا، "انگریزی فلم سے مجھ سے زیادہ کوئی لطف نہیں لیتا...!!"

عابد سہیل کو، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ "حلقۂ یاراں" میں ان سے زیادہ انگریزی صرف تقی حیدر کو آتی ہے، یہ بات شاید کچھ پسند نہیں آئی اور انہوں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

جمال نے وضاحت کی، "فلم دیکھنے کے دوران کسی واقعہ پر لوگ زوروں سے ہنستے ہیں تو میں بھی قہقہہ لگا دیتا ہوں، تھوڑی دیر بعد جب سب خاموش ہو جاتے ہیں تو پاس والی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھتا ہوں کہ لطیفہ کیا تھا اور وہ لاعلمی ظاہر کرتا ہے تو دوسرا قہقہہ لگاتا ہوں، اس کے بعد جب کسی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہنسنے کی بات کیا تھی تو ایک بار اور قہقہہ لگاتا ہوں یعنی ایک ٹکٹ میں تین تماشے"۔

جمال نے "اودھ پنچ" کو از سرِ نو زندہ کیا تو درمیانی سائز کا چمڑے کا ایک بیگ ہر وقت ہاتھ میں رہنے لگا۔ اس میں دو چار شمارے ہوتے اور وہ ہر جان پہچان والے کو رسالہ کا خریدار بنانے کی کوشش کرتے۔ دوست یاروں سے تو انہیں صرف وعدے ہاتھ لگے لیکن سیکڑوں شناساؤں میں سے تھوڑے، بہت خریدار بن گئے۔ حضرت گنج میں مقیم اپنے ایک شناسا کے یہاں بھی اسی مقصد سے گئے۔ انہوں نے نہایت خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ خوب عمدہ ناشتہ کرایا اور اپنی کار سے امین آباد تک

انہیں پہنچا بھی آئے۔ رخصت ہوتے وقت جمال کے چہرے پر زرِ سالانہ کی درخواست کے مثبت جواب کی تمنا پڑھی تو کار موڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''پرسوں ملاقات ہوگی''۔

جمال 'پرسوں' ان کے یہاں پہنچے تو وہ گھر سے نکل ہی رہے تھے۔ نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا اور کار میں بٹھا کر کوالٹی ریسٹورنٹ لے آئے جہاں انہوں نے آئس کریم، کیک، پیسٹری اور ٹھنڈی کافی سے ان کی ضیافت کی، لیکن ''اودھ پنچ'' کی سالانہ خریداری قبول کرنے کا سوال اپنی جگہ قائم رہا۔ یہ سلسلہ کئی ہوٹلوں، سنیما گھروں اور ضیافتوں سے ہوتا ہوا ڈیڑھ دو مہینے بعد اس وقت ختم ہوا جب ایک دن انہوں نے کہا۔

''بھائی جمال! میں سالانہ خریدار بننے کا قائل نہیں۔ ویسے تم ہر مہینے پچیس تیس روپے لے لیا کرو''۔

اس وقت ''اودھ پنچ'' کا زرِ سالانہ زیادہ سے زیادہ چار روپے رہا ہوگا۔

جمال نے اس کوچہ میں دوبارہ قدم نہیں رکھا۔

بعض حالات نے جمال کو تالا کھولنے کا ماہر بنا دیا تھا لیکن کسی دوست یا حاجت مند کی مشکل کشائی اور گھر کے نعمت خانہ سے کسی بھوکے دوست کے لیے کھانا نکالنے کی مجبوری کے علاوہ انہوں نے اس مہارت سے کبھی کام نہیں لیا۔

''قومی آواز'' میں اُن کی ڈیوٹی رات کی تھی، دن میں یوں ہی دفتر پہنچے تو دیکھا کہ ادارتی کاموں سے متعلق سارا عملہ اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے کیوں کہ ہر کمرہ پر تالا لٹکا ہوا ہے اور ''ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں'' والی صورت کے بغیر ہی چابی کھوگئی ہے۔ دوسرا چپراسی بھیج کر مدار بخش کو گھر سے بُلایا گیا تو معلوم ہوا کہ چابی کا گچھا انہوں نے حسبِ دستور ٹائم آفس میں دے دیا تھا۔ رجسٹر کے اندراجات بھی ان کے دعوے کی تصدیق کرتے تھے۔ جمال اس وقت پہنچے تھے جب تالے توڑنے کا فیصلہ تقریباً کیا جاچکا تھا۔ ان کی فرمائش پر کہیں سے کوئی ایک ذرا لمبی کیل لے آیا۔ جمال ایک ایک تالے کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر اس پر داہنے ہاتھ کی بیچ کی انگلی موڑ کر ہڈی سے باری باری ضرب دیتے اور اس عمل سے پیدا ہونے والی آواز کان لگا کر سنتے۔ پھر چابی کی جگہ میں کسی مخصوص زاویہ سے کیل داخل کرتے اور آن کی آن میں تالا کھل جاتا۔ بمشکل چار منٹ میں تین موٹے موٹے تالے ''ٹوٹے ہوئے پیمانوں'' کی طرح اپنی عظمتِ رفتہ پر آنسو بہا رہے تھے۔

کسی نے ان کے اس ''فن'' کی تعریف کی تو مسکرا کر بولے۔
''چھوٹے موٹے تالے کو بس پانچ منٹ گھور کے دیکھوں تو خود بخود کھل جائے اور کیل کی ضرورت بھی نہ پڑے''۔ اور اپنے حساب سے بات ختم کر دی۔

جمال بہت بڑے سوشلسٹ تھے لیکن پارٹی والے نہیں، بلکہ جو چیز جس کے پاس ہونا چاہیے وہ اس تک پہنچانے والے۔
یونیورسٹی میں کیشیر آفس کے سامنے عارف نقوی نے عابد سہیل سے قلم مانگا تو انہوں نے جیب سے نکال کر اُن کی طرف بڑھا دیا۔ عارف نقوی نے فارم کی خانہ پُری کر کے قلم واپس کر دیا۔ اور دونوں دھیرے دھیرے لائبریری کی طرف بڑھنے لگے لیکن عارف نقوی خلافِ معمول خاموش ہیں۔
''کیا بات ہے؟'' عابد سہیل نے پوچھا، جس کا جواب اُنہوں نے خاموشی سے دیا۔ آخر بے حد اصرار کے بعد اُنہوں نے صرف اتنا کہا۔
''یہ قلم تمھارا ہے؟''
''نہیں، جمال نے دیا ہے۔ کیوں کیا بات ہے؟''
عارف نقوی نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن عابد سہیل کو شبہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ آخر ان کے بار بار پوچھنے پر عارف نقوی نے تسلیم کر ہی لیا کہ یہ قلم اُن کا ہے۔ اتفاق سے اسی وقت جمال بھی کہیں سے آ نکلے۔ انھیں دیکھتے ہی عابد سہیل کے غصّے کا پارہ ایک دم اُونچا ہو گیا۔
''تم نے عارف نقوی کا قلم مجھے کیوں دے دیا تھا؟'' وہ گرجے۔
''قلم؟'' جمال ہنسنے لگے۔ پھر عارف نقوی کی طرف مخاطب ہو کر بولے
''اس کے کس کام کا ہے؟''
لیکن اگلے ہی جملے میں اُنہوں نے ''اِس کے'' کو ''تمھارے'' سے تبدیل کر دیا۔
''تمھارا کام تو معمولی سے قلم سے بھی چل جائے گا۔ ایسا قلم تو 'استاد' کے پاس ہونا چاہیے، سو میں نے اُنھیں دے دیا''۔
جب سے عابد سہیل نے ان کے ابتدائی مضامین اشاعت سے قبل اُلٹ پلٹ کے دیکھے تھے، وہ انہیں استاد ہی کہتے تھے۔

جمال کی اس ہٹ دھرمی پر عارف نقوی اور عابد سہیل دونوں ہی ہنس دیے اور قلم اُس کے مالک کو واپس مل گیا۔

یہ قلم پارکر کمپنی کا تھا۔

جمال کی بیوی اُنہیں رخصت کرا کے اپنے مائکے یعنی سیوان (بہار) لے جانے لگیں تو شہر کے ادیبوں نے چار باغ اسٹیشن پر انہیں نم اور چھلکتی ہوئی آنکھوں سے رخصت کیا۔ جمال سنجیدہ اور کسی قدر اُداس اور دِل گرفتہ شاید پہلی بار نظر آئے۔ انہیں اس حالت میں پہلے کسی نے کم ہی دیکھا تھا۔ ایسا نہیں کہ انہیں پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو، لیکن انہیں بڑے سے بڑے غم اور پریشانی کو مسکراہٹوں میں تبدیل کرنے کا گُر آتا تھا۔ اس کے باوجود ان کا یہ گُر بھی اس وقت کام نہ آیا جب ان کے گھر پر حلیم کو ذلیل کیا گیا اور احتجاجاً انہوں نے تاج ریسٹورنٹ میں چائے کی پیالی میں زہر گھول کر خودکشی تک کرنے کی کوشش کی۔ اسپتال لے جائے گئے، طبّی سہولت فوراً فراہم ہوجانے سے جان بچ گئی اور یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کے صدر کی کوششوں سے پولیس کو مداخلت کا موقعہ بھی نہ مل سکا۔ اس واقعہ پر تاج ہوٹل کے مالک کا یہ جملہ... ''جمال کو جان دینے کے لیے کوئی اور ٹھور ٹھکانہ نہیں ملا۔ آدھے گھنٹے کی بکری ماری گئی'' --- یاد کر کے جمال اکثر و بیشتر ہنستے تھے۔

ان کے لیے سیوان منتقل ہونے کا فیصلہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مہینوں سوچتے رہے۔ ''قومی آواز'' سے مستعفی ہونے کے لیے خط لکھتے... بار بار پڑھتے... پھر یہ خط کئی کئی دن تک جیب میں پڑا رہتا اور آخرکار پھاڑ کر پھینک دیا جاتا۔ کبھی ہنستے ہنستے یکایک خاموش ہوجاتے۔ لیکن ہوا وہی جو اُن کی اہلیہ نے چاہا۔

جمال سیوان چلے تو گئے لیکن لکھنؤ کو بھلا نہ سکے۔ اپنے دوستوں کے نام خطوط اور ہر سال پندرہ بیس دن شہر میں قیام کے ذریعہ، جس کی نوبت کبھی کبھی ساتویں آٹھویں مہینے بھی آجاتی، اُنہوں نے اپنی علمی اور ادبی کارگاہ سے زندہ رشتہ استوار رکھا۔ لکھنؤ آتے تو محسوس ہوتا جیسے یہاں سے کبھی گئے ہی نہ تھے، ایک ایک دوست سے ملاقات کرتے، گپ بازیاں ہوتیں، قہقہے لگتے، امین آباد میں ان کے پسندیدہ ہوٹلوں... تاج اور سندر سنگھ --- اور حضرت گنج کے کافی ہاؤس میں ان کے دوستوں کا جمگھٹا لگ جاتا۔

لکھنؤ آتے تو خالی ہاتھ لیکن واپسی میں کتابوں کے دو تین بنڈل ضرور ان کے ساتھ

ہوتے۔ دوسری کتابوں کے ساتھ طنز و مزاح سے متعلق ہر کتاب جوان کی ذاتی لائبریری میں نہ ہوتی، خرید کر لے جاتے... کچھ نہ کچھ کتابیں دوستداری میں بھی خرید لیتے۔

اور پھر انہوں نے مزاحیہ ادب سے متعلق سیوان میں ہی ''احمد جمال پاشا انسٹی ٹیوٹ'' قائم کیا جس سے مستفیض ہونے کے لیے سارے ملک بلکہ بیرون ملک تک سے اسکالرز آتے رہتے۔

اہلیہ کے ساتھ میں فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے روانگی سے چند روز قبل انہوں نے عابد سہیل کو خط لکھا۔ ''یا امیر المشککین! حج کرنے جا رہا ہوں۔ آپ کے لیے دُعا کروں گا کہ خدا آپ کے ارادوں کو پائے استقامت سے سرفراز فرمائے۔ ویسے ان دنوں ہوم ورک بہت کرنا پڑ رہا ہے''۔

اُن کا خط پڑھ کر عابد سہیل کو وہ تصویر یاد آ گئی جس میں چالیس پینتالیس سال قبل کے لکھنؤ کا ایک نوجوان لندن میں کارل مارکس کی قبر پر دُعا مانگ رہا تھا۔ ''یا اللہ مسلمانوں کو مارکس کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما''۔

یہ عبارت تصویر کی پُشت پر درج تھی جسے پڑھ کر ہم لوگ خوب ہنسے تھے لیکن رضیہ آپا نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا تھا، ''تحقیق طلب امر یہ ہے کہ مارکس کی قبر پر یہ وینٹی بیگ کس خاتون کا رکھا ہوا ہے۔''

آخری بار لکھنؤ آئے تو ان کا سرخ و سپید چہرہ داڑھی سے منور تھا۔ کھچڑی بالوں کی مختصر سی داڑھی میں کچھ زیادہ ہی اچھے لگ رہے تھے لیکن پہلے کی جملے بازی اور بات بات پر چٹکلے سنانا ختم ہو چکا تھا۔

سیوان واپس جانے سے پہلے ملنے نصرت پبلشرز آئے تو معمول کے برخلاف صرف پندرہ بیس منٹ بیٹھے اور اُکھڑے اُکھڑے لہجہ میں بات کرتے رہے۔ دس ہی منٹ کے بعد اُٹھنے لگے تو میں نے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے بٹھا دیا۔ باتیں اس کے بعد بھی کیں لیکن ان میں نہ کوئی طنز تھا نہ مزاح، نہ تازگی جو ان کی شخصیت سے عبارت تھے۔ نہ کوئی جملہ بازی کی، نہ کوئی بے ضرر جھوٹ (White lie) ہی بولا۔ پھر یکایک ''اَب چل چلاؤ ہے'' کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اُن کے مُنہ سے یہ جملہ سن کر تو میں کانپ ہی گیا۔ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکل سکا۔

گفتگو کے اس حیرت خیز موڑ کے اثر سے خود کو آزاد کرنے کے لیے ان کے ساتھ باہر تک چلا آیا اور ''مکتبۂ دِین و اَدب'' کے پاس بجلی کے کھمبے کو سہارا دینے والے موٹے سے تار کے قریب کھڑے کھڑے تقریباً آدھ گھنٹے تک ان سے بات کرتا رہا۔ اُسی رات جمال سیوان چلے گئے لیکن جب بھی اُن کا جملہ یاد آتا دِل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔

ماضی اور حال کی یہ دھوپ چھاؤں اب ختم کرنی ہی ہوگی کہ سفاک حقیقت سے کوئی کب تک چشم پوشی کر سکتا ہے۔

چند ماہ بعد اخبار کے ذریعہ اُن کے انتقال کی خبر ملی، دِل نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں نے جو کچھ پڑھا اس پر چند لمحوں تک یقین ہی نہ آیا۔ جمال ایسے خوش مزاج اور ہنس مکھ شخص کو بھی دِل دھوکا دے سکتا ہے، کون مان سکتا تھا، لیکن کوئی خود کو کب تک دھوکا دیتا۔؟

تفصیلات بعد میں معلوم ہوئیں۔ ایک عرصہ سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے، لیکن گھر میں کسی کو بھنک تک نہیں لگنے دی تھی۔ دوائیں برابر لیتے رہتے مگر بیماری کا علم اہلیہ تک کو نہیں ہو سکا تھا۔

اُردو اکادمی (قیصر باغ) کے ہال میں معیّنہ وقت سے بہت پہلے ہی آنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور تعزیتی جلسہ شروع ہونے سے قبل ہی وسیع ہال اور داہنی جانب کی چھت ان کے مدّاحوں، ادیبوں، شاعروں اور ادب سے دلچسپی لینے والوں سے چھلک پڑی۔ بعد میں آنے والوں کو گیلری میں بمشکل کھڑے ہونے بھر کی جگہ مل سکی۔

مجازؔ کے انتقال کے بعد شہر نے کسی ادیب کا ایسا پُر ہجوم تعزیتی جلسہ پہلی بار دیکھا۔ شاید ہی کوئی مقرر ہو جس کی آنکھوں میں آنسو نہ تیر آئے ہوں، بعض تو بمشکل چند الفاظ ہی ادا کر سکے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں

مسیح الزماں صاحب سے پہلی ملاقات[1] احتشام صاحب کے چالیسویں کی مجلس میں ہوئی، گورا رنگ، نکلتا ہوا قد، سنجیدہ مزاج، چہرے پر علم کی روشنی؛ اچھے لگے۔ میں نام سے پہلے ہی

۱۔ یہ پہلی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ ان سے دوستی تو چھ سات سال قائم رہی۔ ظاہر ہے میں بھول گیا ہوں۔ ایسی صورت میں واقعات گڑھ کے انھیں معتبریت بخشنے کی کوشش سے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یادداشت نے جتنا ساتھ دیا ہے اسی پر اکتفا کیا جائے۔ ان کے کئی مضامین بھی اس سے قبل ''ماہنامہ کتاب'' میں شایع ہو چکے تھے۔

واقف تھا۔

مسیح الزماں سے یہ ملاقات جلد ہی دوستی میں تبدیل ہوگئی لیکن اس ''جلد'' میں بھی دو تین دن کی ایک ملاقات شامل تھی۔

ہندوستانی اکادمی، الہ آباد، نے اپنے یہاں ڈرامے کے ایک سیمنار میں لکھنؤ سے اردو کے دو ادیبوں کو مدعو کیا۔ اقبال مجید کو اور مجھے۔ ہمارا قیام مسیح الزماں کے یہاں ہوا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ دونوں نام احتشام صاحب نے ہی تجویز کیے تھے۔

یہ زمانہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں احتشام حسین کے انتقال کے بعد کے خلفشار کا تھا جس کے بارے میں کچھ اڑتی پڑتی خبریں سنی تھیں۔ مسیح الزماں کے یہاں پہنچنے کے پہلے ہی دن اقبال مجید شام میں کہیں چلے گئے۔ رات اتر آئی اور وہ لوٹ کے نہ آئے تو خاصے انتظار کے بعد ہم دونوں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ ابھی دو چار ہی لقمے لیے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ مسیح الزماں کھانا چھوڑ کر کوٹھے کی جانب لپکے اور بات چیت کی آواز ہوا اور فاصلے سے چھن کر نیچے تک آنے لگی، جو کچھ سمجھ میں آتی اور کچھ نہیں۔ پھر آوازیں تیز ہوگئیں اور ایک ایک لفظ سمجھ میں آنے لگا تو معلوم ہوا کہ فون کے دوسرے سرے پر ڈاکٹر رفیق حسین ہیں۔ وہ اس وقت طلبہ کی فلاح و بہبود سے متعلق کسی نظام کار کے سربراہ تھے اور شعبۂ اردو سے بے تعلق۔ وہ اب شعبے میں واپس آنا چاہتے تھے کیونکہ معاملہ صدارت کا تھا۔ انھوں نے مسیح الزماں سے بات اس طرح شروع کی کہ احتشام صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو دقت ہوتی ہوگی، ایک آدھ کلاس مجھے دے دیجیے۔ ظاہر ہے ان کے لیے یہ صورت اپنی موجودہ ذمے داریاں ترک کرنے اور شعبے میں واپسی کے بغیر ممکن نہ تھی اور لوٹتے تو صدر شعبہ ہوجاتے کہ سینیر تھے۔ چنانچہ مسیح الزماں نے کہا۔

''ایک آدھ پیریڈ کیا، پورے طور سے آجایئے''۔

اس کے بعد دونوں کی آوازیں تیز ہوگئیں، ساری گفتگو محلّے والوں نے بھی سنی ہوں گی۔

بیس پچیس منٹ کے مجادلے کے بعد مسیح الزماں زینے طے کر کے آئے تو غصّے سے ان کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر بھابی نے کہا، ''آ گیا میرا شیر میدان مار کے''۔ اس جملے میں ہلکا سا طنز تھا۔

اس وقت تک، تھوڑی دیر ان کے واپس آنے کا انتظار کرنے کے بعد بھابی کے اصرار پر میں کھانا دوبارہ شروع کر کے ختم بھی کر چکا تھا۔

اس سارے دوران جب میں کھانا کھا رہا تھا بھابی، جو تخت کے دوسری جانب بیٹھی تھیں، برابر پنکھا جھلتی رہی تھیں۔ مہمان نوازی کے یہ آداب انھوں نے اپنے میکے میں سیکھے ہوں گے۔ وہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی بیٹی تھیں۔

مسیح الزماں لکھنؤ یعنی اپنی سسرال آتے تو ملنے صرف دو جگہ جاتے، پروفیسر شبیہہ الحسن کے یہاں اور میرے یہاں۔ میری ڈیوٹی کبھی دن کی ہوتی، کبھی رات کی اور شام کی بھی، چنانچہ پہلے ڈیوٹی معلوم کرتے، کیسے، یاد نہیں، پھر آتے، میرے دو کمروں کے مکان میں، جس کا ایک کمرہ ماہنامہ "کتاب"، میری کتابوں اور دوستوں کے لیے وقف تھا۔ وہ آتے تو تخت پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتے، تھوڑی دیر بعد پیروں کو چپل کے فیتے سے آزاد کر لیتے اور اوپر کھسک جاتے، پھر گھنٹے آدھ گھنٹے بعد اور پیچھے کھسک کے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لیتے اور "نیم دراز" ہو جاتے۔ یہ ملاقات دو سے تین ساڑھے تین گھنٹے کی ہوتی۔

مرثیہ اور ڈراما ان کی خصوصی دلچسپیاں تھیں۔ اوّل الذکر سے میں بالکل ناواقف تھا اور ثانی الذکر سے بس اس حد تک واقف کہ ریڈیو کے لیے پندرہ بیس چھوٹے بڑے ڈرامے لکھے تھے۔ اب یاد نہیں کہ اس صورت میں ہماری بات چیت کا نصب نما کیا ہوتا۔ غیبت کرنے کی انھیں چاٹ نہ تھی تاہم برسوں کی ان ملاقاتوں میں انھوں نے دو لوگوں کی برائی کی تھی، بس ایک ایک بار۔ دونوں یاد ہیں لیکن انھیں بھلا رہا ہوں۔ میں نے زیادہ ہی کی ہوں گی لیکن یاد ایک بھی نہیں۔ ویسے بھی لوگ اپنے ہنروں کو زیادہ یاد رکھتے ہیں۔ میرے پاس وہ بھی نہیں۔ چنانچہ دو ایک فرض کر لیے ہیں اور انھیں ہی دہراتا رہتا ہوں، بڑھا چڑھا کر۔

ان کی کتاب "اردو مرثیے کا ارتقا" شائع ہوئی (شاید دوسرا ایڈیشن) تو ایک نسخہ مجھے عنایت کیا، محبت بھرے دو چار الفاظ لکھ کر۔ پھر اس پر کچھ لکھنے کے لیے کہا تو میں نے اپنی معذوریوں کا، جن میں کسرِ نفسی نام کو نہ تھی، ذکر کیا لیکن وہ مصر رہے اور میں نے اس تعلق خاطر کے سبب جو اُن سے تھا، نہ صرف ان کی کتاب بلکہ انیس و دبیر کے آٹھ دس مرثیے دل لگا کے پڑھے اور پھر دو صفحات کا ایک نوٹ تیار کیا۔

اس نوٹ میں دو باتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اورنگ زیب برسہا برس دکن میں مصروف پیکار رہا اور ہر مجادلے میں لوگ مارے جاتے تو ان موتوں کو جشن میں تبدیل کرنے کے لیے شخصی مرثیوں نے ادارہ کی شکل اختیار کر لی اور باقاعدہ مرثیہ کی راہ انھی سے ہموار ہوئی۔ انیس و دبیر کے سلسلے بلکہ

انیس کی فوقیت کے بارے میں میری اس بات پر کہ ان کے یہاں فعل کا استعمال دبیر کے مرثیوں کے مقابلے کہیں زیادہ متحرک ہے، وہ پھڑک اٹھے۔ کہنے لگے یہ نکتہ پہلی بار پیش کیا گیا ہے۔ شاید یہی انیس کی فوقیت کی کنجی ہے۔ بعد میں یہ بات نیر مسعود کو بھی اچھی لگی۔

ظاہر ہے میں خوش ہوا۔ دونوں کے مرثیے زیادہ توجہ سے پڑھے۔ کچھ اور نوٹس بنائے لیکن میں کچھ لکھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ یکایک رخصت ہو گئے۔ کچھ عجیب وقت تھا۔ مجھ پر پیمبری وقت پڑا تو وہ جائے امان دیکھ کر وہیں بیٹھ رہا، بعد میں اس نے پاؤں پسار لیے۔ چنانچہ میں الٰہ آباد بھی نہ جا سکا۔ (میری اس وقت کی مصیبتوں کے ذمے دار یا تو میرے اپنے فیصلے تھے یا نیشنل ہیرالڈ)

ان کے انتقال نے مجھے ایک شفیق دوست سے محروم کر دیا۔ وہ ہوتے تو دھوپ اتنی سخت نہ ہوتی لیکن بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کی کتاب پر مضمون نہ لکھ سکا، جو شاید کسی کام کا ہوتا۔

الٰہ آباد میں ان کے یہاں قیام کے دوران کی دو باتیں لکھنے سے رہ گئیں۔

ان دنوں ایک خاتون جو شاید امریکا سے آئی تھیں ان کے یہاں مقیم تھیں، اردو ڈرامے پر کام کرنے کے لیے۔ انھوں نے ان کو ایک کمرہ دے دیا تھا اور وہ جس طرح اپنے کمرے سے باقی مکان میں آتی جاتی رہتیں اس سے یہ احساس ہوتا کہ خاصے دنوں سے آئی ہوئی ہیں۔ خود ان کے کمرے میں چیزیں سلیقے سے جمی جمائی دیکھ کر لگتا کہ وہ ابھی رہیں گی۔ مسیح صاحب نے ہم دونوں کو ان سے متعارف کرایا تھا۔ اب ان کا نام یاد نہیں رہ گیا۔

اسی قیام کے دوران ان کی بیٹی شبنم سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ افسانے لکھتی ہے۔ اس کا ایک افسانہ شاید ''کتاب'' میں شائع بھی ہوا تھا۔

شبنم کی شادی میں جو ''ادبستان'' میں انجام پائی تھی میں نے شرکت کی تھی، نکاح سے قبل کے ایک واقعے نے خبر دے دی تھی کہ خدا ہی خیر کرے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی... آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ اس کی زندگی میں زہر گھلنا بہت جلد شروع ہو گیا۔ اس سلسلے کی ایک بات مجھے یاد ہے جو اُن دنوں کی ہے جب قاضی عبدالستار شعبہ اردو کے صدر تھے اور علی گڑھ میں فکشن پر ایک سمینار ہوا تھا۔ ایک دن، شبنم کے شوہر اقبال مجید، علی احمد فاطمی کو اور مجھے اپنے گھر لے گئے تھے، ہندی کی اپنی ایک طویل نظم سنانے۔ یہ نظم ہماری سمجھ میں تو خاک نہ آئی لیکن ان کے خیال میں ادب عالیہ تھی۔ نظم سناتے سناتے انھیں جانے کیا یاد آیا کہ یکایک اندر چلے گئے۔ اتنے میں میری نظر شبنم پر پڑی جو دوسرے دروازے سے کچھ لیے ہوئے آ رہی تھی۔ میں نے تیزی سے

اس تک پہنچنے کے بعد اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کسی تمہید کے بغیر کہا، ''شبنم بیٹی، افسانے پھر سے لکھنا شروع کر دو۔ اتنا وقت دکھ کے بغیر کٹ جائے گا''...اتنی سی بات جتنی سی دیر میں کہی اور سنی گئی اسی میں دونوں کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے...ذرا سی دیر بعد نظم کا باقی حصہ سنایا جانے گا لیکن اس سارے دوران، میں نے سنا ایک لفظ نہیں اور دیکھتا رہا مسیح الزماں کو، جو وہاں نہیں تھے۔

چند برس بعد شبنم بھی باپ کے پاس چلی گئی۔

میں ایک سچّی اور چوکھی بات کبھی کبھی مذاق میں بھی کہتا ہوں کہ الہ آباد نے مسیح الزماں کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر نثر نگار نہیں پیدا کیا۔ وہ بہت اچھی نثر لکھتے تھے، ظاہر میں کسی خاص خوبی سے عاری لیکن باطن میں معنی اور ہمواری کی دنیا آباد کیے ہوئے۔

ان کا ایک کام اور بھی یاد ہے۔ نیّر مسعود کو متعارف کرانے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

یہ خاکہ خاصا نامکمل ہے۔ ایک خرابی اور بھی ہے، میرا اپنا ذکر کچھ زیادہ ہی ہے۔ لیکن کیا کروں، اپنوں کا ذکر کروں گا تو اپنا بھی کرنا ہی پڑے گا۔

نیّر مسعود

تعارف تو نیّر مسعود سے مسیح الزماں نے کرایا لیکن ان سے تعلقات کی بنا غالب پر ان مضامین سے پڑی جو ماہنامہ کتاب میں تسلسل سے شائع ہوتے رہے۔ پھر یہ تعلقات دوستی میں تبدیل ہو گئے۔ موقع تھا غالب کی وفات کا سواں سال، ۱۹۶۹ء۔

نیّر مسعود ایک کم گو لیکن صاف گو انسان ہیں۔ وہ الفاظ چباتے نہیں۔ کبھی کبھی مروّت میں الفاظ نرم کر دیتے ہیں یا حذف۔ میرے افسانوی مجموعے ''سب سے چھوٹا غم'' پر انھوں نے ''نیا دور'' میں تبصرہ کیا تھا جس میں نکتہ چینی بھی تھی اور تعریف بھی۔ باقاعدہ نہیں، چند باتوں کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اور چند کو ان سے محروم رکھ کر۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپنے کی نوبت آئی تو میں نے سوچا کہ گرد پوش پر چند تبصروں سے اقتباسات دے دوں۔ نیّر مسعود کا تبصرہ میرے پاس تھا لیکن میں نے اس کی نقل بلکہ وہ جملے جو اُن کے خیال میں دوبارہ شائع ہونا چاہیے انھی سے حاصل کیے،

اور یہ اچھا ہی ہوا۔ انھوں نے وہ حصہ جس میں اسلوب کی مشروط تعریف کی تھی حذف کر دیا اور مجھے بتا بھی دیا۔ ''یہ کچھ بے جوڑ لگتا ہے،'' انھوں نے کہا۔ ان کی یہ بات مجھے اچھی لگی۔ رائے تبدیل کرنے کا حق تو ہر شخص کو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔

لوگ اپنی کتابوں، خاص طور سے افسانوی مجموعوں کے گرد پوش کے لیے چند سطریں لکھنے کو اکثر کہتے رہتے ہیں۔ معذرت کرنے سے بچنے کے لیے ہم دونوں نے ایک غیر رسمی سا معاہدہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بھی فرمائشی یا توصیفی آرا نہیں دیں گے اور کوئی فرمائش کرے گا تو کہہ دیں گے کہ جب اس قدر گہرے تعلقات کے باوجود ایک دوسرے کے بارے میں نہیں لکھتے تو کسی اور کے لیے کیا لکھیں۔ لیکن مَیں اس معاہدہ کی پابندی نہ کر سکا اور اپنی مرضی اور خوشی سے میں نے ان کے ایک افسانے پر مضمون لکھ ہی دیا۔ یہ مضمون غالباً ''سوغات'' میں شائع ہوا تھا۔ اسی شمارے میں ان سے ایک ملاقات کی روداد بھی شائع ہوئی جس میں شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر انیس اشفاق، عرفان صدیقی اور میں نے شرکت کی تھی۔ میں نے اس گفتگو میں نیرّ مسعود کے علاوہ فاروقی کو گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو اپنی جلد بازی کی وجہ سے اس جال میں کسی قدر آ گئے تھے لیکن نیرّ مسعود صاف بچ نکلے۔ بچ کیا نکلے، انھوں نے کسی سوال کا جواب ہی نہیں دیا۔ خود وہ بھی اس معاہدے پر پوری طرح عمل نہ کر سکے جو ہم دونوں کے درمیان ہوا تھا اور میرے ایک افسانے پر مضمون لکھ ہی دیا۔ یہ مضمون کمال کا ہے، اس میں نہ تعریف ہے نہ تنقیص، صرف سوال اٹھائے گئے ہیں، اہم سوال۔

لکھنؤ، اس کی تہذیب اور مرثیہ نگاری ہم معنی الفاظ نہیں (ویسے کوئی بھی دو لفظ ہم معنی نہیں ہوتے) لیکن ایک دوسرے کو بڑی حد تک ڈھک ضرور لیتے ہیں۔ نیرّ مسعود نے ان تینوں موضوعات کو خوب خوب چمکایا ہے۔ ان کے افسانے لکھنؤ ہی کی فضا میں سانس لیتے ہیں اور باہر زیادہ نہیں نکلتے۔ لیکن یہ کام عام طور سے سطح پر نہیں ہوتا جس کے سبب ان میں ایک طرح کی آفاقیت پیدا ہو گئی ہے اگرچہ اس سے ایک نقصان بھی ہوا ہے۔ ان کے افسانے یادداشت میں محفوظ نہیں رہ پاتے۔

انیس نصرت کا آپریشن ہوا تو میرے دو دوست جیبوں میں لفافے ڈالے ہوئے موجود تھے۔ ان میں سے ایک کا نام نیرّ مسعود ہے۔ وہ ایسے دوست ہیں جن پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

دوست آں باشد کہ گیرد دوست دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

تعریف وتوصیف میں کفایت لفظی کے سبب کچھ لوگ نیرّ مسعود سے کبیدہ خاطر رہتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ نیرّ کسی کی ناپسندیدگی کے اظہار میں اس سے زیادہ بخل برتتے ہیں۔ ان کے مُنہ سے دوسروں کی کمزوریوں کا ذکر کم ہی سننے میں آتا ہے لیکن کبھی کبھی جب برداشت جواب دے دیتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے سر سے بوجھ اتار کر پھینک رہے ہوں۔ اس میں وہ لطف نہیں ہوتا جو اُس کی حدیں غیبت سے ملا دے۔

نیرّ مسعود طویل عرصے سے صاحب فراش ہیں، خاصے کمزور ہو گئے ہیں لیکن دماغ چاق وچوبند ہے اور یادداشت برقرار اور وہ تخلیقات کے ڈھیر لگاتے جا رہے ہیں۔

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو

نیرّ مسعود نے اپنے چاروں طرف ایک حصار کھینچ رکھا ہے، نہ خود اس کے باہر نکلتے ہیں نہ کسی کو اس میں داخل ہونے دیتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ حصار نظر بھی نہیں آتا۔ زندگی بھی انھوں نے نہایت محتاط انداز میں گذاری ہے، ایک ایک قدم ناپ تول کے اٹھایا ہے اور کہیں اس ضبط واحتیاط کی شکست کا خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے تو ریکارڈ رکا ٹیپ ٹوٹ جاتا ہے۔

ایک بات اور، نیرّ مسعود کو ساہتیہ اکادمی انعام ملا اور پھر سرسوتی سمان لیکن ان کے رکھ رکھاؤ اور برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے مُنہ سے اپنا ذکر کبھی نہ سنا۔ وہ گہرے پانیوں میں رہتے ہیں۔

نیرّ مسعود میرے عزیز ترین ادبی دوست ہیں اور اس دوستی کو ''ادبی'' سے مشروط کرنے کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں۔

اقبال مجید

اقبال مجید سے میری دوستی ہی نہیں، قرابت داری ہے۔ وہ میرے گھر میں رہے ہیں اور اب میرے دل میں رہتے ہیں۔ میری والدہ کو اماں کہتے اور جب بھی علی گڑھ جانا ہوتا انھیں سلام کرنے جاتے۔ ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی یہ تو نہیں یاد لیکن انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جلسے میں ان کی زبانی ''عمّ وچچا'' سننا، دل ودماغ میں پہلی یاد کی طرح روشن ہے۔ اقبال مجید نے اپنے اس افسانے سے شہر کی ادبی فضا میں فتح یابی کا جھنڈا اگاڑ دیا تھا۔ یہ جھنڈا اب بھی لہرا رہا ہے۔

بطور استاد، اقبال مجید کی پہلی پوسٹنگ اورئی میں ہوئی تو وہ پریشان تھے کہ وہاں کسی کو

جانتے نہ تھے۔ انھوں نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا کہ اور ئی میں کیا پریشانی۔ وہاں تو میری اماں ہیں۔سو یہ وہیں جا کے ٹک گئے اور چند ہی دنوں میں ایسا معلوم ہونے لگا جیسے برسوں سے ساتھ رہتے ہوں۔ لماں کے ساتھ اقبال مجید رہے تو بمشکل سال ڈیڑھ سال لیکن پچاس پچپن سال بعد بھی انھوں نے تعلق خاطر اسی آب وتاب سے قائم رکھا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔

افسانہ نگاری اقبال مجید نے میرے بعد شروع کی لیکن نام مجھ سے زیادہ کمایا۔

اقبال مجید شاعری بھی کرتے ہیں لیکن افسانہ اور ڈرامہ میں ان کی پہلی محبت کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ انھیں شہرت اور مقبولیت دونوں سے ملی، اگرچہ ان کی زندگی اور افسانوں پر بھی اب ڈرامے کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔

ایک زمانے میں رتن سنگھ نے مختصر مختصر افسانے خاصی تعداد میں لکھے تھے۔ ایک دن ایسے چند افسانے انھوں نے مجھے سنائے۔ ان میں سے ایک بہت اچھا لگا اور میں نے جی کھول کے اس کی تعریف کی۔ میرے یہاں سے ریڈیو اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے، جہاں ان دنوں اقبال مجید پروگرام ایگزی کیوٹو تھے، یہ تعریف پھول کے کپا ہوگئی۔ انھوں نے اقبال مجید سے کہا، ''عابد سہیل تو ایک کہانی سن کے بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گیا''۔

اقبال مجید کی رگِ شرارت پھڑکی اور انھوں نے تبصرہ کیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو ڈرامہ میں ہی کرتا ہوں''۔

یہ اقبال مجید کی رگِ شرارت نہیں رگِ ڈرامہ تھی جو پھڑکی تھی۔

اقبال مجید سے صحیح معنوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بس سات آٹھ سال پہلے شروع ہوا۔ خود انھوں نے لکھا کہ یہ پہلا خط ہے جو تم نے مجھے لکھا ہے۔ انھوں نے اس خط پر ایک نظم لکھی اور ''یار جانی عابد سہیل کے نام'' کر کے کئی رسائل و جرائد میں چھپوا دی۔ خط و کتابت کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ان خطوں میں ہم ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں اور محبت کی باتیں بھی کرتے ہیں۔

''میرا یار جانی'' خود شناس اور خود آگاہ ہے اور اپنی اور اپنے افسانوں کی اہمیت سے واقف۔ اس کا اظہار بھی کسی نہ کسی طرح کر دیتا ہے۔ آج کے زمانے میں جب بے معنی شور غل اتنا بڑھ گیا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ایسا کرنا شاید ضروری بھی ہے... اقبال مجید کی افسانہ نگاری ایسی نہیں کہ دو چار جملوں میں اس سے انصاف کیا جا سکے اور یہ اس کا محل بھی نہیں، تاہم یہ کہنا

ضروری ہے کہ ان کے افسانوں میں سے کئی ایسے ہیں جن کی حالت ہائی وولٹیج (High Voltege) تار کی ہے۔ وہ پڑھنے والوں کو کرنٹ مارے بغیر نہیں رہتے۔

یہ اعلان کرنے کے باوجود کہ ''تماشا گھر'' ان کا آخری افسانوی مجموعہ ہے، اب ان کے پاس نئے افسانے اتنے ہو گئے ہیں کہ نیا مجموعہ شائع ہو جائے۔ ساہتیہ اکادمی کی کوتاہ نظری کے شاکی ہونے کے باوجود انھیں اپنے پڑھنے والوں کو نئے مجموعے سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ اور بالآخر انھوں نے کیا بھی یہی ہے۔ کتاب کا نام ہے، ''آگ کے پاس بیٹھی عورت۔''

رتن سنگھ

تقسیم ہند سے جو دو فوائد حاصل ہوئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ رتن سنگھ لاہور سے اور رام لعل راولپنڈی سے لکھنؤ آ گئے۔ وہ لکھنؤ نہ آتے تو رام لعل سے ان کی ملاقات کیسے ہوتی اور رام لعل سے ملاقات نہ ہوتی تو وہ افسانے لکھنا کیسے شروع کرتے؟ پہلے کی طرح پنجابی میں نظمیں کہتے رہتے۔

رتن سنگھ نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں اپنا افسانہ ''ہادی'' پڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ کھیل کے میدان سے ہادی خود سرور صاحب کے نعمت اللہ بلڈنگ کے مکان میں آ گئے ہوں جہاں یہ افسانہ پڑھا جا رہا تھا۔ اب ''ہادی'' کو جاننے والے رہ ہی کتنے گئے ہیں اور وہ بھی کب تک؟ لیکن یہ افسانہ جو انھیں اور رتن سنگھ کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے، ضرور باقی رہ جائے گا۔ ویسے رتن سنگھ کو زندہ رکھنے والے افسانوں کی کمی نہیں۔

پہلے رتن سنگھ اس قدر مختصر افسانے لکھتے کہ اکثر گمان ہوتا کہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئے، لیکن وہ یادوں میں اپنی جگہ پھر بھی بنا لیتے۔ اب وہ ذرا لمبے افسانے لکھنے لگے ہیں تاہم یہ بھی طول طویل نہیں ہوتے۔

رتن سنگھ کو ترکِ وطن کیے ہوئے ساٹھ سال سے اوپر ہونے کو آئے لیکن اپنے شہر کے گلی کوچوں کی یادیں ان کے افسانوں میں آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتی ہیں۔ پچھلے آٹھ دس برسوں میں ان کے افسانوں میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی ہے جسے شناخت کے مسئلے سے بھی جوڑا جا سکتا ہے اور مذہب کی اعلیٰ ترین اقدار سے بھی۔ اس نئے عنصر نے ان کے افسانوں کی دنیا وسیع تر کر دی ہے۔ وہ پاکستان سے آئے تو نام لیے بغیر مسلمانوں کو گالیاں دیا کرتے تھے۔

اب گالیاں نہیں دیتے، محبت سے مارتے ہیں۔ ان کے تازہ ترین افسانوں میں پنجاب کی ثقافت اور بودوباش نے کردار، واقعات اور ردِ عمل کا چولا پہن لیا ہے۔

ان کی افسانہ نگاری پر بات چیت کی گنجائش یہاں ذرا کم ہے پھر بھی ایک بات ضرور کہوں گا۔ پہلے اخلاقی اور روحانی معاملات ان کے افسانوں کی زیریں سطح پر ہوتے تھے اب پیش منظر میں آ گئے ہیں لیکن زندگی کو حسین تر بنانے کی ان کی للک کم نہیں ہوئی ہے۔

رتن سنگھ ۱۹۴۷ء ہی میں لکھنؤ آ گئے تھے۔ نوئڈا اور اس سے قبل جبل پور میں قیام سے پہلے وہ برسوں ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں سری نگر، بھوپال اور جانے کہاں کہاں رہے، لیکن دل ان کا لکھنؤ ہی میں اٹکا رہا۔ اپنی ملازمت کا آغاز انھوں نے لکھنؤ سے کیا تھا۔ ان کا دفتر حضرت گنج میں تھا اور اس کی حیثیت ہم سب کے لیے کافی ہاؤس کی نہ سہی، ایک چائے خانے کی ضرور ہوگئی تھی۔ ہم الٹا سیدھا جو بھی لکھتے دوستوں کو سناتے اور اس پر کئی کئی دن باتیں ہوتی رہتیں۔ کیا دن تھے۔ اب ادب کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کرتا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجے اور کوئی کسی تمہید کے بغیر بات شروع کردے تو آواز پہچانے بغیر سمجھ لیجیے کہ ہو نہ ہو رتن سنگھ ہیں۔ شہر کے چار پانچ لوگوں کو فون کر کے وہ برابر دریافت کیا کرتے ہیں کہ عالم باغ میں ان کا مکان خیریت سے تو ہے۔ اسے مبالغہ نہ سمجھیے۔ وہ ماضی کو حال سے جوڑنے میں کمال رکھتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو انھیں فون کر کے دیکھیے۔ وہ بات وہیں سے شروع کریں گے جہاں دو سال پہلے ختم کی تھی۔ لکھنؤ میں تین لوگوں کو وہ سب سے زیادہ فون کرتے ہیں۔ عائشہ صدیقی، صبیحہ انور اور عابد سہیل۔

ان دنوں رتن سنگھ خودنوشت لکھ رہے ہیں۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ ساری زندگی کے دکھ تھوڑے سے عرصے میں جھیلنے پڑتے ہیں۔ اس سے بچنے کا طریقہ انھوں نے یہ نکالا ہے کہ سارے ماضی کو بس سو دو سو صفحات میں سمیٹ لیں۔ پھر بھی فون کر کے ان کا دکھ بانٹتے رہیے، حوصلہ بڑھاتے رہیے۔

رشید حسن خاں

رشید حسن خاں سے بس جان پہچان تھی، دوستی نہیں۔ وہ عالم و فاضل تھے، تدوین متن میں بے مثال، مَیں صرف حرف آشنا۔ یہ جان پہچان بھی دہلی یونیورسٹی کے دوستوں کے ذریعے

ہوئی لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب ادب میں ان کا دبدبہ نہ تھا۔ لوگ ان سے ہنسی مذاق کرتے تھے اور وہ بھی اس میں کچھ کم نہ شامل ہوتے۔

پھر ان سے تھوڑی زیادہ جان پہچان نیر مسعود کے حوالے سے ہوئی لیکن بس اتنی کہ کچھ بات چیت ہونے لگی۔ برسوں بعد ہم دونوں اردو اکادمی کے ممبر ہوئے، وہ مجلس عاملہ کے اور میں جنرل کونسل کا۔ میں اردو اکادمی کی تین کمیٹیوں کا ممبر تھا۔ لائبریری کمیٹی اور طلبہ کی وظائف کمیٹی کا، تیسری کا نام یاد نہیں آ رہا ہے یا ممکن ہے دو ہی کمیٹیوں سے متعلق رہا ہوں۔

انگریزی کتابوں کی مشہور دوکان کے مالک رام ایڈوانی سے میرا تعارف اس وقت ہوا تھا جب میری یادداشت کے مطابق اس کا نام رے بک ڈپو تھا اور حضرت گنج میں محکمہ اطلاعات کے دفتر کے نیچے تھی (اب اسلم محمود صاحب پر ٹائمس آف انڈیا میں ایک مضمون سے یاد آیا کہ دوکان کا نام شملہ ریز (Simla Rays) تھا۔) ڈاکٹر محمد حسن وہاں سے کتابیں خریدتے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی متعارف کرا دیا اور دھیرے دھیرے کچھ ایسا ہوا کہ مجھے وہاں سے کتابیں ادھار ملنے لگیں۔ ان دنوں کتابیں سستی ہوتی تھیں۔ ڈیڑھ پونے دوسو صفحات کی کتاب زیادہ سے زیادہ دو پونے دو روپے میں مل جاتی، خاص طور سے وہ جو مجلد نہ ہو۔ لیکن یہ دو پونے دو روپے بہت مہنگے ہوتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب آمدنی کا واحد ذریعہ ٹیوشن تھے۔ خیر یہ سلسلہ کافی دنوں چلتا رہا پھر ایک دن دوکان یکا یک غائب ہوگئی۔ میرا خیال ہے اس وقت میں دوکان کا تین چار روپے کا مقروض تھا۔ پھر زندگی میں کچھ ایسا بونڈر لا چلا کہ اپنی سدھ بدھ تک نہ رہ گئی، کافی ہاؤس جانا بھی چھوٹ گیا۔ برسوں بعد ایک دن جانے کیسے رام ایڈوانی کی یاد آئی اور یہ بھی کہ میں ان کا مقروض ہوں۔ اس وقت دوکان وہیں تھی جہاں اب ہے۔ میں گیا تو وہ موجود نہیں تھے۔ معلوم ہوا اوپر آفس میں ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ملاقات ہوسکتی ہے۔ مجھے اوپر لے جانے سے ملازموں کو کچھ تکلف تھا لیکن میں نے بتایا کہ انھیں بہت دنوں سے جانتا ہوں تو وہ مجھے اوپر لے گئے۔ دوکان کے اندر ہی سے زینہ اوپر جاتا ہے۔ اب اسے کیا کہوں کہ وہ نہ صرف نہایت گرم جوشی سے ملے بلکہ انھوں نے کہا کئی دن سے آپ کی یاد آ رہی تھی۔ ایک کتاب آپ کو دکھانا چاہتا ہوں اور یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑے پکڑے نیچے آ گئے۔ مذکورہ کتاب کا نام ''سارے سخن ہمارے'' تھا جو فیض کا اس وقت تک کا کلیات تھا۔ لندن سے شائع شدہ بڑے سائز کے اس نہایت خوبصورت کلیات کی ہر جلد پر فیض کے دستخط تھے اور قیمت تھی پانچ سو روپے۔ میں نے کہا کہ اس کی ایک جلد اپر دول

(Approval) پر اردو اکادمی بھجوا دیجیے۔ میں نے برسوں پہلے کے تین چار روپوں کا ذکر کیا تو وہ مسکرا کے رہ گئے۔

لائبریری کمیٹی کے اگلے جلسے میں خریداری کے لیے اس کتاب کا جیسے ہی ذکر آیا رشید حسن خاں نے کہا،" فیض کی کوئی کتاب نہیں خریدی جائے گی۔ انھیں ہر موسم راس آتا ہے۔" کوئی کچھ نہ بولا۔ وہ بات ہی اتنی ہنک سے کہتے تھے۔ لیکن میٹنگ ختم ہونے لگی تو میں نے لائبرین صاحب سے کہا کہ اگلی میٹنگ سے پہلے غالبؔ اور ان سے متعلق ساری کتابوں کی فہرست تیار کر لیجیے گا۔ سب لوگ حیران تھے کہ اس فہرست کا کیا ہوگا، لیکن رشید حسن خاں کے علاوہ کسی نے کچھ کہا نہیں۔

انھوں نے پوچھا،" سہیل صاحب۔ غالبؔ اور ان سے متعلق کتابوں کی فہرست کا کیا ہوگا؟"

میں نے کہا،" یہ کتابیں لائبریری سے خارج کی جائیں گی۔ غالبؔ سے زیادہ ہر موسم کسی کو راس نہیں آیا۔"

سناٹا چھا گیا۔ آخر شبیہ الحسن صاحب نے کہا،" بھئی وہ فہرست لایئے جس میں خریداری کے لیے منظور کی جانے والی کتابوں کے نام ہیں۔ اس میں " سارے سخن ہمارے" کا نام بھی شامل کر لیا جائے۔"

میرے خیال میں یہی واقعہ ہم دونوں کی دوستی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

لائبریری کمیٹی کی کسی دوسری میٹنگ کا ایک واقعہ بھی یاد ہے۔ اسے بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا، اگرچہ اس سے صرف میرے جہل کا ہی انکشاف ہوتا ہے۔

معلوم نہیں کمیٹی برائے خریداریٔ کتب کی میٹنگ میں لفظ" قوس قزح" کے استعمال کی مجھے کیا ضرورت پڑ گئی اور میں نے" قوس وقزح" کہا۔ اردو میں نے کلاس روم میں پڑھی نہیں اور بس یونہی سی آتی ہے۔

رشید حسن خاں نے کہا،" چلیے یوں ہی سہی"۔

نیر مسعود نے جو اس طرح کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، بات آگے بڑھائی،

" لیکن اس میں" ؤ" کا اضافہ بھی تو کرنا پڑے گا۔

مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، علاوہ اس کے کہ ایک لفظ کا صحیح تلفظ اور املا معلوم ہو گیا۔

اس میٹنگ کی کوئی اور بات یاد نہیں الا اس کے کہ رشید حسن خاں نے ہاتھ ملائے بغیر اپنے رویے میں دوستی کا جو عنصر شامل کر دیا تھا اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ممکن ہے انھوں نے سوچا ہو کہ جاہل ساتھ ہو تو عالم کی چمک میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

میں نے اس وقت تک اپنی کوئی کتاب رشید حسن خاں کو پیش نہیں کی تھی۔ ویسے کوئی کتاب تھی بھی نہیں، علاوہ ''سب سے چھوٹا غم'' کے، جس کا ایڈیشن بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اپنی ہر نئی کتاب ضرور عنایت کرنے لگے اور ہم دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

میرا دوسرا مجموعہ ''جینے والے'' شائع ہوا تو میں نے انھیں نذر کیا لیکن خیال یہ تھا کہ تحقیق و تدوین کے کاموں میں مستغرق رہنے کے سبب وہ اسے شاید کھول کے بھی نہ دیکھیں اور ان کے اگلے خط میں کتاب کا ذکر تک نہ ہونے کی وجہ سے میرا یہ خیال یقین میں تبدیل ہو گیا۔

چند ماہ بعد ان کا ایک 'اِن لینڈ' موصول ہوا جس میں انھوں نے اطلاع دی تھی کہ بنگال اردو اکادمی کے مولانا آزاد اوارڈ کے لیے انھوں نے میرا نام تجویز کیا ہے۔ لیجیے ان کے دو خطوط مل گئے۔ ان سے ان کے مزاج اور شخصیت کے ایک آدھ پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ اب ان خطوط میں انھیں دیکھیے۔

(۱)

شاہ جہان پور

۲۴ر مارچ ۹۹ء

برادرم!

کتاب (جینے والے) مل گئی تھی، رسید اب بھیج رہا ہوں۔ اپنی رائے (کتاب پڑھ کر، بغیر پڑھے نہیں) مغربی بنگال اردو اکیڈمی (یعنی جناب سالک لکھنوی) کو بھیج رہا ہوں آج ہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ کے نام سے وہاں اسی سال سے ایک نیا انعام شروع کیا گیا ہے، افسانوی مجموعے پر جو ۹۸ء کا مطبوعہ ہو۔ میری نظر میں اس کے لیے اس مجموعے سے بہتر کوئی اور مجموعہ نہیں ۹۸ء کی مطبوعات میں۔ تجریدیت کی لایعنیت کے خاتمے کے اعلان کے طور پر اس کو دیکھا جانا چاہیے، جس میں کہانی پن، بیانیہ اور سماجی حقیقت نگاری، تینوں اہم افسانوی اجزائے

مجموعی طور پر جگہ پائی ہے۔

آج ہی اپنی فضول نگاری کا بھی ایک مجموعہ بھیج رہا ہوں جو کل ہی آیا ہے۔ اسے بھرے بھتیجے۔ رسید بھیجیں گے تو ممنون ہوں گا اور اطمینان ہوگا کہ وہ آپ تک پہنچ گیا۔

انھوں نے مجھے بھی اُس پینل میں شامل کیا ہے جس سے رائے مانگی گئی ہے۔ ماننا نہ ماننا ان کا اختیار ہے۔

رشید حسن خاں

(۲)

شاہ جہان پور
۲۶ رمئی ۲۰۰۱ء

محبیؔ!

کئی دن پہلے خط ملا تھا۔ بمبئی سے واپسی پر طبیعت خراب ہی رہی۔ خط میں والدہ صاحبہ کے انتقال کی اطلاع پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ہر وہ شخص جس کی محبت کرنے والی ماں کا انتقال اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہو، وہ اِس حادثے کی دل دوزی سے خوب واقف ہوگا، میں بھی اِس سے دو چار ہو چکا ہوں اور آپ کے غم کو محسوس کرسکتا ہوں، خدائے پاک (اگر وہ کہیں ہے) مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ (یہ جملہ محض بر بنائے روایت لکھا گیا ہے۔ جنت کیا واقعتا ہے؟ اس کا احوال مجھے معلوم نہیں۔ میں تو بس ایک جنت کو مانتا ہوں جو شدّ اد نے بنوائی تھی اور ہمارے زمانے میں جس کے نمونے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ اس آنکھوں دیکھی کے سوا اور کسی خیالی فردوس سے میں واقف نہیں۔ اِسے جملہ معترضہ سمجھا جائے)۔

ایسی بہن کا اُٹھ جانا بھی قیامت سے کم نہیں۔ آپ ان تین حادثوں سے دو چار ہو کر (نصرت پبلشرز کا مرحوم ہو جانا، والدہ کا انتقال اور بہن کی جدائی[1]) جس کرب سے دو چار ہوں گے، اُسے دوسرے اچھی طرح سمجھ نہیں پائیں گے۔ یہاں آپ کی روایتی سخت جانی حقِ رفاقت ادا کرے گی اور با ہوش و حواس رکھے گی۔ کاش مجھے اِس کی توفیق ہوتی کہ وہاں آ کر تعزیت کرسکتا اور سچی ہمدردی کے چند بول کہہ سکتا۔ ان آنے والے دنوں میں اس کی ایمان دارانہ کوشش ضرور

۱۔ رشید حسن خاں کا خط آخر کے صفحات میں۔ (میں نے ایک دوسرے خط میں وسیمہ کے انتقال کا ذکر کیا تھا، ان کا ذہن نجمہ کی طرف چلا گیا۔)

کروں گا کہ چند گھنٹوں کے لیے وہاں آ کر، کچھ دیر بیٹھ کر ایسی باتیں کریں جیسی باتیں محفل میں نہیں کی جاسکتیں، ان میں کچھ غیبت کریں، کچھ تبرّا بھیجیں، ایک دوسرے کے احوال پر مل کے آہ و زاریاں کریں اور اس طرح مابعد جدیدیت کے مسائل سے واقفیت حاصل کریں۔ خدا وہ دن کرے۔

رشید حسن خاں

اب ان کا خط تو میرے پاس نہیں لیکن یاد ہے کہ شمس الرحمان فاروقی نے بھی میرا نام تجویز کیا تھا اور ''جینے والے'' پر اپنے اس تبصرے کی نقل بھی مجھے بھیج دی تھی جو انھوں نے اکادمی کو بھیجا تھا۔ انھیں یہ افسانے اس لیے پسند تھے کہ میرے ترقی پسند ہونے کے باوجود ان میں مقصدیت اس طرح حاوی نہ تھی جس طرح بقول ان کے دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں ہوتی ہے۔ کچھ اسی طرح کا خیال انھوں نے اپنے اس تبصرے میں بھی ظاہر کیا تھا جو ''شب خون'' میں شائع ہوا تھا۔

اس انعام کے لیے میرا نام پروفیسر مختار الدین احمد نے بھی تجویز کیا لیکن انھوں نے اس کی صرف اطلاع دی۔ رائیں میرے حق میں سب سے زیادہ تھیں لیکن اس کے باوجود انعام مجھے ملا اور نہ کسی اور کو۔ سبب اس کا یہ تھا کہ اکادمی نے اس انعام کے لیے پچاس نامی گرامی ادیبوں سے رائے طلب کی تھی اور فیصلہ یہ کیا تھا کہ انعام صرف اس صورت میں دیا جائے گا جب کم سے کم پچیس لوگ اپنی رائے دے دیں گے۔ لیکن اکادمی کو صرف تیئیس لوگوں کی آرا موصول ہوئیں۔ ان تیئیس میں سولہ میرے حق میں تھیں۔ معلوم نہیں وہ باقی تیرہ خدا کے بندے کون تھے۔ مجھے تو اس انعام کے نام کا علم بھی بعد میں ہوا تھا۔

لطف یہ ہے کہ کلکتہ سے اکادمی سے متعلق ساری اطلاعات ایک ایسے صاحب نے دیں جنھوں نے اپنے کالج کے لیے دس بارہ ہزار روپے کی کتابیں منگانے اور بل کی رقم وصول کرنے کے بعد روپے بھیجنا تو دور کی بات کسی خط کا جواب تک نہ دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ قمر رئیس کی پچھترویں سالگرہ کے سلسلے میں دہلی میں جو جلسہ کیا گیا تھا اس میں انھوں نے مجھے پہچاننے کی زحمت بھی گوارا نہ کی، یعنی یہ کہ میرے پاس بیٹھے ہونے کے باوجود مجھ سے مخاطب نہ ہوئے۔

لیجیے بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ رشید حسن خاں زندہ ہوتے تو کہتے بات کرتے ہو یا کنکوا اڑاتے ہو۔ لیکن افسوس اب وہ کہاں۔

اور پھر ایک دن رشید حسن خاں کسی اطلاع کے بغیر آ گئے۔ علی گنج کے میرے مکان میں یہ ان کی پہلی اور آخری تشریف آوری تھی۔

اس دن انھوں نے دنیا جہان کی باتیں کیں، کچھ اس قسم کی جن کا ذکر انھوں نے اپنے خط میں کیا تھا۔ وسیمہ کی تعزیت انھوں نے نام کو نہیں کی۔ اپنے گھر کے باہر، ان کے رخصت ہوتے وقت، میں نے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اپنی گرفت میں لے لیا اور کہا، ''ابھی تو اس غم سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے ہی باہر نکلا جا سکتا ہے۔ یادیں آپ کی بہن کا قرض ہیں۔ وہ تو آپ کو ساری زندگی ادا کرتے رہنا ہی ہے، ساری زندگی۔ وہ کس قدر فخر سے کہتی تھی کہ بھائی جان بہت بڑے ادیب ہیں۔ اسے مایوس نہ کرنے کا قرض بھی تو آپ کو ادا کرنا ہے۔'' یہ حوالہ نجمہ کا تھا لیکن اس بات کا معلوم نہیں انھیں کیسے پتہ لگا تھا۔ ہو سکتا ہے میں نے کبھی کہا یا لکھا ہو۔

یہ رشید حسن خان سے آخری ملاقات تھی اور آخری گفتگو بھی۔

ڈاکٹر کیسری کشور

کیسری کشور کو پہلی بار ایک مشاعرے میں دیکھا، پھر ملاقات نیر مسعود کے یہاں ہوئی اور پھر ہم دوست بن گئے۔ کیسری کشور کی بیوی ریڈیو آرٹسٹ تھیں۔ اس ڈرامے میں جو میں نے لکھا اور پروڈیوس کیا، انھوں نے ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ ان دنوں ڈرامے پہلے سے رکارڈ نہ ہوتے، Live براڈ کاسٹ کیے جاتے۔ شفاعت علی صدیقی نے مجھ سے کہا کہ آپ کا گھر ادھر ہی ہے، انھیں ڈراپ کر دیں۔ ریور بینک کالونی میں چڑھائی پر مڑتے ہوئے انھوں نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا تو میں نے کہا یہاں تو میرے دوست کیسری کشور رہتے ہیں۔ بولیں، میں ان کی مسز ہوں۔ یہ کہہ کر وہ مسکرائیں تو ان کی مسکراہٹ مجھے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ سے سنائی دی۔ جی ہاں، مسکراہٹ سنائی بھی دیتی ہے... انھوں نے گھر چلنے پر اصرار کیا، میں نے معذرت کر لی، ''دس بج چکے ہیں، کیسری کشور روک لیں گے، بہت دیر ہو جائے گی''۔

کیسری کشور کھانا بہت اچھا پکاتے تھے بلکہ وہ ہر کام اچھا کرتے۔ عجیب معاملہ ہے جو شخص ایک کام اچھا کر لیتا ہے وہ ہر کام اچھا ہی کرتا ہے۔ ان کے یہاں دعوت ہونے والی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ ہر چیز ایک ہی رنگ کی ہوگی۔ پھر یہ پروگرام انیس کی صحتیابی تک کے لیے ملتوی

کر دیا گیا۔ ان دنوں وہ آپریشن کے بعد اسپتال میں تھیں۔

کتنی بار دہراؤں کہ ان دنوں بھی ہیرالڈ میں لاک آؤٹ تھا... آپریشن کے بعد وہ پرائیوٹ وارڈ میں آ گئیں۔ لوگ انھیں دیکھنے آتے رہتے۔ دو بار تو ایسا لگا کہ اردو اکادمی یہیں منتقل ہوگئی ہے۔ نورالحسن، شبیہہ الحسن، صباح الدین عمر اور عزیز الجبار خاں صاحبان کو ایک ساتھ دیکھ کر خیال ہوتا کہ میٹنگ ہوچکی ہے یا ہونے والی ہے۔ وارڈ میں کرسیوں کی کمی پڑ جاتی۔ کیسری کشور کو معلوم ہوا تو انھوں نے میڈیکل کالج کے اپنے شعبے سے دو کرسیاں بھجوا دیں۔

آپریشن کے بعد یہ ٹیسٹ ہونا تھا کہ خدا نہ خواستہ کینسر تو نہیں۔ رپورٹ میں دیر لگتی ہے۔ میں نے کیسری کشور سے کہا تو انھوں نے اسی وقت شعبہ پیتھولاجی کے سربراہ کو خط لکھ کر چپراسی سے بھجوا دیا۔ دوسرے دن وہی چپراسی ان کا خط لے کر آیا۔ خط کیا ان کے شعبہ کے پیڈ پر بس یہ سطر لکھی تھی "Cong Suhail, you are clear K.K."

میں نے یہ سات الفاظ اتنی بار پڑھے کہ کوئی دیکھتا تو سمجھتا پیراگراف دہرا رہا ہوں۔

اسپتال سے چھٹی مل گئی تو بل ادا کرنا تھا، جس کے بارے میں خیال تھا کہ سیکڑوں سے زیادہ ہی میں ہوگا، لیکن وہ مل کے ہی نہ دیتا۔ متعلقہ کلرک چھٹی پر تھا۔ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ بل بنا تھا، لیکن کہاں گیا، پتہ نہ چلتا۔ میں نے کیسری کشور سے کہا۔ بولے، نہیں مل رہا ہے تو کیا پریشانی۔ بنا ہی نہ ہوگا، آپ جائیے۔ کوئی روکے گا نہیں... لیکن میں جاتا کیسے، ڈرپوک آدمی ہوں۔ کوئی ٹوک دیتا تو! چنانچہ ایک اور کوشش کی۔ اب کے ان بلوں کی گڈی بھی دیکھی گئی جن کی ادائگی ہوچکی تھی کہ کہیں غلطی سے ان میں نہ رکھ دیا گیا ہو۔ بل وہیں ملا، لیکن غلطی سے نہیں رکھا گیا تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا:

The amount may be adjusted against my salary. Kesri Kishore.

میری آنکھیں نم ہوگئیں لیکن بل لے کر مسکراتا ہوا ان کے پاس گیا۔ بڑی مشکل سے انھیں راضی کر پایا۔

چند دنوں بعد ان پر دل کا زبردست دورہ پڑا۔ I.C.U. میں تھے۔ میں اور نیرّ مسعود جاتے اور باہر سے لوٹ آتے۔ تین چار دن بعد ایک ایک کر کے اندر جانے کی اجازت اس وعدے پر ملی کہ بات نہیں کی جائے گی۔ ہم دونوں چپکے سے اندر چلے گئے۔

مجھے دیکھتے ہی بولے، ''ہیرالڈ کھلا، خرچ کیسے چل رہا ہے۔''

''کھل جائے گا،'' میں نے آہستہ سے کہا۔

نرس نے ہم دونوں کو باہر کر دیا۔

اگلے دن انھوں نے نیرؔ مسعود اور انیس اشفاق کو چند نئے شعر سنائے۔

الٰہ آباد میں ایک سیمینار تھا۔ ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ میں چلا گیا۔ واپس آیا تو کیسری کشور جا چکے تھے۔

بارہ تیرہ برس قبل گوئن روڈ سے اسکوٹر پر امین آباد جاتے ہوئے ایک خاتون پر نظر پڑی۔ وہ رکشے پر تھیں۔ پہچانتے ہوئے بھی نہ پہچان پایا۔ سخت الجھن ہوئی۔ اسکوٹر موڑی، دور تک نکل گیا، لوٹا، دھیرے دھیرے اسکوٹر چلاتا ہوا۔ پھر نظر پڑی، ذہن پر زور ڈالا۔ وہ کیسری کشور کی بیوہ تھیں۔ جی چاہا اسکوٹر روک کر سلام کروں۔ ہمت نہ ہوئی۔

کیسری کشور اردو رسم خط سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ آخری دنوں میں بس ٹوٹے پھوٹے جملے لکھنے لگے تھے۔ لیکن انھیں اردو اور فارسی کے ہزاروں، بلا مبالغہ ہزاروں، اشعار یاد تھے اور ان کے بہت سے شعر دوسروں کو۔ دو حاضر ہیں۔

شام ہوئی اب گھر لوٹو کب تک منظرِ دریا دیکھو گے
بہتا جاتا ہے وقتِ رواں بہتی جاتی ہیں تصویریں

....

کیسے پتھر بن نہ جاتیں وہ چٹانیں جن کی قسمت ہی میں تھا
بس سنے افسانے سننا اور وہی دیکھا تماشا دیکھنا

ان کی موت سے اردو شاعری درجنوں نہایت عمدہ غزلوں سے محروم رہ گئی۔

لطیف صدیقی

یادش بخیر پچھلی صدی کے چھٹے ساتویں دہے میں شہر میں نوجوان ادیبوں اور ادب نوازوں کے حلقے در حلقے تھے۔ یہ ساتھ ساتھ چلتے، ایک دوسرے کو کاٹتے، لڑتے جھگڑتے۔ ان میں ہر حلقہ اپنی شناخت رکھتا، دوسرے سے مختلف ہوتا۔ لیکن ان میں لطیف صدیقی کی حیثیت جی۔ سی۔ ایم۔ کی ہوتی۔ وہ سب میں تھے اور سب سے جدا بھی۔ دوستی کا آغاز وہ خفگی سے کرتے، مشکل ہی سے کوئی انھیں پسند آتا، ہنک اپنی سب پر قائم رکھتے لیکن کسی کو مدد کی ضرورت ہوتی تو

سب سے پہلے وہی پہنچتے۔

''ماہنامہ کتاب'' کے شروع کے برسوں میں انھوں نے ایک درجن افسانوں کے ترجمے تو کیے ہوں گے، ہندی کہانی نمبر میں انھوں نے تین کہانیوں کے ترجمے کیے۔ ایک ان کے نام سے چھپی، باقی دوسرے ناموں سے کہ پڑھنے والے جانیں کہ کتاب کے پس پشت ایک پوری ٹیم ہے۔ انھوں نے پلٹ کے وہ کہانی بھی نہیں دیکھی جو اُن کے نام سے چھپی تھی جب کہ ایک صاحب اپنی ترجمہ کی ہوئی دو کہانیوں میں سے ایک کی کسی دوسرے کے نام سے اشاعت پر ایسے ناراض ہوئے کہ لوٹ کے دفتر نہ آئے۔

''چور راستے'' کے حوالے سے ''ماہنامہ کتاب''، ''حرم'' اور ''محرم'' کے جھگڑوں سے ''سرفراز'' ہوا اور وکٹوریہ اسٹریٹ کی گلی چاہ کنکر کے پاس والے دفتری خانے میں ''علی عباس حسینی نمبر'' کو لوٹنے بلکہ اس کے سارے فارم پھاڑ پھینکنے کی کوشش ہوئی تو لطیف وہاں موجود تھے۔ نکلتا ہوا قد، گٹھا ہوا جسم، مضبوط ہاتھ پیر، پاٹ دار آواز۔ ان کی موجودگی ہی نے ''رقیبوں'' میں خوف وہراس کی لہر دوڑا دی، پھر بھی انھوں نے تھوڑے سے سرورق پھاڑ ہی ڈالے۔ پھر جو لطیف گرجے اور انھوں نے ایک شورہ پشت کو تھپڑ رسید کیا تو سارے جواں مرد بھاگ نکلے۔

لطیف صدیقی نے قومی آواز میں ریڈیو اور دور درشن کے پروگراموں پر برسوں تبصرے لکھے۔ ادب خوب خوب پڑھا، قرۃ العین حیدر، احمد علی اور عطیہ حسین کی متعدد چیزیں انگریزی میں بھی پڑھیں لیکن خود کو ادیب کہلا کے نہ دیا، نہ کبھی پسند کیا کہ ان کا شمار ادیبوں میں ہو۔ وہ زندگی کے بہت عمدہ سب ایڈیٹر ہیں۔ خامی چاہے چھوٹی سے چھوٹی کیوں نہ ہو، ان کی نظر سے چوک نہیں سکتی۔ میں نے افسانوی مجموعہ ''سب سے چھوٹا غم'' دیا تو مہینوں بعد ایک دن افسانے کا نام لیے بغیر کہا، ''بڑھاپے میں لوگ سوتے کہاں ہیں، سوتے جاگتے رہتے ہیں۔'' میں سمجھ گیا ''بفاتن'' نام کے افسانے کی کمزوری پکڑلی ہے۔

منظر سلیم، قیصر تمکین، عثمان غنی اور عابد سہیل لطیف کے قریبی دوستوں میں رہے ہیں جن سے وہ بہ یک وقت خوش اور ناخوش رہ چکے ہیں۔ یہ ہنر صرف انھیں آتا ہے۔ وہ جیسے ہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں۔ آپ انھیں آر پار دیکھ سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے معرکے کی تخم ریزی سے ماضی قریب تک کے ہندوستان کی تاریخ کے ہر سنگ میل کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس کے بارے میں انھوں نے ساری قابل ذکر کتابیں نہ پڑھ

رکھی ہوں اور ان میں سے بیشتر کتابیں ان کی ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔ ان کے اس ذخیرے سے وکرم راؤ تک فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لطیف صدیقی اسّی کے پیٹے میں ہیں۔ مزاج کی ہنک ذرا سی کم ہوگئی ہے لیکن آن بان باقی ہے۔ شاکی رہتے ہیں کہ بھولنے لگے ہیں لیکن جو چاہتے ہیں یاد آ ہی جاتا ہے۔

قیصر تمکین کا انتقال ہوا تو ان کے بھائی ابراہیم علوی کے یہاں پہنچنے والے وہ پہلے شخص تھے۔ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کی چوک سے لے کر حضرت گنج تک کی ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی اور اس سے متعلق لوگوں اور واقعات کے سلسلے میں ان کی حیثیت انسائیکلوپیڈیا کی ہے۔

حسن شہیر

حسن شہیر کا خیال تھا کہ وہ بہت بڑے مفکّر ہیں اور کارل مارکس سے دو سو سال آگے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار وہ اکثر نہایت سنجیدگی سے کرتے۔ مذاق کی بات یہ ہے کہ اس دعوے میں مذاق کا کوئی عنصر شامل نہ ہوتا۔

وہ کبھی کبھی حضرت گنج کے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے رک جاتے، دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیتے اور کہتے، ''اس کمبخت کے بوجھ سے شانے دکھنے لگتے ہیں۔''

ان کا سر واقعی بڑا تھا۔ ممکن ہے یہ وزن شانوں کو گراں گزرتا ہو لیکن وہ سر کے وزنی ہونے کو عقل و دانش کی علامت مانتے۔

یہ سب ایک طرح سے فطری تھا۔ وہ ان دنوں معطّل سیلس ٹیکس افسر تھے۔ یہ معطلی شاید بارہ تیرہ سال جاری رہی، اتنے دنوں کہ لوگ بھول بھی گئے کہ وہ کبھی سرکاری ملازم تھے۔ یہ ایک بڑی محرومی تھی جسے وہ خود سے بھی چھپاتے۔ خود کو بہت بڑا مفکّر اور کارل مارکس سے دو سو سال آگے سمجھنا دراصل اپنی محرومیوں کو خود سے چھپانا ہی تھا۔ ہر شخص کو زندگی کرنے کے لیے، زندگی کرنا چھوڑیے کہ یہ بڑی بات ہے، زندہ رہنے اور خود کو مطمئن کرنے کے لیے، کچھ نہ کچھ حیلے بہانے تراشنا پڑتے ہیں۔ عظمت کا یہ تصوّر اور شاعری بھی ایسے حیلوں ہی کی ایک شکل تھی اور جب یہ حیلے، خود کو دیے جانے والے دھوکے، پرانے پڑنے لگے تو انھوں نے دوسرے حیلے تراش لیے جن کا ذکر آگے آئے گا۔

"اگر نہ ہو یہ فریب پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا

وہ رات میں اکثر قومی آواز آتے، سرور کے عالم میں۔ وہاں سب ان سے بزرگ تھے الاّ میرے اور قیصر تمکین کے اور قیصر تمکین پائنیر جا چکے تھے۔ وہ چق اٹھاتے، میری نظر پڑ جاتی تو میں "غیبت کدہ" میں لے جا کر ان کی "عظمتیں" بیان کرتا، ان پر یقین کا اظہار کرتا اور انھیں مطمئن اور خوش وخرم لوٹا دیتا۔ ایک دن کچھ زیادہ ہی سرور کے عالم میں تھے، چق اٹھائی لیکن میں سر جھکائے کام کر رہا تھا۔ آخر دو تین بار کی ناکامی کے بعد انھیں ضبط کا یارا نہ رہا تو انھوں نے پورا سر اندر ڈالا اور مجھے اشارے سے بلایا۔

میں گیا تو بولے، "اپنے فلسفے پر سوچتے سوچتے تھک گیا ہوں، جی چاہتا ہے کہ دوسرے درجے کے کسی مفکر کی کوئی کتاب پڑھوں۔"

دو تین دن بعد میں نے برٹرنڈ رسل کی Principles of Mathametics انھیں دے دی جو انھوں نے اگلے ہفتے واپس کر دی، یہ کہتے ہوئے کہ بیکار ہے۔

ان کا شعری مجموعہ "موت کی شہنائی" شائع ہوا تو نیاز فتح پوری نے اس کی "ہیبت ناک ندرت" کو سراہا۔ ایک نظم "موت" کچھ اس طرح تھی۔ اتاہ سمندر/ کٹے ہوئے سر/ اور خاموش مسکراہٹ۔

اس سے پہلے فلسفیانہ افکار پر ان کی کتاب "ذہن اور انقلاب" شائع ہو چکی تھی۔ "موت کی شہنائی" چھپی تو یار لوگوں نے ایک غزل کہہ دی۔ دو تین شعر یاد رہ گئے ہیں:

سب سے بڑی کتاب ہے "ذہن اور انقلاب"
اور اس کتاب سے بھی بڑے ہیں حسن شہیر
کرنے چلے تھے شہر نگاراں میں انقلاب
دیکھا تو راستے میں کھڑے ہیں حسن شہیر
تھی نثر کی تو پہلے ہی لٹیا ڈبو چکے
اب شاعری کے پیچھے پڑے ہیں حسن شہیر

حسن شہیر کو اچھے خاصے مصرعے پر خراب مصرع لگا کر اسے بگاڑنا خوب آتا تھا۔ ان کا ایک اچھا خاصا مصرع تھا، "دستِ طلب میں لے کے فسانہ حیات کا،" لیکن انھوں نے دوسرے مصرعے "محفل میں آپ آئے لیے آدمی کے پھول" سے اسے غارت کر دیا۔

پھر اپنے ریاستی وزیر بھائی کی سعی سفارش سے ان کی بحالی ہوگئی۔ لیکن اس دوران ان کی اردو کتابیں دس گنی بیس گنی قیمتوں یا تھوک میں خریدنے والوں کی نسل ختم ہو چکی تھی۔ اب جن لوگوں کے مقدمے ان کی عدالت میں آتے وہ اردو رسم الخط سے بھی ناواقف ہوتے چنانچہ انھوں نے رسم الخط کا جھگڑا ہی ختم کر دیا اور مصوری کرنے لگے اور وہ بھی Abstract۔ ہر ہفتے ایک آدھ تصویر بنا لیتے اور دو چار دن میں ہی فروخت ہو جاتی۔ وہ سیلس ٹیکس آفیسر تھے۔

پھر رٹائر ہو گئے۔ اب نہ کتاب بک سکتی تھی نہ پینٹنگ۔ چنانچہ انھوں نے اللہ سے لَو لگائی۔ ایک دن پنجابی مارکیٹ میں انیس کپڑا خرید رہی تھیں۔ وہیں میری نظر ان کی بیوی پر پڑی۔ میں نے پوچھا، ''صاحب بہادر کہاں ہیں؟'' تو انھوں نے پاس ہی کھڑے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ پہلی نظر میں تو میں انھیں پہچان نہ سکا۔ ٹخنوں سے اوپر چوڑی مہری کا پاجامہ، گھٹنوں سے نیچے تک کرتا اور لمبی داڑھی۔ ہنسے تو میں نے پہچان لیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگے۔

''میں اب تک جو کچھ کہتا تھا غلط تھا، جھوٹ تھا۔ اسلام ہی واحد سچا راستہ ہے۔ نماز پڑھا کرو، ہر سال پورے روزے رکھو''۔

میں نے کہا، ''شکریہ۔ اس کا ثواب آپ کو ضرور ملے گا۔''

کہنے لگے، ''میں نے اپنا فرض پورا کر دیا، اب روزِ حشر یہ نہ کہنا کہ تمھیں کسی نے بتایا نہیں۔''

میں نے کہا، ''لیکن بتانے والا بھی تو معتبر ہونا چاہیے۔''

کہنے لگے، ''مجھ سے زیادہ معتبر کون ہوگا۔ ہر گھاٹ کا پانی پی کے آیا ہوں۔''

میں نے کہا، ''اور اس سے مستفیض ہو کر بھی!''

کہنے لگے، ''توبہ توبہ۔''

◆◆◆

میری محبتیں

شیریں دہنی، شیریں نظری، رفاقت کے احساس، خلوص کی زیریں لہر اور گفتگو میں علم وذہانت کی گوٹ سے محرومی سے زندگی عبارت رہی۔ وہ سب جن میں یہ خوبیاں ملیں چہیتے، جان سے پیارے اور آنکھوں کا نور رہے اور جنھیں خدا نے ان سوغاتوں سے نہیں نوازا وہ حلقۂ بیرونِ در ...لیکن ان سے دشمنی یا مخاصمت کا کوئی رشتہ نہ رکھا...تم اپنی دنیا میں خوش، ہم اپنی دنیا میں، ...تاہم ایسے بھی ہیں جنھوں نے التزام رکھا کہ کوئی زخم بھرنے نہ پائے، ہر دھوکے، ہر فریب ہر جھوٹ پر ایک نئے دھوکے، ایک نئے فریب اور نئے جھوٹ سے پردہ ڈالنا چاہا۔ ان سب کو، جنھوں نے اپنوں کو غیر بنا دیا اور دوستوں کو دشمن بنانے کی کوشش کی اور ہر حسنِ سلوک کا جواب اینٹ پتھر اور کمینگی سے دیا، حسبِ صلاحیت وقوت برداشت کیا۔ صبر وضبط سے سہا، لیکن جب ضبط کی طنابیں ٹوٹنے لگیں تو انھیں اپنی زندگی اور وجود سے خارج کر کے خود پس دیوار چلا گیا لیکن کمینے اور رذیل گھروں میں گھس کر وار کرتے رہے۔

''جو یاد رہا'' میں کسی ایسے شخص کا ذکر ضمناً یا اتفاقاً آ گیا ہو تو بات دوسری ہے، ورنہ ان کے ناموں، کاموں اور عیاریوں سے نوکِ قلم کو آلودہ کر کے نہ قلم کی بے حرمتی کی ہے نہ کاغذ کی... الّا ایک واقعے کے، کہ اب بھی پکی روشنائی سے اسے رقم نہ کیا تو سینہ پھٹ جائے گا...لیکن اس کا ذکر سب سے آخر میں آئے گا۔

آمنہ آپا

آمنہ آپا جن سے تعارف کبیر شاہ نے کرایا بس ایسی تھیں کہ خدا ہر ایک کو ایسی بہن نصیب کرے۔ یونیورسٹی میں ان کے تین دوست تھے، کبیر شاہ، افضال اور مَیں۔ باقی دونوں انھیں آمنہ کہتے لیکن میں آمنہ آپا، اگرچہ ہم تینوں ہم عمر تھے۔

آمنہ آپا کوئی ایسی ویسی خاتون نہ تھیں، مسٹر امیر رضا کی رفیق حیات تھیں۔ رضا صاحب نے الٰہ آباد کے ضلع مجسٹریٹ کی حیثیت سے ۱۹۴۲ء کی ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک میں مظاہرین پر گولی چلانے سے انکار کر کے معطلی اور گرفتاری کو لبیک کہا تھا۔ اس وقت میں دس برس کا رہا ہوں گا۔ آمنہ آپا کہتیں، ''بھیّا میں جانتی ہوں برے دن کیسے ہوتے ہیں۔ صبر کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ امیر رضا معطل ہوئے تو ایسوں نے جو صبح شام سلام کرنے آتے تھے صورت دکھانا چھوڑ دی اور رشتے دار مُنہ چرانے لگے۔''

پہلی بار کلّے اسکوائر میں ان کے گھر گیا تو انھوں نے اپنے تین بچوں سے ملایا... سعیدہ شاید انٹر میں تھی، لا ریٹو میں، اور مجھوّلا مارٹنیر میں، تمو نے اسکول جانا بس شروع ہی کیا تھا۔ تھوڑے دنوں میں شمیم رضا بھی آ گئی جو امیر رضا کے بڑے بھائی کی بیٹی تھی۔ تیغ الٰہ آبادی کو (جو بعد میں مصطفیٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے) پہلی اور آخری بار وہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنا ایک پتلا سا مجموعۂ کلام بھی مجھے دیا تھا۔ شاید اس کا نام ''روشنی'' تھا۔

امیر رضا بے حد پڑھے لکھے تھے، دبلے پتلے خاموش قسم کے انسان۔ ڈرائنگ روم سے لال بہادر شاستری، مظفر حسین، ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد، کے۔ ڈی۔ مالویہ، اور پی۔ سی۔ جوشی، جنھیں پہلی بار وہیں دیکھا، کی آوازیں تو کبھی کبھی ملحق کمرے میں سنائی دیتیں لیکن امیر رضا کی آواز کبھی نہیں۔ وہ بائیں بازو کے خیالات کے آدمی تھے، اس لیے کمیونسٹ لیڈر جو باہر سے آتے، ان سے ضرور ملتے۔

امیر رضا کوئی معمولی افسر نہ تھے۔ اصلاحات آراضی کے کمشنر تھے۔ اتر پردیش میں خاتمۂ زمینداری کا بل اور سارا منصوبہ انھی کا بنایا ہوا تھا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ حکومت ہند کے مشیر اصلاحات آراضی مقرر ہوئے، افریقہ کے کسی ملک (غالباً نائجیریا) میں بھی اس کام کا سارا منصوبہ انھی نے بنایا۔ ان میں افسری کی کوئی خو بو نہ تھی، کھدّر کا کرتا اور پاجامہ پہنتے... ان کے استعمال میں دو دو گاڑیاں تھیں، ایک سرکاری، ایک نجی۔ سرکاری گاڑی ساڑھے نو بجے صبح آتی، وہ پونے دس بجے دفتر روانہ ہو جاتے، چھے سوا چھے بجے عام طور سے دفتر سے واپس آتے اور گاڑی لوٹ جاتی۔ سرکاری گاڑی کو سودا سلف لاتے، بچوں کو اسکول پہنچاتے کبھی نہ دیکھا۔

آمنہ آپا بھی ویسی ہی تھیں۔ نہ ان کے جسم پر کبھی شوخ اور قیمتی کپڑے دیکھے نہ ناک اور کانوں کی کیل اور ایک ہاتھ میں چوڑیوں کے ساتھ سونے کے ایک پتلے سے کڑے کے علاوہ کوئی زیور۔ سواریوں میں انھیں یکّہ پسند تھا لیکن کچھ عجیب انداز سے۔ وہ اس پر چادر تنواتیں اور

برقع اوڑھ کر اندر بیٹھ جاتیں۔ وہ پوچھتا بیگم صاحبہ کہاں چلنا ہے تو کہتیں دس روپے میں جہاں تک چاہو گھمادو، بس واپس گھر پہنچانا ہوگا۔

ان دنوں چاول کی بڑی قلت تھی۔ بنگلے کے اوپری حصے میں ایک عیسائی خاتون اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کے یہاں ایک صاحب ہر اتوار کو آتے، چاول کی ایک پوٹلی ہاتھ میں لیے ہوئے۔ ایک دن مجھ سے بولیں، ''بھیا تمھیں ایسا کوئی نہیں ملتا جو میرے لیے چاول لے آیا کرے۔'' یہ سن کے سعیدہ بولی، ''امی آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں؟'' تو ہنسنے لگیں۔

آمنہ آپا نے مجھے بیس روپے مہینے کا ان دونوں لڑکیوں کا ٹیوشن دلا دیا تھا۔ مذاق یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ مجھے ہندی پڑھانی تھی۔ مجھے ان دونوں سے ہندی بس اس قدر زیادہ آتی تھی کہ وہ کہتیں، ''کالو بھانگی کے پاس ایک ٹوٹا تھا'' اور میں کہتا، ''کالو بھنگی کے پاس ایک توتا تھا''۔ لیکن یہ ٹیوشن تھا بڑے مزے کا، اتوار کو تو سنڈے ہوتا ہی، دوشنبہ کو دونوں ہاکی کھیلنے جاتیں، منگل کے دن انھیں اپنے/اپنی کسی دوست کی سالگرہ میں نہ جانا ہوتا تو پڑھائی ہوتی، بدھ کو سوئمنگ کے لیے جاتیں، آگے کے دو تین دنوں میں سے مشکل سے ایک دن پڑھائی ہوتی اور پھر سنڈے آجاتا۔

گھر میں ایک چھوٹا سا کتا تھا جو میز کے نیچے بیٹھا رہتا۔ ایک دن میں نے جان بوجھ کے اسے پیر سے چھوا تو وہ زور سے بھونکا اور اس نے مجھے کاٹنے کی کوشش کی لیکن جوتے پر منہ مار کے رہ گیا۔ وہ دونوں ایک دم اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور کتے کی برہمی دور کرنے کے لیے اسے ''جمی، جمی'' کہہ کے پکارنے لگیں، پھر ان میں سے بڑی نے مجھ سے پوچھا، ''سر آپ نے اسے جوتے سے چھوا تھا؟''

''نہیں تو،'' میں صاف جھوٹ بول گیا۔

پھر ایک دن یہ سلسلہ یکا یک ختم ہو گیا، ان کی طرف سے نہیں، میری طرف سے۔ ہندی جتنی مجھے اب آتی ہے اس وقت اس سے کم ہی آتی تھی۔ مجھے ایک ایک حرف پڑھ کے لفظ بنانا پڑتا تھا لیکن ایک ایسا لفظ آ گیا جس کے حروف ہی سمجھ میں نہیں آرہے تھے تو لفظ کیا بناتا اور اس کے معنی کیا بتاتا۔ میں سمجھا چھپائی کی غلطی ہے، سمجھا نہیں، بہانا بنایا، وہ لفظ ''رنز'' تھا جس کے معنی قرض ہوتے ہیں۔ ایسی شرمندگی ہوئی کہ سات آٹھ دن تک آمنہ آپا کے یہاں بھی نہ گیا۔ نہ لڑکیوں نے پوچھا نہ ان کی ماں نے۔ شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ میں پڑھانا نہیں چاہتا، ''رنز'' کی بات تو ان کی سمجھ میں آنہیں سکتی تھی۔ یہ واقعہ مہینے کی سات تاریخ کو ہوا تھا۔ ان سات دنوں

کی ٹیوشن فیس بھی نہیں ملی۔

نزہت اور ثروت نام کی دو لڑکیوں کو پہلی بار آمنہ آپا ہی کے یہاں دیکھا۔ نزہت گوری تھی لیکن ثروت جس کا رنگ دبتا ہوا تھا کہیں زیادہ اچھی لگتی۔ وہ خاموش مزاج تھی جب کہ نزہت بلاسوچے سمجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ بولا کرتی۔ دہلی جانے کے بعد ثروت کو آمنہ آپا نے کے۔ ڈی۔ مالویہ سے کہہ کر انھی کے دفتر میں رکھا دیا تھا۔ پھر ایک دن میں دہلی میں ان کے گھر گیا ہوا تھا۔ کسی نے ان سے مالویہ جی سے کسی کام کا ذکر کیا تو آمنہ آپا نے کہا۔

''اب ہم لوگوں کو ان سے ملاقات کرنے کے لیے ثروت سے وقت لینا پڑتا ہے۔ میں اسی سے کہوں گی۔''

اتوار کے دن آمنہ آپا کے یہاں شام کی چائے مکان کے باہر کے چھوٹے سے لان میں پی جاتی۔ ملازم میز کرسیاں لگا کر اس پر میز پوش بچھا دیتے۔ چائے اور بسکٹ وغیرہ رکھے جارہے ہوتے تو گھر کے لوگ ایک ایک کر کے بیٹھنے لگتے۔ اسی وقت ایک بڈھا سا آدمی گلاب کے پودوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتا تو سعیدہ آمنہ آپا سے کہتی۔

''امّی آپ کا بڈھا آ گیا۔''

امیر رضا کی موجودگی کے خیال سے آمنہ آپا زیر لب مسکراتیں۔

اسے چائے دی جاتی تو کہتا، ''خالی چائے۔'' آمنہ آپا توس بھجوا دیتیں۔ وہ انھیں دونوں طرف الٹ پلٹ کے دیکھتا اور کہتا، ''مکھن نہیں لگایا ہے؟'' خیر مکھن لگا دیا جاتا۔ پھر سب لوگ چائے پی چکتے تو برتن اٹھائے جانے لگتے۔ اسی بیچ کوئی کہتا، ''اب جاتے کیوں نہیں؟'' وہ خاموشی سے سوال پوچھنے والی کی طرف دیکھتا رہتا۔ کوئی اور یہی سوال دوبارہ پوچھتا تو دھیرے سے کہتا، ''روپیہ تو ملا نہیں۔'' اب آمنہ آپا کی باری ہوتی۔ وہ پوچھتیں، ''کھائی تو نہیں تھی؟'' وہ ان سے آنکھیں ملائے بغیر انگوٹھا اور شہادت کی انگلی ملا کر کہتا، ''اتّی سی کھائی تھی'' مراد افیم سے ہوتی۔ آمنہ آپا مسکراتیں اور اسے ایک روپیہ دے دیتیں۔

یہ تقریباً روزانہ کا معمول تھا۔

ایک دن آمنہ آپا نے مجھ سے کہا، ''بھیّا تم نے اپنی لمّاں سے نہیں ملایا، کے بار کہہ چکی ہوں''

''آمنہ آپا میرا گھر واقعی غریب خانہ ہے۔''

"تمھارے گھر سے تھوڑی ملنا ہے، امّاں سے ملنے جاؤں گی۔"

خیر، وہ میرے ساتھ بدرالدین ماموں کے گھر آئیں، اپنی کار میں۔ اوپر نیچے کے کئی کمروں کے مکان میں سناٹا سا تھا۔ امّاں سے جو کچھ چائے پانی ممکن تھا اس کا انتظام کیا۔ اس کے بعد پاندان کھولا اور پوچھا۔

"بہو تم تمبا کو کھاتی ہو۔"

"نہیں امّاں، پیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے پرس سے سگریٹ نکالی۔ امّاں ہنسنے لگیں۔

آمنہ آپا دن بھر میں دو تین سگریٹیں پیتی تھیں لیکن ہمیشہ گھر میں اور وہ بھی کمرے کے اندر۔ ان کو گھر کے دالان تک میں سگریٹ پیتے کبھی نہیں دیکھا۔

عشرے کے دن کالے کپڑوں میں ملبوس ایک صاحبہ کو جو بڑی ترقی پسند بنتی تھیں حضرت گنج کے پرانے یونیورسل کے سامنے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا تو انھیں بہت برا لگا۔ اس کا ذکر اکثر کرتیں۔

ایک دن امیر رضا کو چھتر منزل جانا تھا۔ وہی وقت آمنہ آپا کے یونیورسٹی جانے کا تھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ آمنہ آپا نے کہا، "رضا تم ہمیں یونیورسٹی چھوڑ دینا۔" رضا صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا جس کے معنی تھے ٹھیک ہے۔

ہم لوگ گاڑی سے یونیورسٹی چلے لیکن انھوں نے کارمنکی برج (سابقہ پل) کے پاس رکوادی۔ آمنہ آپا نے کہا، "دو قدم تو ہے، یونیورسٹی تک چھوڑ دو۔" امیر رضا نے ان کی طرف دیکھا اور کہا، "سرکاری گاڑی میں یہاں تک آ گئیں یہی بہت ہے۔"

پھر آمنہ آپا اور سب لوگ دہلی چلے گئے، سعیدہ کے علاوہ۔ وہ آئی ٹی میں بی۔ اے کر رہی تھی۔ دہلی میں ایک بار سعیدہ سے ان کے یہاں ہی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد رابطہ ٹوٹا رہا۔ پھر ایک دن افضال کا فون آیا، ہیرالڈ میں، "آمنہ آئی ہیں۔" اسی شام میں اور انیس، بڑی بٹی صبا کے ساتھ افضال کے یہاں گئے۔ ویسی ہی تھیں، بس ذرا دبلی ہو گئی تھیں۔ وہاں نعیمہ بھی تھی جسے میں "نمو" کہتا۔ اس کے یہاں چند روز قبل ولادت ہوئی تھی۔ آمنہ آپا ہنس ہنس کے انیس سے کہہ رہی تھیں، "ایک ہم لوگ تھے، ہفتوں اٹوائی کھٹوائی لیے پڑے رہتے، سٹھورا کھاتے اور ایک آج کی لڑکیاں ہیں چوتھے دن زینے چڑھنے لگتی ہیں۔" پھر ہم لوگ دو گاڑیوں میں لد

پھند کے تمو کے گھر گئے تھے، نرالا نگر میں۔ وہاں چھدرے چھدرے تھوڑے سے مکان تھے۔ میرا خیال ہے ۱۹۸۰ء کے آس پاس کی بات رہی ہوگی۔ مجھے تو سچ پوچھیے ڈر لگا تھا کہ رات کے سناٹے میں لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں۔

دو تین دن بعد آمنہ آپا ہمارے گھر بھی آئی تھیں۔ ان دنوں ہم لوگ کپور مارکیٹ میں رہتے تھے۔

لکھنؤ میں ان کا قیام ہمیشہ افضال کے یہاں رہتا لیکن جب بھی آتیں ہمارے یہاں دو تین بار ضرور آتیں۔ بچوں کے لیے جے پور کے زیور اور کھلونے لاتیں۔ کبھی خالی ہاتھ نہ آئیں۔ میں پرانے دنوں کی باتیں کرتا تو خاموشی سے سنا کرتیں، کچھ نہ بولتیں، ایسا لگتا جیسے اندر اندر رو رہی ہوں۔

ایک بار میں نے نام بنام ایک ایک کی خیریت دریافت کی۔ مجو کے نام پر آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پرس کھولا، تصویر نکالی، آنکھوں سے لگائی۔ بہت دیر بعد بتایا۔ نائجیریا میں تھا۔ کار ایکسی ڈینٹ میں میاں بیوی دونوں جاں بحق ہوگئے۔ نائجیریا سے دونوں کی لاشیں لے کر آئیں۔

پھر بہت بعد، بہت بعد کیا ۲۰۰۴ء یا ۲۰۰۵ء میں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ جانے کیسے اس نے آمنہ دادی کا ذکر کیا۔ میں نے کہا، ''مجوّ کے بیٹے ہو؟''

صورت بہت ملتی تھی۔

اس نے پوچھا کہ مجھے اس کے والد کا گھر کا نام کیسے معلوم ہوا۔ میں نے ساری بات بتائی۔ اس نے بغیر کسی جذباتی تعلق کے رام کہانی سنی۔ مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوئی۔ اب جذبے کی گرمی بس آتی جاتی لہروں کی طرح ہوتی ہے۔ غم کوئی پالتا نہیں۔ وہ زمانے ہوا ہوئے جب غم پالے جاتے تھے۔

ایک بار آئیں تو اس دن دفتر سے میرا آف تھا۔ دن کا کھانا ہم سب نے ایک ساتھ کھایا۔ کھانے کے دوران ہی میں نے رضا صاحب کے بارے میں پوچھا تو ہاتھ پلیٹ اور منہ کے درمیان جہاں تھا وہیں رک گیا۔ آنکھیں نم ہوگئیں، پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ انیس نے ہاتھ سے لقمہ لے کر پلیٹ میں رکھ دیا۔ پھر ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ بہت دیر تک کسی نے کوئی بات نہیں کی، کھانا کھانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔

شام میں چائے پی گئی۔ بچے اسکول سے آ گئے تو ان سے خوب خوب باتیں کیں، جیسے کچھ بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔

کئی برس بعد ایک دن یکا یک خیال آیا کہ آمنہ آپا کئی برسوں سے نہیں آئیں۔ فوراً افضال کو فون کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے خط کا بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ ان سے بیرسٹر نورالدین کی بیوہ، اور دہلی اور جے پور کی دو خواتین کے پتے ملے۔ تینوں پتوں پر آمنہ آپا کی خیریت معلوم کرنے کے لیے رجسٹری سے خطوط بھیجے۔ صرف بیگم نورالدین کا خط واپس نہ آیا لیکن خیر خبر وہاں سے بھی نہ ملی۔

پھر دو تین سال بعد افضال نصرت پبلشرز آئے۔ آنسوؤں سے لڑتے ہوئے۔ انھوں نے کہا، ''آمنہ بہت دن ہوئے چلی گئیں۔'' اب ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کر ان سے چمٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھے رو رہے تھے۔ وہاں جو لوگ تھے ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ ہم نے بتایا بھی نہیں، کون کس کا دکھ سمجھتا ہے۔ کون کس کا دکھ بانٹتا ہے۔

نجمہ اور انو آپا کی طرح وہ میری سب سے پیاری بہن تھیں۔

سب چلے گئے، سب سے پہلے کبیر شاہ، پھر آمنہ آپا، پھر افضال... پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ ایک نوحہ گر باقی ہے۔ دیکھیے کب تک رہے۔

راجی سیٹھ

راجی سیٹھ سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ راجن سرین ہوا کرتی تھی۔ ایم۔ اے کے پہلے سال میں وہ میری کلاس فیلو تھی۔ راجن گوری چٹی تو تھی لیکن جب تک وہ بات نہ کرے اس میں کوئی ایسی بات نہ نظر آتی جو کسی کو کچھ زیادہ لبھائے اور یہ محض اتفاق تھا کہ درشن پریشد میں سرگرم ہونے کے باوجود میری اس سے باقاعدہ ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

ایک دن ٹیگور لائبریری گیا تو وہ اسٹیک روم کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی... خاموش، اداس، خود میں کھوئی ہوئی۔

''کیا ہوا راجن؟ میں نے کہا۔ یہ میری اس سے پہلی بات چیت تھی۔

وہ رودی، جیسے انتظار ہی میں ہو کہ کوئی پوچھے اور وہ رودے... معلوم ہوا کہ اس کی بھابی میڈیکل کالج کے پرائیوٹ کاٹیج وارڈ میں بھرتی ہیں اور Appendix کا آپریشن ہونا ہے۔ میں نے وہ ساری باتیں کہیں جو ایسے موقعوں پر کہی جاتی ہیں اور شام کو ٹیوشن کے بعد میڈیکل کالج پہنچ گیا،۵۔کاٹیج وارڈ۔ پرائیوٹ وارڈ تھا کہ پورا مکان۔ باہر دالان، اس کے بعد ایک بڑا کمرہ، پھر ایک اور کمرہ، اس کے بعد دالان جس کے ایک حصّہ میں چھوٹا سا کمرہ تھا، اس کے بعد آنگن، داہنی جانب باورچی خانہ اور بائیں طرف کونے میں غسل خانہ وغیرہ۔

راجن کے گھر والوں میں سب ایسے تھے کہ ذرا سی دیر بعد معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ پہلی ملاقات ہے، ایسا لگتا کہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ سب گورے چٹے تھے۔ بھابی دبلی پتلی تھیں اور بستر پر دراز، بھیاّ جی یعنی راجن کے سب سے بڑے بھائی کا رنگ ذرا سا کم تھا لیکن ان کی باتیں ایسی ہوتیں کہ دل موہ لیتیں۔ لیش، ان کا چھوٹا بھائی، تو سرخ سفید تھا اور یہی حال اماّں جی کا تھا لیکن انھیں دیکھا بعد میں۔ اس وقت وہ شاہجہاں پور ہی میں تھیں۔

پہلے دن تو رسماً اپنی کلاس فیلو کی بھابی کی مزاج پرسی کے لیے گیا تھا لیکن پھر یہ ہوا کہ روز ہی جانے لگا اور پھر ایک دن بھیاّ جی کے اصرار پر فلسفہ کی آٹھ دس کتابیں اور کاپیاں لے کر وہیں منتقل ہو گیا۔ چھوٹے سے کمرے میں میز کرسی پہلے سے موجود تھی۔ میں نے اسے اپنی اسٹڈی بنادی اور جب بھی موقع ملتا تھوڑی بہت پڑھائی لکھائی بھی کر لیتا۔ اپینڈی سائٹس کا آپریشن اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب نس پھولی ہوئی ہو اور جب یہ ہوتا تو سرجن مسرا، جن کے وہ زیر علاج تھیں، ہاتھ نہ آتے۔ اس لیے کئی مہینے لگ گئے۔

اسی دوران ایک بار راجن شاہجہاں پور گئی اور وہاں سے پانچ چھے دن بعد لوٹی تو باہر کمرے میں بھیاّ جی بھابی کے سرہانے بیٹھے تھے اور ایک کرسی پر میں۔ اس نے گھر کی موٹی موٹی باتیں بتائیں اور اندر کے کمرے میں جاتے ہوئے مجھ سے کہا، ”عابد تم ذرا اندر آنا۔“

میں اندر گیا تو اس نے کہا، ”عابد اپنی کتابیں اٹھاؤ اور چلے جاؤ یہاں سے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ انھیں روکنے کے لیے خود سے لڑ رہی تھی۔

میں نے کہا، ”میں ابھی چلا جاؤں گا، پھر کبھی نہیں آؤں گا، لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمھیں ہوا کیا ہے۔“

”تمھیں معلوم ہے،“ اس نے کہا، ”میری منگنی ہو چکی ہے... شاہجہاں پور میں مَیں نے

تمھیں بہت مِس (Miss) کیا...نہیں نہیں، تم جاؤ، بس یہاں سے چلے جاؤ۔''

لیکن تھوڑی دیر میں وہ نارمل ہوگئی۔ بالکل عام دنوں جیسی۔ جے سنکر پرساد کی ''آنسو'' اسی نے مجھے پڑھ کر سنائی تھی اور ''کامائنی'' کے کئی حصّے سنا کر اس کے معنی سمجھائے تھے۔ الٰہ آباد کی ''نئی کہانی'' میں میری جتنی بھی کہانیاں چھپیں سب ترجمہ کی ہوئی اسی کی تھیں، ترجمہ کی ہوئی کیا ناگری لپی میں لکھی ہوئی۔ وہ اردو پڑھ لیتی تھی۔

مس باربرا نام کی ایک ہیڈ نرس ہر ہفتے آتی، گول مٹول، خوبصورت سی۔ جاڑوں کے دن تھے، وہ سفید کوٹ پہنے ہوئے تھی جو بھابی کی دیکھ بھال کے دوران اس نے اتار دیا تھا۔ پھر وہ اندر سے ہاتھ دھو کے لوٹی تو اس نے دیکھا کہ اس کا کوٹ بھیا جی پہنے ہوئے ہیں۔ اس نے پوچھا،

"What is this?"

"Barabarism"، بھیا جی نے کہا

وہ ہنسنے لگی اور کہاں ہفتے میں ایک دن آتی تھی، اب دو بار آنے لگی۔ کہنا یہ ہے کہ اس گھر کے لوگ ایسے تھے کہ ہر ایک اپنا دل ہار دیتا۔

آخر بھابی کا آپریشن ہوگیا اور یش پال کی شادی بھی جو اُن کی بیماری کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ میں نے یش کی شادی میں بھی شرکت کی، راجن کی شادی میں بھی، اس کے بعد بھی دو تین بار جانا ہوا۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ یش نے گاڑی ہیرالڈ کے آفس کے سامنے لاکر کھڑی کردی کہ تمھیں لے کر ہی جاؤں گا۔ میں نے کسی طرح تین دن کی چھٹی لے کر اس کی بات پوری کی۔

شروع میں راجن سے خط و کتابت رہی لیکن پھر سیٹھ صاحب کے تبادلوں کے سبب رشتہ منقطع ہوگیا۔ وہ محکمۂ انکم ٹیکس میں تھے اور دہلی میں کمشنر کے عہدے سے رٹائر ہوئے۔ شریف اور خاموش انسان۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اتنے بڑے افسر ہیں۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولے ہوئے تھے کہ دہلی میں ہندی اردو فکشن پر ایک سیمنار ہوا اور وہاں راجی سے ملاقات ہوگئی، لیکن اس کی بھی ایک کہانی ہے۔

میرا قیام جامع مسجد کے مہمان خانے میں تھا۔ معلوم نہیں رات میں نیند کس وقت آئی کہ صبح آنکھ ساڑھے نو بجے کھلی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر جلسہ گاہ پہنچا تو گیارہ بج رہے تھے۔ صبح کا اجلاس جس میں مجھے تقریر کرنی تھی شروع ہو چکا تھا۔ میں خاموشی سے بالکنی میں جا کر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے منتظمین کو میرے آنے کا علم ہوگیا اور اسٹیج سے میرا نام لے کر وہاں آنے کے لیے کہا

گیا۔ میں نے وہیں سے کہا کہ اس وقت بس ایک پیالی چائے بھیج دیجیے، دوسرے سیشن میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔ تھوڑی دیر میں مجھے ایک جانا پہچانا چہرہ خالی کرسی تلاش کرتا ہوا نظر آیا۔ میرے پاس کی کرسی خالی تھی لیکن جانے کیسے اس پر اس کی نظر نہیں پڑی اور وہ میرے پاس سے گذری تو میں نے ہاتھ پکڑ کے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

''عابد تم!'' یہ آواز راجی کی تھی۔ ''ہائے رام میں نے تمھیں پہچانا نہیں۔''

راجی جیسی بھی ہو، جس موڈ میں ہو ویسی ہی نظر آتی ہے۔ نہ وہ اپنا غصہ چھپا سکتی ہے نہ بیزاری، نہ غم نہ خوشی۔ اس وقت مجسّم خوشی تھی۔

اسٹیج پر کیا ہو رہا تھا، کس نے کیا کہا ہمیں پتہ نہ چلا۔ ہم دونوں چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ بیس بائیس سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ دنیا جہان کی باتیں کرنے کو تھیں۔ اتنے میں چائے پانی کے لیے وقفہ ہو گیا۔ میں نے سیٹھ صاحب کے بارے میں پوچھا تو بولی وہی تو چھوڑ کے گئے ہیں، لینے آئیں گے تو ملنا۔ پھر دہلی کے کئی ہندی ادیبوں اور اپنی دوستوں سے ملایا۔ اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی، کچھ یہی حال میرا بھی تھا۔

دوسرے اجلاس میں مجھ سے پہلے ہندی کے ایک نامور ادیب نے جدیدیت کی حمایت میں تقریر کی تھی۔ اتفاق سے ان کی ساری توجہ فکشن ہی پر تھی۔ میں بھی ان دنوں فکشن پر کام کر رہا تھا۔ اپنی بساط بھر جواب دیا۔ اسی دوران سیٹھ صاحب آ گئے اور اسے جانا پڑا۔ ہاتھ سے اشارہ کر کے چلی گئی۔

اس دن سے اب تک ملاقات نہیں ہو سکی، اگرچہ فون پر کبھی کبھی بات ہو جاتی ہے۔

راجن نے لکھا کہ ہندی کے اخباروں میں تمھاری تقریر کی بہت تعریف ہوئی۔ خدا جانے سچ کہ جھوٹ، ویسے وہ جھوٹ بولنے والوں میں نہیں ہے۔ لیکن کون جانے اس نے اتنے پرانے دوست کی خوشی کے لیے ایک بار جھوٹ بھی بول دیا ہو۔

راجی سیٹھ ہندی کہانی کا ایک بڑا نام ہے۔ اس کی کہانیوں کے مجموعے ہندی کے بڑے پبلشروں نے چھاپے ہیں۔ اس کی بہترین کہانیوں کا انتخاب دہلی اردو اکادمی سے بھی شائع ہوا ہے۔ اسے رابندر ناتھ ٹیگور اوارڈ بھی مل چکا ہے۔ ساہتیہ اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے ہندی سے انگریزی اور انگریزی سے ہندی میں ترجمے بھی کرتی ہے۔

راجن اب بھی بالکل ویسی ہی ہے جیسی پچاس سال پہلے تھی۔ اس کی ایک ایک بات،

ایک ایک جملے اور ایک ایک کہانی پر اس کی شخصیت کی چھاپ نظر آتی ہے لیکن وہ خود دکھائی نہیں دیتی۔ آپ اس سے ذاتی طور پر واقف نہ ہوں تو اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ کردار کے پیچھے کون بول رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی کہانی کا ہر کردار اپنی شخصیت رکھتا ہے۔ اس کے افسانوں کا یہ بھی ایک حسن ہے، ایک بڑی فنکاری ہے۔

ایک دن فون پر بولی، ''عابد تم آؤ، ارچنا بھی ملنا چاہتی ہے۔''

''لیکن میں اس سے نہیں ملنا چاہتا،'' میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ارچنا شعبۂ فلسفہ ونفسیات کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ شخصیت میں بڑی فنکاری تھی، سیکڑوں نہایت عمدہ اشعار یاد تھے... لیکن اس نے ہار بڑی جلدی مان لی یا اپنی قیمت بہت کم آنکی اور یہ بھی نہ سوچا کہ سائکولوجی کے نوٹس نقل کرنے میں مدد کرنے کے لیے جسے لائبریری سے اپنے ساتھ لے کے آئی تھی اسے اس کی بزدلی یا مصلحت اندیشی کی کتنی بھاری قیمت چکانی پڑی۔

یہ سب اپنی جگہ، لیکن راجن کی باتیں کسی اور کے ذکر پر کیوں ختم کروں۔

راجن کوئی ایسی خوبصورت نہیں ہے لیکن آپ اس سے بات کر رہے ہوں یا اس کی کہانیاں پڑھ رہے ہوں تو یہ خیال ضرور آئے گا کہ وہ صورت کی بھی حسین ہے اور دل کی بھی۔

خواجہ رائق

''کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں'' کی تفسیر کا ایک نام خواجہ رائق بھی ہے۔ ہر ایک کے کام میں سب سے آگے، کسی کام سے انکار کرنا جانتے ہی نہیں۔ میں اکثر کہا کرتا کہ پنڈت نہرو کی برائی کرنے والے مل جائیں گے، رائق کی برائی کرنے والا ڈھونڈھنا مشکل ہے۔

بھابی یعنی حلیم خاں کی بیوی کا انتقال ہوا تو ان کی خالہ بہرائچ سے آئیں اور سارے کاموں کا نپٹارا کرنے لگیں۔ اماں کے بھابی کی بٹی بیٹی کو پالنے پوسنے کے لیے اپنے ساتھ لے کر اورئی چلے جانے کے بعد بہرائچ والی خالہ نے جمیل کی اماں سے کہلایا، ''اب تک کی بات دوسری تھی۔ اب اوپر کے کمرے کا کرایہ بیس روپے ہوگا اور کھانے کے چالیس روپے۔'' کھانے کا کچھ باقاعدہ دیتا نہ تھا لیکن بار خاطر بھی نہ تھا البتہ کرائے کے بیس روپے کہاں سے آئیں گے؟ میں نے

سوچا۔ حلیم بے چارے مُنہ چھپائے چھپائے پھرتے۔

کیا کرتا؟ آخر رائق سے کہا۔ انھوں نے سر کھجایا، ادھر ادھر دیکھا، تو ند پر، جو اس وقت بھی تھی، ہاتھ پھیرا اور "پیچھے کے مکان کا اوپر کا حصہ خالی پڑا ہے، آجاؤ" کہتے ہوئے کہیں اور نکل گئے۔

ایک بڑا سا کمرہ، آنگن، کچن اور آب خانہ، اور کیا چاہیے تھا؟ خیر میں اگلے دن منتقل ہو گیا، ایک میز، چھوٹا سا بکس اور پندرہ بیس کتابیں لے کے۔ شام ہوئی تو دیکھا کہ ان کے گھر کی ملازمہ چھوٹی سی سینی پر خوان پوش ڈھکے چلی آرہی ہے۔ دن بھر کا تھکا تھکایا تھا، کہیں جانے کی ہمت نہ تھی، کہار کھ دو اور جیسے ہی وہ آنکھوں سے اوجھل ہوئی کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ تھکا ہی نہیں، دن بھر کا بھوکا بھی تھا۔ برتن لینے آئی تو اس غریب کو ڈانٹ پلادی، "آگے سے کھانا لے کے آئی تو ٹانگ توڑ دوں گا"۔ وہ جانتی تھی کیسی باتیں کرتا ہوں، ہنستی ہوئی چلی گئی اور رائق سے جانے کیا جا کے لگایا کہ ذرا کی ذرا میں آستین چڑھا کے آگئے۔ میں جانتا تھا کہ معاملہ کیا ہے سو اُن کے آتے ہی حملہ بول دیا۔

"کرایہ کتنا ہوگا؟"۔

یہ جملہ اُن پر بم بن کر گرا۔ جو سوچ کے آئے تھے بھول گئے اور روزے معاف کرا کے ہی خوش ہو لیے۔ میں نے نماز معاف کرالی۔

یہ مکان اس حویلی کا حصہ تھا جس کے مالک کے لیے غالبؔ نے کہا تھا۔

"بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے"

بی۔اے۔ میں رائق کا ٹیوٹوریل ہاشمی صاحب کے ساتھ تھا۔ یہ کلاس ہی میں کم جاتے، ٹیوٹوریل کے لیے خاک جاتے۔ احتشام صاحب نئے نئے الہ آباد گئے تھے، ہر ہفتے نہیں تو دسویں پندرہویں ضرور آتے۔ ہاشمی صاحب کے ساتھ شعبۂ اردو سے نکل ہی رہے تھے کہ رائق پر نظر پڑ گئی، پوچھا، "پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟" انھوں نے کہا، "ٹھیک ہے"۔ احتشام صاحب نے پوچھا ٹیوٹوریل کس کے ساتھ ہے تو انھوں نے ہاشمی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ ہاشمی صاحب نے حیرت کا اظہار کیا تو بولے۔ "جی میں گیا تھا، آپ اس دن یونیورسٹی نہیں آئے تھے۔" احتشام صاحب نے ٹیوٹوریل کے نمبروں کی لالچ دی کہ خوب ملتے ہیں۔ بات خواجہ رائق کے سمجھ میں آگئی اور انھوں نے ایک مضمون ہاشمی صاحب کو دکھا ہی دیا۔

تھوڑے دنوں بعد پھر کچھ ایسی ہی صورت پیدا ہوگئی تو احتشام صاحب کے استفسار کے جواب میں خواجہ رائق نے کہا مضمون تو دکھا دیا تھا لیکن ہاشمی صاحب نمبر کم دیتے ہیں۔ آپ

نے ''اے'' دیا تھا، انھوں نے خالی ''بی پلس'' دیا ہے۔ بات احتشام صاحب کی سمجھ میں نہ آئی۔ انھوں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شارب کا مضمون ہی انھوں نے اپنا نام لکھ کے دکھا دیا تھا۔ احتشام صاحب نے کہا، ''نقل کرنے میں غلطیاں ہوگئی ہوں گی۔'' رائق میاں کے پاس جواب موجود تھا۔ ''نقل کون کرتا ہے۔ ربر سے ان کا نام مٹا کے اپنا لکھ دیا تھا۔''

احتشام صاحب مسکرا کے رہ گئے، ہاشمی صاحب سے مسکراتے بھی نہ بنا۔

ایک دن رائق نے مجھ سے پوچھا، ''یہ نقال کیا ہوتے ہیں؟''

میں نے کہا، ''وہی، کشمیری، بھانڈ جو تم ہو۔''

''وہ نہیں'' رائق مسکرائے، ''وہ جو احتشام اور سرور ہیں''۔

''نقاد'' میں نے دال پر زور دیتے ہوئے کہا۔

بات ان کی سمجھ میں نہ آئی تو دوسری پوچھ لی، ''یہ کیسے پتہ چلے کہ شعر غالبؔ کا ہے کہ مومنؔ کا، سب تو اردو میں لکھتے ہیں''۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ انھیں بہت برا لگا، بولے، ''کس نے کہا تھا ان سے شاعری کرنے کو۔ نہ کرتے تو آسمان پھٹ پڑتا؟ ہمارے لیے مصیبت کھڑی کردی۔''

امتحان کے دن قریب آئے تو رائق بہت پریشان نظر آئے۔ وہ سولی پر سونے والوں میں تھے، امتحان ان کا کیا بگاڑ لیتے۔ جاگتے رہنے کی گولی کھائی، سو گئے۔ کسی نے بتایا کہ بال ڈوری سے باندھ لو، چنانچہ یہی کیا، پھر بھی سو گئے۔ بہر حال کسی طرح امتحان پاس کرلیا۔ پھر ایل۔ ایل۔ بی۔ کیا۔ ابتدائی مراحل طے کر کے پہلے دن عدالت جانے لگے تو میرے پاس آئے اور بولے، ''سمجھ میں نہیں آتا وہاں کیا ہوگا!'' وہ بہت پریشان تھے۔

میں نے کہا، ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بس کسی دوست کا مقدمہ ہاتھ میں نہ لینا۔''

''اور دوست بضد ہو جائے تو؟'' انھوں نے پوچھا۔

''بدقسمت ہوگا،'' میں نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد بات سمجھ میں آئی تو پہلے خفا ہوئے، پھر خوب ہنسے۔

چنانچہ انھوں نے کسی دوست کا مقدمہ نہیں لڑا۔ پہلے سارا وقت ہنسی مذاق میں گذارتے تو ہر شخص تعریف کرتا، اب متعدد مسلم تنظیموں میں سرگرم ہیں، تو لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

خالدہ باجی

میں جن دنوں ایم۔اے میں تھا، خالدہ باجی پی۔ایچ۔ڈی۔ کررہی تھیں، غالباً معاشیات میں۔ مجھ سے بڑی تھیں یا شاید نہ ہوں لیکن میں کہتا خالدہ باجی ہی تھا۔ گورا چٹا رنگ، دہرا بدن، قد پانچ فٹ سے ذرا سا نکلتا ہوا لیکن اس سب کچھ کا مالک تو کوئی بھی ہوسکتا ہے، وہ ایسی تھیں کہ یونیورسٹی کے شریر سے شریر لڑکے کے لیے ان کے پاس سے مودّب گذرے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسٹاف روم میں کسی ٹیچر سے ملنے جاتیں تو دوسرے ٹیچرس تک کھڑے ہوجاتے۔ شخصیت میں معلوم نہیں کیسی کشش تھی۔

یاد نہیں کہ ان سے تعارف کیسے ہوا۔ انھیں ادب سے تھوڑی بہت دلچسپی تھی، شاید تعارف کا یہی بہانہ رہا ہو۔ وہ اتنی اچھی لگتیں کہ میں انھیں ڈھونڈھا کرتا۔ اکثر ٹیگور لائبریری کے پی۔ایچ۔ڈی کے طلبہ کے کمرے میں مل جاتیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری ایک دوسرے سے واقفیت کا زمانہ زیادہ سے زیادہ سال سوا سال تھا، اس سارے دوران میں نے ان کو یونیورسٹی کی کینٹین تک میں کبھی نہیں دیکھا، ان کے ساتھ چائے پینے کی بات تو دور رہی۔

ایک دن انھوں نے پاکستان کے کسی شاعر کے بارے میں پوچھا۔ میں عمر کی اس منزل میں تھا جو جھوٹی شان کا ہوتا ہے اور دوسروں کو کم وقعت کرنا بھی اس کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ میں نے تعریف تو کی لیکن تحفظات کے ساتھ، جو الفاظ میں نہیں جواب کے انداز میں پوشیدہ تھے۔ کچھ بولیں نہیں۔ اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں خیال آیا کہ بات شاید انھیں اچھی نہیں لگی۔ کبھی لگتا یہ محض گمان ہی گمان ہے، حقیقت کچھ نہیں۔ بہر حال انھوں نے کبھی کچھ نہ کہا۔

ایک دن بولیں، ''امّی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''کیوں، کوئی خاص بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی بتائیں گی''۔ انھوں نے کہا۔

میں نے پتہ پوچھا تو انھوں نے بتادیا۔ آئی۔ ٹی۔ کالج کے آگے کے پہلے یا دوسرے بائیں ڈھال پر اندر رہتی تھیں۔ مکان ڈھونڈھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

ماں کو دیکھ کر پہلا خیال یہ آیا کہ ایسی ماں کی ایسی ہی بیٹی ہوسکتی ہے۔ سامنے دیوار پر سرسید کی بڑی سی تصویر ٹنگی تھی۔

خالدہ باجی شاید چائے بنانے چلی گئیں تو انھوں نے بتایا کہ بیٹی کی شادی طے ہوگئی ہے، پاکستان میں۔ انھوں نے انھی شاعر کا نام لیا جن کے بارے میں خالدہ باجی نے پوچھا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ بھی وہیں منتقل ہو جائیں گی۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ اسی دوران انھوں نے کہا، ''بھیا تم سے ایک کام ہے۔''

''جی فرمایئے،'' میں نے جواب دیا۔

بات اصل میں یہ تھی کہ ان کا اکاونٹ اسٹیٹ بینک میں تھا جسے ختم کر کے وہ روپے گھر لانا چاہتی تھیں۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے کسی مرد کی موجودگی ضروری تھی... ہم تینوں مقررہ دن اسٹیٹ بینک پہنچے۔ میں وہاں براہ راست پہنچا تھا۔ البتہ واپسی میں خالدہ باجی کی والدہ اور میں ایک رکشے پر تھے، خالدہ باجی دوسرے رکشے پر۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان روپوں کا انھوں نے کیا کیا، پاکستان بھیجے تو کیسے۔

خالدہ باجی نے کہا پاکستان کا پتہ لے لو۔ میں نے کہا کہ فلاں تاریخ کو فلاں گاڑی سے آپ کی روانگی ہے، اسٹیشن پر لے لوں گا۔ لیکن جانے اس دن کیا ہوا، کونسی مصیبت آن پڑی کہ اسٹیشن نہ جا سکا۔ ان کے پاس میرا پتہ بھی نہ تھا، ورنہ انھوں نے خط ضرور لکھا ہوتا... باون ترپن سال پرانی بات ہے اب انھیں کیا خاک یاد ہوگی لیکن دل کہتا ہے کہ دیکھ لیں یا نام سن لیں تو انھیں سب کچھ یاد آ جائے گا... مجھے تو ذرا ذرا یاد ہے۔

اوشا

ان محبتوں میں، جن کی گہرائی اور دل سے قربت کا اندازہ کرنا ممکن نہیں، ایک مقدّس محبت اوشا نام کی ایک بھولی، سیدھی سادی لڑکی سے تھی۔ (ویسے کونسی محبت مقدّس نہیں ہوتی؟)۔ اس کے سلسلے میں یہ بتانا میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اسے زیادہ چاہتا تھا (ہوں) کہ وہ مجھے۔ وہ بی۔ اے۔ فائنل ہی میں تھی کہ اس کی شادی طے ہوگئی اور ماں باپ نے لکھا کہ دس دن کے اندر اندر واپس آ جاؤ۔ خط ملنے کے بعد وہ مجھے ساری یونیورسٹی میں ڈھونڈتی پھری اور میں ملا تو پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ ان چھ سات دنوں میں، کیلاش ہوسٹل کی پشت سے یونیورسٹی آنے والے راستے پر بڑے سے پھاٹک کے نیچے، ہم دونوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے یا چپکے چپکے آنسو بہاتے رہتے۔ ادھر سے گذرنے والے ہمیں دیکھ کر مسکراتے اور سمجھتے کہ ہم

Love birds ہیں۔

اس سارے دوران ہم نے آنسوؤں کے خزانے خوب خوب لٹائے۔ سدرشن اس کی بے حد گہری دوست تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی ساتھ ہوتی اور ہمیں تسلّی دیتی۔ پھر وہ چلی گئی۔

لیکن چلی کہاں گئی۔ ہر سال راکھی بھیجتی۔ صرف ایک محفوظ رہ گئی ہے، لفافہ بھی محفوظ ہے۔ خط قومی آواز کے پتے پر بھیجا گیا تھا۔ راکھی گلابی رنگ کی ایک چھوٹی سی دفتی میں لپٹی ہوئی ہے اور ہندی میں لکھا ہے، "عابد بھائی کو سنیہہ ...اوشا۔"

برسوں بعد ایک دن برما بسکٹ کمپنی کے آس پاس وہ مجھے نظر آئی، دو تین عورتوں اور دو تین بچوں کے ساتھ۔ نظر پڑتے ہی میں اس کی طرف تیزی سے بڑھا لیکن اس نے آنکھ کے اشارے سے مجھے روک دیا تو میں دل مسوس کے رہ گیا۔

وہ بہت دبلی ہوگئی تھی، چہرے پر رونق ذرا نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں، مجھے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے لیکن کہیں بھی ہو، میرے دل میں ضرور ہے۔

خواجہ فائق

خواجہ فائق عورتوں کے عاشق تھے اور عورتیں ان کی۔ حضرت گنج سے لے کر شاہ مینا اور کٹرہ ابوتراب کی گلیوں تک میں نے انھیں بیسوں بار عورتوں کے ساتھ دیکھا لیکن کبھی کوئی عورت دوسری بار ان کے ساتھ نہ دیکھی۔ بیوی گوری چٹی، دبلی پتلی تھیں۔ ان پر جان دیتیں لیکن لڑائی نہ ہو تو میاں بیوی کے درمیان محبت ہی کیا۔ جب بھی دونوں میں جھگڑا ہوتا میں پکڑ بلایا جاتا۔ فائق کو اتنا ڈانٹتا اتنا ڈانٹتا کہ انھیں محبت آجاتی اور مجھے روک دیتیں۔

فائق نے دوسری شادی کر لی تھی۔ کام کچھ کرتے نہ تھے، بس مجاہد آزادی ہونے کی پنشن سے کام چلاتے۔ میں نے پوچھا، "دوسرے گھر کا خرچہ کیسے چلاتے ہو"۔ بولے اللہ مسبب الاسباب ہے۔ ذرا دیر بعد کہا، "کتا" گھر میں گھس آتا ہے تو لکڑی کا چیلا ہاتھ میں لے کے بھگاتے بھگاتے دوسری کے گھر تک چلا جاتا ہوں۔ امّی کا پاندان کھول کر دو دانے منہ میں ڈال لیتا ہوں تو دو ڈلی جیب میں، یوں ہی مزے سے کٹ رہی ہے"۔

ان کی مجاہد آزادی کی پینشن کے بارے میں رائق سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ مدح صحابہ ایجی ٹیشن میں جیل گئے تھے۔ اسی سے مجاہد آزادی بن گئے۔ میں نے کہا مدح صحابہ میں

اتنی تاثیر تو ہونی ہی چاہیے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کی پکار پر انھوں نے ہوائی فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ پائلٹ تھے۔ یعنی سچا کیس جھوٹی گواہی سے جیت لیا۔

آزادی کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہاں جا کر شاعر بن گئے۔ مشاعروں میں مقبول ہونے لگے۔ یہاں سے غزلیں منگاتے۔ پھر خط آیا اب نئے لوگوں کی چیزیں بھیجا کرو۔ لوگ مجازؔ اور جذبیؔ کو جان گئے ہیں۔ پھر ۲۶ رجنوری ۱۹۵۲ء کے بھی سال سوا سال بعد کسی طرح ہندوستان آ گئے۔ مجھ سے ملاقات اسی وقت ہوئی۔

ایک دن ان کی بیوی کسی شادی میں مل گئیں۔ خفا تھیں کہ میں نے بچوں کی شادی میں نہیں بلایا جب کہ رائق اور ان کی بیوی کو بلایا تھا۔ میں نے معافی مانگ لی۔ واقعی چوک ہو گئی تھی۔ بہت افسوس تھا۔

پرانے دنوں کی باتیں کرتے کرتے یکا یک رونے لگیں، پھر بولیں، ''عابد بھیا تم چلے گئے تو لڑنا چھوڑ دیا تھا۔ کہتے تھے سمجھوتا کون کرائے گا۔'' میں نے کسی طرح چپ کرایا اور ہنسا کے ہی جانے دیا۔

فائق بھی غضب کے آدمی تھے۔ نواب سلطان مرزا کا مرغ گھر میں آ گیا تو پکا کے کھالیا اور پر میرے کمرہ کے سامنے ڈال دیے۔ سلطان مرزا بہت ناراض ہوئے۔ ایک تو ان دنوں کنکوے بہت کٹ رہے تھے، دوسرے ان کا چہیتا مرغ مَیں کاٹ کے کھا گیا۔ فائق نے انھیں سمجھا دیا، کمیونسٹ ہیں اللہ رسول کو نہیں مانتے، ان کے لیے کیا اچھا کیا برا...اور لطف یہ کہ سب کچھ مجھے ہنس ہنس کے بتا بھی دیا۔

میں نے دیکھا کہ نواب سلطان مرزا مجھے دیکھتے ہی مُنہ پھیر لیتے ہیں تو انھیں سمجھایا کہ وکٹوریا اسٹریٹ کے لال اسکول کے سامنے والے بھورے کے ہوٹل میں کھانا کھاتا ہوں، مرغ کا کیا کروں گا۔ بولے مرغ کھانا کس کو برا لگتا ہے۔ لے جا کے دے دیا ہوگا کہ پکا دینا۔ میں نے کہا پھر پر لا کر کمرے کے سامنے ڈال دیے کہ پکڑا جاؤں۔ بولے کمیونسٹوں میں ہیکڑی بہت ہوتی ہے۔ دکھاتے ہیں کہ ہم تو اپنی سی کریں گے جس کو جو کرنا ہو کر لے۔ اس کے بعد میرے سلام کا جواب دینا بھی چھوڑ دیا۔

پھر ایک دن کیا دیکھا کہ نواب سلطان مرزا خود سے سلام کر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہ آیا چنانچہ جواب بھی نہ دیا۔ انھوں نے دوبارہ سلام کیا تو تیار ہو چکا تھا، جواب دے دیا لیکن سمجھ میں

کچھ نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ م۔ نسیم کو میرے کمرے میں دیکھ کر رائے بدل دی تھی۔ اب کہتے جب اتنے بڑے مذہبی لوگ ملنے آتے ہیں تو میں برا بھلا کہہ کر گنہگار کیوں بنوں۔ مجھے دیوار کے اس پار تو دکھائی نہیں دیتا، دلوں کا حال کیا جانوں۔ م۔ نسیم جنوری کی پہلی تاریخ کو آتے، پرانا کلنڈر اتار کے نیا ٹانگتے، ایک پیالی چائے پیتے اور چلے جاتے۔ وہ ریاستی جماعت اسلامی کے صدر تھے۔ نواب سلطان مرزا نے انھیں میرے یہاں دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے سوکھا سا منہ بنا کے کہا، ''فقہ کے کسی مسئلے میں الجھ جاتے ہیں تو پوچھنے چلے آتے ہیں۔'' بس یہ تھا ان کی رائے کی تبدیلی کا سبب۔

فائق کی ایک بات اور: میں پہلے بہت خوش پوش تھا۔ اب کپڑوں سے دل ہٹ گیا تھا۔ آپ ہی آپ، کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ ایک دن میں نے فائق سے پوچھا تو بولے، ''پہلے کپڑے ہی کپڑے تھے، اب تم بھی کچھ ہو''۔ خدا بخشے، اپنے بارے میں کبھی نہ سوچتے تھے کہ کپڑے میلے ہیں کہ صاف۔

بشیر وارثی

زندگی میں دوست تو بہت ملے، دوستی کا دم بھرنے والے ان سے زیادہ، لیکن بشیر وارثی ایسا مخلص اور شری چند ایسا ذہنی رفیق نہیں ملا۔ فلسفہ کے مسائل پر میں نے اور شری چند نے گھنٹوں بحثیں کیں، محمود آباد اور اچاریہ نریندر دیو ہوسٹل میں کل ملا کر مہینوں ساتھ ساتھ رہے ہوں گے لیکن یونیورسٹی سے تعلق ختم ہوا تو شری چند سے بھی رشتہ ٹوٹ گیا۔ جب کہ بشیر وارثی کے معاملے میں کوئی فرق نہ آیا، رشتہ قائم گھر سے تھا، راجن کی طرح۔

وارثی کانپور میں Entertainment Officer ہو گیا تھا، مہینے دوسرے مہینے لکھنؤ کا چکر ضرور لگاتا اور قیام میرے یہاں رہتا۔ مجھ سے بس تین چار سال چھوٹا تھا لیکن صورت ایسی بھولی تھی کہ لگتا کسی نے دودھ کی بوتل ابھی مُنہ سے نکال کر رکھ دی ہو۔

ایک بار اتفاقاً دوا کا پرچہ ہاتھ لگ جانے سے پتہ چلا کہ انجائنا کا مریض ہے اور ایک مشہور ڈاکٹر کے زیر علاج۔ میں نے اپنے دوست ڈاکٹر کے۔ کے۔ مسرا کو دکھایا۔ انھوں نے ساری دوائیں روک دیں اور طلوع آفتاب سے قبل چہل قدمی کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ مہینے ڈیڑھ مہینے کی چھٹی لی اور دواؤں کے بغیر ٹھیک ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد پھر پرانا سلسلہ چل نکلا۔ کوئی نہ کوئی دوست مل جاتا۔ کانپور میں درجن ڈیڑھ درجن سینما گھر تو تھے ہی، کسی نہ کسی میں بیٹھ

جاتا، رات گئے سوتا، سورج نکلنے کے بعد جاگتا۔ بیماری عود کر آئی۔

کانپور سے ڈرتا بھی تھا۔ دادا، باپ اور بڑے بھائی نے وہیں آخری سانس لی تھی۔ آخر ایک دن بیماری اور خوف نے زیادہ گھیرا تو میرے پاس بھاگ آیا۔ دو دو زینے چڑھ کے بستر پر نڈھال لیٹ گیا۔ شاید جمعرات کا دن تھا، میں نے فوراً ڈاکٹر لاری کو دکھایا۔ انھوں نے کہا گھر لے جانے کے بجائے سیدھے میڈیکل کالج لے جایئے۔ چنانچہ انیس کو اطلاع کر کے اسے اسپتال لے گیا، جہاں ڈاکٹروں نے فوراً بھرتی کر لیا۔

میں نے فون کیا یا تار دیا تو دوسرے ہی دن بیوی اور دونوں بیٹے آ گئے۔ سب کی ڈیوٹی باری باری لگتی، کوئی نہ کوئی ہر وقت موجود رہتا۔ اس کی صورت اور مسکراہٹ ایسی تھی کہ پتہ ہی نہ چلتا کہ بیمار ہے اور تین ہی دنوں میں عشق کا تیر ایک لیڈی ڈاکٹر کے سینے کے پار ہو چکا تھا۔ میرے سامنے لیڈی ڈاکٹر نے بیٹے کو دیکھ کر پوچھا، "Who is he?"

"Younger brother"، بشیر وارثی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور کروٹ لی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری کروٹ تھی لیکن ہمیں پتہ اس وقت چلا جب وہ دوسری دنیا کی سیر کر رہا تھا۔

اس کے روپے، کاغذات میں نے جلدی جلدی میں اپنے بستر پر تکیہ کے نیچے رکھ دیے تھے۔ بعد میں دیکھا تو دس ہزار روپوں کا ایک چیک بھی تھا، میرے نام۔ روپے اور کاغذات تو میں نے بھابی کو دے دیے لیکن چیک رکھ لیا۔ یہ چیک اٹھارہ انیس سال قبل تک، جب میں کپور مارکیٹ سے علی گنج منتقل ہوا میرے پاس تھا۔ اس کی ایک کہانی تھی۔ پہلے وہ سن لیجیے۔

وارثی ایک دن سیدھے نصرت پبلشرز آ دھمکا۔ دوکان دیکھ کر بولا، ''یہ دوکان ہے یا کوڑا گھر؟'' میں ہنس دیا۔ وہ بگڑ اٹھا۔ ''یہ ہنسنے نہیں رونے کی بات ہے... مسئلہ کیا ہے۔ یہ کتابوں کی دس دس کاپیاں کیوں رکھی ہیں؟'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولا، ''مفت مل جاتی ہیں کہ جب بک جائیں پیسے دے دینا... ارے بکنے والی ہوتیں تو کوئی دو کاپیاں نہ رکھاتا۔ کتنی جگہ گھیر رکھی ہے انھوں نے۔ ایسا کرو انھیں واپس کر دو۔ نئی کتابوں کی، جو بکنے والی ہوں، دو دو کاپیاں منگا لو، بک جائیں تو اور منگا لینا۔''

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے پوچھا، ''کتنے روپے لگائے ہیں۔''

روپے ہوتے، لگائے ہوتے تو جواب دیتا۔

''بتاتے کیوں نہیں؟'' اس نے پھر پوچھا اور میری خاموشی سے سب کچھ سمجھ گیا۔
''دس ہزار روپے مہینہ لگاؤ تو کچھ پتہ بھی چلے۔''
''کتنے روپے جمع کر لیے ہیں؟ ایک لاکھ؟''۔ میں نے پوچھا۔
ایک لاکھ اس وقت میری پرواز کی آخری حد تھی۔
وہ مسکرایا۔ میں یہ مسکراہٹ سمجھ نہ پایا۔
''دس ہزار روپے مہینہ لگاؤ۔ منافع ہم دونوں آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔'' اس کی مسکراہٹ میں شرارت تھی۔ اس کے بعد اس موضوع پر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگلی بار وہ لکھنؤ مرنے کے لیے آیا لیکن چیک لانا نہ بھولا۔

نقل مکانی کے دوران میں نے میز کی اوپر والی دراز سے کاغذات نکالے تو بالکل نیچے یہ چیک رکھا تھا۔ ایسا لگا وارثی پاس کھڑا ہے۔ میرے کمرے کی کھڑکی جو سڑک پر کھلتی اسے بہت پسند تھی۔ کہتا یہاں ہوا اپنے ساتھ خوشبو لے کے آتی ہے۔ میں خاموشی سے اسی کھڑکی پر کھڑا ہو گیا... لیکن میں تنہا نہ تھا، وہ بھی میرے ساتھ تھا اور اس چیک کے چھوٹے چھوٹے پرزے ہم دونوں کی انگلیوں نے ہوا میں بکھیر دیے۔

بشیر! تمھیں یاد تو ہوگی یونیورسٹی کے کوآپریٹو بینک کی چیک بک جس کے دو چیکوں پر دستخط کر کے تم نے مجھے دیے تھے، اور پاس بک بھی۔ یہ دونوں چیزیں شاید ۱۹۶۰ء سے میرے پاس تھیں اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں نے روپے نہیں نکالے تم نے غصّے میں ان کو پھاڑ دیا تھا... پھر تھوڑی دیر بعد اپنے غصّے کے لیے مجھ سے معافی مانگی تھی۔ کیا اس چیک کے پرزے پرزے کر دینے پر بھی تم مجھ سے ناراض ہو؟ تم نے زندگی سے مُنہ نہ موڑ لیا ہوتا تو اس بار یہ چیک ضرور کیش کرا لیتا۔ مجھے تم سے روپے لینے میں کوئی عذر نہ تھا... تم اتنا برا مان گئے!

مسرور جہاں

یہ بات انچاس پچاس سال پرانی ہے۔ ماہنامہ ''کتاب'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ان دنوں اس کی طباعت سرفراز پریس میں ہوتی تھی۔ اتفاق سے اس پریس کی مشین خراب ہو گئی اور انھوں نے اپنی طرف سے یہ کام کسی اور پریس کے حوالہ کر دیا۔ اب وہ پریس بند ہو چکا ہے۔

جو لوگ لیتھو طباعت سے واقف ہیں انھیں علم ہے کہ اس طریقِ طباعت میں غلطیوں کی تصحیح ایک دقّت طلب کام ہوتا ہے اور پریس کے چکّر لگانے پڑتے ہیں۔ ایک دن میں نے ایک خاتون کو پریس میں پروف پڑھتے ہوئے دیکھا۔ دوسری بار جانا ہوا تو بھی انھیں موجود پایا۔ معلوم ہوا مسرور جہاں ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خیال ہوا کہ انھیں کہیں دیکھا ہے، پھر یاد آ گیا۔

میری ماموں زاد بہنیں شکیلہ اور عطیہ کشمیری محلّہ اسکول میں پڑھتی تھیں جن سے ان کی دوستی تھی اور وہ ایک بار وہ گھر بھی آئی تھیں۔ تعارف ہوا تو میں نے یہ بات انھیں بتائی اور انھیں یاد بھی آ گئی۔

اب مسرور جہاں ناولیں لکھنے لگی تھیں۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ناولیں خوب خوب پڑھی جاتی تھیں... کچھ دنوں بعد انھوں نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا لیکن دفتر اور ماہنامہ کتاب کی مصروفیت کے سبب میں جا نہ سکا۔ شاید سال بھر بعد ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا جس کی اطلاع مجھے ان کے بہنوئی اکرام علی نے دی جو چند ماہ قبل ہی ہیرالڈ سے متعلق ہوئے تھے۔ میں تعزیت کے لیے گیا تو ملاقات ان کے بیٹے اور بیٹیوں سے ہوئی۔ ان کا بیٹا اسلم اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے مختلف تھا۔ اس کی انگریزی بہت اچھی تھی اور ناولوں کا اس کا مطالعہ بہت اچھا۔ ان ناولوں کے بارے میں وہ باتیں کیا کرتا۔

مسرور جہاں کے ناول تو لکھنؤ اور دہلی کے ادارے شائع کرتے لیکن اپنے افسانوی مجموعے انھیں خود ہی چھاپنا پڑتے۔ ماہنامہ کتاب کے ساتھ ساتھ میں نے کتاب پبلشرز کے نام سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا لیکن ان کی کوئی کتاب نہ چھاپ سکا البتہ میں نے ان کے دو افسانوی مجموعوں کی ترتیب میں مدد ضرور کی۔ ان دونوں کتابوں کے نام میں نے ہی تجویز کیے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تھا "دھوپ دھوپ سایہ۔" دوسری کا نام یاد نہیں۔

مسرور جہاں لکھنؤ کے ایک ممتاز ادبی خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے دادا شیخ مہدی حسین ناصری ایک قاموسی شخصیت تھے۔ مسرور جہاں کو مہذّب اندازِ گفتگو اور ادبی ذوق ددھیال سے ملا ہے۔ وہ صاف ستھری زبان لکھتی ہیں۔ ایک دن انھوں نے میری ایک غلطی درست کی تھی۔ میں لکھ چکا ہوں کہ بدقسمتی سے مجھے کلاس میں اردو پڑھنے کا موقع بہت کم ملا اس لیے زبان و بیان کی غلطیاں اکثر راہ پا جاتی ہیں۔ انھوں نے ایک افسانے میں لفظ اضمحلال استعمال کیا تھا۔ میں لکھتا تو اس کی شکل اضحمال کی ہوتی۔ میں نے ٹوکا تو انھوں نے اضمحلال پر اصرار کیا۔ میں ماننے کے لیے تیار نہ ہوا۔ وہ لغات اٹھا لائیں۔ وہ صحیح تھیں، میں غلط۔

ان دنوں جب نیشنل ہیرالڈ میں کئی کئی مہینے تنخواہیں نہ ملتی تھیں، سب ایڈیٹر اور رپورٹر ڈوبتے جہاز کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور میرے لیے ڈیوٹی چارٹ بنانا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک دن ریزیڈنٹ ایڈیٹر پی۔ سی۔ ٹنڈن نے مجھ سے کہا کہ دو سب ایڈیٹر پر تول رہے ہیں، کچھ کیجیے۔ میں نے اکرام علی کے ذریعے اسلم کو بلا کر ٹنڈن صاحب سے ملا دیا۔ وہ اس کی لیاقت سے بہت متاثر ہوئے اور فوراً ہی اس کا تقرر کر دیا۔ اسی طرح اختر الملک کو "عزائم" سے بلا کر پروف ریڈر بنا دیا تھا۔ اسلم نے ہیرالڈ میں بمشکل چند مہینے کام کیا۔ اصل میں بڑی فتوحات اس کی منتظر تھیں۔ وہ ممبئی چلا گیا جہاں ٹائمس آف انڈیا میں اسے فوراً جگہ مل گئی لیکن وہ کہیں ٹکا نہیں، ہر تیسرے چوتھے مہینے ملازمت بدل دیتا۔ پھر اس نے India Today کا آخری صفحہ Eye-catcher کے نام سے لکھنا شروع کیا اور اپنی انگریزی کی دھوم مچا دی۔

لیکن موت جو اس کے تعاقب میں تھی اسے پراسرار طور پر اپنے ساتھ گوا لے گئی۔ اس کے انتقال کی خبر ملتے ہی میں اور انیس تعزیت کے لیے گئے تو مسرور جہاں میرا ہاتھ پکڑ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں کیونکہ وہ مجھے بہت چاہتا تھا اور نئی ناولوں کی باتیں مجھ سے اکثر کیا کرتا۔

مسرور جہاں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے، بڑی پامردی سے ان کا مقابلہ کیا۔ گھر میں صرف دو بیٹیاں تھیں اس لیے باہر کے کام بھی انھی کو کرنا پڑتے۔ ایک دن دفتر جاتے ہوئے میں نے انھیں رفاہ عام کلب کے سامنے دیکھا۔ وہ رکشے پر تعمیرات کا کچھ سامان سنبھالے ہوئے بیٹھی تھیں۔ میں اسکوٹر پر تھا۔ ان کا رکشہ اور میرا اسکوٹر تقریباً آمنے سامنے آئے تو میں نے نظریں دوسری طرف کر لیں تاکہ اس حالت میں دیکھے جانے پر انھیں کسی قسم کی سُبکی کا احساس نہ ہو لیکن اتنے میں آس پاس کوئی سواری اس طرح گذری کہ مجھے سامنے دیکھنا پڑا اور ہماری نظریں ٹکرا گئیں۔ ان کے چہرے پر شرمندگی کا کوئی تاثر نہ تھا۔

بعد میں ایک بار دانش محل سے ملحق ریلوے پارسل آفس سے کتابوں کا بنڈل کندھے پر رکھ کر نصرت پبلشرز لے جاتے وقت مجھے مسرور جہاں کا خیال آیا تھا... بمشکل پچیس تیس قدم کا فاصلہ طے کرنے کے لیے رکشہ والا ایک روپیہ مانگ رہا تھا جب کہ میرے خیال میں آٹھ آنے بھی زائد تھے۔ یہ بات ۱۹۸۱ء کی ہے۔ اس وقت میرے لیے آٹھ آنے بڑی چیز تھے۔

"کتاب" کی اشاعت کا سلسلہ ختم ہونے کے برسوں بعد اقبال متین لکھنؤ آئے تو میرے یہاں مقیم ہوئے۔ ریڈیو اسٹیشن پر اتفاق سے ان کی ملاقات مسرور جہاں سے ہو گئی

جنھوں نے انھیں اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔ میں اور اہلیہ بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ اسی طرح ساجدہ زیدی کو ہم نے کھانے پر مدعو کیا تو انیس کی دعوت پر انھوں نے بھی شرکت کی۔
اب ہم لوگ علی گنج چلے آئے ہیں اس لیے برسوں سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔

خواجہ انور

نام تو پورا انور الدین ہے لیکن مشہور خواجہ انور کے نام سے ہیں۔ ان کے یہاں ''ماہنامہ کتاب'' یا کسی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں پہلی بار گیا تو پاس کے اس پھاٹک پر نظر پڑی جس کے اندر کے دالان میں حکیم شمس الدین مطب کرتے تھے۔ اب ان کا نام آ ہی گیا ہے تو تھوڑا سا ذکر بھی ہو جائے۔ نبض پر ہاتھ رکھتے اور مریض کچھ بتانا شروع کرتا تو بگڑ جاتے، ''بیماری تم ہی بتا دو گے تو میں یہاں کس لیے بیٹھا ہوں۔'' ایک سیکنڈ کے لیے آنکھیں بند کرتے اور نسخہ بولنا شروع کر دیتے تو دونوں بینچوں پر بیٹھے ہوئے تکمیل الطب کالج کے فارغ طلبہ تیز تیز لکھنے لگتے اور جو پہلے مکمل کر لیتا پرچہ ان کی طرف بڑھا دیتا۔ وہ کہیں کچھ بڑھاتے، کہیں کچھ گھٹاتے اور یہ بھی ہوتا کہ بس ایک نظر ڈال کے مریض کے حوالے کر دیتے۔ قومی آواز میں ان کے انتقال کی خبر کی سہ کالمہ سرخی تھی، ''آخری نبض شناس حکیم شمس الدین کا انتقال۔''
وہ میونسپل کمشنر بھی تھے۔ نخاس سے الکشن لڑتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ ایک بار یاروں نے مشہور طوائف دل ربا کو مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ ظاہر ہے وہ ہار گئی لیکن لوگوں نے اسی بہانے ''دل دل ربا کو دیجیے اور ووٹ شمس الدین کو'' گنگناتے ہوئے جلوس بھی دیکھ لیے۔ حکیم صاحب کی کامیابی کے جشن میں مبارکباد دینے وہ خود بھی آئی اور ان کے ''ہائیں ہائیں'' کرنے کے باوجود اس نے محفل رقص و سرور بھی برپا کر دی، لیکن اس سے پہلے یہ بھی کہا، ''آپ کی کامیابی سے پتہ چل گیا کہ لکھنؤ میں مرد کم ہیں اور بیمار زیادہ۔''
خواجہ انور انھی حکیم شمس الدین کے بھتیجے ہیں۔
نامی پریس شہر کا قدیم ترین مطبع ہے۔ پنڈت نہرو کی شادی کا دعوت نامہ جو اردو اور فارسی میں تھا یہیں چھپا تھا۔ پرانی فائلوں میں ایک دن مل گیا تو انھوں نے رجسٹری سے اندرا گاندھی کو بھیج دیا۔ میں نے بھی دیکھا تھا۔ ان کے پریس کی مشین جرمنی سے آئی تھی اور اب بھی لوہا لاٹ ہے۔

طباعت کی عمدگی کے سبب نامی پریس میں کام کی بھرمار رہتی، چنانچہ وعدہ خلافیاں ہوتیں اور خواجہ انور کو حیلے بہانے تراشنے پڑتے۔ ہوتے ہوتے وہ اس کام میں ماہر ہو گئے، اس حد تک کہ ہر مرتبہ اس غریب کو جس کا کام اٹکا ہوتا ایک نئی گولی پیش کر دیتے۔ وہ بے چارہ کچھ نہ کہہ پاتا لیکن پیٹھ پیچھے کوستا کاٹتا۔ تاہم یہ سب کچھ وہ مسکراتے مسکراتے ہی کرتا کہ اس کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ مجھے بھی انھوں نے خوب خوب جھکائیاں دیں اور میں نے بھی وہی کیا جو دوسرے کرتے تھے۔

اب اسے اتفاق کہیے یا مشیت ایزدی کہ وجاہت علی سندیلوی صاحب نے اپنی کوئی کتاب چھپوانے کے لیے نامی پریس کا انتخاب کیا۔ ابتدائی مراحل اس قدر خوش اسلوبی سے طے ہوئے کہ وہ خواجہ انور کے وعدے وعید شیروانی کی اوپر کی جیب میں بہ حفاظت رکھ کر فرحاں اور شاداں لوٹ جاتے۔ لیکن وہ وعدہ ہی کیا اور وہ بھی خواجہ انور کا جو پورا ہو جائے۔ چنانچہ وجاہت علی سندیلوی جن کی وجاہت بس نام بھر کی نہ تھی، سندیلہ سے آ کر بے نیل و مرام لوٹنے لگے، کوئی ایسی گولی لے کر جو خواجہ انور نے چاندی کے ورق میں لپیٹ کر پیش کی ہوتی۔

ایک بار آئے تو ان کی بیٹی صبیحہ جو گورکھپور یونیورسٹی میں ایم۔اے کر رہی تھی ان کے ساتھ تھی۔ خواجہ انور نے اطمینان دلایا کہ طباعت کا کام بس مکمل ہی سمجھیے۔ بظاہر تو مطمئن ہو گئے لیکن پریس سے نکلتے ہی انھوں نے بیٹی سے کہا، ''برخوردار مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔''

سندیلہ واپس جا کر انھوں نے قانون کی کتابوں میں معلوم نہیں کون سی شق ڈھونڈ نکالی کہ ایک ہی نوٹس پر خواجہ انور مجلّد کتاب ہاتھ میں لیے دولھا بن کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پا بہ دستِ دگرے، دست بہ دست دگرے نہیں، کشاں کشاں۔

خواجہ انور اپنے پریس میں کچھ ہوتے ہیں، اس کے باہر کچھ۔ گھر جائیے تو دامن دل فرشِ راہ ہوتا ہے، بچھے جاتے ہیں۔ کوئی گولی نہیں دیتے۔ کبھی دعوت میں آپ کے ساتھ ہوں تو کھانا ایسے کھلاتے ہیں جیسے خود ہی میزبان ہوں۔ کہتے ہیں ''ون ڈے میچ'' ہے جس نے شروع میں سبقت حاصل کر لی وہی سکندر۔

انیس کا آپریشن ہوا تو آپریشن تھیٹر کے باہر خواجہ انور کے ساتھ صبیحہ انور بھی موجود تھیں۔ ایک لفافہ خواجہ صاحب کی جیب میں تھا جو وہ چپکے سے جیب سے نکال کر میری طرف بڑھاتے اور میں اسے وقت ضرورت کے لیے ان کی جیب ہی میں محفوظ رہنے دیتا۔

ڈاکٹر صبیحہ انور باوقار کرامت حسین گرلس کالج کی باوقار پرنسپل تھیں، جہاں سے حال ہی میں قبل از وقت سبک دوش ہو کر ادبی سفر پر دوبارہ نکل پڑی ہیں۔

سدرشن

سدرشن کو پہلی بار اوشا کے ساتھ دیکھا۔ وہ بی۔ اے کے دوسرے سال میں تھی۔ اوشا نے کہا، ''بھیا! انھیں جانتے ہو؟''۔ میں نے کہا، ''نہیں،'' تو بولی، ''تم کیسے ہو، کسی اچھی لڑکی کو جانتے ہی نہیں''۔

''تم نے ملایا ہی نہیں،'' میں نے کہا۔

''تو اب مل لو، بہت اچھی لڑکی ہے۔'' یہ کہہ کر اوشا کلاس چلی گئی۔ وہ میرے ساتھ کسی کلاس میں نہیں تھی لیکن اکثر میرے ساتھ رہتی۔ وہ میری بہن تھی۔

اس طرح ہوئی تھی سدرشن سے پہلی ملاقات۔

ایک نظر ڈالی، کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ بوٹا سا قد، گندمی رنگ، ہاتھوں پر ہلکے ہلکے روئیں، مجھے عام سی لڑکی لگی۔ اسی وقت اس نے آنکھ اٹھا کے دیکھا تو ایسا لگا جیسے ایک عالم تہہ و بالا ہو گیا ہو۔ کچھ یہی حال اس کی باتوں کا تھا۔ کم بولتی، دھیرے سے مسکراتی، بناؤ سنگار نام کو نہ کرتی، سادے کپڑے پہنتی۔

اس دن کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ دونوں بس ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، ایسے جیسے نہ دیکھ رہے ہوں۔

وہ بولی، ''میں جاؤں، ہسٹری کا کلاس ہے۔''

''ہاں، نہیں''۔ میں نے کہا۔

دھیرے سے مسکرائی اور کتابیں سینے سے لگائے چلی گئی۔ ایک بار پلٹ کے نہ دیکھا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا لیکن ملاقات تب بھی بس کبھی کبھی ہی ہوتی، عام طور سے لائبریری کے آس پاس۔ ایک آدھ بار گرنانی کی چھوٹی سی کین ٹین میں، جو لائبریری کے کونے پر تھی، ہم دونوں نے، بلکہ تینوں نے ساتھ ساتھ چائے پی۔ راجن بھی اس کے ساتھ اکثر ہوتی۔ وہ میری کلاس فیلو تھی لیکن اس وقت تک میں اس کا صرف نام جانتا تھا۔

ایک اور ملاقات یاد ہے۔ وہ لائبریری سے کیلاش ہوسٹل جا رہی تھی، لائبریری کے

پاس والے راستے سے جو اَب بند کر دیا گیا ہے۔ میرا دوست سمیع اور میں ساتھ تھے۔ راستے میں ایک بڑا سا محرابی دروازہ تھا، ایسا کہ اس کے نیچے پندرہ بیس لوگ کھڑے ہو جائیں۔ ایک دم بوندیں آ گئیں۔ ہم تینوں اور چار چھے دوسرے لڑکے لڑکیوں نے دوڑ کے وہاں پناہ لی۔ معلوم نہیں کیوں میں اداس تھا اور خاموش۔

سمیع نے پوچھا، ''کیا ہوا؟''

''کنیاں (بوندیں) آ گئی ہیں۔'' اس نے کہا۔ مجھے جواب دینے کا موقع ہی نہیں دیا۔

کوئی ہنسا نہیں۔

چھوٹے چھوٹے جملے بولتی، کم باتیں کرتی۔ مجھے اچھی لگتی لیکن یہ بات میں نے اس وقت تک راجن کو بھی نہیں بتائی جس سے میں کچھ بھی کہہ سکتا تھا، یہ بھی کہ ایک روپیہ دے دو جس سے مشکل کوئی بات میرے لیے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ راجن کا دل ایسی تجوری تھا جس میں کوئی بھی سچا دوست اپنی بات حفاظت سے رکھ دیتا۔

پھر یونیورسٹی میں آٹھ دس دن کی چھٹی ہو رہی تھی۔ وہ بولی کل جا رہی ہوں۔

''اپنے گھر؟''

''اور کہاں جاؤں گی؟''۔

''لیکن کہاں ہے تمھارا گھر؟''

''ارے تم کیسے ہو، تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں رہتی ہوں؛'' اس نے مہینوں کی بات چیت میں شاید سب سے لمبا جملہ بولا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''میں ایسے شہر میں رہتی ہوں جس کے بارے میں تم بعد میں کہو گے، شاید زندگی بھر، کہ اس کا نام جھوٹا ہے۔''

''شہر کا نام جھوٹا ہے!'' میں نے کہا۔

''ہاں'' اس نے کہا، ''شہر کا نام ہے دل دار نگر''۔

''دل دار نگر''۔

''ہاں، نام شاید جھوٹا ہے''۔

وہ مسکرائی، اس نے آنکھیں جھکا لیں، پھر ایک دم اوپر تک کھول دیں۔ ساری دنیا جو

اُن میں سمٹ گئی تھی، روشن ہوگئی۔ وہ بولی، ''میں بات کروں... مشکل ہے... پھر بھی''۔

''مشکل ہے تو کیا فائدہ؟''

''بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ کسک نہ رہ جائے کہ کوشش ہی نہیں کی''۔

ہم دونوں نے محبت کی پہلی بات یہ کی تھی۔

یونیورسٹی کھلی تو دوسرے ہی دن اس سے ملاقات ہوگئی۔ اسی دن آئی تھی۔ تین چار سال چھوٹی ایک لڑکی ساتھ تھی۔ صورت اس سے بہت ملتی، لیکن ذرا گوری تھی۔

میں نے دیکھا تو وہ سدرشن کو دھیرے دھیرے کہنی مار رہی تھی۔ سدرشن نے میری آنکھوں میں کچھ اجنبیت دیکھی تو بولی۔

''پیچھے لگ گئی، میں بھی دیکھوں گی، کیسے ہیں۔''

وہ شرمائی جارہی تھی۔

''دیکھو، ہیں نہ کالے!''

وہ اور شرما گئی۔

''اب کیوں نہیں بولتے بنتا۔ ابھی تو بہت چپڑ چپڑ کر رہی تھی''۔

وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں دیکھتا تو ادھر اُدھر دیکھنے لگتی... سدرشن کے رشتے کے چاچا یہاں رہتے تھے، رات میں وہ ان کے یہاں رہتی اور دن میں سدرشن کے ساتھ۔ تین چار دن میں ہماری گہری دوستی ہوگئی۔ وہ مجھے چھیڑتی، میرے ساتھ مذاق کرتی۔

تیسرے دن سدرشن نے مجھ سے کہا۔

''تمھیں شہر کا نام بدلنا پڑے گا'' یہ بات اس نے ہنستے ہوئے کہی تھی، بالکل ایسے جیسے معمولی بات ہو۔ لیکن وہ مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔

میں نے کہا، ''کوئی بات نہیں... یہ تو پہلے سے معلوم تھا''۔

بولی ''بنومت... ذرا میری طرف دیکھو''۔

دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

بولی، ''بابا نہا کے بالوں میں تیل لگا رہے تھے، صبح کی ہلکی دھوپ میں کھڑے ہوئے، لمبے لمبے کالے بال پھیلائے ہوئے۔ بڑے چنگے لگ رہے تھے۔ وہ صبح صبح نہا کے بالوں میں تیل لگاتے وقت بہت خوش ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا کچھ کہوں لیکن جانے کیا ہوا، سب کچھ کہہ

دیا... بولے تو جانے تیرا کام... پھر انھوں نے کہا ماں سے پوچھ لے۔''

سدرشن یہ کہہ کے چپ ہوگئی۔ میں سمجھ پہلے ہی گیا تھا، کچھ نہ بولا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ میں نے نظریں دوسری طرف کرلیں۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولی۔

''ماں سے پوچھا تو اس نے سر پیٹ لیا، ''مسلمٹا۔ ہائے نی ٹُٹ پنیئیے۔ تیرا ککھ نہ رہے۔ چنبادی تے مسلمٹا۔'' وہ جانے کس رَو میں بول گئی۔ پھر رکی۔

''وہ چھاتی پیٹتی اور مجھے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتی جا رہی تھی۔ اور پھر جانے کیا کیا پرانی باتیں کرتی رہی۔ ماں تو غصّے میں بولتی ہی جا رہی تھی۔ اس نے تو یہ بھی کہا،... ایدے نالوں ناں توں جمدی ہی مرجاندی...''

اپنے سکھ دوستوں کی باتیں سن سن کر آخری جملہ میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ ''تو پیدا ہوتے ہی مرجاتی تو اچھا ہوتا۔''

باقی سب کچھ تو اس کے چہرے پر جھلکتی مایوسی اور آنکھوں میں اتر آیا، اس کے دل کا درد، آنسوؤں کی شکل میں ٹپ ٹپ گرتا ہوا اس کے کرتے کو بھگو رہا تھا۔

''اچھا اب رہنے دو،'' میں نے کہا۔ ''ادھر دیکھو''۔

اس نے دیکھا تو میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ نہ ہلے۔ میں نے انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ دی اور بڑی مشکل سے کہا۔

''اب اور نہیں، کبھی نہیں''۔

اور پھر کبھی کوئی بات نہ کی... ایک بار کے علاوہ۔

میں نے، سدرشن اور اس کی بہن نے ساتھ ساتھ ایک پکچر دیکھی تھی۔ نام تھا، ''پاپوش''، چار باغ کے ایک پکچر ہاؤس میں لگی تھی جس کا نام سدرشن کے نام پر تھا۔ بڑی اچھی فلم تھی۔

رکشے میں ہم تینوں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ ہم دونوں ادھر ادھر۔ اس کی بہن بیچ میں تھی اور راستے بھر مجھے چھیڑتی رہی تھی۔ بعد میں ہم دونوں نے بھی ساتھ ساتھ ایک پکچر دیکھی تھی۔ چوک کے سینما گھر میں۔ جاڑوں کے دن تھے۔ مڈشو دیکھ کر نکلے اور رکشے میں بیٹھ کر کیلاش ہوسٹل کے لیے روانہ ہوئے تو میڈیکل کالج کے سامنے اس نے کہا...

''سہیل مجھے سردی لگ رہی ہے''۔

میں نے اپنا پرانا کوٹ اتار کے اسے دے دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میرے بدن پر سوئٹر بھی نہ تھا۔

بولی، ''پاگل کہیں کے''۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اس کی بہن کو گئے ہوئے بس آٹھ دس دن ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے کیلاش ہوسٹل تک کوئی بات نہ کی لیکن رکشے سے اترنے کے بعد، رخصت ہونے سے پہلے، اس نے کہا، ''تم جانتے ہو وہ کیا کہہ رہی تھی''

''کون سا کشی؟''

''ہاں وہی... وہ کہہ رہی تھی تم روٹھ جاؤ تو ماں مان جائیں گی''۔

''نہیں سدرشن غلط بات... ہم لوگ تو فیصلہ کر چکے ہیں کہ آگے کوئی بات نہ کریں گے اس بارے میں اور میں تمھاری ماتا جی کو دکھی نہیں کروں گا... بس اب کوئی بات نہیں۔''

تیسرے سال سدرشن چلی گئی۔ جاتے وقت وہ مجھ سے خاص طور سے ملی تھی۔ ہم نے بہت دیر تک باتیں کی تھیں۔ ڈیڑھ دو برسوں میں ہم نے ساتھ ساتھ کوئی پکچر دیکھی نہ پہلے والی کوئی بات کی۔ لائبریری کے سامنے والے پارک کے ہم کئی کئی چکّر لگاتے۔ سمیع اکثر ساتھ ہوتا۔ اس کے جانے سے پہلے سمیع نے ہم دنوں کو حضرت گنج میں چائے کی پارٹی دی تھی۔ سمیع امریکا سے دو سال اُدھر آیا تو اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

ایک بار جب میری شادی ہو چکی تھی، قومی آواز یا پھر ہیرالڈ سے اس نے میرا پتہ لیا اور گھر آ گئی۔ کسی نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ اوپر سے میں نے جھانک کے دیکھا۔ وہ کھڑی تھی، دروازے کے پاس۔ میں نیچے جا کر اسے لے آیا۔ اس نے مبارکباد دی اور سب سے پہلے پوچھا، ''تم نے سب بتا دیا نا، کچھ چھپایا تو نہیں؟''

''پہلے سوال کے جواب میں ''ہاں''، دوسرے کے جواب میں ''نہیں''۔

''یہ اچھا کیا،'' اس نے کہا اور انیس سے جیسے ہی اکیلے میں بات کرنے کا موقع ملا بولی۔

''میں یوں ہی آئی ہوں۔ مجھے تو معلوم بھی نہ تھا۔ میں بیچ میں نہیں آئی ہوں۔ تم دونوں کے ساتھ ہوں''۔

تھوڑی دیر بعد وہ جانے لگی، میں بھی دفتر جانے کے لیے تیار تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ قیصر باغ تک آئے۔ وہاں جنتا کافی ہاؤس میں ہم نے ایک ایک پیالی کافی پی۔

میں نے پوچھا، '' سدرشن تم نے شادی کی''۔
اس نے جواب میں پوچھا، ''اوشا کا خط آیا''۔
''خط؟ کئی سال سے راکھی بھی نہیں آئی۔ایک راکھی اب تک میرے پاس ہے۔''
''کیسی پیاری تھی، ہے''
''بہت پیاری ہے، ہے نا،''
یہ بات ۲۰۱۰ء میں لکھی جارہی ہے، پینتالیس سال پرانی ہوچکی ہے۔
دس دن پہلے، دسمبر ۲۰۱۱ء کے آخر میں، راجی سیٹھ نے بتایا، ''سہیل تمھیں پتہ ہے کچھ سدرشن کے بارے میں؟ وہ اب نہیں ہے''۔
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔'' سن رہے ہو''۔ وہ بولی۔ میرے منہ سے آواز نہ نکلی۔
''تمھیں پتہ ہے اس نے شادی نہیں کی تھی''۔ میں نے خاموشی سے ٹیلی فون رکھ دیا۔
جوش ملیح آبادی نے اٹھارہ بلکہ انیس کامیاب معاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ میں نہیں جانتا کامیاب معاشقہ کیا ہوتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں جو دل میں جگہ بنالے وہی ہے کامیاب محبت......
اللہ بس، باقی ہوس۔

◆◆◆

جستہ جستہ

نولکھا ہار

ایک دن کسی نے ہمارے کپور مارکیٹ کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو گیارہ بارہ برس کے دولڑکے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک ایک تھیلا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا کیا ہے لیکن جب انھوں نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے کہا اندر آ جاؤ۔ اندر آتے ہی ان میں سے ایک نے کہا دروازہ بند کر دیجیے۔ میں نے دروازہ تو بند کر دیا لیکن انھیں حیرت سے دیکھنے لگا۔

گرمی کے دن تھے۔ انھوں نے کہا پانی مل سکتا ہے۔ میں دونوں کو دالان میں لے آیا۔ وہاں دونوں نے دو دو گلاس پانی پیا۔ ان کے ہوش و حواس درست ہوئے تو ان میں سے ایک نے، ادھر ادھر دیکھ کے، ڈرتے ڈرتے کہا کہ ہمارے پاس کچھ چیزیں ہیں، آپ دیکھنا چاہیں گے؟

میں نے کہا، ''کیوں نہیں؟'' تو ان میں سے ایک نے تھیلے سے ایک پوٹلی نکالی اور اسے کھولنے لگا۔ اس میں سونے کا ایک نہایت خوبصورت ہار تھا، کئی کئی لڑیوں کا ہار۔ اسے دیکھ کر میری اور انیس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے کھڑے ہو کر اس ہار کو لٹکایا تو اندازہ ہوا کہ قد آدم سے شاید ہی کچھ کم ہے۔ ہر لڑی سے دوسری لڑی کچھ اس طرح جڑی ہوئی تھی کہ بعض جگہ لڑیوں کی تعداد نو تک ہو جاتی۔ اس تعداد کی مناسبت سے میں اسے نولکھا ہار کہنے لگا۔ میں نے نہ اس وقت تک نولکھا ہار دیکھا تھا نہ اب تک اس کی نوبت آئی ہے پھر بھی میرا خیال ہے کہ میں نے اس کا نام صحیح ہی رکھا تھا۔ ان دنوں اخباروں میں اس طرح کی خبریں پڑھی تھیں کہ لوگ سونے کا ملمع کیے ہوئے پیتل کے زیور سیدھے سادے لوگوں کو سستے داموں فروخت کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ بچے ایسے نہیں معلوم ہوتے تھے، اگرچہ انھوں نے اس ہار کی جو قیمت مانگی تھی وہ اس قدر کم تھی، یعنی

صرف دس ہزار روپے، کہ ہار سونے کا ہونے کی صورت میں بھی پیتل کا معلوم ہوتا۔ میں نے انیس سے یہ کہتے ہوئے کہ میں تو کبھی اس طرح کا ہار تمھارے لیے بنوا نہ سکوں گا وہ ہار انھیں پہنا دیا۔

اگر چہ اس ہار کے سلسلے میں ان لڑکوں نے جو کہانی بیان کی تھی اسے تسلیم کرنا ذرا مشکل تھا لیکن معلوم نہیں کیوں مجھے یہ لڑکے شاطر نہیں معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم بنارس کے کسی اناتھالے سے متعلق ہیں اور سال میں چھے مہینے اس کے لیے چندہ جمع کرتے ہیں۔ ایک بار ہم لوگ جنگل سے ہو کر جا رہے تھے کہ رات ہو گئی۔ وہیں ہم دونوں زمین کھود کر چولھا بنا رہے تھے کہ ایک موکھا دکھائی دیا۔ ہم لوگوں نے اس میں ہاتھ ڈالا تو یہ ہار اور چاندی کے روپے وہاں سے ملے۔ اسی دوران دوسرے لڑکے نے اپنے تھیلے سے جارج پنجم کے کچھ روپے نکال کر ہمیں دکھائے۔

یہ روپے تو یقیناً بالکل اصلی تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ نہ سکوں میں کہیں مٹی لگی تھی نہ ہار میں۔

ان میں سے ایک لڑکے نے بتایا تھا کہ دو سال بعد پندرہ سال کی عمر ہو جانے پر اس کو اناتھالے سے چھٹی مل جائے گی اور کچھ دنوں بعد دوسرے کو اور چھٹی کے وقت دونوں کو دو دو ہزار روپے دیے جائیں گے، اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے۔

میں نے ان سے کہا کہ اتنے روپے میرے پاس تو ہیں نہیں کہ ہار خرید لوں لیکن میں اپنے ایک دوست سے بات کروں گا۔ تم لوگ کل آنا۔

دونوں چپ چاپ کھڑے رہے، کبھی وہ چپکے چپکے ایک دوسرے کو دیکھتے، کبھی دھیمے لہجے میں ایک دوسرے سے کچھ کہتے۔ مجھے ٹوہ لگانے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی، کھسک کے ذرا پیچھے ہو گیا۔ اس دوران وہ دونوں ہار اور سکے اپنے اپنے میلے سے تھیلوں میں رکھ چکے تھے۔ دو ایک منٹ بعد ان میں سے اس لڑکے نے جو عمر میں بڑا معلوم ہوتا تھا کہا یہ چیزیں آپ رکھ لیجیے، ہم لوگ کل آئیں گے... میں نے یہ چیزیں صرف یہ سوچ کر رکھ لیں کہ وہ لوگ کسی مصیبت میں نہ پڑ جائیں، یہ خیال بھی نہ ہوا کہ خود میں بھی مصیبت میں پھنس سکتا ہوں۔ انھوں نے ہار کی قیمت دس ہزار بتائی تھی۔

شام کے وقت میں نے اپنے ایک دوست سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ میں کسوٹی پر کسوانے کے بعد یہ ہار ضرور لے لیتا لیکن ایمرجنسی کا زمانہ ہے اس لیے یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا...

آپ کیوں نہیں لے لیتے؟

انھوں نے یہ بات کہی تو نہیں لیکن ان کا مطلب یہ تھا کہ میں تو خاصی بڑی رقم انکم ٹیکس کی دیتا ہوں، اس لیے شک کے دائرے میں ہوں۔ آپ کی جانب تو محکمہ انکم ٹیکس کا خیال بھی نہ جائے گا۔

میں ہنسا اور صرف ''میں'' ہی کہہ پایا تھا کہ انھوں نے کہا۔

''روپے مَیں کل صبح لیتا آؤں گا، آپ لے لیجیے اور غسل خانے کے پاس کونے میں جہاں ٹوٹا پھوٹا سامان اور کوئلے پڑے ہیں یہ ہار ڈال دیجیے۔ اوّل تو ایمرجینسی کے دوران کسی کی ہمت نہیں کہ نیشنل ہیرالڈ کے کسی آدمی کے یہاں چھاپا مارے اور دوسرے یہ کہ کوئی اس تک پہنچ بھی جائے تو کہہ دیجیے گا کہ میں نہیں جانتا یہاں کون ڈال گیا۔''

میں نے کہا،''ہار پیتل کا نکلا تو میں خواہ مخواہ مقروض ہو جاؤں گا۔''

''یہ Risk میرا اور ہار سونے کا ہو تو ایمرجینسی کے بعد آپ چاہیں تو ایک لاکھ روپے میں مجھے دے دیجیے گا... میں نوّے ہزار روپے اور دے دوں گا۔''

ذرا سی لالچ تو آئی لیکن ایک دوسرے خیال نے اس کی جگہ لے لی۔ یہ خیال پہلے بھی آ چکا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا

''جانے کس کا ہو یہ ہار، میرا دل نہیں کرتا۔''

''یہ سونے کا ہار ہے، دوسرے کی جورو نہیں، سنکوچ کاہے کا؟''

میں ہنس دیا لیکن خود کو مطمئن نہ کر سکا۔ سوچتا رہا۔ یکا یک ایک خیال آیا۔ کیوں نہ دو سو روپے سے بینک میں ان کا اکاونٹ کھلوا کر ان کے زیور اور سکّے لاکر میں رکھوا دوں... دو تین سال بعد اناتھالے سے چھٹی ملنے پر ان کے کام آئیں گے۔

ایک بات بتانا بھول گیا۔ انیس کو ''نولکھا ہار'' پہناتے وقت میں نے چپکے سے ایک بالکل چھوٹا سا گنگھرو توڑ لیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ چوک کی کسی دوکان میں اس کی قیمت انکوا لیں۔ میں نے صرف قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کہا تھا، وہ اسے بیچ آئیں، ۳۷ روپے پچھتر پیسے میں۔ چلیے یہ تو طے ہو گیا کہ ہار سونے کا ہے، پیتل کا نہیں۔

میرا ایک دل کہتا کہ اپنے دوست سے روپے لے کر ہار رکھ لوں، ایک کہتا کہ نہ جانے کس کا ہے، اس کی آہ نہ لگے گی۔ آہ واہ تو خیر لگ کر مزید کیا بگاڑ لیتی لیکن دل اسے خریدنے پر راضی نہ ہوا۔

دوسرے دن دونوں بھائی آئے اور میں نے انھیں بتایا کہ ایک گھنگھرو توڑ کر میں نے فروخت کر دیا ہے اور اس کے پیسے دے رہا ہوں تو ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کیا سیکڑوں گھنگھروؤں میں وہی ایک گھنگھرو سونے کا تھا؟

بہر حال میں نے انھیں ''نولکھا ہار''، ایک گھنگھرو کی فروخت سے ملنے والے روپے اور چاندی کے سکّے واپس کر دیے۔ وہ ہار کی قیمت اور بھی کم کرنے کے لیے تیار تھے لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ دونوں زینے اتر کے تھوڑی دیر کپور مارکیٹ کے اس پاٹے ہوئے کنویں پر جس کا اب نام و نشان بھی نہیں رہ گیا ہے، بیٹھے رہے، پھر میڈیکل کالج کی طرف چل دیے۔ میں نے آہستہ آہستہ اسکوٹر چلاتے ہوئے چوک پولیس تھانے تک ان کا پیچھا کیا جہاں سڑک کی دوسری طرف وہ ایک دوکان میں گئے اور کوئی دس منٹ بعد ایک لڑکے کے ساتھ باہر نکلے۔

اسی وقت روڈویز کی ایک بس وہاں رک گئی اور پھر آگے پیچھے رکشے تانگے اور لوگوں کی بھیڑ میں برآمدہ نظروں سے بالکل چھپ گیا۔ دس بارہ منٹ بعد سڑک صاف ہوئی تو میں نے آس پاس کا ایک ایک کونا چھان مارا۔ دونوں بھائی کہیں نظر نہ آئے۔

میرا خیال ہے کہ یہ ہار خالص سونے کا تھا لیکن وہ وہ اسے جعلی اور ملمع کیا ہوا سمجھتے تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے اسے اونے پونے فروخت کر کے خریدار کو مالا مال ضرور کر دیا ہوگا۔ معلوم نہیں یہ مالِ حرام ان لڑکوں کے پاس سے ''بہ جائے حرام'' گیا یا نہیں۔ ویسے انصاف کا چکّر سلسلہ در سلسلہ ذرا کم ہی چلتا ہے۔

'پرگتی شیل' کے بغیر

انجمن ترقی پسند مصنّفین کو ۱۹۴۹ء میں سیاسی پارٹی قرار دے دیا گیا تو اردو کی انجمن پہلے کی طرح کام کرتی رہی لیکن ہندی والوں نے ''لیکھک سنگھ'' بنالی کہ کہیں جیل نہ بھیج دیے جائیں، بالکل اسی طرح جیسے اردو ادیب سلاخوں کے پیچھے کر دیے گئے تھے۔ ایک بات اور بھی تھی، ہندی راج بھاشا تھی اور اردو راندۂ درگاہ، کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی۔ ہندی والے وہ راستہ کیوں اختیار کرتے جو اردو والوں نے اپنایا تھا۔ ان دو باتوں کے علاوہ ایک سیاسی پہلو بھی تھا۔ حکومت کو یہ تاثر بھی تو دینا تھا کہ ہندی کے ادیب اس کے ساتھ ہیں جب کہ اردو والے اس کے مخالف۔ لیکن کل تک جو سرخا سرخ تھے وہ ایک دم ترنگے کیسے ہو جائیں۔ سو اس کی بھی ایک

ترکیب نکال لی گئی۔ پرگت شیل لیکھک سنگھ کا نام لیکھک سنگھ کردیا گیا کہ "پرگت شیل" کا شایبہ رہے بھی، نہ بھی رہے۔ جیسی جس وقت ضرورت پڑ جائے۔

لیکھک سنگھ کے جلسے یشپال جی کے "ساتھی پریس،" کے۔ این۔ ککڑ کے گھر، کنور نارائن کے یہاں اور ہلواسیا کے سامنے مقبرہ نام کے محلّے میں ڈاکٹر این۔ کے۔ دیوراج کے یہاں ہوتے۔ ہندی کے سارے ہی ادیبوں سے میری دوستی تھی، مدعو کیا جاتا لیکن میرے دل میں یہ خیال بھی رہتا کہ "دلِ یزداں" میں کانٹے کی طرح کھٹکنے والا بھی تو کوئی نہ کوئی ہونا چاہیے، میں ہی سہی۔

ایک جلسہ ڈاکٹر دیوراج کے یہاں ہوا جس میں، "مَیں افریقہ" کے مشہور ہندی شاعر گرجا کمار ماتھر مہمان خصوصی تھے۔ ویسے ان دنوں وہ آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے اور حال ہی میں ریڈیو کے سلسلے میں کوئی ٹریننگ کر کے لندن سے لوٹے تھے۔ وہ سوٹیڈ بوٹیڈ رہتے ہی تھے لیکن اس دن کی بات ہی اور تھی۔ کوئی نہ بتاتا تو بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ لندن سے، بس چلے ہی آ رہے ہیں۔

انھوں نے اپنی مشہور نظم "مَیں افریقہ"، جو واقعی بہت عمدہ ہے، سنائی۔ خوب خوب تعریف ہوئی۔ اس کے بعد کسی نے افسانہ پڑھا۔ اس پر بات چیت شروع ہوئی اور جب ان کی باری آئی تو انھوں نے انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ میں نے کہا یہ جلسہ اردو ہندی کے ادیبوں کا ہے۔ اس لیے آپ اپنی رائے کا اظہار ہندی ہی میں کریں تو بہتر ہے۔

ماتھر صاحب کو بات بہت بری لگی اور انھوں نے کہا، "ہمارے گاؤں میں لوگ کہتے ہیں کہ یہ چیز ہم نے کودوں بیچ کر تو لی نہیں، رپیا خرچ کر کے خریدی ہے۔ تو سہیل صاحب ہم نے انگریزی کودوں بیچ کے نہیں پڑھی ہے..."

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ میں بول اٹھا۔

"ماتھر صاحب یہ پوری بات آپ انگریزی میں کہہ دیں تو میں مان لوں گا کہ آپ نے انگریزی کودوں بیچ کے نہیں پڑھی ہے۔"

سب لوگ ہنس دیے... ہنسنے والوں میں وہ خود بھی شامل تھے اور بات اسی ہنسی میں آئی گئی ہو گئی...

لیکن اس کے بعد جب تک گرجا کمار لکھنؤ میں رہے، مجھے ریڈیو سے کوئی پروگرام نہیں

ملا۔

بعد میں ہندی کے اس وقت کے نوجوان ادیبوں نے جس میں ککّو، مدرارا کھشش اور کنور نارائن پیش پیش تھے، ایک رسالہ نکالا تھا اور میرے دو ایک مضامین بھی اس میں شائع ہوئے تھے۔ ان مضامین کو راجی سیٹھ نے ہندی میں منتقل کیا تھا۔ وہ اس وقت راجن سرین تھی۔

بڑے بے آبرو ہو کر

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ہر سال ایک کل ہند مشاعرہ نشر ہوتا۔ اس وقت ایک تو اردو کلچر خاصی بڑی حد تک لکھنؤ پر چھایا ہوا تھا اور دوسرے تکمیل ذوق اور تفریح کے لیے سینما کے علاوہ کوئی دوسرا وسیلہ نہ تھا چنانچہ ریڈیو سے یہ مشاعرہ نشر ہوتا تو قدیم لکھنؤ سے قیصر باغ بلکہ لال باغ تک کے سارے چھوٹے بڑے ہوٹل سامعین سے چھلک پڑتے۔ مشاعرے میں معین احسن جذبی ہر سال آتے، شہر میں ان کا قیام برف والے صغیر صاحب یا حیات اللہ انصاری کے یہاں ہوتا۔ وہ قومی آواز ضرور آتے اور وہاں خاصا وقت بھی گزارتے۔ معلوم نہیں کیوں وہ مجھ پر بہت مہربان تھے اور مجھے اپنے ساتھ دو بار مشاعرے میں لے جا چکے تھے۔ ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے مجھ سے کوئی کچھ نہ کہتا۔ اس سال بھی لے گئے۔

لیکن اس بار ہوا یہ کہ جذبی دوسرے شعرا کے ساتھ گیلری میں داخل ہو گئے اور جب میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اسٹیشن ڈائرکٹر نندی نے مجھے روک لیا۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا کہ جذبی صاحب مجھے لائے ہیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر میں نے ان سے بحث شروع کر دی۔ ریڈیو سے اپنے سات آٹھ سالہ تعلق کا ذکر کیا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ گل محمد شاہ، ان کا بیٹا کبیر شاہ جو ہاکی کا مشہور کھلاڑی اور میرا دوست تھا وہاں موجود تھے لیکن میری توقع کے برخلاف ان میں سے کسی نے میرے حق میں ایک لفظ نہ کہا۔ اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ خواہ مخواہ اپنے افسر کی خفگی کوئی کیوں مول لیتا۔

خیر، میں نندی کو انگریزی میں برا بھلا کہہ کر چلا آیا۔ ان دنوں انگریزی میں اظہار خود ایک دلیل کے مصداق تھا۔ لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

اب یہ یاد نہیں کہ میں نے مشاعرہ کسی ہوٹل میں بیٹھ کر سنا یا ریڈیو اسٹیشن اور خاص طور

سے نندی سے اس قدر ناراض ہو گیا کہ سنا ہی نہیں۔

کچھ دنوں بعد ریڈیو اسٹیشن سے کسی پروگرام کے سلسلے میں ایک معاہدہ نامہ آیا جو میں نے دوسرے لفافے میں رکھ کر فوراً واپس کر دیا۔ چار چھے دن گذر گئے لیکن کچھ نہ ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ معاہدہ نامہ کی واپسی سے ریڈیو اسٹیشن پر آسمان پھٹ پڑے گا اور نندی ہاتھ جوڑ کے گڑگڑاتے ہوئے میرے پاس آئیں گے، یہ کہتے ہوئے کہ حضور غلطی ہوئی معاف کر دیجیے اور ریڈیو اسٹیشن تشریف لے چلیے۔

وہ عمر خود کو بے حد اہمیت دینے کی تھی اور میرے حالات نے تو مجھے خاصا ٹیڑھا بھی بنا دیا تھا۔

ڈیڑھ دو مہینے بعد دوسرا معاہدہ نامہ آیا تو میں نے اس پر

"It is disgraceful to go to AIR Station, Lucknow, so long as man like Nandi is the station director."

لکھ کر واپس کر دیا۔ اب بھی کچھ نہ ہوا، علاوہ اس کے کہ ریڈیو والوں نے پروگرام دینا ہی بند کر دیے۔

''ایں ماتم سخت است'' والی کیفیت تھی۔ ساری اکڑ فوں نکل گئی۔ لیکن خوش قسمتی سے جلد ہی نندی کا تبادلہ ہو گیا اور گل محمد شاہ مجھے قومی آواز سے رکشے میں بٹھا کر لے گئے۔ وہاں پروگرام میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس بات کا ذکر میں صرف یہ بتانے کے لیے کر رہا ہوں کہ ان دنوں ریڈیو اسٹیشن پر آرٹسٹوں کی قدر ہوتی تھی اور آج کا حال نہ تھا کہ کوئی ایک گلاس پانی کو نہیں پوچھتا اور فیس کے معاملے میں پچاس سال پرانا براڈ کاسٹر ہو یا نو وارد، سارے دھان بائیس پسیری کی پیس دیے جاتے ہیں۔

سیپی نظر آئی کہیں...

میں آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ کے کل ہند مشاعرے کی منتخب سامعین کی فہرست میں تو کبھی نہ رہا لیکن تین مشاعرے میں نے اسٹوڈیو میں سنے تھے۔ دو جذبی کے طفیل، ایک میں سلام مچھلی شہری نے چوری کے مال کی طرح ادھر سے ادھر کر دیا تھا۔

ان دنوں مَیں، عبدالحلیم خاں (فارسی) اور احمد جمال پاشا اس طرح کے مشاعرے

نظیر آباد کے تاج ہوٹل ہی میں سنتے تھے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے بریکٹ کے فارسی کی بھی توضیح کردی جائے۔ ان دنوں شہر میں دو ہی لوگ ایسے تھے جن کے نام کے ساتھ "فارسی" لگایا جاتا۔ ان میں سے ایک "فارسی" تو سچ مچ کا تھا لیکن دوسرا بس بریکٹ بھر کا۔ سچ مچ کے فارسی کے لاحقے کے مستحق وارث کرمانی تھے اور بریکٹ والے کے عبدالحلیم خاں۔

خاں صاحب کو فارسی الفاظ اور فقرے استعمال کرنے کا بہت شوق تھا، غلط صحیح کی اس میں کوئی قید نہ تھی۔ لیکن ایک دن تو انھوں نے حد ہی کردی۔ ہم لوگ نظیر آباد کے تاج ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ ان کی پیالی میں مکھی گر گئی۔ فوراً ہی عبدالحلیم خاں کی رگِ فارسیت پھڑکی اور انھوں نے برجستہ کہا

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

بس اس دن سے عبدالحلیم خاں کا نام عبدالحلیم خاں فارسی پڑ گیا۔ ویسے ان کا اصل مضمون تاریخ تھا۔ "نیا دور" اور "ماہنامہ کتاب" میں ان کے دو چار مضامین شائع ہوئے تھے۔ آیئے پھر تاج ہوٹل چلیں۔

صفدر نامی ایک نوجوان... نوجوان تو ہم بھی تھے لیکن وہ ہم سے عمر میں کچھ کم تھا... بھی مشاعرہ اسی ہوٹل میں سنتا تھا۔ ان دنوں ریڈیو بھی ہر گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ صفدر اپنی حاضر جوابی کے لیے مشہور تھا۔ اس نے کبھی کوئی کام نہیں کیا، یعنی ملازمت کے قسم کا کام، لیکن ہمیشہ اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھایا، کھائے پیے لوگوں کے ساتھ۔ لکھنؤ میں جب تک رہا صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک کوالٹی، کیورس، برلنگٹن وغیرہ میں لوگ اسے لے جاتے اور اپنے ساتھ رکھنا باعثِ فخر سمجھتے۔

ایک دن اردو پروگرام میں کسی شاعر نے مطلع پڑھا:

دریائے محبت میں کیا کیا نظر آیا

وہ ابھی مصرع پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ صفدر نے گرہ لگائی:

سیپی نظر آئی کہیں گھونگا نظر آیا

رنگِ محفل کا اندازہ کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔

صفدر بے حد حاضر جواب تھا اور ہر وقت کوئی نہ کوئی جملہ اس کی زبان پر مچلتا رہتا، لیکن ان لوگوں کا بہت ادب کرتا تھا جو عمر میں اس سے تھوڑے بھی بڑے تھے۔

عمر کی ایک منزل ایسی بھی ہوتی ہے جب یہ فاصلے قائم رہتے ہوئے بھی آپ ہی آپ کم ہو جاتے ہیں۔ اسے یوں سمجھیے کہ دس اور پندرہ کے درمیان فرق ایک تہائی کا ہے اور تیس اور پینتیس کے درمیان بہت کم۔

ایک دن میرے بیٹے ساجد میاں کا رکشہ والا نہیں آیا تو مجھے انھیں اسکول سے لینے حضرت گنج جانا پڑا۔ کیتھیڈرل اسکول سے ساجد کی انگلی پکڑے نکل ہی رہا تھا کہ صفدر پر نظر پڑی۔ معلوم نہیں کس موڈ میں تھا کہ اس نے ایک جملہ چسپاں کر دیا۔

''لوگوں پر بڑی ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔''

''بڑا بیٹا ناخلف نکل جائے تو یہی ہوتا ہے،'' میں نے جواب دیا۔

''ہوگئی، ہوگئی،'' کہتا ہوا صفدر شرمندگی میں سر جھکائے ہوئے ذرا کی ذرا میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ بات کوئی پینتیس چھتیس سال ادھر کی رہی ہوگی۔ حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ میرا حضرت گنج جانا ختم ہی ہو گیا اور صفدر کب دہلی سدھار گئے مجھے معلوم ہی نہیں ہو سکا۔

بہ نوکِ گیاہ...

دہلی تو آنا جانا لگا رہتا لیکن برسوں سے ''اردو بازار'' جانا نہیں ہوا تھا۔ پانچ چھے سال قبل (۲۰۰۵ء) یہ فیصلہ کر کے دہلی گیا کہ اس بار نئی اردو کتابوں سے واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس کے کسی ہوٹل میں روٹی بھی توڑوں گا۔ حسنِ اتفاق ہی کہیے کہ مکتبہ جامعہ میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ صفدر آ گئے اور دوکان کے مینیجر خسرو صاحب نے ان کی پسند کی ہوئی کتابوں پر دل کھول کر رعایت دی۔ اس سارے دوران ہم لوگ باتیں کرتے رہے، کچھ پچھلے دنوں کی، کچھ حال کی۔ صفدر بھوپال ہاؤس میں رہتے تھے، ریل کے کرایے میں رعایت حاصل کرنے کے لیے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا کٹوا دیا تھا، چہرے پر مسکراہٹ اب بھی ایک آدھ بار پھیل جاتی لیکن ایسا لگتا جیسے ہنسی کو یاد کر کے ہنس رہے ہوں۔ تھا تو صفدر ہی، لیکن پچھلے دنوں کے صفدر کی بس پرچھائیں۔

رخصت ہوتے وقت میں ہاتھ ملاتے ملاتے کھڑا ہونے لگا تو مجھے اٹھنے نہ دیا، نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور رخصت ہو گیا، سائیکل پر، جو اس نے دوکان سے لگا کر کھڑی کر دی

تھی۔

صفدر نے زندگی کا موسمِ بہار گذر جانے کے بعد خود کو اپنے آپ میں سمیٹ لیا ہے... کہ کہیں بارِ خاطر نہ بن جائے۔

خسرو صاحب نے بتایا کہ ہر مہینے دس پندرہ کتابیں تو خریدتے ہی ہیں۔ نظیر آباد کی اس گلی کے نکڑ پر جس میں ڈاکٹر شاکر ہاشمی کا پریس ہے صفدر کے والد کی انگریزی کی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ صفدر نے انگریزی شاید نہیں پڑھی لیکن کتابوں کی رفاقت، چاہے وہ پڑھی بھی نہ جائیں، مالا مال کر ہی دیتی ہے۔

میرے ساتھ اقبال مجید بھی تھے۔ ہم دونوں وہیں ایک ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ ہم نے بھی کتابیں خریدیں اور غالب انسٹی ٹیوٹ روانہ ہو گئے جہاں قمر رئیس کے زندگی کی پچھتر گرہیں کھولنے کے موقعے پر ایک تہنیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

وہاں شیلا وکشت کو پہلی بار اور قمر رئیس کو آخری بار دیکھا۔

معلوم نہیں کس کس کو آخری بار دیکھنا ہے، قبل اس کے کہ دوسرے یہی بات میرے بارے میں کہیں:

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ
مثالِ قطرۂ شبنم رہے، رہے، نہ رہے

جواہر کی دکاں

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اردو کے گلے پر چھری پھیری جا چکی تھی لیکن بازاروں اور زبانوں پر اسی کی حکمرانی تھی اور پنڈت نہرو اور پٹیل کے درمیان نظریاتی جنگ زور و شور سے جاری، اگرچہ اوپر اوپر پھول کھلے تھے۔

ریڈیو کے سالانہ مشاعرے کا موسم آیا تو شہر میں خیال کے گھوڑے دوڑائے جانے لگے کہ اس بار کون کون سے شعرا آئیں گے۔ جوشؔ، جگرؔ، فراقؔ، اثرؔ لکھنوی اور ساغر نظامی تو خیر آئیں گے ہی۔

یاد ش بخیر کیا دن تھے کہ شعرا کے ناموں پر بحث ہوتی تھی، اشعار زیرِ بحث آتے۔ اب شعرا فیس پر جھگڑتے ہیں۔

ریڈیو کا ایک دستور ہے۔ کہ رکارڈنگ سے پہلے مسودہ متعلقہ افسر کو دے دیا جاتا ہے۔
ں زمانے میں اس پر سختی سے عمل ہوتا تھا اگرچہ شاعری میں اس کی حیثیت ایک رسم سے زیادہ نہ تھی کہ غزل میں کوئی واعظ ومحتسب اور گلچین وصیاد کو برا بھلا کہنے کے علاوہ اور کیا کرلے گا۔ لیکن جوش کی نظم نما غزل کے دو اشعار پر القط کا نشان لگا کر 'چڑیا' بٹھا دی گئی۔ جوش نے وہ کاغذ کھول کے بھی نہیں دیکھا اور غزل پڑھ دی۔ ان دنوں پروگرام کی پہلے سے رکارڈنگ کی سہولت نہ تھی اور قبل اس کے کہ براڈ کاسٹنگ کیبن کے ناظمین کو احساس ہوا ایک شعر نشر ہو چکا تھا۔ وہ دو شعر یہ تھے:

جس کے ہر لفظ سے سو پھول مہک اٹھتے تھے
کاٹ دی جائے گی شاید وہ زباں اے ساقی

اور دوسرا شعر تو شمشیر بے نیام تھا۔

ٹھیکرے بیچنے والوں کے پرانے گاہک
آج اٹھاتے ہیں جواہر کی دُکاں اے ساقی

اب یہ نہیں یاد کہ ان میں سے کون سا شعر نشر ہو گیا تھا لیکن اسٹوڈیو میں جو لوگ موجود تھے انھوں نے دونوں ہی سن لیے تھے، اگرچہ شہر میں لوگوں کو شکایت رہی کہ بجلی کمپنی کی نااہلی کے سبب ایک شعر سنا نہ جا سکا۔

ریڈیو کے اعلیٰ حکام جوش کی اس جرأتِ رندانہ پر بہت برہم تھے مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ آخر، چند دنوں کے بعد انھوں نے لکھنؤ ریڈیو کے دروازے جوش پر بند کر دیے۔

اگلے سال مشاعرہ ہوا تو جوش کو مدعو نہیں کیا گیا۔ شاعروں کی فہرست شائع ہوئی تو جوش کے نام کی عدم موجودگی پر چہ می گوئیاں تو ہوئیں لیکن لوگوں کو اصل بات معلوم نہ ہو سکی۔ غرض مشاعرہ ہوا اور دھوم دھام سے ہوا۔ لیکن

''نصیبہ سو رہا تھا اپنا پر باپ اس کا جاگ اٹھا'' والی بات بھی ہوئی۔

اتفاق سے پنڈت نہرو نے سارے دن کا کام ختم کر کے بستر پر دراز ہوتے ہوتے ٹرانسسٹر کھولا تو لکھنؤ اسٹیشن سے مشاعرہ آ رہا تھا۔ انھوں نے کلام سے اندازہ لگا لیا کہ مشاعرہ اختتام کے قریب ہے اور وہ جوش کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں مشاعرہ ختم ہو گیا اور وہ جوش کا انتظار ہی کرتے رہے۔ انھوں نے فوراً اسٹیشن ڈائرکٹر کو فون کیا تو وہ اسٹوڈیو نمبر ایک سے نکل

رہے تھے۔ خبر ملتے ہی تیزی سے زینے چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچے تو پنڈت نہرو پوچھ رہے تھے کہ کیا جوشؔ صاحب نے معذرت کر لی تھی۔ اسٹیشن ڈائرکٹر کے لیے پنڈت نہرو سے یہ کہتے نہیں بنتا تھا کہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ان پر اپنے دروازے بند کر رکھے ہیں، لیکن بہر حال کہا، جسے سن کر نہرو آگ بگولا ہو گئے اور انھوں نے چیخ کر کہا، ''جوشؔ کے بغیر مشاعرہ کیسے مکمل ہو سکتا ہے؟''

غرض چند ماہ بعد لکھنؤ سے دوبارہ مشاعرہ نشر ہوا اور اس کے آخری شاعر جوشؔ تھے۔

پہلی اور شاید آخری بار ایک سال میں دو کل ہند مشاعرے لکھنؤ سے نشر ہوئے۔

پروفیسر ولی الحق نے اپنی خودنوشت ''مدوجزر'' میں یہ واقعہ کمیونسٹ پارٹی کے کسی مشاعرے سے منسوب کیا ہے۔ میں نے یاد دلایا تو انھیں یاد آ گیا کہ واقعہ ریڈیو کا ہے۔ یہ بھی کہا کہ ''جو یاد رہا'' میں اس کی تردید کر دوں۔ میں ان کی تردید کیا کرتا، اپنی بات، یعنی یہ تحریر لکھ کر انھیں سنا دی۔ انھوں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں ان سے اس تحریر پر دستخط کرنے کے لیے نہ کہہ سکا۔ لطیف صدیقی اس بات سے واقف ہیں۔

ایک چھوٹی سی بڑی بات

نیشنل ہیرالڈ میں ایک جگہ خالی ہوئی اور کسی ذریعے سے کے۔ این۔ ککّڑ کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے ہیرالڈ کے ایڈیٹر ایم۔ چلپت راؤ سے ملاقات کی۔ ککّڑ نے انگریزی میں ایم۔ اے۔ کیا تھا۔ ایم۔ سی۔ نے ککّڑ سے کہا،

"Let me interview the applicants, may be I take you."

امیدواروں میں لوتھر بھی تھے جو تھے تو شاید بی۔ اے۔ ہی لیکن ان کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ چنانچہ ایم۔ سی۔ نے انھیں کو لے لیا۔ جب یہ خبر ککّڑ کو ملی تو انھوں نے ایم۔ سی۔ سے ملاقات کر کے انھیں یاد دلایا کہ آپ نے "May be I take you." کہا تھا۔ ان کی شکایت سن کر ایم۔ سی۔ نے کہا:

"My dear Kakkar, may be I take you may also mean may be I do not take you."

میرے عزیز دوست ککّڑ نے یہ واقعہ اپنے انتقال سے چند ماہ قبل سنایا تھا۔ ایم۔ سی۔ پر میرا مضمون شائع ہو چکا تھا ورنہ اسے الگ سے شائع نہ کرنا پڑتا۔

لوتھر بالکل سیاہ تھے، ضلع کی خبریں دیکھتے تھے۔ ان کی انگلیاں سیاہی سے نیلی رہتیں۔

ایک دن ان کے کسی دوست نے کہا کہ یہ کہتے تو خود کو سب ایڈیٹر ہیں لیکن ہیں دراصل فورمین۔
لوتھر نے فوراً جواب دیا۔

"Yes, I am a foreman, but I work under the stewardship of M.C."

دور کا نشانہ

پچھلی صدی کے ساتویں دہے میں مغربی بنگال اسمبلی کے انتخابات کے دوران ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔

ایک آزاد امیدوار سے جو تین بار سے مسلسل منتخب ہو رہا تھا، ووٹر بہت ناراض تھے، اس کی مبینہ بے ایمانیوں اور دھاندلیوں کے سبب۔ چنانچہ انھوں نے نہ اسے کوئی جلسہ کرنے دیا نہ پوسٹر لگانے دیے۔ دس بیس پوسٹر جو اس نے کسی طرح لگا دیے تھے، پھاڑ ڈالے گئے۔

آخر اس نے ایک ترکیب سوچی۔ ووٹروں سے اپیل کی کہ اپنی بات کہنے کا ایک موقعہ دے دیجیے، آپ کہیں گے تو میں میدان سے ہٹ جاؤں گا۔ لوگوں نے سوچا ایسے جلسہ میں کیا ہرج ہے۔

خیر جلسہ ہوا۔ اس نے سارے الزامات شروع ہی میں تسلیم کر لیے۔ اس نے کہا کہ پہلی بار ایم۔ایل۔اے۔ منتخب ہوا تو میرے پاس اپنا مکان تک نہ تھا، چنانچہ میں نے مکان بنوایا، اسے سجایا، سنوارا۔ دوسری بار کی کمائی سے دونوں بیٹیوں اور بیٹے کو عمدہ سے عمدہ اسکولوں میں تعلیم دلوائی اور تیسری بار میں تینوں کی شادیاں کر دیں۔ بیٹی کی شادی میں کتنا خرچ ہوتا ہے، آپ سب جانتے ہی ہیں۔ اب وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کی ہیں، بیٹا وکیل ہے اور بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتا ہے۔ میرے اوپر اب کوئی ذمہ داری نہیں، بیوی پہلے ہی مر چکی ہے۔

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

اس نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا، ''اب کی بار آپ نے مجھے منتخب کیا تو صرف آپ کی خدمت کروں گا اور یاد رکھیے کوئی نیا امیدوار چنا تو وہ وہیں سے شروع کرے گا جہاں سے میں نے شروع کیا تھا۔

یہ خبر اسٹیٹسمین کے صفحۂ اوّل پر حلقہ میں شائع ہوئی تھی۔

ٹیپ کا بند یہ ہے کہ وہ چوتھی بار بھی الکشن جیت گیا۔

'آگ کا دریا'

پاکستان میں ''آگ کا دریا'' شائع ہوا۔ تو ہندوستان کے ان ناشروں میں جو پاکستانی کتابیں چھاپتے تھے اسے جلد از جلد شائع کرنے کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ لکھنؤ میں کتابی دنیا کے مالک اظہر نگرامی اور اردو پبلشرز کے مالک منشی امیر علی نے یہ کتاب مل کر شائع کی اور آدھی آدھی کتابیں آپس میں بانٹ لیں۔ کتاب پر نام لیکن کتابی دنیا ہی کا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد قرۃ العین حیدر کو ہندوستان کی شہریت مل گئی۔ کتاب بہت خراب چھپی تھی اور اغلاط سے پر تھی۔ اسے دیکھ کر انھیں بہت تکلیف ہوئی اور انھوں نے خواجہ احمد عباس کے ذریعے، جو رجسٹرڈ وکیل تھے، کتاب کے ناشر کو نوٹس بھیج دیا۔ ناکافی اطلاعات کی بنیاد پر پہلا نوٹس نسیم انہونوی، مالک کتابی دنیا، کے نام آیا جو ظاہر ہے واپس چلا گیا۔ دوسرا نوٹس اظہر نگرامی، مالک نسیم بک ڈپو، کے نام آیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے والے نوٹس کا ہوا تھا۔ لیکن تیسرا نوٹس اظہر نگرامی، مالک کتابی دنیا، کے نام آیا اور وہ انھیں لینا پڑا۔ اظہر نگرامی نہایت شریف انسان تھے، ان کے تو پسینے چھوٹ گئے۔ اسی وقت سلامت علی مہدی آ گئے۔ ساری بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اظہر نگرامی سے کہا، ''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، اس کا جواب میں دوں گا'' اور انھوں نے واقعی یہی کیا بھی۔

سلامت علی مہدی کا وہ خط میں نے پڑھا تھا۔ ان دنوں میں قومی آواز اور بعد میں نیشنل ہیرالڈ جاتے ہوئے دن میں کم سے کم ایک بار ضرور کتابی دنیا جاتا۔ میرے خطوط بھی کتابی دنیا کے پتے پر ہی آتے تھے۔ اسی ادارہ کے حوالے سے میں سلامت علی مہدی سے واقف ہوا اور ان کی ذہانت، حاضر جوابی، اور صحافتی صلاحیتوں کے مدّاحوں میں شامل ہوگیا۔ افسوس ان کی صلاحیتیں تعمیری کاموں میں نہیں صرف ہوتی تھیں۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے انھوں نے خواجہ احمد عباس کے بجائے جواب قرۃ العین حیدر کو دیا تھا اور لکھا تھا کہ کتاب میں بطور ناشر کتابی دنیا کا نام غلطی سے شائع ہوگیا ہے جب کہ اصل ناشر مَیں ہوں۔ انھوں نے قرۃ العین حیدر سے اپنی ملاقات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا تھا، ''آگ کا دریا'' کی رائلٹی میں ہی آپ کو ہندوستان کی شہریت ملی ہے۔ اس سے بڑی رائلٹی اب تک کسی ادیب کو نہیں ملی۔ اب آپ کیسی رائلٹی مانگ رہی ہیں۔

خط خاصا طویل تھا ساری باتیں اب یاد بھی نہیں اور جو یاد ہیں انھیں لکھنا مناسب نہیں

لیکن خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے آخر میں نرم الفاظ میں یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کا جو جی چاہے کر لیجیے۔

قرۃ العین حیدر بے چاری خاموش ہو کے بیٹھ رہیں۔

وہ ہندوستان آئیں تو ''ماہنامہ کتاب'' میں مسیح الحسن رضوی کا مضمون ''عینی کی واپسی'' شائع ہوا جو کئی جگہ نقل کیا گیا۔ اس کے بعد میں نے قرۃ العین حیدر کو خط لکھ کر تجویز پیش کی وہ چاہیں تو ''آگ کا دریا'' کا ایک عمدہ ایڈیشن چھاپ کر اس کا سارا منافع انھیں بطور رائلٹی پیش کر دیا جائے۔ کوئی جواب نہیں آیا لیکن پہلی ملاقات میں انھوں نے ہندوستان میں ناول کے حشر پر آزردگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اب مجھے اس کی اشاعت یا عدم اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک بات اور: انھوں نے ایک ذاتی خط میں ''عینی کی واپسی'' کے عنوان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مجھے ''عینی'' کے نام سے پکارنے کا حق ہر شخص کو نہیں ہے۔

قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی'' پہلی بار ماہنامہ ''کتاب'' ہی میں شائع ہوا تھا۔

گنجے مرد، زُلف دراز خواتین

ایک زمانے میں عصمت چغتائی جب بھی لکھنؤ آتیں ڈاکٹر صبیحہ انور کے یہاں ہی قیام کرتیں۔ یوں بھی علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات و خواتین ان کے یہاں آتے ہی رہتے تھے لیکن عصمت چغتائی قیام پذیر ہوتیں تو ظاہر ہے آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا۔ صبیحہ انور کے شوہر خواجہ انور سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں لیکن وجاہت علی سندیلوی مرحوم کی بیٹی سے ان کی شادی کے بعد ان تعلقات میں ایک اور جہت کا اضافہ ہو گیا۔ آمد و رفت کا سلسلہ بڑھا اور دونوں جانب خلوص و محبت کا رشتہ مضبوط تر ہو گیا۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

عصمت چغتائی حاضر جواب اور مُنہ پھٹ تو تھیں ہی لیکن رام لعل کو وہ کچھ زیادہ ہی اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا کرتیں۔ ایک دن وہ اپنے میز بانوں کے ساتھ رام لعل کے یہاں گئیں تو وہ زندہ اور مرحوم ادیبوں کے خطوط الگ الگ کر کے ان کے فائل بنا رہے تھے۔ وہ رام

لعل پر بہت بگڑیں اور کہنے لگیں یہ سب کیا کر رہے ہو، سارے خطوط پھینک دیے جائیں گے۔ تم سمجھتے ہو کوئی انھیں محفوظ رکھے گا۔ پھر انھوں نے یکا یک پوچھا کہ کیا اس میں ان کے بھی خط ہیں اور رام لعل نے کہا بہت سے تو انھوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا، ''انھیں زندوں کی فائل میں رکھنا۔''

صبیحہ انور اور خواجہ انور سے رام لعل کے بہت گہرے تعلقات تھے اور ان کا ذکر وہاں ہوتا ہی رہتا۔ ایک دن رام لعل کی بات نکلی تو عصمت چغتائی کی رگِ شرارت پھڑکی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

''سہیل یہ بتاؤ کہ مرد گنجے کیوں ہوتے ہیں؟ عورتیں تو نہیں ہوتیں۔''

میں نے کہا، ''عصمت آپا عورتیں اس لیے گنجی نہیں ہوتیں کہ ان کی بیویاں نہیں ہوتیں۔''

جواب سنتے ہی عصمت آپا بھڑک اٹھیں۔

''بیویاں نہیں ہوتیں تو کیا ہوا، سوتیں تو ہوتی ہیں، شوہر کی داشتائیں تو ہوتی ہیں، طوائفیں تو ہوتی ہیں۔''

جملہ پورا کرنے کے بعد بھی وہ غصہ میں کچھ نہ کچھ بدبدائے جا رہی تھیں کہ صبیحہ انور نے کہا، ''عصمت آپا اب جانے بھی دیجیے، آپ اس کا جواب نہ دے پائیں گی''۔

عصمت چغتائی کہاں تو بے حد ناراض تھیں کہاں ایک دم ہنسنے لگیں۔

ایک دن کسی نے مردوں کے مظالم گنانا شروع کیے۔ وہ مظالم کی یہ داستان نہایت سنجیدگی سے سنتی رہیں پھر ایک دم بولیں۔

''مرد کا ظلم ہر شخص کو نظر آ جاتا ہے، لیکن عورت کے ظلم پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ ایسا بغلی گھونسہ مارتی ہے کہ مرد بلبلا کے رہ جاتا ہے لیکن ایک لفظ کہہ نہیں پاتا۔''

انھوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جیسے بہت دور سے آتی ہوئی آواز میں کہا۔

''پی۔ ڈبلو۔ اے۔ کا جلسہ تھا، شاہد (شاہد لطیف، عصمت کے شوہر) کو افسانہ پڑھنا تھا۔ شاہد نے کہا تھا دیکھو عصمت تم نہ بولنا۔ میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ میں بحث میں شریک نہ ہوں گی لیکن بحث کی گرما گرمی میں اپنے آپ سے کیے ہوئے میرے سارے عہد و پیمان دھرے رہ گئے اور میں نے افسانے کے بخیے ادھیڑ ڈالے۔ میٹنگ ختم ہوئی تو گھر جانے کے لیے شاہد نے

کار اسٹارٹ کی، پاس والی سیٹ کا دروازہ کھولا، میں نے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کرلیا، گاڑی چل دی، وہ سامنے سڑک پر نظر جمائے ہوئے تھا؛ چہرے پر غصّے کی ایک لکیر نہ تھی۔ میں انتظار کرتی رہی کہ وہ ایک لفظ تو بولے، کم سے کم یہی پوچھے کہ عصمت تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ خاموش رہوگی لیکن تمھیں کیا ہوگیا تھا؟ میں انتظار ہی کرتی رہی، اس کے چہرے پر نظریں جمائے رہی لیکن اس نے کچھ نہ کہا''۔

یہ کہہ کر عصمت چغتائی رونے لگیں، آنسوؤں کے رخساروں پر دھیرے دھیرے پھسل رہے تھے لیکن وہ انھیں پونچھ نہیں رہی تھیں۔

ہم لوگ ان کی شخصیت کا یہ پہلو دیکھ کر حیران تھے۔ وہ کس قدر معصوم تھیں۔

سڑکیں میدان بن گئیں

ملک میں ہنگامی حالات نافذ ہوئے تو ڈاکٹر شارب ردولوی نے ایک خط میں لکھا، ''گلیاں سڑکیں ہوگئیں، سڑکیں میدان۔ ہر بس وقت پر چلتی ہے، مسافر کیو لگاتے ہیں، ریل گاڑیاں وقت سے پہلے آوٹر سگنل پر پہنچنے کے بعد صحیح وقت کا انتظار کرتی ہیں۔ نہ کہیں شور ہے نہ شرابہ، نہ چوری نہ ڈکیتی۔''

لیکن تھوڑے ہی عرصے میں یہ میدان قتل گاہیں بن گئے۔ دہلی میں تو کتابوں کے نام تک حکومت کی منظوری کے بعد ہی رکھے جاتے، حد یہ ہے کہ جیلانی بانو کا ناول ''عہدِ ستم''، ''ایوانِ غزل'' بن گیا... لیکن یہ حد نہیں تھی... حد ابھی دور تھی اور اس دن پار ہوئی جب نیشنل ہیرالڈ کی پیشانی پر سے پنڈت نہرو کا یہ نعرہ ہٹا دیا گیا۔

"Freedom is in peril; defend it with all your might"

معلوم نہیں یہ فیصلہ حکومت کے جبر کے ماتحت کیا گیا تھا یا ایم۔ سی۔ کا اپنا تھا۔ افسوسناک ہر دو صورت میں تھا لیکن دوسری صورت میں افسوسناک ترین۔

ایمرجنسی اور جے پرکاش نرائن کے ''مکمل انقلاب'' کے سیاق وسباق میں ''آزادی کو خطرہ'' کا فقرہ ان کے حق میں جاتا تھا اور پوری طاقت سے اس کا مقابلہ کرنے کی للکار کا نشانہ برطانوی حکومت کے بجائے کانگریس حکومت بن گئی تھی۔ حیرت کی بات تو یہ بھی تھی کہ ملک کی آزادی کے بعد ہنگامی حالات کے نفاذ تک پنڈت نہرو کے اس نعرے میں کسی کو کوئی

قابلِ اعتراض بات نظر نہ آئی لیکن پھر یہ نعرہ یکا یک نا قابلِ قبول بن گیا۔

وزیر اعلیٰ کی بے چارگی

لکھنؤ میں انڈو سویت کلچرل سوسائٹی یا انڈو سوویٹ فرینڈ شپ ایسوی ایشن کی کانفرنس ہوئی جس میں شرکت کے لیے روسی سفیر بھی آئے۔ کہا جاتا تھا کہ روسی سفیر اور وزیر اعلیٰ بہوگنا کے درمیان ایک خفیہ ملاقات ہوئی جس کو مرکزی حکومت نے شک وشبہ کی نظر سے دیکھا اور چند ہی دنوں بعد بہوگنا کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ خیر یہ کانگریس کا اندرونی معاملہ تھا اور کسی کو شکایت نہیں ہوسکتی لیکن قابلِ اعتراض بات یہ ضرور تھی کہ متبادل انتظام ہونے سے قبل جب قانونی طور سے وزیر اعلیٰ بہوگنا ہی تھے، محکمۂ اطلاعات کی ڈائرکٹر سرلا ساہنی نے اخباروں کو یہ ہدایت جاری کی کہ ان کا کوئی بیان نہ شائع کیا جائے۔ نوجیون کے چیف سب ایڈیٹر رمیش چندر جو اپنی جسامت کی وجہ سے پوری صحافتی برادری میں ''رمیش پہلوان'' کے نام سے جانے جاتے بہوگنا کے قریبی دوستوں میں تھے۔ بہوگنا نے استعفے اور اس کی منظوری کے درمیان کے دنوں کا بیشتر حصہ ان کے ساتھ پریس کلب میں گذارا۔ یوپی جرنلسٹ ایسوسی ایشن سے سرگرم طور پر وابستہ ہونے کے سبب میرا بھی پریس کلب آنا جانا لگا رہتا چنانچہ میرا بھی خاصا وقت ان کے ساتھ گذرا۔ بہوگنا کی یادداشت غضب کی تھی۔ وہ جس کو بھی ایک بار دیکھ لیتے نہ اس کی شکل بھولتے نہ نام۔

ایمرجنسی کے نفاذ کے اگلے دن محکمۂ اطلاعات سے اخباروں کے لیے ایک ہدایت نامہ جاری کیا گیا جس میں بتایا گیا تھا کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ مجھے جے پرکاش نرائن کی سیاست کبھی سمجھ میں نہیں آئی اور ویسے بھی ان کی مکمل انقلاب (Total Revolution) کی تحریک میں فرقہ پرست طاقتوں نے ان کے ہر نعرے کو اپنا کر عملی طور سے انھیں اپنا اسیر بنالیا تھا۔ ظاہر ہے میں اس تحریک سے متفق نہیں تھا لیکن میرے خیال میں اس کا مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ سیاسی اقدام تھا، ہنگامی حالات کا نفاذ نہیں۔ میرا خیال تھا (بدقسمتی سے ہوا بھی یہی) کہ اس فیصلے سے رجعت پسند طاقتیں مضبوط ہوں گی۔ جس دن یہ ہدایت نامہ جاری ہوا، میں شفٹ انچارج تھا اور میں نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہدایت نامے پر سرخی لگا کر صفحہ ۳ پر اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ لیکن معلوم نہیں کیسے یہ بات ضلع حکام تک پہنچ گئی اور نیشنل ہیرالڈ کے دفتر پر ضلع مجسٹریٹ اور پولیس نے چھاپا مارا اور اس ہدایت نامہ کی اشاعت روکنے کا ''حکم'' دیا۔ میں نے کہا

کہ میں نے ریاستی حکومت کا ہدایت نامہ چھاپا ہے، کیا ضلع مجسٹریٹ حکومت سے بالاتر ہے؟ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن انھوں نے دھمکی دی کہ اس کی اشاعت کی صورت میں وہ اخبار کی ایک کاپی بھی دفتر سے باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ میں نے اپنا رویہ نرم کرنے کے باوجود انھیں رولر سے نکالا ہوا صفحہ ۳ کا پروف پڑھنے اور اس پر دستخط کرنے پر مجبور کردیا، یہ پروف پڑھنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے، خاص طور سے غیر تربیت یافتہ آنکھوں کے لیے۔

میرے رویئے کی توصیف بھی ہوئی اور سخت نکتہ چینی بھی۔ میں نے ایک بجے رات کو ایم۔ سی۔ کو جگانے اور اخبار کی عدم تقسیم کے مقابلے میں ایک ایسے حکم نامے کی عدم اشاعت پر راضی ہونا مناسب سمجھا جو کہیں اور شائع نہ ہوا۔

کچھ ہی دنوں میں ایس۔ وی۔ ڈی۔ حکومت کے دوران انتظامیہ میں بچھائی ہوئی سرنگوں نے اپنا کام کرنا شروع کردیا۔ ان دنوں نس بندی کا پروگرام زور وشور سے چلایا جارہا تھا، خاص طور سے یوپی کے ان اضلاع میں جہاں مسلمانوں کی آبادی خاصی ہے۔ اس کی زبردست مزاحمت بھی ہوئی۔ ایک دن میں اور دلاور حسین صاحب قیصر باغ چوراہے پر پان کھانے گئے تو ہم نے ایک سپاہی کو دو تین سپاہیوں سے کہتے سنا، ''کٹوؤں کی وہ پٹائی کی ہے کہ کانگریس کو ووٹ کبھی نہ دیں گے''۔ مجھ سے سرکاری عملے میں فرقہ پرستی کی سرنگوں کے بچھائے جانے کی شکایت فرحت اللہ انصاری نے شاید یوں کی تھی کہ میرا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا جو جن سنگھ کے ساتھ سنیکت ودھایک دل کی حکومت میں شامل تھی، لیکن وہ خود سے بھی ناراض تھے کیوں کہ وہ ذہنی طور پر اگر کسی سیاسی پارٹی سے قریب تھے تو وہ کمیونسٹ پارٹی ہی تھی۔ وہ اپنی جوانی میں اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے شعلہ بار مقرر بھی رہ چکے تھے۔

پلیٹ فارم تو ملے

ایمرجینسی کے خاتمے اور لوک سبھا الکشن میں زبردست شکست کے بعد کانگریس کی نامقبولیت اس حد تک عروج پر تھی کہ اس کے لیڈروں کو اپنی بات کہنے کے لیے کوئی پلیٹ فارم تک نہیں مل رہا تھا اور کانگریس کی بات کوئی سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

ملک زادہ منظور احمد کسی کام سے دہلی گئے جہاں اتفاقاً ان کی ملاقات سابق مرکزی وزیر کلپ ناتھ رائے سے ہوگئی۔ رائے صاحب شبلی کالج میں ملک زادہ صاحب کے شاگرد رہ چکے

تھے۔ وہ انھیں اندرا گاندھی کے پاس لے گئے جنھوں نے ان سے صرف ایک سوال پوچھا۔

''مسلمانوں کا کیا رویہ ہے؟''

ملک زادہ نے کہا، ''مسلمانوں نے آپ کے خلاف ووٹ دیا تھا لیکن انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ آپ کے ساتھ ہیں''۔

''لیکن یہ مسلمان لیڈر جو کانگریس چھوڑ رہے ہیں؟''

''وہ لیڈر ہیں، لیکن عوام ان کے ساتھ نہیں''۔

بعد میں کلپ ناتھ رائے نے ملک زادہ سے درخواست کی کہ لکھنؤ میں کسی بڑے مشاعرے کا اہتمام کیجیے اور اس کا افتتاح یا اس کی صدارت اندرا گاندھی سے کرایئے۔ روپیہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

دہلی سے واپس آکر ملک زادہ، جو کپور مارکیٹ سے متصل حسنین مارکیٹ، میں رہتے تھے، صبح ہی صبح غریب خانے پر تشریف لائے اور انھوں نے ساری روداد سنائی تو میں نے کہا بھائی کانگریسی تو میں کبھی نہیں رہا لیکن جن سنگھ کی حمایت سے حکومت پر قابض جنتا پارٹی کے مقابلے میں کانگریسی ہوں۔ آپ بسم اللہ کر کے ڈول ڈالیے میں گلے گلے آپ کے ساتھ ہوں۔ اس جملے کا آخری حصہ لفظ بہ لفظ یہی تھا۔

لیکن معلوم نہیں کیوں ملک زادہ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ کر سکے۔ ممکن ہے، ہمت نہ پڑی ہو یا ان کے مزاج کی بے نیازی آڑے آ گئی ہو۔

دلیپ کمار رائے کے درشن

''ماہنامہ کتاب'' بند ہونے کے کچھ دنوں بعد مجھے مختلف زبانوں کے ادیبوں کے ایک ایسے وفد میں شامل کر لیا گیا جسے پندرہ دنوں تک شمالی ہندوستان کی تین چار ریاستوں کا دورہ کرنا تھا۔ من متھ ناتھ گپت اس وفد کے قائد اور ہندی اور اردو ادیبوں میں وشنو پربھاکر اور دیوندر اسر خاص طور سے قابلِ ذکر تھے۔ ہم لوگوں نے اتر پردیش، راجستھان اور پنجاب اور ہریانہ کے متعدد اہم مقامات کا دورہ کیا اور محکمہ فیلڈ پبلسٹی نے جس نے اس دورے کا اہتمام کیا تھا ایک بار بھی ہم سے ایمرجنسی کی حمایت کرنے کے لیے نہیں کہا بلکہ چنڈی گڑھ کے انفارمیشن افسر نے میرے اس احتجاج پر کہ سیمنار میں ایمرجنسی کی تعریف نہیں کروں گا کہا کہ نکتہ چینی پر پابندی ہے، تعریف

کرنا لازمی نہیں۔

اس دورے کے دوران دو قابلِ ذکر واقعات ہوئے۔ پہلا دلیپ کمار رائے اور ان کی شاگردہ (جو بہت پہلے ان کی بیوی بن چکی تھی) سے ملاقات اور دوسرا ہریانہ کے وزیر اعلیٰ بنسی لال سے جھگڑا۔ آیئے دلیپ کمار رائے سے ملاقات کا ذکر پہلے کرلیں کیوں کہ دوسرے واقعے کے سلسلے دراز ہیں۔

چنڈی گڑھ ہم لوگوں کے دورے کا آخری پڑاؤ تھا اور ہم لوگ پنجاب کے ممبران اسمبلی کے ہوسٹل میں ڈیڑھ دو دن مقیم رہے۔ اب اسے حسنِ اتفاق ہی کہیے کہ دیویندر اسر بھی میری طرح دلیپ کمار رائے کے عاشق ہیں اور ہم دونوں اس ہوسٹل میں قیام کے دوران بیشتر اوقات صرف دلیپ کمار رائے کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے تھے اور اس وقت بھی جب ہم دہلی واپس جانے کے لیے بس میں بیٹھے دلیپ کمار کا نام ہماری زبان پر تھا۔ ٹھیک اس وقت جب ہماری بس روانہ ہونے والی تھی، وفد کے کسی رکن نے ہماری گفتگو سن کر کہا کہ دلیپ کمار رائے تو اسی ہوسٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ہم حیران رہ گئے، ناقابلِ یقین حد تک حیران! یہ کیا تھا؟ ان کی آواز کے لیے ہمارا عشق یا ان کی شخصیت، ان کی آواز کا جادو جو ہمیں، یہ معلوم ہوئے بغیر کہ وہ یہاں موجود ہیں، اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ ہم دونوں بس سے تقریباً کود پڑے اور ہوسٹل کی طرف بھاگے لیکن بدقسمتی ہمارے ساتھ ساتھ تھی، بلکہ شاید ہمارے آگے آگے چل رہی تھی۔

معلوم ہوا ستر پچھتر سالہ رائے صاحب سو رہے ہیں۔ یہ بات ان کی اہلیہ نے بتائی۔ وائے ناکامی! ہم دونوں نے خود کو متعارف کرایا، دو ایسے افراد کے طور پر جنھیں ان کے فن اور آواز کا عاشق ہونے کا شرف حاصل ہے اور عرض کیا کہ بیدار ہو جانے پر ان سے فرما دیں کہ ہم مایوس اور دل شکستہ جا رہے ہیں۔

ابھی بس روانہ ہونے ہی والی تھی کہ ایک شخص دوڑا دوڑا آیا اور اس نے کہا رائے صاحب جاگ گئے ہیں اور ان لوگوں کو یاد کر رہے ہیں جو ابھی ان سے ملنے گئے تھے۔

تسلیم کہ یہ نہایت آرام دہ بس صرف ہم ادیبوں کے تصرف میں تھی، لیکن اس ''ہم'' میں دوسرے ادیب بھی شامل تھے جو جلد از جلد دہلی پہنچنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود ہم بس سے تقریباً کود کر دوڑتے ہوئے ہوسٹل کی پہلی منزل پر پہنچے اور ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

گورا چٹا رنگ، نورانی چہرہ، گھنی سفید داڑھی... ایک نور تھا جو مجسم ہو گیا تھا۔[1]

ہم نے خود کو متعارف کرایا، دو چار باتیں کیں، اثر نے کیمرہ نکالا، ان کے ملازم سے بٹن دبانے کی درخواست کی تو وہ بولے، "اب کیا تصویر کھینچ رہے ہو"۔

لیکن اس بڑھاپے میں بھی وہ ہزاروں نہیں لاکھوں سے زیادہ حسین تھے۔ یہی حال ان کی بیوی کا تھا... دونوں آواز، نغمہ اور لَے بن گئے تھے۔ ان کا پورا وجود موسیقی میں تبدیل ہو گیا تھا۔

"کوئی ہمدم نہ رہا، کوئی سہارا نہ رہا" اور "تو نے کیا کیا بتا تو سہی"... تو من شدی من تو شدم، من تن شدم تو جاں شدی...

اور ہم بوجھل دلوں کے ساتھ لوٹ آئے کہ یہ شاید پہلی اور آخری ملاقات تھی... شاید نہیں واقعتاً۔

ایک شہر تین گورنر

چنڈی گڑھ میں ملے تو ہم لوگ دو گورنروں اور ایک لیفٹیننٹ گورنر سے بھی لیکن دو وزرائے اعلیٰ سے ملاقاتیں یادگار بن گئیں۔ ذیل سنگھ سے ان کی قیام گاہ پر اور بنسی لال سے ان کے دفتر میں۔ ذیل سنگھ سے بات چیت ایک یک طرفہ عمل تھا، ہماری سماعت اور ان کی گفتگو کا؛ عمل ایک صورتیں دو۔

دوسری ملاقاتوں کی طرح ہریانہ کے وزیر اعلیٰ سے بھی ملاقات کا وقت طے تھا اور یہ کام حکومت ہند کے انفارمیشن بیورو کے متعلقہ افسر اور ریاستی حکومت کے محکمہ اطلاعات کے ڈائرکٹر کے ذریعہ ہوا تھا۔ ہم لوگ صبح ساڑھے نو بجے کے مقررہ وقت پر پہنچے تو بنسی لال موجود نہیں تھے۔ پندرہ منٹ بعد آئے۔ من متھ ناتھ گپت کھڑے ہو گئے تو ہم سب بھی کھڑے ہو گئے، میں بڑی مشکل سے خود کو آمادہ کر سکا، کیوں کہ بطور صحافی ہم اندرا گاندھی کی آمد پر بھی کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ گپت جی نے ہم سب کو متعارف کرایا۔ اسی دوران چائے بسکٹ آ گئے۔ بنسی لال نہایت بے دلی سے، نظریں سامنے کے اخبار پر گاڑے، گپت جی کو سن رہے تھے، معلوم نہیں سن بھی رہے تھے یا نہیں۔

۱۔ اس موقع کی تصویر کے لیے دیکھیے آخر کے صفحات۔

بنسی لال کے آفس کے کسی شخص نے ان کے لیے چائے بنادی تو ان کی انگلی پیالی کے کنڈے میں داخل ہو گئی۔ تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو بنسی لال نے کہا۔

''تعارف ہو گیا، ٹھیک ہے لیکن جلدی جلدی بتائیے آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟''

وشنو پربھاکر نے کہا'' ہم لوگ کچھ مانگنے نہیں صرف ملاقات کرنے آئے ہیں اور یہ بس Courtesy call ہے''۔

''سب یہی کہتے ہیں، لیکن آدھ گھنٹہ برباد کرنے کے بعد کہتے ہیں بنسی لال جی یہ چھوٹا سا کام ہے،'' انھوں نے چٹکی بجائی اور سلسلۂ کلام جاری رکھا'' جلدی جلدی بتاؤ کیا چاہتے ہو۔''

میں کھڑا ہو گیا اور میں نے کہا:

Mr. Bansi Lal, I wonder you have ever met a person who has nothing to ask for.

بنسی لال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میں نے اپنا جملہ مکمل کر کے دروازہ کا رخ کیا، میرے بعد وشنو پربھاکر اور سب سے آخر میں گپت جی وزیر اعلیٰ کے کمرے سے نکلے۔

انقلابی من متھ ناتھ گپت اس سارے واقعے اور خاص طور سے واک آؤٹ سے خوش نہیں تھے... عام طور پر بڑھاپے کے لیے وہ سب بھی قابل قبول ہو جاتا ہے جس کے خلاف لڑتے ہوئے کبھی جان کی بازی لگا دی گئی ہو۔

میں نے اور وشنو پربھاکر نے طے کیا کہ اپنے اپنے گھر جا کر وزیر اعظم اندرا گاندھی کو خط لکھیں گے کہ آپ نے کس اجڈ کو وزیر اعلیٰ بنا رکھا ہے اور ہم نے خطوط لکھ کے ایک دوسرے کو مطلع بھی کیا۔ وشنو جی کا خط میرے پاس شاید اب تک محفوظ ہے۔ نیشنل ہیرالڈ کے پتے پر ان کا خط جس دن ملا اسی دن تھوڑی دیر بعد ٹیلی پرنٹر سے خبر آئی۔

''بنسی لال وزیر دفاع بنا دیے گئے۔''

میں نے سوچا اب ملٹری پولیس ہمیں کسی وقت بھی گرفتار کر سکتی ہے اور وشنو پربھاکر کو یہی لکھ بھی دیا۔

لیکن بنسی لال بوفورس سے مچھر کا شکار نہیں کرتے تھے۔

میں نے اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔

پھر جرنلسٹ فیڈریشن کی کانفرنس حیدرآباد میں ہوئی تو کانفرنس کے دوسرے دن رات کا کھانا ریاستی گورنر کے یہاں تھا اور فتح میدان کے ہال سے، جہاں کانفرنس ہوئی تھی، گورنمنٹ ہاؤس بمشکل ایک کلومیٹر رہا ہوگا۔ موسم نہایت خوشگوار تھا چنانچہ ہم چار چھے صحافی خراماں خراماں گورنمنٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہوئے۔ پردیپ ماتھر، جواُن دنوں ٹریبیون (Tribune) میں تھے، میرے ساتھ تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ میں نے وہ واقعہ جس کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا تفصیل کے ساتھ انھیں سنا دیا لیکن ان کے اس وعدے کے بعد کہ وہ میرے نام کے حوالے کے ساتھ اسے کہیں شائع نہیں کریں گے۔

جنتا پارٹی کی حکومت کے دوران ان دنوں میں جب چرن سنگھ بنسی لال کو طرح طرح سے ذلیل اور پریشان کر رہے تھے روزنامہ ٹریبیون "Tribune" میں صفحہ اوّل پر ایک چار کالمہ خبر ۶ ستمبر ۱۹۷۷ء کو شائع ہوئی جس میں میرے حوالے سے واقعات کی کڑیوں سے کڑیاں بٹھائی گئی تھیں۔ اس کی اطلاع مجھے دس پندرہ دن بعد اس خبر کے تراشے سے ملی جو پردیپ ماتھر نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ خبر انھیں کی لکھی ہوئی تھی۔

مجھے بے حد تکلیف ہوئی، خاص طور سے یوں کہ خبر ایک ایسے وقت شائع ہوئی تھی جب چرن سنگھ نے بنسی لال کو مشکلوں میں ڈال رکھا تھا۔ میں نے پی۔ سی۔ ٹنڈن سے، جو کچھ ہی دنوں قبل غالباً ہندوستان ٹائمس چھوڑ کر بطور ریزیڈنٹ ایڈیٹر نیشنل ہیرالڈ کے لکھنؤ ایڈیشن سے متعلق ہوئے تھے، اس کا ذکر کیا اور کہا کہ میں بنسی لال سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ ٹنڈن بنسی لال کے خاصے قریب تھے۔

انھوں نے کہا آپ معافی مانگنا چاہتے ہیں تو بخوشی مانگ لیں لیکن پہلے ایک واقعہ بھی سن لیں۔ چرن سنگھ کی سالگرہ پر دہلی میں کسانوں کی زبردست ریلی ہوئی تو بنسی لال کے بہی خواہوں نے ان سے کہا کہ اس موقع پر ایک گلدستہ آپ بھی بھیج دیں، اندرا گاندھی بھی بھیج رہی ہیں۔ لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ احباب نے جب بہت اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ سوچ کر کل بتاؤں گا۔ اگلے دن ان کے احباب بڑی امیدوں کے ساتھ ان سے ملنے گئے تو انھوں نے کہا، ''میں گلدستہ ضرور بھیجوں گا، لیکن ابھی نہیں، اس کی مٹی پر... اب بھی آپ سمجھتے ہیں بنسی لال معاف کر دیں گے تو معافی نامہ ضرور بھیج دیجیے۔''

''میں صرف معافی مانگنا چاہتا ہوں، وہ معاف کریں نہ کریں ان کی مرضی۔''

''جیسا آپ چاہیں،'' پی۔سی۔ٹنڈن نے بات ختم کردی۔

میں نے بنسی لال کو لکھا:

Respected Bansilalji,
I am sorry for the story published in the Tribune regarding the incident that had taken palace in your Chandigarh office on...... (Date), but I have no hand in its publication.
However, I hope, you will appreciate that the facts mentioned in the story are not wrong.[1]

چار پانچ دن بعد بنسی لال جی کا مختصر سا خط موصول ہوا۔

Dear Mr. Abid suhail,
Thanks for your letter; I was touched by the sentiments expressed by you.

میں نے پی۔سی۔ٹنڈن کو خط دکھایا تو انھوں نے کہا حیرت ہے۔مبارک ہو۔اس خط کو محفوظ رکھیے گا۔لیکن افسوس میں اسے محفوظ نہ رکھ سکا۔

ایسی بھی کیا اصول پرستی

مَیں ۱۹۸۵ء میں بہ وجوہ نیشنل ہیرالڈ سے مستعفی ہوگیا۔اس وقت میں نیوز ایڈیٹر تھا۔لیکن ہیرالڈ کے حالات کے سبب نصرت پبلشرز کا سلسلہ کافی پہلے شروع ہوگیا تھا۔سال ڈیڑھ سال بعد ایک دن مجھے بخار تھا اس لیے انیس دوکان چلی گئیں۔وہاں سے واپس آ کر انھوں نے مجھے بتایا کہ مکند صاحب آئے تھے۔انھوں نے کہا ہے کہ پائنیر کے ایڈوائزر گھوش صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں،کل دن میں بارہ بجے۔

میں نے کہا طبیعت ٹھیک ہوگئی تو ہو آؤں گا لیکن بخار نہ ٹوٹا۔مجھے پائنیر کا فون نمبر معلوم تھا نہ میرے یہاں فون کہ انھیں مطلع کردیتا۔اگلے دن میں نہ پہنچا تو مکند مجھے بلانے نصرت پبلشرز آئے اور پھر گھر۔میں نے دو دن سے شیو بھی نہیں کیا تھا۔لیکن ان کے اصرار پر میں نے کہا ڈھائی بجے تک پہنچ جاؤں گا۔

میں پائنیر پہنچا تو سب سے پہلے ملاقات اے۔کے۔ورما سے ہوئی۔انھوں نے مجھے

۱۔ اس خط کی نقل میرے پاس موجود نہیں ہے لیکن نفسِ مضمون یہی تھا اور یہی حال اس کے جواب کا ہے۔

ہیرالڈ میں کام سکھایا تھا۔ وہ مجھے سنہا صاحب کے پاس لے گئے جو اُن دنوں ایڈیٹر تھے اور پھر یہ دونوں گھوش صاحب کے پاس، جنھوں نے کہا کہ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ آپ بطور ریزیڈنٹ ایڈیٹر بنارس ایڈیشن کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

میں نے اس طرح کی پیش کش کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا اور ابھی مصائب سے بھری زندگی سے نجات اور حالات کے بہتر ہونے کے امکانات کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ چپراسی نے آ کر سنہا جی سے کہا کہ ششر[1] جی آ گئے ہیں اور سہیل صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔ اب یہ تینوں مجھے لے کر ششر گپتا کے آفس کی طرف چلے۔ اس وقت ان کے دفتر کا زینہ عمارت کے دوسری طرف پریس کے اندر سے تھا۔ دفتر کے باہر ایک صوفہ رکھا تھا وہاں مجھے بٹھا کر وہ تینوں اندر چلے گئے۔ مشکل سے دو تین منٹ کے بعد مجھے بلا لیا گیا۔

رسمی تعارف ہو رہا تھا کہ چائے بسکٹ آ گئے اور اسی دوران ششر گپتا نے مجھ سے کہا:

"Suhail sahib, unfortunately we have introduced computer setting whereas you had handsetting in the Herald. How will this difference effect the working of the editorial department?"

مجھے اس مسئلے پر سوچنے کی کبھی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ فوری طور پر جو بات سمجھ میں آئی کہہ دی:

"Although the computer setting is very fast, it takes much time to carry out corrections. Hence, the copy has to be sent to the press quick and as clean as possible."

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جواب کی پسندیدگی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے۔

"What about the salary?"
"That you have to decide. I was getting ......when I quit the Herald. But I would need a place to stay"
"you want a whole house?"
"No, just a one room set."
"That's all right"

۱۔ پائنیر کے مالک اور مینیجنگ ایڈیٹر۔

میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور ہم چاروں باہر آ گئے۔ سنہا صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، پھر انھوں نے بنارس کے بارے میں بات چیت شروع کی۔ فائل منگا کر اخبار دکھایا (بہت خراب تھا) اور کہا سہیل صاحب آپ ایسا کیجیے کہ وہاں کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی پردیپ ماتھر کو Dismiss کر دیجیے۔

"کیا پردیپ ماتھر وہاں ہیں؟"

"جی ہاں، اسی نے سب گڑبڑ کر رکھا ہے۔"

"لیکن جاتے ہی...؟ میں ورکنگ جرنلسٹ یونین سے برسوں سرگرم طور پر وابستہ رہا ہوں، "But I will definitely sack him if he is found wanting"

انھوں نے چپراسی سے کہا کہ ورما صاحب کو بلا لاؤ اور جیسے ہی ورما آئے انھوں نے کہا

"بھائی سہیل صاحب کو سمجھائیے۔ یہ ان کا کام دیکھنے کے بعد..."

"سہیل صاحب ہم لوگ کام دیکھ چکے ہیں،" ورما نے کہا

"تو پھر آپ اسے Sack کیوں نہیں کر دیتے؟"

خاموشی

ورما نے پھر کہا:

"Suhail sahib why, don't you appreciate our offer, you know once a resident editor, always a resident editor."

میں نے ایک ہفتہ سوچنے کی مہلت مانگی اور پھر لوٹ کے نہیں گیا۔ مکند کو اس کا بہت افسوس تھا۔ وہ ایک بار مجھے راضی کرنے آیا بھی، اپنی طرف سے۔ وہ مجھے ریزیڈنٹ ایڈیٹر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔

وہ ہمارے بہت سخت دن تھے۔ ہیرالڈ سے ایک پیسہ نہیں ملا تھا۔

نشہ بہ قدر ظرف عطا کر...

ہیرالڈ چھوڑنے کے نو سال بعد: ارن سالومن جو میرے ساتھ نیشنل ہیرالڈ میں مقابلتاً جونیر پوزیشن میں کام کر چکا تھا، دہلی ہوتے ہوئے پائنیر کا ریزیڈنٹ ایڈیٹر بن کے لکھنؤ آ گیا۔ ایک دن پائنیر سے فون آیا... سالومن صاحب بات کریں گے۔ پھر سالومن کی آواز آئی "سہیل صاحب"..." بول

رہا ہوں"... "کیا آپ کل چار بجے شام میں تشریف لے آئیں گے"..."کل؟"..."کوئی دقت ہو تو میں آ جاؤں!"۔ "نہیں میں آ جاؤں گا"... "Sure"..."Sure"

میں پہنچا تو سالومن نے کھڑے ہو کر میرا خیر مقدم کیا۔ ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے، ان کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، "The editor" اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ان سے کہا، "My guru"۔ انھوں نے ہاتھ ملایا۔

"کانپور کی حالت خراب ہے، سہیل صاحب دیکھ لیں گے۔"

"As you like"

لیجیے میں پائنیر پہنچ گیا۔ چھے ہزار روپے تنخواہ! معاہدہ پر ملازمت میں سالانہ چھٹی نہیں دی جاتی لیکن ایک ماہ کی چھٹی، پندرہ دن کی اتفاقی چھٹی، بارہ دن کی علالت کی چھٹی، ہفتہ کی چھٹی اس کے علاوہ۔

چھے ماہ بعد سالومن نے کہا، "سہیل صاحب آپ لکھنؤ دیکھ لیجیے۔" میں لکھنؤ کی خبریں دیکھنے لگا۔

کچھ دنوں بعد اتل چھٹی پر گئے، لوٹ کے آئے تو ان کے کمرے پر اُدے سنہا قابض تھے۔ بعد میں وہ ریزیڈینٹ ایڈیٹر بن گئے۔ ایک دن میری غیر حاضری میں ڈی۔ پی۔ اے۔ ہال کے ایک جلسے میں میری انگریزی کی تقریر سے متعلق خبر اور دو کالمہ تصویر صفحہ اوّل پر دی جانے والی تھی کہ میں اپنے چشمے کی تلاش میں وہاں پہنچ گیا۔ چشمہ بھی مل گیا اور خبر اور تصویر چھاپنے سے چیف سب ایڈیٹر رنجن بسو کو روکنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔

میں نے کہا لوگ کہیں گے جس اخبار میں کام کرتے ہیں اسی میں اپنی تصویر و تقریر چھاپ لی۔

یہ ایم۔ سی۔ کا فیض تھا۔ ہیرالڈ میں پچیس سال کام کیا۔ ایک بار اپنا نام نہ چھاپا، بائی لائن کی بات دوسری ہے۔

لیکن میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۵ء کو اگلے دن یعنی یکم جنوری ۱۹۹۶ء کے اخبار میں صفحۂ اوّل پر اپنی نظم چھاپنے سے سالومن کو نہ روک سکا۔

ایک دن زرّین نے ایک اشتہار دکھایا... گرافک ڈزائننگ کی ٹریننگ کا... میں نے کہا کل بتاؤں گا۔ پائنیر کے نہایت جونیر سب ایڈیٹر اور کمپیوٹر کے ماہر وجے پرکاش سے، جو اَب

لکھنؤ ایڈیشن کے ریزیڈینٹ ایڈیٹر ہیں، اس کورس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا بہت اچھا ہے، ضرور کرا دیجیے۔

میں نے گیارہ بجے رات کو گھر واپس آ کر زرّین سے Yes کہا اور یہ بھی کہ پائنیئر سے تعلق صرف اسی کام کے لیے قائم ہوا ہے، ورنہ تمھاری فیس کہاں سے آتی۔

اٹل بہاری واجپئی

ان دنوں میری مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ گیارہ بجے دن میں نصرت پبلشرز پہنچ جاتا، مہینے میں پانچ چھے دن ٹی۔ وی سے نشر کی جانے والی خبریں دیکھتا، شام کو ۵ بجے پائنیئر میں ہوتا، وہاں سے لوٹ کر صحافت کا اداریہ لکھتا، مہینے میں کم از کم دو مضامین بمبئی کے ''انقلاب'' کے لیے بھی لکھ دیتا اور ضرورت پڑ جاتی تو ریڈیو سے ایک آدھ کہانی نشر کر دیتا، کہانی کیا اس کا خاکہ۔

پھر چندن مترا پائنیئر کے ایڈیٹر بن گئے۔ انھوں نے لکھنؤ کے اسٹاف کی میٹنگ کی۔ اخبار کو بہتر بنانے کے لیے مشورے مانگے۔ میں نے بھی ایک مشورہ دیا۔ انگریزی کے علاوہ ہندی اور اردو کی کتابوں پر بھی تبصرے چھاپے جائیں۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔

اٹل بہاری واجپئی نے وزیر اعظم کی گدّی سنبھالی، دہلی کے پائنیئر کی شاہ سرخی تھی "VAJPAYEE"۔ اب کیا کیا جائے۔ لکھنؤ کی سرخی اس سے چھوٹے ٹائپ میں نہیں ہونی چاہیے۔

میں نے مشورہ دیا ATAL بہتر رہے گا۔ سرخی پہلے صفحے کے اوپر کے آدھے حصّے کو گھیر لے گی۔

بات دہلی تک پہنچ گئی۔ مجھے رپورٹروں کی کاپی سب کرنے کے لیے ملنی بند ہوگئی۔ دوسرے سال کا معاہدہ ختم ہوگیا تو اُدے سنہا توسیع کے لیے بار بار دہلی خط لکھتے رہے، کوئی جواب نہ آتا۔ میں بضد رہا کہ اب مجھے جانے دیجیے، مفت کی روٹیاں توڑتے مجھے اچھا نہیں لگتا۔ سنہا صاحب نے جانے نہ دیا۔ لڑائی بھارتیہ جنتا پارٹی کے دو حامیوں کے درمیان تھی۔ ایک جو اُس سے نظریاتی طور پر طویل عرصے سے وابستہ تھا اور دوسرا وہ جو خود کو سابق مارکسی کمیونسٹ کہتا۔

میں نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ اُدے سنہا نے آخر تنگ آ کر دہلی لکھا کہ معاہدہ میں توسیع نہیں کر رہے ہیں تو انھیں تین مہینے کی مدت دیجیے تا کہ وہ کوئی اور کام تلاش کر سکیں۔ منظوری آ گئی

اور میں تین ساڑھے تین ماہ بعد ایک ایسی ملازمت سے آزاد ہو گیا جس میں کئی مہینوں سے کوئی کام کرنے کے لیے نہیں دیا جا رہا تھا۔ اُدے سنہا نظریاتی طور پر میرے سخت مخالف تھے لیکن وہ نظریہ سے وابستہ لوگوں کی قدر کرتے تھے۔

مخدومؔ کے دیس میں

حیدر آباد کے لوگوں کی مہمان نوازی اور ادب دوستی کا بیان مشکل ہے۔ وہاں گیا تو تھا ورکنگ جرنلسٹس فیڈریشن کی کانفرنس میں شرکت کرنے لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ اقبال متین سے پہلے ہی دن ملاقات نہ کرتا۔ انھیں مطلع جان بوجھ کر نہیں کیا تھا کہ دو ایسے لوگوں کی غیر متوقع ملاقات میں جو ایک دوسرے کو جانتے تو ہوں لیکن کبھی ملے نہ ہوں جو مزا ہے وہ جاتا نہ رہے۔ پوچھتا پاچھتا ان کے گھر پہنچا۔ راستے میں ایک پتلی سی گلی سے بھی گذر ہوا جہاں ایک گھر کی چنبیلی کی شاخوں نے اوپر سے دوسرے مکان کی دیوار کو ڈھک لیا تھا۔ پھولوں کی چادر سر پے تنی تھی۔ کسی سے محلّے کا نام پوچھا، اس نے کہا '' چنبیلی کا منڈوا۔''

ہائے، کیا دو بدن پیار کی آگ میں یہیں جلے تھے؟ جی چاہا، مخدوم سے پوچھوں، لیکن مخدوم کہاں؟

دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
اِک چنبیلی کے منڈوے تلے

اقبال متین کے یہاں پہنچا تو معلوم ہوا بچّوں کو لے کر پکچر دیکھنے گئے ہیں۔ پکچر ہاؤس پاس ہی میں تھا۔ میں نے ایک دربان کو ان کا حلیہ بتایا اور یہ بھی کہ کئی بچے ساتھ میں ہیں۔ وہ مشکل سے دو تین منٹ میں انھیں ساتھ لے آیا۔ میں تو خیر '' کتاب'' میں ان کی تصویر چھاپ چکا تھا لیکن اقبال متین نے کیسے پہچانا یہ اب بھی نہیں جانتا۔ اس نے بچّوں کو سمجھایا کہ تم پکچر دیکھو، میں گھر جاتا ہوں اور مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ ایسی خاطر مدارات کی کہ اب تک نہیں بھولا۔

کانفرنس تو دو دن میں ختم ہو گئی، لیکن بعد کے دو دن زیادہ مصروفیت کے تھے۔ یہیں سعید بن محمد نقش سے بھی ملاقات ہوئی۔ آبنوسی رنگ، دہرا بدن لیکن موقلم ہاتھ میں ہو تو حسن ہی حسن۔ مُصر رہتے کہ دنیا کا کونسا خیال ہے جو موقلم سے ادا نہیں ہو سکتا۔ مخدومؔ نے ایک بار کہا تھا ذرا میرؔ کا یہ شعر رنگوں میں ڈھال دو:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

بولے،''اس وقت موقلم ہے نہ رنگ نہ کینوس، لیکن اس میں کیا مشکل ہے... پہلے ''اُس'' بنایا، پھر اُس کا لب اور اس میں گلاب کی تازگی شامل کر دی، ہو گیا شعر''

مخدوم نے کہا ٹھیک ہے، سب کچھ تو شامل کر دو گے لیکن ''سی'' کے لیے رنگ کہاں سے لاؤ گے؟

شاذ تمکنت، مغنی تبسم اور اقبال متین کی ایما پر اندرادھن راج گیر صاحبہ نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا، دو تین ادیب اور بھی تھے۔ باہر کے پھاٹک سے کوئی دس منٹ کار پر سفر کر کے کوٹھی میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ کوٹھی تو خیر تھی ہی شاندار، مقامِ حیرت تھا اندرانی کا دیدار، گفتگو کا انداز، تہذیب، سلیقہ، لباس، غرض ''جا ایں جاست'' کا محل تھا۔ معلوم ہوا کہ شہر کا بہترین باورچی دستیاب نہ ہو سکا اس لیے دعوت شراب اور فواکہات تک محدود کر دی گئی ہے۔ لوگوں نے خوب خوب جام لنڈھائے، میں نے بھی ہر پھل چکھا اور کمیونزم اور جاگیرداری پر میزبان سے دوبارہ الٹی سیدھی باتیں بھی کر دیں، جب کہ مخدوم محی الدین بھی اس دربار میں اپنا تلنگانہ باہر چھوڑ کر آتے تھے اور ان کے شوہر شتیند رشرما[1] کو جو تیلگو کے مایۂ ناز شاعر تھے، اس محل میں مستقلاً داخل ہونے کی اجازت اسی شرط پر ملی تھی کہ وہ سرکاری ملازمت (اور وہ ایک اعلیٰ افسر تھے) سے استعفیٰ دے دیں۔ اندرانی کا ''نصف کمتر'' بھی کسی اور کا ملازم نہیں ہو سکتا تھا، چاہے یہ ''اور'' حکومت ہند ہی کیوں نہ ہو۔

اندرادھن راج گیر کی ہلکی سی چھب فہمیدہ ریاض میں نظر آئی، جب میں نے دوردرشن کے لیے ان کا انٹرویو لیا اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہر چیز، جی ہاں ہر چیز، حسین نظر آتی ہے۔

پھر یاروں نے ایک ہوٹل میں شاندار پارٹی دی۔ ریپشن کے بعد کاؤنٹر پر ایک نہایت حسین و جمیل نوجوان بیٹھا تھا۔ اقبال متین نے کان میں پوچھا، ''انھیں جانتے ہو؟'' میں نے کہا، ''پہچاننے کی کوشش تو کر رہا ہوں''۔ ''ارے انھیں نہیں جانتے، یہ فاروق شیخ ہیں''... ''ہائیں فاروق شیخ؟'' لو کا ایک تھپیڑا چہرے پر لگا۔ پھر تعارف ہوا، پھر معلوم ہوا کہ ''گرم ہوا'' کے بعد کوئی کام ہی

۱۔ افسوس شتیند رشرما اب ہم میں نہیں۔

نہیں ملا... یہاں نہ دیکھتا تو سوچتا کہ ایکٹنگ کرتے کرتے ممکن ہے تانگہ کھوکھراپار ہنکادیا ہو۔

ان دنوں گھر ہی سے نصرت پبلشرز کا بھی چھوٹا سا سلسلہ تھا۔ روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر۔ فہرست کتب لے گیا تھا۔ ایک کتب فروش کے یہاں گیا، کچھ کتابوں کا انھوں نے آرڈر دیا، چائے پلائی، جب بھی اٹھنا چاہا کسی نہ کسی بہانے روک لیا کہ اتنے میں ناشتہ دان آ گیا۔ بولے، ''میری بیوی حلیم بہت اچھا پکاتی ہیں۔'' میں حیران، پریشان۔ یہ تک نہ جانتا تھا کہ یہ کوئی کھانے کی چیز ہے، لیکن بعد میں محاورتاً نہیں، سچ مچ انگلیاں چاٹتا رہا۔ پاس میں چار مینار تھا، سوچا یہ بھی دیکھ لوں۔ پہنچا ہی تھا کہ بارش آ گئی، دھواں دھار۔ اسی میں پناہ لی۔ ایک بزرگ بھی میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ دو ایک جملے ہم دونوں نے موسم کی بے کیفی پر کہے کہ شاید دونوں کو کہیں جانا تھا، پھر باتیں ہونے لگیں۔ انھوں نے پرانے حیدرآباد کی تعریف شروع کر دی۔ میں نے سوچا کوئی سابق سالار جنگ ہوں گے، اپنا لال جھنڈا جیب میں ڈالے سنتا رہا۔ پھر پانی رک گیا۔ ہم دونوں رخصت ہوتے وقت ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ ان کا نام تھا رام نرائن۔ ٹوپی لگائے تھے، شیروانی پہنے تھے۔

ریڈیو پر ایک پروگرام ہوا۔ ان دنوں پروگرام ایگزیکیٹو متین سروش تھے۔ لگ بھگ چھتیس سال بعد دیکھا تھا۔ صورت کچھ کچھ یاد تھی۔ اشارتاً، بس اشارتاً، بھوپال کی یاد دلائی۔ مسکرائے لیکن یہ نہ بتا کے دیا کہ وہاں حشمت پھوپا کے یہاں کس سلسلے سے رہتے تھے۔

لکھنؤ کے مہمان کے ''اعزاز'' میں دو ادبی جلسے ہوئے۔ کئی لوگ ''سب سے چھوٹا غم'' خرید کے لائے اور دستخط کرالے گئے۔ اقبال متین اور دوسرے بضد تھے کہ دو دن رک جائیں، کیسۂ زر پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں رتی تڑا کے بھاگا تو پھلوں کا اتنا بڑا جھوا ساتھ کر دیا گیا کہ دو دن کے سفر میں لکھنؤ کے کئی صحافیوں نے پھل خوب خوب کھائے پھر بھی آدھے بچ رہے۔

تیری یادوں میں گلوں کی خوشبو

بنّے بھائی (سجاد ظہیر) نے روس کے دورے سے واپسی کے بعد ایک عبرت ناک واقعہ سنایا۔ وہ تاشقند کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری سے ملاقات کرنے ان کے دفتر گئے تو معلوم ہوا جمعہ کی نماز پڑھنے گئے ہوئے ہیں۔ انھیں سخت حیرت ہوئی۔ ہندوستان میں تو ان دنوں کمیونسٹ عام طور سے خود کو مذہب بیزار ثابت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ خیر، پارٹی کے سکریٹری واپس

آئے تو بنے بھائی کے استفسار کے جواب میں انھوں نے کہا، ''کامریڈ Mass Contact (عوامی رابطہ) کے لیے مسجد سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟''

عام طور سے ہم ہندوستانی کمیونسٹوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ بنگال اور کیرالہ میں کمیونسٹوں کی عوامی مقبولیت میں درگا پوجا اور اونم کے تہواروں میں ان کی سرگرم شرکت کا بھی بڑا ہاتھ تھا اور انگلینڈ میں ڈین آف کنٹربری Red Dean کے نام سے جانے جاتے تھے۔

....

ایک دن بنے بھائی حضرت گنج میں جینز میں نظر آئے تو منظر سلیم نے پوچھا، ''بنے بھائی آپ اور جینز میں؟''

''کمیونسٹوں کو ہمیشہ وقت کے ساتھ رہنا چاہیے۔'' انھوں نے جواب دیا۔

اس سلسلے میں کوئی اور بات اس وقت نہیں ہوئی لیکن میں نے جو اس وقت موجود تھا یہ ضرور سوچا کہ ہندوستانی کمیونسٹ وقت سے پیچھے جانے کیسے رہ گئے۔

....

ایمرجنسی کے دوران کسی دن میں اپنے ٹرانسسٹر پر کوئی عمدہ پروگرام تلاش کر رہا تھا۔ اتفاق سے فراق گورکھپوری کی آواز سنائی دی۔ کوئی صاحب ان کا انٹرویو لے رہے تھے۔ فراق کی آواز ابھری۔

''سجاد ظہیر سے زیادہ پرکشش شخصیت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔''

''پنڈت نہرو سے بھی زیادہ پرکشش تھے؟''

فراق نے ایک لمحہ، بس ایک لمحے، کے بعد جواب دیا۔

''پنڈت نہرو سے بھی زیادہ۔''

....

بنے بھائی کا پوسٹ کارڈ آیا۔ میں ''ماہنامہ کتاب'' کی مصروفیات میں جواب نہ دے سکا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ تاخیر کے لیے معذرت کن لفظوں میں ادا کروں کہ ان کا دوسرا پوسٹ کارڈ آ گیا۔ بے حد مختصر سی تحریر کے ساتھ۔

''پیارے سہیل

محبت وہ نازک پودا ہے جو مسلسل آبیاری چاہتا ہے۔

..........کو لکھنؤ پہنچ رہا ہوں۔

تمھارا بنّے''

(افسوس یہ دونوں خطوط اب میرے پاس نہیں)

اگلے ہفتے کافی ہاؤس میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے میری کوتاہی کا ذکر تک نہ کیا۔

پہلی معشوقہ

فیض ۱۹۳۶ء کے بعد پہلی بار لکھنؤ آئے اور انھوں نے یو پی اردو اکادمی کی سابقہ عمارت کے ہال میں اپنا کلام سنایا۔ ہال بہت پہلے سے سامعین سے چھلک رہا تھا، اسی دوران ایک دبلی پتلی خاتون داخل ہوئیں اور سامعین کو الانگتے پھلانگتے اسٹیج کے بالکل سامنے جگہ بنا کر بیٹھ گئیں لیکن بیٹھنے سے قبل ہی انھوں نے ہاتھ بڑھایا تو فیض نے دونوں ہاتھوں سے ان سے مصافحہ کیا۔ فیض نے کلام سنانا شروع کیا اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ بجلی چلی گئی۔ ان خاتون نے اپنے وینیٹی بیگ سے وہ چینی پنکھا نکالا جو لپیٹ کر ذرا سا رہ جاتا ہے اور فیض کو جھلنے لگیں اور یہ سلسلہ اس سارے دوران جاری رہا جب تک بجلی غائب رہی، کوئی دس منٹ۔

فیض کو دیکھنے میں ان کی محویت اور ایک لمحے کے لیے بھی ہاتھ کو روکے بغیر اتنی دیر تک ان کے پنکھا جھلتے رہنے نے میرے اندر کے صحافی کو بیدار کر دیا اور میں نے سوچا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد ان خاتون سے ملاقات کر کے انھیں کریدنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن پروگرام ختم ہوتے ہی وہ جانے کدھر سے نکل گئیں اور میں ان سے ملاقات نہ کر سکا۔

تقریباً سال ڈیڑھ سال بعد امین آباد میں سالومن نام کی دواؤں کی دوکان کے پاس ایک خاتون پر مجھے شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو یہ وہی ہیں۔ میں نے ان کے پاس پہنچ کر، ''معاف فرمائیے'' کہتے ہوئے ان سے بات چیت شروع کی۔

میں نے پوچھا، ''آپ کو فیض کے جلسے میں دیکھا تھا۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے آپ سے مصافحہ کیا تھا۔ وہ آپ کو کیسے جانتے ہیں؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

''تم فیض کو کیسے جانتے ہو؟''

میں نے کہا ''فیض کو کون نہیں جانتا، پھر مجھے Literature سے تھوڑی سی دلچسپی ہے۔''

''اچھا، اچھا'' انھوں نے کہا، ''تم کام کیا کرتے ہو؟''
''میں نیشنل ہیرالڈ میں ہوں،'' میں نے تفصیلات نہیں بتائیں۔
''نیشنل ہیرالڈ میں، وہاں تو میں کبھی کبھی جاتی ہوں... وہاں گلاب رائے سریواستوا ہیں۔ میرے دو ایک خط بھی تمھارے اخبار میں چھپے ہیں۔''
''جی ہاں، جی ہاں،'' میں نے اس طرح کہا جیسے ان کے خطوط کی اشاعت مجھے یاد ہو اور پھر اپنا سوال دوسری طرح سے دہرایا۔
''آپ فیض کو شاید بہت دنوں سے جانتی ہیں؟''
''بہت دنوں سے... امرتسر سے۔ اس کا مکان میرے گھر کے سامنے تھا... چھریرے بدن کا لڑکا تھا۔ بہت اچھا لگتا لیکن میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اتنا بڑا شاعر بن جائے گا۔''
یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئیں، اداس ہوگئیں۔ پھر ایک دم بولیں۔
''میں اس کی پہلی معشوقہ ہوں۔''
انھوں نے محبوبہ نہیں، معشوقہ ہی کہا تھا۔
میں ان کے مُنہ سے کچھ تفصیلات کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن وہ خاموش تھیں۔ اپنے آپ میں گم، پھر انھوں نے کہا۔
''اس کے گھر کی طرف میرے مکان کی کھڑکی تھی۔ میں اسی کھڑکی سے اسے دیکھتی تھی اور وہ مجھے... کبھی کبھی ہم لوگ اشاروں سے باتیں بھی کرتے، لیکن پھر الگ ہوگئے۔ اس میں اس کی کوئی خطا نہ تھی۔ میری بہن بہت ظالم تھی۔ اس نے کھڑکی کے پٹوں کے اوپر تختے لگا کر کیلیں جڑ دی تھیں۔'' ایسا لگتا تھا آواز دور سے آ رہی ہو۔
وہ یکا یک خاموش ہوگئیں، جیسے اب انھیں کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔ بلکہ وہ شاید کچھ کہنے کی حالت میں نہیں رہ گئی تھیں۔
میں نے پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟
انھوں نے میری طرف دیکھا، ایک منٹ خاموش رہیں، پھر بولیں
''مس سنگھ''
''آپ کہاں رہتی ہیں؟''
"Women's Home" میں۔ تم جانتے ہو، چار باغ میں ہے۔''

"Labour Court کے پاس؟"

"ہاں، پاس ہی کہو... کبھی آنا۔ میری بہن بھی ساتھ ہی رہتی ہے"

اور پھر کچھ کہے بغیر، کسی سلام دعا کے بغیر غائب ہو گئیں۔

میں نے سوچا تھا کہ ان سے ملاقات کر کے تفصیلات معلوم کروں گا۔ ان کی تصویر بھی حاصل کرلوں گا۔ میرا اندازہ تھا کہ جوانی میں خاصی حسین رہی ہوں گی۔ ویسے تو جوانی خود ہی حسن کا دوسرا نام ہے... لیکن بدقسمتی سے ان سے ملنے کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے... کام، کام، کام... زیادہ تر بے کار اور بے فیض کام۔

کلکتہ کے ایک جریدے نے "ادیبوں کی حیات معاشقہ" نمبر نکالنے کا اعلان کیا تب بھی سوچا کہ مس سنگھ سے ملاقات کروں لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

پھر شاید ۱۹۹۲ء میں جب تھوڑی سی فرصت نصیب ہوئی میں "Women's Home" گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں اس نام کا اب کوئی نہیں رہتا۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب تک وہاں تھیں۔

اشتہار لے ڈوبا

لکھنؤ سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات نیشنل ہیرالڈ اور پائنیر پورے یوپی پر چھائے ہوئے تھے۔ الہ آباد کے نواح میں امرت بازار پتر کا زیادہ پڑھا جاتا۔ لیکن تعدادِ اشاعت کے اعتبار سے پائنیر کو بالادستی حاصل تھی اور اس کا بڑا سبب تھا مسلمانوں میں اس کی مقبولیت۔ پرانی انگریزی کے رسیا بھی پائنیر ہی پسند کرتے۔ نیشنل ہیرالڈ کو اپنے ایڈیٹر چلپت راؤ اور ان کے پیش رو اماراؤ کے سبب بین الاقوامی شہرت حاصل تھی لیکن آزادی سے پہلے انگریز کی نگاہوں میں مشکوک ہو جانے کے خوف اور آزادی کے بعد غلط طور سے "نیم سرکاری" اخبار سمجھے جانے کی وجہ سے ہیرالڈ خسارے میں رہتا۔ انھی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا کہ ایک بڑے طبقے نے پائنیر پڑھنا چھوڑ دیا۔

ایک ریٹائرڈ فوجی افسر کا کتا کھو گیا تھا۔ پائنیر میں شاید دوسرے صفحہ پر ایک چھوٹا سا Classified اشتہار شائع ہوا جس میں کتے کی نسل اور نام بتانے کے علاوہ اسے مالک کے حوالے کرنے والے کے لیے بطور انعام پچاس روپوں کا وعدہ کیا گیا تھا۔ کلاسی فائڈ اشتہار کم ہی لوگ پڑھتے ہیں چنانچہ مسلمانوں کو اس کا علم ایک دن بعد ہوا۔ کتے کے نام پر انھیں شدید اعتراض

تھا۔ احتجاج کی چند آوازیں بلند ہوئیں اور کہا جاتا تھا کہ حکومت نے اس ریٹائرڈ فوجی افسر کو نیپال فرار ہونے میں مدد دی اور پولیس میں کوئی رپورٹ بھی درج نہیں کی گئی۔ تیسرے دن مسلمانوں کا ایک نمائندہ جلسہ مولوی گنج میں ہوا اور پائنیئر کو دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے فوراً معافی نہ مانگی تو مسلمان اسے پڑھنا چھوڑ دیں گے۔ پائنیئر نے معافی مانگنے میں تاخیر کی اور نتیجتاً اس کی تعدادِ اشاعت آدھی رہ گئی۔ اس کے بعد پائنیئر پہلے والا مقام کبھی حاصل نہ کرسکا۔ پہلے تاج برطانیہ کا ترجمان تھا، اب بھارتیہ جنتا پارٹی کا ترجمان ہے۔

'حضرت جان' کیوں لکھی گئی!

بیسویں صدی کے آخری برسوں میں ایک پڑھی لکھی خاتون نے قاضی عبدالستار سے پوچھا کہ آپ نے ''حضرت جان'' کیوں لکھی؟''

''یہ سوال تو آپ میرے ہر ناول کے بارے میں کرسکتی ہیں،'' قاضی صاحب نے جواب دیا۔

کچھ دنوں بعد اتفاق سے ان خاتون کے یہاں جانا ہوا، اتفاق یوں کہ اب زندگی کی لعنتوں نے اس قدر مصروف کردیا ہے کہ ان کے یہاں جانا کم ہی ہو پاتا ہے۔ انھوں نے قاضی عبدالستار سے اپنا سوال اور ان کے جواب کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ وہ تو ٹال گئے، آپ بتائیے کہ انھوں نے یہ ناول کیوں لکھا؟

میں نے کہا،'' میں کیا بتاؤں، میں نے تو صفحات چھوڑ چھوڑ کے ہی اسے ختم کیا ہے۔ صفحات چھوڑ کے یوں کہ ایک ہی طرح کے مناظر نے آدھی سے زیادہ کتاب گھیر رکھی ہے''۔

میرے جواب سے وہ خاتون مطمئن نہ تھیں اور ظاہر ہے میں نے کوئی ایسی معقول بات کہی بھی نہیں تھی، بلکہ سچ پوچھیے تو میں نے بھی قاضی صاحب ہی کی طرح جواب سے گریز کا راستہ اپنایا تھا... تھوڑی دیر بعد چائے پیتے پیتے میرے دماغ میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور میں نے کہا۔

'' دیکھیے میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ قاضی عبدالستار نے یہ ناول کیوں لکھا لیکن ایک واقعہ ضرور سنا سکتا ہوں۔''

میری بات سن کر وہ خاتون مجسم اشتیاق بن گئیں تو میں نے کہا۔

’’میرے یہاں، یعنی نصرت پبلشرز میں، میرے ایک پرانے دوست اور کلاس فیلو کی والدہ بیگم عبدالواجد آتی ہیں۔ سرخ سفید، انگریزی ایسی بولتی ہیں کہ انگریز رشک کرے۔ آزادی کے بعد پہلی ریاستی اسمبلی کی ممبر تھیں اور انھوں نے کانگریس سے متعلق ہونے کے باوجود ’’انسداد گاؤکشی‘‘ کے بل کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک قوم کو اس کی جائز غذا سے محروم رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے بل پاس ہوگیا اور کانگریس نے انھیں الکشن لڑنے کے لیے پھر کبھی ٹکٹ نہ دیا۔‘‘

ان ساری تفصیلات نے ان خاتون کا اشتیاق اور بھی بڑھا دیا اور میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ’’بیگم صاحبہ کی عمر ستر پچھتر سے کم کیا ہوگی۔ ہوٹل گلمرگ میں ٹھہرتی ہیں تو تقریباً روزانہ نصرت پبلشرز ضرور آتی ہیں۔ یوں تو کونسی بیماری ہے جو انھیں نہ ہو، گوشت وہ کھا نہیں سکتیں، مرچ مسالے منع ہیں، شکر کے استعمال پر مکمل پابندی ہے...لیکن جب بھی آتی ہیں، کھانا پکانے کی ایک نہ ایک کتاب ضرور خرید لے جاتی ہیں۔‘‘

اس انکشاف نے ان خاتون کو محوِ حیرت کردیا۔

میں نے بات آگے بڑھائی، ’’ایک دن میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا، ’’نہ آپ مرغ مسلم کھا سکتی ہیں نہ بریانی اور کسی میٹھی چیز کا تو سوال ہی نہیں۔ آپ کو کھانا تو ہے بس بغیر شکر و نمک کا ابلا ابلایا، پھر آپ ان کتابوں کا کیا کرتی ہیں؟‘‘

میرا سوال سن کر بیگم صاحبہ بولیں۔

’’ہاں بھیا تم نے ٹھیک کہا... یہ سب کھانا تو دور کی بات، ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی...اسی لیے تو یہ کتابیں خرید لیتی ہوں کہ انھیں پڑھ کر ہی کچھ مزا لے لیں۔‘‘

حیا اور مسکراہٹ ان خاتون کے چہرے پر ایک ساتھ نمودار ہوئی اور انھوں نے موضوع بدل دیا اور پھر اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی۔ لیکن آٹھ دس دن بعد ان کے یہاں جانا ہوا تو وہ چائے بنانے کے لیے ملازمہ کو ہدایت دینے باورچی خانہ کی جانب جاتے ہوئے بس ایک منٹ کو میرے پاس رکیں اور بولیں۔

’’آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے اپنی جس سہیلی سے بھی ذکر کیا اس نے یہی کہا کہ ’حضرت جان‘ لکھنے کا اور کوئی سبب نہیں ہوسکتا۔‘‘

بے شک حضور!

سلامؔ مچھلی شہری ایک طویل عرصے تک لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ رہے۔ میں نے انھیں سات آٹھ سال تک تو لکھنؤ میں دیکھا ہوگا۔ وہ یہاں تنہا رہتے۔ حضرت گنج میں کیپٹل سینما کے پاس کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کھانا کھاتے، شامیں کافی ہاؤس میں گذرتیں۔ حسین گنج کے چوراہے سے کلے اسکوائر جانے والی سڑک پر تھوڑی دور چل کر ایک دومنزلہ مکان سڑک پر خاصا نکلا ہوا تھا۔ اس کے نچلے حصّے میں آٹا چکّی تھی۔ اوپر کے حصّے میں سلامؔ رہتے اور اسی سڑک کے دوسری جانب کچھ پہلے ایک پھاٹک کے اندر ہندی کے مشہور شاعر اور نثر نگار اور محکمۂ اطلاعات کے سابق ڈائرکٹر ٹھاکر پرساد۔

سلامؔ کے مکان مالک نے وہ حصّہ جس میں چکّی لگی تھی خالی کرانے کے لیے چکّی کے مالک پر مقدمہ دائر کر دیا۔ اس کی دلیلیں بس دو تھیں۔ ایک تو یہ کہ چکّی چلنے کے سبب عمارت کمزور ہو رہی ہے اور دوسری یہ کہ اس سے اوپر کے کرایے دار (سلامؔ مچھلی شہری) کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس نے سلامؔ سے اپنے حق میں گواہی دینے کے لیے کہا تو وہ فوراً راضی ہو گئے۔

خیر، مقرّرہ تاریخ کو گواہی ہوئی تو فریق مخالف کے وکیل کے اس سوال پر کہ کیا آپ کو چکّی کی وجہ سے بہت تکلیف ہوتی ہے، انھوں نے کہا، ''بالکل نہیں، مجھے بھلا کیا تکلیف ہوگی؟''

اب مالک مکان کے وکیل نے ٹوکا اور انھیں راہ پر لانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا، ''آپ اوپر کی منزل میں رہتے ہیں، صبح سے شام تک چکّی چلتی رہتی ہے آپ کیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تکلیف نہیں ہوتی۔''

سلامؔ نے جواب دیا، ''میں تنہا رہتا ہوں۔ صبح صبح تیار ہو کر گھر سے نکل جاتا ہوں۔ ناشتہ باہر کرتا ہوں۔ دس بجے اپنی ملازمت پر ریڈیو اسٹیشن چلا جاتا ہوں، شام کافی ہاؤس میں گذرتی ہے اور پکچر و کچر دیکھ کر رات گئے گھر لوٹتا ہوں تو چکّی بند ہو چکی ہوتی ہے۔ سو جاتا ہوں، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔''

غریب مالک مکان مقدمہ ہار گیا۔ اس نے شکایت کی تو انھوں نے کہا کہ تمھیں بتانا چاہیے تھا۔ میں نے تو سچ سچ بات کہہ دی۔ میں کیا جانوں۔

جونپور اور مچھلی شہر میں ہمارے خاندان سے تعلقات کے سبب وہ علیم صاحب سے ذرا

آزادانہ طور سے گفتگو کر لیتے۔ ایک دن انھوں نے علیم صاحب سے پوچھا،'' ڈاکٹر صاحب آپ کی داڑھی کی ٹیکنیک کیا ہے؟''

علیم صاحب نے کہا،'' پہلے معمولی لوگوں کی داڑھی بنانے کی تکنیک سیکھ لو پھر میری داڑھی کے بارے میں سوچنا''۔

یہ بات خود سلام مچھلی شہری نے مجھے بتائی تھی۔

ان کا پہلا مجموعہ ''وسعتیں'' لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس کی قیمت دو یا سوا دو روپے تھی۔ اس کا سرِ ورق ہلکے نیلے رنگ کا تھا اور اس میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ پاس ہی ان کا نام لکھا تھا۔

انھوں نے کتابی دنیا کے لیے ایک ناول بھی لکھا تھا۔ نام تھا'' بازو بند کھل کھل جائے۔'' یہ ناول بے حد دلچسپ طریقے سے لکھا گیا تھا۔ وہ کتابی دنیا آتے اور دوکان کے مینیجر رضی صاحب کے پاس کی خالی کرسی پر بیٹھ کے دو تین صفحے کاپی میں بڑھا دیتے اور اظہر نگرامی سے دس روپے لے کر چلے جاتے۔ اس زمانے میں دس روپے بہت ہوتے تھے۔ ٹھرّے کی بوتل، رات کے کھانے اور پان سگریٹ کے بعد بھی ایک دو روپے بچ ہی جاتے ہوں گے۔ وہ اتوار کے دن صبح صبح ریشم کا گاؤن پہن کر حضرت گنج میں ٹہلتے اور خود کو ملکِ جبش کا شہزادہ کہلوانا پسند کرتے لیکن رات جیسے جیسے ڈوبتی اور اپنے ہوش میں نہ رہ جاتے تو اپنی بات پر یقین بھی کرنے لگتے۔

ریڈیو اسٹیشن کی پرانی بلڈنگ میں اسٹوڈیو نمبر ایک کے تقریباً سامنے سے جو زینہ اوپر جاتا ہے اور جس جگہ نکلتا ہے، اس کے پاس ہی کے کمرے میں سلام مچھلی شہری بیٹھتے تھے۔ وہ فیچر رائٹر تھے۔ بعد میں اس کمرے میں ریڈیو ڈرامے کے مشہور پروڈیوسر ایس۔ ایس۔ ایس ٹھاکر بیٹھتے رہے تھے۔

دہلی ریڈیو اسٹیشن پر سلام مچھلی شہری نے خاصی ترقی کی لیکن وہاں رہ کر بھی انھوں نے دنیاداری نہ سیکھی۔

جشن جمہوریہ کا مشاعرہ تھا۔ بطور وزیر اطلاعات اندر کمار گجرال مسند صدارت سنبھالے تھے۔ سلامؔ نے حکومتِ وقت کے خلاف ایک نظم پڑھ دی اور شاید نشے کی جھونک میں ان سے کچھ بدتمیزی بھی کی۔ گجرال صاحب تو خیر شریف آدمی ہیں، انھوں نے کچھ برا نہ مانا لیکن آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل نے انھیں معطل کرتے ہوئے وضاحت اور معافی کا مطالبہ کیا۔ ان کا

نشہ اترا تو ہاتھی فروخت ہو چکا تھا۔ انھوں نے فوراً معافی مانگ لی۔ یہ خبر اخباروں میں بھی چھپی۔

لکھنؤ جب بھی آنا ہوتا قومی آواز ضرور آتے۔ دہلی کے مشاعرے کے واقعے کے بعد لکھنؤ آئے تو ان سے ملاقات ایسوشی ایٹیڈ جرنلس کی عمارت کے زینے پر ہوئی۔ میں نے پوچھا، ''سلامؔ صاحب میں نے سنا ہے کہ آپ نے فوراً ہی معافی مانگ لی؟''

بلا تامل بولے، ''کیا کہوں سہیل، خودداری کو جگانے کی بہت کوشش کی لیکن کمبخت جاگی ہی نہیں''۔

ہے کوئی سلامؔ ایسا صاف گو آج؟ کوئی اور ہوتا تو ہزار بہانے بناتا۔ شاعری میں جتنے تجربے سلامؔ نے کیے کسی نے نہیں کیے۔ ان کے منظوم خطوط جو ''نقوش''، ''ادب لطیف'' اور ''جاوید'' میں شائع ہوئے خاصے کی چیز تھے۔ اب کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا۔ ان پر شاید صرف ایک ڈاکٹریٹ ہوئی ہے۔ اُس زمانے کی شاعری کے مقالوں میں ان پر ایک پیراگراف بھی مشکل سے لکھا جاتا ہے۔ افسوس ان کی شاعری کے وزن و وقار کو اب تک آنکا نہیں گیا۔

اس وقت ان کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔ آپ بھی سنیے۔

بے شک حضور، آپ خدا کی طرح رہیں
جینے کا حق ہمیں بھی ہے انسان کی طرح

گواہی

غالباً ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ مئی جون کا مہینہ تھا۔ میں نے ہوٹل کلارکس[1] کے سامنے کی سڑک پر تین نوجوانوں کو ایک دوسرے سے جھگڑتے دیکھا۔ دو موٹر سائیکلیں یا اسکوٹریں بھی وہیں کھڑی تھیں۔ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش پر ان میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ میں نے انھیں سمجھا بجھا کر معاملہ ختم کرنے کی کوشش کی اور جانبین نے شاید میرے کھچڑی بالوں کے پیشِ نظر بات مان لی۔ دونوں سواریاں مخالف سمتوں میں روانہ ہوگئیں۔ میں ان میں سے کسی سے واقف نہ تھا۔ معاملہ آیا گیا ہوا۔

تین چار دن بعد قومی آواز کے آخری صفحے پر حلقے میں ایک خبر شائع ہوئی۔ سرخی تھی۔
''دلِ خانہ خراب کے بدلے''

۱۔ غالباً اس وقت تک وہاں یہ ہوٹل نہیں بنا تھا۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ دو چار دن قبل عابد علی نام کے ایک نوجوان نے ایک شخص کی بہن کو جو اس کی موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھی ہوئی تھی، چھیڑا جس پر دونوں میں جھگڑا ہوا اور لڑکی کے بھائی کی رپورٹ پر پولیس نے کچھ کارروائی بھی کی ہے۔ میں نے خبر پڑھ کر لطف لیا لیکن خیال تک نہ آیا کہ یہ وہی معاملہ ہے جس میں دو تین نوجوانوں کے درمیان میں نے بیچ براؤ کیا تھا اور وہاں کوئی لڑکی تو تھی نہیں۔

چند روز بعد ایک صاحب جنھیں دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا کیوں کہ انھی سے دونوں نوجوان جھگڑ رہے تھے، ہیرالڈ میں مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے تو بیچ بچاؤ کر کے ان دونوں کو ایک طرف اور مجھے دوسری طرف روانہ کر دیا تھا لیکن انھوں نے پولیس میں رپورٹ درج کرادی ہے کہ میں ان کی بہن کو چھیڑ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی مجھے تو وہاں کوئی لڑکی نظر نہیں آئی تھی۔ میری اس بات سے ان کی ہمت بندھی اور انھوں نے مقدمہ میں اپنی طرف سے گواہی دینے کی مجھ سے درخواست کی۔ میں نے کہا گواہی دواہی تو میں جانتا نہیں لیکن جو میں نے دیکھا ہے وہ ضرور بیان کر دوں گا۔ انھوں نے خود کو یقین دلانے کے لیے مجھ سے گھما پھرا کر کئی بار وعدہ لیا۔ پھر وہ آٹھویں دسویں آ کر مجھ سے ملاقات کرنے لگے تو میں نے کہا بھائی میں نے وعدہ کرلیا ہے تو اسے پورا کروں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ بس پیشی کی تاریخ سے آٹھ دس دن قبل مجھے مطلع ضرور کردیں تا کہ میں شہر میں موجود رہوں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے اپنے وکیل نذیر احمد صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے کہا تو میں نے کہا میں کسی وکیل سے ملاقات نہیں کروں گا اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے صاف صاف بیان کر دوں گا۔ انھیں تھوڑی سی مایوسی تو ضرور ہوئی لیکن انھوں نے کچھ کہا نہیں۔ مجبور تھے بے چارے۔ پیشی کی تاریخ سے ایک دن قبل آ کر انھوں نے اگلے دن کار لانے کی پیش کش کی۔ میں نے کہا میں سائکل سے دفتر جاتا ہوں، سائکل ہی سے کچہری بھی جاؤں گا اور وہیں سے دفتر چلا جاؤں گا۔ اس بار بھی انھیں مایوسی ہوئی۔ اصل میں انھیں دھڑکا لگا ہوا تھا کہ میں آخر وقت پر جُل نہ دے دوں۔

میں کچہری پہنچا تو مجھ پر سب سے پہلے نظر خواجہ رائق کی پڑی۔ انھیں معاملہ معلوم ہوا تو انھوں نے سمجھایا کہ میں گواہی دواہی کے چکّر میں نہ پڑوں، کوئی پابندی نہیں ہے اور گواہی اگر کورٹ نے Disbelieve کر دی تو ساری زندگی کے لیے ایک داغ لگ جائے گا۔ اس وقت سب سے زیادہ پریشان عابد علی اور ان کے ساتھی تھے۔ میں نے کہا اب کورٹ

وعدہ کرلیا ہے تو میں سچی بات ضرور کہوں گا۔ Disbelieve کرے یا Believe۔ اسی وقت شبیر الحسن اور حیدر عباس بھی آ گئے اور انھوں نے بھی مجھے گواہی دینے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن میں اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ میرے یہ تینوں وکیل دوست واقعی پریشان تھے۔ آخر خواجہ رائق نے وکالت نامے پر مجھ سے دستخط کرائے اور پکار ہونے پر میرے ساتھ ساتھ عدالت میں کھڑے ہوگئے تاکہ میں کوئی گڑبڑ کروں تو وہ معاملے کو بگڑنے سے بچانے کی کوشش کریں۔ اب یہ نہیں یاد کہ وہاں حیدر عباس اور شبیر الحسن تھے یا نہیں۔

گواہی کے لیے سب سے پہلے مجھے ہی طلب کیا گیا۔ میں نے ضمیر کے نام پر سچ بولنے کی قسم کھائی۔ اس کے بعد شاید نذیر احمد صاحب نے اپنا پہلا سوال داغا۔

میں نے عدالت سے کہا، ''می لارڈ، زندگی میں یہ میری پہلی گواہی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وکیلوں کے داؤں پیچ کے سوالوں سے گھبرا نہ جاؤں اور کچھ کا کچھ نہ کہہ بیٹھوں۔ آپ اجازت دیں تو میں وہ سب کچھ بیان کردوں جو میں نے دیکھا تھا اور اس کے بعد کوئی چاہے تو میری باتوں کی وضاحت طلب کرلے۔''

عدالت نے دونوں وکیلوں کی طرف دیکھا۔ انھیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ چنانچہ میں نے عدالت کے حکم پر آنکھوں دیکھا حال بیان کردیا۔

میرے بیان کے بعد عدالت نے دونوں جانب کے وکیلوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ انھیں کچھ پوچھنا ہو تو پوچھ لیں۔ دونوں نے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ لیکن عدالت نے ایک ایسا سوال پوچھا کہ میں نے ذرا سا بھی جھوٹ بولا ہوتا تو ضرور پھنس جاتا۔

عدالت نے پوچھا، ''جون کی فلاں فلاں تاریخ کو دن میں دو بجے آپ وہاں کیا کررہے تھے؟''

میں نے کہا، ''مجھے اس وقت معلوم ہوتا کہ گواہی دینا پڑے گی اور یہ سوال بھی پوچھا جاسکتا ہے تو اپنی موجودگی کا سبب ضرور یاد رکھتا۔ اس لیے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس چلچلاتی دھوپ میں اس دن وہاں کیسے موجود تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں ڈیوٹی پر جارہا ہوں گا۔''

''۲ بجے دن میں ڈیوٹی پر۔ اس وقت کونسی ڈیوٹی شروع ہوتی ہے؟''

میں نے کہا، ''میں نیشنل ہیرالڈ کے شعبۂ ایڈیٹوریل سے متعلق ہوں۔ وہاں ایک

ڈیوٹی صبح دس بجے شروع ہوتی ہے، دوسری دن میں ۲ بجے اور تیسری رات میں ۸ بجے۔ دن کی ۲ بجے کی ڈیوٹی کو مِڈ کی ڈیوٹی کہتے ہیں۔''

اب انھوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا، گواہ کی طرح نہیں، ایک شریف انسان کی طرح... اور پوچھا، ''لیکن آپ رہتے تو میڈیکل کالج کے پاس ہیں۔ وہاں سے نیشنل ہیرالڈ جانے کا یہ کونسا راستہ ہوا؟''

میں نے کہا، ''ڈالی گنج میں میری سسرال ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں وہاں سے دفتر جارہا ہوں گا۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس دن میری مِڈ کی ڈیوٹی تھی یا میں ڈالی گنج سے قیصر باغ جارہا تھا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ ممکن ہے''۔

عدالت نے مجھے پھر بہ نظر استحسان دیکھا۔

بعد میں مخالف وکیل کے منشی نے نذیر احمد سے خرچہ دلانے کی بات کہی تو میں نے کہا، ''خرچہ کیسا؟ مجھے دو بجے دفتر پہنچنا ہے۔ اسی راستے سے ویسے بھی جاتا۔ بس ذرا دیر بعد۔ اسٹینڈ پر سائکل کھڑی کرنے کے لیے چار آنے دینے پڑیں گے آپ چاہیں تو وہ دلوادیں''۔

خدا کے شکر سے ضرورت سے زیادہ دولت کو میں نے حضرت علیؓ کی طرح ہمیشہ ''سور کے منہ میں کوڑھی کی ہڈی'' ہی سمجھا اور کبھی اس کی لالچ نہ کی۔ عابد علی یا ان کے بھائی کی، جن کا انتقال ہو چکا ہے، ناشتے کی فرمائش بھی قبول نہ کی البتہ رائق کے اڈے پر بیٹھ کر ان کے اور شہیرل کے ساتھ ایک آنے گلاس کی چائے ضرور پی۔

چند ماہ بعد فیصلہ عابد علی کے حق میں ہوا۔ اس کا علم مجھے مٹھائی کے اس بڑے سے ڈبے سے ہوا جو دفتر سے واپس آنے پر گھر میں ملا۔ بعد میں عابد علی سے میں اکثر کہا کرتا کہ ''بچّے مٹھائی کے لیے بہت ضد کررہے ہیں، اب کب لڑکی کو چھیڑو گے۔''

عابد علی نے مجھے بتایا کہ عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ عابد سہیل کی گواہی اتنی سیدھی، سچی اور فطری تھی کہ اس پر ایک کیا کئی ملزموں کو رہا کیا جاسکتا ہے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ فیصلہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ میں یہ بات عابد علی کے بیان اور اپنی یادداشت کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں اور وہ بھی خاصی کم بیانی سے کام لے کے۔

لیکن یہ سطریں لکھنے سے قبل بھی میں نے واقعہ کے سینتالیس اڑتالیس سال بعد عابد علی کا گھر تلاش کرکے فیصلہ کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے پاس سے فیصلے کی نقل دوسرے

بہت سے ضروری کاغذات کے ساتھ برسات کی بوچھار میں بھیگ کر گل گئی تھی۔ میری فرمائش پر انھوں نے اپنے موجودہ وکیل کے ذریعے فیصلے کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اس طرح کے غیر اہم فیصلوں کی نقلیں بیس سال بعد ضائع کردی جاتی ہیں۔[1]

بعد میں بعض ناگزیر حالات کے سبب نیشنل ہیرالڈ سے مستعفی ہوگیا۔ وہاں سے گریچوئٹی بھی نہیں ملی۔ پیمبری وقت پڑا تھا۔ حسنِ اتفاق سے میری بڑی بیٹی کا رشتہ طے ہوگیا۔ وہ لوگ جلدی کررہے تھے اور یہاں جیب خالی تھی۔ لیکن ان کا کوئی مطالبہ بھی نہ تھا۔ پھر بھی جو ہوسکتا تھا وہ کیا۔

عابد علی اور خورشید (عابد علی کے عزیز) نے شرماتے شرماتے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ضرور ڈالے لیکن عابد سہیل کسی دوسری ہی مٹی کا بنا تھا۔ تاہم ان کی جانب سے تحفہ کے طور پر ایک خوبصورت سنگار میز اور سلامی کے پانچ سو روپے قبول کرنے سے انکار نہ کرسکا۔ سلامی کے اتنے ہی روپے سعید اسلم رضوی کی والدہ (اسلم رضوی کی اہلیہ) نے بھی بھجوائے تھے۔ اشفاق رضوی کی برسی کے سبب وہ شرکت نہ کرسکی تھیں۔ سعید اور اطہر نبی کی کاریں دن بھر دوڑتی پھریں۔

غلام السیدین کے بڑے بھائی

ایک دن کافی ہاؤس میں سلام مچھلی شہری نے ڈاکٹر عبدالعلیم سے پوچھا،" ڈاکٹر صاحب Dialectical Materialism کا ترجمہ کیا ہوگا؟"

علیم صاحب نے کہا،" جدلیاتی مادّیت مروّج ہے ویسے صحیح ترجمہ تو،" انھوں نے داڑھی کھجائی، تھوڑا سا سوچا، پھر کہا۔" صحیح ترجمہ تو..."

سب لوگ گوش برآواز ہوگئے

علیم صاحب نے ایک بار پھر داڑھی کھجائی، کچھ سوچا اور کہا،" صحیح ترجمہ تو" فلسفۂ ارتقائے اجتماع بالضدین، ہوگا"

مجاز نے جو بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے نہایت معصومیت سے پوچھا۔

" ڈاکٹر صاحب یہ خواجہ غلام السیّدین کے بڑے بھائی تو نہیں!"

بات ہنسنے کی نہیں قہقہہ لگانے کی تھی۔ لوگوں نے یہ قہقہہ بعد میں ضرور لگایا ہوگا۔

۱۔ یہ پوری تحریر میں نے عابد علی کو سنادی ہے۔

قسمت کے کھیل!

راجن سرین کا ذکر آچکا ہے۔ اس کا بڑا بھائی، یش، ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا اور اپنی بھابی کو دیکھنے کے لیے جو میڈیکل کالج میں بھرتی تھیں شاہجہاں پور سے برابر آتا رہتا۔ سدیش نام کی ایک نہایت خوبصورت نرس ان کی دیکھ بھال کرتی۔ کچھ ایسا ہوا کہ وہ اور یش ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے اور معاملات اس حد تک بڑھ گئے کہ بزرگوں نے طے کر دیا کہ بھابی کی صحت یابی کے بعد ان کی شادی کر دی جائے۔

شاہجہاں پور کا یہ خاندان جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان سے آیا تھا، خاصا خوشحال تھا اور جیسا کہ اکثر پیسے والوں کے یہاں ہوتا ہے، جوتش وغیرہ کا قائل اور برگومہاراج نام کے ایک جوتشی سے بہت متاثر۔ یہ لوگ ہر بڑے کام سے قبل برگومہاراج سے منظوری یا ان کا آشیرواد ضرور لے لیتے۔ ایک دن پال نے مجھ سے کہا کہ چلو برگومہاراج سے آشیرواد لے آئیں۔

میں ان سب چیزوں میں یقین نہیں رکھتا، لیکن پال کے اصرار پر برگومہاراج کے یہاں جانے پر راضی ہوگیا۔ پال میرا دوست بھی تو تھا۔ غازی الدین حیدر کینال سے پہلے کی تقریباً متوازی سڑک پر ان کا مکان تھا۔ ہم دونوں ان کے یہاں رکشے سے گئے تھے۔ اس سارے دوران ایسی بے وقوفی کی باتوں پر اعتقاد رکھنے کے لیے میں پال کو چھیڑتا رہا۔

برگومہاراج کا مکان نہایت خوبصورت اور دومنزلہ تھا۔ نیچے انتظار کے کمرے میں گوبند بلبھ پنت اور سمپورنا نند وغیرہ کے ساتھ پنڈت نہرو[1] کا سرٹیفیکٹ دیکھ کر خاص طور سے حیرت ہوئی۔ کیوں کہ وہ چاہے پورے طور سے سوشلسٹ نہ رہے ہوں عقلیت پسند ضرور تھے۔

اس کمرے میں پانچ چھے لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے اور باہر کھڑی ہوئی کاروں اور ان لوگوں کی پوشاکوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پال نے اپنے نام کا پرچہ بھیجا تو شاید پرانے تعلقات کی بنا پر برگومہاراج نے انھیں دو تین لوگوں کے بعد ہی بلالیا۔

میں برگومہاراج کے پاس جانے کے لیے تیار نہ تھا لیکن پال مجھے کھینچ لے گیا۔ اوپر کا

۱۔ کم وبیش پچیس سال بعد میں نے مستشرق علی جاہ صاحب کی خودنوشت On Becoming Alijah میں پڑھا کہ ڈاکٹر علیم انھیں پنڈت نہرو کے نجومی کے پاس لے گئے تھے۔ صفحہ ۲۹۴۔

کمرہ خاصا بڑا تھا اور وہاں چاروں طرف کی الماریوں کے خانوں میں تاڑ کے لمبے لمبے پتے، جو سو دو سو کی گڈیوں میں کونے سے سلے ہوئے تھے، قرینے سے رکھے تھے۔ مجھے انھیں اس طرح ترتیب سے رکھے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ انھوں نے میرے بارے میں استفہامیہ نظروں سے پال کی طرف دیکھا تو اس نے کہا میرے دوست ہیں۔

پال نے اپنی بات بتائی تو انھوں نے پوچھا کہ لڑکی کے پتا جی کا نام کیا ہے اور وہ کہاں رہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ملازم سے تاڑ کے پتوں کی ایک گڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے لانے کے لیے کہا۔ گڈی آئی تو انھوں نے اسے الٹ پلٹ کے دیکھا اور اس کے بعد کی گڈی منگائی۔ دوسری گڈی آئی تو انھوں نے چند خشک پتے پلٹنے کے بعد ایک پتے پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنی شروع کی۔ پھر کہا، ''باپ میٹھا کام کرے۔؟''

برگو مہاراج نے پال کی طرف دیکھا تو اس نے کہا، ''شوگر مل میں منیجر ہیں؟''

تقریباً دس بارہ منٹ تک برگو مہاراج نے تاڑ کے پتے کی تحریر پڑھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے بعد پال کی طرف دیکھا اور پوچھا، ''لڑکی کا نام سدیش ہے نا؟''

پال نے سر ہلایا تو انھوں نے بہت دھیمی آواز میں کہا، ''تمھاری شادی اس سے نہیں ہوگی، اس سے زیادہ خوبصورت اور اس سے اچھی لڑکی سے ہوگی اور تم بہت سکھی رہو گے، اس لڑکی کا باپ بھی میٹھا کاروبار کرتا ہوگا۔''

پال اسی جگہ بھوں بھوں کرنے لگے۔ واپسی میں راستے بھر میں پال کو سمجھاتا رہا کہ یہ لوگ ڈھونگی ہوتے ہیں۔ شادی کے بارے میں سب کچھ تو طے ہو چکا ہے اور یہ کہتا ہے کہ کسی اور سے ہوگی۔

سدیش روز ہی آتی تھی، ہفتہ میں ایک دن کے علاوہ۔ وہ دو دن سے نہیں آئی تھی، اگلے دن بھی نہیں آئی تو سب کو تشویش ہوئی۔ پال کو بہت پریشانی تھی اور وہ سر لپیٹے اندر لیٹا تھا۔ اگلے دن بھیا جی (سب سے بڑے بھائی) نے راجن سے کہا کہ تم اور سہیل ڈفرن ہاسپٹل کے ہوسٹل جا کر پتہ لگاؤ کہ وہ کیوں نہیں آئی۔ راجن کو میرے ساتھ رکشے پر بیٹھ کر جانا کچھ اچھا نہ لگا تو انھوں نے کہا، ''تم بتاشہ تو ہو نہیں، جو سہیل تمھیں منہ میں رکھ لیں گے۔''

ڈفرن ہاسپٹل میں عجیب حال تھا، کوئی کچھ بتاتا ہی نہ تھا۔ بڑی مشکل سے پتہ چلا کہ وہ سخت بیمار ہوگئی ہے اور کوئن میری ہاسپٹل میں داخل ہے۔

ہم لوگ میڈیکل کالج واپس آئے اور پھر اس کی تلاش میں کوئن میری گئے تو وہ پرائیوٹ وارڈ کے کمرہ نمبر ۳ میں ملی۔ ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ بظاہر اس کی حالت ٹھیک تھی اور وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔ اس دن میں نے پہلی بار چشمہ لگایا تھا، جس کی طرف اشارہ کر کے اس نے الفاظ کا سہارا لیے بغیر کہا تھا،''اچھے لگ رہے ہو''، آنکھوں آنکھوں میں یہ بات کہنے کا اس کا انداز میری یادوں میں اب تک بسا ہوا ہے۔

اس کے والد کو ڈفرن اسپتال کے ہوسٹل سے مطلع کر دیا گیا تھا۔ وہ اگلے دن آ گئے اور اسی دن سدیش ختم ہو گئی، جیسے انھی کا انتظار کر رہی ہو۔

اس کے والد کے ساتھ سدیش کی بہن آشا بھی تھی۔ وہ کالج وارڈ ہی میں ٹھہری اور ہم لوگوں نے سدیش کے آخری رسوم بھینسا کنڈ میں ادا کیے۔ پال کے آنسو خشک ہو چکے تھے لیکن میرے کسی طرح تھمنے کا نام نہ لیتے۔ اس کے والد پر جیسے کچھ بھی اثر نہ تھا۔ وہ نشے میں بری طرح دھت تھے۔

یہ ایک عجیب اور نہایت تکلیف دہ معاملہ تھا۔ میڈیکل کالج کے دو ڈاکٹروں کا تبادلہ کر دیا گیا تھا۔

آخر پال کی شادی آشا سے ہوئی۔ میں اس شادی میں شریک تھا۔ شاہجہاں پور تین چار بار جانا ہوا اور ہر بار اسی گھرانے کے حوالے سے۔ ان کا بڑا سا مکان بہادر گنج نامی محلے میں تھا۔ اب بھی ہو گا۔ ان کا اپنا تھا۔

تقریباً بیس بائیس سال قبل ایک دن بسنت ٹاکیز کے سامنے مجھے دیکھ کر بھیا جی (نرہی والے) نے اسکوٹر روک دی۔ اسکوٹر پر پیچھے ایک نہایت خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ بھیا جی نے بتایا کہ یہ پال کی بیٹی ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ اسی وقت بھیا جی نے اس سے کہا کہ تم نے نمستے تو کر لیا لیکن جانتی بھی ہو یہ کون ہیں؟ اس نے فوراً کہا،''سہیل انکل؟''۔

میں حیران تھا کہ میری تو اس سے کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا، لیکن سوال پوچھا بھیا جی نے۔

اس نے کہا،''آپ لکھنؤ میں کسی اور سے مجھے اس طرح ملا ہی نہیں سکتے۔''

لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی میں ایم۔ اے کر رہی تھی۔ میں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ اس سے ملاقات کروں گا، لیکن وہ دن اس طرح کے کسی وعدے کے نبھانے کے نہ تھے۔ بہت سخت تھے۔ اس طرح ایک بات اور بھی ہوئی۔ کیلاش ہوسٹل میں داخل ہونے کا آخری موقع ہاتھ

سے نکل گیا۔ ہاں اسماعیل لاج دو تین بار ضرور گیا تھا۔ وہاں نسیم رہتی تھی۔ وہ دو بار نصرت پبلشرز بھی آئی تھی، ایک بار اپنے بیٹے کے ساتھ۔

شاعر اور باربر

ڈاکٹر محمد حسن مجھے افسانہ نگار تسلیم نہیں کرتے تھے اور اپنی اس رائے کا مجھ سے اور دوسروں سے برملا اظہار بھی کرتے۔ ان کا حسنِ ظن تھا کہ میں تنقیدی ذہن کا مالک ہوں، افسانے کیا خاک لکھوں گا۔ کسی رسالے میں میرا نام دیکھتے ہی ورق پلٹ دیتے اور مجھ سے کہتے بھی کہ فلاں رسالے میں تمھارا افسانہ چھپا ہے لیکن میں نے پڑھا نہیں، صفحہ پلٹ دیا۔ میں ان کے علم و فضل کا قائل تھا اور ان کے اس رویئے کا کبھی برا نہ مانتا بس ہوتا یہ کہ اپنے افسانے اور بھی بے توقیر معلوم ہونے لگتے اور میں سوچنے لگتا کہ شاید ایک بھی اچھا افسانہ میری جھولی میں نہیں۔

یہ بات پچھلی صدی کی چھٹی دہائی کی ہے۔ محمد حسن کے مضمون "اردو ادب میں رومانی تحریک" کی ادبی حلقوں میں دھوم مچی تھی اور ہفت روزہ "فلم میل" میں، جو اُن کی ادارت میں پائنیر سے شائع ہوتا، سوالات کے جوابوں کی۔ ان دنوں ان کے دو جواب مہینوں دہرائے جاتے رہے، کافی ہاؤس میں اور اس کے باہر بھی۔

ایک سوال تھا، "گوپ کا جوڑا کون ہے؟"

ان کا جواب تھا، "گوپ خود ہی جوڑا ہے۔"

ایک اور سوال کچھ اس قسم کا تھا، "شاعروں کے بال عام طور سے لمبے کیوں ہوتے ہیں؟"

جواب تھا، "باربر شاعری سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔"

لکھنؤ کے نوجوان ادیبوں میں ان کی حیثیت گائڈ اور رہنما کی تھی اور ان نوجوانوں میں شامل تھے رتن سنگھ، اقبال مجید، عثمان غنی، احمد جمال پاشا، حسن عابد، آغا سہیل، بہت سے دوسرے اور خود میں۔ یہ لوگ محمد حسن کو گھیرے رہتے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے ان کے یہاں میرا جانا ذرا کم ہوتا پھر بھی ہفتے میں ایک آدھ پھیرا ہو ہی جاتا۔

قیصر باغ کے چوراہے سے لاٹوش روڈ میں داخل ہوا جائے تو تھوڑی دور چل کر ایک

بے نام سا چوراہا پڑتا ہے جہاں سے بائیں ہاتھ کی طرف کی سڑک ماڈل ہاؤسیز کی طرف چلی جاتی ہے اور دائیں ہاتھ کی نظیر آباد کی جانب۔ اسی سڑک پر دس پندرہ قدم چلنے کے بعد دائیں جانب ایک راستہ پھوٹتا ہے جس پر تیسرے یا چوتھے مکان میں، جو دو منزلہ ہے، محمد حسن رہتے تھے۔ پہلے اس مکان میں قومی آواز کے چیف سب ایڈیٹر حبیب الرحمان مقیم تھے۔ ان دنوں مکانوں کی ایسی مارا ماری نہ تھی۔ اس سے پہلے محمد حسن سڑک کے دوسری طرف کے ایک مکان میں رہتے تھے جس کا کرایہ وصول کرنے نیاز فتح پوری آتے، ایک بچّے کی انگلی پکڑے ہوئے۔

محمد حسن مسیح الحسن رضوی کی افسانہ نگاری کے بہت قائل تھے۔ انھی دنوں مسیح الحسن نے تقسیم ہند کے ثقافتی اثرات کے پس منظر میں ''کفارہ'' نام کا ایک افسانہ لکھا اور اشاعت کے لیے ''شاہراہ'' کو بھیج دیا۔ ان دنوں ''شاہراہ'' کے ایڈیٹر ظ۔ انصاری تھے جنھوں نے افسانے کی اشاعت سے معذرت تو نہیں کی لیکن اسے منتظرِ اشاعت مسودات کی فائل میں رکھے رہے۔ پھر محمد حسن کا ایک طویل مضمون ''شاہراہ'' میں شائع ہوا جس میں اس افسانے کی خاصی تعریف کی گئی تھی۔ اگلے شمارے میں ظ۔ انصاری نے وہ افسانہ تو شائع کر دیا لیکن اس نوٹ کے ساتھ کہ ادارہ ''کفارہ'' کی اشاعت کے سلسلے میں مذبذب تھا تاہم ڈاکٹر محمد حسن نے اس کی اتنی تعریف کر دی ہے کہ اب اس کی اشاعت ضروری ہے۔

اس مکان کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں محمد حسن کبھی کبھی ادبی جلسے بھی کرتے تھے۔ ان جلسوں کے سینیئر شرکا میں مجھے اثر لکھنوی، علی عباس حسینی، اختر علی تلہری اور کمال احمد صدیقی کے نام یاد آ رہے ہیں۔ احتشام حسین کو ان جلسوں میں کبھی نہیں دیکھا۔ نوجوان پارٹی تو ہوتی ہی تھی... یہی ڈاکٹر محمد حسن کا مطالعہ کا کمرہ بھی تھا۔

ایک جلسے میں مجاز بھی موجود تھے۔ وہ شاید پہلی بار آئے تھے۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد ان کی نظر اپنی تصویر پر پڑی جو محمد حسن کی اس میز کی سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی جس پر وہ تصنیف و تالیف کا کام کیا کرتے۔ مجاز اپنی تصویر کچھ عجیب انداز سے دیکھتے رہے، پھر دھیرے سے بولے

''میاں ٹنگے ہوئے ہو''

ان دنوں محمد حسن ایک لطیفہ اکثر سنایا کرتے۔

ایک صاحب کی ملازمت کچھ ایسی تھی کہ رات میں ان کی واپسی بہت دیر سے ہوتی

چنانچہ وہ صبح دیر تک سوتے رہتے۔ گھر میں خواتین کے علاوہ صرف ان کا بھانجا تھا جسے انھوں نے ہدایت کر دی تھی کہ صبح صبح کوئی آئے تو کہہ دیا کرو میں سو رہا ہوں۔

ایک دن صبح صبح کوئی صاحب آئے اور انھوں نے اتنی زور کی آواز لگائی کہ ان کی آنکھ کھل گئی۔ اسی وقت بھانجے صاحب دروازے پر پہنچ کر ان سے کہہ رہے تھے۔

''ماموں ہیں تو لیکن میرا کمبل اوڑھے سو رہے ہیں۔''

خیر وہ صاحب چلے گئے اور انھیں پھر نیند آ گئی۔ نیند پوری کرنے کے بعد جب وہ اٹھے تو انھوں نے بھانجے سے کہا کہ ''یہ میرا کمبل کہنے کی کیا ضرورت تھی؟''

وہ یہ سمجھا کہ ماموں کو ''میرا'' کا اضافہ ناپسند ہے چنانچہ اگلی بار جب ایسی نوبت آئی تو اس نے کہا۔

''ہیں تو، لیکن کمبل اوڑھے سو رہے ہیں''

اتفاق سے اس بار بھی وہ پوری طرح جاگے تو نہیں تھے لیکن کسمنا ضرور رہے تھے۔ بعد میں انھوں نے بھانجے سے کہا کہ ''یہ کمبل کا کیا ذکر؟''

اگلی بار جب کوئی صاحب ان سے ملنے آئے تو اس نے کہا

''ماموں ہیں تو لیکن سو رہے ہیں اور کمبل کا کوئی ذکر نہیں۔''

ڈاکٹر محمد حسن کا لطیفہ سنانے کا انداز کچھ اس قدر دلچسپ تھا کہ کافی ہاؤس میں اور باہر بھی لوگ ان سے ''کمبل والا'' لطیفہ سنانے کی بار بار فرمائش کرتے۔

سب سے چھوٹا غم

ڈاکٹر محمد حسن پہلے علی گڑھ گئے اور پھر وہاں سے دہلی۔ اس دوران انھوں نے مجھے بیس پچیس خط تو ضرور لکھے ہوں گے۔ افسوس یہ خطوط ضائع ہو گئے، اگرچہ بعد کے خطوط محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض تو چار چار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلے والے کسی خط میں میرے کسی افسانے کا ذکر نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے؟ افسانہ پڑھا ہوتا تو ذکر کرتے۔

پھر ایک دن دہلی سے ان کا خط ملا جس میں نہ صرف ایک افسانے کا تفصیلی ذکر تھا بلکہ اس کی تعریف بھی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ان پر کیا افتاد پڑی کہ انھوں نے میرا افسانہ پڑھ ڈالا۔ یقین نہ آتا کہ یہ خط انھی کا ہے۔

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے میرے افسانے نشر ہوتے تھے لیکن ایک دوستانہ شرط کے ساتھ اور وہ شرط یہ تھی کہ انھیں پندرہ روزہ ''آواز''[1] میں اشاعت کے لیے نہیں بھیجا جائے گا۔ اس طرح میں ''آجکل''، ''نیا دور'' یا کسی اور رسالے میں انھیں شائع کرا کے کچھ مزید معاوضہ حاصل کر لیتا۔ اس کا سبب روپوں کی لالچ کے بجائے حالات کا جبر تھا۔

مفلسی کیا گلا کروں تجھ سے

ساتھ تیرا کہاں کہاں نہ رہا باقر مہدی

میرا افسانہ ''سب سے چھوٹا غم'' نشر ہوا تو پروگرام ایگزیکیٹو شفاعت علی صدیقی چھٹی پر تھے اور ان کے معاون نے اسے اشاعت کے لیے ''آواز'' کو بھیج دیا۔ ''آواز'' میں تخلیقات کی اشاعت کا انداز یہ تھا کہ مصنف کا نام بعد میں دیا جاتا۔ اتفاق سے سرورق پلٹتے ہی افسانہ شروع ہو گیا تھا اور نام آخر میں تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ نام دیکھتے ہی اگلی چیز پڑھنے لگتے۔ انھوں نے افسانے کے آخر میں میرا نام دیکھا تو انھیں کچھ حیرت ہوئی اور مجھے فوراً خط لکھا جس میں افسانے کی تعریف کے بعد یہ بھی لکھا تھا کہ تم اپنا مجموعہ کیوں نہیں چھپواتے، مقدمہ میں لکھوں گا۔

میں نے افسانوں کی نقلیں تیار کر کے انھیں بھیج دیں۔ ان دنوں فوٹو کاپی مروّج نہیں ہوئی تھی۔ خاصی محنت کرنا پڑی اور وقت بھی لگا۔ خیر، پندرہ بیس دن بعد ان کا خط آیا کہ میں فلاں تاریخ کو لکھنؤ پہنچ رہا ہوں، یونیورسٹی میں ڈی۔ پی۔ اے۔ کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہروں گا، مقدمہ وہیں آکر لے لینا۔ تم سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ میں وہاں گیا تو کمرے پر تالا لٹک رہا تھا۔ ظاہر ہے لوٹ آیا۔ تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی۔

شام میں انیس اشفاق، جو اُن دنوں شبیہ الحسن مرحوم کے یہاں رہتے تھے، ان کا ایک مختصر سا خط لے کر آئے جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ پروفیسر محمد حسن کو رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے، آپ بھی شریکِ طعام ہوں۔ کھانے میں صرف ہم تین لوگ تھے۔ کھانے کے بعد محمد حسن نے مقدمہ مجھے وہیں دیا۔ میرے مجموعے کی کتابت مشہور خطاط آغا صاحب کر رہے تھے جو شبیہ الحسن

ا۔ کہا جاتا ہے کہ آزادیٔ ہند سے قبل جب آل انڈیا ریڈیو نے ایک پندرہ روزہ اردو جریدے کی اشاعت کا فیصلہ کیا تو مجازؔ نے جو وہاں ملازم تھے اس کا نام ''آواز'' تجویز کیا۔ ڈبلو۔ زیڈ۔ بخاری کو جو ڈائرکٹر جنرل تھے یہ نام بہت پسند آیا۔ مجازؔ ہی اس رسالے کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ افسوس آل انڈیا ریڈیو کے اس جریدہ کی اشاعت ۱۹۹۵ء کے آس پاس بند کر دی گئی۔ (مصنف)

کے گھر کے پاس ہی رہتے تھے، میں نے مقدمہ رات ہی میں کاتب صاحب کو دے دیا اور اس کا پہلا مطالعہ پروف ریڈنگ کے دوران کیا۔

مقدمہ میں دو تین افسانوں کی خاص طور سے تعریف تھی جس میں ''سب سے چھوٹا غم'' سرفہرست تھا۔ ظاہر ہے اچھا لگا۔ بعد میں انھوں نے میرے افسانوں پر دو اور مضامین لکھے۔ مجھے ان مضامین کی یہ ادا خاص طور سے پسند ہے کہ انھوں نے ان افسانوں کے بارے میں جو انھیں پسند نہیں آئے کسی قسم کی مروت سے کام نہیں لیا ہے۔

گیان چند جین

''سب سے چھوٹا غم'' کو یوپی اردو اکادمی نے اپنے دوسرے بڑے انعام کی مستحق کتابوں میں شامل کیا۔ اس انعام کی رقم دو ہزار روپے تھی یہ بات ۱۹۷۶ء کی ہے۔ میرے دوست نیر مسعود کو اس انعام پر حیرت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ میرا افسانوی مجموعہ ہزار سوا ہزار سے زائد کا مستحق نہ تھا۔ یہ بات انھوں نے دوسروں سے نہیں مجھ سے کہی اور ان کی یہ صاف گوئی مجھے اچھی لگی۔ لیکن اس انعام کے متعلق ایک زیادہ حیرت افزا واقعہ بھی ہے۔

ایک دن باتوں باتوں میں صباح الدین عمر مرحوم نے بتایا کہ ڈاکٹر گیان چند جین کا اصرار تھا کہ یہ کتاب کچھ بڑے انعام کی مستحق ہے۔ دو ہزار کا انعام تو سلمیٰ صدیقی کے افسانوی مجموعے ''نئے چراغ'' کو بھی دیا گیا ہے جب کہ ''سب سے چھوٹا غم'' بہتر افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انعام کی رقم میں پانچ سو روپوں ہی کا اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن رقم محدود تھی اس لیے گیان چند جین کی خواہش پر عمل نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر جین سے ''ماہنامہ کتاب'' کے حوالے سے خط و کتابت تو رہ چکی تھی لیکن مجھے اس وقت تک ان کا نیاز حاصل نہ تھا اس لیے ''سب سے چھوٹا غم'' میں ان کی دلچسپی پر مجھے خاصی حیرت تھی۔

ایک دن میں نے فروغ اردو (امین آباد) کے پاس کپڑوں کی ایک دوکان میں ایک ایسے صاحب کو داخل ہوتے دیکھا جن کی صورت ڈاکٹر جین کی ان تصاویر سے ملتی جلتی تھی جو دو چار رسائل میں دیکھ چکا تھا، ممکن ہے ''ماہنامہ کتاب'' میں بھی ان کی تصویر شائع ہوئی ہو۔

میں نے بڑھ کر معذرت خواہانہ انداز میں ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ گیان چند

جین صاحب ہیں۔

انھوں نے مسکرا کر، جسے بمشکل مسکراہٹ کہا جا سکتا تھا، اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اپنا اور اہلیہ کا تعارف کرانے کے بعد، جو اس وقت میرے ساتھ تھیں، اردو کادمی کی مجلس منتظمہ کے جلسے میں میری وکالت کرنے کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میرے اس شکریے نے انھیں کسی قدر ناراض کر دیا۔ وہ بولے، ''اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ میں نے کسی قسم کی جانبداری تو برتی نہ تھی۔ آپ سے ذاتی طور سے واقف بھی نہ تھا۔''

''سب سے چھوٹا غم'' کے بارے میں ان کا خیال صحیح تھا یا غلط اس سے مجھے بحث نہیں، میں ان کے کھرے رویّے سے متاثر ہوا تھا اور برسوں بعد ان کی آخری کتاب سے جنم لینے والے ہنگامے میں مجھے سب سے زیادہ افسوس اس کا تھا کہ ساری زندگی کی کمائی انھوں نے کس آسانی سے غارت ہو جانے دی۔

یادداشت نے دھوکا دیا

''سب سے چھوٹا غم'' سرور صاحب کو بھیجی تو انھوں نے بعض افسانوں کی تعریف کی، نثر کی خاص طور سے اور یہ بھی لکھا کہ لکھتے رہیے۔ یہ اشارہ میری کوتاہ قلمی کی جانب تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کتاب پر کچھ لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔[1]

علی گڑھ میں میرا چھوٹا بھائی ڈاکٹر محمد عمران مقیم تھا اور میڈیکل کالج سے متعلق۔ والدہ اسی کے ساتھ رہتی تھیں کیوں کہ میرا قیام دوسری منزل پر تھا اور گھٹنوں کے درد کے سبب ان کے لیے زینے چڑھنا اترنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ علی گڑھ میں دوسرے اعزا بھی تھے اور میرا آنا جانا لگا رہتا۔

''سب سے چھوٹا غم'' کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی نوبت آئی تو میں نے سرور صاحب کا خط تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ میں کتاب کے گرد و پوش پر ان کے خط کی چند سطریں شائع کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت تک میں نہیں جانتا تھا کہ ذاتی خطوط میں ظاہر کی جانے والی توصیفی آرا کو عام نہیں کرنا چاہیے۔

اسی دوران علی گڑھ جانا ہوا تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تھوڑی دیر بعد ان

۱۔ سرور صاحب کے خط کے لیے دیکھیے کتاب کے آخری صفحات۔

سے عرض کیا کہ آپ نے اس اس طرح کی رائے ظاہر کی تھی، مناسب سمجھیے تو چند سطریں لکھ دیجیے۔ اس وقت آپ کا خط مل نہیں رہا ہے۔

میری بات سن کر آل احمد سرور گویا تصویرِ حیرت بن گئے۔

''میں نے خط لکھا تھا!''

''میں نے تعریف کی تھی!''

''میں نے کچھ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا!''

غلطی مجھ سے بس یہ ہوئی تھی میں نے اپنا مدّعا بیان کرنے سے پہلے ڈاکٹر عبدالعلیم کے کسی گم شدہ مضمون کا ذکر کر دیا تھا جو ایک دن قبل ہی علی گڑھ میں ایک صاحب سے حاصل ہوا تھا۔ ان کا نام سنتے ہی سرور صاحب کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے تھے۔

آل احمد سرور نے عبدالعلیم سے تعلقات ہمیشہ استوار رکھے۔ ایک لفظ ان کے خلاف کہا نہ لکھا، اگرچہ عبدالعلیم نے اپنی ایک تقریر میں، اور وہ بھی ان کی موجودگی میں، شاعرانہ نثر نگاری کو فروغ دینے کے لیے ان کی نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد اپنی خود نوشت سوانح حیات ''خواب باقی ہیں'' اور علی گڑھ شعبۂ اسلامیات سے شائع ہونے والی کتاب ''علیم صاحب'' میں سرور صاحب نے جگہ جگہ ان کی چٹکیاں لی ہیں، دو ایک جگہ کھل کے تعریف بھی کی ہے تاہم ان کے مضمون کے بعض حصّوں کا شمار ہجوِ ملیح کے نادر نمونوں میں کیا جائے گا۔

تقریباً ایک سال بعد جب میری کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا، سرور صاحب کا وہ خط مل گیا۔ اگلی بار علی گڑھ جانا ہوا تو میں نے انھیں وہ خط دکھایا۔ انھوں نے پورا خط پڑھا اور مجھ سے آنکھیں ملائے بغیر تسلیم کیا کہ نفسِ مضمون ان کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ میں نے صرف انھیں جلانے کے لیے علیم صاحب کی خوب خوب تعریف کی۔

اب سوچتا ہوں تو اپنی کمینگی پر شرمندگی ہوتی ہے۔

سرور صاحب کا رویہ اپنی جگہ لیکن ان کی خوش بیانی اور خوش گفتاری اور شخصیت کی موہنی بھلائے نہیں بھولتی۔

''سب سے چھوٹا غم'' کی دوسری اشاعت میں یہ التزام رکھا گیا کہ افسانوں کے بارے میں ناموافق آرا توصیفی آرا سے کم نمایاں نہ رہیں۔ اصغر علی انجینئر نے اس کتاب پر ہفت روزہ ''کلے رٹی'' (Clarity) میں ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا۔ میں نے اس کے اقتباسات فلیپ

پر چھاپے لیکن یہ خیال رکھا کہ ایک بھی ایسا جملہ جس میں میرے افسانوں یا افسانہ نگاری کی خامیوں کی نشاندہی ہو، شامل ہونے سے نہ رہ جائے۔ ایک صاحب نے اپنے تبصرے میں لکھا تھا کہ ان افسانوں نے مایوس کیا ہے۔ ان کا متعلقہ پیراگراف پورے کا پورا نمایاں ترین مقام پر شائع کیا گیا تھا۔

اس روئیے کو یوں تو وسیع القلبی کہا جائے گا لیکن دل کے ایک کونے میں یہ چور بھی رہا ہوگا کہ دیکھو تم نے جس افسانوی مجموعے کو دو کوڑی کا قرار دیا تھا اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ناموافق آرا کی نمائش کو فوقیت دے کر میں نے خود کو ایک ایسا شخص ظاہر کرنے کی کوشش کی ہو جو نکتہ چینی بلکہ تنقیص تک سے آزردہ خاطر نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اس عمل میں یہ دونوں عناصر شامل تھے۔

بھٹا بابو

نیشنل ہیرالڈ میں وشنو شنکر سے پہلے جو صاحب ٹیلی پرنٹر آپریٹر تھے، ان کا پورا نام تو نہیں یاد لیکن سب انھیں بھٹا بابو کہتے۔ چھوٹے سے قد، دبلے پتلے جسم، شیو تیسرے چوتھے دن بھی نہ کرنے کے سبب چہرے پر کھچڑی بال... ان سب نے مل ملا کر انھیں مسکینی اور ستم رسیدگی کی تصویر بنا دیا تھا۔ اس پر مستزاد تھا ان کی بیوی کا پاگل پن۔ ان کی ساری چھٹیاں بیوی کو اسپتال لانے لے جانے اور تیمارداری کی نذر ہوتیں۔ عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ بھٹا بابو بے حد بے وقوف ہیں۔

ایک دن میں اور انیس اسکوٹر سے حضرت گنج جا رہے تھے۔ کرسچین کالج کے پاس میں نے دیکھا کہ بھٹا بابو رکشے پر اپنی بیوی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں۔ شاید اسپتال جا رہے تھے۔ گھر میں ان کا ذکر کر چکا تھا۔ میں نے بھٹا بابو کو پہچنواتے ہوئے انیس سے کہا کہ ''بیوی شوہر کی بے وقوفی سے پاگل ہوگئی ہے۔''

انیس نے فوراً تبصرہ کیا، ''بیوی کو تو پاگل ہونا ہی ہے، اپنی بے وقوفی سے ہو یا شوہر کی بیوقوفی سے۔''

میں انیس کو اکثر پاگل کہا کرتا تھا۔ یہ اس کا جواب تھا۔

اس جواب پر مجھے اتنی زور کی ہنسی آئی کہ میں نے اس خوف سے کہ اسکوٹر لڑھک نہ

جائے بریک لگادیا اور ہم ہنسی پر قابو پانے کے بعد ہی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو سکے۔

ایک بار مہینے کی پہلی تاریخ کو میں ٹیلی پرنٹر روم میں گیا تو بھقا بابو ایک مڑے تڑے کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ بائیں جانب بنگالی میں کچھ لکھا تھا اور داہنی جانب انگریزی میں روپے پیسے۔

''تو بجٹ بن رہا ہے بھقا بابو!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بجٹ کیا صاحب،'' بھقا بابو نے کہا ایسے جیسے بھیک مانگ رہے ہوں۔

میرے سوال میں تھوڑا سا مذاق ضرور شامل رہا ہوگا، یا شاید مذاق اڑانے کی معمولی سی کوشش۔ ان کو بمشکل چار پانچ سو روپے تنخواہ ملتی رہی ہوگی۔ اتنے سے روپوں کا بھلا بجٹ کیا ہوگا۔ لیکن میرے اصرار پر انھوں نے اندراجات پڑھنا شروع کر دیے۔

پہلے اندراج ہی میں بنگالی کے ادبی ماہنامے اور ایک ہفت روزہ کے نام تھے۔ میں ان رسائل کے نام سے واقف نہ تھا۔ یہ بات میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوئی، اور یہ بھی کہ ان کی قیمت ۱۶ روپے تھی۔

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

اس وقت آئینے میں اپنی صورت دیکھنی ممکن نہ تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ بھقا بابو کے چہرے کو تو ستم زدگی نے مسخ کر رکھا تھا، میرے چہرے پر پھٹکار ضرور برس رہی ہوگی، میرے ہی نہیں اردو کے ان سارے عاشقوں کے چہروں پر جو اس زبان سے محبت کا دم تو خوب خوب بھرتے ہیں لیکن ایک رسالہ یا کتاب خریدنے میں ان کی جان نکلنے لگتی ہے۔

'جینے والے'

میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ''جینے والے'' تیئیس سال بعد ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں نہ کسی کا مقدمہ ہے نہ فلیپ یا گرد پوش کی پشت پر کسی کی رائے۔ یہ میرا سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ ''سب سے چھوٹا غم'' کے پہلے ایڈیشن میں محمد حسن کے مقدمے اور اپنے دوست رتن سنگھ اور قیصر تمکین کی مختصر آرا اور بعد میں کتاب پر تبصروں اور دوسرے ایڈیشن میں ان میں سے چند لوگوں کی آرا کی اشاعت کے بعد مجھے کسی قسم کے تعارف کی ضرورت نہیں کیوں کہ لوگ میرے افسانوں کے بارے میں نہ صرف اپنی رائے قائم کر چکے ہیں بلکہ اب دونوں قسم کی رایوں سے

واقف بھی ہیں اور بیساکھی لگائی تو سہارا دینے کے بجائے بوجھ سے وہ خود ہی ٹوٹ جائے گی۔

یہ بات میرے دوست اقبال مجید کو بہت بری لگی۔ انھوں نے کچھ اس طرح کی بات لکھی کہ ''خود کو بہت بڑا افسانہ نگار سمجھنے لگے ہو اس لیے تم نے کسی دوسرے ادیب اور ناقد کی رائے نہیں چھاپی۔ مجھے ان افسانوں سے باسی پن کی بو آتی ہے۔'' جب کہ میرے خیال میں یہ افسانے صرف ان معنوں میں باسی تھے کہ رسائل میں شائع ہو چکے تھے لیکن کسی رسالے میں اشاعت یا وقت گذرنے سے کوئی افسانہ باسی ہو جاتا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ افسانہ باسی ہو تو پہلی اشاعت میں بھی باسی ہی رہے گا۔ یہی بات میں نے اقبال مجید کو لکھ دی۔

''جینے والے'' پر خاصے تبصرے شائع ہوئے۔ یہ کتاب سراہی بھی گئی اور ناپسند بھی کی گئی۔

اسی طرح کا سلوک میں نے ''فکشن کی تنقید'' کے ساتھ بھی روا رکھا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے جو بات لکھی اس کا اطلاق افسانوی مجموعے پر بھی ہوتا ہے اور مجھے ان کی رائے قابلِ توجہ معلوم ہوئی۔ انھوں نے لکھا تھا۔

> ''عابد سہیل کی کتاب فکشن کی تنقید (چند مباحث) میں بعض اچھوتے زاویے نظر آئے تھے۔ معاً یہ خیال آیا کہ انھیں یہ مشورہ دیا جائے کہ اپنے بارے میں ہم عصروں کی تحریروں کو مختصر تقریظی تحریروں کے طور پر شائع کرنے کو بیساکھیوں سے تشبیہ دے کر عابد سہیل نے اس کتاب کی پشت پر شامل تحریر بہ عنوان ''اعتذار'' میں غیر ضروری طور پر بے جا زود حسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ عابد سہیل اپنے ہم عصروں کی صائب آرا کو اپنے لیے غیر ضروری سمجھ سکتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے کیوں؟ اس طرح ان کے فن کے بارے میں قارئین ادب کے اذہان میں کچھ زیادہ اسپیس ہی پیدا ہوگی۔ بہتر ہے کہ وہ اسے بے ضرر سمجھیں۔ شاید انگریزی شاعر Pope نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ جو کچھ ہوتا آ رہا ہے وہ بس ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ (ارتقا، شمارہ ۳۱)

بات دل کو لگی لیکن ''میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا'' والی کیفیت بھی پیدا ہوئی۔ ''جینے والے'' کو یو پی اردو اکادمی نے تین ہزار روپوں کے انعام سے نوازا۔ کچھ بہت اچھا نہیں لگا لیکن تکلیف ہوئی مشہور نقاد و محقق علی جواد زیدی کو ڈیڑھ ہزار روپوں کے انعام سے۔ میں

نے زیدی صاحب یا کسی اور سے اپنی اس تکلیف کا ذکر نہیں کیا مگر اکادمی کے اس وقت کے سپرنٹنڈنٹ کاظمی صاحب کو بذریعہ فون اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا کہ میں انعام قبول نہیں کروں گا۔ شیمہ رضوی کو بھی جو اس وقت اکادمی کی سربراہ تھیں ایک خط لکھ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرا وہ خط انھیں نہیں ملا اور ملتا بھی کیسے، پتہ ہی نامکمل تھا لیکن میرے مکمل پتے کے باوجود واپس بھی نہ آیا۔ میں نے انعام قبول کرنے سے معذرت چند سطری خبر کے طور پر مقامی اخباروں میں شائع کرادی لیکن اپنے اس فیصلے کا کوئی سبب نہیں لکھا، صرف ''بوجوہ'' سے کام چلالیا۔

چند دنوں بعد چھے سات دوسرے ادیبوں نے انعام قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی، ان میں علی جواد زیدی بھی شامل تھے۔

پھر ایک دن زیدی صاحب نے فون کر کے انعام واپس کرنے کا سبب پوچھا تو میں نے سچی بات بتادی۔ انھیں حیرت تھی کہ کوئی کسی دوسرے کی ناقدری سے بھی آزردہ خاطر ہو سکتا ہے، خاص طور سے یوں کہ ان دنوں جب وہ اکادمی کے سربراہ تھے ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ انھوں نے ایک مرتبہ کتاب کے سرِ ورق پر میرے نام کی اشاعت روک دی تھی اور میں نے مہینوں بعد یہ معلوم ہونے پر کہ یہ بھول چوک نہیں ایک ارادی عمل تھا، اس کتاب کی فروخت رکوادی تھی۔ دوردرشن کے ایک مباحثہ میں بھی ان کے ساتھ میرا رویہ قطعاً نامناسب تھا۔ لیکن اس وقت میں نے ان باتوں کو اپنی یادوں سے ڈھکیل دیا۔

چار چھے ماہ بعد جب چیک آئے تو سب نے قبول کر لیے۔ میرے انعام کے چیک کی رجسٹری میری عدم موجودگی میں وصول کر لی گئی لیکن میں نے اگلے ہی دن معذرت کے ساتھ چیک واپس کر دیا۔ اسی دوران زیدی صاحب نے فون کر کے پوچھا کہ اب چیک آگیا ہے تو کیا کیا جائے۔ میں نے کہا دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے بینک میں جمع کر دیا جائے، دوسرا یہ کہ جس طرح آیا ہے، یعنی بذریعہ ڈاک، اسی طرح واپس کر دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اب رجسٹری کرنے کے لیے ڈاک خانے کسے بھیجوں، پڑا رہے گا، چھے مہینے بعد آپ ہی ساقط ہو جائے گا۔

میں اپنے دل کا چور کیوں چھپاؤں۔ اس وقت میں سمجھا تھا کہ زیدی صاحب آئے ہوئے دھن کو ٹھکرانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ لیکن دو چار دن بعد انھوں نے کسی کے ذریعے چیک واپس کر دیا۔

چوں کہ انعامات تقریباً ان سب لوگوں نے بھی قبول کر لیے تھے جو اسے مسترد کر چکے تھے اس لیے عام طور پر یہ مان لیا گیا کہ میں نے بھی انعام کی رقم چپ چپاتے قبول کر لی ہے۔ مجھ سے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا اور شاید لوگوں کے اس عام خیال کا مجھے علم بھی نہ ہوتا اگر نیر مسعود ایک دن ذکر نہ کرتے کہ بعض لوگوں کے خیال میں انعام کی رقم میں نے بھی قبول کر لی ہے۔ میں نے کہا مجھ سے تو کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا ورنہ میں اس کی غلط فہمی دور کر دیتا۔ نیر مسعود کے اس مشورہ پر کہ میں اس غلط فہمی کی تردید کر دوں میں نے کہا کہ کوئی یہ الزام کھلے عام لگائے تو میں اس کی تردید کر دوں لیکن جو بات تحریری طور پر نہ کہی گئی ہو اس کی تردید کیسے کی جائے۔ چنانچہ واحد صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی اخبار کے مراسلات کے کالم میں یہ الزام لگائے کہ میں نے اعلان کے باوجود انعام قبول کر لیا ہے تو میں اس کے جواب میں صحیح صورت حال بیان کر دوں۔ نیر مسعود میرے اس خیال سے متفق تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ کسی سے اس قسم کا خط لکھوا دیجیے، انھوں نے کوشش کرنے کا وعدہ بھی کیا لیکن شاید بھول گئے۔

بعد میں میرے ہی کہنے پر ایک شناسا نے لکھنؤ کے ایک اخبار میں خط بھیجا تا کہ اس غلط فہمی کے ازالے کی صورت نکل آئے لیکن وہ خط وہاں شائع نہ ہوا۔ قصہ اصل میں یہ تھا کہ اس وقت شہر کے بیشتر انگریزی اور اردو اخبارات میں وہ لوگ چھائے ہوئے تھے جو قومی آواز اور نیشنل ہیرالڈ میں میرے ساتھ کسی نہ کسی حیثیت سے کام کر چکے تھے چنانچہ یہ خط شاید اس خیال سے شائع نہ کیا گیا کہ اس سے میری سبکی ہوگی... ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے۔ لیکن یہ کام ہو ہی گیا اور زیادہ بہتر طریقے سے۔

ایک دن سبطِ محمد نقوی صاحب نے مجھ سے صاف صاف لفظوں میں (وہ باتیں صاف صاف ہی کرتے اور لگی لپٹی نہ رکھتے) کہا، ''سہیل صاحب آپ نے بھی انعام قبول کر لیا،'' میں نے انکار کیا تو انھوں نے بھی تردید کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اپنی دلیل دہرائی تو انھوں نے کہا، ''تردید میں کروں گا'' اور دوسرے یا تیسرے دن اپنے ایک خط میں جو ''روزنامہ اِن دنوں'' میں شائع ہوا تھا، انھوں نے جانے کیسے یہ موضوع چھیڑا اور غلط فہمی کی تردید کر دی۔ نقوی صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ صاف گوئی اور بے باکی میں ان کے واحد حریف رشید حسن خاں ہی قرار دیے جاسکتے تھے۔

پندار کا صنم کدہ...

تیسرے افسانوی مجموعے ''غلام گردش'' کی طباعت کی نوبت آئی تو محمد علی صدیقی کی ''بے جا زود حسی'' پر اعتراض کا خیال آیا۔ سوچا بات تو بڑی حد تک ٹھیک ہے، کیوں نہ ان کی شکایت دور کر دی جائے لیکن گرد و پوش کا ڈیزائن تیار ہو چکا تھا اور چونکہ اس کے لیے میں نے کوئی عبارت نہیں دی تھی اس لیے پشت بھی ڈیزائن میں شامل کر لی گئی تھی، البتہ فولڈرس خالی تھے۔ میرے مشورہ پر آرٹسٹ نے گرد و پوش کے آخری صفحہ کی جگہ بھی فراہم کر دی اور میں نے تین چار لوگوں کی رائیں انھیں دے دیں۔ ان میں ایک رائے ڈاکٹر نگینہ جبیں کی ہے جو کانپور کے کسی کالج میں اردو پڑھاتی ہیں اور جنھوں نے چند سال قبل ہی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کیا ہے۔ ان کی رائے کی شمولیت پر ایک صاحب کو سخت اعتراض ہوا۔ انھیں شکایت یہ تھی کہ مجھ ایسے ''سینیئر'' ادیب نے ایک ''بچی'' کی رائے شامل کر لی۔

شاید دو چار لوگوں کو یاد ہو کہ ان دنوں جب اردو ادب کے دو مخالف گروپوں کے کچھ لوگ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے (ماشاء اللہ اب بھی ہیں) میں نے ایک باوقار جریدے میں اپیل کی تھی کہ خدارا اپنے گندے کپڑے سرِ راہ نہ دھوئیے۔ اس وقت انھی بزرگ ادیب نے الزام لگایا تھا کہ میں دونوں گروپوں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

کہنا صرف یہ ہے کہ ''نہ کردن یک عیب، کردن صد عیب۔''

ایک بات اور: ''غلام گردش'' کا سرِ ورق مشہور آرٹسٹ مصلح احمد کے موقلم کا نتیجہ ہے اور وہ بھی صرف اس عنوان کا افسانہ پڑھ کر۔ افسانے تو خیر جیسے ہیں ویسے ہیں ہی، سرورق کا کمال یہ ہے کہ افسانہ لکھتے وقت غلام گردش کے اصل کردار کی جو تصویر میرے ذہن میں تھی ہو بہو وہی اس ڈیزائن میں ہے جب کہ افسانے میں شکل و صورت کی ذرا بھی تفصیل نہیں دی گئی ہے۔

عذر کچھ چاہیے ستانے کو

غالباً ۲۰۰۲ء کے شروع میں ڈاکٹر انیس اشفاق اور ڈاکٹر قمر جہاں کو جو اس وقت بالترتیب لکھنؤ اور بنارس یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبوں کے صدر تھے، اردو اکادمی کی مجلس عاملہ سے برطرف کر کے الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور کاشی ودّیا پیٹھ کے مشترکہ شعبۂ اردو ہندی

کے سربراہوں کو ان کی جگہ نامزد کر دیا گیا۔

انیس اشفاق کا ''قصور'' بس یہ تھا کہ انھوں نے مجلس عاملہ کے ایک جلسے میں جو سراسر غیر قانونی تھا کہ اسے ایک ایسے شخص نے طلب کیا تھا جو اس وقت تک باقاعدہ طور پر اردو اکادمی کا وائس چیرمین نامزد بھی نہیں کیا گیا تھا، سخت اعتراض کیا۔ ڈاکٹر قمر جہاں نے ان کی حمایت کی، چنانچہ وہ بھی ''سزا'' کی مستوجب قرار پائیں۔ اس جلسے میں اردو اکادمی کے دستور میں تبدیلی کی ایک ایسی تجویز بھی پیش کی گئی جس کی منظوری کے بعد اکادمی باقاعدہ طور سے ایک سرکاری محکمہ بن جاتی اور بہت ممکن تھا کہ اسے ہندی سنستھان میں ضم کر دیا جاتا۔ لیکن ان دونوں حضرات کی شدید مخالفت کے سبب جلسہ برخاست کر دیا گیا اور تقریباً ایک مہینے بعد انھیں مجلس عاملہ سے برطرف... بہانے تو ایسے کاموں کے ڈھونڈھ ہی لیے جاتے ہیں۔

بدلتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت

برطرفی کے فیصلے کے خلاف سید سبطِ محمد نقوی نے روزنامہ ''ان دنوں'' میں سخت احتجاج کیا اور انھوں نے اپنے مراسلے میں نو نامزدگان سے اس درخواست کے علاوہ کہ وہ مجلس عاملہ کی رکنیت قبول نہ کریں۔ انھوں نے اردو کی مختلف انجمنوں سے یہ اپیل بھی کی کہ ان دونوں برطرف شدہ اراکین اکادمی کو اردو کے مجاہدین کی طرح استقبالیے دیں لیکن کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔

مثلث اور مربع

روزنامہ صحافت کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۹۵ء کے آخر یا ۱۹۹۶ء کے ابتدائی مہینوں میں شروع ہوا۔ عرفان صدیقی اور روزنامے کے مالک امان عباس کے بڑے بھائی طاہر عباس نے مجھ سے اس روزنامہ کی ادارت قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن میں ان دنوں روزنامہ پائنیر سے متعلق تھا اس لیے بطور مدیر نام کی اشاعت شاید مناسب نہ تھی۔ تاہم ان دونوں حضرات کے اصرار پر اداریہ لکھنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے علاوہ بطور مشیر خصوصی اپنے نام کی اشاعت کی اجازت میں نے دے دی۔

ان دنوں عرفان صدیقی لکھنؤ میں مرکزی حکومت کے انفارمیشن بیورو کے سربراہ تھے لیکن ان کی سبکدوشی کا دن جیسے اڑا چلا آ رہا تھا۔ فطری طور سے ان کی خواہش تھی کہ ملازمت میں

توسیع کی کوئی صورت نکل آئے۔ ایک دن امان عباس نے ان کی اس خواہش کا ذکر کیا تو میں نے انھیں بتایا کہ حکومت مدّتِ ملازمت میں توسیع کی پالیسی ترک کرچکی ہے اس لیے یہ تو ممکن نہیں ہاں معاہدہ کے تحت ملازمت کی کوئی صورت ضرور نکل سکتی ہے لیکن معلوم نہیں ترسیل کی ناکامی کا المیہ کہاں واقع ہوا... میرے اور امان عباس کے درمیان یا امان عباس اور عرفان صدیقی کے درمیان ... کہ انھیں یہ خیال ہوا کہ میں ان کی ملازمت کی توسیع پسند نہیں کرتا اور ہمارے خاصے اچھے تعلقات میں ہلکی سی درار پڑگئی۔

بہر حال ہوا وہی جو ہونا تھا۔ ملازمت میں توسیع نہیں ملی اور معاہدہ کے تحت دہلی میں ملازمت کی پیش کش کی گئی۔ معاہدے کی اس ملازمت میں مشاہرہ پہلے سے کم تھا اور انھوں نے بجا طور پر معذرت کرلی۔

عرفان صدیقی سگریٹ بہت پیتے تھے۔ ایک زمانہ میں سگار اور پائپ بمشکل ہی میرے مُنہ سے چھوٹتا تھا لیکن یہ سلسلہ تیس پینتیس برس قبل ختم ہوچکا تھا۔ میں انھیں مسلسل سگریٹ نوشی پر ٹوکتا اور وہ میرے سفید بالوں کا اتنا خیال ضرور کرتے کہ میرے سامنے ایک سگریٹ سے دوسری نہ جلاتے۔ ایک دن سہکارتا بھون میں کوئی ادبی جلسہ تھا۔ اس کا اختتام قریب آیا تو ہم لوگ باہر آکر باتیں کرنے لگے۔ پھر میں نے سائکل اسٹینڈ سے اسکوٹر حاصل کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اس کام میں وقت لگے گا چنانچہ دوستوں کے پاس لوٹ آیا۔ میں وہاں پہنچا تو عرفان صدیقی پہلی سگریٹ سے دوسری جلارہے تھے جو مجھے دیکھتے ہی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ہم دونوں ہی مسکرانے لگے۔ نیر مسعود بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بھی ہنس دیے۔

ایک دن عرفان صدیقی شہریار کو لے کر نصرت پبلشرز آئے اور بولے، ''اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔'' لیکن کچھ ہی دنوں بعد ''یہ سخت مقام'' ان کا ایک حوالہ بن گیا۔ دراصل معاملہ یہ تھا کہ وہ کسی سے زیادہ دنوں ناراض نہیں رہ سکتے تھے۔

مجھے ان کی علالت کا علم ہوا تو میں پی۔جی۔آئی۔ گیا۔ پلنگ پر بیٹھے تھے۔ صورت سے اچھے خاصے صحت مند لگ رہے تھے۔ میں نے انھیں کا شعر پڑھا

ہوشیاری دلِ نادان بہت کرتا ہے
رنج کم سہتا ہے، اعلان بہت کرتا ہے

خوش ہوئے۔ یہ وہی دن تھا جب شمس الرحمان فاروقی نے اپنے محکمے کے ایک بڑے ڈاکٹر کو ان کی علالت

کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ خوش تھے کہ ان کے دوستوں کو ان کی صحت کی اتنی فکر ہے۔

لکھنؤ میں شمس الرحمان فاروقی، نیرّ مسعود اور عرفان صدیقی کی حیثیت بے حد قریب دوستوں کے مثلث کی تھی۔ میری دوستی ان تینوں سے تھی لیکن اتنی نہیں کہ مثلث مربع بن جائے۔

اقبال سمّان

انعام واکرام ادیب کی منزل نہیں ہوتے، نہ ان سے ادیب کا ادبی قد بلند ہوتا ہے، نہ ان سے محرومی تخلیقات کو کم عیار کرتی ہے۔ پھر بھی مالی پہلو سے قطع نظر ان سے مصنف کو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس کی لگن کارِعبث نہیں۔

۱۹۹۲ء میں ایک دن بھوپال سے بذریعہ فون دریافت کیا گیا کہ اقبال سمّان کی جیوری میں شامل ہونے پر مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ ظاہر ہے مجھے کیا قباحت ہوسکتی تھی لیکن حیرت ضرور تھی کہ نظرِ انتخاب مجھ پر کیسے پڑی۔

ہفتے عشرے بعد باقاعدہ خط آیا جس کے ساتھ ان کابرین کی فہرست بھی تھی جو اس انعام سے نوازے جا چکے تھے۔ اس فہرست میں ڈاکٹر محمد حسن کا نام نہ تھا۔ میں نے اسی وقت طے کر لیا کہ ان کے نام کی پرزور وکالت کروں گا کیوں کہ ان کی ادبی خدمات کا اس حد تک اعتراف نہیں کیا گیا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ کئی دن بعد میرے ایک ادبی دوست آئے تو میں نے اپنے ارادے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر محمد حسن کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ محمد حسن نے بھی بہت زیادتیاں کی ہیں۔ وہ اور محمد حسن برسوں ماڈل ٹاؤن میں ساتھ ساتھ رہ چکے تھے، پھر دہلی ہی میں انھوں نے اپنا مکان بنالیا تھا۔ دونوں ہی ایک عرصہ تک دہلی یونیورسٹی سے بھی متعلق رہے تھے، ایک دوسرے کو خوب خوب جانتے اور یہ بھی کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ لیکن میں صرف یہ چاہتا تھا کہ محمد حسن کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔

بھوپال جا کر معلوم ہوا کہ جیوریز میں ڈاکٹر صدیق الرحمان اور ڈاکٹر وہاب اشرفی بھی ہیں۔ ہم لوگوں کا قیام شملہ کے ایک سرکاری ہوٹل میں تھا۔ میٹنگ اگلے دن ہونی تھی۔ پہلے دن ہم لوگوں میں انعام کے سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن اگلی صبح وہاب اشرفی اور صدیق الرحمان میرے کمرے میں آئے اور ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ہم سب میں سینیر ہیں اس لیے ہم لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کے خیال میں اس انعام کا مستحق کون ہے۔ میں

نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تو ان دونوں نے کہا کہ وہ میری رائے سے متفق ہیں۔ وہاب اشرفی کے کچھ تحفظات ضرور تھے، جن کا علم مجھے بعد میں ہوا، لیکن انھوں نے بزرگی بہ عقل کے بجائے بزرگی بہ عمر کی رعایت برتتے ہوئے میرے سفید بالوں کی لاج رکھ لی۔

مدھیہ پردیش کے محکمۂ ثقافت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ چند اخباروں میں اشتہار دے کر اپنے انعامات کے لیے عام لوگوں کی رائے بھی حاصل کرتی ہے اور اس سلسلے میں موصول ہونے والے خطوط میٹنگ میں ہی کھولے جاتے ہیں۔ ان خطوط سے فیصلے میں ایک طرح کا جمہوری عنصر شامل ہو جاتا ہے، اگرچہ سب کچھ کرتے جیوری ہی ہیں۔ پھر بھی عین ممکن ہے کہ کوئی اہم نام جیوریز کے ذہن میں نہ آیا ہو جو کسی خط سے منظرنامے پر آجائے۔ لفافے بمشکل دس بارہ تھے اور غالباً ان میں سے دو میں وہاب اشرفی کا نام تجویز کیا گیا تھا اور ایک میں اقبال مجید کا۔ ایک جیوری نے وہاب اشرفی سے کہا کہ آپ نے ابھی رجسٹر میں دستخط نہیں کیے ہیں اس لیے میٹنگ میں شرکت نہ کریں تو ہم فیصلہ آپ کے حق میں کر دیں۔ لیکن انھوں نے اس تجویز کو جو ممکن ہے مذاق ہی رہی ہو، کوئی اہمیت نہ دی۔ ان کے اس رویّے سے میری نظروں میں ان کی عزّت کچھ اور بڑھ گئی۔

میٹنگ میں صرف ایک رکن نے علی گڑھ کے ایک صاحب کا نام پیش کیا اور اس نام پر اس قدر بضد ہو گئے کہ انھوں نے اختلافی نوٹ تک لکھنے کی دھمکی دے ڈالی لیکن محکمۂ ثقافت کے سکریٹری کی اس وضاحت کے بعد کہ فیصلہ متفقہ نہ ہونے کی صورت میں انعام سوخت ہو جائے گا، انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

یہ میٹنگ صبح صبح ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کسی کی آواز کمرے کے باہر سنائی بھی نہ دی ہوگی۔ ہندی کے انعام کے سلسلے میں جلسہ اس وقت ہوا جب ہم لوگ ڈائننگ ہال میں تھے جو میٹنگ کے کمرے سے خاصی دور تھا لیکن اس کے باوجود وہاں کا شور و غل ہمیں سنائی دے رہا تھا۔

میں بھوپال میں تین چار دن رہا۔ چند اعزا سے ملاقات کی اور ان مقامات کی زیارت جن سے تقریباً پچاس سال قبل کے دو ڈھائی سال کے قیام کے دوران کی یادیں وابستہ تھیں۔

تین چار مہینے بعد ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ تمھارا نام ہزار کوششوں کے بعد اس امید سے رکھوایا تھا کہ تم میری پیروی کرو گے لیکن تم نے تو میرا نام تک نہیں لیا۔ جیوری میں اپنی شمولیت پر حیرت تو پہلے بھی تھی کہ کہیں ''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں'' کی صورت نہ ہو لیکن

راز اب کھلا اور افسوس ہوا کہ مجھے جس مہرے کو آگے بڑھانے کے لیے جیوری کا رکن بنایا گیا تھا اس کو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

خیر ''غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس'' کے سہارے انھوں نے ہمت نہ ہاری اور خوش قسمتی سے ایک سال ان کے سارے دوست انصاف کی ترازو کے ایک پلڑے میں انھیں بٹھا کر دوسرے پلڑے میں باٹ رکھنا ہی بھول گئے۔ ظاہر ہے انھیں ''سرخرو'' ہونے سے کون روک سکتا تھا۔

پھر بھی، جو کچھ ہوا اس میں انصاف کا کم سے کم شائبہ تو تھا، اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ خود کو اردو کا ادیب کہتے شرم آتی ہے۔ دو تین سال قبل ایک خط کی فوٹو کاپی منتخب ادیبوں میں تقسیم کی گئی تھی جس میں ''کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے'' کی ایسی نادر تجویز پیش کی گئی تھی کہ عدل جہانگیری یاد آ جائے۔ ایک پروفیسر نے ایک نہایت بااثر مدیر کو لکھا تھا کہ آپ ایک ملکِ غیر کا مالی طور پر پُر وقار انعام فلاں فلاں صاحب کو دلوا دیجیے تو آپ کے مربیٔ کو کم وبیش اسی قدر رقم کا دہلی کا ایک پر وقار انعام پیش کر دیا جائے گا۔

''جو کوئے دار سے نکلے تو....''

کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹۴۸ء میں متعدد دیہی علاقوں میں زبردست جدوجہد کا بگل بجا دیا۔ ان علاقوں میں تریپورہ اور تلنگانہ شامل تھے اور بنگال، ریاست مدراس کے رائل سیما، جو چاول کا پیالہ'' (Rice Bowl) کہلاتا تھا، اور کیرالا میں کسان تحریک نے زور پکڑا۔ ان دنوں کمیونسٹ یا تو میدانِ کارزار میں ہوتے یا جیلوں میں۔

پھر، ۱۹۵۱ء میں پارٹی نے بی۔ ٹی۔ رندیوے کی پالیسی کو بائیں بازو کی غیر ضروری مہم جوئی (Left Adventurism) قرار دے کر قومی جمہوریت کی پالیسی اختیار کی تو اگلے انتخاب میں ان علاقوں سے کمیونسٹ امیدوار خاصی تعداد میں منتخب ہوئے اور بیشتر صورتوں میں بڑی اکثریت سے۔ روی نرائن ریڈی نے تلنگانہ میں اس وقت تک سب سے زیادہ ووٹوں سے کامیاب ہو کر ایک رکارڈ قائم کیا۔

انھی دنوں سی۔ راج گوپال اچاریہ (راجہ جی) ماؤنٹ بیٹن کی جگہ پر گورنر جنرل اور پھر مرکزی وزیر رہنے کے بعد ریاست مدراس کے وزیر اعلیٰ ہوگئے اور جیل خانے کمیونسٹوں سے

بھر گئے۔ وہ متشدد کمیونسٹ مخالف تھے۔ اب جو اسمبلی میں کمیونسٹ پارٹی اصل حزب مخالف کے طور پر ابھر کے سامنے آئی تو راجہ جی کو یقیناً پریشانی ہوئی۔ اسی پریشانی کو بھانپتے ہوئے ایک پریس کانفرنس میں کسی رپورٹر نے ان سے پوچھا کہ ان لوگوں کو جنھیں جیلوں میں بھر دیا گیا تھا اسمبلی میں دیکھ کر آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

جواب دینے میں راجہ جی نے ایک منٹ نہ لگایا اور کہا، "اب میں نے انھیں اسمبلی میں قید کر دیا ہے۔"

معلوم نہیں بنگال کے کمیونسٹوں کو راجہ جی کی یہ حکمت عملی یاد ہے کہ نہیں۔

ملاقات کی جگہ

یو پی کی گورنر سروجنی نائڈو اور چند وزرا کا قافلہ چھتر منزل میں کسی تقریب سے واپس آ رہا تھا کہ حضرت گنج (لکھنؤ) میں پرانے یونیورسل بک ڈپو کے سامنے علیم صاحب کو دیکھ کر مسز نائڈو نے اپنی گاڑی رکوادی۔ وہ علیم صاحب کو بیٹا کہتی تھیں۔ وزرا بھی اپنی اپنی گاڑیوں سے نکل کے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ ان وزرا میں حافظ ابراہیم بھی تھے۔

حافظ جی نے ہاتھ ملاتے ہوئے علیم صاحب سے کہا، "ڈاکٹر صاحب اب تو آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔"

"ملاقات کی جو جگہ تھی وہاں آپ نے جانا ہی چھوڑ دیا،" علیم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی وقت مسز نائڈو نے حافظ جی سے کہا: Hafizji, don't try to be witty at the cost of Aleem.

لیکن اس جواب سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ ان دنوں کمیونسٹ حکومت سے برسر پیکار تھے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی امکان ہے کہ ۱۹۴۲ء میں حافظ جی بھی پنڈت نہرو اور ڈاکٹر علیم کے ساتھ آگرہ جیل میں رہے ہوں۔

یاد رکھنے کی ایک بات اور بھی ہے، اگرچہ مندرجہ بالا واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن اس کے اعادہ کی ضرورت یوں ہے کہ ہماری روایتی خراب یادداشت اسے بھلا دیے جانے کا سبب نہ بن جائے۔

مسز سروجنی نائیڈو حیدرآباد کی سیاسی اور ثقافتی اکائی کو درہم برہم کرنے کے سخت خلاف تھیں اور انھوں نے ریاست کے خلاف فوج کی پولیس کارروائی کی سخت نکتہ چینی کی تھی۔

اس وقت وہ یوپی کی گورنر تھیں۔

الٰہ آباد کی ترقی

ان دنوں جب لال بہادر شاستری جی وزیر اعظم تھے، الٰہ آباد سے ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے اور انھوں نے بیگم حضرت محل پارک میں ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کیا۔ شاستری جی نے، جن کا تعلق الٰہ آباد سے تھا، وہاں بھی ایک جلسۂ عام کو خطاب کیا تھا۔

لکھنؤ میں تقریر ختم کرتے ہوئے انھوں نے اپنی کوٹ نما شیروانی کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر سی۔ بی۔ گپتا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ الٰہ آباد والوں کو شکایت ہے کہ لکھنؤ کی ترقی کے لیے بہت کام ہو رہا ہے جب کہ ان کے شہر سے بے رخی برتی جارہی ہے۔ یہ میمورنڈم اسی سلسلہ میں انھیں وہاں دیا گیا تھا۔

سی۔ بی۔ گپتا نے جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے اپنی مختصر سی تقریر میں دو چار دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ میں اور شاستری جی ایک ہی دن پارلیمنٹری سکریٹری مقرر ہوئے تھے لیکن شاستری جی وزیر اعظم بن گئے اور میں صرف وزیر اعلیٰ... بن سکا۔

اب اس سے زیادہ الٰہ آباد کی ترقی کیا ہوسکتی ہے۔

ہوٹل والے بھورے، کاظم ہوٹل، بمبو شاہ

بھورے کو لوگ جانے کیوں بھورے کہتے، دیکھنے میں ایسے ہرگز نہ تھے۔ اچھے خاصے تھے، کھلتا ہوا گندمی رنگ، مزاج کے سیدھے سادے۔ پچیس روپے مہینے میں دونوں وقت کھانا دیتے۔ مجھ پر خاصے مہربان تھے۔ یہ مہربانی کچھ بے سبب نہ تھی۔ دن میں اکثر یونیورسٹی میں رہتا اس لیے مہینے میں مشکل سے پندرہ بیس بار ہی ہوٹل جا پاتا اور رات میں اسلم صاحب کے یہاں ٹیوشن میں دیر ہو جاتی تو سیدھے قومی آواز چلا جاتا اور نظیر آباد کے ہوٹل سے ایک تندوری روٹی اور بھینسے کے کباب منگا کے کھالیتا۔

کچھ دنوں بعد مَیں رائق کے مکان کے نیچے والے بڑے کمرے میں رہنے لگا تھا۔

اوپر رہتا تھا تو رات میں دفتر سے آ کر سائیکل پارک کے جنگلے سے ٹکا کر زنجیر میں تالا ڈال دیتا۔ لیکن دل سائیکل ہی میں اٹکا رہتا۔ نیچے کے کمرے میں سوتا تو ہاتھی گھوڑے بیچ کے لیکن صبح صبح پھیری والے جگا دیتے۔ ایک ترکاری فروش تو اتنی زور کی آواز لگاتا کہ مردہ جی اٹھے۔ ایک دن غصہ آ گیا تو اسے ڈانٹ پلا دی۔

پھیری والے نے مُنہ میری طرف کیا، کرتا اوپر اٹھایا اور رسان سے بولا۔

''بھیا میں نہیں، یہ پیٹ چلاتا ہے''۔

میں چپ ہو گیا۔ اس دن کے بعد کسی پھیری والے کی آواز نے میرے کانوں میں چھید نہیں کیے۔

فقیر بھی اس گلی میں خوب آتے۔ ہر فقیر کم سے کم دو دن کا بھوکا ہوتا۔ میں پوچھتا کھانا کھاؤ گے تو ایک آدھ ہی راضی ہوتا۔ سب پیسے مانگتے۔ جو بھی ''ہاں'' کہتا میں اسے بھورے کے نام پرچہ لکھ کے دے دیتا۔ مہینے میں چار چھے ہی پرچہ لینے پر راضی ہوتے اور ان میں سے سب اس کے ہاں جاتے بھی نہیں اور کھانا تو بس ایک آدھ ہی کھاتا۔ بھورے کو ہدایت پہلے ہی سے کر رکھی تھی کہ کھانا دینا نہیں، کھلا دینا۔

بہت بعد میں میونسپلٹی والوں نے فٹ پاتھ پر سے بھورے کا ہوٹل ہٹا دیا تو وہ سامنے کے کاظم ہوٹل سے ملحق دوکان میں منتقل ہو گئے۔

ایک دن تام چینی کا پیالہ مجھے صاف نہ لگا۔ میں نے بھورے سے کہا تو انھوں نے بدل دیا، مطلب یہ کہ دال دوسرے پیالہ میں لا کے دے دی۔ میں چاول ہاتھ سے نہ کھاتا، ہمیشہ چمچہ مانگتا۔ وہ چمچہ ایسا دیتے کہ احتیاط نہ برتتا تو شاید مُنہ کٹ جاتا۔ ایک دن میں نے یہ بات کہہ دی۔ انھیں جانے کیا سوجھی کہ میرے لیے چینی کے برتن اور دو عمدہ چمچے خرید لائے۔ کسی نے میرے برتن دیکھ کر اپنے معمولی برتنوں پر ناک بھوں چڑھائی تو بولے، ''مہینے میں مشکل سے بیس دن آتے ہیں اور دیتے ہیں پچاس روپے۔ پہلی بات صحیح تھی، دوسری غلط۔

فرنگی محل کی پولیس چوکی کے منشی جی بھی بھورے کے ہوٹل میں کھانا کھاتے اور اکثر وہاں بیٹھے نظر آتے۔ وہ ان دنوں کی یادگار تھے جب رپورٹ اردو میں لکھی جاتی۔ ہندی انھیں آتی نہ تھی، سو وہاں مدِ فاضل تھے۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد چوکی جا کر صورت دکھا آتے۔

ایک دن بھورے نے ان سے شکایت کی، غرض تھی سو انھیں منشی سے دروغہ بنا دیا۔

”داروغہ جی آپ نے کہا تھا رئیسے کو جانتے ہیں۔ وہ ڈیڑھ مہینے کھانا کھا کر غائب ہو گیا۔ پیسے ایک دن کے نہ دیے۔ بس آج کل آج کل پر ٹالتا رہا۔“ منشی جی پہلے دھیرے سے ہنسے پھر بولے...”بھورے تم بڈھے ہونے کو آئے لیکن عقل نہ آئی۔ تم نے یہی تو پوچھا تھا کہ رئیسے کو جانتا ہوں کہ نہیں۔ میں نے کہا تھا ہاں۔ تمھیں خود ہی سوچنا چاہیے تھا۔ ہم پولیس والے کسی شریف آدمی کو بھلا کیا جانیں گے۔“

پھر اورئی سے اماں آ گئیں اور میں نے برسوں پرانا تعلق ختم کرنے کی انھیں اطلاع دی تو بھورے سمجھے میں کسی دوسرے ہوٹل میں کھانا شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بہت افسوس تھا انھیں۔ میں نے ساری بات بتا دی تو مطمئن ہو گئے لیکن بولے، ”بھیا کبھی کبھی آتے رہیے گا۔“ کبھی کبھی کیا ہفتے میں ایک آدھ بار ہو ہی لیتا۔ سڑک کی دوسری طرف حنا بلڈنگ کے پیچھے ہی تو فرحت اللہ انصاری کا مکان تھا۔ جب بھی جاتا بھورے سونف، بھنی ہوئی گری اور الا یچی ضرور کھلاتے۔

کاظم ہوٹل بھی غضب کا تھا، شہر کے سارے ”عظیم“ شاعروں کا اڈا۔ قومی آواز کے ورق الگ کر دیے جاتے۔ جنھیں لوگ باری باری پڑھتے، ایک پیالی چائے پر پورا اخبار پڑھ لیا جاتا اور چار غزلیں الگ سنا دی جاتیں۔ معلوم نہیں گھاٹا سننے والوں کا ہوتا کہ سنانے والوں کا کہ وہاں سننے والے بھی شاعر ہوتے اور سنانے والے بھی۔

لکھنؤ میں وہ سیلاب آیا جس نے منکی برج کو ہنومان سیتو بنا دیا تو اس ہوٹل میں ایک تھیوری پیش کی گئی۔ ”نہ سیلاب نہ ویلاب، دلیپ کمار، راج کپور، سائرہ بانو سب جیل میں ہیں۔ ’طوفانِ نوح‘ بنا رہے تھے۔ پانی جمع کیا تھا، بند ھا ٹوٹ گیا۔“
یہ بات سب نے مان لی تھی۔ ان دنوں کے لوگ کیسے نیک ہوتے تھے۔ کوئی سوال بھی نہ کرتے۔

آپ بھی پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہوں گے لیکن ابھی نہ عبدالصمد کی کھیر کا ذکر ہوا نہ کریم کے قلیچے نہاری کا اور غلام نبی کے فالودے کو تو اب پاس پڑوس والے بھی بھولنے گے ہیں اس لیے انھیں چھوڑیے اور چلتے چلتے ایک شعر سن لیجیے۔ یہ شعر اسی علاقہ کا ہے۔

بڑی بھابی کا پردے تان کر سونا وہ کوٹھے پر
پھر، ان پردوں کا اک دن کاشفِ اسرار ہو جانا

اور اب ببو شاہ سے ملاقات کرنی ہے۔ انھیں میں نے اس وقت تک دیکھا تھا جب

ان کی ساری بھنویں سفید ہوگئی تھیں۔ خیر، وہ تو سب کی ایک نہ ایک دن سفید ہو ہی جاتی ہیں۔ فی الوقت وہ شعر سنیے جس کے سہارے وہ اپنا سرمہ فروخت کیا کرتے۔

نہ ہیں گورے دارا نہ کالے سکندر
مٹے ناموں کے نساں کیسے کیسے

رہے نام اللہ کا!

بابری مسجد

بابری مسجد کے سلسلے میں یو۔ پی۔ ہائی کورٹ کا فیصلہ آ چکا ہے۔ مجھے اس قضیے کے بارے میں فی الوقت کچھ نہیں کہنا لیکن بابر کے حوالے سے ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہوں اور وہ بھی بابری مسجد کے نام کے سلسلے میں۔

وسطِ ایشیا کے شہروں، خصوصاً بخارا اور سمرقند میں مسجدوں کے بیرونی دوازوں پر دونوں جانب دو ببر شیروں کی تصویریں ملتی ہیں۔ سمرقند میں مشہور صوفی بزرگ اور بابر کے ممدوح خواجہ احرار ولی کے مزار کے احاطے میں جو شاندار مسجد اور مدرسہ ہے اس کے عالی شان گیٹ پر دوڑتے ہوئے شیروں کے درمیان بھاگتے ہوئے ہرنوں کی تصویریں اب بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ وسط ایشیا کی تہذیب پر گہرے ایرانی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ایرانی ثقافت میں شیر کو قوت و جبروت کی علامت مانا گیا ہے۔ اسی لیے میر باقی نے، جو مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے، اس مسجد کے دروازے کو بھی ببر شیروں کی تصویروں سے آراستہ کیا تھا۔[1]

اس پس منظر میں میرا خیال ہے کہ پہلے یہ مسجد ببری مسجد کہلائی اور پھر کثرتِ استعمال سے بابری مسجد ہوگئی۔ ویسے بھی انگریزی میں بابر اور ببر ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے۔

تماشہ گھس کے دیکھیں گے

اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کی رکنیت کے لیے امیدواروں کی ہوڑ پہلے بھی لگی رہتی تھی، اب بھی یہی صورت ہے۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ نے ایک عبرت خیز واقعہ سنایا۔ آپ بھی سنیے، بلکہ

۱۔ یہ پیراگراف قمر رئیس کی کتاب ''ظہیر الدین محمد بابر۔ شخص، شخصیت اور شاعری:'' اشاعت ۲۰۰۲، صفحہ ۵۳ سے منقول ہے۔

چاہیے تو عبرت پکڑے۔

ایک صاحب ان کے پیچھے پڑے تھے کہ انھیں کسی طرح مجلس عاملہ کا رکن بنوادیں۔ بیگم صاحبہ ہر بار کہہ دیتیں کہ ابھی کوئی جگہ خالی نہیں ہے، مجبوری ہے اور صورت بھی یہی تھی۔

آخر ایک دن صبح صبح وہ صاحب ان کے یہاں حاضر ہوئے اس ''خوش خبری'' کے ساتھ کہ اب تو جگہ خالی ہوگئی ہے۔ مجھے نامزد کرادیجیے۔

اسی دن، جی ہاں اسی دن، صباح الدین عبدالرحمان صاحب کے انتقال کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔

یہ واقعہ بتاتے ہوئے بیگم صاحبہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی تھیں۔

اہل اقتدار کی آنکھوں میں ''بس جانے'' کی ایسی للک لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے کہ ان کی افطار پارٹیوں کے دعوت نامے حاصل کرنے کے لیے سفارشیں کراتے ہیں، ان کے آگے پیچھے کھڑے ہو کر تصویریں کھنچواتے ہیں اور پھر انھیں البم میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ اور اکادمیوں اور اس طرح کے دوسرے اداروں کی رکنیت، صدارت اور نائب چیرمین نامزد ہونے کے لیے سیاسی وفاداریاں تو بدلی جاتی ہی ہیں، کوئی کہے تو دین وایمان بھی نذر کر دیا جائے۔

ہم سید کب ہوئے؟

سیّد محمد عابد سے میں سید عابد سہیل کیسے ہوا یہ تو شاید آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہوگا، لیکن صرف عابد سہیل کیسے رہ گیا، اس کی بھی ایک کہانی ہے۔

ایک دن میں نے اپنی والدہ سے، جو خود تو صدیقی تھیں، لیکن جنھیں میرے ''سیّد'' ہونے پر بہت فخر تھا، پوچھا، ''لتاں صحیح صحیح بتائیے کہ ہم لوگ سیّد کب ہوئے تھے؟ پہلے تو وہ بہت ناراض ہوئیں، پھر ہنسنے لگیں۔ بات آئی گئی ہوئی، لیکن میں جانے کیسے اپنا نام صرف عابد سہیل لکھنے لگا۔

اس واقعے کے برسوں بعد غالباً ۱۹۹۵ء میں، پروفیسر سیّد محمد عقیل کی خودنوشت ''گئو دھول'' شائع ہوئی تو اس کی رسم اجرا انجام دینے کے لیے قرعۂ فال میرے نام پڑا۔

میں نے اپنی تقریر میں ''گئو دھول'' کو ایک علمی خودنوشت قرار دیا اور اس حصّے کی بہت تعریف کی جس میں انھوں نے اپنے بچپن کے ایک دور کو نہایت خوبصورتی اور ایمانداری سے پیش کیا ہے۔

عقیل صاحب نے خود کو سیّد ثابت کرنے میں خودنوشت کے کئی صفحات صَرف کیے

ہیں۔ میں نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے خود کے ''سیّد'' سے ''بے سیّد'' ہوجانے اور والدہ مرحومہ سے اپنے سوال کا ذکر کیا تو ہال میں زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سب سے زوردار قہقہہ عقیل صاحب ہی کا تھا۔

بعد میں علی احمد فاطمی صاحب نے ایک خط میں لکھا تھا، ''آپ کو اندازہ بھی نہ ہوگا کہ آپ الٰہ آباد میں کتنا زبردست تاثر چھوڑ کر گئے ہیں۔''

معلوم نہیں یہ بات اب انھیں یاد بھی ہے یا نہیں۔

''عثمان غنی'' ایک ہوئے

آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ، کا ذکر آچکا ہے۔ ایک دلچسپ واقعہ اب یاد آیا، لکھے دیتا ہوں۔

سرور صاحب نے اقبال پر ایک فیچر لکھا تھا۔ مجھے اس میں دو تین شعر پڑھنے تھے، الگ الگ موقعوں پر۔

ایک موقعہ پر میں نے اقبال کے ایک مشہور شعر کا مصرع یوں پڑھ دیا۔

''بندہ و صاحب و عثمان غنی ایک ہوئے''، لیکن فوراً ہی غلطی کا احساس ہوگیا اور میں نے یہ کہتے ہوئے کہ، ''بعض لوگ اس مصرع کو یوں بھی پڑھ دیتے ہیں''، صحیح شعر پڑھ دیا۔

فیچر کا نشریہ مکمل ہونے کے بعد ایاز انصاری صاحب نے، جو اسے پروڈیوس کر رہے تھے، کنٹرول روم سے نکل کر مجھے خوب شاباشی دی۔

ان دنوں پہلے سے رکارڈنگ کا طریقہ نہیں رائج ہوا تھا اور مُنہ سے نکلا ہوا لفظ فوراً براڈ کاسٹ ہوجاتا تھا۔

نام لکھ کے مٹادیا

ان دنوں جب میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا، مجھے قبرستانوں میں جاکر کتبے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ بعض کتبوں کا ایک آدھ جملہ، مصرع یا شعر ایسی کہانی کہہ جاتا کہ دل کو ڈھارس بندھتی... دکھ تم ہی نہیں سہہ رہے ہو، اوروں نے تم سے زیادہ دکھ اٹھائے ہیں۔ بعض کتبوں کو دیکھ کر یہ بھی خیال ہوتا کہ مرنے والوں نے ان کی عبارت کا انتخاب ممکن ہے زندگی ہی میں کرلیا ہو۔

ایک دن بیلی گارڈ (جہاں 1857 میں انگریز فوجیوں نے ایک طرح سے خود کو قلعہ بند

کرلیا تھا) جانا ہوا تو وہاں کے قبرستان میں لوحِ مزار پڑھنے لگا۔ ایک قبر کی عبارت ایسی تھی کہ زمین نے جیسے پیر پکڑ لیے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک یہ عبارت پڑھتا اور روتا رہا۔ یہ قبر ایک اعلیٰ فوجی افسر کی تھی اور اس کے نام اور فوجی عہدے کی تفصیلات کے نیچے لکھا تھا:

I was, what you are
You will be, what I am

ایک ایک لفظ یاد ہے۔

بیس بائیس سال قبل جانے کیسے ایک دن اچانک اس قبر کی یاد آ گئی۔ میں بے چین ہو گیا لیکن وہاں جانا کئی دن بعد ہی ممکن ہو سکا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا، اور اب بھی ہے، کہ وہ قبر، قبرستان کے گیٹ سے بس بارہ پندرہ قدم کے فاصلے پر بائیں جانب تھی، میں ان دنوں وہاں کئی بار گیا تھا۔

اب اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ یوں بھی اب وہاں قبریں کم تھیں، گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ زیادہ۔

خط، کبوتر اور جرمانہ

ایک جگہ میں نے نامکمل پتہ کے سبب اردو اکادمی کو بھیجے جانے والے ایک خط کے، جس پر میرا پورا پتہ لکھا تھا، واپس نہ آنے کا ذکر کیا ہے۔ محکمۂ ڈاک وتار کی ''حسنِ کارکردگی'' کا ایک واقعہ مجھے تفصیل سے یاد ہے، اگرچہ میری زندگی کا اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن اتنا تعلق تو ہے ہی کہ اب تک ذہن میں محفوظ ہے۔

کم وبیش بیس پچیس سال قبل تک انگریزی کے اخباروں میں پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران کم سے کم اہم سوالوں کے جواب شائع ہوتے تھے۔ ان دنوں کی ایک دلچسپ خبر جس کا تعلق محکمۂ ڈاک وتار (کہ ان دنوں یہ دونوں محکمے ایک ہی تھے) سے تھا اخبارات میں شائع ہوئی۔ اتفاق سے نیشنل ہیرالڈ میں یہ دلچسپ خبر، جس پر سے پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب میں پردہ اٹھا تھا، میں نے ہی ''سب'' کی تھی اور شاید اسی لیے یاد بھی رہ گئی۔

سوال نہایت معصومانہ تھا؛ پوچھا گیا تھا کہ کیا محکمۂ ڈاک وتار کی غلطی سے حکومت کو ایک بڑی رقم کسی خاتون کو ادا کرنا پڑی ہے۔ جواب تو شاید مختصر سا تھا کہ ہاں ایسا ہوا ہے لیکن جواب سے پیدا ہونے والے سوالات نے ایک پوری کہانی کو جنم دے دیا۔

ہوئی بس اتنی سی بات تھی کہ فوج کے کسی افسر کی بیوی کے کسی سے تعلقات تھے اور

دونوں میں خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔ بڑے گھروں میں کسی کا خط کوئی دوسرا کھولتا نہیں۔ ایک دن غلطی سے متعلقہ فوجی افسر نے اپنی بیوی کے نام کا لفافہ کھول لیا۔ وہ خط اس کی بیوی کے عاشق کا تھا۔ یہ خط پڑھ کر اسے اس قدر غصہ آیا کہ اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ جواب میں مطلقہ نے تاوان کے لیے محکمۂ ڈاک وتار پر مقدمہ کر دیا۔

عدالت میں محکمۂ ڈاک وتار کے وکیل نے مطلقہ کے وکیل سے پوچھا کہ کیا اس خاتون کے فلاں فلاں شخص سے تعلقات نہیں تھے۔ جواب ملا یقیناً تھے۔ تو پھر آپ کو اعتراض کیا ہے؟ طلاق انھی تعلقات کی بنا پر دی گئی ہے، سرکاری وکیل نے دلیل دی۔ تعلقات تو بہت دنوں سے تھے، لیکن طلاق نہیں دی گئی۔ طلاق صرف اس لیے دی گئی کہ اس کا خط اس کے سابق شوہر کو پہنچا دیا گیا اور اس کی ساری ذمہ داری محکمۂ ڈاک وتار کی ہے۔

عدالت نے مطلقہ کی دلیل تسلیم کرتے ہوئے متعلقہ محکمے کو تاوان ادا کرنے کا حکم دیا۔

آدھے سر کا درد

بچپن میں آدھے سر کے درد کا میں اکثر شکار ہوتا تھا۔ حکیم صاحب نے کئی دوائیں آزمائیں لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ایک نسخہ کے مطابق نیم کی کونپلیں، مُنڈی اور ایک آدھ چیز اور تقریباً لبریز چاندی کے کٹورے میں ڈال کر چھت کی منڈیر پر رکھ دی جاتی تھیں، صبح صبح پینے کے لیے۔ اس سے بھی فائدہ نہیں ہوا۔ انھی دنوں کسی نے ایک ٹوٹکا بتایا اور اس سے یہ مرض ہمیشہ کے لیے جاتا رہا۔

یہ ٹوٹکا کچھ عجیب سا ہے لیکن تیر بہدف ثابت ہو چکا ہے۔ ایک دو قطرے پانی ڈال کر ایک مکھی پیس لی جائے اور اسے جس جانب درد ہوتا ہے اس کی دوسری جانب ناک میں ڈال کر سُڑک لیا جائے۔ یہ کام سورج نکلنے سے دس پندرہ منٹ قبل تک ہو جانا چاہیے۔ درد اسی دن ختم ہو جائے گا اور دھمک دو تین دن میں۔ انشاءاللہ۔

ڈاکٹر شعیب نظام نے یہ نسخہ اپنایا تھا اور دوسرے دن ہنستے ہوئے ملاقات کرنے آئے تھے۔

کان کی لو

ان دنوں جب والدہ اور میرے بھائی بہن اورئی کے ایک مکان میں بطور کرایے دار رہتے تھے، ایک دن میرے چھوٹے بھائی عمران نے شہر کے مشہور حکیم عبدالرب کو دیکھا اور انھیں

سلام کیا۔ عبدالرب صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے انگلی کے اشارے سے عمران کو بلایا اور پوچھا، کیا تم سید وزیر حسن مرحوم کے پوتے ہو۔ عمران کو سخت حیرت ہوئی اور اس نے پوچھا کہ یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا، ''تمھارے کان کی لویں وزیر حسن مرحوم کی لووں سے بہت ملتی ہیں۔''

عبدالرب صاحب کے دادے ابّا سے بہت تعلقات تھے اور وہ ایک طرح سے ہمارے خاندانی طبیب تھے۔

ہشیار بکارِ خویش

فیاض بھائی لاکھ دیوانے سہی، بکارِ خویش ہشیار تھے اور چچا سے سخت ناراض۔ زمینداری میں اپنے ''حق'' سے دستبردار نہیں ہوئے تھے لیکن چچا سے معرکہ لینے کی ہمت نہ تھی۔ مجھے اوٹ بناتے، کہتے ساری زمینداری عابد کی ہے، معاوضہ اور بحالی گرانٹ جو لاکھوں میں تھی، چچا نے ہضم کر لی۔ حق حقدار کو نہ دیا۔ انھیں یہ بھی شکایت تھی کہ جب بھی موقعہ ملتا ہے فوج کی پنشن کا منی آرڈر وصول کر لیتے ہیں۔ معلوم نہیں اس الزام میں حقیقت کا شائبہ بھی تھا یا نہیں۔

ہمارے گھر کے سامنے کا کوٹھار اتنا بڑا تھا کہ اب چچا کے بیٹے کا اس پر خاصہ کشادہ مکان بنا ہے۔ غلہ اس میں بھرا رہتا۔ ایک دن چابی ان کے ہاتھ لگ گئی۔ انھوں نے کرتا پیجامے کے اندر کر کے کمر بند ذرا کس کے باندھ لیا۔ یہی انھوں نے پائچوں اور کف کے ساتھ کیا اور جس قدر بھی ممکن تھا گریبان سے گیہوں ڈال کے کپّا ہو گئے۔ ٹانگیں اور ہاتھ پھیلائے پھیلائے جانے کیسے غلّہ فروش کے یہاں گئے، دونوں پائچوں کے بند کھلوائے اور سارا غلہ بیچ دیا۔

نواب چچا کو معلوم ہوا تو وہ ہنس دیے۔ انھیں ناراضگی ظاہر کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔

بغیر ناپ کے شیروانی

لاٹوش روڈ پر ''نیشنل ٹیلرس'' نام کی ایک ایسی دوکان تھی جہاں شیروانی سینے کے لیے گردن سے دامن تک کا ناپ لینے کے بجائے صرف داہنے ہاتھ کے انگوٹھے کی لمبائی چوڑائی ناپ لی جاتی تھی اور شیروانی ایسی سی دی جاتی کہ معلوم ہوتا جسم اسی کے لیے بنا تھا۔

مشہور تھا کہ لال بہادر شاستری، حافظ ابراہیم اور متعدد اہلِ ثروت اپنی شیروانیاں ماسٹر سمیع ہی سے سلواتے جو اس دوکان کے مالک تھے۔ ماسٹر سمیع کی دوکان پر سلائی کی کوئی مشین

نہ تھی اور ساری سلائی ہاتھ سے ہوتی۔ وہ شیروانی کے علاوہ کچھ اور سیتے بھی نہ تھے۔

پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد (۵۵-۱۹۵۱ء) جو بہت سینیئر آئی۔سی۔ایس۔افسر تھے اور غالباً حکومت یو۔پی۔سے بھی متعلق رہ چکے تھے، تقسیم ہند سے قبل تک اپنی شیروانی انھی سے سلواتے۔

۱۹۵۲ء یا ۵۳ء میں جب ماسٹر سمیع کو اخباروں سے معلوم ہوا کہ دو تین ہفتے بعد غلام محمد صاحب کا ہوائی جہاز کچھ دیر کے لیے لکھنؤ ہوائی اڈے پر رکے گا تو انھوں نے کسی اخبار میں شائع شدہ ان کی تصویر سامنے رکھ کر شیروانی سی اور اسے لے کر اموسی پہنچ گئے۔ ہوائی اڈے پر ان دنوں آج کل کی پابندیاں نہ تھیں، چنانچہ انھیں غلام محمد صاحب سے ملاقات کر کے شیروانی پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ پاکستان کے گورنر جنرل نے اپنی شیروانی اتار کر نئی پہن لی اور اپنا سفر اسی کو پہنے پہنے جاری رکھا۔

اس واقعے کی خاصی تفصیلی خبر ''قومی آواز'' میں شائع ہوئی تھی اور زیرِ نظر بیانیہ میری یادداشت پر مبنی ہے۔ ویسے وہ دوکان میں نے خود بھی دیکھی تھی۔ اب اس کا نام ونشان بھی نہیں۔

جل رہی تھی لالٹین

اورئی سے لکھنؤ بلا ٹکٹ سفر کے دوران ایک دلچسپ بات ہوئی۔ ایک صاحب کوئی رسالہ پڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے رسالہ رکھ دیا تو میں نے ان کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اس کا مطالعہ شروع کیا اور کئی چیزیں پڑھ ڈالیں لیکن ایک چیز کے علاوہ کسی کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں۔

یہ ''تخلیق'' ایک دلچسپ نظم تھی اور آزاد شاعری پر طنز لیکن اس بات کا مجھے اس وقت کوئی احساس نہ تھا۔ میں تو ''آزاد نظم'' کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ یہ نظم، جس کا عنوان تھا ''جل رہی تھی لالٹین''۔ کچھ اس طرح تھی اور میرا خیال ہے کہ مجھے ساٹھ سال سے زیادہ گزرنے کے باوجود پوری طرح نہیں تو کم وبیش پوری ضرور یاد ہے۔

جل رہی تھی لالٹین
نکلا اک مگدر نما چوہا کوئی
شاید اپنی قوم کا سردار تھا
یا چھچھوندر تھی کوئی

ورنہ اک بلّی کا بچہ تھا ضرور
جل رہی تھی لالٹین

شاید برسوں بعد اس نظم کا ذکر ضرور سنا تھا لیکن ٹھیک سے کچھ بھی نہیں یاد۔ غالباً یہ نظم ان دنوں کہی گئی ہوگی جب یہ خیال عام تھا کہ آزاد نظم کی بدعت ترقی پسندوں کی ایجاد کردہ تھی یا مغرب کی نقالی۔ ''جل رہی تھی لالٹین'' آزاد نظم پر ایک دلچسپ طنز ضرور ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اس طنز کی صورت گری صرف آزاد نظم ہی میں ممکن ہے، کوئی پابند نظم یہ ''کارنامہ'' انجام نہیں دے سکتی۔

پدھاریے بنام تشریف لائیے

نیشنل ہیرالڈ میں نیرو شرما نام کی ایک نہایت مہذب، شائستہ مزاج اور خوبصورت لڑکی کو، جو خاصی جونیر سب ایڈیٹر تھی، اردو پڑھنے کا شوق تھا۔ اپنے اس شوق کا اظہار اس نے مجھ سے کیا تو میں نے حیات اللہ صاحب کا اردو قاعدہ ''دس دن میں اردو'' لاکر اسے دے دیا اور کسی استاد کے بغیر اردو سیکھنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ پھر بھی، کبھی کبھی اٹک جاتی تو مجھ سے پوچھ لیتی۔

ایک دن وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھی کہ گوڑ صاحب نے، جو نیوز ایڈیٹر تھے، کتاب اس کے ہاتھ میں دیکھی تو پوچھا۔

''نیرو، تمھیں اردو میں کیا اچھا لگتا ہے؟''

''سر،'' نیرو نے کہا، ''مجھے تشریف لائیے پدھاریے سے اچھا لگتا ہے۔''

گوڑ صاحب نے جواب میں ایک لفظ نہ کہا اور واپس اپنی سیٹ پر چلے گئے۔

ایچ۔ کے۔ گوڑ صاحب کی مادری زبان اردو تھی اور وہ اپنے خاندان کے واحد شخص تھے جنھوں نے کلاس میں اردو کے بجائے ہندی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اردو کے دشمن نہیں تھے، بس بہت دور تک دیکھ لیتے تھے۔

پستول ہے تو استعمال بھی ہوگی

زندگی ہو، سیاست یا ڈرامہ، دیوار پر پستول ٹنگی ہوگی تو استعمال بھی کی جائے گی۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو اندرا گاندھی کا قتل، اور وہ بھی خود اپنے محافظوں کے ہاتھوں، نتیجہ تھا چند ماہ قبل کی امرتسر گردوارے پر فوج کشی کا اور یہ فوج کشی پنجاب کی دہشت گردی کا۔ اس قتل کو کانگریس نے اسی سال ملک کے عام انتخابات میں ایک جذباتی مسئلہ کے طور پر اختیار کیا اور بے

نظیر کامیابی حاصل کی۔ لیکن بندوق کا استعمال ایک بار شروع ہو جائے تو اسے روکنا مشکل ہو جاتا ہے، قتل کا یہ ہتھیار نالی دار ہو یا بموں کی صورت میں، چنانچہ راجیو گاندھی کو جنھیں ماں کے قتل کے بعد کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے بغیر، گیانی ذیل سنگھ نے وزیر اعظم کے عہدے کا حلف دلا دیا تھا، ۱۹۹۱ء کے عام انتخابات میں، انتہا پسند ایل۔ ٹی۔ ٹی۔ ای۔ کے ہاتھوں اپنی جان گنوانی پڑی۔

سیاست اور صحافت

ایک بار پنڈت نہرو نے بیگم حضرت محل پارک میں جلسۂ عام کو خطاب کرنے کے بعد گورنر ہاؤس جانے کے بجائے کار کا رُخ قیصر باغ کی طرف کرادیا اور پائلٹ حضرت گنج کی طرف نکل گئے۔

قیصر باغ میں نیشنل ہیرالڈ کے آفس کے باہر پنڈت نہرو کار سے اترے اور چک اٹھا کر ایم۔ سی۔ کے کمرہ میں داخل ہو گئے۔

ایم۔ سی۔ تنومند تھے۔ اُن دنوں ان کے پیروں میں شدید درد تھا چنانچہ وہ پیر پھیلائے ہوئے دہلی کا کوئی اخبار پڑھ رہے تھے۔

یکا یک ان کی نظر نہرو پر پڑی جو میز کی دوسری جانب کی کرسی پر بیٹھ رہے تھے۔ انھوں نے کراہتے ہوئے اپنے پیر نیچے کرنے شروع کیے تو پنڈت نہرو نے کہا۔

Take it easy M.C., take it easy.

پنڈت جی اور ایم۔ سی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک بات چیت کرتے رہے اور جب وزیر اعظم رخصت ہونے لگے تو ایم۔ سی۔ اپنے کمرہ کی چق تک انھیں چھوڑنے آئے۔ نیشنل ہیرالڈ کی سلور جبلی کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں نیشنل ہیرالڈ میرا اخبار ہے۔ نیشنل ہیرالڈ میرا نہیں ایم۔ سی۔ کا اخبار ہے۔

یہ تھے پنڈت نہرو اور یہ تھے ایم۔ سی۔

لیکن یہ پہلے والا واقعہ تو ہے شنیدہ، اب ایک دیدہ واقعہ بھی سن لیجیے۔

ایک بار اندرا گاندھی کسی جلسہ میں شرکت کرنے یو۔ پی۔ پریس کلب آئیں۔ سامنے کے لان پر جو اس وقت پوری طرح سبزہ زار تھا ان کے لیے اسٹیج بنایا گیا تھا۔ سامنے کرسیوں پر صحافی بیٹھے تھے۔ یہ دور اندرا گاندھی کے انتہائی عروج کا تھا لیکن وہ آئیں تو ایک اخبار نویس بھی اپنی کرسی سے اٹھ کے کھڑا نہ ہوا۔

پریس کی آزادی کے ایک معنی یہ بھی ہوتے ہیں۔

I want to weep...

پنڈت نہرو کے انتقال کی خبر آئی تو ایم۔ سی۔ پر جیسے کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ روزانہ کی طرح کام کرتے رہے۔ نیشنل ہیرالڈ کے دفتر میں بھی کام ہو رہا تھا کہ خصوصی ضمیمہ شائع ہونا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب ایڈیٹروں کے کمرے میں داخل ہوئے اور حسب دستور جو بھی کرسی خالی نظر آئی اس پر بیٹھ گئے۔ اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب بھی کوئی خاص خبر آتی وہ یہی کرتے۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اس رات بھی انھوں ہمیشہ کی طرح اپنے اداریہ کا گیلی پروف پڑھا۔

ایک دن گزرا، دو دن گزرے۔ پھر ہفتہ پورا ہوا۔ ایم۔ سی۔ روزانہ کی طرح کام کرتے رہے۔

بیس بائیس دن بعد گلاب رائے سریواستو انے گوڑ صاحب کے کان میں کچھ کہا۔ تھوڑی دیر میں بات پھیل گئی۔ ایم۔ سی۔ ایک مہینے کی چھٹی پر جا رہے تھے۔

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ چھٹی شاذ ہی لیتے اور اتنی لمبی — کبھی نہیں۔

پھر معلوم ہوا کہ ان طویل تیس دنوں میں ان سے رابطہ قائم کرنا بھی ممکن نہ ہوگا۔ ان کے پی۔ اے۔ گلاب رائے کو بھی نہ ان کا پتہ معلوم ہوگا نہ فون نمبر۔

دفتر میں سناٹا چھا گیا۔

دو تین دن بعد میں ادارتی عملہ کے کمرے سے برآمدے میں داخل ہوا ہی تھا کہ بائیں ہاتھ کے کمرے کی چق میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور ایم۔ سی۔ برآمد ہوئے۔

میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لمبے چوڑے ایم۔ سی۔ پتھر کی طرح ساکت وصامت تھے۔

میں نے کہا... I have heard

انھوں نے میری طرف دیکھا، سر کو جنبش دیے بغیر — پھر سر جھکا کر داہنی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک باریک سی لکیر جھلمل کر رہی تھی۔

میں ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اسی وقت انھوں نے کہا۔

"I want to weep"....اور چق اٹھا کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔

◆◆◆

پدرم سلطان نہ بود

دادیہال

میرے لیے خاندان کے بزرگوں میں سب سے بڑے دادے ابا اور نانا ابا تھے۔ ان کے بزرگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کبھی نہ کی۔ شجرہ کی تلاش تو دور کی بات، کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا۔

لیکن معلوم ہوا کہ خودنوشت میں آباواجداد کے بارے میں لکھ دیا جائے تو بہتر ہوتا ہے۔ ایک آدھ جگہ تو اس عنصر کو تقریباً لازمی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جستجو شروع کی۔ دادیہال میں بہت سی معلومات محی الدین پور کے وصی الدین صاحب سے حاصل ہوئیں (09335961874)۔ نانیہال میں میرے بزرگوں میں سب سے محترم اور قابل اعتماد میرے خالہ زاد بھائی مولانا فصیح الدین ہیں (09455051875) اس سلسلے میں بہت کچھ بلکہ تقریباً سب کچھ انھیں سے معلوم ہوا۔ اسی دوران والد مرحوم کی نوٹ بک مل گئی۔ ان سارے ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوا لکھ دیا ہے، خاصی کم بیانی سے۔

شنیدہ

میرے آباواجداد نہ جانے کہاں سے، نہ جانے کب اور نہ جانے کیوں یوپی میں ایک جگہ پہنچے۔ خاندان کے سربراہ کا نام ممریز تھا۔ انھوں نے سرائے ممریز، آباد کیا۔ بعد میں اس خاندان کا ایک حصہ مظفرنگر اور محی الدین پور (الہ آباد) پہنچا۔ مظفرنگر کا خاندان رتھیڑی اور جانسٹھ میں آباد ہوا۔ یہ لوگ بہت بڑے زمیندار تھے۔

میرے نگڑ دادا سید سلطان حسن مظفرنگر کی تحصیل کھتولی کے تحصیلدار تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء میں محی الدین پور آئے ہوئے تھے کہ غدر کا بگل بج گیا اور پولیس چوکی لوٹ لی گئی۔ درجنوں لوگ

گرفتار ہوئے۔ گرفتار کیے جانے والوں میں سید سلطان حسن بھی تھے۔ سرسری مقدمہ کے دوران وہ خاموش رہے لیکن جب پھانسی کا وقت آیا تو انھوں نے بتایا کہ میں کھتولی کا تحصیلدار ہوں اور میرے پاس سرکاری پستول ہے۔ انھیں بری کر دیا گیا۔ تقریباً دو درجن لوگوں کو "بڑا باغ" میں پھانسی دی گئی۔ جن لوگوں کو پھانسی دی گئی تھی انھیں اسی جگہ دفنا یا گیا۔ یہ باغ ہم لوگوں کا خاندانی قبرستان ہے۔

دیدہ اور مثل دیدہ

سید سلطان حسن کے دو بیٹے تھے، سید امیر حسن اور سید احمد حسن۔ سید امیر حسن میرے پردادا تھے۔ ان کا انتقال ۲۰ راکتوبر ۱۹۲۵ء کو محی الدین پور میں ہوا۔ ان کے تین بیٹے تھے، سید وزیر حسن، سید نذیر حسن اور سید صغیر حسن۔ سید وزیر حسن میرے دادا تھے۔ وہ قانون گو تھے اور مدت ملازمت کے آخر میں نائب تحصیلدار ہو گئے تھے لیکن کہلائے ہمیشہ قانون گو صاحب ہی۔ ان کا انتقال ۱۹۴۵ء میں محی الدین پور میں ہوا ان کے تین بیٹے تھے۔ سید ظفریاب حسن، سید فتح یاب حسن اور سید نواب حسن۔ سید فتح یاب حسن حکومت یوپی کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔ ان کی رہائش گاہ کلے اسکوائر میں تھی جہاں ان دنوں بڑے افسران رہتے تھے۔ ان کا انتقال غالباً ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ سید ظفریاب حسن میرے والد تھے۔

رتھیڑی میں میرے پھوپھا کا لق ودق مکان "دربار" کہلاتا تھا۔ میں بچپن میں وہاں گیا تھا۔ یہ مکان اب بھی موجود ہے اور "دربار" ہی کہا جاتا ہے۔ میرے اعزا اس میں رہتے ہیں۔ جانسٹھ، رتھیڑی اور کھتولی کے میرے اعزا کا شمار بڑے کاشتکاروں میں ہوتا ہے۔

میرا چھوٹا بھائی ڈاکٹر سید محمد عمران مولانا آزاد میڈیکل کالج، علی گڑھ سے متعلق تھا۔ اب ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہے۔ نجمہ کا انتقال ۱۹ر جون ۱۹۸۳ء کو اسی میڈیکل کالج میں ہوا تھا۔

میرے دادا ۱۷۹ بیگھے کے زمین دار تھے۔ انھوں نے اپنی آدھی زمینداری وقف علی اللہ کر دی تھی۔ وقف بورڈ میں اس کا اندراج میں نے ان دنوں دیکھا تھا جب اس کا دفتر بلوچ پورہ میں تھا۔ لیکن یہ نہیں معلوم زمین کتنی تھی۔ دادا نے بیٹیوں کا حصہ الگ کرنے کے بعد زمینداری اپنے بڑے بیٹے سید ظفریاب حسن اور ان کے صحیح الدماغ بڑے بیٹے کے نام کر دی تھی۔ فیاض

حسن کی دماغی حالت کے سبب بڑا بیٹا عابد سہیل وارث قرار پایا۔ لیکن سید ظفریاب حسن کا یہ بیٹا اس قدر خراب الدماغ نکلا کہ اس نے نہ تو زمینداری کے معاوضہ کے لیے درخواست دی نہ بحالی بانڈ کے لیے۔ یہ بات شاید ۵۱۔ ۱۹۵۲ء کی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں معلوم نہیں کہاں سے اس کے نام کی ایک یا ڈیڑھ بیگھہ زمین نکل آئی جس پر کوئی اور قابض تھا۔ آخر اس نے محی الدین پور کا رخ کیے بغیر یہ زمین ساڑھے چھے ہزار روپے لے کر سید نواب حسن چچا کے بیٹے نعیم کے نام مختار نامہ لکھ دیا۔ خاتمۂ زمینداری کے وقت عابد سہیل کے چچا زمینداری کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

دادے ابّا اور ان کے دونوں بھائی زمینداری میں برابر کے حقدار تھے۔ چھوٹے بھائی نذیر حسن، دادا کے چہیتے تھے اور رات کا کھانا ان کے ساتھ ہی کھاتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک قطعہ زمین جو دادے ابّا کے قبضے میں ہے، ان کا ہے۔ بھائی سے کہنے کی ہمت نہ تھی۔ پٹواری سے دریافت کیا تو اس نے ان کے خیال کی تردید کی۔ ایک دن انھیں جانے کیا سوجھی کہ پھولپور میں جا کر تحصیل میں معاملہ درج کرا دیا لیکن جس دن پیشی کا نوٹس آیا، شرمندگی کے مارے رات کے کھانے پر نہ آئے۔ دادے ابّا کے بلانے پر آ تو گئے لیکن اس موضوع پر کوئی بات کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔

آخر پیشی کا دن آیا تو صبح صبح دادے ابّا نے کہلوایا، ''پھول پور نہیں چلو گے، آج پیشی ہے۔'' دونوں ساتھ ساتھ پھول پور جاتے رہے۔ مقدمہ کا فیصلہ چھوٹے بھائی کے خلاف ہوا۔ انھوں نے اپیل کی اور وہ بھی ہار گئے تو دادے ابّا نے کہا، ''آج دیر ہو گئی ہے، کل محی الدین پور چلیں گے۔'' چھوٹے تھے کیا کہتے۔ ٹھہر گئے۔ اگلے دن دادے ابّا نے تحصیل جا کر زمین چھوٹے بھائی کے نام کر دی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دادے ابّا نے ہی چھوٹے بھائی کے مقدمے کے سارے اخراجات برداشت کیے تھے۔

وصی الدین صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دادے ابّا نے جامع مسجد میں اپنا حجرہ بنوانے کے لیے اینٹوں کے دو بھٹے لگوائے تھے اور حجرہ صرف ایک نمبر کی اینٹوں سے بنوایا تھا۔ چچا کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی لیکن کیا کرتے خاموش رہے۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ گاؤں میں لنگڑے آم کا ایک باغ ابا نے ہائی اسکول پاس کرنے اور ملازمت ملنے کے درمیانی وقفے میں لگوایا تھا لیکن وصی الدین صاحب سے معلوم ہوا کہ اس

میں اب صرف چار پیڑ رہ گئے ہیں۔ وقت بھی کیا چیز ہے، حقیقتوں کو قصے کہانیاں بنا دیتا ہے اور قصے کہانیوں کو حقیقت۔

چند یادداشتیں

والد مرحوم کی نوٹ بک جو میرے پاس ان کے انتقال کے بعد ہی سے تھی، اس قدر حفاظت سے رکھ دی گئی تھی کہ ڈھونڈھے نہ ملتی، آج (۳۰ رستمبر ۲۰۱۰ء) مل گئی۔

اس نوٹ بک کے پہلے صفحے پر مرحوم کی تحریر میں لکھا ہے "This note book appertins to Zafaryab Hasan"۔ اس تحریر کے نیچے 7th July 1916 کی تاریخ درج ہے۔ وہ اس نوٹ بک پر ۲۳ رستمبر ۱۹۴۴ء تک مختلف اندراجات کرتے رہے۔ خودنوشت لکھتے وقت یہ نوٹ بک نہ مل سکی تھی۔ اب جب کہ خودنوشت کی کمپوزنگ بھی مکمل ہو چکی ہے نئی معلومات کو ان کی جگہ پر شامل کرنا بہت دقت طلب ہے۔ اس لیے چند اہم باتیں یہاں درج کر رہا ہوں۔

والد مرحوم کی تاریخ پیدائش ۸ رفروری ۱۸۹۷ء تھی (ان کا انتقال ۲۱ راپریل ۱۹۴۷ء کو ہوا۔) انھوں نے ہائی اسکول اٹاوہ اسلامیہ کالج سے کیا تھا۔ ہائی اسکول کے امتحان میں ان کا رول نمبر 939 تھا اور اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا نمبر 463۔ سنہ درج نہیں۔ اورئی میں ان کی ملازمت کا سلسلہ جون ۱۹۱۸ء میں شروع ہوا تھا۔ ان کا تقرر بطور اپرینٹس ہوا تھا لیکن یہ لفظ ٹھیک سے پڑھا نہیں جاتا۔

ان کی شادی کی تاریخ درج نہیں لیکن تاریخ وفات اہلیہ ۲۲ رفروری ۱۹۲۴ء درج ہے۔ اس نوٹ بک کے مطابق میری تاریخ پیدائش ۲۷ رنومبر ۱۹۳۲ء ہے، (اگرچہ ہائی اسکول سرٹیفکٹ میں ۱۷ رنومبر ۱۹۳۲ء درج ہے۔) سید محمد عمران کی ۳۰ رستمبر ۱۹۴۲ء اور نجمہ (میمونہ خاتون) ۲۳ رستمبر ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئی تھی۔ فتحیاب بڑے ابّا کی شادی ۱۲ رجون ۱۹۲۲ء کو ہوئی تھی۔

دادے ابّا کی تاریخ وفات نوٹ بک میں درج ہونے سے جانے کیسے رہ گئی۔

میری پیدائش کے وقت اختری آپا تقریباً پندرہ سال کی تھیں اور ان کی شادی ہو چکی تھی۔ انو آپا (انوری بیگم) کی شادی کا اندراج نہیں لیکن میرے خیال میں ان کی شادی ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی۔ مجھے کچھ کچھ یاد ہے۔

اس ڈائری کی تفصیلات کے مطابق میرے نام سے ڈاکخانہ میں اور یونڈس کی صورت میں

۹۹۰ روپے جمع کیے گئے تھے اور انوری آپا کے نام ۹۷۰ روپے۔ انوری آپا کے نام سے خریدے گئے پانچ سو روپے کے آخری بونڈ کا نمبر N/2 517749 تھا اور یہ ۸ر نومبر ۱۹۳۴ء کو خریدا گیا تھا۔ اسی تاریخ کو میرے نام سے سو روپے کا بونڈ خریدا گیا۔ اس کا نمبر L/2 063209 تھا۔

میرا خیال ہے کہ ابّا نے یہ بونڈ انوری آپا کی شادی میں کیش کرا لیے ہوں گے کیونکہ انتقال کے بعد ان کے کاغذات میں کوئی بونڈ نہیں ملا۔

اس نوٹ بک میں دادے ابّا کے نام سے ایک ہزار روپے کے بونڈ کا نمبر D/2 199176 اور ابّا کے نام اورئی پوسٹ آفس کے بونڈ کا نمبر D/2 251399 درج ہے لیکن اس کی رقم نہیں لکھی ہے۔ دادے ابّا کے نام کا بونڈ ۲۳ر ستمبر ۱۹۳۱ء اور ابّا کے نام کا بونڈ ۲۸ر مارچ ۱۹۳۲ء کو خریدا گیا تھا۔ سنہ کا آخری عدد اندازے سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کا اندراج ۱۹۳۱ء کے بونڈ کے بعد ہے۔ دادے ابّا کے ہزاروں روپے کے وار بونڈس ان سے الگ تھے۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں خریدے گئے تھے۔

اورئی کی کوآپریٹیو سوسائٹی میں ابّا کے ایک ہزار روپے اور ڈاکخانہ کی پاس بک میں شاید ساڑھے آٹھ سو روپے تھے۔ یہ اکاونٹ اکبری گیٹ کے حنا پوسٹ آفس میں منتقل کرا لیا گیا تھا۔ وہاں اس وقت مشہور مرثیہ نگار خبیر لکھنوی پوسٹ ماسٹر تھے۔

علاج مار گزیدہ:

نوٹ بک میں سانپ کے کاٹے کا علاج اس طرح درج ہے۔

کیچوے کی مٹی جو برسات میں بکثرت مل سکتی ہے تھوڑے سے پانی میں حل کر کے چار پانچ مرتبہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پلانے سے بفضل خدا قطعی صحت حاصل ہو جاتی ہے۔

نانیہال

میرے نانا کا اسم گرامی محمد صوفی تھا اور وہ جونپور میں قیام پذیر تھے، وطن ان کا موضع پہتیا ضلع غازی پور تھا۔ نانا کی بہن کی شادی نواب سر محمد یوسف کے والد جناب عبدالمجید بیرسٹر سے ہوئی اور نانا بھی انھی کی ریاست کے کاموں مصروف رہنے لگے۔ نانا کے والد کا نام مولوی محمد عمر تھا اور ان کا شمار غازی پور کے ممتاز وکیلوں میں ہوتا۔ نانا کے چچازاد بھائی مولوی محمد عظیم کا شمار بھی شہر کے نامور

وکیلوں میں ہوتا اور وہ رفاہ عام کے کاموں میں ساری زندگی مصروف رہے۔ ان کے والد کا نام محمد سلیم تھا۔ مولوی محمد عظیم کی ہمشیرہ میری سگی نانی تھیں۔ ان کی اولادوں میں میری والدہ عائشہ خاتون اور میری خالہ عابدہ خاتون، میرے ماموں محمد عقیل اور ان کے چھوٹے بھائی محمد شفیع تھے۔

میری بڑی خالہ عابدہ خاتون کی شادی سید وجیہہ الدین حسن سے ہوئی جو سید مہدی حسن کے صاحبزادے تھے۔ ان کا خاندان عہد شاہجہانی میں بخارا سے ہندوستان آیا۔ اس خاندان کے سربراہوں کے نام سید عبدالعزیز اور سید عبداللطیف تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے ہمراہ ان کے مرشد کے خاندان کے لوگ یا ان کے مرشد سید شاہ عطا خراسانی جو حضرت مخدوم بلال الدین جہانیان جہاں گشت بخاری کے سلسلۂ نسب سے تھے ہندوستان آئے۔ ہندوستان آنے کے بعد یہ دونوں خاندان آپس میں شیر وشکر ہو گئے۔ شاہجہاں نے اس خاندان کو ایک بہت بڑی جاگیر مرحمت فرمائی اور ان لوگوں نے گورکھپور کے قصبہ شاہ پور میں سکونت اختیار کی۔

۱۸۵۷ء میں اس خاندان کے سربراہ سید شاہ عنایت علی کو انگریزوں نے ڈومن گڑھ (گورکھپور) میں پھانسی دے کر ساری جائداد ضبط کر لی جس کے سبب خاندان منتشر ہو گیا۔ پتہ چلا کہ کچھ لوگ نیپال چلے گئے، کچھ لوگ ضلع رائے بریلی اور کچھ وہیں رہ گئے۔ میرے خالو سید وجیہہ الدین حسن کے دادا سید قاسم علی ۶۰-۱۸۵۹ میں اپنے دونوں بیٹوں، سید محمد ہادی حسن اور سید مہدی حسن، کو ساتھ لے کر جونپور آ گئے اور نواب عبدالمجید کے والد کی ریاست سے متعلق ہو گئے۔ مولانا ہادی حسن نے نواب صاحب کے مدرسۂ حنفیہ میں استاد العلماء مولانا ہدایت اللہ خاں سے علوم رائجہ اور مذہبی میں پوری پوری مہارت حاصل کی۔ مولانا ہدایت خاں اور مولانا سید محمد ہادی حسن کے شاگردوں میں ہندوستان کے مختلف مشاہیر مثلاً ڈاکٹر سر سلیمان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر، مولانا سلیمان اشرف، اور حیدرآباد کے اس وقت کے چیف جسٹس شامل ہیں۔ خود بیرسٹر عبدالمجید اپنے استاد ہادی حسن کا احترام اس حد تک کرتے تھے کہ ہائی کورٹ سے واپسی میں اگر الہ آباد سے آنے والی ٹرین زیادہ لیٹ ہو جاتی تو قیام گاہ کے بہت پہلے ہی اپنی بگھی سے اتر جاتے کہ کہیں گھوڑوں کی ٹاپ سے وہ جاگ نہ جائیں۔ عبدالمجید کے بیٹے نواب یوسف تھے جنھوں نے اپنی انگریز بیوی کے لیے الہ آباد کے سول لائنس میں ایک کوٹھی بھی بنوائی تھی۔ اسی کوٹھی میں علامہ اقبالؔ نے اپنا وہ خطبہ پیش کیا تھا جسے بعض حلقوں میں تصور پاکستان کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ نواب یوسف یوپی کے پہلے ہندوستانی وزیر صحت تھے۔ حضرت گنج کے

میونسپل بورڈ کی عمارت کا سنگ بنیاد انھی نے رکھا تھا۔ پتھر اب تک لگا ہے۔

میرے ننیہال کے سارے بزرگ اور میرے خالو کے خاندان کے افراد حضرت مولانا عبدالعلیم آسی، سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ، اور ان کے جانشین سید شاہ شاہد علی سبز پوش اور ان کے جانشین اور صاحبزادے سید مصطفیٰ علی صاحب، اور ان کے خلفا اور موجودہ سجادہ نشین مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب سے ارادت رکھتے تھے۔ خانقاہ رشیدیہ کے بانی دیوان محمد رشید مصطفیٰ تھے۔ وہ ایک طرف عالم متبحر اور دوسری طرف تصوف میں اس زمانے کے سر سبد گل تھے۔ ان کی تصنیف ''رشیدیہ''، علم مناظرہ کی واحد تصنیف ہے جو بیرون ملک بھی داخلِ نصاب ہوئی۔

میرے نانا کے پھوپھی زاد بھائی ڈاکٹر سید محمود تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد کا نام مولوی محمد عمر تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے علوم رائجہ کی ابتدائی تعلیم کے علاوہ عربی کی پوری پوری تعلیم مولانا سید ہادی حسن سے جونپور میں حاصل کی۔ خانقاہ رشیدیہ سے انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ حضرت آسی کا دست شفقت ان پر تھا۔ وہ خانقاہ سے عقیدت رکھتے تھے اور حضرت آسی کے مرید تھے وہ ان سے اس قدر قریب تھے کہ ان کے خاندان کے لوگ خانقاہ کے قبرستان رشید آباد میں مدفون ہوئے۔

میرے خالو کے دادا سید قاسم علی صاحب اور ان کے صاحبزادے سید ہادی حسن اور مہدی حسن صاحب نواب صاحب کی ڈیوڑھی محلہ عالم خاں کے احاطے کے ایک وسیع و عریض مکان میں رہتے تھے۔ خانقاہ رشیدیہ کے اس وقت کے سجادہ نشین حضرت شاہ غلام معین الدین تھے جو قطب الہند کے لقب سے مشہور تھے۔ انھوں نے اپنے بھانجے سید سراج الدین کی تعلیم و تربیت مولانا سید ہادی حسن کے سپرد کر دی اور ان کو اپنی خانقاہ کی دیوار سے متصل ایک بہت بڑا خطۂ زمین مرحمت فرمایا جس کا ایک راستہ خانقاہ سے ہو کر بھی تھا جو اَب تک برقرار ہے۔ مشہور شاعر اور صوفی آسیؔ غلام معین الدین کے خلیفہ اور مرید تھے اور بعد میں خانقاہ کے سجادہ نشین بھی ہوئے۔ میری نانی، ان کے سگے بھائی مولوی محمد عظیم (ڈاکٹر عبدالعلیم کے والد) اور ان کی اہلیہ بھی حضرت آسی کی مرید تھیں۔

میرے نانا غالباً ۱۸۸۰ء کے آس پاس غازی پور سے جونپور آئے۔ شروع میں ان کا قیام محلہ عالم خاں اور بعد میں خانقاہ سے متصل دو قطعہ مکان میں زندگی کی آخری سانس تک رہا۔

◆◆◆

چھپتے چھپتے

''جو یادرہا'' کا کتابت شدہ مسودہ دہلی اردو اکادمی کو بھیجنے کے بعد ایک دن بالکل خلاف توقع ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۵ء، اور ۱۹۶۲ء کی میری چھوٹی چھوٹی ڈائریاں ہاتھ لگ گئیں، پہلے مل گئی ہوتیں تو چند مزید معلومات تفصیل اور تیقن سے ''جو یادرہا'' کا حصہ بن پاتیں۔ مسودہ سے اس مرحلہ پر چھیڑ چھاڑ مشکلیں کھڑی کرسکتی ہیں۔ چنانچہ ان ڈائریوں کے چند متعلقہ اندراجات مختصراً لکھ رہا ہوں۔

۱۹۵۳ء: پہلے صفحہ پر لکھا ہے، I am a permanent junior where knowledge is concerned.۔ ۲ جنوری، ۹ بجے صبح افسر کریم سے کافی ہاؤس میں ملاقات۔ ۵ جنوری، گل محمد شاہ کو ریڈیو کے ویرائٹی پروگرام کے لیے ڈرامہ دیا۔ ۱۶ جنوری، آل انڈیا ریڈیو، دہلی، سے خط موصول ہوا۔ ۲۵ جنوری، ۱۲ بج کر ۴۵ منٹ پر اے۔ آئی۔ آر۔ سے ''آپ سے مطلب'' کا براڈ کاسٹ، ۲۷ جنوری آل انڈیا ریڈیو سے چیک ملا۔ ۲ فروری، ڈاکٹر محمد حسن کے گھر پر ۴ بجے شام میں حلقۂ احباب کی نشست۔ ۵ فروری، والدہ اور چھوٹے بھائی بہن اورئی کے لیے روانہ ہوئے، ۱۳ فروری، سارا دن عدالت میں لگ گیا۔ ۶ مارچ، اسٹالن کا انتقال۔ ۹ اگست شیخ عبداللہ وزیر اعظم (جموں اور کشمیر) کے عہدہ سے برخاست۔ ۲۲ ستمبر، ماہنامہ ''شمع'' کا خط موصول ہوا، کہانی یکم اکتوبر کو بھیجی گئی۔ ۳۰ اکتوبر، پولیس بھوک ہڑتالی طلبہ کو یونین بلڈنگ سے اٹھالے گئی۔ ۳۱ اکتوبر، منکی برج پر پولیس فائرنگ۔ یکم نومبر، لاٹوش روڈ اور امین آباد میں پولیس فائرنگ ۔ ۲ نومبر، امین آباد میں ۱ بجے دن کو مجھے گرفتار کرلیا گیا، ۳ بجے جیل بھیج دیا گیا۔ ۵ نومبر، جیل سے ۱ بجے دن میں غیر مشروط طور پر رہا کردیا گیا (رفیع احمد قدوائی صاحب سے طلبہ کی ملاقات دو ایک دن بعد ہوئی ہوگی)۔ ۱۸ دسمبر کو حزب مخالف کے لیڈر نے

اپنی تقریر میں میرا نام لیا۔

۱۹۵۴ء: ۱۳ جنوری ماہنامہ ''شمع'' کا خط ملا۔ ۲۴ جنوری، انجمن کا جلسہ، شام ساڑھے پانچ بجے۔ ۸ فروری ''شمع'' کا خط ملا۔ ۱۳ فروری، آل انڈیا ریڈیو، جالندھر، کے خط کا جواب دیا۔ ۱۵ فروری، ورائٹی پروگرام ریڈیو کو بھیجا۔ ۲۲ر فروری، ریڈیو سے چیک موصول ہوا۔ ۲۸ فروری، میرا مزاحیہ ڈرامہ ''اس میں کیا شک ہے'' ۸ بج کر ۴۵ منٹ پر ریڈیو سے نشر ہوگا۔ ۱۸ مارچ، آل انڈیا ریڈیو، جالندھر، کو ڈرامہ بھیجا۔ ۲۸ اپریل، امتحان شروع ہوئے۔ انگریزی نظم ٹھیک ٹھاک۔ ۲۹ اپریل انگریزی ڈرامہ ٹھیک ٹھاک۔ ۳۰ اپریل انگریزی نثر ٹھیک ٹھاک۔ یکم مئی، فلسفہ (II۔ اخلاقیات اور سماجی فلسفہ) ٹھیک۔ ۳ مئی، نفسیات ٹھیک۔ ۴ مئی، مابعد الطبیعات توقع سے بہت کم، حیرت ہے۔ ۵ مئی ہندوستانی معاشیات ٹھیک ٹھاک۔ ۶ مئی اکنامک تھیوری، اچھا نہیں ہوا۔ ۱۱ مئی اوری کے لیے روانگی۔ ۱۳ مئی، مکان فروخت ہوگئے (۲۸ ہزار میں)۔ ۱۳ مئی اکرام صاحب کو پڑھانا شروع کیا۔ ۱۱ جولائی، میرا مزاحیہ ڈرامہ ''نوکری کی تلاش'' دن میں ۱۰ بج کر ۴۵ منٹ پر دوسری بار نشر ہوا۔ ۱۸ جولائی، تقی حیدر رہنے کے لیے میرے یہاں آ گئے۔ ۲۳ جولائی، کہانی ''بھید'' شمع کو بھیجی۔ ۱۱ اگست اکرام صاحب کے بیٹوں، شہزاد اور آباد (نصر اللہ خاں) کو بھی پڑھانا شروع کیا۔ ۲۴ اگست، آج تک مجھے اکرام صاحب سے ساٹھ روپے مل چکے ہیں۔ ۲۰ ستمبر، یونیورسٹی کے حلقۂ ادب کا افتتاح۔ میں سکریٹری منتخب ہوا۔ ۱۵ اکتوبر، ریڈیو اسٹیشن پر مشاعرہ۔ ۱۳ اکتوبر، انجمن کے جلسے میں افسانہ پڑھنا۔ ۱۳ نومبر ''کھلونا'' کو خط لکھا۔ ۱۸ نومبر، ''شمع'' کو کہانی بھیجی۔ کہانی کا نام ہے ''مَد اوا''۔ ۹ دسمبر وزن ۵ پونڈ کم ہوگیا۔

۱۹۵۵ء: ۱۶ جنوری، رضیہ بھابی نے شمو اور نجمہ کو پڑھانے کے لیے کہا۔ ۱۸ جنوری، منٹو کا انتقال۔ ۲۸ جنوری، کھلونا نے کہانی مانگی۔ ۷ ۲مارچ آل انڈیا ریڈیو سے مزاحیہ ڈرامہ ''آپ سے مطلب'' دوسری بار نشر ہوا۔ ۴ جون، قاضی باغ کے مکان سے غلام احمد صاحب (کنگھی والی گلی) کے کمرہ میں منتقل ہوگیا۔

۱۹۶۲ء: یکم جنوری، دوشنبہ، بنّے بھائی سے ۵ بجے شام کو ملاقات۔ ۹ جنوری، ''نئی کہانیاں'' الہ آباد کو افسانہ بھیجا۔ ۱۳ جنوری اجے گھوش کا انتقال۔ ۱۵ جنوری کو ایک خط ملا، جس میں

لکھا تھا، "Are you dead or alive, if alive , I will kill you"۔ ۱۴ اپریل وارثی کو خط لکھا۔ ۲۶ مئی شمع کو افسانہ بھیجا۔ ۱۸ا اگست، شوکت صدیقی کو خط لکھا۔ ۲۸ا اگست، شوکت صدیقی کا خط موصول ہوا۔ ۲۰ اگست کا ایک اندراج اس طرح ہے: ۱۱۰ روپے والدہ کو، ۲ روپے نجمہ کو، ۵۰ روپے اورئی، الہ آباد (شاید بانڈس کے مقدمہ کے سلسلے میں سفر خرچ) ۵ روپے اخبار، ۱۰ روپے بجلی کا بل، ۵ روپے تولیہ، ۵ روپے چپل، ۵ روپے ہوٹل، ۵ روپے پی پلس پبلشنگ ہاؤس۔ کل ۱۹۷ روپے۔

اس کے بعد ڈائری میں کوئی قابل ذکر اندراج نہیں۔ شاید ماہنامہ ''کتاب'' کی اشاعت کی تیاریاں شروع ہونے کے سبب۔

مندرجہ بالا اندراجات سے اندازہ ہوا کہ یادداشت نے خاصہ ساتھ دیا ہے، بس دو ایک جگہ ترتیب میں الٹ پلٹ ہوگئی ہے۔ باقی ڈائریاں مل جاتیں تو صورت آئینہ ہوجاتی۔

ان ڈائریوں میں درج ذیل رسائل و جرائد کے نام بار بار آئے ہیں:: ہفت روزہ ریاست، شاہکار، شمع، راہی، آجکل، بیسویں صدی، شاہراہ، پگڈنڈی، سب رس، خورشید، اجالا، صبح نو، فلم آرٹ، پھول (کراچی) ماہ نو (کراچی) سویرا، افکار، ساتھی، کردار، کھلونا، دوست، چندن (عزیز احمد کا افسانہ ''تصور شیخ'' اسی میں شائع ہوا تھا) نئی کہانیاں (الہ آباد) تخلیق، نقش، کامران۔

ماہنامہ ''شمع'' کا غالباً آخری خط درج ذیل ہے:

۲۷ نومبر ۱۹۶۲ء

عابد بھائی،

بغیر عنوان کے ہی آئی ہوئی آپ کی کہانی جلد ہی شمع اور سشما میں شائع ہوگی۔

امید ہے آپ نے اب تک اس کے لیے کوئی عنوان تجویز کرلیا ہوگا۔

اس دوران کوئی نئی کہانی لکھی ہو تو بھیجیے گا۔ ملک کے موجودہ ہنگامی حالات پر تو کوئی کہانی نہیں لکھی آپ نے؟

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

مخلص

یونس دہلوی

یہ خط محفوظ ہے۔ اس کے بعد میں کوئی کہانی شمع کو نہ بھیج سکا۔

۱۹۵۳ء سے ڈراموں کے نشر ہونے کا مطلب ہے کہ ان میں حصہ لینے کے لیے میری آواز دو سال قبل ضرور منظور ہوئی ہوگی۔ ریڈیو ڈراموں کے مشہور پروڈیوسر ایس۔ ایس۔ ایس۔ ٹھاکر نے میرے دو مزاحیہ ڈرامے ''بے وقوف کی تلاش'' اور ''موٹر کار، بگھی اور شکار'' پروڈیوس کیے تھے۔ یہ ڈرامے تیس تیس منٹ کے تھے اور شمالی ہندوستان کے ہر ریڈیو اسٹیشن سے کئی کئی بار نشر ہوئے۔ میری معلومات کے مطابق ''موٹر کار بگھی اور شکار'' آخری بار ۱۹۹۵ء میں جموں ریڈیو سے نشر ہوا۔ آدھ گھنٹے کا یہ ڈرامہ ''دودھ بھارتی'' سے پندرہ پندرہ منٹ کے دو وقفوں میں نشر ہوا تھا۔ ان دنوں متاخر نشریوں پر ایک چوتھائی رائلٹی ملتی تھی۔ ساڑھے بارہ روپے کے دو درجن چیک تو آئے ہوں گے لیکن جموں کے نشریہ کی رائلٹی نہیں ملی تھی۔ پتہ نہ مل سکا ہوگا۔ عمران نے بھی یہ نشریہ سنا تھا۔

◆◆◆

حرفِ آخر

جو یاد رہا... یعنی عابد سہیل کی تقریباً مکمل دنیا جس میں وہ پلا بڑھا، جس میں اس نے دکھ جھیلے، مصیبتیں اٹھائیں، محبتیں کیں، جس میں اس سے محبتیں اور نفرتیں کی گئیں اور وہ کہانی بھی جس میں اس نے خود کو تباہ کیا اور دوسروں کو موقع دیا کہ اس کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں... ختم ہونے کو آئی۔

اس خودنوشت کے مصنف کا دعوا ہے کہ اس نے سب کچھ سچ سچ بیان کیا ہے، تفصیلات میں کچھ ادھر کا ادھر ہو گیا ہو تو بات دوسری ہے۔ لیکن اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے اسے ذلیل و رسوا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا، بلکہ طرح طرح کے ستم ایجاد کیے، رعایت برتی ہے، کہیں زیادہ دل دوز واقعات کو درگذر کر کے۔ ممکن ہے اس نے انھیں معاف کر دیا ہو۔ اس کا اسے حق ہے لیکن انھیں بھول جانا اس کے بس میں نہیں کہ ایک ایک نشتر دل میں اب بھی ترازو ہے۔

ایک جگہ اس نے ناانصافی سے بھی کام لیا ہے اور آپ کو اس عابد سہیل سے نہیں ملایا جو بالکل مختلف ہونے کے باوجود اس کے ساتھ برسوں پلتا رہا۔ یہ عابد سہیل، کمینہ، حاسد، دوسروں کی ترقی، خوش حالی، خوش پوشاکی، دولت، کامیابیوں اور کامرانیوں سے جلتا اور خوب خوب کڑھتا تھا۔

اس کے اس ہمزاد نے پہلی بار ''دو نقش ایک تصویر'' میں سر اٹھایا اور پھر اپنی انتہا کو پہنچا ''سچے، جھوٹے موتی'' میں، پارو کے اس جملے کے ساتھ، ''کیسا اکڑ اکڑ کے چل رہا ہے، اللہ کرے اس کی موٹر ٹکرا جائے، ساری شیخی نکل جائے''۔

یہ جملہ پارو کا نہیں عابد سہیل کے ہمزاد کا ہے۔

لیکن عابد سہیل نے اپنے اس ہمزاد سے ہار نہیں مانی، خود کو اس کے سپرد نہیں کر دیا بلکہ اس سے ایک خوں ریز، خوفناک جنگ کی جو برسوں جاری رہی، رک رک کر۔ اس ہمزاد کے زیر اثر

اس سے غلطیاں بھی ہوئیں، جن کی اسے سزا ملی اور ملے گی لیکن وہ اس شدید جنگ کے لیے داد کا بھی مستحق ہے جو اس نے اپنے آپ، اپنے دشمن اور اپنے دوست سے کی اور آخر میں فتح یاب ہوا۔

اس کامرانی نے ہی اسے وہ سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ بخشا جو منزلیں مارتے مارتے صرف چند سال قبل اپنی انتہا تک پہنچ گیا تھا اور معلوم نہیں اب کن منزلوں میں ہے... خیر، جب توقع ہی اٹھ گئی تو کیسا گلہ، کیسا شکوہ۔ لیکن ایک واقعہ یادوں سے ایک لمحے کی جدائی کے لیے تیار نہیں۔

۱۹۷۸ء کا کوئی مہینہ، کوئی دن

کوئن میری اسپتال، پرائیوٹ وارڈ۔

مریضہ بستر پر دراز ہے۔ آپریشن کے چوتھے دن اس کی ایک عزیزہ تیمارداری کے لیے آ گئی ہیں۔ ڈاکٹر کٹی پرائیوٹ وارڈ کے کمرے سے نکلتی ہیں۔ مسکرا کر مریضہ کے شوہر کو دیکھتی ہیں اور دالان میں کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک بچّی کو بھی۔ وہ شاید اسے مریضہ کی بیٹی سمجھ رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔

"کچھ دوائیں بدل دی ہیں۔ لے آؤ۔ تمھارا بیوی اب بالکل ٹھیک ہے۔ پرسوں چھٹی، یا ایک دن بعد۔"

اندر سے پرچہ آتا ہے۔ دوائیں لانا ہے۔ وہ دوائیں خریدنے کے بعد دو لالی پاپ بھی خرید لیتا ہے، اس بچّی کے لیے جو پرائیوٹ وارڈ کے باہر کرسی پر بیٹھی ہے۔

کمرے سے ایک خاتون برآمد ہوتی ہیں۔ دوائیں لیتے لیتے ان کی نظر بچّی پر پڑتی ہے۔

"یہ لالی پاپ کہاں سے آئی؟" وہ پوچھتی ہیں۔

"خالو ابّا نے دی ہے۔" بچّی ہنستے ہوئے کہتی ہے۔

ایک چانٹا اس کے ہاتھ پر پڑتا ہے۔

"جو بھی جو کچھ لا کے دے گا تم کھا لوگی!"۔

دونوں لالی پاپ چھٹک کر سامنے کے لان کی گھاس پر پڑے نظر آتے ہیں۔

یہ چانٹا اس بچّی کے ہاتھ پر نہیں عابد سہیل کے گال پر پڑا تھا، زندگی میں اس طرح کا پہلا اور آخری تھپّڑ... اور پانچوں انگلیوں کے نشان جو اس وقت پڑے تھے اب بھی سرسبز ہیں۔ یہ

بات دوسری ہے کہ کسی اور کو نظر نہ آئیں۔

لاکھ کوشش کے باوجود عابد سہیل اس چاننے کی سوزش سے نجات نہیں حاصل کر سکا ہے اور اسے اپنے ساتھ قبر میں لے جائے گا۔

معذرت در معذرت

لفظ معذرت پورے معنی ادا کرنے سے قاصر ہے۔ مجھے معافی مانگنی ہے۔

سب سے پہلے اپنے بچّوں، صبا، ساجد اور زرّین سے، جنھیں اپنا بچپن ان خوشیوں اور بے فکری کے بغیر گذارنا پڑا جن سے عمر کا وہ حصّہ عبارت ہوتا ہے۔ وہ باپ کی مجبوریوں اور مفلسی سے اس حد تک واقف تھے کہ ان میں سے کسی نے کبھی کسی چیز کے لیے ضد نہ کی، ٹھنٹھنانا کیا ہوتا ہے یہ انھیں معلوم ہی نہ ہو سکا۔

اور انیس سے بھی جس کے اُن خوابوں میں سے ایک بھی مَیں پورا نہ کر سکا جنھیں آنکھوں میں بسا کر لڑکی مائیکے کی دہلیز پار کرتی ہے۔

اور اپنے آپ سے بھی جس نے خود پر ہونے والے ظلم اور زیادتی کو خاموشی کا گھونٹ پی کر برداشت کر لیا...

اور اب جب کہ وقتِ سفر قریب ہے، اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ان یادوں کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ ان میں سے کوئی جنھوں نے اس کی زندگی میں زہر بھر دیا دائمی زندگی میں اس کے آس پاس بھی ہو اور اس لیے اس نے اپنی آخری آرام گاہ کی جگہ کا انتخاب بھی کر لیا ہے، اپنی موجودہ قیام گاہ کے پاس ہی۔ اس کی ساری زندگی انتظارِ موسمِ گل میں گذری اور یہ انتظار اسے آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی کرنا ہے:

بنائیے سرِ راہِ گذار میرا مزار
مری سرشت میں ہے انتظارِ موسمِ گل

اور ہر سوال کا اس کے پاس ایک ہی جواب ہے۔ انتظارِ موسمِ گل لے کے آیا ہوں، اور کچھ بھی نہیں۔

خدا حافظ
عابد سہیل

۲۰ر دسمبر ۲۰۱۱ء

اشکِ خوں

(اپنی پیاری بہن نجمہ کی پہلی برسی کے موقع پر ۱۹ رجون ۱۹۸۴ء کو کہی گئی)

(۱)

کیسے ۳۶۵ دن یہ بیتے / اتنی ہی بے کیف سی راتیں
بارہ مہینے / تینوں موسم
دل کو چیر کے رکھ دیں / ایسی یخ بستہ تھیں ہوائیں
اور پھر ایسی گرمی جس میں / جسم کے ساتھ ہی روح بھی گھولے
پھر طوفانی بارش کے مہینے / جن سے کوئی بچ نہ پائے
گھر کے اندر، گھر کے باہر / دل کے اندر، دل کے باہر

لیکن اُن آنکھوں سے اوجھل / جو تم کو جاڑے، گرمی اور برسات
میں ہر دم، ہر لمحہ دل میں رکھتی ہیں / جانے کس دنیا میں گم ہو؟
جانے کہاں ہو؟

کیا تم کو معلوم ہے یہ دن / جن کو گنو تو تین سو پینسٹھ
بھوگو تو لاکھوں سے سوا ہیں / کیسے بیتے!

(۲)

کون سا موسم / کون سی رت تھی
کون سا وہ منحوس تھا لمحہ / جس میں تمھاری یاد کا سایہ
دل پر بادل بن کے نہ چھایا

دل کی دھڑکن/ خون کی گردش
ٹکرائی یادوں سے تمھاری/ اپنی عظمت پر شرمائی

لیکن زیست ہے نام غموں کا/ اور ہم ان سے بچ جانے کو
نام خوشی کا دے دیتے ہیں/ پھر بھی ان جھوٹی خوشیوں میں
جرأت کب ہے/ اپنے خول سے باہر آ کر

آنکھوں اور ہونٹوں کو چومیں/ اور کبھی گر ہنس بھی دیے تو
اپنی حماقت پر یا ان کی/ جن کو قضا و قدر نے دی ہے
شانِ خدائی/ دل کی سونی سی گھاٹی نے
ایک اجاڑ صدا یہ سنائی/ تو ہنستا ہے؟
تو ہنستا ہے؟

(۳)

لیکن نجمہ!
جان سے پیاری/ میرے اِن ہاتھوں میں کھیلی
ٹوٹ کے مجھ کو چاہنے والی/ تجھ کو خبر ہے
تجھ کو خبر ہے/ مجھ پر اس بارہ ماسے کے
سارے دنوں، ساری راتوں میں/ کیا کچھ بیتی، کیا کچھ گذری

خون کی ندی، خون کی لہریں/ وہ بمبئی ہو یا ہو بھونڈی
یا پھر شہر امرتسر ہو/ یا ہو وہ پنجاب کہ اب جو
نام کا بس پنجاب رہا ہے/ دو ندیاں تو ارض وطن سے
کٹ کے غیر ہوئی تھیں پہلے/ ان کے علاوہ ایک ندی تھی
بے بس بے کس انسانوں کی/ جو ہجرت کر کے
اک اک کر کے، دس دس کر کے/ پھر لاکھوں میں مانند سمندر

ارض غیر کو جا کے سدھاری

اور اب

ہیر اور رانجھا کی بستی میں/ دو تقریباً یکساں ندیاں ہیں

اک دوجے کے خون کی پیاسی/ اک دوجے کے خون میں ڈوبی

ان سے کوئی چاہے تو پنجاب کو/ اس کے نام کی لاج دلا دے

(۴)

لیکن نجمہ!

کتنے ہی دلدوز ہوں منظر

کتنی ہی دلدوز ہوں چیخیں

آنکھوں اور کانوں سے میرے

ٹکرا ٹکرا کر لوٹ آتی ہیں

پیاری نجمہ، جان سے پیاری میری نجمہ

اب میں کیا، میرا غم کیا

اب ہم سب کیا، ہم سب کے غم کیا

اور خوشیاں بھی

آنسو ہیں کہ تھمتے نہیں ہیں

آنسو ہیں کہ رکتے نہیں ہیں

◆◆◆

عرش ملسیانی کا خط اختر جمال کے نام

Ajkal
Old Secretariat
Delhi
۲/۶/۵۳

مکرمہ تسلیم

مضمون نمبر امانت موجود ہے۔ ذرا دیر ہوئی تو لکھوں گا
ممکن ہے اکتوبر کے شمارے میں شامل کیا جائے

عرش ملسیانی

ON INDIA GOVT. SERVICE

VAK/722
21.7.53

محترمہ اختر جمال

c/o
حاجی بدرالدین صاحب چوراہا گلی گنج لکھنؤ

Lucknow

R. Aiyangar,
Administrative Officer,
Publications Divn. Miny. of I. & B.
Old Secretariat, DELHI-8.

عرش ملسیانی کا خط عابد سہیل کے نام

Ajkal
Old Secretariat
Delhi

نیازمند
عرش ملسیانی

ڈاکٹر رادھا کرشنن کا خط عابد سہیل کے نام

VICE-PRESIDENT
INDIA

NEW DELHI

5 April,1956.

Dear Sir,

Thank you for your letter of the 4th April.

If you read my Gautama the Buddha, and the introduction to DHAMMAPADA, you will be able to find answers to the questions you raise.

With all good wishes,

Yours sincerely,

(S.Radhakrishnan

Shri Syed Abid Suhail,
Kitabi- Duniya,
Nazirabad,Lucknow,U.P.

Sultan's Bungalow
Badshahbag.
Lucknow. U. P.
6.4.56.

Dear Sir,

Yours of the 4th.

Yes, the Buddha was a nāstika in the Indian sense. Nāstika means one who does not admit the authority of the Vedas and the Upaniṣads.

The Buddha was an atheist in the Western sense too. There is no place of a personal permanent Being as God in Buddhism.

Yours faithfully
Mrs. S. Dasgupta.

حیات اللہ انصاری کا خط

محبی مجیب صاحب

اخبار آپ نے اچھا نکالا ہے۔

مضامین خوب ہیں اور [illegible]

تو بہت ہی خوب ہے۔

حیات اللہ

۱۳ / اگست

قیصر تمکین کا خط

یا شیخ المفکرین

کیا کبھی فرصت سے ملنا ہوگا

ترانا لکھوانا کرنا آپ کی بھی

قسمت میں نہیں ہے۔

تیرا

قیصر

22.1.65

''گھروندہ'' کی تحریر

گھروندا

(ناول)

حیات اللہ انصاری کا خط

حیات اللہ انصاری
MEMBER OF PARLIAMENT
(RAJYA SABHA)

۲۴-۲۵ - ویسٹرن کورٹ
جن پتھ - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

(مورخہ ۹/۶/۱۹۸۹)

مکرمی عابد صاحب - السلام علیکم

آپ نے اتنی محبت، اتنی محبت کا خط لکھا ہے کہ دل باغ باغ ہوگیا - آپ کا واسطہ ہے اس لیے توقع ہے کہ ادھر سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا - اور اب ہم لوگ نقصان کی سطح سے کافی بلند بھی ہوگئے ہیں اور بات بھی پرانی ہوگئی ہے - اس کو بھول جائیے -

پندرہ روزہ "سب رنگ" کا قضیہ ابھی تک پتا نہیں ہے - کیا کام دہلی میں ہوا ہے؟

~~لکھنؤ میں - [illegible] ہوں -~~

لکھنؤ آنے والا ہوں - آ کر ملوں گا -

والسلام

حیات اللہ انصاری

حیات اللہ انصاری

یشپال کپور کا ٹیلی پرنٹر پیغام

TO SHRI ABID SUHAIL NE

FROM HD

--------------SEPT 5/1 83

PLS SEND YOUR BRIEF BIO-DATA ON T P IMMEDIATEL .

HAVE YOU GOT A PASSPORT AND IS IT VALID ?

IF NOT YOU APPLY FOR ONE IXXXBXXXXXE+IMMEDIATEL TO THE

RPO LKO, UNDER INTIMATION TO ME. XXXXXXXXXXXXXXXXXX

THERE MAY BE A LIKELY FOREIGN VISIT FROM 13 TH INST. FOR ABOUT

TWO WEEKS.

ENDS ACK PLS+
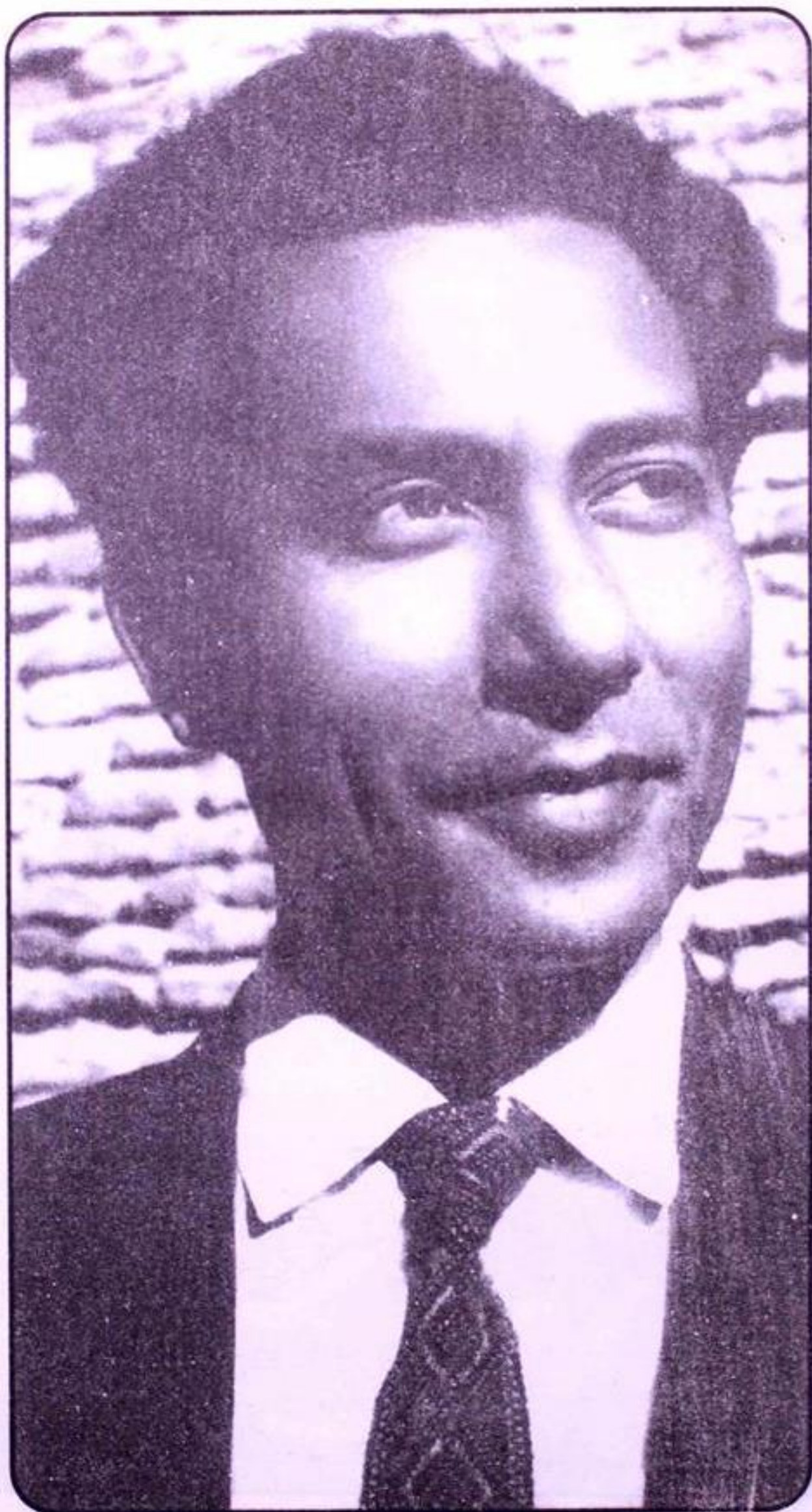
عابد سہیل (۱۹۶۴)
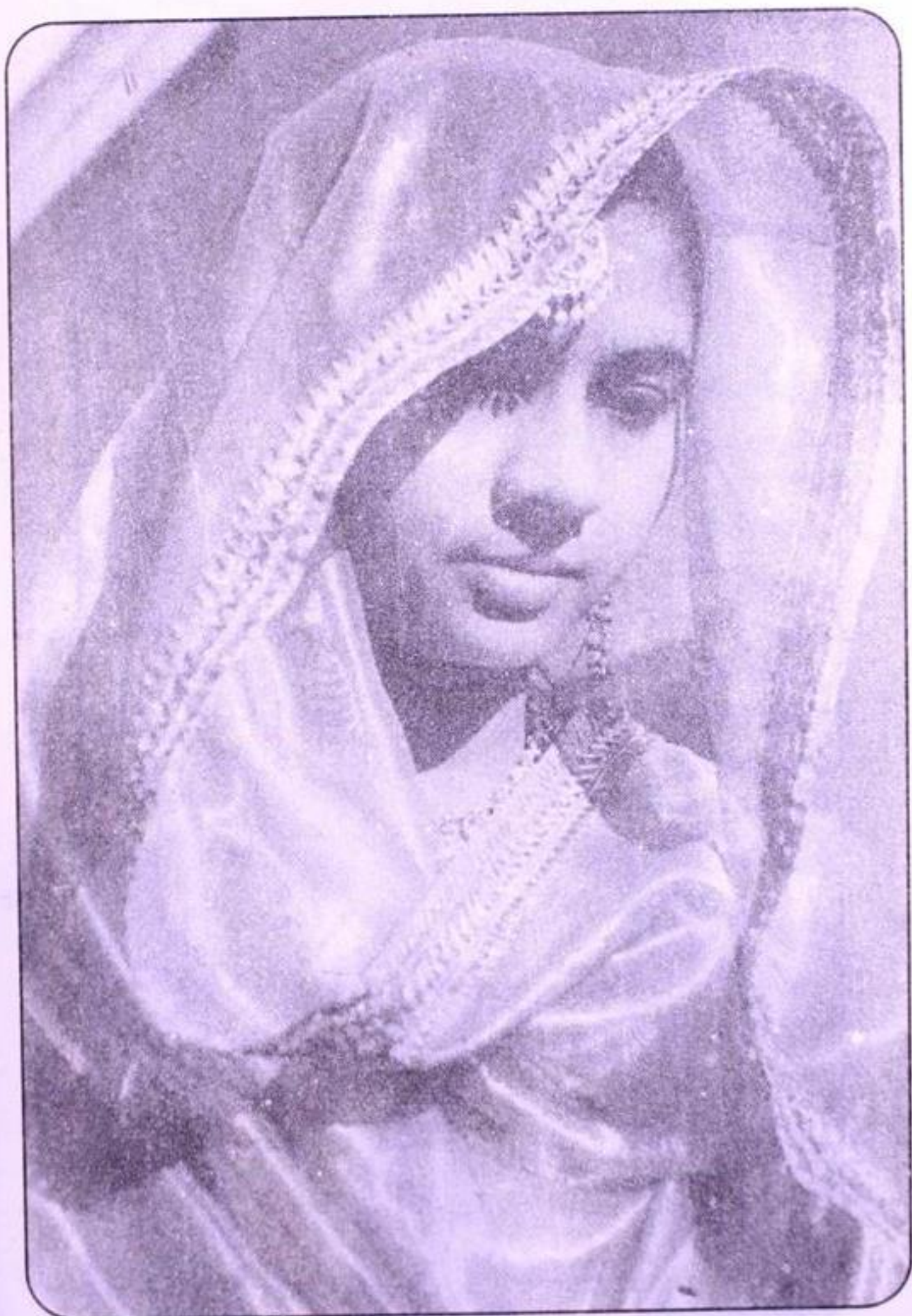
انیس نصرت (۱۹۶۴)
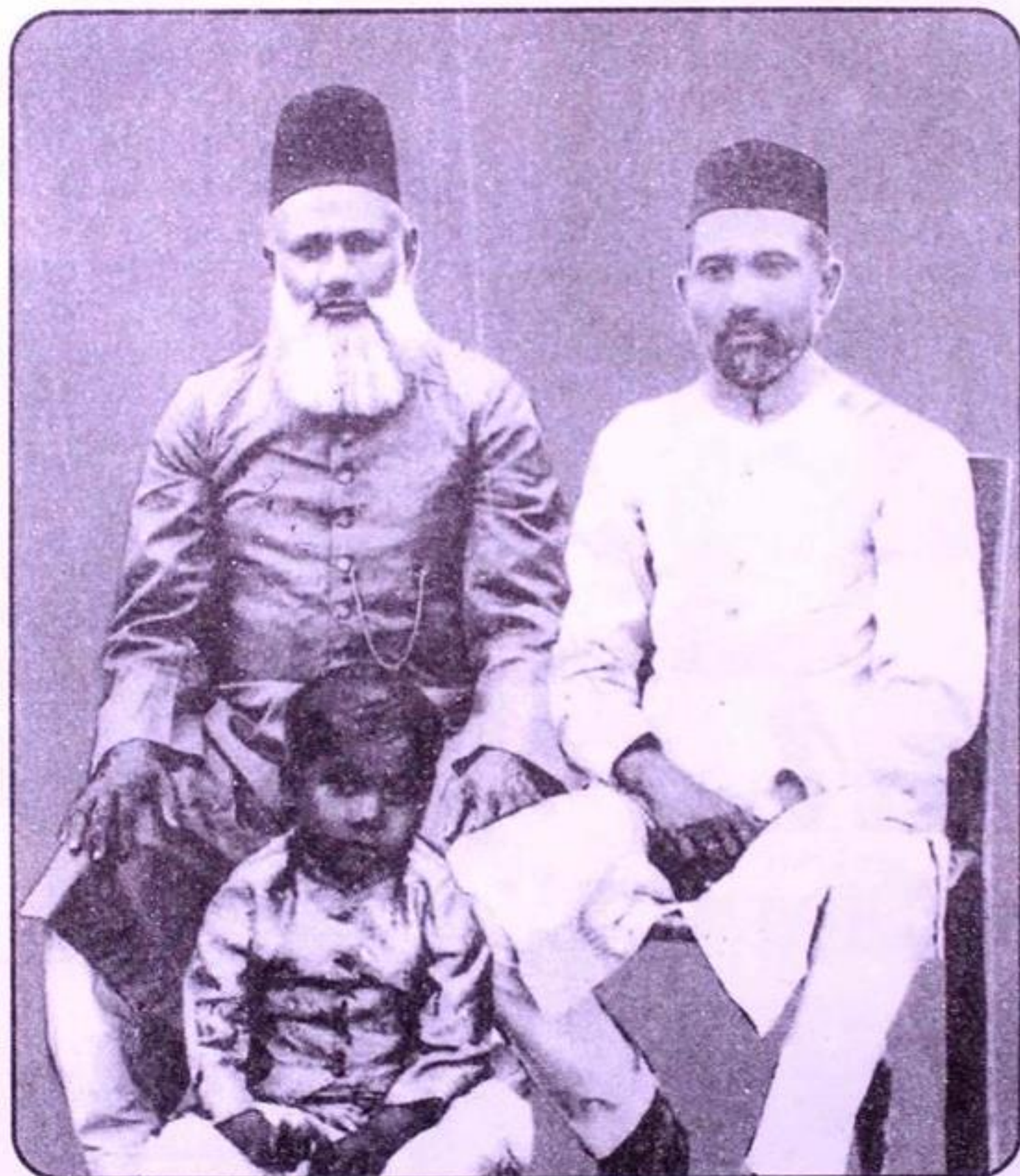
دادے ابّا، ابّا اور ان کے قدموں میں سید محمد عابد (۱۹۳۶ء)

(یہ تصویر ایک گروپ فوٹو سے تیار کی گئی ہے)

نجمہ خاتون (چھوٹی بہن)

عائشہ بیگم (والدہ)

ڈاکٹر سید محمد عمران (چھوٹا بھائی)

۱۹۵۱

۱۹۵۳

عابد سہیل

इंडियन एयरलाइन्स
Indian Airlines
वरिष्ठ नागरिक/SENIOR CITIZEN

दिनांक
Date 19 12/01 . क्र. सं. Sr. No. 23285
नाम
Name MR. S. M. ABID
जन्म तिथि
Date of Birth 17-11-1932
पता
Address 22, SP, Chetan Vihar, Sector-C, Aliganj, Lucknow.

Issuing Authority
LUCKNOW
यात्री के हस्ताक्षर
Signature of Passenger

۲۰۰۱

۱۹۵۵

انیس نصرت اور عابد سہیل ابوظہبی میں
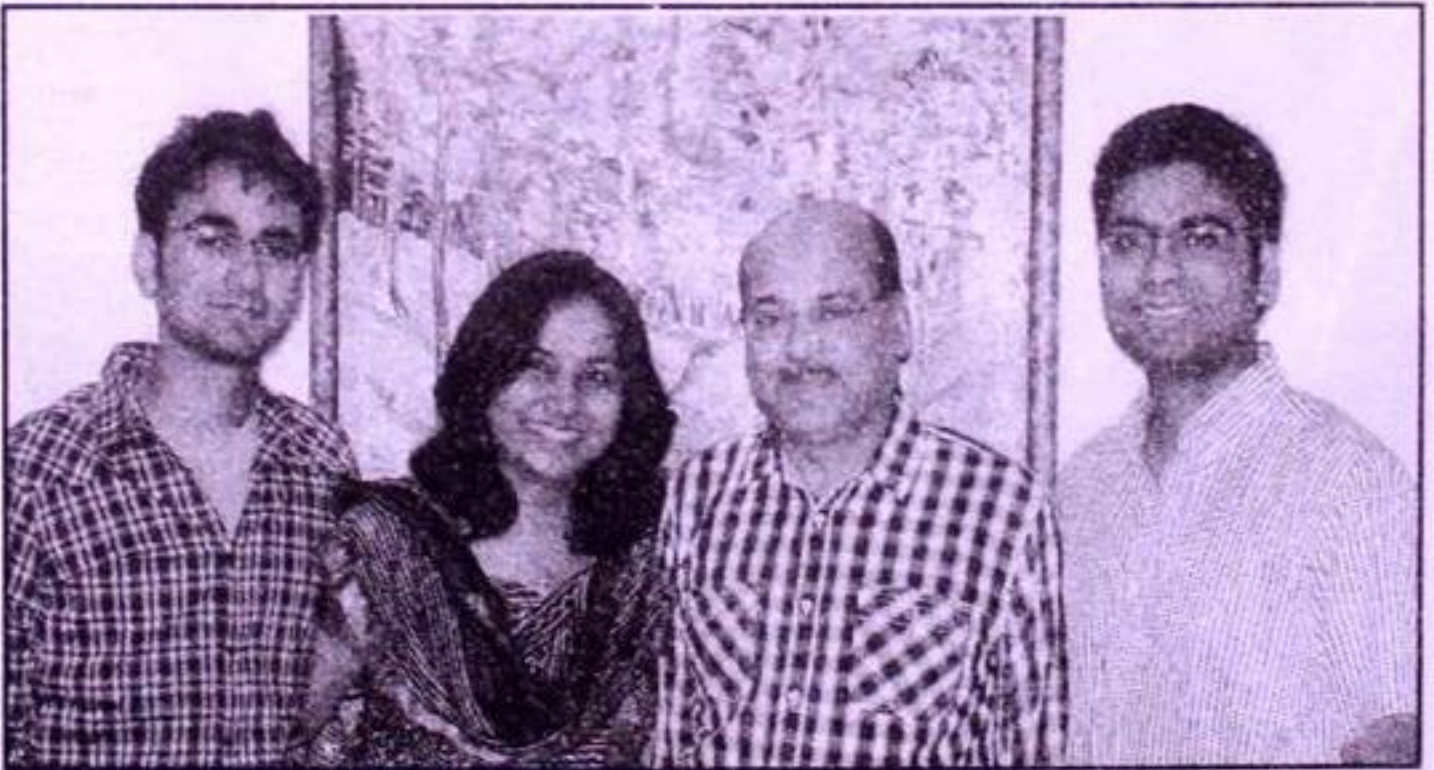
بلال ایم قریشی　　مقبول احمد قریشی　　صبا قریشی (بڑی بیٹی)　　علی عمر قریشی
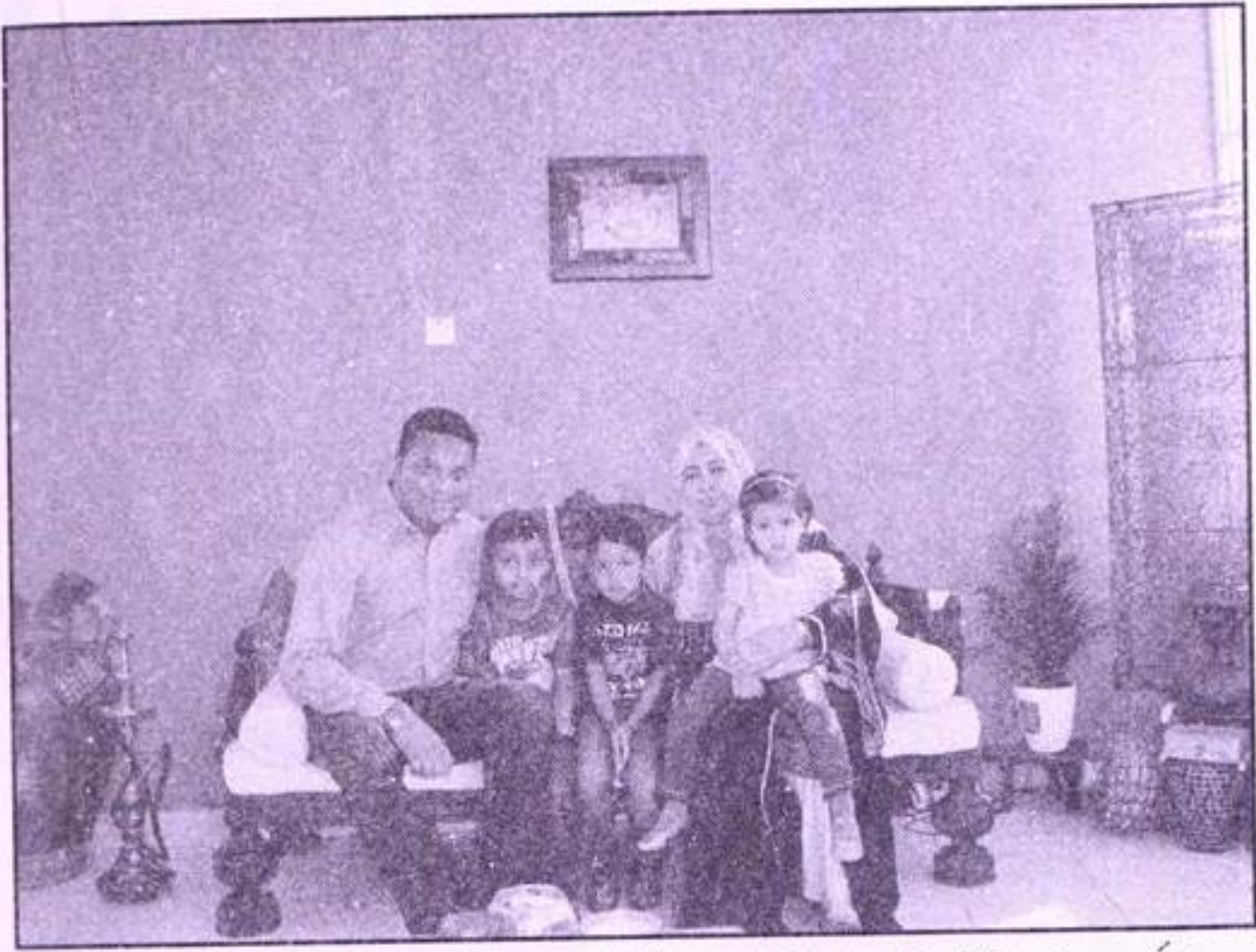
(بائیں سے) ساجد سہیل (فرزند) احمد سہیل، عبداللہ سہیل (پوتے)، عائشہ احمد (بہو) اور آسیہ سہیل (پوتی)
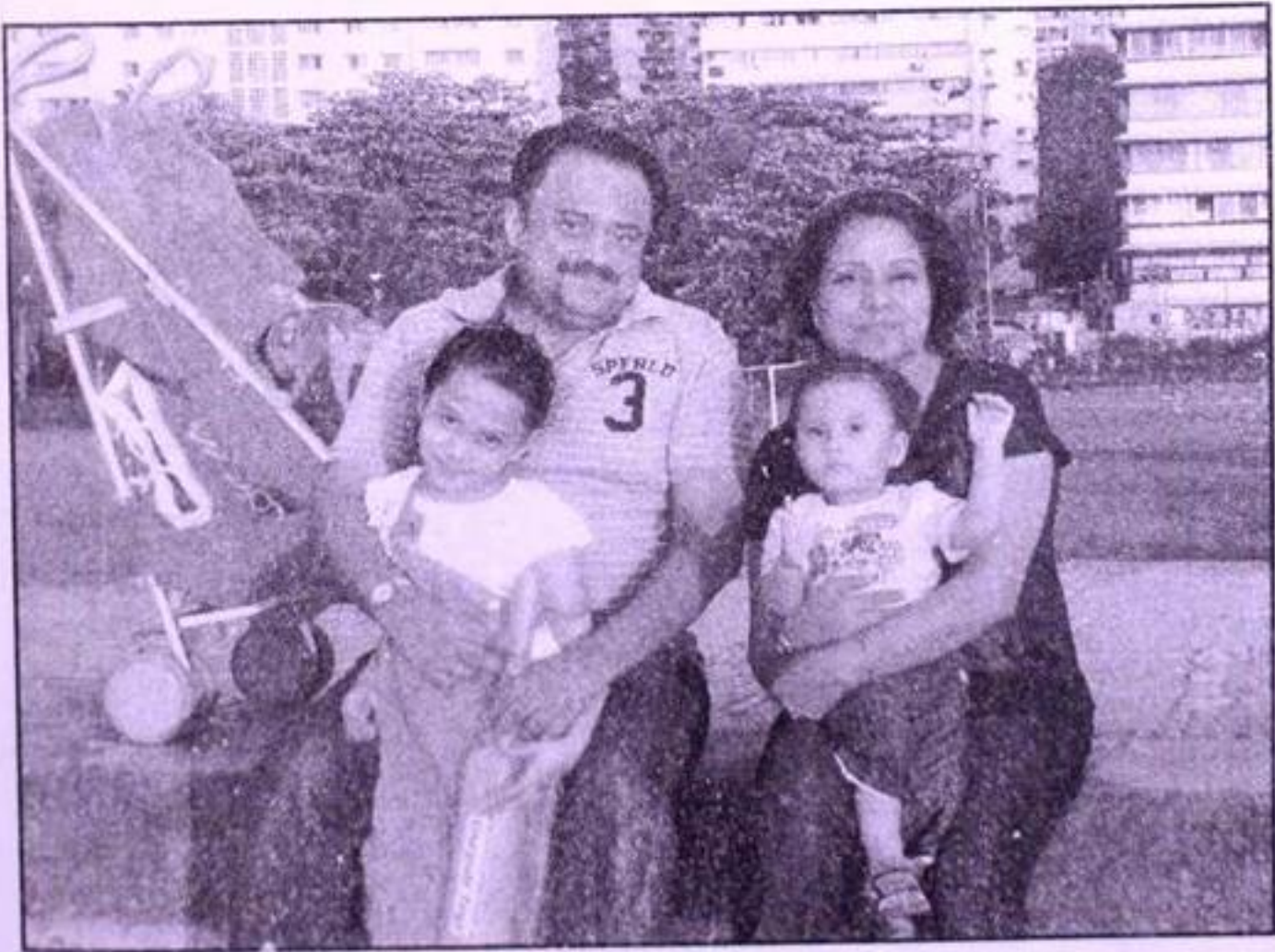
زریں سہیل (زیان خان گود میں) جاوید خان (مریم خان گود میں)

ابراہیم بھائی

اعجاز بھائی

زندگی میں پہلا قدم، ماں کے سہارے (ساجد سہیل)

(بائیں سے) دلیپ کمار رائے، مسز رائے، دیویندر اِسّر اور عابد سہیل

دیویندر اِسّر اور عابد سہیل
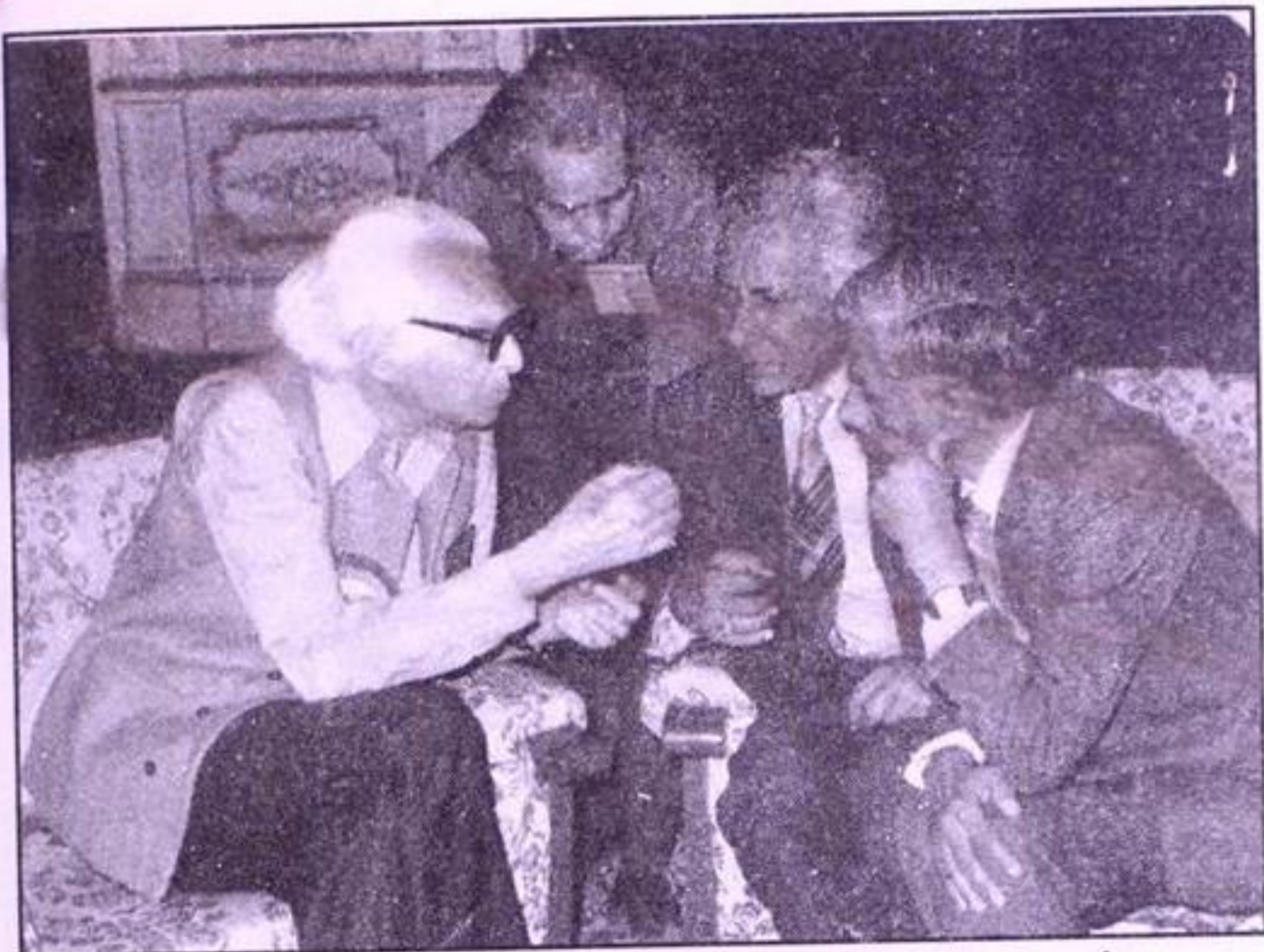
انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس کے موقع پر تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے
(بائیں سے) غلام ربانی تاباں، اجمل اجملی، عابد سہیل اور ڈاکٹر محمود الحسن

یو۔پی اُردو اکادمی کی تقریب میں (بائیں سے) علی احمد فاطمی، عابد سہیل، راجندر بہادر موج، وجاہت علی سندیلوی
اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ وشوناتھ پرتاپ سنگھ سے گفتگو کرتے ہوئے
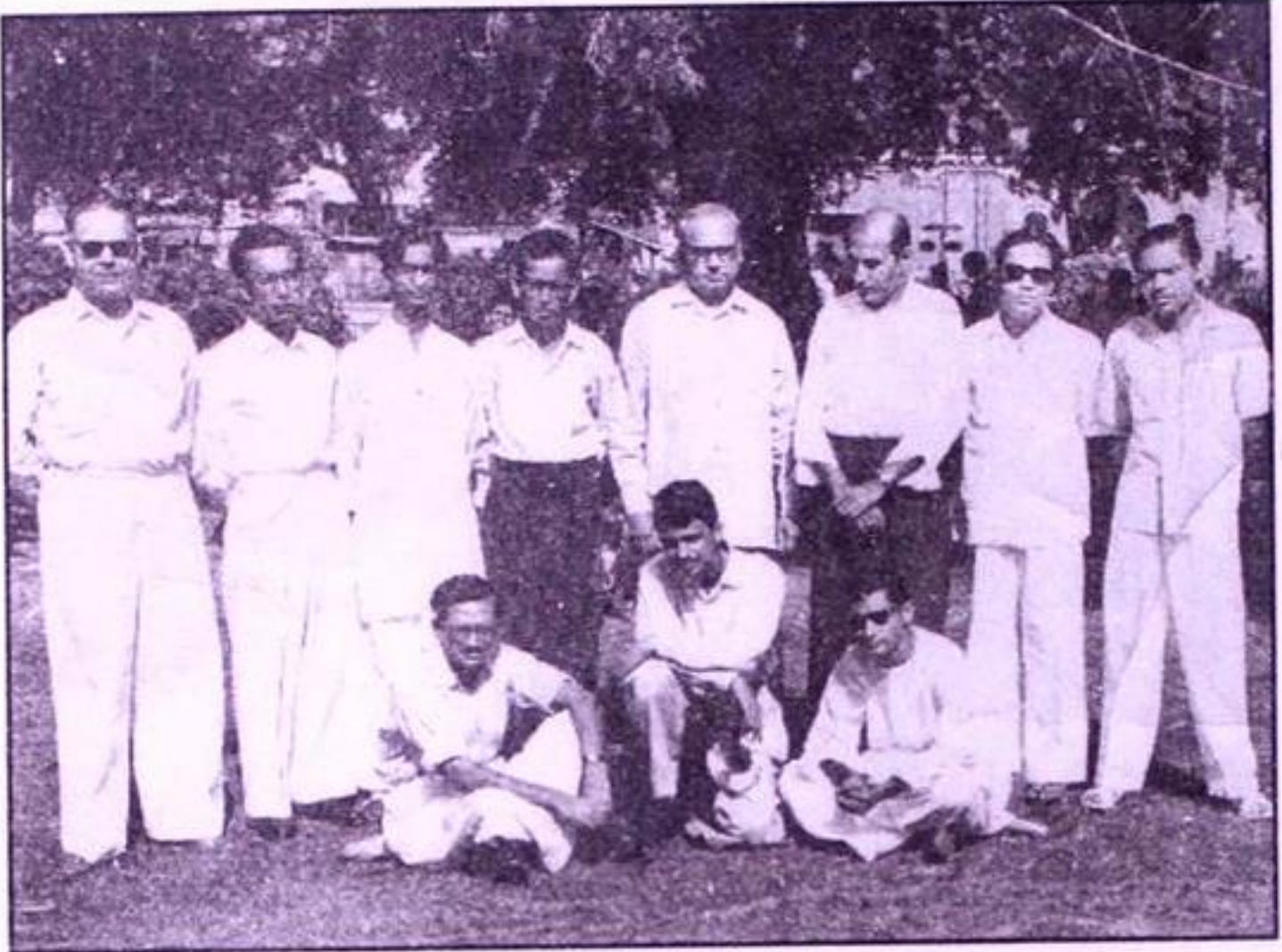
(کھڑے ہوئے بائیں سے) ستیش بترہ، عابد سہیل، حسن کمال، قیصر تمکین، پروفیسر احتشام حسین، بشیشر پردیپ، پرتپا ماتھر اور نامعلوم (بیٹھے ہوئے بائیں سے) احمد جمال پاشا، ثروت پاشا، عثمان غنی
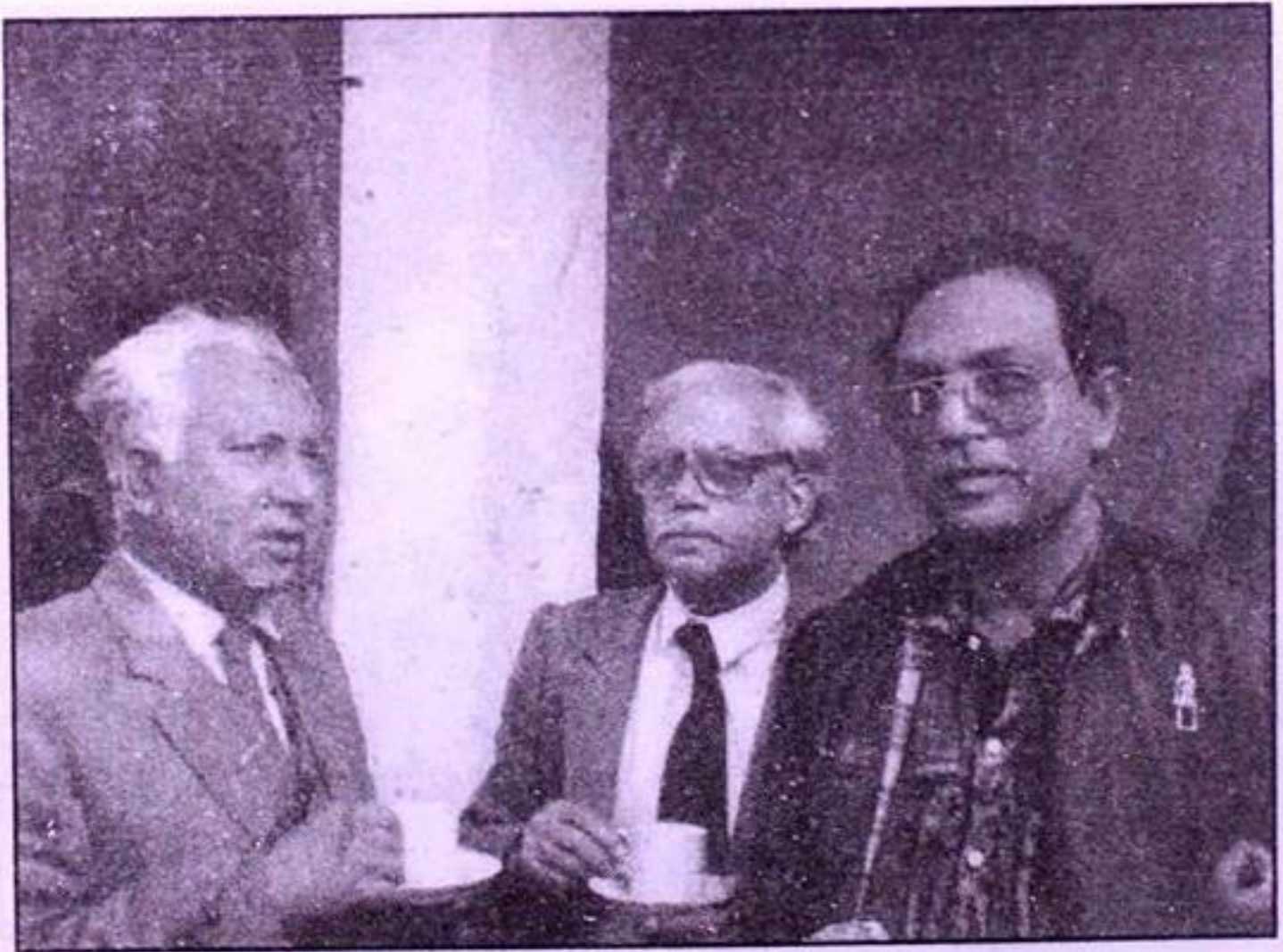
عابد سہیل، راج نرائن راز اور شام بارک پوری ایک محفل میں

شمس الرحمٰن فاروقی اور عابد سہیل محو گفتگو
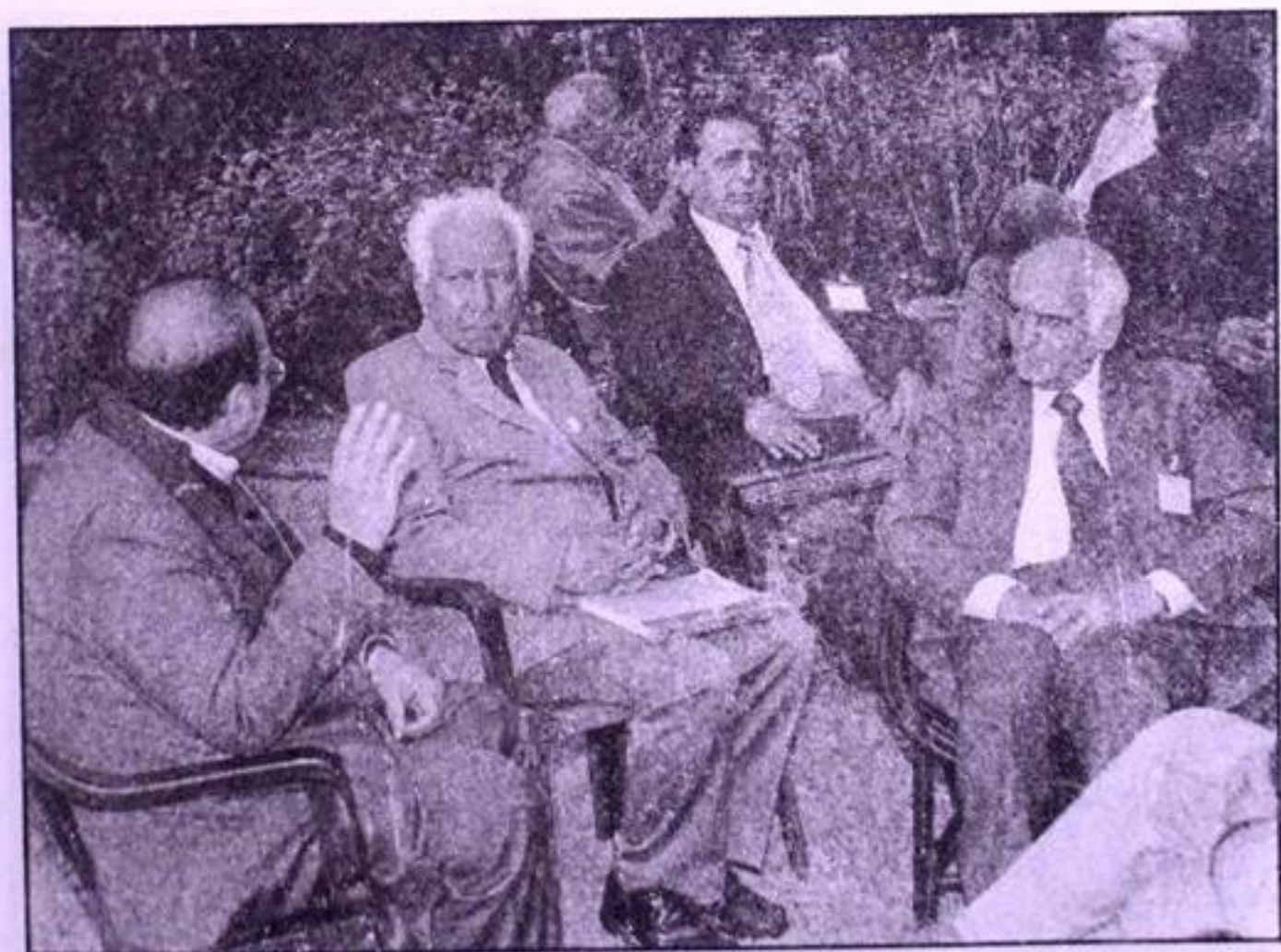
سجاد ظہیر سیمنار کے موقع پر (بائیں سے) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، عابد سہیل، انتظار حسین، پروفیسر قمر رئیس اور ش۔ک۔ نظام بھی نظر آرہے ہیں۔
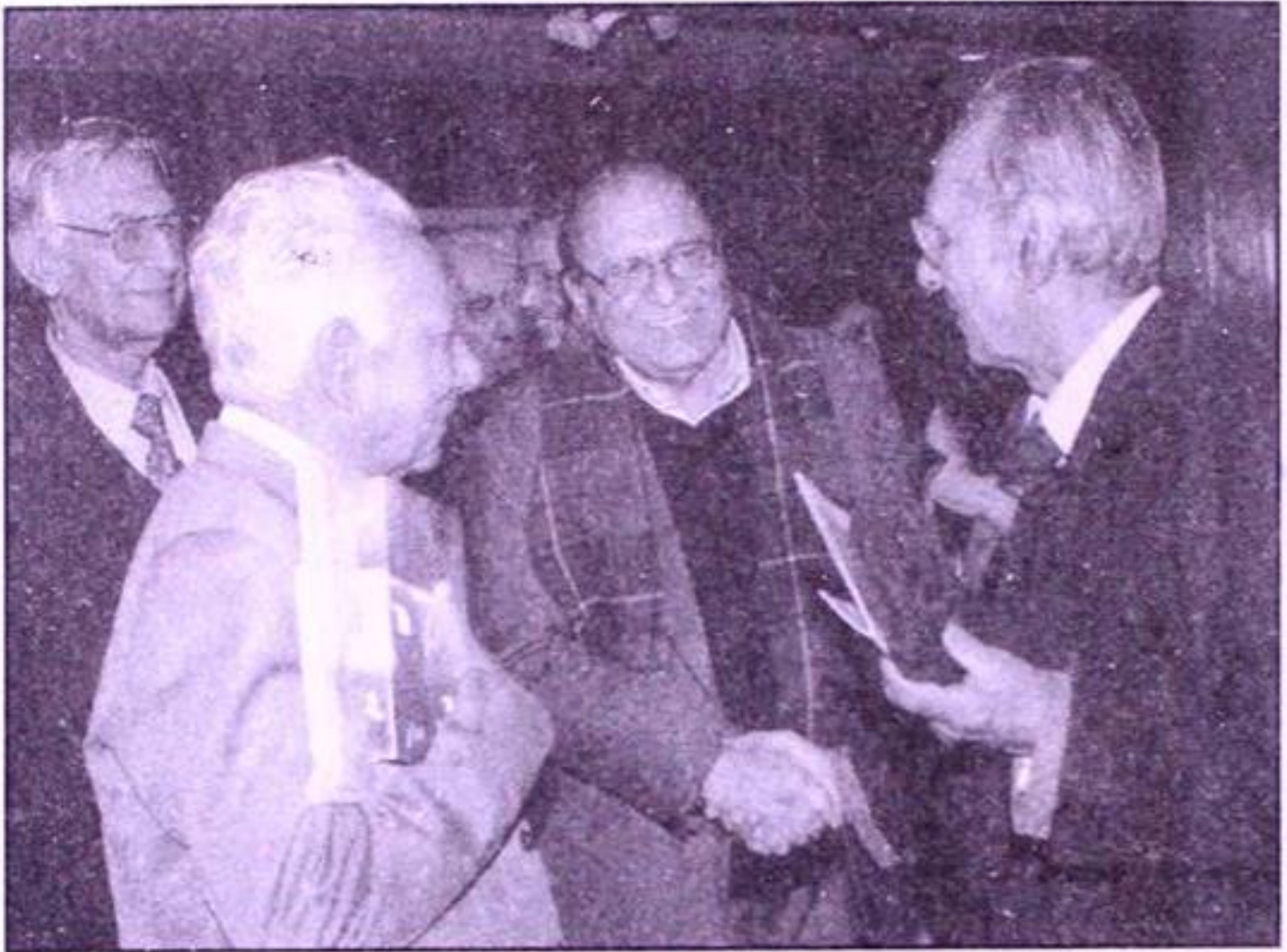
ڈاکٹر محمد حسن، گوپی چند نارنگ، عابد سہیل اور کمال احمد صدیقی (سجاد ظہیر سیمنار کے موقع پر)
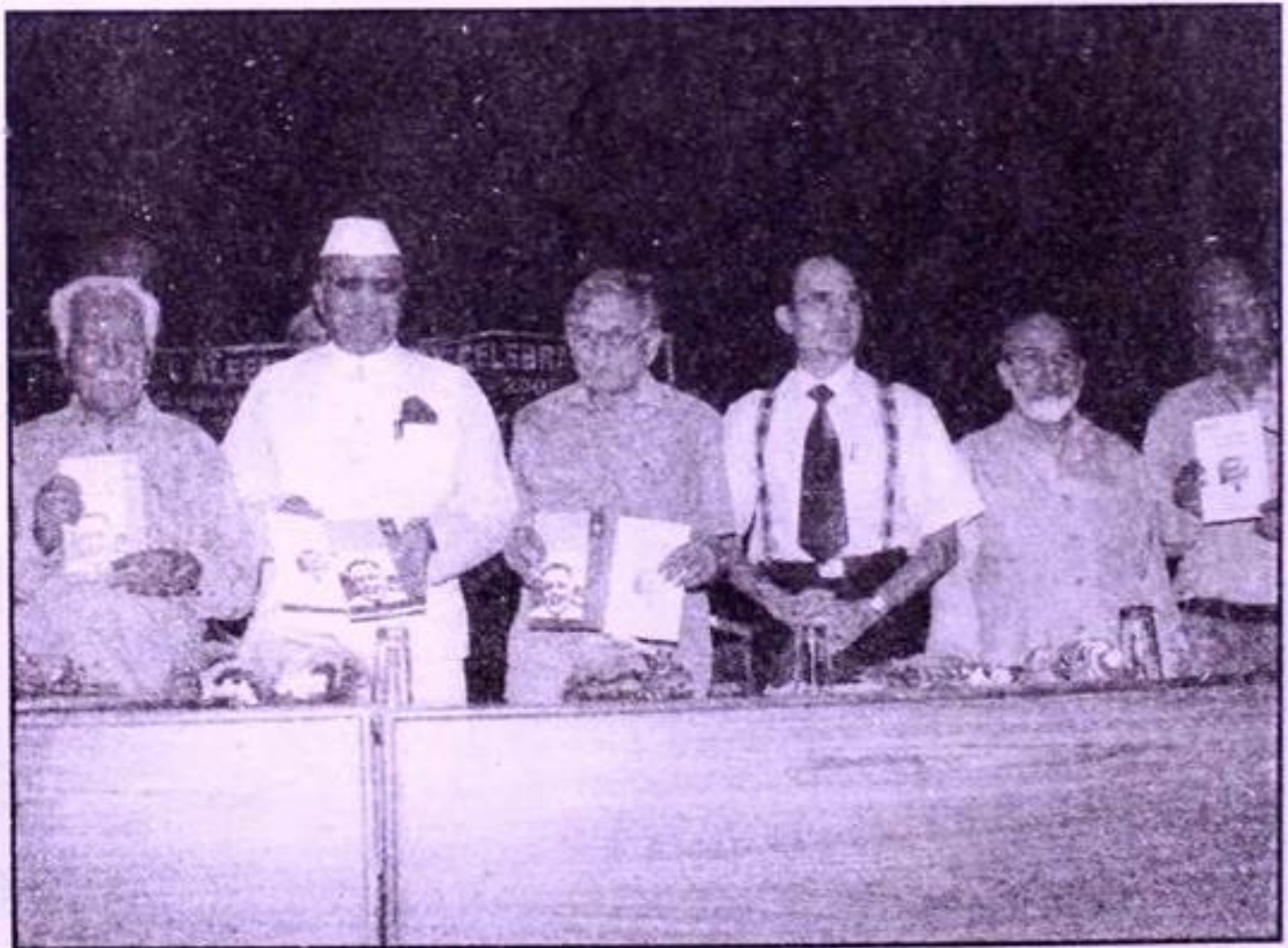
ڈاکٹر عبدالعلیم کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر عابد سہیل اور شکیل صدیقی کی کتابوں کا اجرا کرتے ہوئے
جھاڑکھنڈ کے گورنر سید سبط حسن رضوی، پروفیسر عرفان حبیب ودیگر احباب

(بائیں سے) آغا سہیل، رتن سنگھ اور عابد سہیل محوِ گفتگو
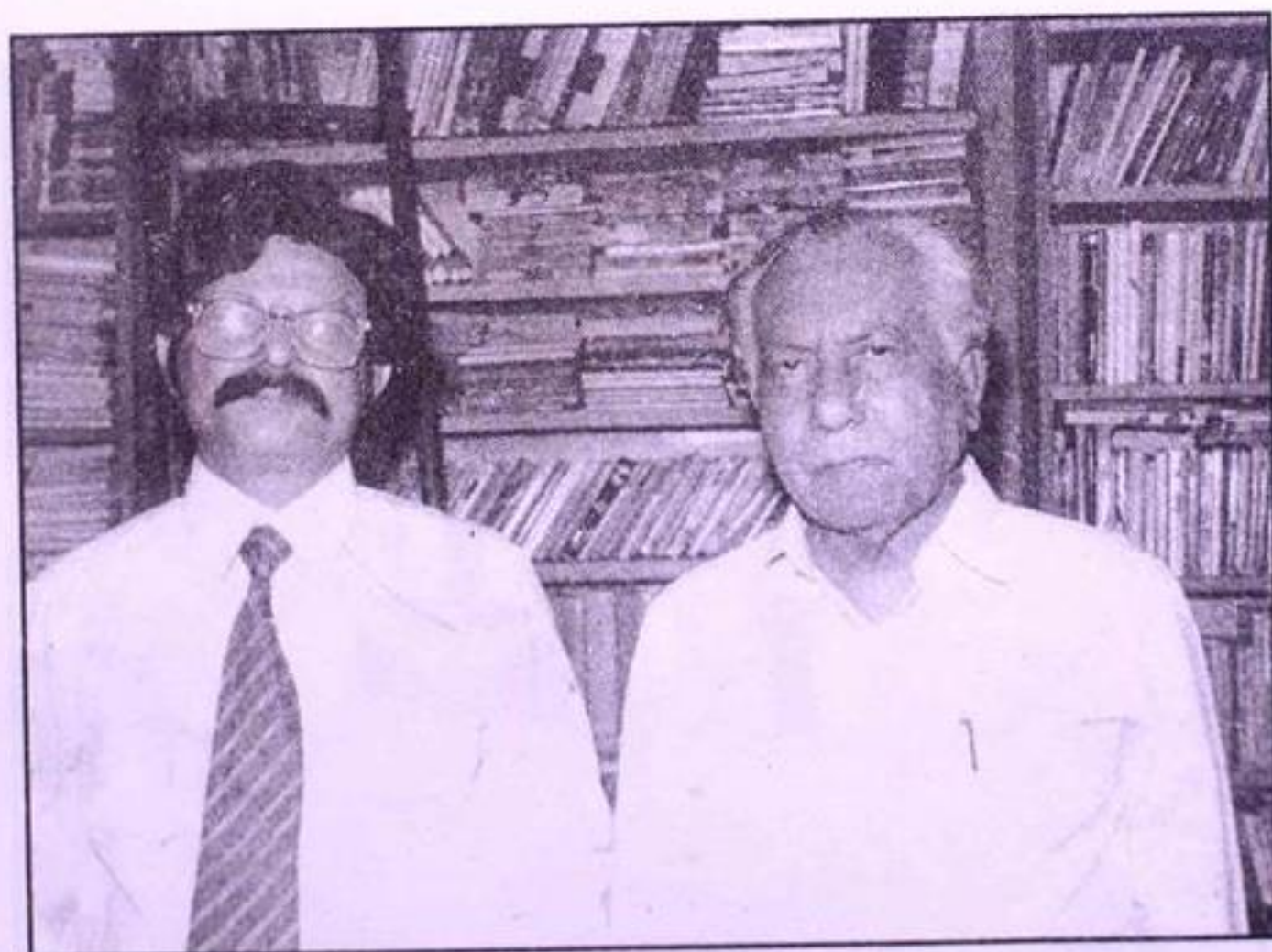
نور پرکار، عابد سہیل کے ساتھ نصرت پبلشرز میں

عابد سہیل معروف افسانہ نگار جوگندر پال کے ساتھ

یو۔پی اُردو اکادمی کے سمینار کے موقع پر (بائیں سے دائیں) ڈاکٹر خلیق انجم، گوپال متل، ڈاکٹر محمد حسن،
غلام حسین زیدی، عابد سہیل اور ڈاکٹر روشن آرا بیگم
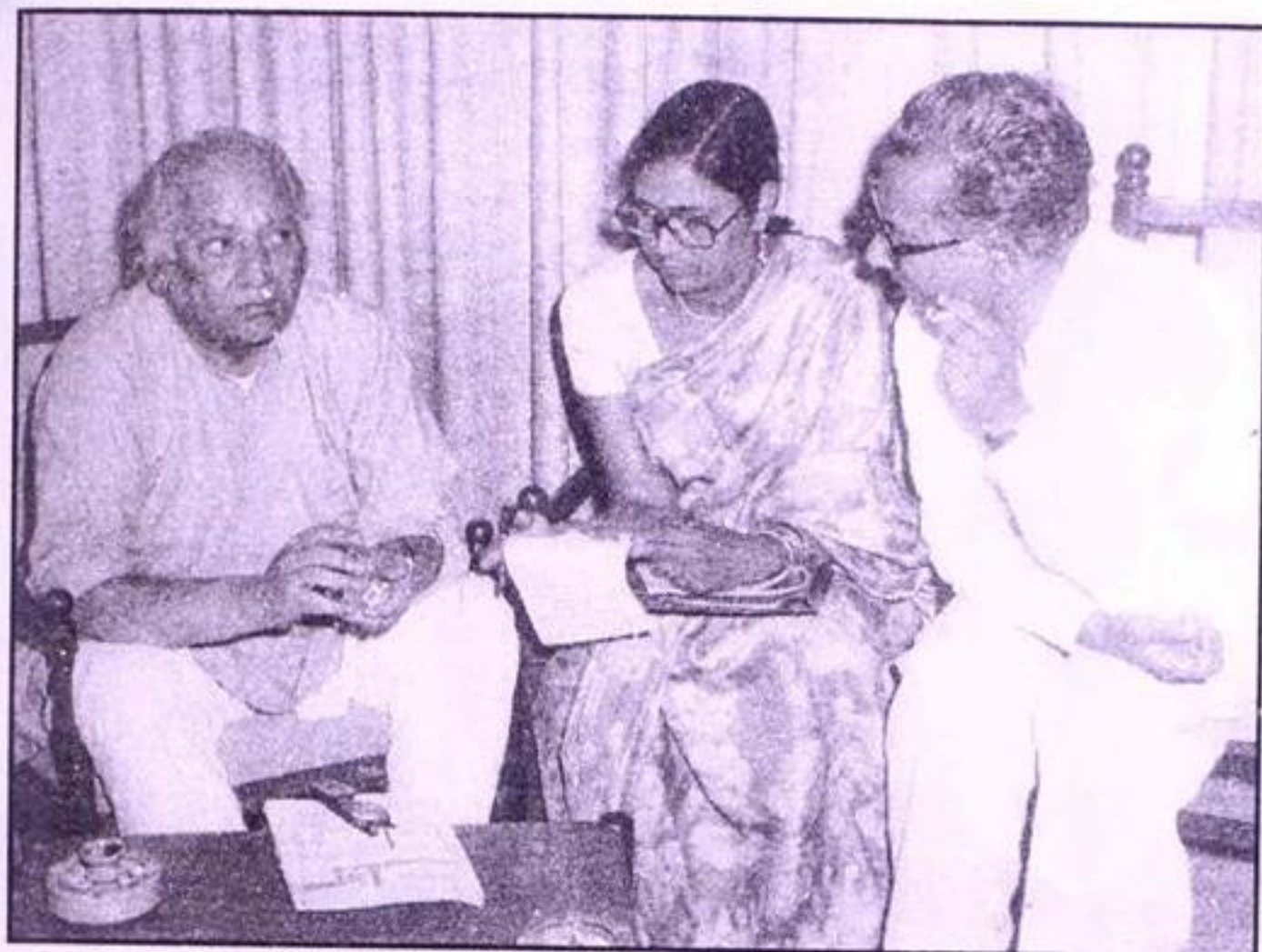
عابد سہیل اور انیس نصرت۔ فیض احمد فیض سے محوِ گفتگو

یو۔ پی اُردو اکادمی کی مجلس عاملہ کے موقع پر (دائیں سے) منظر سلیم، رضا انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور عابد سہیل

متحدہ محاذ کی اُردو کانفرنس کے موقع پر ماہنامہ کتاب کے اسٹال پر (بائیں سے) عثمان غنی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین اور عابد سہیل
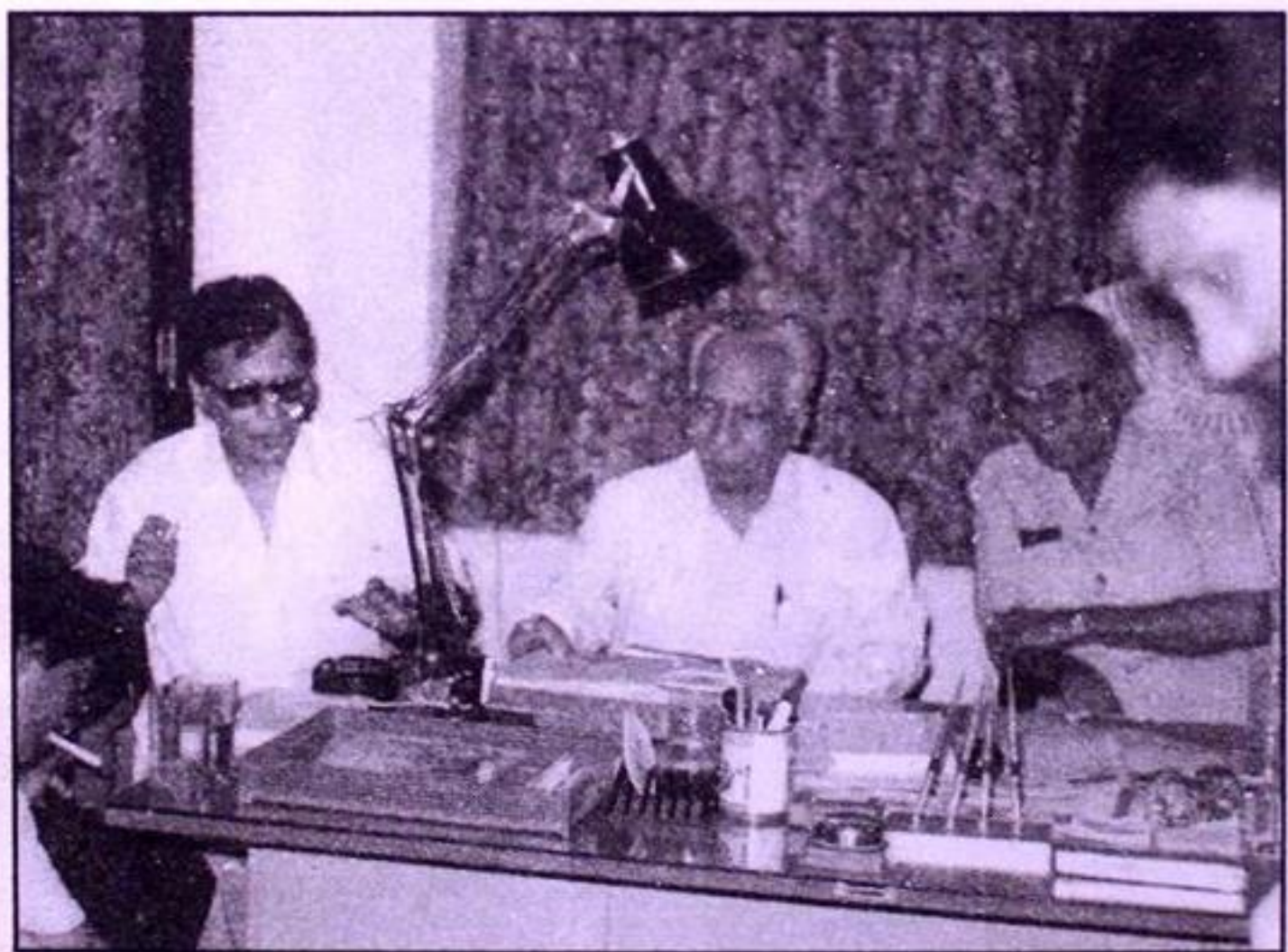
پریس انفارمیشن بیورو لکھنو، میں سہیل وحید کی کتاب ''صحافتی زبان'' کی رسمِ اجرا کے موقع پر بائیں سے عرفان صدیقی، عابد سہیل اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

نیشنل ہیرالڈ کے شعبہ ادارت میں (بائیں سے دائیں) سے عابد سہیل، ایچ۔ کے۔ گوڑ اور شاہد احمد وغیرہ
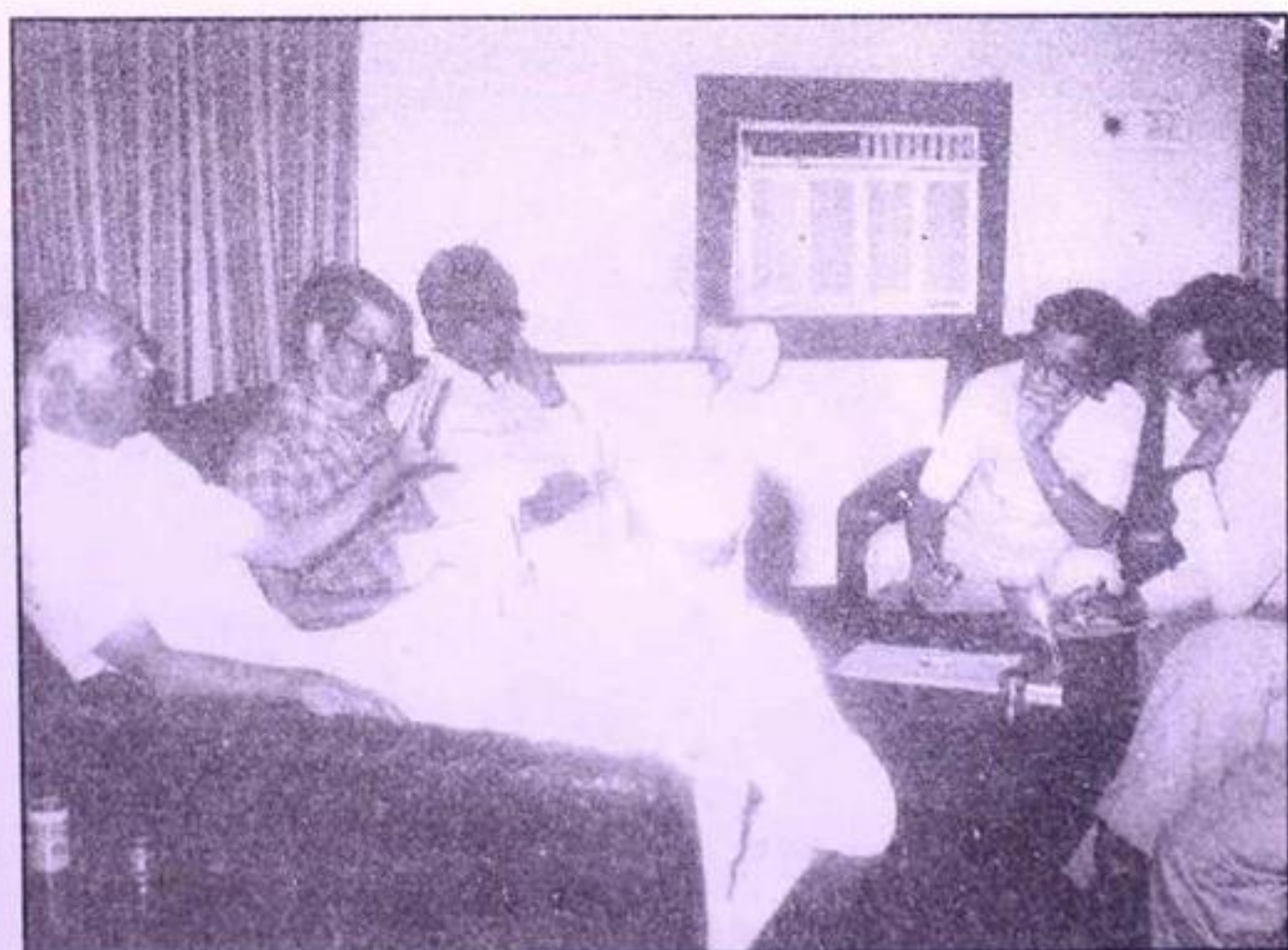
وزیر اعلیٰ شری پتی مشرا اپنی قیام گاہ پر پربھوشن چوہان (نوجیون)، عابد سہیل (نیشنل ہیرالڈ)
عثمان غنی (قومی آواز) اور حسیب صدیقی (نوجیون) سے گفتگو کرتے ہوئے

عابد سہیل، بلراج ساہنی سے نیشنل ہیرالڈ کے لیے انٹرویو لیتے ہوئے

عابد سہیل احمد فراز سے نیشنل ہیرالڈ کے لیے انٹرویو لیتے ہوئے
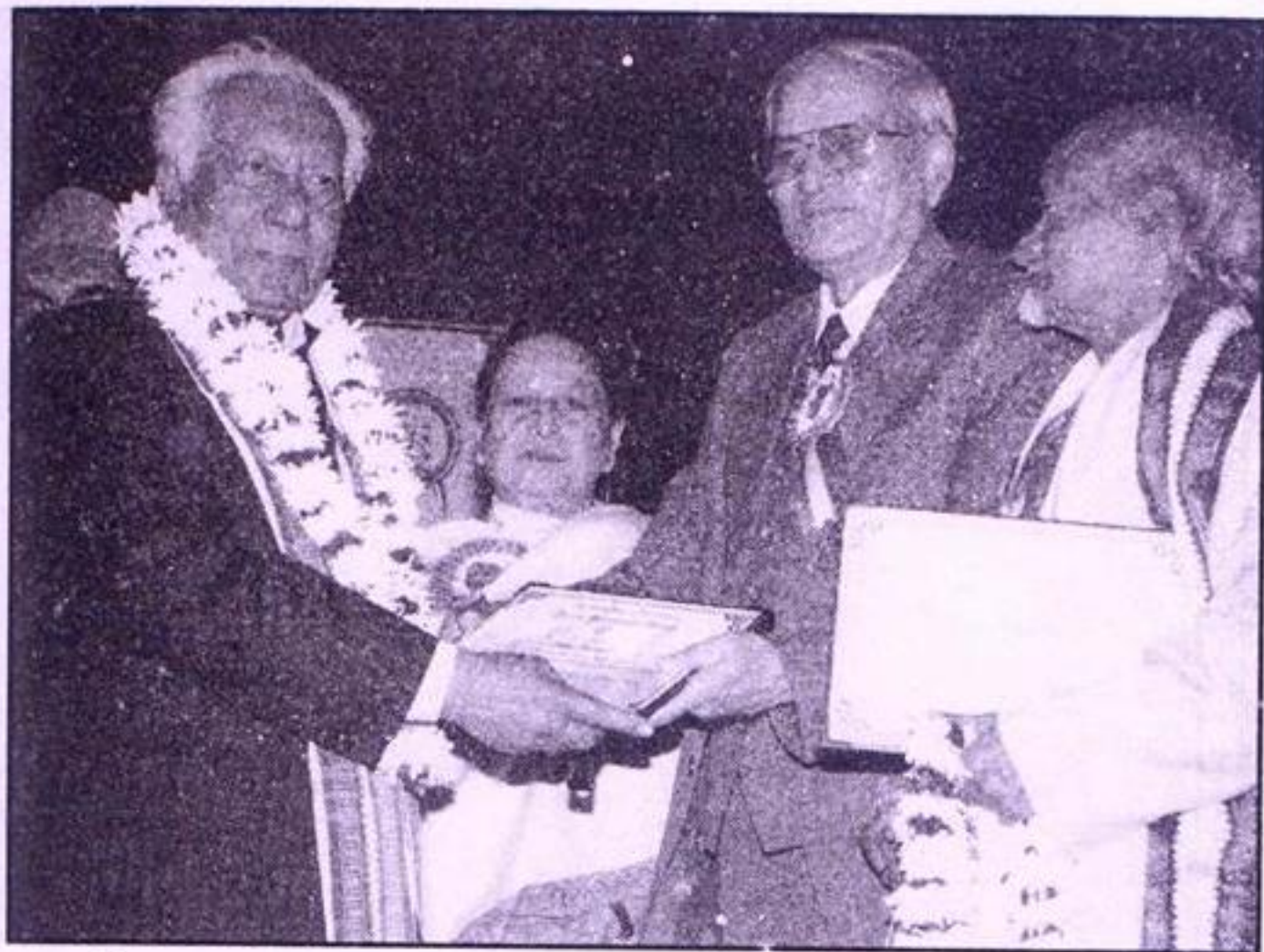
عابد سہیل جسٹس حیدر عباس سے آل انڈیا قمر کہکشاں ایوارڈ لیتے ہوئے، ساتھ میں ہیں محسنہ قدوائی اور مدرا کھش

عابد سہیل اُردو صحافتی خدمات کے لئے گورنر یو۔ پی سورج بھان سے اُردو اکادمی کا ایوارڈ لیتے ہوئے
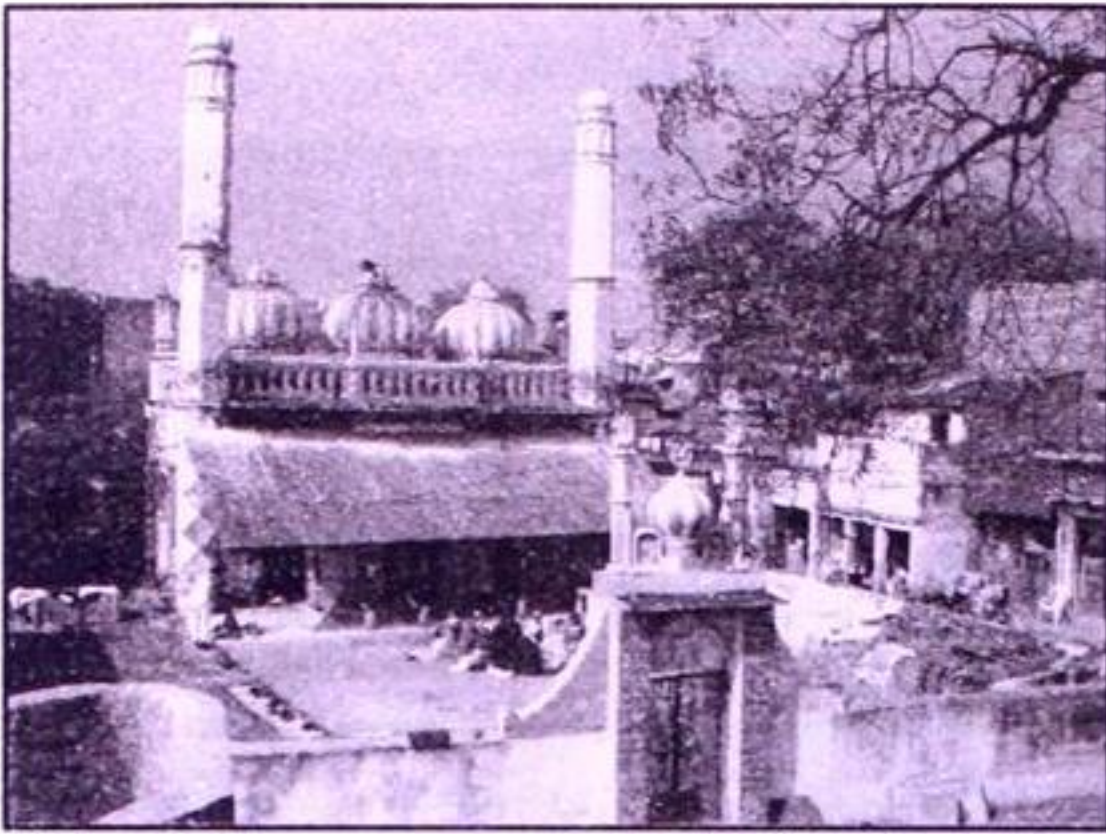
محی الدین پور میں سید وزیر حسن مرحوم کی تعمیر کردہ جامع مسجد
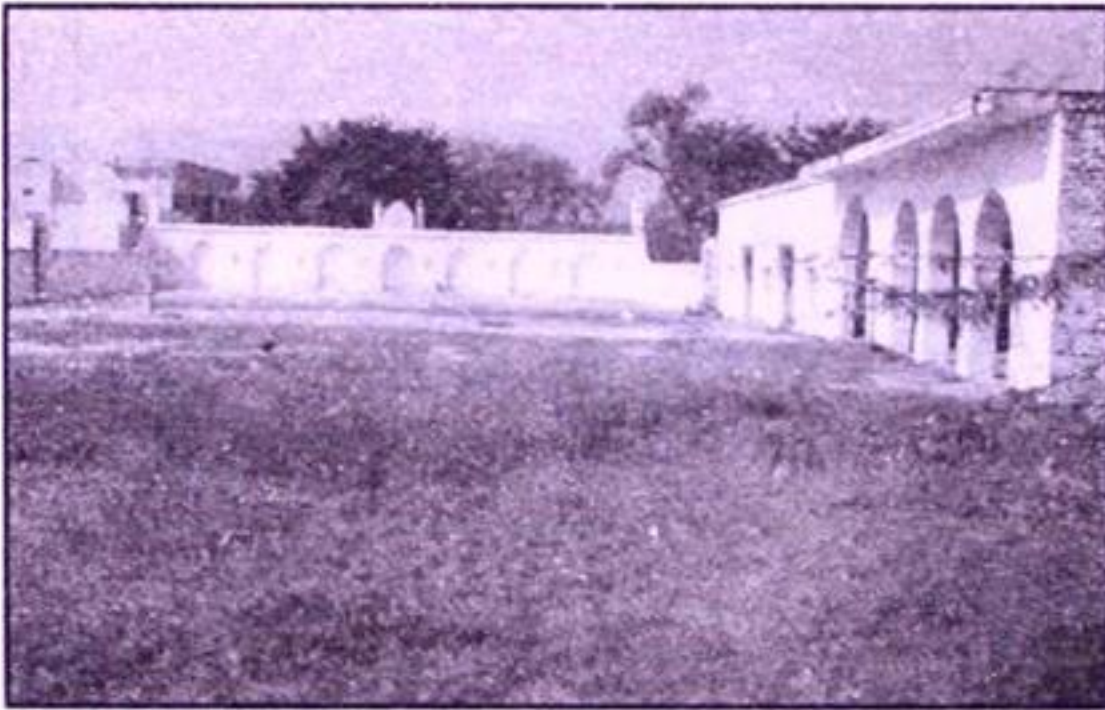
محی الدین پور میں اہلِ خاندان کی تعمیر کردہ عیدگاہ
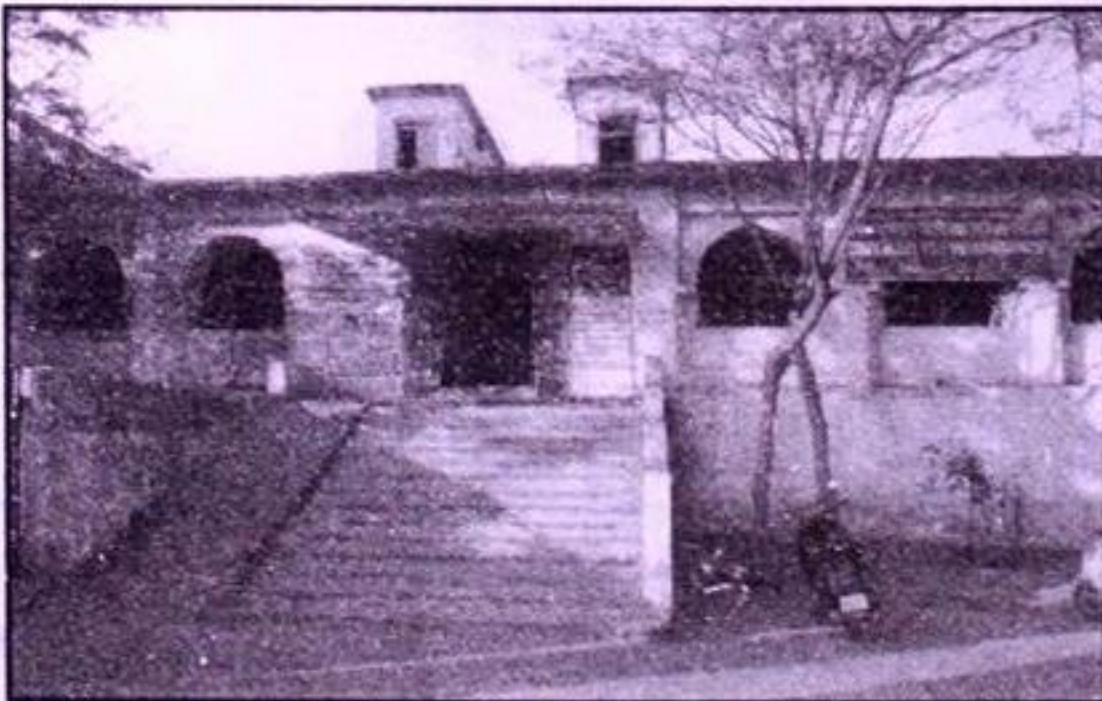
بھوپال میں عابد سہیل کی دوسری درس گاہ: شاہجہانی ماڈل ہائی اسکول

(دائیں سے) قمر رئیس، عابد سہیل اور غلام ربانی تاباں

(کھڑے ہوئے۔ دائیں سے): امرت لال ناگر، رضیہ سجاد ظہیر، علی عباس حسینی، عابد سہیل، ٹھاکر پرساد سنگھ، ستیش بترا، میگھ مجمدا
(بیٹھے ہوئے دائیں سے) نامعلوم، پرمود مجمدار، رام لعل، بیر راجا، کے۔ پی۔ سکسینہ

عابد سہیل